

جوامع السیرت صلی اللہ علیہ وسلم

از

حکیم الاسلام مولانا سید محمد میاں صاحب
امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد
امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی

ناشر: حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ، کراچی

ایڈریس

حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ

6 سندھی، جماعت کو آپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی، جوگی موڑ بس اسٹاپ

نیشنل ہائے وے، کراچی 75030

رابطے کیلئے 021-35000278

0313-2707097

Web: www.hikmatequran.org

Email: hikmatequran@gmail.com

فہرست مضامین

مقدمہ: مطالعہ سیرت کے تقاضے	13	کارنامہ	44
محمد رسول اللہ قرآن و تاریخ کے آئینے میں	46	بلند حوصلہ ہاشم بن عبد مناف	46
مکہ: محل وقوع، اہمیت	31	عبدالمطلب کے بعد خواجہ ابوطالب اور	47
بنائے مکہ، بانی مکہ اور کعبہ	32	حق سقاییہ	47
قریش اور قصی بن کلاب مصلح قریش	33	پورے عرب پر قریش کا ہمہ گیر اثر	47
قریش کا تعارف:	33	نظام بت پرستی	47
قصی اور تولیت کعبہ	34	سیاسی قیادت	48
سیاسی رابطہ	34	دیگر قبائل کے لئے مراعات	49
مکہ کی شہری ریاست جدید تنظیمات	37	عرب کا تجارتی نظام اور قریش کی سربراہی	50
نادی۔ دارالندوہ، شعبے اور منصب	37	میدان تجارت میں قریش کی سربراہی	51
نادی (مقاصد اور فوائد)	37	واقعہ اصحاب فیل	53
دارالندوہ	38	واقعہ اصحاب فیل کے نتائج	55
دارالندوہ کے ضابطے	38	تصدیق کلام	55
دارالندوہ میں انجام پانے والے کام	39	ولادت محمدی	58
مختلف شعبے اور منصب	39	ظہور بشارت عظمیٰ	58
حج سے متعلق	40	نام نامی	58
رفادہ۔ حجاج کے کھانے کا انتظام	40	رضاعت و شیر خوارگی اور مرضعات	59
سقاییہ	41	(دودھ پلانے والی مائیں)	60
وقادہ	41	سیدہ آمنہ مدینہ میں	61
اجازہ یا افاضہ	42	دادا عبدالمطلب کی سرپرستی اور وفات	61
قبۃ۔	42	خواجہ ابوطالب کی سرپرستی	62
عدالت اور فصل خصوصیات	42	اپنا تکفل خود اور دوسروں کی مدد	62
فوجی نظام	43	مکہ تجارتی نقطہ نظر سے	63
تسمیں	43	قومی خدمت کا جذبہ	64
باضابطہ فوج یا پولیس	44	شرم و حیا	65
		غیر اللہ کی پرستش سے پرہیز	66

بچوں کو چھوٹے سے پرہیز	66	پہلی خصوصیت اور نبی اور فلسفی کا فرق	108
دور شباب اور جوہری کردار	67	دوسری خصوصیت	110
تجارت	67	تیسری خصوصیت	110
نکاح	71	چوتھی خصوصیت	111
نکاح	71	پانچویں خصوصیت	111
رشتہ کا سبب	72	چھٹی خصوصیت	111
اخلاقی بد حالی۔ جذبہ اصلاح	74	شمع سوزاں اور سراج منیر کو گل کرنے کی	111
امن پسندی اور صلح جوئی	76	کوشش	113
خدا پرستی اور معرفت حق	78	منسوبہ بند کوششیں	116
نبوت	81	ہردیونگ اور انتشار	116
تبلیغ اور دعوت عام سے پہلے تربیت	83	ناکہ بندی	117
نصاب و طریقہ تربیت	87	زدکوب اور مشق ستم	119
طریقہ تربیت	88	مقصد	120
داعی الی اللہ کے اوصاف اور ان کی تربیت	88	ہجرت حبشہ	122
و تکمیل	88	قریش کا تاثر	123
(۱) ہمدردی	91	حضرت عمر فاروقؓ کا مسلمان ہونا	126
(۲) اذعان اور یقین	92	شعب ابی طالب میں پناہ	126
ثمرہ تربیت	94	قریش کی طرف سے قومی بائیکاٹ	129
مقامی اور سماجی حالات اور رد عمل	95	پناہ کی دیواریں منہدم	129
رد عمل	95	پناہ کی تلاش	130
تبلیغ کا آغاز	97	طائف کا سفر	130
سب سے پہلے اپنا خاندان	98	طائف	130
صفا کی اسٹیج سے اعلان حق	100	روسائی طائف اور ان کے اجواب	131
اتنا اشتعال (بوکھلاہٹ) کیوں؟	100	بارگاہ رب العزت میں عجز و انکسار	131
تعلیمات کا دوسرا رخ	102	پتھر برسانے والوں کے حق میں	133
پڑھنا، لکھنا، تہذیب، تمدن	102	خیر اندیشی اور ہمدردی	133
دلیل صداقت	103	بارغ کے مالک اور ان کا غلام	134
پہلی دلیل	103	مطمع بن عدی کی قدر دانی	135
دوسری دلیل خود قرآن شریف (کلام اللہ)	107	یثرب۔ مدینہ النبی	138
محمد ﷺ کی حیثیت	107	یثرب کے دولیڈر	138
فرائض اور خصوصیات	107	یثرب میں آنے والے نبی کا چرچا	138

139	یثرب میں آنحضرت ﷺ کا ذکر خیر	139	مخرج صدق (مکہ سے ہجرت) اور امداد
140	یثرب میں اسلام	140	خداوندی
140	یثرب کی پہلی جماعت جس نے دعوت اسلام قبول کی	140	صادق و امین کی امانت داری
142	بیعت عقبہ اولیٰ	140	غار ثور میں قیام اور ضروری انتظامات
143	نیادار ہجرت	142	ان کو کیا فکر جن کا ساتھی اللہ ہو
143	صدق اکبر ﷺ کا ارادہ ہجرت	143	سب کچھ قربان
144	بیعت عقبہ دوم	143	حالات سے باخبر رہنے اور دوسری ضروریات کا انتظام
149	بارہ نقیب	149	باہوش و باتدبیر رفاقت
149	حضرات نقباء کا تعارف اور مختصر حالات	149	راستہ کی مختصر سرگزشت
149	حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ	149	حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے ملاقات اور پیش کش
150	حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ	150	کس
150	حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ	150	یثرب میں ورود مسعود
151	حضرت رافع بن مالک رضی اللہ عنہ	151	مدینہ میں روانگی کی خبر
151	حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ	151	آرام گاہ اور نشست گاہ
151	حضرت عبد اللہ بن عمرو بن حرام رضی اللہ عنہ	151	حق پرستوں کا اعتراف حق
152	حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ	152	سرزمین یثرب میں رسول اللہ ﷺ کا پہلا خطاب
152	حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ	152	قبائے مدینہ منورہ
152	حضرت منذر بن عمرو بن خنیس رضی اللہ عنہ	152	بالائی منزل میں قیام
152	حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ	152	قصواء کا قیام اور حضرت اسعد رضی اللہ عنہ کا والہانہ جذبہ متعلقین کی آمد
153	حضرت رفاعہ بن عبد المنذر رضی اللہ عنہ	153	نیادور۔ غیر محدود میدان عمل
153	قریش کا تقاب	153	دعوت الی اللہ۔ داعی کے اوصاف و خصائل اور خصوصیات
155	مکہ معظمہ میں اصول کار (پروگرام) ہاتھ نہیں اٹھا سکتے	155	شہادۂ (۱)
155	صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہجرت مدینہ کی اجازت	156	مبشرۂ (۲)
156	شوق استقبال	157	نذیرۂ (۳)
157	آنحضرت ﷺ کو دعائی تلقین اور ہجرت کا اشارہ	157	وداعی الی اللہ
160	مخالفین کا منصوبہ	160	باذنہ (۵)

189	(۶) سراجا منیراً	189	جماعت کے فوائد
191	ہدایات	191	مواعظ
191	(۱) پہلی ہدایت	191	مہاجرین اور انصار (رضی اللہ عنہما) میں بھائی چارہ
193	(۲) دوسری ہدایت	193	رشتہ اخوت اور حضرات انصار کا ایثار
193	(۳) تیسری ہدایت	193	یہ ایثار کیوں تھا؟
194	(۴) چوتھی ہدایت	194	ایثار و اخلاص کی مثالیں
194	آداب دعوت و طریقہ کار	194	اخلاص و اللہیت کی انتہا
196	دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو دعوت اور طریقہ دعوت	196	اساء گرامی برادران مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہما
196	اہل کتاب	196	مواعظ قبل ہجرت
197	وجہ اختلاف	197	مسجد اور حجرات کی تعمیر اور مواعظ
198	اہل شرک	198	پر دوبارہ نظر
200	لامذہب کے منکر پرست اور خدا کے منکر	200	سلسلہ مواعظ اور سیاسی رہنماؤں کیلئے
201	طرز عمل	201	ایک سبق
203	خلاصہ	203	سیرت مبارکہ کے اشارات
204	دعوت الی اللہ کی دشوار گزار گھائی جہاد فی سبیل اللہ	204	انسان کی حیثیت
207	خطابات و عمومی ارشادات	204	فرائض
209	مدینہ طیبہ میں سب سے پہلا خطبہ جمعہ	207	تزکیہ کس طرح ہوتا ہے
209	خطبہ التقویٰ	209	استحصال کی بندش
212	مقام فکر اور دلیل صداقت	209	ایک معرہ
212	تعمیر مساجد و اقامت صلوٰۃ	212	نتیجہ
213	نئے میدان عمل میں پہلے کام	213	تیسرا کام قریش و اہل یثرب کا معاہدہ یہود سے مصالحت
214	مسجد قبا	214	تحویل قبلہ، انقلاب عظیم
214	جماعت	214	سب سے افضل امت۔ سب سے افضل قبلہ
215	مسجد مدینہ، مسجد النبی ﷺ	215	اشارے
217	تعمیر	217	وجوہات
218	حجرات امہات المؤمنین	218	حضرت ابراہیمؑ سے رب ابراہیمؑ کا وعدہ اور
219	صفہ و اصحاب صفہ	219	بنو اسرائیل کی محرومی کا سبب
221	نماز جنازہ کی جگہ	221	اسب مستحق شرف کون
221	نماز باجماعت	221	نکاح السیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا

281	مکان کا انتظام	307	کتاب اللہ کی شہادت
282	اللہ تعالیٰ اپنے پاکباز مقررین کو کس طرح محفوظ رکھتا ہے	307	حضور ﷺ کے ارشادات
283	نکاح سے کچھ عرصہ بعد رخصتی	308	حضرت علیؓ کا بیان
283	جہیز	309	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان
284	مقاصد بعثت، فرائض نبوت اور تکمیل	311	نبوت سے پیشتر کی زندگی
284	دعاء اور قبولیت دعا	312	حضرت خدیجہؓ کی شہادت
284	قبولیت دعا	313	اہل ایمان کے اوصاف و خصائص
285	تشریح	314	اصل نیکی
285	تلاوت آیات اللہ	315	حسن اخلاق کی اہمیت
286	فریضہ نماز عام مسلمانوں کے لئے	316	ایمان کیا ہے؟
286	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت	318	دائرہ اصلاح و درستی
288	بلسلہ عبادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات	318	حسن خلق
288	روزہ	319	بچوں پر شفقت
289	زکوٰۃ	320	غلاموں پر شفقت
289	جہاد	321	غریبوں پر شفقت
290	خلاصہ کلام	321	مساوات
290	تعلیم الکتاب	323	ایثار
290	يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ	324	سوال اور گد اگری سے کرہیت
294	تعلیم الحکمہ	325	جو دو سنا
294	یعلہم الکتاب والحکمہ	326	سادگی اور بے تکلفی
296	تزکیہ	327	صبر و حلم
296	ویزیکہم	328	عام خصائص
289	حکومت کیا ہے	329	بعض اہم ارشادات
300	مالی نظام	330	پانچ مرموم خصائیس
302	تزکیہ کا عجیب و غریب طریقہ	331	نور حق کے لیے والہیت
203	تزکیہ کا عجیب و غریب نمونہ جینا و بال جان	332	سنت رسول پاک ﷺ
305	سیرت رسول ﷺ کے عملی پہلو	334	رحمۃ للعالمین
307	فضائل اخلاق	334	نوع انسانی کے لیے رحمت
		334	تاریخ کا فیصلہ
		335	ابر رحمت اور شاد آبی زمین
		335	قدرتی مثالوں کی حکمت

336	موت کے بعد زندگی	336	کائنات انسانیت پر احسان عظیم
336	روح کی پیاس اور دل کی بھوک	337	دین رحمت
337	رحمت باری تعالیٰ کے خزانے	338	اسلام کے ضوابط
338	رحمت الہی کی عالمگیر نمود	339	باہم سلوک کی مثالیں
339	دنیا کی بڑائیاں اور ان کے نتیجے	340	اشرف المخلوق کے واجبات
340	اولوالعزم شہنشاہ	340	محبوب معبود
340	سکندر اور دوسرے فاتح	341	حب رسول ﷺ
341	حکم و فلاسفہ	341	خدا سے محبت کی عملی راہ
341	صنعت گر	342	حضور ﷺ کے چند ارشادات
342	دور حاضر	342	صفات الہی کا پرتو
343	اپنے ہاتھوں گھر برباد کرنے والے	343	احکام و شرائع اور تلقینات
343	کس کی یاد منائیں؟	343	اللہ کی بے پایاں رحمت
343	قرآن حکیم کا درس حکمت	344	جزئیات مسائل
344	خدا کے پاک رسول ﷺ	345	بنیادی امر
345	حضرت موسیٰ علیہ السلام	346	عظیم ترین محسن انسانیت
346	حضرت عیسیٰ علیہ السلام	346	اسوۂ محمدی
346	مسیحی قومیں اور تعلیم مسیح	347	احتساب
347	مسیحیت کی حکمرانی	348	ہمارا سرمایہ فخر
348	آریائی نسل کی دعوتیں	348	اسوۂ حسنہ
348	نجات و تسکین کا واحد پیام	349	آیات و احادیث
349	کرہ ارض کے لیے آفتاب ہدایت	350	اصلاح نفس
350	جہانوں کے لیے رحمت	351	غرور و تکبر کا سرچشمہ
351	رب العالمین اور رحمتہ للعالمین	351	احتساب قبیلہ و خاندان
351	آفتاب توحید و ہدایت	352	صدقے سے اجتناب میں اہتمام
352	عالمگیر اخوت و اتحاد	352	احتساب قوم
352	صرف ایک رشتہ	353	عقائد کی درستی
353	مقام محمود	354	مسئلہ قضا و قدر
354	انسانی عظمت کی انتہا	354	چاند سورج کا گہن
354	زبانوں کی ستائش اور روحوں کا احترام	354	عبادات
354	جامعیت افضلیت رسول اکرم ﷺ	355	نماز میں تخفیف کی تاکید
355	رب زدنی علما	355	خشوع فی الصلوٰۃ

375	رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ	368	جزئیات پر نظر
376	عالم دشمنوں سے سلوک	368	بدعت
376	ذاتی وفا سے عہد	368	پیدل چلنے کا حلف
376	مجاہدین کو وضیت	389	ٹنگے پاؤں چلنے کی منت
377	حضرت حبیب رضی اللہ عنہ کا واقعہ	390	کھڑے رہنا اور بات نہ کرنا
377	حدیبیہ کے بعد کا ایک واقعہ	390	ناک میں نکیل
377	احکام شریعت کے تین درجے	391	تشدد آمیز مذہبی اٹھنا
378	ذاتی انتقام کبھی نہ لیا	391	رسم و رواج کا انسداد
378	صحابہ رضی اللہ عنہ کا اتباع	392	میت کا ماتم
378	پابندی عہد کا کمال	392	حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کی شہادت
379	صلح حدیبیہ	393	حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت
379	ابو بصیر کا واقعہ	394	جنازے کے مراسم
379	ایک جمیعت کی فراہمی	394	عورتوں کی شرکت جنازہ
380	جنگ میں بھی عہد کی پابندی	395	فخر و غرور کی ممانعت
380	فراخ دلی اور فیاضی	395	اخلاقی اصلاح
380	صلح و امن	396	انسداد گداگری
381	اہل بخران سے معاہدہ	397	ایک انصاری کی مثال
381	اخلاقی نصائح	397	رشوت خوری
382	ایک قطبی کا واقعہ	397	نخیانت کا انسداد
382	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وصیت	398	حفظ الید و حفظ اللسان
383	فاتح اور پیغمبر کا فرق	398	مداحی اور عیش پروری کا انسداد
383	پیغمبر کا سفر	398	ضرورت سے زائد عمارت
383	سواری	399	آرائشی پردے
384	سفر سے واپسی	399	عفت و عصمت
384	فوج کی روانگی	400	ستر عورت کی تاکید
385	منزل پر نزول	400	اصلاح شئون النسائی
385	جہاد سے مراجعت	400	غیر محتاط لباس کی ممانعت
386	میدان جنگ میں خدا سے التجا	401	اصلاح ذات البین
386	میدان جنگ میں زخم	401	مرامعات ادب
386	بادشاہ اور پیغمبر کا فرق	402	اخلاقی احکام
387	مساوات	402	جنگ و صلح کی متضاد حالتیں

402	غلام اور آقا	417	وحدت دعوت
403	ایک یگانہ مثال	417	ایمان اور محبت
404	پیغمبر اسلام کی دعوت	417	قرآن مجید کے چار وصف
404	عالمگیر دعوت	418	اعلان ہی نہیں دلیل بھی
404	پیام زندگی	419	صراط مستقیم اور دین قیم
405	توحید	419	دین حق کے تین بنیادی اصول
405	بعض ضروری نکتے	419	دکھاوے کی خیرات
406	نبوت کی روشن ترین دلیل	420	محبت و ہمدردی کے تقاضے
407	پیغمبر اسلام کی صداقت	420	مومن اور امید و یقین
408	دین میں جبر نہیں	421	قبول حق کی استعداد
408	خدا پرستی اور نیک عملی	421	پیغمبر اسلام کی دعوت کی تین خصوصیتیں
409	ادامہ و نواہی	422	درخشاں حقائق
410	فرمانبرداروں کے نشان	422	تذکیر و توبہ کیل
411	ایمان والوں کے پانچ وصف	423	تذکیر و تبلیغ اور پسند و قبول
411	راہ حق کے پیشرو	423	خوف و حزن
411	طریق خیر و سعادت	424	عقل اور مادرائے عقل
412	نظم و فلاح میں اصل اصول	424	مرد عورت کی اخلاقی مساوات
412	مسلمانوں کے لیے اصل دین	425	قرآن کریم کی شہادت
412	قواموں بالقطر	426	صبر اور شکر
412	بنیادی دستور العمل	426	اکتساب مال اور انفاق مال
413	انسانی مساوات	427	بد عملی کا بڑا مرکز
413	دین کی اصل عظیم	428	فضیلت و کامرانی کے طریقے
414	ابراہیم علیہ السلام کی راہ	429	وفائے عہد اور قرآن
414	عمل کی کمائی	430	رسول اکرم ﷺ کی شانِ رافت و رحمت
414	دنیا پرستی کا غرور	431	پیام موعظت کی ضرورت
415	آخرت کی نجات	431	تاریخ انسانیت کے نوادر
415	حق و باطل کا معیار	432	”تذکرہ“ و ”بشیر“
415	مکرمین آخرت	433	رحمت و شفقت کا ابرگہر بار
416	مشکلیں اور آزمائشیں	433	ہدایت کے لیے لامتناہی تربیت
416	صبر و ثبات	434	غور طلب حقائق
417	مسلمانوں کا نصب العین	435	واقعہ طائف

436	عہد نبوی ﷺ کی جنگیں	436	رسول اللہ ﷺ کو نبی بنا کر بھیجنے کی حکمت
436	غزوات و سرایا	436	رسول اللہ ﷺ کے وقت میں ملک کی
437	مہموں کی نوعیت	437	حالت اور آپ نے اُسے کیسے بدلا؟
439	جانی نقصان	439	۱۔ رسول اللہ ﷺ کی شریعت کا اصل
439	باقاعدہ جنگیں	439	مول متہ کیا تھا؟
441	باقاعدہ جنگوں کے نقصانات	441	۲۔ رسول اللہ ﷺ نے دنیا کی اقوام تک
442	قاضی صاحب مرحوم کا نقشہ	442	دین حنیفی کی کیسے تبلیغ فرمائی؟
443	توجہ طلب حقیقت	443	۳۔ دین حنیفی کی دوسرے ادیان سے
445	تصویر کا دوسرا رخ	445	برتری
445	مرقع عبرت	445	۴۔ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے
446	دوسری عالمی جنگ	446	امام کا خطاب کیوں ملا؟
447	ربانی سیاست اور شیطانی سیاست	447	۵۔ حنیفی ملت کی اصلی روح
448	عالمی اصلاح و امن کی محکم بنیادیں	448	۶۔ یہودی اور عیسائی اگرچہ حنیفی ملت کی
448	عالمی اور بین الاقوامی زاویہ نگاہ	448	شاخیں ہیں لیکن انہوں نے اس کو پوری
449	بین الاقوامی امن کے تقاضے	449	تبلیغ نہیں کی۔
450	اکثریت کی بنیاد	450	۷۔ حنیفی ملت کی پوری پوری تبلیغ کون
450	دین میں کوئی جبر نہیں	450	کرے گا؟
452	عدل پر استواری	452	۸۔ عیسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی کہ حنیفی
454	نیکی میں تعاون بدی سے گریز	454	دین کی پوری تبلیغ رسول اللہ ﷺ کریں
454	انسان اور استبازی	454	گے۔
455	برائی کے جواب میں بھلائی	455	۹۔ رسول اللہ ﷺ کے نبی ہو کر آنے
456	عدل و احسان	456	کا اصلی مقصد
457	عہد ماضی کے مناقشات	457	۱۰۔ رسول اللہ ﷺ کا اپنے مقصد میں
458	بھائیوں کے درمیان مصالحت	458	کامیاب ہونا
459	موجبات اختلاف کا انسداد	459	۱۱۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کا خلاصہ
461	اشارات سیرت پیغمبر انقلاب ﷺ	461	۱۲۔ شعائر اللہ کی حقیقت
463	نبی کس کو کہتے ہیں؟	463	۱۳۔ عدالت کی وضاحت
463	اللہ والوں کے اقسام	463	۱۴۔ رسول اللہ کی کوئی بھی تعلیم انسانی
464	سب سے بڑا نبی کون ہے؟	464	فطری صفات کے خلاف نہیں
464	نبیوں کو انبیاء بنا کر کیوں بھیجا جاتا ہے؟	464	۱۵۔ انسان کی تشریح اور اس کے مختلف
			مقامات میں مختلف مرتبے اور اس کے

481	اچھے اعمال کا بیان	481	نبی اکرم ﷺ کی جماعت کی خوبی
484	۱۶۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کا خلاصہ:	484	تورات اور انجیل میں اس جماعت کا ذکر:
485	حزب اللہ کی تاسیس مکہ معظمہ میں	485	نبی اکرم ﷺ بطور معلم اور نذیر
486	حزب اللہ مدینہ منورہ میں	486	خدا کی محبت کی معنی
486	منافقین سے مقابلہ	486	سیدھی راہ
486	کیا اسلامی جنگ مدافعت ہے؟	486	اب انقلاب عمومی حضرت محمد ی کی
487	اسلام اور جنگ:	487	اتباع سے آسکتا ہے
488	قومی انقلاب کی دعوت	488	الزلزل کے دوسرے معنی: امام ائمہ انقلاب
488	نبی اکرم ﷺ کی دو حیثیتیں:	488	یہ بار کیا ہے؟: قومی اور بین الاقوامی
489	بین الاقوامی درجہ	489	انقلاب
490	حنفییت عالمی تحریک ہے:	490	مدثر کے معنی
490	دینی اور سیاسی تحریک میں فرق:	490	نبی اکرم ﷺ کی سیرت پر ایک نکتہ:
491	دین کو سیاست کی ضرورت:	491	اسلام کا جامع انقلاب:
493	مقام نبوت	493	انقلاب میں اشاعت کی ضرورت:
495	نبی اکرم ﷺ کی اجتماعی حیثیت	495	حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مثال:
496	مشورہ کرنا آنحضرت ﷺ کے لئے	496	فرعونی ملوکیت کا خاتمہ:
496	ضروری تھا	496	چھٹی صدی عیسوی کے فراعنہ: کسریٰ اور
497	مشاورت کی اہمیت:	497	قیصر
498	صحابی سے کون مراد ہیں؟:	498	انقلاب کے لئے تدبیر الہی کے طریقے:
499	رسول اللہ ﷺ کی یاری کی ضرورت	499	کسریٰ و قیصر اور ان کے قمع میں قریش کو
500	رسول اللہ ﷺ کے ذوی القربی کون ہیں؟:	500	انذار:
501	رسول اللہ ﷺ کے نسبی قربی	501	اس پیشگوئی کی تصدیق:
501	نسبی قربی کسی ترجیحی حق کے مستحق نہیں:	501	انقلاب کا مطالعہ کرنے کی ضرورت:
502	مودۃ فی القربی کا اصل مفہوم	502	سورہ فتح کا مرکزی واقعہ
502	یعنی رسول اللہ ﷺ کے تین قسم کے	502	صلح کا نتیجہ ادائرہ
502	ذوی القربی:	502	*
503	رسول اللہ ﷺ کی صحیح پوزیشن	503	

مقدمہ

مطالعہ سیرت کے تقاضے

پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت پر مختلف زبانوں میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر مسلم اہل علم کی لکھی ہوئی ان کتابوں کے مطالعے کے بعد عمومی طور پر ایک بات محسوس ہوتی ہے، وہ یہ کہ یہ کتابیں زیادہ تر تقدس کے جذبے کے تحت لکھی گئی ہیں۔ یہ طریقہ عقیدت مندانہ مطالعہ کے اعتبار سے اہم ہو سکتا ہے مگر اس طرز پر لکھی گئی کتابوں کی وہ اہمیت نہیں ہوتی جو علمی انداز سے قلمبند ہونے والی کتابوں کی ہوتی ہے۔

نبی کریم ﷺ کی سیرت سے دلچسپی محض حصول ثواب کی خاطر ہو تو ایسی کتابوں سے ممکن ہے یہ مقصد حاصل ہو جائے لیکن انسانیت کی ہدایت و ترقی کے لیے خیر امت کی ذمہ داری اس طرح کسی بھی صورت میں سرانجام نہیں دی جاسکتی۔ اس قسم کی مدحیہ تحریروں میں قاری کو صرف افتخار یا تقدیس کی غذا ملتی ہے، لیکن وہ رہنمائی نہیں ملتی جس کو قرآن میں اُسُوۃً حَسَنَةً (الاحزاب۔ ۱۲) کہا گیا ہے۔ اسی رہنمائی کے نتیجے میں مسلمانوں سے لِيُظْهِرُوا عَلَى الدِّينِ كَلِمَہ (توبہ۔ ۳۳) کا وعدہ کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کی گزشتہ ایک ہزار سالہ تاریخ غلبہ اسلام کے بجائے غلامیوں اور حزیمتوں کی ایک نہ ختم ہونے والی داستان بنی ہوئی ہے۔ اس صورت حال کی وجوہات کے بارے میں امت کے اکثر روشن فکر ارباب علم اس بات پر متفق رہے ہیں کہ ایک تو قرآن حکیم کی تعلیمات توحید سے روگردانی کی گئی ہے اور دوسرا پیغمبر اسلام کی بعثت کے اصل مقاصد اور طریقہ نبوت سے انحراف کر کے رسمی مذہبیت اور جھوٹی تقدیس کو دین بنادیا گیا ہے۔

سیرت کی زیادہ تر کتابیں مقاصد نبوت کو پیش نظر رکھنے کے بجائے برکت کے حصول کے جذبے سے ہی لکھی گئی ہیں۔ اس حوالے سے مولانا وحید الدین خان نے اپنی کتاب ”سیرت کا مطالعہ“ میں سیرت کے موضوع پر اک مشہور مصنف کی کتاب ”السيرة النبوية“ کا حوالہ دیا ہے جس کے مقدمے میں صاحب کتاب لکھتے ہیں کہ:

”مولف کو معلوم تھا کہ سیرت کے موضوع پر لکھنے والوں نے بہت سی اہم کتابیں لکھی ہیں۔ مگر مولف نے اس کو اپنی سعادت سمجھا کہ وہ سیرت کے عظیم موضوع پر ایک نئی کتاب لکھے اور

اس طرح وہ سیرت نگاروں کی اس نورانی لڑی میں شامل ہو جائے:

وكان يرى السعادة في تاليف كتاب جديد في السيرة النبوية لينخرط في سلك المؤلفين

النوراني في هذا الموضوع الحبيب الجليل۔ (صفحہ 10)

ظاہر ہے کہ یہ مطالعے کا کوئی علمی طریقہ نہیں۔ اس طرز مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیرت کا موضوع مسلمانوں کے درمیان علمی و فکری ارتقا کا ذریعہ نہ بن سکا۔ وہ صرف عقیدت مندانہ جذبات کی تسکین یا فخر و مباہات کے اظہار کا ذریعہ بن کر رہ گیا۔

موجودہ زمانے میں سیرت کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ زیادہ تر اسی نوعیت کی ہیں۔ وہ مسلمانوں کے لیے کتاب فخر تو ضرور ہیں، مگر وہ حقیقی معنوں میں ان کے لیے کتاب اسوہ یا کتاب رہنمائی نہیں۔

ہمارے سیرت نگار جب سیرت کے موضوع پر لکھتے ہیں تو وہ اکثر ایسا کرتے ہیں کہ بعثت سے قبل عرب کی حالت کی نہایت تاریک تصویر پیش کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ بعثت سے قبل سارا عرب تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اخلاقی اعتبار سے لوگ وحشی بنے ہوئے تھے۔ درجنوں عورتوں سے نکاح کر کے ان کو اپنے گھر میں رکھ لیا کرتے تھے۔ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کی باتیں پیغمبر اسلام ﷺ کے کارنامے کو نمایاں کرنے کے لیے لکھی جاتی ہیں۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ جب تک عربوں کو آخری حد تک برا ثابت نہ کیا جائے، پیغمبر اسلام ﷺ کی عظمت ظاہر نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ نہ صرف تاریخی حقائق کے خلاف ہے بلکہ خود قرآن و حدیث کے بھی خلاف ہے۔

اس طرح کی باتوں کا نقصان یہ ہے کہ مسلمانوں میں علمی نقطہ نظر پیدا نہ ہو سکا۔ مسلمان حقیقت پسند قوم بننے کے بجائے پر اسرار خیالات میں جینے والی ایک قوم بن گئے۔ کسی بھی حقیقت کو علمی اور تاریخی حیثیت سے سمجھنا ان کے لیے ممکن نہ رہا۔ ان کے اکابر تک کا یہ حال ہے کہ وہ صرف پر اسرار اصطلاحوں میں سوچنا جانتے ہیں۔ سائنٹفک اصطلاحوں میں سوچنا ان کے لیے ممکن ہی نہیں۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام ﷺ کو بہترین لوگوں میں پیدا کیا اس کی مزید تفصیل روایات میں آئی ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ: اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا پھر مجھ کو بہترین انسانوں میں اٹھایا (ان الله خلق الخلق فجعلني في خير خلقه)

(تفسیر ابن کثیر ۱/۲۳۷)

اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ جن عربوں کے اندر مبعوث کیے گئے وہ اخلاق و کردار کے اعتبار سے پوری دنیا میں سب سے بہتر لوگ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی

لیے یہ ممکن ہوا کہ آپ ایک ایسا انقلاب لائیں جس کی نظیر تاریخ میں موجود نہیں۔ اگر عرب کے یہ لوگ ویسے ہی برے ہوتے جیسا کہ ہماری کتابوں میں بتایا جاتا ہے تو اصحاب رسول کی وہ اعلیٰ ٹیم ہی نہ بنتی جس کو قرآن میں خیر امت کہا گیا ہے (آل عمران- ۱۱۰) اور جس کی وجہ سے دین توحید کی عظیم تاریخ وجود میں آئی۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف حدیث کے ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: **خياركم في الجاهلية خياركم في الاسلام اذا فقهوا** (فتح الباری ۶/۷۷۴)

اخلاق و کردار کے حوالے سے تاریخ اسلام کا یہ واقعہ اس تمام مبالغے کو رد کرنے کے لئے کافی ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے جب ہر قل شہنشاہ روم کو اسلام کی دعوت کا خط لکھا تو وہ خط سے متاثر ہوا اور اس نے ابوسفیان کو بلایا جو اس وقت شام میں مکہ کے ایک تجارتی کارواں کی قیادت کر رہا تھا۔ ہر قل اور ابوسفیان کے درمیان پیغمبر اسلام ﷺ کے متعلق جو مکالمہ ہوا وہ سیرت کی تمام کتابوں میں موجود ہے۔ اگرچہ اس وقت ابوسفیان پیغمبر اسلام ﷺ کا سخت ترین دشمن تھا لیکن یہ ان کی اخلاقی کردار کی بڑائی تھی کہ وہ اس دشمنی کے باوجود رسول اللہ ﷺ اور ان کی تحریک کے متعلق پوچھے گئے تمام سوالوں کے جوابات ٹھیک ٹھیک دے رہا تھا۔

تمدنی طور پر حقائق کو دیکھا جائے تو عربوں کے ہاں مکہ کی شہری ریاست تمام ضروری منظمات کے ساتھ موجود تھی جس میں عدالتی، فوجی اور انتظامی امور کا نظام قائم تھا، تاہم اس میں افراط و تفریط اور طبقاتی تضاد بہر حال موجود تھا جو ایک بڑی تبدیلی کا خواہاں تھا۔

مطالعہ سیرت کے مذکورہ اسلوب نے پورے معاملے کو غیر علمی بنادیا۔ مثلاً ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ بعثت سے پہلے عرب کے لوگ درجنوں کی تعداد میں بیویاں رکھتے تھے۔ دوسری طرف انھیں کتابوں میں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ عرب اپنی لڑکیوں کو پیدا ہونے کے بعد مار ڈالتے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ جس سماج میں لڑکیاں زندہ درگور کی جارہی ہوں وہاں عورتیں اتنی زیادہ تعداد میں کیسے پائی جائیں گی کہ لوگوں کو یہ موقع ملے کہ وہ لامحدود تعداد میں اپنے گھروں میں عورتیں رکھ لیں؟

اگر واقعہ یہ ہے کہ زیادہ تعداد میں نکاح کرنے کا رواج صرف کچھ سرداروں میں تھا، نہ کہ عام عربوں میں۔ اور یہ سردار بھی یہ عمل اس لیے کرتے تھے کہ مختلف قبائل سے رشتہ داریاں قائم کر کے انھیں اپنی سرداری کے تحت متحد کر سکیں۔ اسی رواج کو پیغمبر اسلام ﷺ نے بھی اسلام کے حق میں استعمال کیا۔ آپ نے بھی مختلف قبائل کی خواتین کو اپنے نکاح میں لیا تاکہ ان قبائل کو جنگ کے بغیر اسلام کا حامی بنا سکیں۔

جہاں تک لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کا معاملہ ہے تو وہ صرف استثنائی طور پر بعض غریب قبائل میں تھا۔ عام عرب اس کو سخت معیوب سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ غریب خاندانوں کی مالی مدد

کرتے تھے تاکہ وہ اس وحشیانہ رسم سے باز رہیں۔ ایک ہی صحابی کے حوالے سے یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ قتل از اسلام اپنی بیٹی زندہ درگور کرنے پر، بہت درد اور کرب میں مبتلا رہتا تھا اور تادم مرگ اس درد میں روتا رہا۔

علمی مطالعے کے بجائے عقیدت مندانہ مطالعے سے یہ نقصان ہوا کہ ہمارے سیرت نگار بہت سی ایسی حقیقتوں کو دریافت نہ کر سکے جو قرآن میں صراحتاً مذکور تھیں۔ ان میں سے ایک معجزہ نبی کا مسئلہ ہے۔ ہمارے سیرت نگار عام طور پر کثرت سے پیغمبر اسلام ﷺ کے معجزات کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر یہ پورا تصور قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کو اس قسم کے معجزے نہیں دیے گئے جو پچھلے پیغمبروں کو دیے گئے تھے۔

پیغمبر اسلام ﷺ سے آپ کے مخالفین یہ مطالبہ کرتے تھے کہ اگر تم پیغمبر ہو تو دوسرے نبیوں جیسا حسی معجزہ ہمیں دکھاؤ۔ پیغمبر اسلام ﷺ لوگوں کی ہدایت کی امید میں یہ چاہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا کوئی معجزہ ظاہر کیا جائے۔ مگر قرآن میں آپ کی اس خواہش کو رد کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا: ”اور اگر ان کی بے رخی تم پر گراں گزر رہی ہے تو اگر تم ایسا کر سکتے ہو تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے لیے کوئی نشانی (معجزہ) لے آؤ۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ پس تم نادانوں میں سے نہ بنو۔“ (الانعام- ۳۵)

دوسری جگہ قرآن میں اس مستقل پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے کہ پچھلے پیغمبروں کے برعکس، پیغمبر آخر الزماں کو حسی معجزے نہیں دیے جائیں گے۔ قرآن کی درج ذیل آیت اس حوالے سے حتمی بیان کا درجہ رکھتی ہے:

وَمَا مَنَعَنَا أَنْ نُرْسِلَ بِالْآيَاتِ إِلَّا أَنْ كَذَّبَ بِهَا الْأَوَّلُونَ وَآتَيْنَا ثَمُودَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوا بِهَا وَمَا نُرْسِلُ بِالْآيَاتِ إِلَّا تَخْوِيفًا (نہی اسرائیل ۵۹)

”اور ہم کو نشانیاں (معجزے) بھیجنے سے نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ ان لوگوں نے ان کو جھٹلایا۔ اور ہم نے ثمود کو اونٹنی دی ان کو سمجھانے کے لیے۔ پھر انھوں نے اس پر ظلم کیا۔ اور نشانیاں ہم صرف ڈرانے کے لیے بھیجتے ہیں۔“

ہمارے ہاں جو غیر علمی رویہ اختیار کیا گیا اس کے پس منظر میں غالباً یہ نفسیاتی رویہ کار فرما رہا ہے کہ اگر ہم یہ مان لیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ کو حسی معجزے نہیں دیے گئے تو وہ پچھلے انبیاء کے مقابلہ میں کچھ کم ہو جائیں گے۔ اس لیے غیر واقعی طور پر انھوں نے آپ ﷺ کی ذات کے ساتھ بہت سے معجزے وابستہ کر دیے۔ حالانکہ قرآن میں صراحتاً اس کی تردید موجود تھی۔

خود حدیث میں بھی اس کی صراحت موجود ہے کہ آپ کو اس قسم کے معجزے نہیں دیے گئے جس طرح کے معجزے پچھلے نبیوں کو دیے گئے تھے۔ اس سلسلے میں صحیح بخاری کی یہ حدیث

قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”نبیوں میں سے ہر نبی کو ایسی نشانی دی گئی جس کو اس زمانے کے لوگ مانتے تھے۔ اور مجھ کو وحی (قرآن) کا معجزہ دیا گیا۔ اس لیے میں امید کرتا ہوں کہ قیامت میں مجھ پر ایمان لانے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی۔“

ما من الانبياء نبى الا اعطى من الايات ما مثله امن عليه البشر، و انما كان الذى اوتيته وحيًا اوحاه الله الى فارحان اكون اكثرهم تابعًا يوم القيامة (فتح الباری ۸/۶۱۹)

اصل یہ ہے کہ جن واقعات کو پیغمبر اسلام ﷺ کے معجزات کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ وہ سب نصرت کے واقعات ہیں جو ہر مومن کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ اور وہ پیغمبر اسلام کو زیادہ اعلیٰ اور افضل صورت میں دیے گئے۔ معجزہ ایک ایسے خارجی عادت واقعہ کا نام ہے جو مخاطبین کے مطالبے پر پیش کیا گیا ہو۔ مثلاً عصاء موسیٰ کا معجزہ۔ مگر اس نوعیت کا کوئی معجزاتی واقعہ پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی میں ثابت نہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت کو سمجھنے میں دوسری بڑی رکاوٹ محسن انسانیت ﷺ کو ایک ایسے مذہبی رہنما کا درجہ دینا بھی ہے جس کے مطابق حضور ﷺ بس چند اعتقادات، چند رسوم و عبادات، چند اوراد و وظائف، چند اخلاقی سفارشات اور چند فقہی احکام پہنچانے آئے تھے اور آپ کا منشا ایسے افراد پیدا کرنا تھا جو شخصی طور پر معاشرے کی عام خامیوں اور گندگیوں سے مبرا ہوں اور ایسے لوگ طہارت، نماز، روزہ، نوافل و اذکار کے پابند ہوں۔ علاوہ ازیں یہ لوگ انفرادی اخلاقی حد تک اپنے اندر سنت رسول ﷺ پر قائم رہنے والے ہوں۔ سنت کے اسی محدود اتباع کے نتیجے میں خیر امت کے طور پر انسانیت کے لیے وہ تحریک اور اس کی سرگرمی پیدا ہی نہیں ہو سکی جو دنیا کے عظیم عملی انسان کے پیروکاروں کا وتیرہ ہونا چاہیے۔

اسی طرح پیغمبر اسلام ﷺ انسانیت کی ہدایت و نجات کیلئے جس طرح سرگرداں اور سرگرم رہتے تھے تا آنکہ جبریل آکر کہتا تھا کہ ”اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالو گے کیا؟ آپ ﷺ نے اس طرح خود کو اپنے مقصد کی تکمیل میں مصروف کر لیا تھا اور وہ استغناء اختیار کیا کہ تین تین دن تک گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا۔ یہ ساری باتیں ہمارے لیے اتباع سنت کا مواد نہیں ہیں۔ ان کی جگہ پر مخصوص لباس جس میں مسواک کی جیب بھی لازمی لگی ہوئی ہو ہمارے لیے سنت کے اتباع کا بہت بڑا منہاج بن گیا ہے!

سیرت نبوی ﷺ کو سمجھنے میں تیسرا اہم پہلو قرآن کی فکری تعلیم کو نظر انداز کرنا ہے۔ قرآن کی اس بنیادی تعلیم کو یکسر نظر انداز کیا گیا ہے کہ اسلام معاشرے کی طبقاتی فحش کو تبدیل کر کے توحیدی معاشرہ قائم کرنے والی انقلابی تحریک تھی، اور پیغمبر اسلام ﷺ نے اس تحریک کو ایسی

بنیادوں پر ایسا استحکام عطا کیا کہ معاشرے کی طبقاتی فحش آئندہ کی تمام انسانیت کیلئے مذموم قرار پائی۔ انسانوں کی اجتماعی زندگی، تمدن اور معاشرے کی ایسی تشکیل جس میں تمام انسانی غلامیوں کا خاتمہ، نیکی، عدل و انصاف، اور تمام انسانوں کو رزق کے وسائل مہیا کرنا انسانوں کی مشترکہ ذمہ داری ہو، یہ تمام کام نبوت کے مقاصد سے خارج کر دیے گئے ہیں۔ بنیادی انسانی حقوق، امن و آشتی اور سماجی انصاف کے ذریعے افراد کے انسانی جوہر کی ترقی اور کامرانی کے ذرائع جن سے انسانیت حَسَنَةُ الدُّنْيَا کے ذریعہ حَسَنَةُ الْآخِرَةِ (بقرہ ۲۰۱) سے بھی بہرہ یاب ہو سکے آج ہمارے ہاں دین کے کام کا حصہ نہیں رہے اور صرف سیکولر لوگوں کے کرنے کے لیے چھوڑ دیے گئے ہیں۔ قرآن میں پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات اور مشن کو نہایت پر عظمت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (الانبیاء ۱۰۷)

یعنی ”ہم نے تم کو سارے عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔“

اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ اپنے مشن کے ذریعے ایک ایسا کارنامہ انجام دیں گے جو دنیا کے تمام انسانوں کے لیے رحمت کا سبب بن جائے۔ لیکن سیرت نگاروں نے سیرت کے حوالہ سے اس رحمت کو بھی پیغمبر ﷺ کے قائم کردہ نظام کے بجائے ان کے معجزات میں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے مشن کے بارے میں قرآن حکیم نے صاف کہا ہے کہ:

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَیْغً مُّضِلِّينَ (آل عمران ۱۶۳)

”بلاشبہ یہ اللہ کا مومنوں پر بڑا ہی احسان تھا کہ اس نے ایک رسول ان میں بھیج دیا جو انھیں میں سے ہے۔ وہ اللہ کی آیتیں سناتا ہے، ہر طرح کی برائیوں سے پاک کرتا ہے اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے (اس نے ہدایت کی راہ ان پر کھول دی) حالانکہ اس سے پہلے گمراہی میں مبتلا تھے۔“

تعلیمات قرآن کے ذریعے انسان کی سر بلندی، انسان کا تزکیہ و شخصی ارتقا اور حکمت کے ذریعے تعمیر و تسخیر کائنات نبوت کے مقاصد قرار دیے گئے۔ پھر ان مقاصد کی تکمیل کے لیے ایک برتر نظام کے ساتھ جماعت کی تشکیل / پارٹی ڈسپلن اور اس کی خوبیاں قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمائیں:

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (فتح ۲۹)

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ منکروں پر سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔“

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (فتح ۲۹)

”اسی نے اپنے رسول کو بھیجا ہے ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ اس کو سارے دین پر غالب کر دے خواہ یہ مشرکین کو کتنا ہی ناگوار ہو۔“

قرآن کی ان آیتوں کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت کوئی سادہ بات نہ تھی۔ وہ ایک عظیم انقلابی منصوبہ تھا۔ آپ کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کو ایک عظیم واقعہ ظہور میں لانا تھا، ایک ایسا واقعہ جو پوری انسانی تاریخ کے رخ کو بدل دے۔ لیکن سیرت کی عام کتابیں پیغمبر کے اس عظیم کارنامے کی تصویر نظر نہیں آتیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے خدا کے ایک جلیل القدر پیغمبر اور ایک عظیم رہنما کی حیثیت میں اپنے دور کی تمام انسانی غلامیوں کا خاتمہ کر کے، توحید کی بنیاد پر ایک نئے عالمی نظام کو ایک منظم جماعت کی تشکیل سے نہ صرف جزیرۃ العرب میں غالب کیا بلکہ اس وقت کی دو بڑی غاصب سلطنتوں قیصر و کسریٰ کے نظام استبداد کی ہلاکت کی بنیادیں ڈال دیں۔ اس کے بعد انسانی حقوق، آزادی، جمہوریت، مساوات اور انسانی اور فلاح و سعادت کا ایسا دور شروع ہوا جس سے پوری انسانیت پیغمبر اسلام ﷺ کی رحمتہ للعالمین سے فیضیاب ہوتی رہی۔ اب یہ فلاح و سعادت صرف انسانوں کی اس زمینی حیات سے تعلق نہیں رکھتی تھی بلکہ اسی زمینی حیات کے افعال و اعمال پر معاد (آخرت) اور مستقل حیات کی فلاح و سعادت منحصر ہوئی۔ اور اسی سے امر خیر اور حسن عمل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کی دائمی سعادت کی زندگی بھی انسانوں پر آشکار ہوئی۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی اسی سیرت طیبہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے لیے زندگی کا بہتر نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ ختم نبوت کے بعد لیٹمبرہ علی الدین کلمہ کی ذمہ داری اب خیر امت پر ہے جو اسی اسوۂ حسنہ پر مذکورہ ذمہ داری کو سرانجام دے گی۔ اگر یہ امت انھی مقاصد اور منشاء خداوندی کے تحت یہ کام سرانجام نہیں دے گی تو طرح طرح کے امراض قلوب ان کی زندگی کو مستقل روگ بنادیں گے۔ ہم مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ تاریخ اس قسم کے روگ اور دکھوں سے بھری پڑی ہے۔ ہم نے ان امراض کی مسیحا فضائل میں بھی تلاش کی ہے، اور اوراد و وظائف میں بھی، صلوٰۃ و سلام سے بھی مدد اچا چاہا ہے اور ختم بخاری سے بھی۔ زندگیوں کو پار سائی کے مخصوص قالب دینے کی کوششیں بھی کی ہیں اور اپنی پسند کی فرمانبرداریوں کے جالے بھی بنے ہیں۔ لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود ہمارے فرمانبرداری کے معیار ہماری سمت کو درست نہیں کر سکے ہیں۔ یہ سب کوششیں ہمیں محمد رسول اللہ ﷺ کی جماعت کا وَ الْاٰذِنَتِ مَعَهُ، (الفق-۲۹) نہیں بتا سکی ہیں۔ اسوۂ حسنہ کے مطابق اس عمل صالح کی توفیق نہیں دے سکیں جو ہماری مغفرت اور اجر عظیم یعنی ہماری نجات اور کامرانی کا باعث بن سکے۔

ہماری نجات اور کامرانی کا صرف یہی حل ہے کہ ہم قرآن کو مطلوب اسوۂ حسنہ کے مطابق

زندگی جیسی یہ وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے ہماری انفرادی اور ملی زندگی کے راستے ہم پر آسان ہو جائیں گے۔ سچ کہا ہے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے کہ:

”اسلام کا دائرہ معجزہ اور ہیبت کی جگہ اللہ البالغہ قرآن کے بعد اگر کوئی چیز ہے تو وہ صاحب قرآن کی سیرت ہے۔ اور جب تک دنیا باقی ہے صاحب قرآن کی سیرت و حیات مقدس کے مطالعے سے بڑھ کر نوع انسانی کے تمام امراض و علل ارواح کا اور کوئی علاج نہیں۔“ (رسول رحمت ص ۱۳)

قرآن حکیم کی بتائی ہوئی پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت کے تین مرکزی نکات مثالی کردار، عظیم پیغام اور جہد و استقامت اس طرح نکلوں بنے ہوئے ہیں کہ اس کا ہر کونہ اپنی ہیبت کو ضیاء عطا کر رہا ہے۔ ان تینوں کونوں سے ہی اسلامی انقلاب کی عظیم تشکیل کا رنگ ساری انسانیت نے دیکھا۔ اس لیے سیرت کے مطالعے میں ان تینوں عنوانات کو سمجھنے کی بے حد ضرورت ہے۔

مثالی کردار

داؤد بن حصین کا بیان ہے کہ عرب کے لوگ عام طور پر یہ کہتے سنے جاتے تھے کہ محمد بن عبد اللہ ﷺ اس شان سے جوان ہوئے کہ آپ اپنی قوم میں سب سے زیادہ بااخلاق، پڑوسیوں کی خبر گیری کرنے والے، حلیم و بردبار، صادق و امین، جھگڑے سے دور رہنے والے، فحش گوئی اور دشنام طرازی سے پرہیز کرنے والے تھے۔ اسی وجہ سے آپ کی قوم نے آپ کا نام ”الامین“ رکھا تھا۔ (خصائص کبریٰ جلد ۱ ص ۹۱)

شباب کی عمر کو پہنچے تو مکہ میں آنے والے مسافروں کی خبر گیری، مساکین کی امداد اور مظلوموں کی مدد کو اپنا شعار بنالیا۔ نوجوانوں کا ایک گروپ تشکیل دیا جو یہ کام مشنری اسپرٹ سے کرتے رہے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حکم بن خزام اس گروپ میں ساتھ تھے۔ فجار کی لڑائی کی وجہ سے سیکڑوں گھرانے برباد ہوئے اور ہر صوانہ کی پھیلی ہوئی تھی۔ اس صورت حال سے تنگ آکر کچھ خیر پسندوں نے اصلاح کی ایک تحریک شروع کی، آنحضرت ﷺ کے ایک چچا زبیر ابن عبد المطلب کے تحریک پر عربوں کا ایک کنونشن ”حلف الفضول“ کے نام سے منعقد ہوا۔ نوجوانوں کی طرف سے حضرت محمد ﷺ نے اس میں بھرپور کردار ادا کیا۔ چنانچہ یہ معاہدہ ہوا کہ ہم:

- (۱) ملک سے بد امنی دور کریں گے
- (۲) مسافروں کی حفاظت کیا کریں گے
- (۳) غریبوں کی امداد کریں گے
- (۴) مظلوم کی حمایت کریں گے
- (۵) کسی ظالم کو مکہ میں نہ رہنے دیں گے۔

متشدد قبائلی عصبیت کے سماج میں غریبوں کے معاشی استحکام کی منصوبہ بندی اور ہر مظلوم کی حمایت کا عہد خواہ مظلوم کوئی بھی ہو۔ یہ ایک غیر معمولی تحریک اصلاح اور نظام کی تبدیلی کی جستجو تھی۔ پیغمبر اسلام ﷺ اس معاہدے میں سرگرم شرکت پر ہمیشہ فخر کرتے رہے۔ اگرچہ عربوں کی انتقامی اور عصبی جاہلیت نے بعد میں اس معاہدے کو کالعدم قرار دے دیا جب خود حضور ﷺ کی مخالفت میں ظالم و مظلوم کا امتیاز بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ لیکن پیغمبر اسلام ﷺ نے اسلامی فکر سے عالم انسانیت کو جو مستقل اقدار عطا کیں اس سے ان قدروں کو انسانیت کے لیے دائمی ورثے کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

آنحضرت ﷺ ذریعہ معاش کے لئے قریش کے تجارتی سلسلہ میں شامل ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصے میں آپ کے حسن معاملہ اور دیانتداری کے ہر طرف چرچے ہونے لگے جس کی وجہ سے ہر شخص چاہتا تھا کہ اپنے کاروبار میں حضور ﷺ کو بھی شریک کرے۔ آپ کی شخصی دیانتداری اور حسن معاملہ کا وہ اعلیٰ معیار تھا جس کی بنا پر قوم نے متفقہ طور پر آپ ﷺ کو ”امین“ کا لقب دے دیا۔ قبل از نبوت روزانہ کی عام زندگی میں پیغمبر اسلام ﷺ کے جو معمولات تھے اس میں اپنے گرد موجود سماج کی اصلاح کے لیے فکر اور عملی کوششوں کی روداد پر تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں تمام تفصیل کے ساتھ واقعات مذکور نہیں ہیں۔ شاید قبل از نبوت کی پیغمبر اسلام کی بھرپور سماجی زندگی کو نبوت سے علاحدہ دنیوی کاموں میں شمار کر کے ان کو سیرت کی کتابوں کا حصہ بنانا ضروری نہ سمجھا گیا ہو۔ لیکن اس کے باوجود سیرت کی کتابوں میں جمع شدہ واقعات کا بغور مطالعہ کرنے سے پیغمبر اسلام ﷺ کی اس متحرک سماجی زندگی کا بھی ایک واضح عکس ابھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

مثلاً پہلی وحی کی آمد کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ جب اضطراب کی حالت میں گھر پر تشریف لائے تو بی بی خدیجہ الکبریٰ نے اطمینان دلاتے ہوئے جن الفاظ میں شہادت دی تھی، تاریخ نے ان الفاظ کو سیرت کے کئی پہلوؤں کا مینار بنا دیا ہے۔ بی بی خدیجہ الکبریٰ کی شہادت ان الفاظ میں تھی:

”اللہ کی قسم! آپ کو اللہ تعالیٰ کبھی بے مدد نہیں چھوڑے گا۔ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، نادار لوگوں کو کما کر دیتے ہیں، ناتوانوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، اور جائز ضرورتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔“ (اریق المختوم ص ۹۹)

بی بی خدیجہ الکبریٰ کی پندرہ سالہ رفاقت کی یہ شہادت پیغمبر اسلام ﷺ کی قبل از نبوت سماجی زندگی کا جامع اور بھرپور تعارف ہے۔ آپ ﷺ اپنے سماج کو بدلنے، انسانی غلامیوں سے نجات دلانے اور دوسری طرف سماج میں اپنے ایک موثر عملی انسان دوست کردار سے سماج کی تبدیلی کے کام کا آغاز کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ یہی وہ عملی کردار تھا جس کو لیکر پیغمبر اسلام ﷺ

صفا کی پہاڑی پر کھڑے ہو کر مکہ کی آبادی کے لوگوں کے درمیان پیش کرتے ہیں کہ (میری چالیس سالہ زندگی کے کردار کی روشنی میں) بتاؤ۔ اگر میں یہ خبر دوں کہ پہاڑی کے پیچھے اک لشکر تمہاری تباہی کے لیے کھڑا ہے تو کیا تم مجھے سچا مانو گے؟ اس وقت تمام موجود لوگوں نے بیک آواز کہا تھا کہ ”ہاں! تم امین و صادق ہو ہم تمہاری بات سچ مانیں گے۔“ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس وقت دعوت الی اللہ کے لیے کسی معجزے کے بجائے اپنے کردار کو پیش کیا، حالانکہ صاحب نبوت کی حیثیت سے وہ کوئی بھی خرق عادت واقعہ رونما کر کے اپنی صداقت کا یقین و اعتقاد حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن چونکہ آپ ﷺ ایک نئے دور کو جنم دینے والے تھے جس میں کردار و عمل کی اصل اہمیت ہو گی، اس لیے اپنے اسی کمال معجزہ کے ساتھ صفا کی پہاڑی پر اعتماد کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور اپنے تمام دعوتی قبیعین کے لیے یہ مثال قائم کر دی کہ آنے والے دور میں انسانوں کے درمیان معجزوں اور کرامات کی بنیاد پر نہیں جانا ہو گا بلکہ انقلاب اور تبدیلی کے لیے وہی اشخاص انسانوں کے درمیان جاسکیں گے جن کے پاس عمل اور کردار کی ٹھوس بنیادیں ہوں گی۔ اور یہی عمل اور کردار ان کی کامرانیوں کا پیش خیمہ بنے گا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے اسی کردار کا قرآن مجید بھی اس طرح ساکھی بنا کہ نبوت ملنے کے بعد جب ہر طرف سے مخالفت کا جھوم اُٹھا، تو لوگ آتے اور آپ کے دعویٰ کا ثبوت طلب کرتے تو حضور ﷺ فرماتے کہ میں کہیں باہر سے نہیں آیا۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۱۶﴾ (یونس-۱۶)

”میں اس سے پہلے تمہارے درمیان ایک عمر بسر کر چکا ہوں، پھر کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟“ میں نے تمہارے درمیان اپنی عمر بسر کی ہے۔ کیا میری زندگی میری صداقت کی زندہ شہادت نہیں؟ کیا تم میری اس چالیس سالہ زندگی میں جس کا ایک ایک لمحہ تمہارے درمیان بسر ہوا ہے کوئی ایک واقعہ بھی ایسا پیش کر سکتے ہو جس سے میری صداقت کے متعلق ذرا شبہ گزرے؟ یہ چیلنج پوری قوم کو دیا گیا اور اس کے خلاف کسی نے ایک لفظ تک نہیں کہا۔ کسی کے آئینہ صفت ہونے کی اس سے بڑھ کر شہادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ دشمنوں کے جھوم میں خود بسر کی گئی زندگی کو اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش کیا جائے اور اس کے سامنے سب کی نگاہیں جھک جائیں۔

عظیم پیغام

پیغمبر اسلام ﷺ نے کسی اعتقاد، کسی نظریے اور کسی نقشہ فکر کے بغیر اصلاح و تعمیر کا کام یونہی شروع نہیں کر دیا۔ محض ایک مبہم جذبہ نہیں تھا، کوئی ذاتی ولولہ خام نہ تھا، بلکہ حضور ﷺ کون و مکان کی عظیم ترین سچائی کی مشعل لے کر اٹھے تھے۔ انتہائی حساس قلب کے ساتھ برسوں

حضور ﷺ نے زندگی کے رمز و معنی کو پانے کی جستجو کی تھی، غارِ حرا کی خلوتوں میں مدتوں اپنے اندرون کا بھی مطالعہ کیا اور بیرونی عالم پر بھی غور کیا۔ تمدن کے صلاح و فساد کے اصولوں کو سمجھنے میں بھی دماغ کھپایا، لیکن عملی اقدام اس وقت تک نہیں کیا جب تک علم الہی نے آپ کے قلب کو حقیقت سے منور نہیں کر دیا اور سب سے بڑی سچائی پوری طرح آپ کے سامنے بے نقاب نہیں ہو گئی۔ سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ کائنات کا ایک مالک ہے اور انسان اس کا بندہ ہے۔ یہ توحید کا مژدہ ایک نئے نظام کی بنیاد تھی۔ انسانی آزادیوں کا ایک ایسا اعلان کہ مکہ کے سردار، رئیس، دولتمند اور مذہبی پروہت اس اعلان سے بدک گئے۔ مکہ کے یہ طبقات تمام انسانوں کو ہر قسم کی غلامیوں سے نکال کر ایک اللہ کی بندگی اور غلامی میں لانے کے اس اعلان سے مشتعل ہو گئے۔ انھوں نے الوہیت کے حقوقِ خدائے واحد سے الگ کر کے اپنے درمیان بانٹ رکھے تھے۔ انسان کا اپنا نفس اور اس کی خواہشیں، خاندان اور برادری کی رسمیں، نسلی، قومی اور قبیلائی روایات، جاگیر دار اور برہمن طبقوں کی بالادستی، شاہی خاندانوں اور درباری اشرافیہ کی کبر پسندی (جس کو قرآن نے مُسْتَكْبِرِينَ (المومنون- ۶۷) کا نام دیا ہے)۔ یہ مختلف طبقے بر طبق الوہیتیں تھیں جن کے نیچے عام آدمی پس رہا تھا۔ عام لوگ غلامانہ انداز سے ان طبقات کی اتاؤں، مفادات، اور خواہشات کی تکمیل کے لیے کھڑے تھے۔

توحید ان تمام مروجہ الوہیتوں کے انکار کا پیغام تھا جو غلامی کی ان تمام بنیادوں کو جڑ سے اکھاڑ کر صرف اللہ تعالیٰ کی عبدیت کی نئی عمارت کھڑی کر رہا تھا۔

اہل مکہ توحید کے پیغام میں مضمر انسانی آزادیوں، حریت اور مساوات کی اس حقیقت کو بخوبی جانتے تھے اس لیے وہ صفا کی پہاڑی پر یہ پیغام سننے ہی سچ پا ہو گئے۔ اگر یہ پیغام محض چند عقائد و عبادات کے طریقہ کار پر مشتمل ہو تا یا انفرادی زندگی کے کچھ اصلاحی و اخلاقی طریقوں کا مجموعہ ہوتا تو اس پر اہل مکہ یہ ردِ عمل ظاہر نہ کرتے۔ کیونکہ ان کی اکثریت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا مورث اعلیٰ مانتی تھی۔ نماز، روزہ اور عبادت کا ایک سسٹم بھی ان کے ہاں موجود تھا اور عبادات کے اس سسٹم کی اصلاح ان کو اس انتہائی ردِ عمل تک نہیں لے جاتی کہ وہ مکہ کے ایک بااثر خاندان کے بے حد نیکوکار شخص کے قتل پر بھی آمادہ ہو گئے۔ اصل میں توحید کا پیغام تو ہمت اور غلامیوں اور طبقاتی تضاد کے پورے سانچ کی تبدیلی کا پیغام تھا اور اس کے لیے ان کا ردِ عمل بھی اس کے مطابق تھا۔

جب مُسْتَكْبِرِينَ اور مُتَّقِينَ (غاصب و آمر رؤسا اور دولتمند) طبقوں کی اقلیت احبار و رہبان یعنی مذہبی پیشہ ور طبقوں کے تعاون سے مُسْتَفْعَفِينَ یعنی کمزور اکثریت پر اپنے خدائی اختیار کی حد تک غاصب بنی ہوئی تھی تو اللہ تعالیٰ کی مشیت نے پیغمبر اسلام ﷺ کے ذریعے اسی طرح اس سانچ کو بدلنے کا ارادہ فرمایا جس طرح نمرود و فرعون اور قارون کے استبداد و غلامی سے انسانوں کی

آزادی کا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے نجات اور ہدایت کا بندوبست فرمایا تھا۔ قرآن میں پیغمبروں کے تاریخی پس منظر سے واضح ہو جاتا ہے کہ نبوت اور انبیاء کی بعثت کا مقصد دراصل غلام اور آقا پر مشتمل معاشرے کی ہیئتِ ترکیبی کو بدلنا تھا۔ یعنی توحید الہی کے نظریے کو عمرانی لحاظ سے معاشرے پر منطبق کرتے ہوئے متضاد معاشی طبقات کے معاشرے کو ختم کر کے توحید کی غیر طبقاتی معاشرہ قائم کرنا تھا، جو خوف یعنی جنگ و فساد اور بغاوتوں اور رھبران یعنی غربت، بھوک، ناداری، جہالت اور غلامی سے پاک معاشرہ ہو۔

توحید کا پیغام و اشکاف الفاظ میں یہ اعلان تھا کہ خدا کے سوا کسی کی عظمت مجھے تسلیم نہیں، کسی کی بالادستی قبول نہیں، کسی کا بنایا ہوا ضابطہ و قانون منظور نہیں، کسی کے حاصل کردہ فوق الانسانی حقوق جائز نہیں، کسی کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا جائے گا۔ کسی کی رضا جوئی اب نہیں کی جائے گی اور کسی کے اشارہ ابرو پر اب زندگی کا نظام نہیں چلے گا اور خدا کے سوا ہر دوسری خدائی توڑ دی جائے گی۔ سب انسان بنیادی انسانی حقوق میں یکساں ہو گئے۔ سب انسانوں کو اللہ کے عیال کی حیثیت حاصل ہوگی۔ سب کو ایک جیسا انصاف مہیا ہوگا۔ سب کی بنیادی انسانی ضرورتیں مساوی ہوں گی۔ فخر و کبر کی تمام روایتیں ختم ہوں گی۔ اب اکرام و عظمت کی بنیاد صرف اللہ تعالیٰ سے تعلق کی بنیاد پر ہوگی جو اس کے قوانین کا احترام کرے گا وہی محترم ہوگا۔ جو لوگ ان قوانین کے مطابق زندگی گزاریں گے، اپنی شخصی اور اجتماعی زندگی میں وہی لوگ فلاح پائیں گے۔

اس کے دوسرے جزیں یہ اقرار شامل تھا کہ انسانی ہدایت اور سانچ کی اصلاح کے لیے واحد ذریعہ وہ سلسلہ نبوت و رسالت ہے جو اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے۔ زندگی کا اصل علم وہ ہے جو وحی کے ذریعہ آیا ہے اور اسی سے عقلِ انسانی کو سوچنے کے رہنما اصول ملتے ہیں۔ اور محمد ﷺ اسی سلسلہ رسالت کی تکمیل فرمانے والے ہیں اور اب زندگی کی رہنمائی اسی ہستی کے واسطے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اب اسی رسول ﷺ کے اسوہ حسنہ پر توحید کے اسی مفہوم کے ساتھ یہ خیر امت انسانوں کو فلاح و کامرانی عطا کرنے کی ذمہ دار بنائی گئی ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے جس دین حق کی تعلیم دی اس کا مقصد صرف ظاہری عبادات و رسوم کی ادائیگی اور مساجد کی تزئین و آرائش کرنا نہیں تھا، بلکہ دنیا سے بلا لحاظ مذہب و ملت، جہالت، غربت و افلاس، قتل و غارتگری، جنسی آوارگی، شراب نوشی و قمار بازی، محنت کے استحصال، مذہب کے درمیان نفرت و جارحیت اور فساد و بدامنی کا خاتمہ کرنا تھا۔ اسلامی انقلاب ایک انٹرنیشنل تحریک تھی اور معاشرے کی اس تبدیلی کا مقصد یہ تھا کہ فرد اپنی مادی جسمانی ضروریات سے مطمئن ہو کر اپنا یقین اللہ پر قائم کرنے کے قابل ہو جائے۔ تاکہ وہ وعدہ کی گئی اپنی سعادت و راحت، فلاح و کامرانی کی ابدی زندگی کو پاسکے جہاں وہ خالق کائنات اللہ کی ذات سے راضی ہو اور اللہ اس سے راضی ہو۔

جہد و استقامت

جہد و استقامت پیغمبر اسلام ﷺ کی عملی زندگی کا تیسرا اہم معیار ہے۔ جس کام کو سرانجام دینے کا آپ نے بیڑہ اٹھایا اس کو جہد و سرگرمی کی انتہائی کوششوں سے کامیابی کی منزل تک پہنچایا۔ دعوت کے کام سے لے کر اسلامی انقلاب کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں کو ختم کرنے تک اور غار حرا کے پہلے پیغام سے لے کر زندگی کے آخری لمحے تک، ہر لمحہ اسی دعوت کی فکر تھی اور اسی دعوت کی تڑپ تھی۔ مکہ کی گلیوں میں رات دن ایک کر کے لوگوں تک اپنا پیغام پہنچانا، عکاظ کے میلوں کا گشت، طائف کے کوچہ و بازار میں خون آلود ہونا، بدر و حنین کے معرکے اور جزیرۃ العرب کو سلامتی کی آماجگاہ بنانا غرض ایک لمحہ سخت جہد و استقامت کا لمحہ ہے۔

مکہ میں دعوت کے ابتدائی دنوں میں صعوبتوں و آلام کی جو صورت حال تھی اور باوجود مخالف کا جھکڑ، سرکشوں اور مستبد قوتوں کا گھیراؤ ہر وقت زندگی کا چراغ گل کرنے کے درپے تھا۔ جب چچا ابوطالب نے اس گھیراؤ کو تنگ محسوس کیا اور بھیجتے کو توحید کے پیغام میں مصالحت کی پیش کی تو پیغمبر اسلام ﷺ کے پائے استقامت میں ذرہ برابر لغزش نہیں آئی۔ آپ نے واضح الفاظ میں فرمایا کہ:

”چچا جان! خدا کی قسم! اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں

چاند رکھ دیں کہ میں اس کام کو اس کی انتہا تک پہنچائے بغیر چھوڑ دوں، یہ ممکن نہیں۔“

توحید کی دعوت کے لیے قسم قسم کی صبر آزما اور جگر گداز داپوں سے گزرنا پڑا۔ یہ دعوت ہر طاغوتی مستبد قوت کے خلاف اعلان جنگ تھی۔ لیکن پیغمبر اسلام ﷺ ان سب کی مخالفت کا مقابلہ کرتے رہے۔ پھر اس کشمکش میں فریب کاریوں اور سوقيانہ جملہ بازیوں سے بھی احتراز نہیں کیا گیا۔ اس کے برعکس داعی حق و صداقت نے ان حملوں کے مقابلے میں اخلاق و شائستگی اور تہذیب و اصول پسندی کا دامن نہیں چھوڑا۔

مخالفین آپ کے کھلے دشمن تھے، اس لیے دنیا کے عام معیاروں کے مطابق، ان کے ساتھ آپ کا تعلق، انتقام اور عداوت کا تعلق ہونا چاہیے تھا۔ لیکن آپ ﷺ کا ان کے ساتھ تعلق اس قسم کا نہیں تھا۔ آپ کا ان کے ساتھ ایسا ہی تعلق تھا جیسے کسی طیب مشفق کا مریض سے ہو۔ آپ دیکھتے تھے کہ ان کی انسانیت مجروح ہو چکی ہے، اس لیے آپ چاہتے تھے کہ ان کا علاج ہو جائے۔ لیکن ان کی ضد اور سرکشی ایسا ہونے نہیں دیتی تھی۔ اس لیے وہ اس کے قریب نہیں آتے تھے۔ یہ طیب مشفق جانتا تھا کہ ان کا مرض انھیں کسی نہ کسی طرح ہلاکت و تباہی کی طرف کھینچے لیے جا رہا ہے۔ اس لیے ان کی ضد پر آپ کا دل کڑھتا تھا اور ان کی گمراہی کا غم آپ کو بے چین کیے دیتا تھا۔ قرآن اس کی شہادت ان الفاظ میں دیتا ہے:

وَلَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَكْتُمُونَ ﴿٤٠﴾ (النمل ٤٠)

”(اے پیغمبر!) ان کے اوپر غم نہ کھاؤ اور جو کچھ یہ لوگ خفیہ تدبیریں کرتے ہیں، ان کی وجہ سے دل میں تنگی محسوس نہ کرو۔“

پیغمبر اسلام ﷺ کو ان تکالیف سے زیادہ اپنے اس مشن کی کامیابی کی امید تھی جس میں انسانیت کو معرفت خداوندی کے ذریعے فلاح و کامرانی سے ہمکنار ہونا تھا۔ آپ ﷺ نے صحابہ کی ایک عظیم جماعت تشکیل دی جن کی منظم طاقت سے ایمان، دعوت و جہاد کی اعلیٰ حکمت عملیوں سے عظیم مقاصد حاصل کیے گئے۔ اور توحید کی عالمگیر ترویج و اشاعت کی راہ میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو ہٹا دیا گیا۔

انسانی آزادیوں اور مساوات کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے بیثباتی مدینہ کے ساتھ ایک ربانی سانچ وادی جمہوری حکومت کی بنیاد رکھی جس کے ذریعے قرآن حکیم کے انسانیت کی فلاح و کامرانی کے بتائے ہوئے اصولوں کو عملی شکل میں لا کر امن و آشتی اور فلاح و کامرانی کا مثالی نظام قائم کیا گیا۔ اس طرح پیغمبر اسلام ﷺ کی قائم کردہ جماعت کے ذریعے پوری انسانیت کو پیغام دیا گیا کہ آنے والوں ادوار میں استحصال و غلامی، ظلم و جبر اور آمریت کی بنیاد پر کوئی بھی نظام انسانیت کے لیے قابل قبول نہیں ہو گا۔

سیرت کے متذکرہ جامع پہلوؤں کی روشنی میں برصغیر کے اندر گزشتہ چند دہائیوں میں کسی قدر جو تحقیقی کام ہوا ہے، ان میں شیخ الاسلام مولانا محمد میاں کی کتاب ”محمد رسول اللہ۔ قرآن و تاریخ کے آئینے میں“، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب ”رسول رحمت“، مولانا پروفیسر محمد اجمل کی کتاب ”رسول عربی“، ڈاکٹر الطاف جاوید کی کتاب ”انقلاب مکہ، سیرت نبوی نزول قرآن کی روشنی میں“، مولانا وحید الدین کی کتاب ”پیغمبر انقلاب“ اور ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کی کتاب ”پیغمبر اعظم و آخر ﷺ“ اردو زبان کی قابل ذکر کتابیں ہیں۔ اس میں اوّل الذکر چار کتابیں مقاصد نبوت اور قرآنی فکر کا جامع علمی استفادہ ہیں اور آخر الذکر دونوں کتابیں طریقہ نبوت کا عمدہ بیان ہیں۔ موجودہ دور کے ان محققین کے لیے جو اسلام کے ربانی، سانچ وادی، انقلابی فکر سے آشنا ہیں، سیرت کے اساسی مآخذات کے ساتھ مذکورہ کتابیں ایک مبسوط جامع سیرت لکھنے کے بہتر عصری ماخذ ہیں۔ حال ہی میں کراچی میں قائم حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ میں قرآن حکیم کی اعلیٰ تعلیم کے کورسز کے لیے ایک جامع سیرت کی کتاب کی ضرورت پیش آئی تو شیخ الاسلام مولانا محمد میاں اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی سیرت پر تحقیق کی گئی دو کتابوں کے اختصار اور حکیم الاسلام مولانا عبید اللہ سندھی کی تفسیر سے اشارات سیرت کا انتخاب کر کے یہ ”جوامع السیرت ﷺ“ کتاب مرتب کی گئی ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ کے طلبہ کے علاوہ سیرت النبی کے

موضوع پر دیگر محققین و قارئین کے لیے بہتر استفادہ کا ذریعہ بنے گی۔ اور یہ کوشش اس روایت کی بنیاد بنے گی کہ سیرت النبی ﷺ کا مطالعہ صرف و محض برکت حاصل کرنے کا ذریعہ نہ سمجھا جائے بلکہ اس کی روشنی میں تبدیلی کے لیے اپنے کردار کا تعین کیا جائے اور اس ضمن میں اس سے رہنمائی حاصل کی جائے اور اس طرح اسلامی انقلاب کی اساس و استحکام کے فکری و عملی، اجتماعی طریقوں کا شعور پختہ کیا جائے۔ اس وقت اسلامی دنیا میں اسلامی تحریکیں جس اضطراب اور فکری کشاکش سے گزر رہی ہیں، ایسے میں پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت اور اسلامی انقلاب کی ربانی، سماج وادی بنیادیں ان تحریکوں کے لیے روشنی کے مینار ہیں۔ اگر اندھی تقلید اور روایتی عقیدوں کو ترک کر کے تبدیلی کے اسوہ حسنہ کو اختیار کیا جائے اور ایمان کے قرآنی معیار کو حاصل کیا جائے تو اسلام کی ترویج اشاعت اور فروغ کے امکانات روشن سے روشن تر ہو جائیں گے۔ اگر مسلمان بھٹکتی انسانیت کو اب بھی ربانی، سماج وادی نظام کی برکتوں سے فیضیاب کرنے کی ذمہ داری سے محروم رہتے ہیں تو یہ ان کی بد نصیبی ہوگی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ پوری انسانیت کے لیے بھی بڑے خسارے کی بات ہوگی اور پھر یاد رکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ ربّ کائنات اپنا کام روکتا نہیں بلکہ یَسْتَبْدِلُ قَوْمًا غَيْرَهُمْ (محمد: ۳۸) اس کا اصول ہے۔ وہ یہ کام کسی اور افراد اور ذریعے سے بھی کر سکتا ہے۔

ابوالفضل نور احمد

ڈائریکٹر

حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ

محمد رسول اللہ ﷺ

قرآن و تاریخ کے آئینے میں

(اختصار کے ساتھ)

محدث کبیر، مورخ اسلام، مجاہد ملت
حضرت مولانا سید محمد میاںؒ

مکہ

محل وقوع۔۔۔۔۔ اہمیت

دنیا کے وہ مقام جن کو بین الاقوامی تعلقات کے بارہ میں درمیانی کڑی (جکشن) کی حیثیت حاصل تھی مکہ ایسے ہی مقامات میں ایک ممتاز مقام تھا۔

مکہ شہر بعد میں آباد ہوا مگر اس کے محل وقوع کی یہ حیثیت اس وقت سے تھی جب سے ہند، سندھ، افغانستان، ایران، یمن اور شام کے ممالک تمدن سے آشنا ہوئے تھے اور ابن آدم کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں نے اجناس و مصنوعات کے تبادلہ کا سلسلہ ایجاد کیا تھا۔

عرب کا یہ صوبہ جس میں مکہ شہر ہے اس کو حجاز کہا جاتا ہے کیونکہ یہ صحراء اعظم کے ریگ و بالو اور دو سمندروں (بحر احمر و بحر قلزم) کی موجوں کے درمیان قدرتی آڑ^① (حجاب) ہے۔ حجاز نے بے شک سمندر کو صحراء عرب اور اس کے شمال مشرقی شہروں سے کئی سو میل دور ہٹا دیا، مگر سمندر کا یہ قدرتی احسان ہے کہ اس نے حجاز کے ساتھ علیحدگی پسندی کا سلوک نہیں کیا۔ بلکہ پہلے تو عربوں کو جہاز رانی سکھائی پھر ان کے جہازوں کو اپنے سینہ پر چڑھا کر نہ صرف یمن، سندھ، مصر، افریقہ اور ایران بلکہ دنیا کے مشرقی کناروں (جزائر شرق الہند) تک پہنچایا۔ حجاز جس کا قلب مکہ ہے اس کی یہی اہمیت تھی جسکی وجہ سے اس پر قبضہ کے لئے تین ہم عصر سلطنتوں میں رقابت چلی آئی تھی (رومی، ایرانی اور حبشی) یہ تینوں اس پر قبضہ کے خواہشمند رہیں۔

روایت ہے کہ سکندر ذوالقرنین نے ضروری خیال کیا تھا کہ اس شہر کے معبد ”خانہ کعبہ“ کی زیارت کرے^②۔ جدہ جو مکہ سے صرف پچاس میل کے فاصلہ پر حجاز کی بندرگاہ ہے جو فی زمانہ حجاج ہند کے استقبال کا عادی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب نوع انسان کا گلہ وجود و حیات کی پہلی منزل میں تھا تو جدہ نے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اہلیہ حترہ (حضرت حوا) کا استقبال بھی اسی شان سے کیا تھا

① حجاز کے معنی آڑ ہیں۔

② البدایہ والنہایہ ص ۵، ج ۲۔

جب وہ لنکاسے روانہ ہو کر ہندوستان سے گزرتے ہوئے سرزمین حجاز میں فروکش ہونے کے لئے مکہ جارہے تھے۔ جہاں انہوں نے پہلی بار خانہ کعبہ کی بنیاد رکھی۔ یہ کعبہ طوفان نوح میں اٹھایا گیا تھا پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کیا۔ (بحوالہ عہد زین جلد اول)

بنائے مکہ، بانی مکہ اور کعبہ

تقریباً ساڑھے چار ہزار سال پہلے کی بات ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شام سے آکر علاقہ حجاز کی ایک وادی غیر زرع (خجّر میدان) میں اپنے جگر گوشہ اسماعیل علیہ السلام کو آباد کیا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد خدا کے گھر کی مٹی ہوئی بنیادیں ابھاریں۔ اس خانہ خدا کا نام کعبہ ہے اور جو شہر یہاں آباد ہوا وہ مکہ ہے۔

اس نونہال (حضرت اسماعیل علیہ السلام) کے ساتھ صرف اس کی ماں تھی۔ وہی اس چشمہ کی مالک تھی جو یہاں ان کی سکونت کے ساتھ ساتھ^① برآمد ہوا تھا۔

یہ چشمہ برآمد ہوا تو ہاجرہ علیہا السلام سے اجازت لے کر یہاں قبیلہ جرہم^② بھی آباد ہو گیا تھا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام جو ان ہوئے تو ان کی شادی بھی اسی قبیلہ میں ہو گئی۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہوئی تو عرب قدیم میں ایک نئی نسل کا اضافہ ہو گیا جس کو عرب مستعربہ^③ اور بنو اسماعیل کہا گیا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام یہاں تنہا تھے۔ ایک ماں کے علاوہ نہ ان کا کوئی دادھیالی رشتہ دار تھا نہ نانھیالی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام خدا کے نبی تھے۔ نبی کی اخلاقی اور روحانی تربیت خود قدرت کی جانب سے ہوتی ہے اور نظر بظاہر حضرت ابراہیم علیہ السلام مربی تھے وہ یہاں آتے رہتے تھے۔ بنو جرہم سے ان کو سماجی راہ و رسم کی مدد ملی اور ادھر بنو جرہم پر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اخلاق کا یہ اثر ہوا کہ وہ

① ہندوستان کی جنتا برہم کو پوری عظمت کے ساتھ مانتی ہے۔ مگر یہ نہیں بتا سکتی کہ ”برہم“ کون تھے۔ کوئی انسان تھے تو کہاں کے رہنے والے تھے اور ان کا مذہب و مسلک کیا تھا۔ مگر بائبل برہام، اور ابراہام کو موجودہ نسل انسانی کا باعظمت انسان، توحید کا علم بردار اور ان مذہب کا ہادی اعظم مانتی ہے جو ابراہام، وحی اور نبوت رسالت کے قائل ہیں۔ قرآن حکیم نے بھی حضرت ابراہیم کو یہی حیثیت دی ہے۔

② حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لہنی بوی اور لخت جگر کو یہاں آباد کیا تو تھوڑے سے سکھو اور پانی کا ایک منگیزہ توشہ میں دیا تھا چند روز بعد پانی ختم ہو گیا ماں سے پہلے بچہ پیاس کی وجہ سے لب دم ہو گیا تو قدرتی طور پر ایک چشمہ برآمد ہو گیا اسی کا نام ”زمزم“ ہے جو اب خانہ کعبہ کے قریب کنویں کی شکل میں ہے۔

③ اس قبیلہ کا اصل وطن یمن تھا۔ اب وہ الگ سرزمین لہنی آبادی کے لئے چاہتا تھا۔ یہ میدان ان اور چشمہ اس کے لئے نعمت غیر مترقبہ تھا جس نے اس قبیلہ کی مراد پوری کر دی۔

④ یعنی جو پہلے عرب نہیں تھے اب عرب بن گئے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے۔ کیوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اگرچہ عربوں کی طرح اولاد سام میں سے تھے۔ مگر ان کا اصل وطن عراق تھا۔

ان کے معتقد ہو گئے پھر ان کا مسلک قبول کر لیا۔ توریت کی روایت کے بموجب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر ایک سو سینتیس ۱۳۷ سال ہوئی۔^① اس عرصہ میں مکہ چند گھر کی آبادی کے بجائے پورا شہر بن چکا تھا اور کعبہ نے بھی مرکزی عبادت گاہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنی قوم کے مقتدا بھی تھے اور کعبہ کے متولی بھی۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارہ لڑکے ہوئے۔^② اگر وہ سب مکہ میں رہتے تو بہت ممکن تھا کہ میں ان کی اکثریت ہو جاتی مگر یہ صاحبزادگان جو اولولعزم نبی کی اولاد تھے ان کا مطمح نظر اور نصب العین دعوت الی اللہ اور اصلاح خلق تھا۔ وہ اسی مقصد کو لے کر مکہ سے نکلے اور ملک کے مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے۔ جہاں جہاں وہ پہنچے وہاں اس زمانہ کی گراہیوں یعنی کواکب پرستی اور اصنام پرستی وغیرہ کے مقابلہ میں خدا پرستی کا علم بلند ہو گیا۔^③

مکہ میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے صرف ایک فرزند قیدار قیام پذیر رہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد وہ ہی خانہ کعبہ کے متولی ہوئے۔ پھر ان کی اولاد متولی ہوتی رہی اور سیاسی اقتدار ان کے نا نہیں ”بنو جرہم“ کو حاصل رہا۔ کئی صدی تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر وہ وقت آیا کہ بنو جرہم اپنے اقتدار کے نشہ میں ایسے مست ہوئے کہ ان کو اولاد اسماعیل علیہ السلام کی اتنی مداخلت بھی گوارہ نہ ہوئی کہ وہ خانہ کعبہ کے متولی رہیں چنانچہ ان کو مکہ سے نکال دیا۔ اور اب مرکز توحید یعنی خانہ کعبہ پر بھی انہیں کا اقتدار ہو گیا۔

قریش اور قصی بن کلاب مصلح قریش

قریش کا تعارف:

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں تقریباً بیس پشت کے بعد ایک شخص مُضر ہوا ہے۔ باپ کا نام ”کنانہ“ اس کی اولاد کو ”قریش“ کہا جاتا ہے۔ مُضر کی آٹھویں پشت میں ایک شخص ہوا جس کا عربی نام قصی تھا (اصل نام زید، باپ کا نام کلاب، ماں کا نام فاطمہ بنت سعد) قصی بن کلاب کو قوم نے مصلح کا خطاب دیا۔ اس کی پانچویں پشت میں فخر موجودات، سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کا ظہور اقدس ہوا۔ سلسلہ نسب یہ ہے: محمد ﷺ بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی۔

① توریت (بائبل قدیم) باب پیدائش ۲۵، فقرہ ۱۶، ۱۷

② ایضاً

③ سیرۃ ابن ہشام ص ۷۲، ج ۱

قصی اور تولیت کعبہ:

قصی بچپن ہی میں باپ کے سایہ سے محروم ہو گیا تھا ماں نے قبیلہ بنی عذرہ کے ایک شخص سے جس کا نام ربیعہ بن حرام تھا دوسرا نکاح کر لیا۔ بنو عذرہ، شمال عرب کے حدود میں شام کے قریب سرخ میں آباد تھے۔ قصی نے ماں کی آغوش میں یہیں پرورش پائی۔ ہوش سنبھالا تو وطن اور نسل کی جستجو ہوئی۔ کچھ سراغ لگا تو یہ مکہ پہنچا۔ وہاں بڑے بھائی سے ملاقات ہوئی جس کا نام زہرہ تھا۔ جو بوڑھا وہ چکا تھا اس کی بصارت بھی جاتی رہی تھی۔^①

مکہ پر بنو جرہم کے بعد اب قبیلہ خزاعہ کا قبضہ تھا۔ قصی نے یہیں بود و باش شروع کر دی اور یہاں تک تعلقات بڑھائے کہ خانہ کعبہ کے متولی^② نے اپنی لڑکی کا نکاح قصی سے کر دیا۔ قصی نے قریش کے انتشار کو ختم کر کے ان کو ایک مرکز پر جمع کیا، اس لئے اس کا لقب^③ مجمع ہو گیا۔^④ قص بنو خزاعہ کے مقابلہ پر ایک مضبوط محاذ قائم کر کے چند ایک مقابلوں کے بعد قریش کا مکہ پر تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اس طرح کئی ہزار سال کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ بنو اسماعیل کو مکہ پر سیاسی اقتدار حاصل ہوا۔

سیاسی رابطہ:

شام کے قریب جو عربی قبائل آباد تھے اگرچہ وہ خود مختار تھے مگر باز نطفی شہنشاہیت (سلطنت روم) کے زیر اثر تھے۔ کچھ قبیلوں نے عیسائی مذہب بھی قبول کر لیا تھا۔ قصی اس علاقہ میں بڑھ کر جوان ہوا تو اس کی بلند پرواز فطرت نے اس کو شہنشاہ روم تک پہنچا دیا۔ بنو خزاعہ کی جنگ میں قیصر روم (باز نطفی شہنشاہ) کی حمایت بھی قصی کو حاصل تھی اور بقول ابن قتیبہ قیصر روم نے اس کو کمک بھی پہنچائی تھی^⑤ یہ بھی ایک گلہ جوڑ تھا۔

بین الاقوامی سیاست کبھی بھی اپنے مفادات کے تحفظ سے آزاد نہیں رہی ہے۔ بظاہر منشاء یہ بھی تھا کہ عرب کے اندر اپنے اثرات بڑھائے اور ہندوستان سے خشکی کی راہ سے ہونے والی تجارت کے گزر گاہ کو اپنی نگرانی اور حفاظت میں لے لے۔

قصی نے مکہ پر قبضہ کیا تو شہر مکہ کی تعمیر جدید کا منصوبہ بھی تیار کیا۔ کعبہ کے اطراف میں

① ابن سعد ص ۳۷، ج ۱

② حلیل بن حبشیہ خزاعی، لڑکی کا نام حبی، البدایہ والنہایہ ص ۲۱۰، ج ۲

③ معارف ابن قتیبہ

④ ابن سعد ص ۳۰، ج ۱

⑤ داعانہ قیصر علیہا، معارف ابن قتیبہ ص ۲۱۵، ملوک الشام

موجود اس جنگل کو صاف کرایا جو خانہ کعبہ کے احترام میں جھاڑیوں کی صورت میں صدیوں سے موجود چلا آرہا تھا۔ لوگوں کے وہم کو دور کرنے کے لئے سب سے پہلے خود کلہاڑا چلایا اور اعتراض کا جواب یہ دیا کہ ہمارا مقصد آبادی ہے۔ بربادی مقصود ہو تو بے شک درخت کاٹنے ممنوع ہیں۔^① پھر ایک خاص نقشہ کے ساتھ مکہ کو آباد کرنا شروع کیا۔ خالی اراضی کے پلاٹ بنائے اور قریش کے ہر ایک خاندان کو ایک پلاٹ دے دیا۔ یعنی ہر قبیلہ کی الگ کالونی آباد کر دی۔ انہیں کالونیوں کے محل وقوع کے لحاظ سے قریش خواہر اور قریش بطاح کی اصطلاحیں ایجاد ہوئیں۔^②

اس عقیدے کو بھی ختم کیا کہ خانہ کعبہ کے قریب مکان نہ بنائے جائیں بلکہ قریش کے کچھ خاندان یہاں آباد کئے اور کچھ خاندان شہر کے بیرونی حصہ میں۔ البتہ یہ ہدایت کر دی کہ کعبہ کے قریب دوسری منزل تعمیر نہ کی جائے۔^③

اس جدید نقشہ میں خانہ کعبہ وسط میں رہا۔ خانہ کعبہ کے گرد بہت وسیع میدان چھوڑ دیا گیا۔ محلوں (کالونیوں) کے بیچ میں راستے رکھے گئے۔ یہ راستے (سڑکیں) خانہ کعبہ کے میدان پر آکر ختم ہوتے تھے۔ ان میں وہ سڑک بھی تھی جس کو ”طریق ابی شیبہ“ کہا جاتا تھا۔ یہ سڑک بہت وسیع اور سب سے زیادہ چالو تھی۔

وہی قصی جس کا بچپن یتیمی میں گذرا تھا اس انقلاب کے بعد اپنی قوم کا سب سے بڑا شخص تھا۔ وہ گویا پوری قوم کا مالک تھا جس کی عظمت دلوں کی گہرائیوں تک پہنچی ہوئی تھی۔^④ یہاں تک کہ لوگ اس سے برکت حاصل کیا کرتے تھے۔

قوم کے پاس پہلے سے کوئی دستور العمل یا قانون نہیں تھا تو اسی کا قول قانون ہوتا تھا۔ اور نہ صرف زندگی میں بلکہ بقول ابن سعد اس کے مرنے کے بعد بھی اس کے قول کی ایسی ہی تعظیم کی جاتی تھی جیسے کسی مذہبی حکم کی^⑤ مگر نہایت عجیب اور دور حاضر کے سیاست دانوں کے لئے بہت زیادہ قابل قدر اور سبق آموز بات یہ ہے کہ اس تمام عظمت اور اقتدار کے باوجود قصی نے نہ تاج شاہی سر پر رکھنا نہ اپنے آپ کو بادشاہ کہلوانا پسند کیا۔ اس نے اپنے رسمی اعزاز اور اپنی وجاہت و عظمت کے مقابلہ میں ابراہیمی عظمت توحید اور قوم کی روایات اور ان کے اطوار کا احترام کیا۔ حریت اور آزادی اس قوم کا وہ جوہر تھا جس نے کبھی بھی کسی شاہ یا شہنشاہ کے سامنے اس قوم کی

① ابن سعد ص ۴۰ ج ۱

② ابن سعد ص ۴۰ ج ۱

③ احمد السباعی ص ۴۴

④ ابن سعد ص ۴۰ ج ۱

⑤ ابن سعد ص ۳۹ ج ۱

گردن نہیں جھکنے دی تھی۔ قصی نے تخت سلطنت اور تاج شاہی کے مقابلہ میں اس جوہر کو محفوظ رکھنے اور ترقی دینے کی کوشش کی۔ اس سے بڑھ کر اپنی قوم کے ساتھ اخلاص کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے دربار شاہی کے بجائے دارالندوہ تعمیر کیا اور اس کا ایسا نظام بنایا جس کے لئے جمہوری کے علاوہ اور کوئی لفظ مناسب نہیں ہو سکتا۔ جس میں فرد یا شخص کی نہیں بلکہ نظام کی تعظیم تھی اور ملوکیت یا شخصی اقتدار سے یہاں تک اجنبیت تھی کہ نہ دارالندوہ کا کوئی صدر (چیئر مین) تھا نہ اس جمہوری نظام میں صدر کا کوئی عہدہ تھا۔ بہت سے فرائض، پورٹ فولیو تھے جو مختلف قبائل پر تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ قبیلہ کا سربراہ اس فریضہ کا ذمہ دار ہوتا تھا۔

مکہ کی شہری ریاست

جدید تنظیمات

نادی۔ دارالندوہ۔ شعبے اور منصب

دیہات میں اور قصبات کے محلوں میں ایسے مکانات ہوتے ہیں جن کو چوپال کہا جاتا ہے۔ یہ عموماً محلہ یا گاؤں کے بڑے آدمی کی حویلی کا مردانہ حصہ ہوتا ہے جس میں گاؤں یا محلہ والوں کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ کوئی تقریب منائیں کوئی مشاورتی اجتماع یا تفریحی مجلس کریں۔ چوپال میں وعظ کے جلسے بھی ہوتے ہیں بیاہ شادی کی تقریبات بھی۔ مشاعرے اور ادبی مجلسیں بھی ہوتی ہیں اور کبھی رقص و سرود کی رنگین محفلیں بھی جیتی ہیں۔ (جدید دور میں کیونٹی سینئر اس کے متبادل بنے ہیں۔)

چوپال ایک بڑا ہال ہوتا ہے اور موجودہ زمانہ میں بھی عموماً دیہات میں یہ ہال خام ہوتا ہے یعنی دیواریں مٹی یا چکی اینٹوں کی ہوتی ہیں اور چھت کڑیوں کی۔ بیچ میں شہیر (اور دور حاضر میں گاڈز) رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے اوپر دو طرفہ کڑیاں ہوتی ہیں اس وجہ سے اس کو دو کڑیہ بھی کہتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے مدینہ والے اس کو سقیفہ کہتے تھے مگر مکہ معظمہ میں اس کے لئے نادی^۱ کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔

نادی (مقاصد اور فوائد)

جو کام ہمارے یہاں چوپالوں میں ہوتے ہیں وہ ان اندیہ (نادیوں) میں بھی ہوا کرتے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ:

(۱) سلسلہ نسب کے بارے میں کوئی اعلان ہوتا تھا تو وہ ان نادیوں میں کیا جاتا تھا۔

۱ نادی۔ ندنی سے ماخوذ ہے۔ ندنی کے معنی ہیں رطوبت، تراوٹ اسی سے نداء بمعنی آواز بھی ماخوذ ہے کہ جس کے حلق میں تراوٹ زیادہ ہوتی ہے اس کی آواز بلند ہوتی ہے۔ نادی، میں جام و سبکی تراوٹ بھی رہا کرتی تھی اور داد و دہش کی سیرابی بھی اور جس طرح بحث و مباحثہ میں آوازیں بلند ہوتی تھیں، شعراء کے ترنم اور مغنیوں کے طرب انگیز نغمے بھی ہوتے تھے۔ یہی مناسبتیں وجہ تسمیہ ہی۔

(۲) قبیلہ میں داخل کر لینے کا ایک خاص قاعدہ اور رواج تھا۔ جس کو داخل کرتے تھے وہ مولیٰ کہلاتا تھا اور جو معاہدہ اس سے ہوتا تھا اس کو عقد موالات کہا کرتے تھے۔ یہ عقد موالات نادی ہی میں ہوتے تھے۔

(۳) عقد موالات کے برعکس خلع یا طرد کا اعلان بھی اسی نادی میں ہوتا تھا یعنی جس کو مولیٰ بنایا گیا تھا اگر وہ معاہدہ کی پابندی نہ کرتا یا اپنے عمل اور کردار میں غلط ثابت ہوتا تو اس کو قبیلہ سے خارج بھی کیا جاسکتا تھا۔ اس کو خلع کہتے تھے (الگ کر دینا)۔ اور طرد کا لفظ بھی اس کیلئے استعمال کرتے تھے (دھکے دے کر نکال دینا)۔ یہ شخص خلع، مخلوع یا مطرود کہلاتا تھا۔

(۴) خرید و فروخت کے اہم معاملات تجارتی کاروانوں کا استقبال اور ان کی روانگی کی تقریب۔

(۵) تفریحی مجلسیں، رات کو قصہ خوانی (مسامرہ) رقص و سرود اور سوانگ (ڈرامے) بھی نادی میں ہوا کرتے تھے۔

نظم و نسق کے لحاظ سے یہ نادی قبیلہ کی ہے نہ حاکمہ اور شیخ قبیلہ کی اجتماعی طاقت ہوتی تھی۔ ہر ایک نادی کے ساتھ ایک علاقہ بھی ہوتا تھا جس کو موزن، منادی یا نقیب کہا کرتے تھے۔

دارالندوہ:

قبیلہ دار نظام کی طرح پورے شہر کا کوئی مرکزی نظام نہیں تھا۔ ضرورت کے وقت عام اجتماع ضرور ہو جاتے تھے مگر ان کا کوئی ضابطہ تھا، نہ کوئی جگہ ان کے لئے متعین تھی۔ مصلح قصی کا قابل فخر کارنامہ یہ تھا کہ اس نے شہری اجتماع کا ایک نظم اور ضابطہ مقرر کیا۔ اپنا مکان جو اس نے کعبہ کے شمالی میدان میں اس طرح بنایا تھا کہ اس کا دروازہ مسجد حرام کی طرف تھا، مرکزی نظام کے لئے عام کر دیا اور دارالندوہ اس کا نام رکھا۔

دارالندوہ کے ضابطے:

ندوہ کمیٹی یا مجلس کو کہتے ہیں۔ یہ کمیٹی جس کے نام پر یہ دارالندوہ تھا اس کی تشکیل کا ضابطہ ہمارے علم میں نہیں ہے۔ قیاس یہ ہے کہ قبائلی مجالس (نادی) کے شیوخ اور سربراہ اس کے ارکان ہوتے تھے۔ البتہ ارتزقی نے اخبار مکہ^۱ میں اور ابن درید نے کتاب الاشتقاق^۲ میں تصریح کی ہے کہ دارالندوہ کے اجلاس میں صرف وہی لوگ شریک ہو سکتے تھے جن کی عمر کم سے کم چالیس

۱ اخبار مکہ ص ۱۰۷ ج ۱

۲ کتاب الاشتقاق ص ۷۷

سال ہوتی تھی۔ صرف دارالندوہ کے بانی (قصی) کی اولاد اس شرط سے مستثنیٰ تھی^①
اجلاس کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا جب ضرورت ہوتی اجلاس کر لیا جاتا تھا۔ دارالندوہ کا منتظم
اجلاس کا داعی ہوتا تھا، صدر کوئی مقرر نہیں تھا۔

دارالندوہ میں انجام پانے والے کام:

- (۱) شہر مکہ اور قوم قریش سے تعلق رکھنے والے معاملات کے متعلق مشورے اور فیصلے^②
- (۲) کسی قبیلہ یا گروہ سے جنگ یا صلح کے فیصلے (۳) مدافعتی تدابیر (۴) جنگ کے وقت علمبردار کا
تقرر (۵) تجارتی معاہدات (۶) بیرونی مہمانوں کا استقبال (۷) قصی کی شخصیت سے برکت
حاصل کرنے کے لئے شادی کی تقریبات بھی یہاں ہوا کرتی تھی (۸) قافلوں کی روداگی اور واپسی
پر ان کا استقبال بھی یہاں ہوتا تھا۔ (۹) ایک خاص رسم رائج تھی کہ جب لڑکی سن بلوغ کو پہنچ جاتی
تھی تو اس کو درع پہنایا جاتا تھا (بڑا کرتا) اور چھوٹا کرتا اتروادیا جاتا تھا۔ یہ رسم بھی یہاں انجام دی
جاتی تھی^③ (۱۰) قومی ملکیت کی چیزیں بھی یہیں محفوظ کر دی جاتی تھیں۔^④

مختلف شعبے اور منصب

مکہ جو صرف ایک شہر یا ایک آزاد ریاست نہیں بلکہ پورے عرب کا متبرک مرکز بھی یہی
تھا، جہاں عرب کا مرکزی معبد کعبہ تھا۔ اس کے انتظامات کی جو صورتیں پہلے تھیں قصی نے ان کو
باقی رکھا۔ ان کے علاوہ اور بہت سے شعبے قائم کئے، ان کے منصب اور منصبدار (عہدہ دار) مقرر
کئے، کچھ شعبے اپنے پاس رکھے۔ تفصیل یہ ہے:

- (۱) دارالندوہ۔ اس کا نظم و نسق مستقل شعبہ تھا جو قصی سے متعلق تھا اس کے بعد عبدالدار سے
متعلق ہوا۔

- (۲) مشورہ۔ یعنی مشاورتی اجتماع کا انتظام

- (۳) حجابت۔ کلید برداری یعنی کھولنے اور بند کرنے کی ذمہ داری اور خانہ کعبہ کے اندر داخل
ہونے کی اجازت دینے کا اختیار۔

① کتاب الاشتقاق ص ۹۷

② آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دینے کا فیصلہ بھی یہیں کیا گیا تھا۔

③ سیرۃ ابن ہشام ۱۷۹، ابن سعد ص ۳۹ ج ۱

④ مثلاً غزوہ احد کی تیاری کے لئے جو تجارتی مال لایا گیا تھا اس کا نفع مصارف جنگ میں صرف کیا جائے گا وہ مال یہیں
جمع رکھا گیا تھا۔ (ابن ہشام وغیرہ)

- (۴) سدانت۔ دربانی، کھولنے بند کرنے اور صاف رکھنے کی خدمت۔ یہ کوئی مستقل منصب نہیں
تھا بلکہ منصب حجابت ہی سے متعلق تھا۔

- (۵) حرم کعبہ کا عام انتظام اور نگرانی۔ اس منصب کا ذمہ دار یہ نگرانی بھی رکھتا تھا کہ حرم میں
شورو غل یا جھگڑا فساد نہ ہو۔

- (۶) ایبار^①۔ بتوں سے استخارہ یعنی فال لینا جس کا قاعدہ مقرر تھا۔

- (۷) اموال مجبرہ۔ یعنی محفوظ مال۔ خانہ کعبہ کو جو چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے ان کی حفاظت کا
شعبہ۔

خانہ کعبہ میں ایک پختہ گڑھا کنوئیں کی طرح تھا۔ چڑھاوے کی طلائی اور نقرئی چیزیں اس
کنوئیں میں ڈال دی جاتی تھیں۔ اسی کنوئیں کے کنارہ پر صحن خانہ کعبہ کا سب سے بڑا بت ٹہل تھا۔

حج سے متعلق:

رفادہ۔ حجاج کے کھانے کا انتظام:

قصی کا ایک کارنامہ یہ بھی تھا کہ جب اس نے قریش کو مکہ میں آباد کیا تو ان کے ذہن نشین
کر لیا کہ آپ محافظ اور خادم کعبہ ہیں۔ زائرین جو عرب کے کونہ کونہ سے آتے ہیں یہ آپ کے
مہمان ہونے چاہئیں اور ان کے خورد و نوش کا انتظام آپ کو کرنا چاہیے۔ یہ قریش کی عالی حوصلگی تھی
کہ انہوں نے اس تجویز کو منظور کیا۔ اور پھر یہ طے ہو گیا کہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ اس مقصد عظیم
کے لئے جمع کر دیا کریں گے۔ تجارتی مال میں یہ حصہ کم سے کم عشر (دسواں حصہ) ہوتا تھا۔ بعض
باحوصلہ اس سے بھی زیادہ دیدیا کرتے تھے۔ اس تجویز کی سیاسی مصلحت یہ تھی کہ:

- (۱) عام عرب بنو خزاعہ کو بھول گئے جن سے قصی نے اقتدار چھینا تھا۔

- (۲) قریش کے تسلط کو نعمت اور رحمت سمجھنے لگے۔

- (۳) شہر مکہ اور حرم کعبہ میں قصی نے جو انقلاب برپا کیا تھا کہ عرب کے عقیدے کے خلاف
جھاڑیاں اور درخت کٹوا کر قریش خاندان آباد کر دیئے۔ عرب نے اس کو برداشت کیا۔
فریق مخالف (خزاعہ) جو اس کے خلاف پروپیگنڈہ کر کے عرب کو مشتعل کر سکتے تھے اس
کے راستے بند ہو گئے۔ اس طرح خطرات ختم ہو گئے۔

- (۴) نہ صرف سرزمین مکہ میں بلکہ پورے عرب میں قریش کے لئے کوئی خطرہ نہیں رہا۔ چنانچہ

① اس کا ماخذ میسرہ ہے۔ میسرہ کے معنی قمار اور جوا (قاموس) چھوٹے چھوٹے تیر جن کو ازلام کہا جاتا تھا۔ وہ جوا
کھیلنے کے کام میں آتے تھے۔ انہیں کے ذریعہ فال بھی نکالا جاتا تھا۔

عام عرب کے لئے صرف چار ماہ حرم میں ان کو کہیں آنے جانے میں خطرہ نہیں ہوتا تھا اور قریش کے لئے پورے بارہ مہینے حرم ہو گئے۔ اس سے بسل کی اصطلاح ایجاد ہو گئی۔ یعنی باقی آٹھ ماہ کا بھی حرام ہونا۔

یہ قریش کا اعلیٰ درجہ کا تدبیر تھا کہ رفاہ کے باعث انہوں نے خرچ سے زیادہ منافع کی صورتیں پیدا کر لیں اور ان کی عظمت و احترام میں بھی چار چاند لگ گئے۔ پھر احرام کا انتظام بھی قریش نے اپنے ذمہ لے لیا۔ یعنی جب عرفات سے واپس ہو کر طواف کعبہ کریں جو ۱۰ تا ۱۲ ذی الحجہ کو ہوا کرتا تھا تو یہ طواف ان کپڑوں میں نہ ہونا چاہئے جو سال بھر پہنے جاتے ہیں، جن کو پہن کر سینکڑوں گناہ کئے جاتے ہیں۔ بلکہ اس طواف کے لئے احرام کا کپڑا قریش دینگے اور اگر کوئی شخص کسی وجہ سے قریش کا یہ عطیہ حاصل نہ کر سکے تو وہ برہنہ بدن طواف کرے۔^۱

سقاہیہ:

حجاج کے لئے پانی کا انتظام۔ یہ شعبہ بھی رفاہ کی طرح بہت اہم اور بہت کٹھن تھا۔ خزانہ سے ٹکست کھا کر جب بنو جرہم مکہ سے فرار ہوئے تو ان بھاگنے والوں نے سب کچھ تباہ کر دینے کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے زمزم کو بھی (جو پہلے چشمہ تھا پھر یہاں کنواں بنالیا گیا تھا اور چشمہ کنویں کا سوت ہو گیا تھا جس کی وجہ سے کنویں کا پانی بھی کم نہیں ہوتا تھا) نہ صرف بند کر دیا تھا بلکہ لاپتہ کر دیا تھا۔ قصی نے جب کعبہ کا حرم بنایا اور اس کے قریب قریش کو آباد کیا تو یہاں کوئی کنواں نہیں تھا تو زائرین کے لئے پانی کی سخت دشواری ہوتی تھی۔ شعبہ سقاہیہ کا کام یہ تھا کہ مکہ کے مختلف محلوں میں جو کنویں تھے وہاں سے پانی لاتے اور حوضوں میں بھر دیتے تھے۔

زائرین صرف حرم کعبہ ہی میں نہیں رہتے تھے بلکہ عرفات اور مزدلفہ بھی جاتے تھے۔ اور منیٰ میں تو کئی روز تک جشن رہا کرتا تھا۔ پانی کا انتظام سب جگہ کیا جاتا تھا۔ دائرہ پر وف قسم کی چیز اس وقت نہیں تھی البتہ چمڑہ ان کے یہاں ہوتا تھا جو حبش وغیرہ بھی بھیجا جاتا تھا۔ بڑے بڑے حوض چمڑے^۲ ہی کے بنائے جاتے تھے یہ سب انتظام شعبہ سقاہیہ سے متعلق تھا۔

وقادہ^۳:

۹ ذی الحجہ کی شام کو حاجی عرفات سے روانہ ہو کر مزدلفہ پہنچتے ہیں۔ رات کو مزدلفہ میں قیام

رہتا ہے۔ صبح کو وہاں سے منیٰ آتے ہیں۔ یہی دستور زمانہ جاہلیت میں تھا۔ یہ رات اگرچہ چاندنی ہوتی ہے مگر پھر بھی قصی نے یہ انتظام کیا تھا کہ مزدلفہ کے ٹیلوں پر آگ جلائی جاتی تھی جس سے میدان مزدلفہ روشن رہتا تھا اور آنے والوں کو سہولت ہوتی تھی^۱ اس کو وقادہ کہا جاتا تھا۔

اجازہ یا افاضہ:

رواگی کا پروگرام بنانا۔ پہلے گزر چکا ہے کہ یہ اختیار ”صوفہ“ کو حاصل تھا کہ وہ طے کیا کرتے تھے کہ مثلاً عرفات سے کونسا قبیلہ پہلے اور کونسا بعد کو روانہ ہو گا۔

قُبَّہ

حج کے موقع پر ہر ایک قبیلہ کا قیام گاہ (پڑاؤ) الگ ہوتا تھا جس کو منزل کہا جاتا تھا۔ کملوں کے خیمے ہوتے تھے۔ مگر قریش کے خیمے سرخ چمڑے کے ہوتے تھے۔ ایسے خیمہ کو قبہ کہا جاتا تھا (جمع قباب) ان کے انتظام کا ایک شعبہ تھا، اس کو قبہ ہی کہتے تھے۔

عدالت اور فصل خصوصیات:

حکومت۔ عام مقدمات کی سماعت اور فیصلہ اس شعبہ سے متعلق تھا۔ اثنائے قتل کے سلسلہ میں بعض صورتیں ایسی ہوتی تھیں جن میں دیت واجب ہوتی تھی۔ دیت کی ایسی صورت ہوتی تھی کہ اس کو اجتماعی جرمانہ کہا جاسکتا ہے۔ پوری دیت کے سوا ونٹ^۲ ہوتے تھے جو مقتول کے وارثوں کو دیئے جاتے تھے۔ مگر یہ اونٹ قاتل نہیں دیتا تھا۔ بلکہ اسکی ادائیگی عاقلہ کے ذمہ ہوتی تھی۔ یعنی وہ سوسائٹی جس میں یہ رہتا تھا۔ پھر قبائل کے جو معاہدات ہوتے تھے ان میں ایک دفعہ یہ بھی ہوتی تھی کہ اگر کسی قبیلہ پر دیت ادا کرنی لازم ہو تو اس کا اتنا حصہ وہ قبیلہ ادا کرے گا اور اتنا حصہ اس کا حلیف اور معاہدہ قبیلہ ادا کرے گا۔

پھر اگر جان ہلاک ہوئی ہے تو پوری دیت لازم ہوتی تھی اور اگر ناک، کان یا کوئی عضو کاٹ دیا ہے تو بعض صورتوں میں پوری دیت اور بعض صورتوں میں دیت کا ایک حصہ لازم ہوتا تھا۔ چونکہ اسلام نے بھی دیت کے طریقہ کو (جزوی اصلاحات کے بعد باقی رکھا) تو اس

^۱ ابن سعد ص ۴۱ ج ۱

^۲ پہلے ایک انسان کی دیت دس اونٹ ہوا کرتی تھی جب عبدالمطلب کی منت ماننے کے مشہور واقعہ میں عبد اللہ کے فدیہ میں سوا اونٹ پر قرعہ نکلا اور عبدالمطلب نے عبد اللہ کے فدیہ میں سوا اونٹ ذبح کئے تب سے ایک انسان کی دیت سوا اونٹ قرار دی گئی جس کو اسلام نے بھی باقی رکھا۔ ابن سعد ص ۴۵

^۱ ابن سعد ص ۴۱ ج ۱

^۲ ابن سعد ص ۴۱ ج ۱

^۳ وقادہ: آگ روشن کرنا بمعنی وقود

کے احکام کتب فقہ میں بھی ہیں۔ بہر حال قتل و دیت کے مقدمات نہایت اہم ہوتے تھے اور ان میں فیصلہ طلب امور یہ ہوتے تھے کہ پوری دیت لازم ہوتی ہے یا دیت کا جزو۔ اور جو بھی صورت ہو اس کی ادائیگی صرف قاتل کے قبیلہ اور اس کے عاقلہ پر لازم ہوگی یا اس قبیلہ کے حلیف قبائل پر بھی۔ اور اگر حلیفوں پر بھی لازم ہوتی ہے تو بروئے معاہدہ کتنی۔ اور اس کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی۔ اس شعبہ کا نام (جس کے ذریعے ان مقدمات کا فیصلہ کیا جاتا تھا) اشقاق^۱ تھا اور اس کا ذمہ دار وہی ہو سکتا تھا جو اونچے درجہ کا معاملہ فہم ہو اور صحیح فیصلہ کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اسلام سے پہلے یہ شعبہ ابو بکر بن قافہ کے سپرد تھا، جن کو اسلام نے صدیق اکبر کا خطاب دیا۔

فوجی نظام

غیر موزوں نہ ہو گا اگر ”بے ضابطہ فوج“ کا لفظ استعمال کیا جائے۔ بے ضابطہ فوج سے مراد قبائل کے وہ جنگجو ہیں جو کسی بھی مقابلہ کے وقت میدان میں آ جاتے تھے۔ ان کے اسلحہ^۲ خود اپنے ہوتے تھے۔ ان کا کوئی کمانڈر مستقل نہیں ہوتا تھا۔ اس کا انتخاب^۳ وقت پر ہوتا تھا۔ ہر قبیلہ کا جھنڈا الگ ہوتا تھا اس کو لواء کہا جاتا تھا اور ایک علم پوری فوج کا ہوتا تھا اس کو عقاب کہتے تھے۔ پوری فوج کے سالار اعظم کو قائد۔ اس منصب کو قیادت اور اس کے کیمپ کو قہہ کہا کرتے تھے۔ خاص خاص سرداروں کے ساتھ یہ عہدے اور جھنڈے سپرد کئے جاتے تھے سپرد کرنے والے بھی خاص سردار ہوتے۔

تسمیں:

فوج کی چند تسمیں ہوتی تھیں۔ تیر انداز، رماۃ جمع رانی، پیادہ ر جالہ، سوار، خیل۔

سوار فوج کے لئے اعنہ کا لفظ بھی استعمال ہوتا تھا۔

فتح کے وقت لوٹ کے مال کو غنیمت کہا جاتا تھا۔ اس کا اتنا نظام تسلیم شدہ تھا کہ ایک چوتھائی

^۱ اشقاق شق سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں جزو دیت اور زکوٰۃ کے جو نصاب اسلام نے مقرر کئے ہیں تو دو نصابوں کے درمیان جو کسر ہوتی ہے اس کو بھی شق کہا جاتا ہے۔ مثلاً چالیس بکریوں پر ایک بکری زکوٰۃ میں ادا کرنی ہوتی ہے اور ایک سو میں پر دو بکریاں، تو چالیس سے زائد اور ایک سو میں سے کم تعداد شق ہوئی۔

^۲ تلوار، نیزہ، اور حفاظت کے لئے ڈھال، فہ (درغ) اور خود (بیضہ) خود کے آہنی جھار جن سے گردن کی حفاظت ہوتی تھی مغز کہلاتے تھے۔

^۳ جو عموماً قرعہ کے ذریعہ ہوتا تھا قبائل کے سردار امیدوار ہوتے تھے۔ جنگ فار کے موقع پر حضرت عباس کا نام نکل آیا۔ یہ اس وقت بچے تھے تو ان کو ایک ڈھال پر بٹھا کر لے گئے۔ العقد القرید ۴۶، ج ۲۔

قائد فوج یا سردار اعظم کا ہوتا تھا اس چوتھائی کو مریع کہتے تھے (چوتھ)۔^۱ باقی تین حصے مختلف طریقوں سے تقسیم کئے جاتے تھے۔^۲ اس خاکہ کے بموجب فوج کے منصب دار یہ ہوتے تھے:

(۱) قائد اعظم (۲) علمبردار جس کے پاس عقاب رہتا تھا (۳) کیمپ یعنی قہہ کا منتظم اور محافظ (۴) سوار فوج کا سردار، صاحب اعنہ، اس کو مختصر کر کے اعنہ کہتے تھے۔

باضابطہ فوج یا پولیس:

قریش نے حفاظتی مقاصد کے لئے ایک مستقل نظام بھی بنایا تھا اس کو قائم کہتے تھے۔ مگر اس کی حیثیت تنخواہ دار پولیس کی تھی۔ لڑائیوں کے وقت قبائل کے جنگجو بھی اپنے مفاخر کے ترانے گاتے ہوئے میدان میں آیا کرتے تھے اور مقابلہ بھی ان سے کرتے تھے جو ان کے ہمسر ہوتے تھے۔ غزوہ بدر میں سردار ان قریش نے انصاری مجاہدین کو مقابلہ پر دیکھا تو لڑنے سے انکار کر دیا کہ یہ کاشکار اور کسان ہیں۔ قریش کے ہم پلہ نہیں ہیں۔ یہ بھی ایک ضابطہ تھا۔

قصی نے اپنے بعد عبدالدار کو جانشین کر دیا اور جو شعبے قصی کے پاس تھے وہ سب عبدالدار کے حوالہ کر دیے۔ لیکن قصی کے موت کے بعد اس کے دوسرے بیٹے عبد مناف کی اولاد نے مکہ کی ریاست کے شعبوں کا انتظام تقسیم کرتے ہوئے ریاست پر اپنی گرفت مضبوط کر دی۔

کارنامہ:

قصی نے اگرچہ بادشاہت کا دعویٰ نہیں کیا مگر قریش پر اور قریش کے ذریعہ پورے عرب پر اس کا اقتدار کسی بادشاہ سے کم نہیں تھا اور اس لحاظ سے اس کی اولاد کی حیثیت وہی تھی جو شہزادوں اور راج کماروں کی ہو کرتی تھی۔

عبد مناف کی اولاد نے اپنی شخصیت اور اپنی اس حیثیت کو پہچانا اور اس سے کام لیا۔ چنانچہ انہوں نے پڑوسی ممالک کے بادشاہوں اور شاہنشاہوں سے تعلقات پیدا کئے اور ان کو بڑھایا۔ اور قابل قدر بات یہ ہے کہ ان تعلقات کے فوائد کو صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ ان

^۱ عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستان بھی چوتھ سے نا آشنا تھا۔ شیواجی عالمگیر سے اس پر لڑتا رہا کہ وہ چوتھ ماگنکا تھا۔ یعنی یہ کہ عالمگیر یہ تسلیم کرے کہ شیواجی کو اپنے میں چوتھ حاصل کرنے کا حق ہو گا۔ سلطان عالمگیر اس کے لئے تیار نہیں ہوئے۔

^۲ عموماً تین چوتھائی باقی ساتھیوں پر اگر کچھ مال دشمن کی شکست اور عام لوٹ سے پہلے مل جاتا تھا۔ اس کو شیط کہا جاتا تھا۔ فضول سے مراد ناقابل تقسیم کسرات ہوتے تھے اور صفی کسی ایسی منتخب چیز کو کہتے تھے جو مہم کا سردار اپنے لئے منتخب کر لیا کرتا تھا، مثلاً کوئی تلوار یا کوئی گھوڑا وغیرہ۔ سردار کو اس انتخاب کا حق ہوتا تھا۔

۱۵	قیادت	فوجوں کی کمانداری	بنو امیہ	ابوسفیان بن حرب
۱۶	لوار	علم برداری	بنو عبد الدار	
۱۷	اعنہ	سواروں کے رسالہ کی سپہ سالاری	بنو مخزوم	خالد بن الولید
۱۸	سفارت	دوسرے ملک یا دوسرے فریق جنگ سے جنگ یا صلح کی گفتگو اور پیغام رسانی	بنو عدی	عمر فاروقؓ

بلند حوصلہ ہاشم بن عبد مناف

رفادہ اور سقایہ سب سے اہم شعبے تھے جن کے لئے دولت کی ضرورت بھی تھی اور محنت کی بھی۔ یہ اگرچہ عبد مناف کے چاروں بیٹوں کے سپرد ہوئے تھے مگر ان میں پیش پیش ہاشم رہا۔ یہ سب بھائیوں میں سب سے زیادہ بلند حوصلہ، باسلقہ، صاحب الرائے اور رسا آدمی تھا۔ رفادہ اور سقایہ کو جس قدر رقم کی ضرورت تھی ہاشم کا حوصلہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا۔ پہلے گزر چکا ہے قصی نے قریش کو سمجھایا تھا کہ زائرین (جو حج کو آتے ہیں) وہ قریش کے مہمان ہونے چاہئیں۔

حج کی خدمت کیلئے دعوتوں کا یہ سلسلہ ۷ ذی الحجہ (یوم الترویہ) سے ایک دن پہلے سے شروع ہو کر ۱۲ تک رہتا تھا۔ عرفات، منیٰ اور مزدلفہ جہاں جہاں حاجی جاتے تھے یہ دعوتیں ہوتی تھیں۔^① ہاشم کا ذریعہ آمدنی تجارت تھی۔ شہنشاہ روم (ہرقل) سے تعلقات بہت اچھے تھے۔ ایسے ہی شاہان ایران و یمن اور حبش سے تعلقات تھے۔ اس نے ان تمام فرامین کی تجدید کرائی جو پہلے ہو چکے تھے اور رَحَلَةُ الشَّيْءِ وَالْعَيْنِيف (القریش-۲) کا طریقہ اسی نے ایجاد کیا کہ قریش کا تجارتی قافلہ سردیوں میں یمن اور حبش جاتا تھا اور گرمیوں میں شام سے غزہ تک اور کبھی انقرہ تک پہنچ جاتا تھا۔ یہاں کے بادشاہ اور امراء ان قافلوں کا اعزاز کرتے تھے۔^②

مطلب ہاشم سے بڑے تھے۔ ہاشم کے بعد رفادہ اور سقایہ انہیں کے سپرد رہا مگر یہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہے۔ کچھ دنوں بعد یمن گئے وہیں ”روان“ میں ان کا انتقال ہو گیا۔^③ مطلب کے بعد عبدالمطلب جائنشین ہوئے۔ یہ ان کی خداداد صلاحیت تھی کہ ہاشم کے صحیح جائنشین ثابت ہوئے اور چند کام ایسے کئے جن سے نہ صرف قریش یا عرب کی تاریخ متاثر ہوئی بلکہ تاریخ اسلام بھی ان

① ابن سعد ص ۳۵ جلد ۱

② ابن سعد ص ۳۳ جلد ۱

③ ابن سعد ص ۳۵ جلد ۱

تعلقات سے کام لے کر اپنی قوم کے لئے تجارتی مراعات اور سفروں میں آسانیاں پیدا کیں۔ چنانچہ مطلب نے جو سب سے بڑا تھا شاہ حبش نجاشی اور یمن کے ملوک (ملوک حمیر) سے، ہاشم^① نے بازنطینی شہنشاہ ہرقل سے اور نوفل نے شہنشاہ ایران کسریٰ سے اپنی قوم کے لئے آزاد تجارت کے فرامین حاصل کر لئے کہ قریش تاجر جو ان کے ملکوں میں جائیں گے ان سے کوئی محصول یا ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔^② ظاہر ہے تجارت پیشہ قوم کے لئے اس سے بڑی نعمت کیا ہو سکتی ہے۔ اسی لئے ان کو بحیرون کہا جاتا تھا۔^③

تقسیم مناصب^④ جب آفتاب اسلام طلوع ہوا تو مناصب کی تقسیم اس طرح تھی:

شعبے	نمبر شہر	منصب	خدمات و فرائض	قبیلہ	منصب دار
نظم و حفاظت کعبہ مکرمہ	۱	حجاب و سدانہ	خانہ کعبہ	بنو عثمان بن	عثمان بن طلحہ
	۲	عمارت	حرم کعبہ کا عام انتظام اور نگرانی	عبد الدار بن قصی	
	۳	ایسار	فال نکلنے کی خدمت جس کا قاعدہ مقرر تھا	بنو جمح	صفوان بن امیہ
	۴	اموال مجبرہ	بٹوں کے نام پر حاصل شدہ نذرانوں کی حفاظت اور ان کا انتظام	بنو سہم	حارث بن قیس
حج اور ضروریات حاج	۵	سقایہ	حاجیوں کے لئے پانی کا انتظام	بنو ہاشم	ابوطالب
	۶	رفادہ	حاجیوں کے لئے کھانے اور احرام کے کپڑوں کا انتظام		
	۷	اجازہ یا افاضہ	عرفات سے واپسی میں ترتیب قائم کرنا	صوفہ	
	۸	وقادہ	مزدلفہ میں روشنی کا انتظام	بنو عبد مناف	
	۹	نسی	لود کا مہینہ معین کرنا	صوفہ	ابو ثمامہ جنادہ بن عوف
	۱۰	قبہ	حج کے موقع پر قبائل کے لیے قیام گاہوں نیز جنگ کے وقت خیموں اور خرگاہوں کا انتظام		
مدلہ انصاف اور تجارتی امور	۱۱	مدوہ	ساعت مقدمات اور درع وغیرہ کی تقریبات کا انتظام	بنو عبد الدار	عثمان بن طلحہ
	۱۲	مشورہ	اہم امور میں مجلس مشاورت کا انتظام	بنو اسد	یزید بن زمعہ
	۱۳	اشناق	خون بہا، جرمناہ اور مالی تاوان کا فیصلہ اور نظم	بنو تمیم	ابو بکر (الصدیق)
	۱۴	حکومت	مقدمات کی ساعت و فیصلہ	بنو سہم	حارث بن قیس

① البدایہ والنہایہ ۲۵۳، ج ۲

② طبقات ابن سعد ۲۳۳، البدایہ والنہایہ ۲۳۵، ج ۲

③ ایضاً

④ ماخوذ از طبقات ابن سعد ج ۱، اخبار مکہ العقدان، و سیرت ابن ہشام ج ۱

ﷺ نے ان کی تفصیل یہ بیان کی ہے۔^①

وؤ: بمقام دومتہ الجندل۔ قبیلہ کلب اس کا بھگت تھا۔

سواع: بمقام رباط، ساحل سمندر کے قریب۔ قبیلہ ہذیل اس کا بھگت تھا۔

یفوث: بمقام جرف (بحرین) پہلے قبیلہ مراد اس کی خدمت کیا کرتا تھا پھر بنو غطفان اس کے خادم اور بھگت بن گئے۔

یعوق: اہل ہمدان اس کے پجاری تھے۔

نسر: ذی الکراع (جو علاقہ حمیر) کا مشہور خاندان تھا اس کا بھگت تھا۔ یہ تمام صنم اور ان کے مندر اگرچہ علاقائی حیثیت رکھتے تھے مگر طواف، نذرانہ اور قربانی وغیرہ کی رسومات جو کعبہ میں انجام دی جاتی تھیں وہ یہاں بھی پوری کی جاتی تھیں۔ اور خانہ کعبہ کے خدام کے جو منصب تھے، کلید برداری، درباری اور ایسار وغیرہ یہ تمام منصب ان علاقائی کعبوں کے خدام کے بھی ہوا کرتے تھے۔ اس طرح پورے عرب میں مندروں یا چھوٹے بڑے کعبوں کا ایک جال پھیلا ہوا تھا۔ خدام اور پوجاریوں کے سیکڑوں خاندان اس نظام سے وابستہ تھے۔ اس پورے نظام کا مرکز کعبہ تھا۔^② اس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا ”بیت اللہ“ سمجھا جاتا تھا اور اسی کے گرد طواف کر کے حج کا مقدس فرض انجام دیا جاتا تھا۔ پس جو یہاں کے خدام تھے وہ پورے عرب کے مخدوم تھے اور جب کہ یحمر بن عوف کا یہ فیصلہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ وراثت ابراہیم اور تولیت کعبہ کا حق قریش کو ہے تو قریش پورے عرب کے مخدوم اور مذہبی مقتدا تھے۔

سیاسی قیادت

بت پرستی کے اس نظام نے قریش کو پورے عرب کا مذہبی پیشوا ضرور بنا دیا تھا مگر قریش کی عظمت صرف اس نظام پر موقوف نہیں تھی، بلکہ اس زمانہ کے بین الاقوامی سیاسی گھ جوڑنے بھی قریش کو ایسی حیثیت دیدی تھی کہ پورے عرب کا اس سے متاثر ہونا ضروری تھا۔

روم (بازنطینی)، ایران اور حبش تینوں سلطنتوں کے بیچ میں عرب حد فاصل تھا۔

تینوں سلطنتیں عرب پر نظر رکھتی تھیں۔ قریش اس حیثیت کو پہنچانتے تھے اور اس سے کام لینا بھی جانتے تھے۔ قصی نے بنو خزاعہ کا مقابلہ کیا اور ان کو مکہ سے نکالا تو نہ صرف یہ کہ شہنشاہ روم (بازنطینی شہنشاہ) کی حمایت اس کو حاصل تھی بلکہ ابن قتیبہ کی شہادت یہ ہے کہ اعانہ قیصر علیہا^③

① بخاری شریف ص ۷۳۲

② سیرت ابن ہشام ص ۱۵۴ ج ۱

③ معارف ابن قتیبہ ۲۱۵ ملوک الشام

سے متاثر ہے۔ مثلاً: (۱) چاہ زمزم کی برآمدگی (۲) خزاعہ سے معاہدہ (۳) دیت کے اونٹوں کی تعداد میں اضافہ (۴) اصحاب نفل کے واقعے میں اہل مکہ کو محفوظ کر لینا۔

عبدالطلب کے بعد خواجہ ابوطالب اور حق سقایہ

آنحضرت ﷺ کی عمر تقریباً ۸ سال تھی جب عبدالطلب کا انتقال ہوا۔ عبدالطلب کے جانشین ابوطالب قرار دیئے گئے۔ خدمت سقایہ ان کے سپرد ہوئی۔ ابوطالب اخلاق اور کمالات میں سب بھائیوں سے ممتاز تھے مگر دولت میں کم تھے۔ حج کا زمانہ آیا تو ہاتھ خالی تھے اور خدمت سقایہ کے لئے دس ہزار کی ضرورت تھی۔ انہوں نے یہ رقم اپنے بھائی عباس سے ایک سال کے وعدہ پر قرض لی۔ دوسرا سال آگیا قرض ادا نہ ہو سکا اور مزید خرچ کی ضرورت پیش آگئی تو بھائی عباس سے پھر ایک سال کے لئے چودہ ہزار قرض لئے۔ مگر اس مرتبہ عباس نے یہ طے کر لیا کہ اگر آئندہ سال تک یہ رقم ادا نہ ہو سکے تو آپ خدمت سقایہ میرے حوالہ کر دیں۔ خواجہ ابوطالب نے یہ شرط منظور کر لی۔ پھر یہ اتفاق ہوا کہ ابوطالب ادائیگی قرض کا انتظام نہ کر سکے تو حسب وعدہ خدمت سقایہ عباس کے حوالے کر دی۔^① آنحضرت ﷺ نے اس کا احترام فرمایا۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد بھی یہ خدمت سقایہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے نام پر ہی باقی رکھی۔

پورے عرب پر قریش کا ہمہ گیر اثر

نظام بت پرستی:

پورے عرب کو چند منطقوں پر تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر ایک منطقہ کا بت الگ ہوتا تھا۔ اس کا مندر الگ ہوتا تھا جس کے ساتھ اس کے تمام لوازمات ہوتے تھے۔ مثلاً بنو ثقیف نے ”لات“ کو اپنا دیوتا بنا رکھا تھا۔ طائف میں اس نام کا بت تھا۔ باشندگان یثرب (قبائل اوس اور خزرج) اور جو ان کے ہم مشرب و پیرو تھے ان کا مخصوص دیوتا ”منات“ تھا جو ساحل سمندر پر مشعل کے ایک جانب قدید میں تھا جو ایک مقام کا نام تھا۔^②

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے جو دیوتا بنا رکھے تھے جب عرب میں بت پرستی کا رواج ہوا تو احمائی ذہنیت نے ان فراموش شدہ دیوتاؤں کو پھر یاد دلادیا۔ پھر کسی طرح وہ مورتیاں بھی برآمد کر لی گئیں تو مختلف قبائل ان دیوتاؤں کے بھگت (پوجاری) ہو گئے۔ سیدنا حضرت عبداللہ بن عباس

① البدایہ والنہایہ ص ۷۳۲ ج ۲

② بخاری شریف ۳۲۲

(قیصر روم^۱ نے اس کو ملک بھی پہنچائی تھی)

قصی کے پوتوں نے ان تعلقات کو وسیع کیا اور لطف کی بات یہ ہے کہ ایران، روم، حبش اور ملوک یمن آپس میں ایک دوسرے کے حریف تھے مگر آل عبد مناف (قصی کے پوتوں) نے سب سے قریش کے لئے یکساں حقوق اور رعایتیں حاصل کر لیں۔ چنانچہ مطلب نے شاہ حبش (نجاشی) اور اس کے حریف شاہان یمن (ملوک حمیر) سے، نوفل نے شہنشاہ ایران (کسری) سے اور ہاشم نے بازنطینی شہنشاہ ہرقل سے قریش کے لئے آزاد تجارت کے فرامین حاصل کر لئے۔^۲

ابن سعد کا بیان ہے: ہاشم ایک شریف آدمی تھا۔ یہی ہاشم ہے جس نے قیصر (شہنشاہ روم) سے یہ حلف لیا تھا (فرمان حاصل کر لیا تھا) کہ اس کے حدود مملکت میں قریش کو آزادی ہوگی۔ ان کے جان و مال کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ قیصر روم نے یہ فرمان اپنی مملکت کے لئے دیا اور اپنے دوست ملک (حبش) کے بادشاہ نجاشی کو بھی لکھ دیا کہ وہ اپنے ملک میں قریش کو آمد و رفت اور کاروبار کی اجازت دیں۔^۳

ہاشم نے فرامین سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قریش کی تجارت کو منظم کیا۔ تجارتی قافلوں کا ایسا پروگرام بنایا کہ وہ سال بھر رواں رہتے اور جہاں جاتے موسم کی خوشگواری ان کا استقبال کرتی۔ سردیوں میں یمن کی طرف جاتے اور حبشہ تک تجارتی قافلے پہنچتے اور گرمیوں میں شام کی طرف غزہ تک اور کبھی انقرہ تک تجارتی قافلے پہنچتے تھے۔ بسا اوقات ہاشم خود ان کی قیادت کرتا تھا۔^۴

دیگر قبائل کے لئے مراعات:

ان طویل راستوں میں جو قبائل پڑتے تھے ان کے لئے مراعات یہ تھیں کہ قریش کے قافلے ان کا سامان بھی لے جاتے۔ مزید احسان یہ کرتے کہ سامان لیجانے لانے کا محصول تو درکنار بار برداری کا خرچ بھی نہ لیتے تھے۔^۵

مکہ مکرمہ پورے عرب کا مرکزی شہر (ام القریٰ) تھا۔ سیاسی قیادت کے لئے یہی کافی تھا کہ قریش ام القریٰ پر قابض اور اس کے مالک تھے۔ مزید برآں آل مناف نے پڑوسی ممالک سے یہ

^۱ بازنطینی شہنشاہ کو عرب قیصر کہا کرتے اور ایران کے شہنشاہ کو کسریٰ اور شاہ حبش کو نجاشی کہا کرتے تھے۔

^۲ طبقات ابن سعد ۴۳ جلد ۱،

^۳ ابن سعد ۴۵ ج ۱

^۴ ابن سعد ۴۳، ۴۵، ج ۱

^۵ ابن سعد ۴۵ قرآن حکیم نے اس سلسلہ کو ایلاف سے تعبیر کیا ہے (یعنی مانوس کرنا) تفریح آگے آئے گی۔

انشاء اللہ۔

رعایتیں حاصل کر کے قریش کے آسان قیادت کو ماہ و پروین اور کہکشاں سے آراستہ کر دیا۔ اب پورا عرب قریش کا کلمہ گو اور اس کے احسانات کا ممنون تھا۔

عرب کا تجارتی نظام اور قریش کی سربراہی

بت پرستی کے منظموں کی طرح عرب کے ایسے علاقے بھی ہو گئے تھے جن کو تجارتی منطقہ کہا جاسکتا تھا۔

قصیوں اور شہروں میں چھوٹے بڑے بازار بھی تھے۔ ہفتہ وار بازار بھی جگہ جگہ لگا کرتے تھے۔ لیکن ہر ایک منطقہ کے مرکزی مقام پر ایک میلہ سالانہ ہوتا تھا جس میں نہ صرف عرب بلکہ قریب کے (غیر عرب) علاقوں کے تاجر بھی مال لاتے، دوکانیں لگاتے اور نفع کماتے تھے۔ یہ پہلے سال کے بارہ مہینوں میں دائر ساز رہتے۔ مورخین نے ان میلوں کی تفصیل و ترتیب یہ بیان کی ہے۔

(۱) دومتہ الجندل میں جو شام و حجاز کے مابین ہے۔ یکم ربیع الاول کو میلہ لگتا جو پورے مہینہ رہتا۔
(۲) یہاں سے لوگ چل کر بحرین میں مشعر آتے۔ یہاں یکم سے آخر جمادی الاخریٰ تک میلہ لگتا اور دومتہ الجندل کی طرح یہاں بھی مقامی حکمران کو عشر (دس فیصدی) (چنگی یا کسٹم) دیا جاتا۔ ایران تک کے تاجر سامان لے کر یہاں آتے۔
(۳) یکم رجب کو مشعر سے بازار اجڑتا تو صحار کے لئے روانگی ہوتی جو عمان کا پر رونق شہر تھا۔ تقریباً بیس دن راستہ میں صرف ہوتے۔ یہاں پانچ دن کا میلہ ہوتا اور بادشاہ جلدی کو عشر دیا جاتا تھا۔

(۴) رجب کے آخر میں دبا کا میلہ شروع ہوتا۔ یہ عرب کی دو بڑی بندر گاہوں میں سے ایک تھا۔ یہاں سندھ، ہند، چین اور مشرق و مغرب کے لوگ آتے اور خشکی اور سمندر کے راستوں سے سامان لاتے، یہاں کا عشر بھی بادشاہ جلدی کو ملتا۔

(۵) اس کے بعد مہرہ کے شہر شمر میں وسط شعبان سے میلہ لگتا جہاں بری اور بحری جہاز دبا سے چل کر آتے۔ یہ کھالوں اور کپڑے کی خاص منڈی تھی۔ مقامی پیداوار کی جنسیں ایلو، لوبان وغیرہ بھی یہاں سے خریدی جاتیں۔

(۶) پھر یکم رمضان سے عدن میں میلہ لگتا۔ عدن میں جو عطر بنتا تھا اس کی دور دور تک شہرت تھی۔ بحری راستہ سے آنے والے سندھ اور ہند تک اور خشکی کے راستہ سے آنے والے ایران اور روم تک یہاں کا عطر لے جاتے تھے۔ یہاں کا عشر ایران کے نو آباد کار افسر لیتے تھے۔

بھی قریش کو سربراہی حاصل تھی۔

(۲) قریش نے جب تجارت کو منظم کرتے ہوئے رحلتہ الشتاء والصیف موسم گرما اور سرما کی قافلوں کا طریقہ ایجاد کیا اور اس طرح ان کا تجارتی سلسلہ عرب کے چپے چپے میں پھیل گیا تو انہوں نے ایک حفاظتی فوج بھی تیار کی جس میں حبشی غلام اور تنخواہ دار سپاہی ہوتے تھے۔ اس کو قائمہ کہا جاتا تھا۔ یہ فوج قریش کے قافلوں کی طرح حلیف قبائل کے قافلوں کی بھی حفاظت کرتی تھی۔^۱

(۳) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے عرب میں نہ کوئی سلطنت تھی نہ حکومت، نہ فوج، نہ پولیس، البتہ قبائلی معاہدات کا ایک سلسلہ تھا جو افراد کی جان و مال کی حفاظت کا ذریعہ ہوتا تھا۔ قبائل کے معاہداتی گروپ تھے۔ جو فرد کسی گروپ سے تعلق رکھتا تھا تو پورا گروپ اس کی حفاظت کا ذمہ دار تھا۔ اس ذمہ داری کا نام خفارت^۲ تھا۔ راہرو کو اس کی سند دیدی جاتی تھی تو وہ اس گروپ کے حدود تک محفوظ رہتا تھا۔ اس سند کو بھی خفارت ہی کہا جاتا تھا (یعنی پروانہ راہداری یا ویزا) کبھی خفارت پر معاوضہ بھی لیا جاتا تھا۔

قریش کے تعلقات کا دائرہ پورے عرب کو گھیرے ہوئے تھا تو اس کا ”پروانہ راہداری“ خفارہ بھی پورے عرب کے لئے کافی ہوتا تھا۔

(۴) تنظیم تجارت اور تجارتی قافلوں کے ذریعہ جب دوسرے ممالک سے تجارتی تعلقات قائم ہوئے تو پہلے تو یہ ہوا کہ تجارتی قافلے والہی کے وقت شام اور یمن وغیرہ سے غلہ بھر کر لاتے تھے تو مکہ اور اطراف مکہ جہاں کاشت کا نام و نشان نہیں تھا وہاں غلہ کی فراوانی ہو گئی۔ پھر ان ممالک کے باشندوں نے خود بھی غلہ کی روانگی (سپلائی) شروع کر دی۔ خشکی کے راستوں سے بھی غلہ آتا اور بحری راستہ سے بھی جدہ کی بندرگاہ پر غلہ اتارا جاتا تھا۔^۳

یہ تھے وہ اسباب جن کی بناء پر قریش کو مذہبی عظمت اور سیاسی قیادت کی طرح اقتصادی برتری اور تجارتی سربراہی بھی حاصل ہو گئی۔

۱۔ الحجر ل محمد بن حبیب

۲۔ زیر عنوان معاہداتی حکومت

۳۔ اس ذمہ داری کی خلاف ورزی کو اخیاء کہتے تھے۔ کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانه من صلی القذاۃ فی ذمۃ اللہ فلا یخفرن اللہ فی ذمۃ (صحیح البخاری)

۴۔ ابن قتیبہ کے استاذ محمد بن حبیب التوئی ۲۳۵ھ، ۸۵۹ عیسوی نے اپنی کتاب الحجر میں اس کی تفصیل دی ہے ص ۲۶۳، ۲۶۴۔

(۷) عدن کے بعد صنعاء (یمن) کا میلہ لگتا جو وسط رمضان سے آخر رمضان تک رہتا۔ یہاں روٹی، زعفران، مختلف قسم کے رنگوں اور لوہے کی منڈیاں تھیں یہاں کا عشر بھی شاہ ایران کا گورنر لیتا تھا۔

(۸،۹) وسط ذی قعدہ سے آخر ماہ تک دو میلے لگتے:

(الف) رابیہ میں جو علاقہ حضر موت کا ایک شہر تھا۔

(ب) عکاظ میں جو مکہ اور عرفات کے درمیان شہر تھا۔

(۱۰) عکاظ کے قریب ذی الحجاز ہے۔ یہاں یکم ذی الحجاز سے میلہ لگتا جو دس ذی الحجاز تک رہتا۔

(۱۱) زمانہ حج میں (۱۰ ذی الحجاز سے ۱۵ ذی الحجاز تک) منیٰ میں میلہ لگتا۔

(۱۲، ۱۳) منیٰ سے فارغ ہو کر لوگ خیبر یا میامہ جاتے جہاں محرم کی دسویں سے میلے لگتے۔

(۱۴، ۱۵) اس کے بعد جنوبی فلسطین میں بصریٰ اور اذرعات کے میلے لگتے۔^۱

ان تمام میلوں میں سب سے زیادہ اہمیت عکاظ اور ذوالحجاز کے میلوں کو تھی۔ کیونکہ (الف) یہ میلے شہر حرم میں لگتے تھے۔ جو پورے عرب کے لئے امن و پناہ کے مہینے تھے۔ اس لئے سب طرف سے بڑی بڑی تعداد میں تاجر اور زائرین امن کی بانسری بجاتے ہوئے یہاں آتے، رسومات حج ادا کرتے، مال خریدتے اور عیش و تفریح کی مجلسیں جماتے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس میلہ میں عام نگرانی، حفاظت اور جو ہنگامے ہو جاتے ان کے مقدمات کی سماعت اور ان کا فیصلہ کرنا ”قبیلہ تمیم“ کے متعلق ہوتا تھا۔ جبکہ قبیلہ تمیم کا مسکن عرب کی انتہا، مشرق تھا اور مکہ و عکاظ انتہا مغرب میں تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ان میلوں سے پورے عرب کا تعلق رہتا اور تعلق بھی عقیدہ تمندانہ ہوتا تھا۔

میدان تجارت میں قریش کی سربراہی

(۱) عکاظ اور ذی الحجاز کے مذکورہ بالا عظیم الشان میلوں کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ تھی کہ اس موقع پر بڑے بڑے اجتماعات بھی ہوا کرتے تھے جن میں پورے عرب کے اساتذہ شعر و سخن شرکت کرتے، ادبی مقابلے ہوتے، دھوم دھام سے مشاعرے ہوتے۔ مشہور مقررین کی تقریریں ہوتیں جن میں وہ اپنے قبائل کے کارنامے بیان کرتے۔ مختصر یہ کہ مذہبی جشن (حج) کے ساتھ قومی جشن بھی منائے جاتے تھے۔ ان میلوں کے جملہ انتظامات قریش سے متعلق تھے یا قریش کے تعاون سے ہوتے تھے۔ اس طرح میلوں کے سلسلہ میں

۱۔ کتاب الحجر واسواق العرب ل محمد بن حبیب (مروئی)

واقعہ اصحاب فیل

قصی کا زمانہ بظاہر چوتھی صدی عیسوی کا وہ ابتدائی نصف ہے جب مسیحیت، جدید ترتیب کے ساتھ ظہور پذیر ہوئی تھی۔ تثلیث کو جزو دین بنایا گیا تھا اور قسطنطین اول نے مسیحیت قبول کر کے حکومت کا مذہب بھی عیسائیت قرار دیدیا تھا۔ جب مسیحیت کا مرکز رومۃ الکبریٰ اٹلی بنا تو مسیحیت کی لہر ان تمام علاقوں میں پہنچی جو بازنطینی شہنشاہیت کے زیر اثر اور اس ہلاک میں داخل تھے۔ عرب کے وہ علاقے جو شام سے متصل تھے، افریقہ کے علاقے خصوصاً حبش اور یمن کے بھی کچھ علاقے عیسائیت سے متاثر ہوئے۔^①

بازنطینی شہنشاہ (قیصر روم) نے قصی کی امداد کی پھر ہاشم کے ساتھ یہ مراعات کی کہ قیصر نے اپنی طرف سے بھی اس کو آزادانہ تجارت کا پروانہ دیا اور شہنشاہ حبش سے بھی مراعات دلوائی۔ اس کا مقصد خالص سیاسی بھی ہو سکتا ہے کہ ایران کے مقابلہ میں عربوں کو اپنی طرف مائل اور تجارتی راستوں کو اپنے زیر اثر رکھے۔ اور اس کا مقصد مذہبی بھی ہو سکتا ہے کہ عرب میں عیسائیت کو رواج دے۔ غالباً اسی سلسلہ کی آخری کڑی یہ تھی کہ ابرہہ نے (جو خود عیسائی تھا اور حبش کے عیسائی بادشاہ نجاشی کی طرف سے یمن کا گورنر تھا) یمن کے مرکزی شہر صنعاء میں نہایت عظیم الشان کلیسا تعمیر کرایا^② تو عربوں کو ہدایت کی کہ وہ خانہ کعبہ کے بجائے اس کلیسا کو اپنا معبد بنائیں اور اسی کا طواف کیا کریں۔ مگر جب عربوں نے اس کا انکار کیا تو ابرہہ نے لشکر کشی کر دی۔

ابرہہ نے دریافت کیا: آپ کیا چاہتے ہیں۔ خواجہ عبدالمطلب نے جواب دیا۔ آپ کی فوج نے میرے دو سو اونٹ لوٹ لئے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ ان کو واپس کرادیں۔ ابرہہ حیران ہوا۔ اس نے ترجمان سے کہا: ان سے کہو کہ آپ کی وجاہت اور شاندار صورت سے میں متاثر ہوا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ آپ کوئی بڑا مطالبہ پیش کریں گے، آپ نے صرف اپنے اونٹوں کی واپسی کی درخواست کی اور تعجب ہے آپ نے اس کعبہ کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا جو آپ کا اور آپ کے آباؤ اجداد کا دین اور دھرم رہا ہے۔

خواجہ عبدالمطلب نے جواب دیا:

”اس بیت کا ایک رب ہے اس کا محافظ وہ ہے اس کی فکر وہ کرے گا۔ میں اس بیت کا مالک نہیں ہوں، میں ان اونٹوں کا مالک ہوں جن کی واپسی کی میں نے درخواست کی ہے۔“
ابن ہشام^③ کی روایت ہے کہ حناطہ نے عبدالمطلب سے پہلے دو اور سرداروں کو پیش کیا تھا۔

① تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو عہد زریں ص، ۳۰۱ تا ۲۸۴

② ابن سعد ص ۵۵، ج ۱

③ سیرۃ ابن ہشام ص ۳۳ جلد ۱

ایک قبیلہ بنی بکر کے شیخ عمر بن نفاشہ اور دوسرے قبیلہ ہذیل کے سردار خویلد بن نائلہ۔ ان دونوں نے یہ پیش کش کی تھی کہ مکہ میں جو کچھ دولت ہے اس کی ایک تہائی ابرہہ منظور کر لے اور ہدم کعبہ کے ارادہ سے باز آجائے۔ مگر ابرہہ نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا۔ اس روایت کو سامنے رکھا جائے تو عبدالمطلب کی یہ موقع شناسی تھی کہ انہوں نے کعبہ کے متعلق ابرہہ سے کوئی بات ہی نہیں کی۔ صرف اپنے اونٹوں کی بات کی اور کعبہ کا معاملہ رب کعبہ کے حوالہ رکھا۔

ابرہہ نے اونٹ واپس دلوا دیئے۔ عبدالمطلب ان کو لے کر مکہ میں آئے۔ تمام اونٹ^① قربانی کے لئے وقف کر دیئے اور مکہ والوں کو ہدایت کی کہ شہر خالی کر کے پہاڑوں پر چلے جائیں۔ پھر تنہا اور ایک روایت کے مطابق چند ساتھیوں^② کو لے کر حرم کعبہ میں آئے اور خانہ کعبہ کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر حلقہ باب کو سنبھالا اور یہ منظوم دعا^③ کی:

۱۔ لاہم * ان العبدینم رحلہ فامنع حلالک

۲۔ لا یغلین صلیبہم ومحالہم غدّ ومحالک

۳۔ ان کنت تارکھم وقبیلتنا فامر مابدالک

یہ تین اشعار ابن سعد اور ابن ہشام نے نقل کئے ہیں۔ ان کے علاوہ یہ دو شعر بھی مروی ہیں:

۴۔ جدوا جموع جموعہم والغیل کی ے سبوعیالک۔

۵۔ عبدوا حیاک بکیدیہم۔ جھلا ومار قہوا جلالک

ترجمہ: (۱) اے اللہ! ایک غلام اپنے کجادہ کی حفاظت کرتا ہے۔ بس خداوند تو ان کی حفاظت کر جو تیرے بیت کے پڑوسی اور مجاور ہیں۔ (۲) ایسا ہرگز نہ ہو کہ ان کی تدبیر اور ان کا کمرو فریب کل کو تیری تدبیر پر غالب آجائے۔ (۳) اگر میں ان دشمنان کعبہ کو اور اپنے قبیلہ کو چھوڑ کر جا رہا ہوں (کہ میں مجبور اور بے بس ہوں۔ میرے لئے کوئی چارہ کار نہیں ہے تو خداوند!) جو تیرا ارادہ ہو اس کا حکم کر دے۔ (۴) یہ اپنے بے شمار لشکروں کو لے آئے ہیں اور ہاتھیوں کو لائے ہیں تاکہ باشندگان مکہ کو جو تیرے عیال ہیں قید کر لیں۔ (۵) انہوں نے اپنے کمرو فریب اور جہالت سے تیرے حما (محفوظ علاقہ۔ حرم) کا قصد کیا ہے۔ انہوں نے تیری عظمت کا پاس و لحاظ نہیں کیا۔“

اس کے بعد کیا ہوا۔ تاریخ عالم کا وہ عبرت انگیز اور ہولناک حادثہ پیش آیا جس کا تذکرہ قرآن حکیم نے بھی کیا ہے۔ مورخین کا بیان ہے کہ ابرہہ عظیم الشان مسلح فوج کے ساتھ تیرہ قلعہ

① ابن سعد ص ۵۶، ج ۱

② عمرو بن عائذ۔ مطعم بن عدی۔ ابو مسعود ثقفی ابن سعد ص ۵۶، ج ۱

③ عبدالمطلب نے جو ابابت دیئے ان سے نیز اس دعا سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خدا پرست موحّد تھے: والا شہد انہ من اهل الفاتحة ومن لم تبلغه الدعوة (حاشیہ سیرۃ ابن ہشام ص ۳۳، ج ۱)

* اصل اللہم

ٹھکن ہاتھی لایا تھا۔ ان میں سب سے بڑا ہیبت ناک اور بڑے ذیل ڈول کا ہاتھی محمود تھا۔ وہ ہاتھیوں کی کمان کر رہا تھا۔ جب حملہ کا وقت آیا تو یہ ہاتھی اپنی جگہ جم گیا۔ بہت مارا پینا مگر یہ آگے کی طرف حرکت نہ کرتا، دائیں بائیں اس کا رخ کر دیا جاتا تو خوب لپک کر چلتا۔

یہاں ہاتھی کا یہ تماشا ہو رہا تھا۔ ادھر آسمان پر پرندوں کی قطار نمودار ہوئی۔ ایک پرندہ تین کنکریاں لئے ہوئے تھا۔ ایک ایک چونچ میں دو دو پتھوں میں۔ یہ کنکریاں چنے کی اور مسور کے دانے کے برابر تھیں۔ یہ کنکریاں جس پر پڑتیں اس کا چورا کر دیتی تھیں۔ پھر پانی کی ایک رو آئی اس نے ان سب کو بہا کر سمندر میں ڈال دیا۔ ابرہہ اور اس کے مخصوص ساتھی اس وقت ختم نہیں ہوئے۔ وہ بھاگے اور طرح طرح کی تکلیفوں میں مبتلا ہو کر راستہ ہی میں مر گئے۔ ابرہہ کو ایسی بیماری لگی کہ اس کا بدن گل گیا، ایک ایک عضو گل کر گر تار ہا۔ وہ صنعا پہنچ گیا مگر اس حالت میں پہنچا کہ گوشت کالو تھڑا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس کا سینہ پھٹا۔ دل باہر نکل آیا اور دل کے ساتھ جان بھی نکل گئی۔^①

واقعہ اصحاب فیل کے نتائج

جیسے یہ واقعہ غیر معمولی تھا، قدرتی بات تھی کے نتائج بھی غیر معمولی ہوئے۔ سیاسی لحاظ سے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ:

- (۱) عربوں کو قیصر روم اور اس کے ماتحت حکومتوں سے نفرت ہوئی۔ اس واقعہ سے تقریباً پچاس سال بعد جب روم کی فوجوں کو ایران نے شکست دی تو مکہ والے بہت خوش ہوئے۔^②
- (۲) یمن کی وہ طاقتیں جو ابرہہ کی طاقت کے سامنے جھک گئی تھیں ابھریں اور انہوں نے شہنشاہ ایران (کسریٰ) سے مدد لے کر ابرہہ کے باقی ماندہ اثرات کو یمن سے ختم کیا۔
- (۳) یمن کی یہ ابھرنے والی طاقتیں اچھی صلاحیت نہیں رکھتی تھیں۔ ان میں خانہ جنگی شروع ہو گئی تو کسریٰ نے براہ راست یمن کے ایک علاقہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور وہاں اپنا گورنر مقرر کر دیا۔^③

تصدیق کلام

اصحاب فیل کا یہ واقعہ جس طرح قادر ذوالجلال کی قدرت بے پایاں کا مظاہرہ تھا ایسے ہی قریش پر احسان عظیم بھی تھا۔ قریش خراب و خستہ تھے مگر رب ذوالجلال کو ان سے کام لینا تھا۔ یہی قریش تھے جنہوں نے کچھ دنوں بعد دنیا کا چولا بدلا اور عالم انسانیت کو ایسے زیور سے آراستہ کیا جو

① ابن ہشام ۵۳ھ

② سورہ روم کی ابتدائی آیتوں میں اس کی طرف اشارہ ہے

③ جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو کسریٰ کی طرف سے یمن کا گورنر باذان تھا جو دولت اسلام سے مشرف ہوا۔ (ابوالفداء)۔

اسی طرح بے مثال و بے نظیر ہے جس طرح تاریخ عالم میں اصحاب فیل کا واقعہ بے نظیر ہے۔ سورہ فیل میں اللہ تعالیٰ نے اسی احسان عظیم کا تذکرہ فرمایا ہے۔ خطاب اگرچہ آنحضرت ﷺ کو (یا ہر اس شخص کو ہے جو قابل خطاب ہو) مگر روئے سخن قریش کی طرف ہے۔ ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے الفاظ میں کسی قدر تشریح کے ساتھ یہ ہے:

”تو نے نہیں دیکھا، کیا کیا تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ۔ کیا نہ کر دیا ان کا داؤ غلط۔ اور بھیجے ان پر اڑتے جانور تنگ تنگ (کنکریاں بنا کر) پھینکتے ان پر پتھریاں کنکری (ٹھیکرے کی) پھر کر ڈالا ان کو جیسے بھس ہو کھا یا ہوا۔“

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے قریش کو خاص طور سے حکم دیا ہے کہ وہ رَبِّ هَذَا الْبَيْتِ کی عبادت کریں اور اس حکم کی معقولیت کے لئے وہ احسانات شمار کرائے ہیں، جن کی تفصیل وہ ہے جو اس کتابچہ کے اوراق میں پیش کی گئی۔ مختصر یہ ہے کہ

(۱) اس سورت میں سب سے زیادہ بیت پر زور دیا گیا ہے، یہاں تک کہ ذات معبود کے لئے اللہ یار حمن کے بجائے رَبِّ هَذَا الْبَيْتِ کا لفظ لایا گیا ہے کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ عظمت قریش کے قلعہ معلیٰ کا سنگ بنیاد بیت ہی تھا (یعنی کعبہ)۔

(۲) یہی بیت تھا جس کی وجہ سے قریش کا اثر عرب پر قائم ہوا۔ قریش نے بیت کی خدمت کی اور وہ عرب کے سر تاج بنے۔

(۳) قریش نے بیت اللہ کی زیارت کرنے والوں (حجاج) کی خدمت کی وہ پورے عرب میں محبوب ہو گئے۔

(۴) یہی محبوبیت تھی جس کی بناء پر پورے عرب کی پر آشوب اور خوں آشام زمین ان کے لئے امن کا گہوارہ بن گئی۔ چار ماہ کے بجائے پورے بارہ ماہ ان کے لئے حرم رہتے تھے اور بلا خطر جہاں چاہتے جاتے تھے۔

(۵) یہی عظمت تھی جس کی بنا پر وہ قیصر و کسریٰ اور نجاشی تک پہنچے اور ان سے تجارت کے پروانے حاصل کئے۔

(۶) اندرون عرب عربوں کی عقیدت اور ان کی اراد تمندی اور احسان شناسی اور بیرون عرب فرامین شامی کی طاقت نے قریش کو موقع دیا کہ ان کا رہنما ہاشم رَحْلَةَ الشَّيْءِ اور رَحْلَةَ الصَّيْفِ کا طریقہ ایجاد کر سکا اور تجارت کو منظم کر سکا۔

(۷) مکہ اور اطراف مکہ میں غلہ عثقا تھا۔ شکار کا گوشت اور کھجوریں عام غذا تھیں۔ رَحْلَةَ الشَّيْءِ وَ الصَّيْفِ کی ایجاد نے ان کو موقع دیا کہ وہ واپسی کے وقت غلہ لاسکیں اور عرب کا فائدہ توڑ سکیں۔

(۸) کلبی کی تحقیق یہ ہے کہ ہاشم ابن عبد مناف پہلا شخص ہے جو شام کے علاقہ میں تجارتی قافلہ لے کر گیا اور وہاں سے گیہوں بھر کر لایا۔^۱

(۹) اسی سورت کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد یہ ہے کہ قریش کی حالت نہایت ابتر تھی وہ فاقہ کش تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہاشم کو توفیق بخشی کہ انہوں نے رَحْلَةَ الْبُشْتَاءِ وَالصَّيْفِ کا طریقہ ایجاد کیا۔ اب ان کو بہت کافی نفع ہوتا تھا۔ بڑے تاجر اپنے منافع غریبوں اور فقیروں کو تقسیم کر دیا کرتے تھے تو ان کے فقیر بھی امیروں کی طرح ہو جاتے تھے۔^۲

(۱۰) جب رَحْلَةَ الْبُشْتَاءِ وَالصَّيْفِ سے تجارتی تعلقات دوسرے ممالک سے قائم ہو گئے تو پھر غلہ کی درآمد کیلئے ان قریشی قافلوں کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ بلکہ دوسرے ممالک خود غلہ بھیجنے لگے۔ یمن میں ثبالہ اور جرش میں بہت غلہ پیدا ہوتا تھا۔ وہاں کے کچھ تاجر بحری راستہ سے بندر گاہ جدہ پر غلہ پہنچاتے تھے۔ کچھ تاجر خشکی کے راستہ سے براہ راست مکہ غلہ پہنچاتے تھے۔ اسی طرح شام کے تاجر بھی غلہ سپلائی کرتے تھے۔^۳ یہ اونٹ اور خچر اور گدھے جن پر خشکی کے راستوں سے غلہ آتا تھا ان کا پڑاؤ محبت ہوتا تھا جس کو ابلح، بطحا اور خیف بنی کنانہ بھی کہتے تھے۔^۴ جو مکہ اور منی کے درمیان ہے۔ یہ ہے اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوعٍ (کھانا دیا بھوک میں) کا احسان عظیم۔

(۱۱) حرم کعبہ کا احترام اگرچہ حضرت اسماعیل و حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے چلا آرہا تھا اور اس وجہ سے حرم مکہ کے رہنے والے مامون رہا کرتے تھے۔ مگر جب رَحْلَةَ الْبُشْتَاءِ وَالصَّيْفِ کے سلسلہ میں مامونیت کا تذکرہ ہے تو اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ قریش کے یہ سرمائی اور گرمائی قافلے مال لیجانے اور لانے میں راستہ کے قبائل کی جو خدمت کیا کرتے تھے، اس حسن سلوک نے قریش کو خارج حرم ان قبائل کی حدود میں بھی محفوظ و مامون کر دیا تھا جن کا پیشہ ہی غارتگری تھا۔ عبادت رب کے حکم کی معقولیت سمجھانے کیلئے ان گیارہ احسانات کی طرف اس سورت (سورہ قریش) میں اشارہ کیا اور ایک احسان عظیم وہ تھا کہ مکہ اور اہل مکہ کو اصحاب فیل سے محفوظ رکھا۔ اس کی نوعیت چونکہ جداگانہ تھی کہ وہ دنیاوی اسباب سے بالا و برتر شخص اللہ تعالیٰ کی قدرت کا معجزہ تھا، تو اس کو مستقل سورت میں ذکر فرمایا اور بظاہر یہی حکمت ہے ان دونوں سورتوں کے متصل ہونے کی۔

۱ تفسیر مظہری (تفسیر سورہ قریش)

۲ ایضاً

۳ معالم التنزیل

۴ معجم البلدان

ولادت محمدی ﷺ

ظہور بشارت عظمیٰ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو بشارت دی تھی یاقی من بعدی اسبہ احمد (میرے بعد ایک رسول آئے گا جس کا نام احمد ہوگا) (۶۱:۶)

۱۲۵ اپریل ۵۷۱ء کو اس جان آفریں بشارت کا ظہور ہوا۔

صبح کا سہانا وقت تھا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا کہ ہدایت و رحمت کا یہ آفتاب افق مکہ پر طلوع ہوا۔ ربیع الاول کی بارہ تھی۔^①

نام نامی:

اس چہیتے بچہ کا نام دادا نے ”محمد“ والدہ نے ”احمد“ رکھا۔ باپ (عبداللہ) کا انتقال دو مہینے پہلے ہو چکا تھا۔^②

والدہ کا نام آمنہ تھا اور دادا کا نام عبدالمطلب جو قریش کے سردار اور مکہ کے بڑے لوگوں میں سے تھے۔ آمنہ کے باپ کا نام وہب تھا پسر عبدمناف پسر زہرہ پسر کلاب پسر مرہ۔ کلاب پر ماری اور پدری دونوں سلسلے جمع ہو جاتے ہیں۔

① مشہور یہی ہے ہذا ہوا المشہور عند الجمہور (البدایہ والنہایہ ۲۶۰ ج ۲) مگر مورخین نے ۱۲ کے علاوہ اور تاریخیں بھی بیان کی ہیں۔ فلکیات کے ماہر علامہ محمود فلکی نے ۹ ربیع الاول صحیح قرار دی ہے۔ حضرت الاستاذ العلام الحدیث مولانا سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ان کے علاوہ علامہ شبلی عظیمی نے بھی علامہ محمود فلکی کی تحقیق کو تسلیم کیا ہے۔ یعنی ۹ ربیع الاول ۱۲۱ اپریل ۵۷۱ء

② وہ تجارتی قافلہ میں شام گئے تھے غلہ لینے کے لئے۔ واپسی میں جب قافلہ مدینہ پہنچا تو عبد اللہ بیمار ہو گئے۔ مدینہ کے مشہور قبیلہ بنی عدی بن نجار سے نانہالی رشتہ تھا۔ عبد اللہ یہیں ٹھہر گئے قافلہ والوں نے مکہ پہنچ کر خواجہ عبدالمطلب کو عبد اللہ کی بیماری کی خبر دی۔ عبدالمطلب نے اپنے بڑے لڑکے حارث کو مدینہ بھیجا۔ مگر عبد اللہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ دارالابنہ میں ان کو دفن کیا گیا۔ پچیس سال عمر ہوئی۔ ترکہ میں بکریوں کا ایک گلہ، پانچ اونٹ ایک باندی ”ام ایمن“ چھوڑی۔ (طبقات ابن سعد ص ۶۱ ج ۱)

رضاعت و شیر خوارگی اور مرضعات (دودھ پلانیوالی مائیں)

زعم برتری اور خوش حالی کا ایک تکلف یہ تھا کہ بیگمات اپنے بچوں کو خود دودھ نہیں پلاتی تھیں۔ کچھ عرصہ بچہ ماں کے پاس رہتا تو دودھ پلانے میں خاندان کی عورتیں یا باندیاں مدد کیا کرتی تھیں۔ پھر بچہ کو مستقل طور پر کسی ماما کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔

قریش کو اپنی زبان سے عشق تھا۔ وہ شخص قوم کا سردار نہیں مانا جاسکتا تھا جو فصیح نہ ہو۔ بچپن ہی سے زبان کی حفاظت کی جاتی تھی اور بچوں کو فصیح عربی کا عادی بنایا جاتا تھا۔ مکہ شہر میں یہ ممکن نہیں تھا کہ بچے لکسالی فصیح عربی کے عادی ہوں کیونکہ یہ ایک تیر تھ تھا جہاں غیر قریشی عرب جو فصاحت سے ناشاہوتے تھے، ہمیشہ آتے رہتے تھے۔ یہاں قیام کرتے تھے۔ تجارت کے سلسلہ میں بھی آمد و رفت رہتی تھی اور زبان کے لحاظ سے سب سے زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ یہاں عجمی (شام اور افریقہ وغیرہ کے غلام) بکثرت رہتے تھے۔ ایک ایک گھرانے میں کئی کئی غلام ہوتے تھے۔ ان کی مخلوط عربی مستحکمہ خیز ہوتی تھی اور بچوں کا واسطہ زیادہ تر انہیں غلاموں سے پڑتا تھا۔ اس لئے قریش نے کچھ ایسے دیہاتی قبائل منتخب کر رکھے تھے جن کی زبان فصیح مانی جاتی تھی۔ انہیں قبائل کی عورتوں کو وہ اپنے بچوں کی ”ماما“ بناتے تھے۔ ان قبائل کی عورتیں مکہ میں آتیں اور بچوں کو لے جاتیں۔ وہی دودھ پلاتیں اور وہی پرورش کرتیں۔ انہیں کی لکسالی عربی کے الفاظ بچوں کے کانوں میں پڑتے۔ انہیں الفاظ کی ادائیگی کے لئے بچوں کی زبان پہلی مرتبہ پلٹتی اور فصاحت گویا ان کی گھنٹی میں پڑ جاتی۔

زبان کی حفاظت کے علاوہ صحت کے لحاظ سے بھی دیہات کی کھلی ہوا بچوں کے لئے مفید ہوتی تھی۔ اس سماجی رسم کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ بچوں کی نشوونما صحت مندانہ^③ ہو۔ اخلاق و خصائل کے لحاظ سے بھی یہ قبیلے پست نہیں تھے۔ یتیم عبداللہ کے دور رضاعت کو خاندانی آداب کے اسی سانچے میں ڈھلنا پڑا۔ چنانچہ آپ کی والدہ نے تو صرف سات یا نو روز دودھ پلایا۔ پھر ابو لہب کی آزاد کردہ باندی ثویبہ نے سات ماہ دودھ پلایا۔ ابو لہب کی باندی ثویبہ نے جب گوشہ جگر عبد اللہ کی ولادت کی خبر سنائی تو ابو لہب نے اس خوشی میں اس باندی کو آزاد کر دیا تھا۔ ان کے علاوہ کچھ اور خواتین کے نام بھی لئے جاتے ہیں جنہوں نے دودھ پلایا۔ اس کے بعد آپ حضرت حلیمہ کے سپرد کئے گئے جو آپ کو قبیلہ بنی سعد میں لے گئیں۔ کم و بیش چار سال آپ نے اسی قبیلہ میں گزارے۔

③ سیرۃ ابن ہشام ص ۱۰۱ ج ۱

سیدہ آمنہ مدینہ میں

مدینہ منورہ جس کا نام اُس وقت یثرب تھا۔ سیدہ آمنہ کا وہاں نانہیالی رشتہ تھا۔ حضرت محمد (ﷺ) حلیمہ سعدیہ کے یہاں سے آگئے تو تقریباً تیرہ سال بعد سیدہ آمنہ مدینہ گئیں۔ اپنے نور چشم لختِ جگر کو بھی لے گئیں اور خدمت کے لیے متوفی عبد اللہ کی باندی ”ام ایمن“ بھی ساتھ گئیں۔ وہاں دار النانہ میں قیام کیا۔ یتیم عبد اللہ۔ آمنہ کالال جس طرح حُسن و جمال میں موتی تھا۔ اُس کی خصلتیں بھی سب بچوں سے نرالی تھیں۔ ذہین بچے شریر ہوتے ہیں مگر آمنہ کے اس جگر گوشہ میں ذہانت تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، شرارت کا نام نہ تھا۔ ہر بات میں ادب اور تہذیب۔ ہر ایک کام سلیقہ کا۔ بھولی بھولی بات چیت بہت شیریں۔ سمجھداری اور شرافت ایسی کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ دوسروں سے تذکرہ کرتے وہ اس بچہ کو دیکھنے آتے تھے۔ مدینہ سے دو دو تین تین میل کے فاصلہ پر یہودیوں کی بڑی بڑی بستیاں تھیں۔ وہاں بڑے بڑے عالم رہتے تھے۔ وہ آنے والے نبی کی پیشین گوئیاں کیا کرتے تھے اور اُس کی آمد کے منتظر تھے۔ نجومیوں اور جوتشیوں (کاہنوں) کی باتیں بھی مشہور تھیں۔ اس بچہ کی خبر رفتہ رفتہ ان یہودیوں کو پہنچتی تو وہ دیکھنے آنے لگے۔ کوئی دیکھ کر بچہ کی تعظیم کرتا اور کوئی ہکا بکا دم بخود رہ جاتا کہ جو باتیں آنے والے نبی کی ہیں وہ اس بچہ میں پائی جاتی ہیں۔ پھر اپنی تنگ نظری سے جبرِ ہونے لگتا کہ نبوت تو ہمارے خاندانوں کا حصہ ہے۔ قریش میں یہ بچہ کیوں پیدا ہو گیا۔ اس طرح کی باتیں ہونے لگیں۔ سیدہ آمنہ کو حلیمہ کی بات یاد آگئی کہ وہ ایک یہودی کے پاس اس نونہال کو لے گئی تھیں تو اُس نے شور مچا دیا تھا کہ اس بچہ کو ختم کر دو ورنہ انقلاب برپا کر دے گا، تمہارے مذہب بدل دے گا۔ سیدہ آمنہ کو فکر ہوئی انھوں نے مدینہ کا قیام مختصر کیا۔ صرف ایک مہینہ ٹھہریں۔ پھر اپنے آنکھوں کے نور، دل کے سرور کو لے کر مکہ روانہ ہو گئی۔ لیکن اس یتیم بچہ کی انوکھی بات یہ بھی تھی کہ قدرت نے ابھی سے اس کو آزمانا شروع کر دیا تھا۔ سیدہ آمنہ مدینہ سے چلیں تو طبیعت خراب ہو گئی۔ اب جیسے جیسے قافلہ چل رہا تھا، اُن کا مرض بڑھ رہا تھا۔ ایک مقام ابواء تھا۔ وہاں قافلے پڑاؤ کیا کرتے تھے۔ جب سیدہ آمنہ یہاں پہنچیں تو مرض اور بڑھ گیا۔ آگے چلنے کی ہمت نہیں رہی، مکہ کے بجائے آخرت کے لئے رختِ سفر باندھ لیا اور دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ یہیں اُن کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ”ام ایمن“ ساتھ تھیں۔ وہ اس یتیم کو جواب لیسیر بھی ہو گیا تھا، لے کر مکہ معظمہ آئیں۔ دادا کو خبر ہوئی تو بہت صدمہ ہوا۔

اس واقعہ سے تقریباً پچاس سال بعد جب آنحضرت ﷺ ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو آپ ﷺ کو بچپن کی باتیں یاد تھیں۔ آپ بتایا کرتے تھے کہ یہاں ہم ٹھہرے تھے۔ یہاں والدہ کا قیام ہوا تھا۔ یہودی مجھے آکر دیکھا کرتے تھے۔ آپ نے یہ بھی بتایا کہ ”بنی عدی بن نجار“ کے محلہ

میں ایک بادی تھی، میں اُس میں تیراکی کی مشق کیا کرتا تھا۔ ام ایمن بیان کرتی تھیں کہ مجھے خوب یاد ہے۔ یہودی کہا کرتے تھے کہ یہ بچہ اس اُمت کا نبی ہو گا، مکہ سے ہجرت کر کے آئے گا یہ اس کا دارا ہجرت ہے۔^۱

دادا عبد المطلب کی سرپرستی اور وفات

یہ غم زدہ معصوم مکہ معظمہ پہنچا تو عبد المطلب نے اپنے یتیم ویسیر پوتے کو چھاتی سے لگایا اور اپنے ساتھ رکھنے لگے۔

یہ معصوم بھی دادا سے لگ گیا اور اتنا کھل گیا کہ ان کے پاس جاتا تو بلا تکلف ان کی گدی پر بیٹھ جاتا تھا۔ خانہ کعبہ کی دیوار کے نیچے ان کے لئے فرش بچھایا جاتا تھا۔ فرش پر عبد المطلب بیٹھتے اور کنارے پر لڑکے بیٹھا کرتے تھے۔ مگر یہ معصوم ”محمد“ آگے پہنچ جاتے تھے۔ چچا تائے منع کرتے تھے لیکن عبد المطلب خوش ہوتے اپنے پاس بٹھالیتے۔ کمر پر ہاتھ پھیرتے اور فرمایا کرتے تھے یہ میرا بیٹا بہت بڑا آدمی ہو گا۔ اس کی خاص شان ہو گی۔^۲ یہودی کہتے ہیں کہ یہ نبی ہو گا۔^۳ ام ایمن جن کو برکت کہتے تھے ان کو تاکید کیا کرتے کہ دیکھو برکت! میرے محمد کا ہر وقت خیال رکھا کرو، کہیں باہر نہ جانے دیا کرو۔^۴

لیکن عبد المطلب چراغِ سحری تھے۔^۵ سو سال سے بھی زیادہ عمر ہو چکی تھی۔ صرف دو سال پوتے کی دیکھ بھال کر سکے پھر ان کی وفات ہو گئی۔ ام ایمن کہا کرتی تھیں کہ اس روز میں نے دیکھا کہ جنازے کے پیچھے ”محمد“ روتے جا رہے تھے۔ (ﷺ)

آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا: آپ کو دادا کی وفات یاد ہے فرمایا خوب یاد ہے میری عمر اس وقت آٹھ سال تھی^۶

خواجہ ابو طالب کی سرپرستی

عبد المطلب نے زندگی کے آخری ایام میں ہی یتیم عبد اللہ کو ابو طالب کے سپرد کیا۔ ابو طالب

۱ طبقات ابن سعد ج ۱، ص ۴۳

۲ سیرت ابن ہشام ص ۱۰۶

۳ طبقات ابن سعد ص ۴۵، ج ۱

۴ ایضاً ص ۴۵

۵ ایک روایت ہے کہ ایک سو دس سال اور دوسری روایت میں ہے کہ ایک سو بیس سال عمر ہوئی۔ یہ بھی روایت ہے کہ بیاسی سال عمر ہوئی جون میں دفن کیا گیا۔ طبقات ص ۴۵ ج ۱

۶ طبقات ابن سعد ص ۴۵ ج ۱

کو پہلے سے بھی اس بھتیجے سے محبت تھی اب یہ محبت اور بڑھ گئی بقول ۱ ابن عباس (رضی اللہ عنہ) اپنی اولاد سے زیادہ اس بھتیجے سے محبت کرتے تھے۔ ابوطالب کو ایسی محبت کبھی کسی سے نہیں ہوئی تھی۔ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے۔ کہیں جاتے تو ساتھ لے جاتے۔ رات کو اپنے پاس لٹاتے تھے۔ دسترخوان بچھ جاتا سب بچے بیٹھ جاتے مگر ابوطالب اس وقت تک نوالہ نہ توڑتے جب تک ان کا چہیتا ”محمد“ نہ آجاتا تھا۔ محمد کی باتیں بھی ایسی تھیں کہ ابوطالب کے دل کو لہجائی رہتیں۔ دسترخوان پر جب بچے اکٹھے ہوتے تو چچا دیکھ کر اور چھین چھٹ کرتے مگر یہ بھولے صاحبزادے ”محمد“ خاموش بیٹھے رہتے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ انہیں کچھ بھی نہ ملتا، دوسرے بچے ہی جھپٹ لیتے تھے۔ ابوطالب نے محمد کا کھانا الگ کر دیا ۲ مگر یہ بات محمد کی فطرت کے خلاف تھی کہ الگ کھائیں یا کوئی چیز ان کو مل جائے اور دوسروں کو نہ ملے۔ اس لئے الگ کھانے پر محمد راضی نہ ہوئے سب کے ساتھ ہی کھاتے اور اپنے کھانے سے زیادہ دوسروں کے کھانے سے خوش ہوتے۔ کبھی خود اپنے پاس سے اٹھا کر دیتے تھے۔

علماء سیرت و تاریخ کا ایک متفقہ بیان ہے۔ اس موقع پر اس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے:

محمد ﷺ اس کردار کے ساتھ جوانی کی منزل پر پہنچے کہ زمانہ جاہلیت کی باتوں سے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ آپ کو محفوظ رکھا۔ آپ ایسے نوجوان تھے کہ مروت میں سب سے افضل، شرافت کی باتوں میں سب سے اعلیٰ، اخلاق میں سب سے بہتر، میل جول میں نہایت شریف، جواب دینے میں نہایت مہذب اور باسلیقہ، گفتگو نہایت شیریں، سمجھ بوجھ میں سب سے برتر، نہایت بردبار، نہایت امانت دار، بات کے سچے، زبان کے پکے، ہر ایک برائی سے کوسوں دور، ہر ایک کے خیر خواہ، کبھی کسی کو آپ سے تکلیف نہ پہنچی، کبھی کسی کو سخت بات نہیں کہی، نہ کسی سے لڑائی نہ کسی سے جھگڑا کیا۔ انہیں خوبیوں نے آپ کی قوم کو آپ کا گرویدہ بنادیا۔ آپ کی سچائی اور امانتداری نے لوگوں میں جذبہ پیدا کیا کہ آپ کو الامین (الصادق) کہیں اور اسی نام سے آپ کو یاد کریں۔

اپنا تکفل خود اور دوسروں کی مدد

اپنی زندگی خود بناؤ، اپنا بوجھ خود سنبھالو، دوسروں کی مدد کرو۔

عبدالمطلب کی وفات کے بعد ابوطالب ان کے جانشین بنائے گئے۔ قبیلہ کے شیخ اور مکہ کے ایک سردار مانے گئے۔ اس لحاظ سے عزت تو کافی تھی مگر دولت ناکافی۔ بڑا کنبہ، عیال کثیر آمدنی کا ذریعہ محدود، یتیم عبداللہ (محمد ﷺ) آپ کے سپرد ہوئے تو اگرچہ یہ یتیم عمر عزیز کی ابھی آٹھویں

۱ ہادیہ و نہایہ ص ۲۸۲ ج ۲

۲ ہادیہ و نہایہ ص ۲۸۲ ج ۱

منزل ہی طے کر رہا تھا مگر چچا کی پریشان حالی کے احساس نے اس کو اس ننھی سی عمر میں ہی فکر مند بنادیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اپنے مربی چچا کی مدد وہ کس طرح کر سکتا تھا۔ مگر مکہ میں نہ کوئی دستکاری تھی نہ کوئی سرکار جس کی نوکری کی جاسکے۔ اس زمانہ کی دنیا کارخانوں سے بھی آشنا نہ تھی اور مکہ کی پتھرلی اور ریتلی زمین اور آس پاس کے جھلے ہوئے کالے اور بھوسلے پہاڑوں کو کسی چشمہ یا دریا کی سیرابی بھی میسر نہ تھی کہ وہاں کھیتی باڑی ہو سکے۔ البتہ بھیڑ بکری اور اونٹ یہاں بکثرت تھے اور قدرت نے ان کا چارہ یعنی بول کے درخت اور اذخر جیسی گھاس بھی وہاں پیدا کی تھی۔ انہیں مویشی کے گلے اس زمانہ کی قیمتی دولت تھے اور جن کے پاس یہ دولت ہوتی تھی وہ ان کے چرانے اور دیکھ بھال کے لئے مزدور اور اجیر بھی رکھا کرتے تھے۔ یہ گلہ بانی سوسائٹی کی نظر میں کچھ بھی حیثیت رکھتی ہو مگر آمدنی اور گذر کا ایک جائز ذریعہ تھی۔ سردار قریش عبدالمطلب کے یتیم پوتے محمد ﷺ نے اسی ذریعہ کو اختیار کیا اور اس کے ننھے سے وجود کے لئے اونٹوں کی گلہ بانی مشکل تھی تو بکریاں چرانے کی مزدوری کرنے لگے۔ اس طرح اپنی زندگی خود بنالی۔ اور نہ صرف یہ کہ اپنا بوجھ خود سنبھالا بلکہ پریشان حال چچا کی مدد بھی کرنے لگے۔

مکہ تجارتی نقطہ نظر سے:

مکہ کی زمین اگرچہ پیداوار کے قابل نہیں تھی مگر تجارتی کاروبار کے لئے نہایت موزوں تھی۔ یہاں مشرق و مغرب کے ڈانڈے ملتے تھے۔ ایران و عراق، یمن، شام اور افریقہ کے تجارتی تعلقات کی درمیانی کڑی یہی شہر تھا۔ قریش اس قدرتی نعمت کو پہچانتے تھے اور جہاں تک ان کی منجاش تھی وہ اس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

بعثت نبوی (آنحضرت ﷺ کے نبی بنائے جانے) سے تقریباً دو سو برس پہلے قریش کے مشہور اور ممتاز سردار ہاشم نے رحلة الشتاء والصیف (سردی اور گرمی کے موسم کے دو کوچ) کا دستور ڈال دیا تھا۔ گرمیوں میں مکہ والوں کے تجارتی قافلے شام اور انقرہ جاتے تھے جہاں اس زمانہ میں ٹھنڈ ہوتی تھی۔ وہ خوشگوار موسم، صحت بخش آب و ہوا، کا لطف بھی اٹھاتے اور تجارت بھی کرتے تھے، اور سردیوں میں یہ قافلہ حبشہ اور یمن جاتے تھے۔ ہاشم اور اس کے بھائیوں نے مختلف ممالک سے عربوں کے لئے آزاد تجارت کے سرٹیفکیٹ (پروانے) بھی حاصل کر لئے تھے۔ عرب میں قریش کی عظمت کا ایک بڑا سبب یہ تجارتی اقتدار بھی تھا۔

حضرت محمد ﷺ کی عمر نے ترقی کی اور اس قابل ہوئے کہ تجارتی قافلے کے ساتھ سفر کر سکیں تو آپ نے اس شریف پیشہ کو اپنا ناچا۔ لیکن روپیہ آپ کے پاس نہیں تھا تو آپ نے دوسروں کے سرمایہ سے تجارت شروع کر دی۔ بیرونی تجارت میں بھی حصہ لیا اور جیسا کہ (عبداللہ

بن ابی الحس (کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مکہ میں گھوم پھر کر بھی کاروبار کرتے تھے۔ تفصیل آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیے۔ یہی دور تھا جب آپ نے چچا ابوطالب کی مستقل مدد سے ان کی ”نوہال“ علی کے مصارف سے ان کو سبکدوش کر دیا۔ ان کو اپنے ساتھ رکھا اور جملہ مصارف کے ذمہ دار خود ہو گئے۔

قومی خدمت کا جذبہ:

بچپن کا یہی معصوم دور جس کی خود داری نے اس معصوم نوہال کو گلہ بانی پر آمادہ کیا تھا، فطری طور پر قومی خدمت کے جذبے سے معمور تھا۔ کعبہ عربوں کا قومی اور مذہبی نشان تھا چونکہ وہ پہاڑوں کے نشیب میں واقع ہے تو جب بھی زور دار بارش ہوتی تھی سیلاب کی دھاریں اس کو چھوٹی رہتی تھیں اور کبھی کبھی اس کو نقصان پہنچا دیا کرتی تھیں۔

مکہ اگرچہ ساحل سمندر سے صرف چالیس میل کے فاصلہ پر ہے مگر مون سون اس طرف نہیں جاتا۔ برسات تو وہاں ہوتی ہی نہیں۔ بارش بھی کبھی کبھی ہوتی ہے۔ بسا اوقات کئی سال گزر جاتے ہیں بارش کی ایک بوند نہیں برستی اور کبھی ایسی زور دار برستی ہے کہ مکہ میں طوفان آ جاتا ہے۔ اس وقت کا ایک واقعہ ہے جب آنحضرت ﷺ کی عمر تقریباً دس سال ہوگی کہ مکہ کے پہاڑوں پر زور دار بارش ہوئی پھر سیلاب بھی ایسے زور کا آیا کہ کعبہ کی عمارت کو نقصان پہنچ گیا۔ سیلاب اترا تو کعبہ کی مرمت شروع کی گئی۔ سن رسیدہ اور نوجوان رضا کار اپنے اس قومی نشان کی مرمت کر رہے تھے تو لوگوں نے دیکھا کہ ایک بچہ بھی نوجوانوں کی طرح سرگرم ہے اور اگرچہ بساط کچھ بھی نہیں مگر جذبہ اور شوق کا یہ عالم ہے کہ بھاری بھاری پتھر مونڈھے پر اٹھا رہا ہے اور کعبہ کی دیوار تک پہنچا رہا ہے۔ مونڈھے پتھروں سے چھلے جارہے ہیں، بوجھ اٹھانے سے سانس چڑھ رہا ہے مگر اس کے ولولہ میں کوئی فرق نہیں آرہا ہے۔

اور یہ بہادر بچہ وہی ہے جسے ”محمد“ کہا جاتا ہے (ﷺ)

شرم و حیا:

اس فلمی دور میں شرم و حیا ایک مذاق کی چیز بن گئی ہے۔ مگر دنیائے اخلاق میں یہ بہت قیمتی چیز ہے کیونکہ یہ درحقیقت اس خصلت کا نام ہے جو انسان کو ایسی باتوں سے روکے جو انسانیت اور شرافت کی نظر میں معیوب مانی جاتی ہیں۔

سیدنا محمد ﷺ کی فطرت کو جو شرم و حیا کی جنس گراں مایہ عطا ہوئی تھی اس کا ایک نمونہ اس موقع پر دیکھنے میں آیا۔

کعبہ کی مرمت کے سلسلہ میں جب آپ پتھر اٹھا رہے تھے تو آپ کے چھوٹے چچا عباس جو آپ سے دو سال بڑے تھے وہاں موجود تھے انہوں نے دیکھا کہ بے ڈول اور نوکیلے پتھروں سے ان کے معصوم بھتیجے محمد کے مونڈھے چھلے جارہے ہیں۔ نیم وحشی عربوں میں برہنگی زیادہ معیوب نہیں تھی۔ وہ بسا اوقات اپنے عقیدے کے مطابق حج جیسے مقدس فرض ادا کرتے ہوئے خانہ کعبہ کے قریب (جوان کے نزدیک سب سے زیادہ واجب الاحترام مقام تھا) مادر زاد برہنہ ہو جاتے تھے۔ عقیدہ یہ تھا کہ جن کپڑوں میں سال بھر گناہ کرتے رہے ہیں انہیں کپڑوں میں یہ مقدس فرض انجام دینا صحیح نہیں ہے۔ بہر حال عباس کو بھولے بھالے معصوم بھتیجے پر ترس آیا اور یہ چاہا کہ کوئی کپڑا بھتیجے کے مونڈھے پر ڈال دیں۔ کوئی اور کپڑا انہیں ملا تو اپنے یہاں کے عام دستور کے مطابق انہوں نے ارادہ کیا کہ بھتیجے کی لنگی کھول کر مونڈھے پر رکھ دیں۔ مگر اتنی سی برہنگی بھی اس شرمیلی اور باحیا فطرت کے لئے ناقابل برداشت تھی جو حضرت محمد ﷺ کو عطا ہوئی تھی۔ چنانچہ ابھی لنگی کھلنے بھی نہیں پائی تھی کہ اس برادر زادہ سعید کی حالت غیر ہونے لگی۔ چہرے پر سواپااں اڑنے لگیں اور ایک ایسی اضطرابی صورت پیدا ہو گئی کہ عباس گھبر اگئے اور لنگی جوں کی توں باندھ دی۔

غیر اللہ کی پرستش سے پرہیز:

یہ عجیب بات ہے کہ مکہ کے باشندے بے دینی اور مذہب سے آوارہ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو مذہبی سمجھتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت عیسائیوں اور یہودیوں کے نزدیک مسلم تھی۔ کیونکہ عیسائی اور یہودی جو عام طور پر بنی اسرائیل تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چھوٹے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ وہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نسلی اعتبار سے مورث اعلیٰ مانتے تھے، ایسے ہی مذہبی اعتبار سے بھی ان کو اپنی ملت کا بانی مانتے تھے۔ یہی حال اس زمانہ میں عربوں کا بھی تھا۔ کیونکہ عرب عموماً اور قریش خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے فرزند یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد تھے۔ اس نسلی رشتے کے علاوہ خانہ کعبہ اور خود مکہ شہر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تاریخی یادگار تھے۔ قریش خانہ کعبہ کے محافظ اور متولی بھی تھے جس کی بنا پر تمام عرب ان کی تعظیم کرتے تھے۔ اس لحاظ سے مکہ والوں کے لئے مذہبیت ایک لازمی چیز تھی۔ مگر ان کی یہ مذہبیت شرک اور ادہام پرستی کا جال بن کر رہ گئی تھی۔ ایک طرف حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا نام زبان پر تھا جنہوں نے شرک کے خلاف توحید کا جھنڈا بلند کیا تھا۔ اور دوسری طرف حالت یہ تھی کہ حرم کعبہ میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے اور ان کے علاوہ ہر ایک قبیلہ کا دیوتا اور اس کا بت الگ الگ تھا۔

شرک کی اس گرم بازاری میں کسی بچہ کا غیر اللہ کی پرستش سے بچنا ناممکن تھا۔ مگر جس کو قدرت نے وہ سنجیدگی عطا فرمائی تھی جس نے اس کو کھیل، تماشے اور قصہ گوئی کی محفلوں سے الگ رکھا۔ جو برہنگی کے تصور سے بھی لرز جاتا تھا۔ وہ عبادت کے معاملہ میں یہ بے جوڑ بات اور یہ مذاق گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ ایک طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی توحید پرستی کے قصے سنے اور دوسری طرف اپنی پیشانی غیر اللہ کے سامنے جھکا دے۔ ایک وقت اپنے ہاتھ سے مورتی بنائے اور دوسرے وقت اسی مورتی کے سامنے ماتھا ٹیک دے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کے متعلق یہ بات سب کو تسلیم ہے کہ کبھی آپ کی گردن غیر اللہ کی عبادت کے لئے نہیں جھکی۔

جس فطرت سلیم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سمجھا دیا تھا کہ چاند سورج اور آسمان کے چمکدار تارے جن کو ان کی قوم معبود مانتی ہے ہرگز قابل پرستش نہیں ہیں۔ کیونکہ انسان کی طرح رات دن کی تبدیلیوں کا ان پر بھی اثر ہوتا ہے بلکہ وہ انسان سے زیادہ پابند اور بے بس نظر آتے ہیں۔ جو پابند ہو اور جس پر رات دن کی تبدیلیوں کا اثر ہوتا رہتا ہو وہ معبود نہیں ہو سکتا۔ اسی فطرت سلیم نے پاک طینت محمد ﷺ کو ہوش سنبھالتے ہی بتا دیا تھا کہ جس کو انسان خود بنائے وہ معبود نہیں ہو سکتا۔ اس قابل ہو سکتا ہے کہ انسان اس کے سامنے گردن جھکائے یا ماتھا گرے۔

بتوں کو چھونے سے پرہیز:

لوگ خانہ کعبہ کا طواف جب بھی کیا کرتے تھے وہاں بیتل کے دو بت ^۱ اساف اور نائلہ تھے۔ طواف کرنے والے ان کو بوسہ دیا کرتے تھے اور ان پر ہاتھ پھیرا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کے چہیتے غلام زید بن حارثہ نے اپنے بیٹے حضرت حارثہ کو واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ بچپن میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ طواف کر رہا تھا۔ چکر لگاتے ہوئے جب ہم اساف اور نائلہ کے پاس پہنچے تو میں نے چاہا کہ میں بھی انہیں چھو لوں۔ حضرت محمد نے منع فرمادیا۔ اگلے چکر میں میں نے نظر پکڑ کر چھو لینا چاہا اور چھو بھی لیا۔ مگر آپ کی جیسے ہی نظر پڑی آپ نے سختی سے ڈانٹا کہ میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا۔ ^۲

^۱ ایہ مرد اور عورت کے دو مجسمے ساتھ ساتھ تھے جن کو پوجا کرتے تھے اور ان پر بھیجت چڑھایا کرتے تھے روایت ہے کہ خاص کعبہ مکرمہ میں خنس حرکت کرتے ہوئے مسخ کر دیئے گئے تھے۔ عجائب پرستی کی انتہا تھی کہ جب پتھر بن گئے تو انکی پوجا شروع کر دی گئی۔ (بخاری۔ ازرقی ص ۱۲۱ ج ۱)

^۲ ہدایہ و نہایہ ص ۲۸۸ ج ۲ بروایت بیہقی

دور شباب اور جوہری کردار

تجارت:

نوخیز و نوجوان محمد ﷺ گلہ بانی سے آگے بڑھ کر میدان تجارت میں آئے تو آپ کے تعلقات وسیع ہوئے۔ لوگوں کو آپ کے آزمانے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے آپ کو زیادہ قریب سے دیکھا وہی آپ کے سب سے زیادہ گرویدہ ہو گئے۔ اور ایک عجیب بات یہ ہے کہ صرف دس بارہ سال کے عرصہ میں آپ کی غیر معمولی امانت داری، راستبازی اور سچائی نے سب ہی مکہ والوں کو یہاں تک موہ لیا کہ وہ آپ کا نام لینا بے ادبی سمجھنے لگے۔ یہی مکہ کے بڑے بڑے تاجر اور سیٹھ جن کو اپنی دولت پر ناز تھا جن کو اپنے بین الاقوامی تعلقات پر فخر تھا کہ ان کے تجارتی قافلے شام، یمن، فارس وغیرہ جاتے رہتے تھے۔ افریقہ کے بازاروں میں ان کا لین دین رہتا تھا۔ ان ملکوں کے امیروں اور بادشاہوں سے ان کی راہ و رسم تھی، ان سے اپنی بات منوا سکتے تھے۔ یہی رؤساء قریش جو اپنے سوا کسی کو نظر میں نہیں لاتے تھے، جو دوسروں کی گردنیں اپنے سامنے جھکوانا چاہتے تھے، جن کے مشاعروں کی جان ان کے وہ فخریہ قصیدے ہوا کرتے تھے، جن میں وہ اپنی عظمت اور بڑائی کے ترانے گاتے اور کوئی ان کی توڑ کر تاتھا تو لڑ پڑتے تھے۔ یہاں تک کہ خونریز جنگ کی نوبت آجاتی تھی۔ دنیا جانتی ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ یتیم عبد اللہ کی غیر معمولی سچائی اور امانت داری نے ان سیٹھوں اور رئیسوں کو یہاں تک متاثر اور گرویدہ بنا دیا تھا کہ وہ آپ کو ”الصادق“ یا ”الامین“ ہی کہتے تھے اور نام لینا بے ادبی سمجھتے تھے۔ یہ دو لفظ یہاں تک زبانوں پر چڑھ گئے کہ انہوں نے قومی لقب کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

مؤرخ حیران رہ جاتا تھا کہ وہ کردار اور وہ کیر کٹر کس درجہ بلند ہو گا جس نے تیس بتیس سال کی عمر کے نوجوان کو اتنا اونچا اٹھادیا کہ بڑے بڑے لوگوں کی گردنیں اس کی صداقت و امانت کے سامنے جھک گئیں۔ ممکن ہے خاندانی رقابت کے سبب سے کچھ لوگ اس خطاب کو پسند نہ کرتے ہوں لیکن وہ مجبور تھے کہ آپ کو اس خطاب سے یاد کریں۔ کیونکہ کوئی ایسی بات یا کوئی ایسا بہانہ ان کو نہیں ملتا تھا کہ وہ تردید کر سکیں اور عوام کے جذبات کا مقابلہ کر سکیں۔

تاریخ کی یہ پرانی عادت بہت ہی تکلیف دہ اور مایوس کن ہے کہ کسی شخص کے واقعات قلمبند کرنے کے لئے وہ اسی وقت قلم اٹھاتی ہے جب وہ شخص تاریخی انسان بن چکتا ہے۔ اس سے پہلے اس کے قلم کو جنبش نہیں ہوتی۔ اس نے محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بھی اسی بخل سے کام لیا اور ان تمام واقعات سے دامن سینے رکھا جو نبوت سے پہلے محمد ﷺ کی روزمرہ کی زندگی میں پیش آتے رہتے، جو قریش کے گردن درازوں کو متاثر کرتے رہے۔ تب بھی چند واقعات ایسے ہیں جو کسی طرح تاریخ کے سکرے ہوئے دامن میں پڑ گئے اور تاریخ نے ان کو صحیح سندوں کے ساتھ محفوظ رکھا۔ قیاس کرنے کے لئے یہ واقعات ہی کافی ہیں اور ان سے قبل نبوت کی زندگی روشنی میں آ جاتی ہے۔

عبداللہ بن ابی الحساء عامری ایک معمولی آدمی تھے۔ اگر آنحضرت ﷺ کے ساتھ اس کا یہ معاملہ نہ ہوا ہوتا جو یہاں ذکر کیا جا رہا ہے تو دنیا نہ اس کو پہچانتی اور نہ پہچاننے کی ضرورت محسوس کرتی۔

یہ عبداللہ حضرت محمد بن عبداللہ ﷺ سے کوئی سوداگر رہا تھا۔ بات چیت کرتے ہوئے اسے کوئی کام یاد آگیا۔ اس نے حضرت محمد ﷺ سے کہا: آپ ٹھہریے میں ابھی آتا ہوں، تب بات کروں گا۔ آپ کی زبان سے نکل گیا: اچھا۔

اب بات کی چٹنگی اور زبان کی پابندی ملاحظہ فرمائیے۔

عبداللہ بن ابی الحساء یہاں سے چلا تو اس کو کوئی اور ضرورت پیش آگئی وہ اس میں ایسا لگا کہ اس کو اپنے وعدہ کا خیال بھی نہ رہا۔ یہ دن یونہی گزر گیا۔ پھر اگلے دن بھی گزر گیا۔ تیسرے دن اسے خیال آیا کہ میں محمد بن عبداللہ ﷺ سے معاملہ کر رہا تھا یہ بات یہاں تک پہنچ چکی تھی۔ میں ان کو ٹھہرا کر آیا تھا۔ اب چل کر بات پوری کر لینی چاہئے۔ چنانچہ عبداللہ بن ابی الحساء آپ کے مکان پر پہنچا معلوم ہوا کہ دروازہ گزر گئے آج تیسرا دن ہے وہ مکان پر نہیں آئے۔ گھر والے خود پریشان ہیں۔ عبداللہ بن ابی الحساء یہاں سے روانہ ہوا۔ جہاں جہاں خیال تھا سب جگہ آنحضرت ﷺ کو تلاش کیا۔ کہیں نہ ملے تو احتیاطاً اس جگہ بھی پہنچا جہاں بات چیت ہو رہی تھی اور وہ آپ کو وہاں ٹھہرا کر آیا تھا۔

عبداللہ بن ابی الحساء اس مقام پر پہنچا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ محمد بن عبداللہ ﷺ وہیں موجود ہیں، عبداللہ بن ابی الحساء کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور زیادہ حیرت اس کو اس بات پر ہوئی کہ مسلسل تین دن تک انتظار کی زحمت اٹھانے کے بعد بھی جب عبداللہ بن ابی الحساء سامنے آئے تو نہ لڑائی جھگڑا تھا نہ ڈانٹ ڈپٹ۔ کہا تو صرف اتنا کہہا اور وہ بھی دھیمی آواز سے یافقی لقد شفقت علی انا

ہہنا منذ ثلاث انتظرك^۱ (اے صاحب! آپ نے پریشان کر دیا۔ تین دن ہو گئے یہاں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔)

کہہ سکتے ہیں کہ وعدہ کی یہ صداقت اور چٹنگی وہ متبرک ترکہ تھا جو آپ کو اپنے جدا علی حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ملا تھا سیدنا اسماعیل علیہ السلام سے بھی ایک شخص نے کہا تھا کہ آپ یہاں ٹھہریں میں ابھی آتا ہوں وہ اپنے کام میں لگ کر بھول گیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام وعدہ کی پابندی کی بناء پر وہیں ٹھہرے رہے۔ وہ تیسرے دن جب اس کو یاد آیا اور وہاں پہنچا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام اسی جگہ انتظار کر رہے تھے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا یہ وصف یہاں تک مقبول ہوا کہ وحی الہی نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی خصوصیات میں اس کو شمار کرایا ہے۔ اِنَّكَ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ (مریم۔ ۵۴) آنحضرت ﷺ کے اوصاف الگ الگ وحی الہی نے شمار نہیں کرائے بلکہ ایک جامع اور مکمل سند یہ دیدی: وَ اِنَّكَ لَعَلٰی خُلِقْتَ عَظِيْمًا (قلم۔ ۴)، یعنی اخلاق کی مثالیں جو انبیاء علیہم السلام کے تذکرہ میں الگ الگ بیان کی گئیں آپ ان سب کا مکمل مجموعہ ہیں۔

قیس بن سائب بن عویر ایک صحابی تھے۔ اس زمانہ میں جب آپ کاروبار کیا کرتے تھے وہ آپ کے شریک اور سا جھی رہے تھے۔ وہ ہمیشہ تعریف کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے:

کان رسول اللہ ﷺ شریکی فی الجاہلیۃ فکان خیر شریک لایدارى ولا یساری۔
”محمد ﷺ جب نبی نہیں بنائے گئے تھے (زمانہ جاہلیت میں) میرے سا جھی تھے۔ بس بہت ہی اچھے ساتھی تھے۔ نہ کبھی سخت بات کہتے تھے نہ جھگڑتے اور بحث کرتے تھے۔

یہ کاروباری سلسلہ کی باتیں تھیں۔ اب ہمدردی نوع انسان اور احترام انسانیت کی ایک مثال مطالعہ فرمائیے جو اس زمانہ میں بھی اپنی نظیر آپ تھی اور تہذیب کی دعویٰ دار موجودہ دنیا بھی اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔

برہہ فروشی عرب میں عام تھی اور بسا اوقات شریف گھرانوں کے بچے بھی اس شگفہ میں کس لئے جاتے تھے۔ چنانچہ قبیلہ بنی القین بن جسر کے آدمی ایک لڑکے کو پکڑ لائے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے برادر زادے ”حکیم بن حزام بن خویلد“ کے ہاتھ بیچ دیا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اپنے بھتیجے کے یہاں گئیں تو یہ غلام ان کو پسند آگیا۔ انہوں نے فرمائش کی اور بھتیجے نے یہ غلام بھوپھی کی نذر کر دیا۔ حضرت محمد ﷺ کی نظر اس پر پڑی تو اس کی معصوم زندگی اور اس کی مظلومیت سے دل بے چین ہو گیا۔ آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اس کو خرید لیا۔ پھر بچہ سے اس کے ماں باپ کا نام اور خاندان و قبیلہ کا پتہ دریافت کیا۔ بچہ ذہین تھا اس نے

برجستہ جواب دیا: میرا نام زید، میرے والد حارث بن شریل بن کعب اور والدہ سعدی بن ثعلبہ ہیں اور قبیلہ طے کے خاندان بنی معن سے ہمارا تعلق ہے۔ آنحضرت ﷺ کو اس کے باپ کا نام اور پتہ معلوم ہو گیا تو اس کے والد کو خبر پہنچائی۔ والد حارث خبر پاتے ہی اپنے بھائی کو ساتھ لے کر مکہ آگیا اور دریافت کرتا ہوا حضرت محمد ﷺ کے پاس پہنچا۔ بچہ کو دیکھا، چوہا پیار کیا گلے لگایا اور شفقت پداری کے بموجب یہ چاہا کہ اپنے لخت جگر، نور چشم کو ساتھ لے جائے اور حضرت محمد ﷺ کی خدمت میں کچھ رقم بطور فدیہ پیش کر دے۔ آنحضرت ﷺ نے رقم لینے سے تو انکار کر دیا اور اس کی اجازت دیدی کہ بچہ کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ البتہ یہ فرمادیا کہ خود بچہ سے بھی دریافت کر لیں کہ وہ آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہے یا یہاں رہنا چاہتا ہے۔

بچہ آپ کے یہاں آیا۔ اس کے والد کو اس زمانہ کے ذرائع اور وسائل کے بموجب خبر دی گئی۔ وہ اپنے علاقہ طے سے سفر کر کے یہاں آیا اس میں کچھ دن لگ گئے۔ بچہ اس عرصہ میں حضرت محمد کی شفقتوں سے انتہائے غلام ہو گیا تھا کہ اس کو آپ سے جدا ہونا گوارا نہ ہوا۔ اس نے باپ کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ باپ نے بہت سمجھایا مگر بچہ کسی طرح راضی نہ ہوا۔ آخر میں باپ اور چچا نے جھجکتی ہوئی بات کہی: بیٹا تم غلام ہو، غلام رہنا پسند کرتے ہو، باپ کے ساتھ آزاد رہنا پسند نہیں کرتے۔

آنحضرت ﷺ نے اب تک باپ بیٹے کی گفتگو میں دخل نہیں دیا تھا۔ مگر یہ بات ایسی تھی جس کا تعلق آنحضرت ﷺ کے سلوک اور آپ کے انداز فکر سے تھا۔ کیا واقعی زید کو آپ غلام سمجھتے ہیں۔ زید کو غلام کی حیثیت سے رکھنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ کسی آزاد بچہ کے لئے غلامی پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے فوراً باپ بیٹے کی گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے فرمایا: غلام نہیں بیٹا۔ زید میرے پاس رہے گا تو بیٹا بن کر۔ میں تمہارے سامنے یہ کہتا ہوں اور تمہیں اس سے اطمینان نہ ہو تو چلو، مجمع میں یہ اعلان کئے دیتا ہوں۔ چنانچہ آپ باپ چچا اور زید کو لے کر ایک چوپال میں پہنچے، جہاں قریش کے سردار اور چودھری موجود تھے اور آپ نے اعلان فرمادیا کہ: زید میرا بیٹا ہے میں اعلان کرتا ہوں آپ لوگ گواہ رہیں۔

حارث (زید کے باپ) کی یہ آخری تدبیر تھی۔ زید کو پھسلانے کی جو قطعاً ناکام رہی۔ اب حارث کو کہنا پڑا: اچھا آپ بیٹا بنا کر رکھتے ہیں تو مجھے بھی عذر نہیں۔ فطرت محمد (ﷺ) کی یہ بلندی بھی نظر انداز نہ ہونی چاہیے کہ آپ نے عبد محمد (محمد کا غلام) کہلانا پسند نہیں کیا۔ آپ نے ”ابن محمد“ کہلایا اور اسی نسبت سے ان کی شہرت ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ اس واقعہ سے تقریباً ۳۰ سال بعد آیت نازل ہوئی: اُدْعُوهُمْ لِابْنَائِهِمْ (احزاب-۵)۔^۱

محمد ﷺ کا بچی کردار تھا جس نے سرداران قریش کی گردنیں اس کی تعظیم کے لئے خم کیں۔ یہاں تک کہ نام لینا بے ادبی سمجھتے اور ”الصادق“ اور ”الامین“ کے خطاب آپ کے لئے عام ہو گئے۔

آپ کے مربی چچا ابوطالب آخر تک مسلمان نہیں ہوئے۔ اپنے باپ دادا کے مذہب پر رہے اسی مذہب پر جان دی مگر بھتیجے کے اخلاق و کمالات اور ہمدردی خلق کا جو جذبہ بھتیجے کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، اس کے یہاں تک گرویدہ تھے کہ بھتیجے کی تعریف میں قصیدے کہا کرتے تھے۔ ایک قصیدہ جس میں تقریباً سو شعر ہیں اس کو ابن ہشام نے نقل کیا ہے جس کا مشہور شعر یہ ہے، جس سے حضرت محمد ﷺ کے فیض بے پناہ کا اندازہ ہوتا ہے:

دایبض یستسقی الغمام بوجہہ شمال^۱ الیتامی عصبة للارامل
وہ نورانی چہرے والا جس کی ذات اور جس کے چہرے کی برکت سے بادل بھی سیرابی حاصل کرتا ہے۔ یتیموں کا مربی پواؤں کی عزت و آبرو کا محافظ۔“

وان فخرت یوماً فان محمداً هو المصطفیٰ من سہا و کرہیہا^۲
”اور اگر کسی دن (کسی موقع پر) فخر کرنا چاہو تو محمد وہ منتخب شخصیت ہے جس سے کمالات قریش^۳ کے مخفی خزانے نمایاں ہوتے ہیں جو پورے قریش میں صاحب کرم اور صاحب شرف ہے۔“

نکاح

وَالطَّلِیْتُ لِلطَّلِیْبِیْنِ (نور-۱۳)

نکاح:

مکہ کی رہنے والی ایک ادھیڑ عمر کی خاتون (خدیحہ) جس کی عمر چالیس سال سے کم نہیں ہے، جو کئی بچوں کی ماں ہے، دو مرتبہ بیوہ ہو چکی ہے۔ تیسری مرتبہ شادی کے لئے ایک پچیس سالہ نوجوان سے سلسلہ جنابی کرتی ہے۔ یہ نوجوان حسب نسب کے لحاظ سے مکہ کے تمام شریف اور باعزت خاندانوں میں ”نگ“ ہے۔ جسمانی صحت بہت عمدہ، شکل و صورت بے مثال۔ اخلاق و

۱ الشیال کالغیاث الذی یقوم بہ امر قومہ

۲ البدایہ والنہایہ ص ۲۵۸، ج ۲، دسیرۃ ابن ہشام ص ۷۰، ج ۱

۳ چونکہ پہلے اشعار میں قریش کا ذکر ہے۔ اس لئے یہاں یہ مفہوم لیا گیا۔ اس سیاق کا لحاظ نہ کیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ محمد ﷺ وہ شخصیت ہے جس سے کمالات انسانیت کے مخفی خزانے نمایاں ہوتے ہیں۔ جو پوری نوع انسان میں صاحب کرم اور صاحب شرف ہے۔

عادات میں پورے مکہ کا قیمتی ہیرا۔ اس کے یہاں دولت کے انبار نہیں ہیں مگر کامیاب تجارت میں وہ نام پیدا کر چکا ہے کہ اس کے مقابلہ میں دولت و ثروت ایک پر چھائیں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ بیشک اس بیوہ کے لئے اس رشتہ میں بہت سی دلچسپیاں ہو سکتی ہیں مگر اس پچیس سالہ نوجوان کے لئے دلچسپی کی ایک چیز ختم ہے۔ یہ خاتون دولت مند ضرور ہے لیکن جس خود دار نوجوان نے اپنی زندگی خود بنائی، جس نے بچپن میں بھی گوارا نہ کیا کہ اپنا بار دوسروں پر ڈالے، کسی خاتون کی دولت و ثروت اس کی خودداری اور غیرت کے لئے چیلنج تو ہو سکتی ہے دلچسپی اور کشش کا باعث نہیں بن سکتی۔ ہاں، ایک بہت بڑی دولت اور ہے۔ نیک نفسی، راست بازی، امانداری، سچائی اور خلق خدا سے ہمدردی۔ محمد ﷺ کی ذات ستودہ صفات ان اوصاف کا خزانہ تھی۔ اور یہ نیک نفس خاتون جو دنیا کی تمام بہاروں سے آسودہ ہو چکی تھی ان اوصاف کی قدردان تھی، یعنی ایک طرف جو ہر تھا تو دوسری طرف جو ہری۔

قدر جو ہر شاہ داند یا بداند جو ہری

یہی سبب تھا کہ یہ رشتہ جو بظاہر ان لے بے جوڑ تھا ایسا مبارک ثابت ہوا کہ خاندان اور کنہ والے اس پر رشک کیا کرتے تھے۔ خود آپ کی وہ بیویاں جو بعد میں آپ کی حرم بنیں، جب آنحضرت ﷺ کی زبانی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی تعریفیں سنتی تھیں تو رشک کیا کرتی تھیں۔

رشتہ کا سبب:

واقعہ اس طرح پیش آیا کہ خدیجہ رضی اللہ عنہا جب دوسری مرتبہ بیوہ ہو چکیں تو اپنی تجارت کو باقی رکھنے کیلئے انہیں کسی ایسے امانت دار شخص کی ضرورت تھی جو کاروباری سلیقہ اور تجارتی تجربہ بھی رکھتا ہو۔ آنحضرت ﷺ کی عمر اگرچہ تقریباً ۲۳ سال تھی مگر آپ کے اوصاف حمیدہ کے چرچے شروع ہو گئے تھے۔ کاروباری سلیقہ کی بھی شہرت ہو چکی تھی اور تجارتی قافلہ کے ساتھ شام جاکر بیرونی تجارت کا بھی آپ کو تجربہ ہو چکا تھا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی یہ شہرتیں سنیں پھر ذاتی طور پر بھی واقفیت حاصل کی، تو اپنے وسیع کاروبار کے لئے آپ کو زیادہ سے زیادہ موزوں پایا۔ چنانچہ آپ نے جو ان صالح حضرت محمد بن عبد اللہ القریشی المکی ﷺ کو پیشکش کی کہ وہ کاروباری ذمہ داری سنبھال لیں۔ نفع میں ایک حصہ ان کا ہو گا۔ آنحضرت ﷺ نے یہ پیشکش منظور فرمائی اور مال لے کر شام تشریف لے گئے۔ وہاں کے وقت آپ نے ایسا مال تلاش کیا، جس کا مکہ میں فوراً نکاس ہو جائے۔ آپ نے شام سے یہ مال لا کر مکہ معظمہ میں فروخت کیا، تو نفع بدرجہا زیادہ ہوا۔ آنحضرت ﷺ کی اس کاروباری دانشمندی، ہوشیاری اور مستعدی نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی اس

رائے کی تصدیق کر دی جو وہ اس ”ترقی پسند“ نوجوان کے متعلق پہلے قائم کر چکی تھیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے شام جاتے وقت جب مال سپرد کیا تو خاص اپنے بھروسے کے غلام ”میسرہ“ کو بھی ساتھ کر دیا تھا۔ بہانہ یہ تھا کہ وہ خدمت کرتے رہیں گے اور مقصد یہ تھا کہ مال کی نگرانی بھی رکھیں اور آنحضرت ﷺ کے طور و اطوار کا بھی گہرا مطالعہ کرتے رہیں۔

سفر شام سے واپسی پر آنحضرت ﷺ نے منافع کا مال حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سپرد کیا اور ”میسرہ“ نے نہ صرف امانت داری بلکہ آپ کے عام اخلاق کی بھی ایسی تعریف کی کہ خدیجہ رضی اللہ عنہا جو اپنی زندگی کا یہ آخری دور کسی راست باز کے حوالہ کرنا چاہتی تھیں ”دامان محمد“ ﷺ میں ان کو گوہر مراد نظر آنے لگا۔ انہوں نے آپ کے خاص احباب اور بزرگوں کے ذریعہ رشتہ کی سلسلہ جہنابی کی۔ جس نے منظوری کا شرف عظیم حاصل کیا اور نکاح ہو گیا۔ نکاح کے بعد تجارت اور کاروبار کی طرف خاص توجہ کا تذکرہ تو نہیں آتا، البتہ خدمت قوم، ہمدردی خلق، خدا پرستی اور خدا ترسی کے اوصاف روز افزوں نظر آتے ہیں۔ ادھر خدیجہ رضی اللہ عنہا جن کے لئے یہی اوصاف باعث کشش تھے ان کی گردیدگی دن بدن بڑھ رہی ہے۔ یہاں تک کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا محض خانگی زندگی ہی میں ریفقہ حیات نہیں رہیں بلکہ قومی اور ملی خدمات میں بھی دہنا تھ بنی رہیں۔ آنحضرت ﷺ کی ذات پر تو ان کا ایک حہ بھی کبھی صرف نہیں ہوا۔ البتہ قومی اور ملی کاموں میں ان کی پوری دولت صرف ہو گئی۔ حتیٰ کہ وفات کے وقت وہ اس گھر انہ کی صاحب خانہ (گھر ستن) تھیں جس کا فخر اور امتیازی نشان فقر و فاقہ تھا۔ خود آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے لوگوں نے مجھے امداد سے محروم رکھا۔ خدیجہ نے میری مدد کی۔ لوگوں نے مجھے جھٹلایا، مگر خدیجہ نے ہر موقع پر میری تصدیق کی اور ہمت بڑھائی۔^۱

پچیس برس تک حضرت خدیجہ زندہ رہیں۔ چھ بچے ہوئے دو لڑکے جو بچپن ہی میں وفات پا گئے، چار لڑکیاں جو زندہ رہیں۔ ان کے نکاح بیاہ بھی ہوئے مگر آنحضرت ﷺ کی وفات سے پہلے یہ لڑکیاں بھی وفات پا چکی تھیں۔ صرف ایک صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا زندہ رہیں جن کے دو لڑکوں (سیدنا حضرت حسن اور سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہما) کی اولاد کو یہ شرف حاصل ہے کہ ان کو سادات کہا جاتا ہے۔

^۱ البدایہ والنہایہ ص ۱۲۹ ج ۲ والا ستیعاب وغیرہ

اخلاقی بد حالی۔ جذبہ اصلاح امن پسندی اور صلح جوئی

چھٹی صدی عیسوی جس کے آخری حصہ میں یہ آفتاب طلوع ہوا۔ ایک اندھیری رات تھی جس پر گرہیوں اور ظلم و ستم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔

دولت پر غرور، جاگیر و جائیداد پر گھمنڈ، نسل اور خاندانی اونچ نیچ، اپنے آپ کو اونچا، دوسروں کو نیچا سمجھنا، یہاں تک کہ ان سے چھوٹ چھات کرنا، غریبوں کو دبانہ، کمزوروں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا، عورتوں کو ایک خدمت گزار جاننا، شوہروں کے مرنے کے بعد ان کی زندگی کو اکارت ماننا، یہاں تک کہ ان کی خودکشی کو ان کے لئے ذریعہ نجات سمجھنا، خدا سے انکار کرنا، یا سینکڑوں ہزاروں دیوی دیوتاؤں کے سامنے ماتھا کرنا، من مانی باتوں کو مذہب اور دھرم سمجھ لینا، خود غرضی، بے رحمی، سود، زنا، شراب، رشوت، جو وغیرہ ایسی بیماریاں تھیں جن کی وبا پوری دنیا میں پھیلی ہوئی تھی۔ عرب میں ان عام بیماریوں کے علاوہ :

(۱) ایک بیماری یہ تھی کہ پورے ملک کی کوئی باقاعدہ حکومت نہیں تھی۔ ہر ایک قبیلہ اپنی جگہ آزاد تھا۔

(۲) کچھ انسانوں کو ناپاک سمجھنے کا عقیدہ تو نہیں تھا مگر انسانی خون کو سستا اور مہنگا سمجھنا ان کا قومی مزاج بن چکا تھا، یعنی کسی معمولی قبیلہ کا کوئی آدمی اگر مارا جاتا خواہ وہ اس قبیلہ کا سردار ہی ہوتا تو اس کے خون کے عوض میں چند اونٹ دینے کافی سمجھے جاتے تھے جس کو وہ دیت کہا کرتے تھے۔ لیکن اگر کسی بڑے قبیلہ کا کوئی معمولی آدمی بھی مارا جاتا تو اس کے عوض میں قاتل کے ایک سے زائد اور انتہائی کہ کبھی پورے قبیلہ کو تباہ کر دینا بھی اپنا حق سمجھتے تھے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے۔

(۳) فطرت جنگجو تھی، اس بنا پر معمولی بات پر بھی بڑی سے بڑی جنگ کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو سالہا سال جاری رہتا۔ مثلاً:

ایک شخص کا اونٹ کھیت میں چلا گیا۔ کھیت والی عورت نے اسے مارا۔ اونٹ والے نے عورت کی چھاتی کاٹ ڈالی۔ اس بات پر ۴۹۴ء سے ۵۳۵ء تک برابر لڑائی رہی۔ یعنی اکتالیس سال برابر، کہتے ہیں ستر ہزار آدمی اس میں مارے گئے۔

داحس ایک گھوڑا تھا۔ گھوڑ دوڑ میں وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر اسے بدکا دیا۔ اتنی بات پر ایسارن پڑا کہ قبیلہ کے قبیلہ کٹ مرے۔ اس لڑائی کا خاتمہ اس وقت ہوا جب

اسلام کی امن پسندی نے محارب قبیلوں کے مزاج بدل دیے۔

مختصر یہ کہ ان قومی اور بین الاقوامی بیماریوں اور علتوں نے نہ صرف یہ کہ امن و امان کی زندگی کو ناممکن بنا دیا تھا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ رحم، رواداری، بھائی چارگی، عدل و انصاف، مروت و شرافت، مختصر یہ کہ انسانیت کی تمام شریف خصلتوں کے چراغ گل تھے۔ قریش جیسے قبائل اگرچہ تمدن میں اپنا ممتاز مقام رکھتے تھے۔ مگر روح تمدن سے وہ بھی محروم تھے۔ ان کی کاروباری منڈیاں بڑھ رہی تھیں مگر اخلاق کی جنس ان میں ناپید تھی۔

حضرت محمد ﷺ نے جیسے ہی بیدار مغز جوان صالح کی حیثیت سے شہری زندگی میں قدم جمایا، جس طرح آپ کو اپنے خالق اور پروردگار کی عبادت و پرستش کا شوق بڑھا، قوم کی یہ ابتر حالت بھی آپ کے دل کا درد اور جگر کا سوز بن گئی۔ یہ سوز آپ کو ہر وقت بے چین اور مضطرب رکھتی۔ مگر کوئی معمولی نسخہ شفاء اس درد کے لئے کارگر نہیں تھا۔

اس درد کے علاج کیلئے ایک بہت بڑے سماجی انقلاب کی ضرورت تھی۔ لیکن وقتی طور پر ایک واقعہ نے موقع دیا کہ آپ اس میدان میں آگے بڑھیں۔

واقعہ یہ تھا کہ یمن کا ایک سوداگر کچھ مال مکہ معظمہ میں لایا۔ مکہ کے ایک بوپاری عاص^۱ بن وائل سبھی نے اس کا مال خرید لیا اور جب قیمت ادا کرنے کا وقت آیا تو اس کو مار پیٹ کر بھگا دیا۔ وہ مکہ والوں کے سامنے رویا دھویا مگر کسی نے پرواہ نہیں کی اور عاص بن وائل کا مقابلہ کرنے کی ہمت کسی کو نہیں ہوئی۔ مکہ جیسے تجارتی شہر کیلئے یہ بدنامی بہت خطرناک تھی۔ اس پر مکہ کے کچھ شرفاء نے ایک کنونشن کا انعقاد کیا۔ محمد ﷺ اگرچہ ابھی بیس سالہ نوجوان تھے مگر امن و آشتی اور صلح و مصالحت جو آپ کا فطری جذبہ تھا اس کا یہ اثر تھا کہ جیسے ہی آپ کو خبر ہوئی آپ بھی مجمع میں پہنچ گئے۔ آپ کی شرکت کی یہ برکت تھی کہ واقعہ کا تعلق اگرچہ تجارت اور کاروباری سلسلہ سے تھا مگر غور و فکر کے دائرہ کو وسیع کیا گیا اور ایک ایسی سوسائٹی (۱) بنائی گئی جس کے ارکان کا یہ عہد ہوتا تھا: (۱) ہم اپنے وطن سے بے امنی دور کریں گے (۲) مسافروں کی حفاظت کیا کریں گے (۳) غریبوں کی امداد کرتے رہیں گے۔ (۴) طاقتور کو کمزور پر، بڑوں کو چھوٹوں پر ظلم کرنے اور ناانصافی سے روکا کریں گے۔^۲

مگر جب تک دلوں کی سطح ہموار نہ ہو اس طرح کے معاہدے پائیدار نہیں ہوتے کیونکہ ان کا منشا علاج نہیں ہوتا۔ بلکہ دفع الوقتی ہوتا ہے۔ وقت گزرتا جاتا ہے تو یہ معاہدے بھی فراموش

^۱ اپنے قبیلہ کا بارع سردار بھی تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا حلیف تھا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تھے تو اس نے ان کو پناہ دی تھی۔ حضرت عمرو بن العاص انہیں کے فرزند تھے۔

^۲ ابن ہشام ص ۸۳ و ص ۸۴ ج ۱

ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی طرح کا ایک معاہدہ پہلے بھی ہو چکا تھا جب مکہ پر قبیلہ جرہم کا قبضہ تھا۔ مگر اب اس معاہدہ کا صرف نام یاد رہ گیا تھا۔ یعنی ”حلف الفضول“

بہر حال وقتی طور پر یہ امن اور حفاظت جان و مال کے لئے ایک اچھا اقدام تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اسی ثابت قدمی اور استقلال کے ساتھ اس میں حصہ لیا کہ نبوت کے بعد جب ایک مضبوط نظام مسلمانوں کا قائم ہو گیا تھا تب بھی آپ فرمایا کرتے تھے کہ قریش اگر حلف الفضول کو زندہ کریں تو میں سب سے پہلا شخص ہوں گا جو اس میں حصہ لوں گا۔^۱

خدا پرستی اور معرفت حق

خدا کو ایک ماننا اور اس کی عبادت کرنا، عقل سلیم کا تقاضا ہے۔ مگر خدا پرستی کے وہ طریقے جن سے انسان روحانی ترقی اور ابدی سکون حاصل کر سکے، انسان اپنی عقل سے نہیں معلوم کر سکتا۔ عقل ان فیصلوں میں بھی بسا اوقات غلطی کر جاتی ہے جن کا تعلق مشاہدہ سے ہے۔ انتہا یہ کہ وہ طاقتیں جو انسان کے اندر موجود ہیں اور تندرستی یا بیماری کی وہ کیفیات جو جسم انسان میں پائی جاتی ہیں، چونکہ ان کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا تو عقل ان کو پوری طرح پہچاننے سے بھی قاصر رہتی ہے اور پہچانتی ہے تو بسا اوقات غلطی کر جاتی ہے۔ انتہا یہ کہ ایک سرے جیسی نظر آنے والی چیز کے بعد بھی ڈاکٹروں کی تشخیص مختلف رہتی ہے، جن میں کوئی ایک صحیح ہوتی ہے اور کبھی ایک بھی صحیح نہیں ہوتی۔ پس وہ معاملات جن کا تعلق ان حقیقتوں سے ہے جن تک مشاہدہ کی رسائی نہیں ہو سکتی، نہ ان کے تجربہ کی کوئی صورت ممکن ہے ان کے بارے میں عقل کے فیصلوں پر وہی شخص اعتماد کر سکتا ہے جو انصاف جیسی نعمت سے محروم ہو، یا موجودہ زندگی کے فلسفہ اور فکر مستقبل سے غافل اور لاپرواہ ہو۔ مگر وہ صاحب فہم و فراست جو دیکھتا ہے کہ ہر ایک فعل کی ایک تاثیر ہے اور یہ بھی یقین رکھتا ہے کہ معمولی کمی بیشی سے تاثیروں میں بے انتہا فرق آجاتا ہے۔ اگر صحیح توازن قائم رہے تو انسان ایٹم بم اور راکٹ تک بنا سکتا ہے اور چاند تاروں تک پہنچ سکتا ہے، لیکن توازن میں کچھ بھی فرق آجائے تو ساری محنت رائیگاں اور دولت برباد ہو جاتی ہے۔ وہ ہر گز جرأت نہیں کر سکتا کہ مشاہدہ سے بالا چیزوں کے بارے میں عقلی فیصلوں پر اعتماد کر لے۔ وہ لامحالہ کسی ایسے مخبر اور ایسے رہنما کی تلاش کرے گا اور اس کی جستجو میں بے چین اور مضطرب رہے گا جو انسانی زندگی کے منتہا اور انجام کی صحیح خبر دے سکے۔ اور وہ متوازن چیزیں بتا سکے جن سے روحانی صحت اور ترقی حاصل ہو اور ابدی سکون میسر آئے۔

آنحضرت ﷺ کی فطرت سلیم نے آپ کو ایک خدا کی یاد پر آمادہ کیا۔ اس کا شوق پیدا ہوا۔ ایک طرف قوی زندگی میں آپ وہ اعتماد حاصل کرتے رہے کہ آپ کو ”الصادق الامین“ کا خطاب دیا گیا۔ دوسری جانب یاد خدا کا شوق اتنا ہی بڑھتا رہا۔ یاد خدا کے شوق کے ساتھ لامحالہ نوع انسان کی اصلاح و ترقی کے سوالات بھی آپ کے سامنے آتے رہے۔

- ☆ یہ اصلاح و ترقی صرف مادیات تک ہو یا اس کا تعلق روحانیت سے بھی ہو؟
- ☆ انسانی زندگی صرف اسی ظاہری زندگی تک ہے یا اس کے بعد بھی اس کا تعلق ہے؟
- ☆ اگر انسان مرنے کے بعد بھی ایک وجود رکھتا ہے تو اس کی فلاح و بہبود کس طرح ہو سکتی ہے؟
- ☆ اصلاح کا وہ طریقہ کیا ہو کہ انسان اس زندگی میں بھی امن و سکون اور ترقی سے ہمکنار ہو اور اس کے بعد کی زندگی بھی ایک خوشگوار زندگی ہو اور اس طرح یہ اصلاح مکمل اصلاح ہو۔

یہ وہ سوالات تھے جو آنحضرت ﷺ کے قلب حساس میں خلش پیدا کرنے لگے اور ان کی خلش یہاں تک بڑھی کہ آپ کو اس غور و فکر میں لطف آنے لگا۔ گویا یہی غور و خوص، فکر و مراقبہ آپ کی حیات مقدسہ کا جوہر بن گیا۔ اور چونکہ شہری زندگی اس میں ہارج تھی تو آپ کو تنہائی پسند آنے لگی۔ رفتہ رفتہ یہ وابستگی یہاں تک بڑھی کہ آپ شہر سے باہر پہاڑ کی ایک کھوئی میں رہنے لگے۔

حرا پہاڑ کا چار گز لمبا اور پونے دو گز چوڑا غار جہاں سے کعبہ مکرمہ بھی نظر آتا رہتا ہے اب بھی موجود ہے۔ یہ مکہ شہر سے تقریباً تین میل ہے۔ راستہ اتنا دشوار کہ یہ تین میل تیس میل سے بھی زیادہ کٹھن پڑتے ہیں۔ طاقتور نوجوان بھی وہاں پہنچتے پہنچتے تھک جاتے ہیں۔ مگر آنحضرت ﷺ نے یہ عادت بنالی تھی کہ پانی اور ستو ساتھ لیتے اور اس غار میں پہنچ جاتے اور جب تک پھر ضرورت نہ ہوتی آپ وہیں یاد خدا، غور و فکر اور مراقبہ میں مشغول رہتے۔

رفیقہ حیات حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی پوری وفاداری اور دل سوزی سے حق رفاقت ادا کرتی رہیں۔ وہ پانی اور ستو کا ایک اندازہ رکھتیں اور جب ان کے اندازہ سے آنحضرت ﷺ کی واپسی میں تاخیر ہوتی تو وہ خود پانی اور ستو لیکر اس غار پر پہنچ جاتیں۔

آخر میں چھ ماہ^۱ ایسے گزرے کہ آپ کو عجیب و غریب خوابیں آتی تھیں اور وہ اپنی تعبیر میں ایسی ہی سچی ہوتی تھیں جیسے سپیدہ صبح طلوع آفتاب کی پیش گوئی میں صادق ہوتا ہے۔ پھر آفتاب طلوع ہوتا ہے تو آفتاب آمد دلیل آفتاب، بقول سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا، آنحضرت ﷺ کا خواب بھی گویا سپیدہ صبح ہوتا تھا جس کے بعد آفتاب تعبیر کی درخشانی لازمی ہوتی تھی۔^۲

^۱ یعنی نبوت سے چھ ماہ پہلے

^۲ بخاری شریف والہدایہ والنبیۃ وغیرہ

نبوت

آپ اسی غار میں تھے کہ ایک وجود نمودار ہوا۔ اس سے گھبراہٹ نہیں ہوئی بلکہ دل کو سکون ہوا۔ جیسے سوکھے ہونٹوں کو ٹھنڈا پانی مل گیا۔

اس نے فرمائش کی: ”اِفْرَأْ“ پڑھو۔

حضرت محمد ﷺ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔ آپ نے عذر پیش کر دیا، میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس وجود نے دوبارہ یہی کہا، اِفْرَأْ۔ پڑھو۔ اس مرتبہ بھی حضرت محمد ﷺ کا وہی عذر تھا۔ اس وجود نے تیسری مرتبہ یہی کہا۔ اس مرتبہ جواب میں حضرت محمد ﷺ نے فرمایا: کیا پڑھوں۔ اس وجود نے یہ آیتیں پڑھوائیں:

اِفْرَأْ يَا سَمِ رَّبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِفْرَأْ وَ رَّبُّكَ الْاَكْزَمُ ۝

الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝

ترجمہ: پڑھ ۱ اپنے رب کے نام سے جس نے (ساری مخلوق کو) پیدا کیا۔ بنایا انسان کو لہو کی پھسکی (جسے ہوئے خون) سے پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے۔ سکھایا آدمی کو جو نہ جانتا تھا“

آپ نے یہ آیتیں پڑھیں۔ آیتیں ذہن نشین ہو گئیں۔ مگر ساتھ ساتھ ذمہ داری کا احساس بھی ہوا۔ ایک طرف اپنی عاجزی کا غیر معمولی احساس تھا۔ آپ کی خصوصیت یہ تھی کہ اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ بچہ در بچہ سمجھتے تھے۔ دوسری طرف اتنی بڑی ذمہ داری، اور ایسی ذمہ داری جس کا کوئی تجربہ اب تک نہیں تھا۔ یعنی بھگی ہوئی مخلوق کو پڑھنے پڑھانے، تعلیم دینے اور سدھارنے کی ذمہ داری، اور ایسی صورت سے جو بالکل اجنبی صورت تھی۔ جس کا کبھی وہم و گمان

۱ یہ آیت ۶۲۲ فی میں نازل ہوئی، یعنی ساتویں صدی عیسوی کے شروع میں جو یورپ کے قرون وسطیٰ کا تاریک ترین زمانہ تھا جب مغربی یورپ پر جہالت کی گہری گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ مشرقی یورپ میں کچھ تعلیم کا چرچا تھا تو اس کو کلیسا نے اپنی مخصوص جائیداد سمجھ رکھا تھا۔ کسی کی کہا جاتی تھی کہ دست درازی کر سکے۔ ہندوستان میں جو کچھ علم تھا وہ چند گھرانوں کی ملکیت تھا۔ کسی غیر ملکی اگر بھٹک پہنچ جاتی تو اس کے کان میں سیسہ پلا دیا جاتا تھا۔

بھی نہیں آیا تھا نہ کسی سے ایسی باتیں سنی تھیں۔ اس طرح کے خیالات اور غیر معمولی احساس کا اثر یہ ہوا کہ دل کانپنے لگا۔ آپ مکان پر پہنچے تو لرزہ جیسی کیفیت تھی۔ آپ نے رفیقہ حیات (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا) سے کہا:

”میرے اوپر کپڑا ڈال دو“ ۱

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کیا بات ہے؟ طبعیت کو سکون ہوا تو آپ نے پورا قصہ سنایا اور یہ بھی فرمایا۔ مجھے خوف ہے کہ ایسی بڑی ذمہ داری کس طرح اٹھا سکوں گا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سمجھدار خاتون تھیں۔ حضرت محمد ﷺ کو جس طرح پندرہ سال سے دیکھ رہی تھیں، ان کو یقین تھا کہ اس غیر معمولی شخص کے لئے کوئی غیر معمولی صورت نمودار ہوگی جس کی شان نزالی ہوگی۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے پورا واقعہ سنا، پھر وہ آیتیں سنیں جن میں اس طرف اشارہ تھا کہ خدا قادر جو خون کے لو تھڑے سے جیتا جاگتا انسان بناتا ہے۔ قلم کے ذریعے لکھنا پڑھنا سکھاتا ہے۔ انسان کو وہ باتیں بتاتا ہے جن کو وہ اپنے ذہن سے نہیں معلوم کر سکتا تھا۔ وہ خدا قادر کسی استاد یا قلم کی مدد بغیر محض اپنی قدرت سے علم کے دروازے آپ پر کھول دیا۔

یہ آیتیں سن کر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو یقین ہو گیا کہ جس غیر معمولی صورت کی توقع تھی وہ سامنے آگئی ہے۔

وہ اس واقعہ کے متعلق کوئی فیصلہ تو نہیں کر سکیں۔ البتہ حضرت محمد ﷺ نے جو اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ ان ذمہ داریوں کے بوجھ سے میری جان جاتی رہے گی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اس کا اطمینان دلایا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی زندگی کا مرقع پیش کر کے بہت لطیف پیرایہ میں اطمینان دلایا کہ آپ یہ بار اٹھا سکیں گے کیونکہ اب تک کی زندگی میں جو بوجھ اٹھاتے رہے ہیں وہ کم نہیں وہ بھی غیر معمولی ہیں۔ پس اگر کوئی اس سے بھی بڑی ذمہ داری آپ پر پڑے گی آپ اس کو بھی اٹھا سکیں گے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا: کلا والله لا یخیرک الله ابدالاً انک لتصلح الرحم وتحمل کلک وتکسب البعد ودم وتقری الضیف وتعين علی نواب الحق (بخاری شریف ص ۴۰) ترجمہ: خدا شاہد ہے ایسا ہر گز نہیں ہو سکتا۔ کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ناکام کر دے۔ آپ کی مدد نہ کرے آپ رشتہ داروں کا خیال رکھتے ہیں، ان کی مدد کرتے ہیں، ان کو

۱ خود قرآن پاک کی عظمت اور اس کا وقار ایک احساس کو لرزہ بر اندام کرنے کے لئے کافی ہے۔ ارشاد باری ہے۔ لو انزلنا هذا القرآن علی جبل لرايتہ ارج۔ اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تو دیکھتا کہ وہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا (سورہ حشر آخری رکوع پ ۲۸)

منزل تک پہنچاتے ہیں۔ آپ ایسے احسانات کرتے ہیں اور ایسی خدمات انجام دیتے ہیں جن کی نظیر نہیں ملتی۔ جو دوسری جگہ قطعاً نایاب ہیں۔ باہر کے مسافر جو بے ٹھکانا ہوتے ہیں آپ ان کو اپنا مہمان بناتے ہیں۔ برپا ہونے والے ہنگاموں اور ناگہانی حوادث میں آپ حق کی حمایت کرتے ہیں۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اس طرح تسلی دی۔ لیکن یہ ان کی رائے اور ان کا اپنا اعتقاد تھا کہ جو اس طرح صاحب خیر ہو، خدا کی طرف سے اس کی مدد ہوگی۔ اس کو ذلیل و رسوا اور ناکام نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اس طرح کے معاملہ کی حقیقت وہ بھی نہیں جانتی تھیں، کیونکہ نبوت اور الہام کی باتوں سے وہ بھی واقف نہیں تھیں۔ ان کو ایک شخص کا خیال آیا۔ یہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ہم جد تھے۔ رشتہ کے بھائی ہوتے تھے، عیسائی مذہب اختیار کئے ہوئے تھے۔ عالم فاضل تھے۔ نبوت اور الہام کی باتیں جانتے تھے۔ عبرانی زبان پر ان کو عبور تھا۔ عبرانی کی اصل انجیل کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ عربی میں اس کا ترجمہ بھی کیا کرتے تھے۔ اب بہت بوڑھے تھے۔ بصارت سے بھی معذور ہو چکے تھے۔ مگر لوگ ان کی قدر کرتے تھے۔ ان کا نام ورقہ تھا ولدیت نوفل۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا حضرت محمد ﷺ کو ساتھ لے کر ان کے یہاں پہنچی اور کہا: آپ کے برادر زادے حضرت محمد ﷺ کو عجیب صورت پیش آئی ہے۔ یہ خود ہی بیان کریں گے۔ آپ غور سے سنئے اور رائے دیجئے۔

حضرت محمد ﷺ نے پورا واقعہ بیان کیا۔

ورقہ نے جیسے ہی سنا برجستہ جواب دیا:

یہ تو ہی ناموس^۱ (فرشتہ) ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمایا تھا۔

ورقہ نے کہا: میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ کاش میں جوان ہوتا! کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی!

حضرت محمد ﷺ نے سنا کہ قوم ان کو نکالے گی تو بہت تعجب ہوا۔ یہ قوم جو یہاں تک گرویدہ ہے کہ عقیدت اور احترام میں نام لینا بے ادبی سمجھتی ہے، مجھ سے دعائیں کراتی ہے اور بڑے معاملات کا فیصلہ کرنا میرے حوالے کر دیتی ہے، کیا وہ ایسی آنکھیں پھیر لے گی کہ مجھے مکہ سے نکال دیگی؟

حضرت محمد ﷺ جیسے محبوب رہنما کے لئے یہ بہت ہی عجیب بات تھی۔ آپ نے تعجب سے دریافت کیا: ”کیا میری قوم مجھے نکالے گی؟“

ورقہ! بیشک آپ کو نکالے گی اور یہ انوکھی بات نہیں ہے۔ جو شخص بھی ایسی بات پیش کرتا

ہے جو آپ پیش کرنے والے ہیں اس کے ساتھ قوم کا برتاؤ ایسی ہو کر تا ہے۔ کاش میرے سامنے وہ دن آئے تو میں آپ کی پوری پوری مدد کروں!

ورقہ تو زندہ نہیں رہے۔ کچھ دنوں بعد ان کی وفات ہو گئی مگر جو بات انہوں نے کہی تھی وہ پوری ہوئی۔

یہ تھانوت کا آغاز اور یہ تھی وحی کی ابتداء جس میں پڑھنے پڑھانے، علم اور قلم کا تذکرہ اور عالمانہ زندگی کی ترغیب ہے۔ (واللہ اعلم) ابتدائی ظہور کے بعد یہ سلسلہ کچھ عرصہ کیلئے بند ہو گیا۔

تبلیغ اور دعوت عام سے پہلے تربیت

حضرت محمد ﷺ کی چالیس سالہ مثالی زندگی نے آپ کو الصادق اور الامین اور ایسا محبوب رہنما بنا دیا تھا جس کے اعلیٰ اخلاق اور بہترین کردار پر مکہ کے ہر ایک چھوٹے بڑے کو پورا اعتماد تھا۔ مگر ان اعلیٰ اخلاق کے باوجود منصب نبوت کے فرائض اور اداء فرائض کے طریقوں سے آپ قطعاً ناواقف تھے۔ قرآن مجید نے آپ کی شان یہ بیان کی ہے۔

(الف) نہ آپ لکھ سکتے تھے، نہ لکھا ہوا پڑھ سکتے تھے، نہ آپ نے کہیں تعلیم پائی تھی۔^۱ نہ آپ شاعر تھے۔ نہ ادیب کی حیثیت سے آپ کی شہرت تھی۔^۲ نہ آپ کا ہن یا نجوم داں تھے۔^۳ نہ سابق مذہبوں سے آپ کو واقفیت تھی۔^۴ نہ آپ یہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہوتا ہے، آسمانی کتاب کیا ہوتی ہے^۵ نہ آپ کو کبھی یہ خیال آیا تھا کہ آپ پر کوئی کتاب نازل ہوگی۔^۶ نہ اس شہر میں جہاں آپ پلے تھے، بڑھے تھے، نبوت یا رسالت کا چرچا تھا انتہائی کہ وہ قوم جس کے آپ فرد تھے اُبی تھی یعنی نبوت سے نا آشنا کیونکہ اس میں کوئی نبی نہیں ہوا تھا۔ حضرت ابراہیم کا نام سنا تھا۔ مگر ان کی تعلیمات فراموش ہو چکی تھیں صرف دھندلے سے نشان باقی تھے۔ لیکن اب آپ پر یہ ذمہ درمی ڈالی گئی تھی کہ ایسی قوم میں مکمل انقلاب برپا کریں۔ جو اگرچہ گمراہ ہے مگر اپنے آپ کو تمام دنیا کی قوموں میں سب سے بہتر اور برتر سمجھتی ہے اور یقین رکھتی ہے کہ حق وہی ہے جس پر وہ قائم ہے۔ اور اس انقلاب کا آغاز خاص اس گروہ سے کریں جس کو نہ صرف اس کا یقین ہے کہ وہ حق پر

۱ سورہ عنکبوت ۲۹ آیت ۳۸

۲ سورہ یٰسین ۳۶ آیت ۶۹

۳ سورہ الحاقہ ۶۹ آیت ۳۲ و ۳۱

۴ سورہ قصص ۲۸ آیت ۴۳ و ۴۲

۵ سورہ شوریٰ ۴۲ آیت ۵۲

۶ سورہ قصص ۳۸ آیت ۸۶

۷ سورہ الانفال آیت ۳۲ وَ اِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ لِهٰذَا اٰهْوَا لِحَقِّ الْاَمْرِ

ہے بلکہ یہ فخر بھی ہے۔ کہ وہ اپنے مذہب میں نہایت پختہ اور کٹر ہیں۔^۱

اس قوم (عرب) سے متصل ایک طرف ایران، عراق، فارس اور ان سے متصل ہندوستان ہے۔ ان کے مذہب اگرچہ مختلف ہیں مگر پرستش غیر اللہ (شرک) میں سب شریک ہیں۔ کوئی بت پرست ہے کوئی کو اکب پرست، کوئی عجائب پرست، ہر ایک کے پاس ایک فلسفہ ہے اور ہر ایک کو اپنی روایات، اپنے تمدن، اپنی عقل و دانش اور اپنے فلسفہ پر ناز ہے۔

دوسری طرف شام، مصر، افریقہ اور یورپ کے علاقوں میں بازنطینی شہنشاہیت کے پرچم لہرا رہے ہیں۔ اور اگرچہ آج بیسویں صدی عیسوی میں چھٹی ساتویں صدی عیسوی کے دور کو قرون وسطیٰ کا پس ماندہ غیر مہذب اور غیر ترقی یافتہ تاریک ترین دور کہا جاتا ہے۔ مگر یہی علاقے ہیں جہاں رومنہ الکبریٰ کا مشہور قانون (رومن لا) جاری ہے اور اسی علاقہ میں سقراط، بقرط، ارسطو، افلاطون، فیثاغورث جیسے باکمال فلاسفہ اور موجد گزر چکے ہیں۔ جن کے فلسفہ کو آج بیسویں صدی میں بھی زندہ فلسفہ کہا جاتا ہے۔

پس ماندہ لیکن کٹر عرب^۲ کا ایک اُمی ان تمام علاقوں اور ان میں بسنے والے انسانوں یعنی پورے نوع بشر کے لئے ہادی اور رہنما بنایا جا رہا ہے۔ منصب رسالت اس کے سپرد ہونے والا ہے تو اس سے پہلے کہ وہ دوسروں کو دعوت دے ضروری ہے کہ جن باتوں کی وہ دعوت دے ان کا نمونہ وہ خود^۳ بن جائے۔ چنانچہ نبوت کے بعد کم و بیش تین سال ایسے گزرے جن میں حضرت محمد ﷺ کو عام دعوت و تبلیغ کا حکم نہیں تھا۔ ہاں، کچھ سعادت مند وہ تھے جنہوں نے مشک کی خوشبو خود سونگھ لی اور وہ خود ہی اس شمع کے پروانے بن گئے۔ ان میں سب سے پہلے یہ حضرات ہیں ابو بکر، خدیجہ، علی، زید بن حارثہ اور اُم ایمن (رضی اللہ عنہا) یہ تعداد میں صرف پانچ ہیں مگر عجیب بات یہ ہے کہ ان کا تعلق آزاد، غلام، مرد، عورت، بچے یعنی نوع انسان کے ہر طبقہ سے ہے۔

آزاد مردوں میں ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ)

آزاد عورتوں میں خدیجہ (رضی اللہ عنہا)

بچوں میں حضرت علی (رضی اللہ عنہ)

آزاد کردہ غلاموں میں زید بن حارثہ (رضی اللہ عنہ) جو اس وقت زید بن محمد کہلاتے تھے

^۱ اپنے آپ کو وہ احس یا حس کہتے تھے یعنی اپنے مذہب میں کٹر اور نہایت پختہ

^۲ قبیلہ قریش اور ثقیف وغیرہ چند قبائل اگرچہ متدین تھے مگر عرب قوم متدین نہیں تھی۔ اس کی بڑی تعداد بادیہ نشین صحراؤں میں تھی۔ محمد میاں

^۳ تاکہ مقصد رسالت پورا ہو۔ کیونکہ نبوت اور رسالت اس لئے نہیں کہ پیغام پہنچا دیا جائے بلکہ بشر کو نبی یا رسول بنانے کا مقصد یہ ہے کہ نوع بشر کے سامنے عملی نمونہ بھی پیش کیا جائے۔ (دیکھو سورہ الانعام آیت ۱۰۳)

آزاد کردہ باندیوں میں اُم ایمن (رضی اللہ عنہا) جو بچپن سے آنحضرت ﷺ کی ماما (خادمہ) تھیں۔ ان حضرات نے بھی ابھی تبلیغ شروع نہیں کی۔ لیکن کچھ اور افراد جن کے کردار نے مستقبل میں ثابت کر دیا کہ وہ بہترین انسان اور پورے سماج کے قیمتی جواہر تھے، وہ خود متاثر ہوئے اور دعوت عام سے پہلے آغوش اسلام میں داخل ہو گئے۔ ان کے اسماء گرامی یہ ہیں (ان کے پر تقدس کارنامے تاریخ عالم کے سینے پر نقش ہیں جو شہادت دے رہے ہیں کہ یہ حضرات کس درجہ صداقت پسند، حق گو، دلیر اور بہادر تھے اور اسی لئے وہ سب سے پہلے الصادق الامین اور اس کے پیغام کے گرویدہ ہو گئے تھے)

عثمان بن عفان، طلحہ بن عبید اللہ، زبیر بن عوام، سعد بن ابی وقاص، عثمان بن مظعون، ابوعبیدہ بن الجراح، عبد الرحمن بن عوف، ابوسلمہ بن عبد اللہ، ارثم بن ابی ارقم^۴ (رضی اللہ عنہ)۔ تعلیم و تربیت کے اس بنیادی دور میں ان کی تربیت بھی ہوتی رہی۔

نصاب و طریقہ تربیت

قرآن پاک کی وہ سورتیں جو ابتداء میں نازل ہوئیں انہیں کو نصاب کہا جاسکتا ہے۔ ان سورتوں میں عقائد و نظریات کی بھی تعلیم دی گئی اور طریقہ تربیت بھی بتایا گیا ہے۔ عجیب بات جو ایک طالب حق کو مطمئن اور گرویدہ بنادیتی ہے یہ ہے کہ جن عقائد و نظریات کی تعلیم ابتداء میں دی گئی، باقی ۲۳ سالہ زندگی میں ان کی ہی تشریح اور توضیح ہوتی رہی، ترمیم کسی ایک میں بھی نہیں ہوئی۔ بنیادی تعلیمات درج ذیل ہیں۔ آیتوں اور سورتوں کے نمبر حاشیہ میں لکھ دیئے گئے ہیں۔

☆ پوری کائنات کا ایک خالق ہے جسکی سب سے نمایاں صفت یہ ہے کہ وہ رب العالمین اور ارحم الراحمین ہے (یعنی مخلوقات کے جس قدر طبقات اور درجات کائنات عالم میں ہیں وہ ان کا پیدا کرنے والا اور پالنے والا ہے۔ اس نے ہر مخلوق کی ایک فطرت بنائی اور اس فطرت کے بموجب نشوونما، بقا و تحفظ، تدریجی ترقی اور درجہ کمال تک پہنچنے کیلئے جن چیزوں کی ضرورت تھی اس کی رحمت نے ان کو مہیا کیا اور برابر مہیا کرتی رہتی ہے)۔ تمام جہانوں کا رب اور سب پر رحم کرنے والا وہی ہے۔ تمام کمالات اسی کو حاصل ہیں۔ تمام تعریفوں کا وہی مستحق ہے۔^۵

☆ مشرق و مغرب کا رب وہی ہے۔ وہی معبود ہے اس کے سوا اور کوئی پرستش کے قابل نہیں ہے۔^۶

^۴ البدایہ والنہایہ ص ۳۷ ج ۳

^۵ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ سورہ آیت ۲۱

^۶ سورہ مزمل ۷۳ آیت ۹

- ☆ اس نے انسان کو خون کے لو تھڑے سے پیدا کیا، اس کو دولت علم سے نوازا اور ترقی کے راستہ پر لگایا۔^①
- ☆ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ قلم اور لکھنے پڑھنے کے ذریعہ تعلیم کا طریقہ اسی نے بتایا۔^② وہ اس ذریعہ کے بغیر بھی جس کو چاہے عالم و فاضل اور سر تاج فضلاء بنا سکتا ہے۔
- ☆ وہ ایک ہے، یکتا ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں سب اس کے محتاج ہیں، نہ اس کے اولاد ہے، نہ وہ کسی کی اولاد ہے، اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔^③
- ☆ انسان کا ہر ایک عمل اچھا ہو یا برا ایک حقیقت ہے۔ ہر ایک عمل اپنا اثر رکھتا ہے۔ انسان اپنے اعمال کے جال میں اس طرح پھنس جاتا ہے جیسے کوئی قیدی۔^④
- ☆ کوئی شخص کسی کا گناہ اپنے اوپر نہیں لے سکتا کسی پر دوسرے کا گناہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ ہر شخص اپنا اور اپنے فعل کا ذمہ دار ہے۔ انسان کو صرف وہی ملتا ہے جو اس نے کمایا۔ انسان جو کچھ کماتا ہے وہ اس کے سامنے آئے گا۔^⑤
- ☆ ایک خاص دن ہو گا جس میں انسان کے تمام اعمال کا حساب اور ہر معاملہ کا انصاف ہو گا۔^⑥
- ☆ خدا کی مخلوق صرف وہی نہیں ہے جو تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے، بلکہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی مخلوق ہے۔ ایک خاص مخلوق وہ ہے جس کو فرشتہ کہا جاتا ہے۔ ان کی تعداد کا علم صرف ان کے خالق اللہ رب العالمین ہی کو ہے۔^⑦ وہ خدا کے حکم کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔^⑧ ان کی زندگی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل اور خدا کی حمد و ثناء کرتے رہتے ہیں۔ وہ خدا کے حکم سے انسانوں پر خدا کی نعمتیں بھی نازل کرتے ہیں اور خدا کے حکم سے خدا کا قہر بھی بندوں پر اتارتے ہیں۔^⑨
- ☆ اللہ تعالیٰ انسانوں کی صحیح رہنمائی کے لئے نبی اور رسول بھیجتا ہے۔^⑩ نبی اپنی طرف

① سورہ علق ۹۶ آیت ۲ و ۳

② سورہ علق ۹۶ آیت ۳

③ سورہ اخلاص ۱۱

④ سورہ مدثر ۷۷ آیت ۳۸

⑤ سورہ النجم ۵۳ آیت ۳۸، ۳۹، ۴۰

⑥ سورہ الفاتحہ ۱ آیت ۳

⑦ سورہ مدثر ۷۷ آیت ۳۱

⑧ سورہ النجم ۵۳ آیت ۲۵

⑨ سورہ مدثر ۷۷ آیت ۳۱

⑩ سورہ حمل ۷۷ آیت ۱۵

- سے کچھ نہیں کہتا، صرف وہ کہتا ہے جو خدا اس کو بتاتا ہے۔^①
- ☆ علم اور یقینی بات وہی ہے جو اللہ کے بتانے سے رسول بتاتا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ انسان کے پاس ہے وہ ظن ہے (تخمینی اور اٹکل کی باتیں ہیں)، جو علم و یقین کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔^②
- ☆ تزکیہ نفس اور دل کو پاک کرنے اور روحانیت کو ترقی دینے کی صورتیں یہ ہیں۔
- ☆ اللہ کو یاد کرو۔ دن کو یاد کرو۔ رات کو جاگ کر خدا کو یاد کرو۔^③ نمازیں پڑھو۔ زکوٰۃ ادا کرو (جو ایک لازمی فریضہ ہے اور زکوٰۃ کے علاوہ) اللہ کو قرض دو (ملی اور قومی کاموں میں خرچ کرو وہ اللہ تعالیٰ پر قرض ہو گا) کوئی نیک عمل ضائع نہیں کیا جائے گا۔ جو نیکی کرو گے خدا کے یہاں اس سے بہتر اور بڑھا ہوا پاؤ گے۔ جو غلطیاں اور کوتاہیاں ہوتی رہیں اللہ تعالیٰ سے ان کی معافی اور مغفرت چاہتے رہو۔^④
- ☆ دولت کو اللہ کا انعام سمجھو۔ ہر ایک غرض سے بلند ہو کر صرف اللہ تعالیٰ کے فرمان کی تعمیل اور اس کی رضا حاصل کرنے کیلئے ہر ایک ضرورت مند کی مدد کرو اور اس سے کہہ دو کہ ہم کوئی بدلہ نہیں چاہتے صرف اللہ کی رضا چاہتے ہیں۔^⑤
- ☆ روحانیت کی پاکی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جسم کو پاک رکھو۔ لباس پاک رکھو ہر ایک پلیدی کو (ظاہری ہو یا باطنی) دور کرو۔^⑥
- ☆ عذاب کے کام (جن سے انسان کی ابدی زندگی برباد ہوتی ہے اور دوزخ کا مستحق ہو جاتا ہے) یہ ہیں: نماز نہ پڑھنا، غریبوں کی امداد نہ کرنا، بیکار باتوں (اور خدا سے غافل کرنے والے کاموں) میں منہمک رہنا، عذاب و ثواب یعنی پاداش عمل پر یقین نہ رکھنا^⑦ کسی کے ساتھ اچھا سلوک کر کے اس پر احسان جتنا۔^⑧
- ☆ ایسی صورتیں اختیار کرنا کہ دولت اپنے پاس جمع رہے اور غریبوں اور ضرورت مندوں کی امداد نہ ہو۔^⑨

① وانجم ۵۳ آیت ۳۔۴

② وانجم ۵۳ آیت ۲۸

③ سورہ حمل ۷۷ آیت ۲، ۳، ۴

④ سورہ حمل ۷۷ آیت ۲۰

⑤ سورہ دھر ۷۷ آیت ۸، ۹ سورہ مدثر ۷۷ آیت ۶

⑥ سورہ مدثر ۷۷ آیت ۵۴

⑦ سورہ مدثر ۷۷ آیت ۳۳ تا ۳۶

⑧ ایضاً آیت ۶

⑨ سورہ القلم ۷۸ آیت ۱۶ تا ۳۰

☆ اچھے آدمی جن کے نقش قدم پر چلنا چاہئے وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعام سے نوازا۔^①
یعنی ① (الف) خدا کے برگزیدہ نبی: جو ایسے پاک فطرت ہوتے ہیں کہ ہمیشہ گناہوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

(ب) صدیق: جو اپنے قول و فعل میں نہایت سچے، جن کا ضمیر سچا، جن کے ہر فعل میں سچائی اور صداقت، یہاں تک کہ وہ سچائی کا پیکر اور صداقت کی تصویر ہوتے ہیں۔
(ج) شہید: جو حق و صداقت کے راستہ میں ہر ایک قربانی کے لئے تیار رہتے ہیں جن کا جذبہ بیکہ ہوتا ہے کہ راہ حق میں قربان ہوں۔ اس کے علاوہ اور اپنے تمام جذبات قربان کر دیتے ہیں یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی قربان کر دیتے ہیں۔

(د) صالح: نیک کردار، پاکباز، پاک طینت، جو اچھے کاموں کی بہترین صلاحیت رکھتے ہیں اور اس صلاحیت کو عمل میں لاتے رہتے ہیں۔

☆ مومن صالح اور سچا مسلمان وہ ہے جو راتوں کو جاگ جاگ کر خدا کو یاد کرے۔ دن کے کاموں کو خوبی سے انجام دے اور دل میں یاد خدا رکھے۔ اسی سے اس کا دل لگا رہے۔ اسی پر بھروسہ رکھے، نمازیں پڑھے، زکوٰۃ ادا کرے۔ قومی اور ملی کاموں کے لئے دولت خرچ کرتا رہے۔ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگتا رہے۔ مخالفین کی باتوں کو ضبط و تحمل سے برداشت کرے۔ برداشت سے باہر ہو جائیں تو خوش اسلوبی، سنجیدگی اور نرمی کے ساتھ ان سے الگ ہو جائے۔^② جو قول و قرار کے پکے ہوں، جو منت مان لیں یا عہد کر لیں اس کو پورا کریں۔ جو بلا لحاظ مذہب و فرقہ مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کی امداد کو اپنا فرض سمجھیں۔ اپنی ضرورتیں پیچھے ڈالیں ان کی ضرورتیں پوری کریں۔ خدا کی خوشنودی ان کا نصب العین ہو۔ جو کچھ کریں خدا کے لئے ہی کریں۔ کسی انسان سے کوئی معاوضہ گوارا نہ کریں۔ یہاں تک کہ یہ بھی نہ چاہیں کہ کوئی انسان ان کا کسی طرح شکر یہ ادا کرے۔ خوف خدا، خدا کی عظمت اور اپنے انجام کی فکر ان کے دل و دماغ پر چھائی رہے۔ جو کچھ کریں اسی لئے کریں۔^③

☆ بدترین انسان وہ ہیں جو حکومت اور اپنے اقتدار پر گھمنڈ کریں۔ جن کو اپنی شاہنشاہیت پر ناز ہو (جیسے فرعون)۔ جو اپنی دولت کے نشہ میں صداقت سے منہ موڑیں۔ حقائق کو جھٹلائیں۔^④

① سورہ فاتحہ آیت ۵

② یہ تشریح قرآن پاک میں بعد میں نازل ہوئی (سورہ نساء آیت ۶۹) لیکن عمل پہلے دن سے اسی پر تھا۔

③ سورہ حمل آیت ۱-۷، ۸، ۹، ۱۰، ۲۰

④ سورہ ہر آیت ۷، ۸، ۱۰، ۹

⑤ سورہ حمل آیت ۱۵، ۱۶، ۱۷

جن کو اپنی دولت پر، اپنی اولاد پر، اپنے مادی ذرائع و وسائل پر ناز نہ ہوا انہیں کی بڑھوتی کی اڈھیڑ بن میں رات دن لگے رہیں۔ ذخیرہ اندوزی کے حریص ہوں، حق کے مقابلہ میں اکثر جائیں، سچائی کی توہین کریں، عبرت کی آنکھیں بند رکھیں۔^① خدا کی مخلوق کو بھول جائیں۔ جھوٹ بولنے اور جھوٹی قسمیں کھانے سے نہ شرمائیں۔ بلکہ اس کو ہوشیاری اور فن کاری سمجھیں۔ کسی کو چڑھائیں کسی کا اتاریں۔ لگی بجھی کرتے رہیں۔ چغلیاں کریں۔ نہ ان کی نظر میں شرافت اور اخلاق کی قدر ہونہ عصمت اور پاک دامنی کی۔ جن کی کوشش یہ ہو کہ غریبوں کا حق دبا لیں اور اپنا سرمایہ بڑھائیں۔^②

طریقہ تربیت

☆ رات کو اٹھو، جاگو، آدھی رات یا آدھی رات کے قریب یاد خدا میں کھڑے ہو کر گزارو۔^③
☆ قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر اطمینان سے پڑھو۔^④ (تبلغ خصوصاً فرائض نبوت کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ ریاضت و مجاہدہ یعنی محنت کرنے اور مشکلات کو برداشت کرنے کی عادت ہو۔ ضمیر پاک ہو۔ اس کی تمام صلاحیتیں بیدار ہوں۔ جو بات نکلے دل سے نکلے۔ ہر ایک بات نہایت ٹھیک اور سنجیدہ ہو۔ شب بیداری سے یہ خصلتیں پیدا ہوتی ہیں اور ترقی کرتی ہیں کیونکہ) یہ حقیقت ہے کہ رات کے اٹھنے میں دل اور زبان کا خوب میل ہوتا ہے اور ہر بات خوب ٹھیک نکلتی ہے۔^⑤ (لہذا شب بیداری کرو تاکہ یہ خصلتیں پیدا ہوں کیونکہ) ہم عنقریب ڈالیں گے تم پر بھاری کلام۔^⑥

☆ پورے دن کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھو۔^⑦

☆ اپنے رب کے نام کا ذکر جاری رکھو۔^⑧

☆ اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو جاؤ۔^⑨

☆ خدا کو اپنا وکیل اور ذمہ دار بنالو^⑩ اسی پر بھروسہ رکھو۔

① سورہ مدثر آیت ۱۱-۱۲

② سورہ قلم آیت ۸-۱۰، ۲۳ تا ۲۸

③ سورہ حمل آیت ۲، ۳

④ ایضاً آیت ۳

⑤ ایضاً آیت ۶

⑥ ایضاً آیت ۵

⑦ سورہ حمل آیت ۷، ۸

⑧ ایضاً آیت ۸

⑨ ایضاً آیت ۸

⑩ ایضاً آیت ۹

☆ اس عقیدہ کو اپنے اوپر حاوی کر لو کہ مشرق و مغرب (اور تمام عالم) کارب وہی ہے اس کے سوا اور کوئی نہیں جو معبود اور اللہ ہو۔^{۱۰}

☆ جو کچھ وہ (مخالفین) کہتے ہیں اس پر ضبط و تحمل سے کام لو^{۱۱}۔ زیادہ سے زیادہ برداشت کی عادت ڈالو۔

☆ دنیا داروں سے کنارہ کرو (مگر خوبصورتی کے ساتھ^{۱۲})۔ یہ کنارہ کشی ایسی ہو کہ اپنے اندر جمال رکھتی ہو۔ نفرت نہ ہو بلکہ ایسی ہو جیسے طبیب، بیمار کی بیماری سے اپنا بچاؤ کرتا ہے۔ مگر اس طرح کہ اس بچاؤ میں بھی دلداری ہوتی ہے۔ مرض کا علاج کرتا ہے، مریض کا دل نہیں توڑتا۔

داعی الی اللہ کے اوصاف اور ان کی تربیت و تکمیل

جس ذات کو اس لئے اٹھایا جا رہا ہو کہ وہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے، بھگی ہوئی مخلوق کو حق و صداقت کے صراط مستقیم اور نیکی اور سچائی کے شاہراہ اعظم پر چلائے۔ اس کے کچھ اوصاف ہونے چاہئیں۔ قرآن حکیم میں جابجا ان اوصاف کی طرف اشارے اور کہیں تصریح پائی جاتی ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت ایک بہترین مثال ہے اور ان اشاروں اور تصریحات کی شہادت یہ ہے کہ محمد رسول اللہ کی ذات اقدس بہترین مثال اور نمونہ اس لئے تھی کہ مقاصد دعوت و ہدایت کے لئے آپ کی تربیت خاص طور پر کی گئی تھی۔ داعی حق کے تمام اوصاف اس مختصر کتابچے میں بیان نہیں کئے جاسکتے یہاں صرف چند اوصاف بیان کئے جا رہے ہیں۔

(۱) ہمدردی: کامیاب داعی اور ہادی کو شمع اور چراغ ہونا چاہئے۔ شمع پوری محفل کو فیض پہنچاتی ہے۔ تاریک مجلس کو روشنی سے بھر دیتی ہے۔ مگر اس طرح کہ اہل محفل کے لئے خود فنا ہوتی رہتی ہے۔ ایک سوز ہوتا ہے جو اس کے تن من کو تحلیل کرتا رہتا ہے۔ داعی حق بھی اسی طرح سوز و گداز کا پیکر ہوتا ہے۔ وہ اپنی بقاء اسی میں سمجھتا ہے کہ راہ حق میں خود کو فنا کر دے۔ قرآن حکیم کی شہادت یہ ہے کہ محمد ﷺ سراج منیر (شمع سوزاں) تھے^{۱۳} اور درد دل کا عالم یہ تھا کہ جان عزیز اسی میں گھلا رہے تھے^{۱۴} کہ بھٹکے ہوئے انسان سیدھے راستے پر آجائیں۔

(۲) اذعان اور یقین: (الف) ایک شخص اپنے بھڑکھڑا ہوا، دشمن کے لشکر کو دیکھ رہا

^{۱۰} ایضاً آیت ۱۰

^{۱۱} ایضاً آیت ۱۰

^{۱۲} ایضاً آیت ۱۰

^{۱۳} يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِأَفْئِهِ وَسَيِّئًا مَّا تُنْفِي ۝ (احزاب ۳۵، ۳۶)

^{۱۴} فَلَعَلَّكَ بَاقِعٌ مِّنْ نَّفْسِكَ (شعراء آیت ۳۔ نیز سورہ ۱۸ کہف آیت ۶)

ہے جو تیزی سے حملہ کرنے کے لئے آرہا ہے۔ اس کی ہستی کے آدمی، پہاڑ کے پیچھے ہیں وہ نہیں دیکھ رہے۔ یہ دیکھنے والا شخص جس خطرہ سے اپنی قوم کو آگاہ کر رہا ہے، وہ اس کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ اس لئے وہ اپنی پوری طاقت صرف کر رہا ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے وہ ہستی کے غافل لوگوں کو جگا دے اور اپنے مشاہدہ کا یقین ان کو دلا دے۔ داعی حق کو اپنی دعوت پر ایسا ہی یقین ہونا چاہئے۔^{۱۵} گویا قبول حق اور کفر و انکار کے نتائج کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

(ب) ایک نہایت شاداب باغیچہ میں ایک گہری خندق ہے جس میں آگ کے بڑے بڑے انگارے دھک رہے ہیں۔ خندق کے کنارے پھسلوان ہیں۔ سیر کرنے والوں کو اس کی خبر نہیں ہے۔ جس کو خبر ہے وہ سیر کرنے والوں کو پورے یقین کے ساتھ خطرہ سے آگاہ کرتا ہے اور اگر باغ کی سیر کرنے والے اس کے دوست اور عزیز قریب ہوتے ہیں تو وہ اپنی پوری طاقت صرف کر دیتا ہے کہ ان کو اس خندق کی طرف نہ جانے دے۔

داعی حق باخبر باغبان ہوتا ہے جس کو مخلوق خدا سے ایسی ہی محبت ہوتی ہے، جیسی اپنے اہل و عیال سے۔ وہ خندق کی طرف جانے والوں کو منع کرتا ہے۔ کوئی آگے بڑھ جاتا ہے تو اس کو کمر پکڑ کر کھینچتا ہے۔ اس وقت اس کی ہمدردی سراسر اضطراب بن جاتی ہے۔^{۱۶} اس کا سوز و اضطراب ناقابل بیان ہوتا ہے۔

شمع جلتی ہے پر اس طرح کہاں جلتی ہے

بڑی ہڈی مری اے سوز نہاں جلتی ہے

(۳) داعی حق کی کامیابی یہ نہیں ہے کہ اس کی شوکت و حشمت کے سامنے لوگوں کی گردنیں جھک جائیں۔ بلکہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ اس کی دعوت کی مقبولیت، دلائل کی مضبوطی، اس کے اخلاص، قول اور فعل کی صداقت اور اس کی سچی خیر خواہی اور ہمدردی، بے لوث زندگی اور بلندی اخلاق کے سامنے لوگوں کے دل جھک جائیں۔ ان میں گرویدگی اور عقیدت پیدا ہو جائے۔ لہذا سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ:

(الف) کوئی جور اور جبر نہ ہونا چاہئے۔ ہر صاحب فکر کی رائے کو آزادی حاصل ہو۔ وہ خود اچھے برے اور اندھیرے اور اجالے کو پہچانے اور اپنے ضمیر کی شہادت پر عمل کرے۔

لَا اِكْرَاهِي الْدِينُ ۚ قَدْ تَشِيتُ الرُّشْدَ مِنَ الْغَىٰ - (بقرہ ۲۵۶)

(ب) بیشک داعی حق اصلاحی مسائل پیش کرے گا۔ لوگوں سے مطالبہ کرے گا کہ وہ اس کے اصول تسلیم کریں اور ان پر عمل کریں۔ لیکن ضروری ہے کہ انداز نہایت سنجیدہ، دانش مندانہ،

^{۱۵} بخاری شریف ص ۹۶۰ حدیث ابی موسیٰ فیہ اتا الخیر العریان

^{۱۶} بخاری ص ۹۶۰ حدیث ابی ہریرہ۔

نصیحت آمیز اور خیر خواہانہ ہو۔ تبادلہ خیالات اور بحث و مباحثہ کی نوبت آئے تو اس کا انداز اور طرز بھی ایسا حسین ہو کہ اس سے زیادہ نرم، دلکش اور پیار بھر انداز نہ ہو سکے۔

أَذْمُ إِلَى سَيِّئِلِ رَبِّكَ ۝ (نمل- ۱۲۵)

(ج) گمراہ، سرکش، شورہ پشت، شرارت پسند، بدکردار جن کو سیدھے راستہ پر لانا مقصود ہے ان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ داعی حق کی بات سنجیدگی سے سنیں گے اور شرافت کا جواب شرافت سے دیں گے۔ بالخصوص ایسی صورت میں کہ ان کی عزت و عظمت، شہرت یا ان کے کسی مفاد کو نقصان پہنچ رہا ہو تو وہ لامحالہ حق کے مقابلہ میں اپنی ہر ایک شرارت کو کام میں لائیں گے اور پوری قوت سے سرکشی اور بغاوت کا مظاہرہ کریں گے۔ اس صورت میں داعی حق کا فرض کیا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: معافی اور درگزر کو اپنا اصول بنالو، نیکی کی ہدایت کرتے رہو اور جاہلوں (نادانوں) سے کنارہ کرتے رہو۔ (اعراف- ۱۹۸، نمل- ۱۲۷، مزمل و مدثر و ہر وغیرہ)

(۴) اگرچہ قانون یہ ہے کہ برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہوتی ہے وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (شوریٰ ۴۸)

مگر داعی حق اس قانون پر عمل نہیں کرتا بلکہ اس کا اصول یہ ہوتا ہے: بدی کا جواب نیکی سے دیتے ہیں، بھلائی کر کے برائی کو دفع کرتے ہیں۔

وَيَذَرُوعُونَ بِالْخَسَنَةِ السَّيِّئَةَ (الرعد- ۲۲)

(۵) عدل کے معنی برابر ہی پیدا کرنے کے ہیں۔ اسی کو انصاف کہا جاتا ہے، اس سے مساوات تو قائم ہو جاتی ہے مگر بدی ختم نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات جواب اور جواب الجواب کا سلسلہ بدی کو بڑھاتا اور اس کے دائرہ کو وسیع کر دیتا ہے۔ داعی حق کا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ بدی اور برائی دنیا سے ختم ہو۔ لہذا اس کا اصول یہ ہو گا کہ جب کوئی بدی پیش آئے گی تو اس کے اسباب تلاش کر کے ایسا راستہ اختیار کرے گا کہ بدی اور برائی کی جڑ کٹے، دوست دشمن بن جائیں، جو برے ہیں وہ اچھے ہو جائیں۔

وَلَا تَسْتَوِي الْخَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ إِذْ قُمَ بِالْأَيْمِيهِ إِحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ

وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (حم سجدہ- ۳۴)

مگر یہ آسان بات نہیں ہے۔ اس کو وہی کر سکتے ہیں جو ضبط و تحمل کے عادی ہوں۔ جو مکارم اخلاق

پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے (اے نبی) اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ اس طرح کہ حکمت (دانمندی) کی باتیں بیان کرو۔ اور اچھے طریقہ پر پند و نصیحت کرو اور مخالفوں سے بحث و نزاع کرو (وہ بھی) ایسے طریقہ پر کہ حسن و خوبی کا طریقہ وہی ہو (اس سے اچھا نہ ہو سکے) تمہارا پروردگار یہی بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک گیا اور کون راہ راست پر ہے۔

کے خوگر ہوں۔ (ایضاً آیت ۳۵)

لیکن عالم اسباب میں کسی چیز کی عادت جب ہی ہوتی ہے جب پہلے اس کی تربیت ہو چکی ہو۔ مختصر یہ کہ اس دور میں تربیت کا ایک مکمل باب یہ بھی تھا کہ ان کمالات و اوصاف کا عادی بنایا گیا جو سب سے افضل اور آخری پیغمبر اور سب سے زیادہ جلیل القدر داعی کے لئے ضروری تھے۔

شمرہ تربیت

جن کی فطرت سلیم نے بلا دعوت اور بلا فرمائش خود بخود محمد رسول اللہ ﷺ کی پیروی کو پوری زندگی کا نصب العین بنایا تھا۔ اس زمانہ تربیت میں جو رنگ محمد نبی اللہ ﷺ پر غالب آتا رہا اسی رنگ میں یہ بھی رنگے جاتے رہے۔ شمرہ یہ ہوا کہ ایک جماعت ایسی تیار ہو گئی۔

۱۔ جو خدا شناس اور سچی خدا پرست تھی۔

۲۔ جو سب کو چھوڑ کر اپنا رشتہ خدا سے جوڑ چکی تھی۔

۳۔ جس کا پورا بھروسہ اپنے خالق اور مالک پر تھا۔

۴۔ جس کا دل ہر ایک طمع سے پاک اور صرف اپنے خالق کی محبت سے لبریز تھا۔

۵۔ جس کے دل پر صرف خالق کائنات کی عظمت کا سکھ تھا، اسی کا خوف اس کے قلب و جگر کا داغ تھا۔ جس نے خوف خدا کے سوا ہر ایک خوف و خطر کے دھبے کو مٹا دیا تھا۔

۶۔ جس کو خالق کی ہر ایک مخلوق سے محبت تھی، کیونکہ وہ اس کے رب کی پالی ہوئی مخلوق ہے۔ ہر ایک انسان کا در اس کے دل میں تھا، کیونکہ یہ انسان خدا کی قدرت کا شاہکار تھا جس سے اس کو عشق ہو گیا تھا اور جس کے لئے یہ سب کچھ قربان کر دینے کو زندگی کا نصب العین اور دل کی آخری آرزو بن چکا تھا۔

۷۔ اس جماعت کو ان سے نفرت ہو گئی: (الف) جن کے دل اپنے خالق اور رب کی عظمت اور اس کی مخلوق کے در سے نا آشنا تھے۔ (ب) جو خدا کو چھوڑ کر اپنی اغراض کی پوجا میں لگے ہوئے تھے۔ (ج) جن کو مال اور اولاد پر ناز تھا اور انہی کی ترقی ان کی زندگی کا محبوب نصب العین تھا۔ (د) جن کو غریبوں سے نفرت تھی کیونکہ وہ دولت سے محروم ہوتے تھے۔ (ه) جو یتیموں اور بیواؤں کو اپنے پاس نہیں آنے دیتے تھے کہ ان کی امداد کرنے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان سے کہیں زیادہ انہیں اپنی تجویروں سے محبت تھی۔ (و) کمزوروں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا، مخلوق خدا کو غلام اور غلاموں کی زندگی کو اپنی خواہشات کا کھلونا بنانا، ان کی عظمت و برتری کا نشان تھا، جس کو وہ کسی وقت بھی مٹانا یا نیچا کرنا نہیں چاہتے تھے خواہ ان کی جان جاتی رہے۔

مقامی اور سماجی حالات اور رد عمل

۱۔ عرب میں بادشاہت نہیں تھی۔ ہر ایک قبیلہ آزاد ہوتا تھا۔ شیخ قبیلہ اندرونی نظام کا اگراں ہوتا تھا۔ مکہ میں اس نظام نے چھوٹے سے جمہوریہ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ صدر جمہوریہ تو پھر بھی کوئی نہیں تھا، البتہ قبائل کی ایک مشترک جماعت (کونسل) تھی۔ اس نے شہری، سماجی اور انتظامی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر تقریباً ایک درجن شعبے (پورٹ فولیو) بنائے تھے اور ہر شعبہ کا سربراہ منتخب کر دیا تھا۔ مثلاً مقدمات قتل کا ایک خاص شعبہ تھا۔ اس کے سربراہ ابو بکر صدیق تھے۔ شعبہ سفارت کے ذمہ دار حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے۔ اسی طرح باقی شعبوں کے ذمہ دار علیحدہ علیحدہ تھے۔ ان میں سے صرف ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ وہ تھے جو سب سے پہلے اسلام لائے تھے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کئی سال بعد مسلمان ہوئے۔ باقی شعبوں کے ذمہ دار یا مسلمان ہی نہیں ہوئے یا اگر مسلمان ہوئے تو بہت آخر میں۔ اس مشترک جماعت کے اجلاس ہوا کرتے تھے۔ اس مقام کا نام ”دارالندوہ“ تھا۔

جہاں یہ اجلاس ہوا کرتے تھے، کوئی غیر معمولی معاملہ ہوتا تو اراکین کے علاوہ بھی نمایاں افراد کو خاص طور پر مدعو کر لیا جاتا تھا۔

(۲) حرب بن امیہ، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، عتبہ ربیعہ، ابو لہب، ابو جہل، امیہ بن خلف، ابی بن خلف، عقبہ بن ابی معیط، نضر بن حارث، اسود بن عبد یغوث۔ بڑے بڑے دولتمند تھے۔ یہ تاجر بھی تھے صاحب جائیداد بھی، سودی کاروبار بھی بڑے پیمانہ پر کرتے تھے اور ان تمام خصوصیتوں کے مالک تھے جو سرمایہ داروں میں ہوا کرتی ہیں مثلاً ابو لہب جو آنحضرت ﷺ کا چچا بھی تھا اور ہمیشہ مخالفت میں پیش پیش رہا، اس کا سودی لین دین وسیع پیمانے پر تھا اور اس کے حرص و طمع کی یہ حالت تھی کہ اس نے خانہ کعبہ کے خزانہ سے سونے کا ہرن چوری کر کے بیچ ڈالا تھا۔ یہ ہرن بہت عرصہ سے محفوظ چلا آتا تھا۔^۱

عاص بن وائل بہت بڑا دولتمند قبیلہ کا مشہور سردار تھا مگر حضرت خباب رضی اللہ عنہ سے اس پر جھگڑا ہوا کہ انہوں نے لوہے کی کوئی چیز بنا کر اس کو دی تھی وہ اس کی اجرت مانگتے تھے اور یہ جان چراتا تھا۔^۲ اور یاد ہو گا یہی عاص بن وائل تھا جس نے یمن کے ایک تاجر کو مار پیٹ کر بھگا دیا تھا، جب اس نے اپنے دام مانگے جس سے تمام مکہ والوں کی بدنامی ہوئی اور جس کی بنا پر وہ انجمن بنائی گئی تھی جس کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے۔^۳

^۱ معارف ابن قتیبہ

^۲ بخاری شریف ص ۳۰۴

^۳ زیر عنوان کمزوروں کی امداد عدل و انصاف اور جذبہ اصلاح۔

قرآن شریف نے کسی کا نام نہیں لیا مگر اس کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ سماج اور معاشرہ کا اونچا طبقہ جو مکہ پر چھایا ہوا تھا جو اس لحاظ سے خوش نصیب مانا جاتا تھا کہ ان کے یہاں دولت کے انبار بھی ہوتے تھے اور فرماں بردار اولاد کی بھی کمی نہیں ہوتی تھی، اس کے اخلاق اور اوصاف یہ تھے:

(الف) اپنی اس خوش نصیبی پر کہ وہ صاحب مال اور صاحب اولاد ہیں ان کو گھمنڈ اور غرور ہوتا تھا۔

(ب) جوان سے کم ہوتے تھے ان کو حقیر سمجھتے اور طرح طرح کے طعنے دیتے تھے۔

(ج) اپنے اثر و رسوخ اور اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے جھوٹی قسم کھانے سے ان کو عار نہ آتی تھی بلکہ بڑھ بڑھ کر قسمیں کھاتے، دوسروں کو لڑانے اور اپنے مخالفوں کو زک پہنچانے کے لئے بے دھڑک چغلیاں اور طرح طرح کا شرارت آمیز پروپیگنڈہ کرتے تھے۔^۱

(د) کمزوروں پر ظلم کرنا، ان کی عادت تھی۔

(ه) نرم مزاجی اور اخلاق سے نا آشنا تھے۔ نیک کام نہ خود کرتے نہ دوسروں کو کرنے دیتے۔

(و) غریبوں کی امداد کا کوئی موقع ہوتا تو اس میں روڑے اٹکاتے نہ خود خرچ کرتے نہ دوسروں کو خرچ کرنے دیتے۔

(ز) اخلاق سے نا آشنا سخت دل، خشک مزاج طبیعت کے روکھے۔^۲

(ح) رات دن تجوری بھرنے کی کوشش میں مصروف رہتے۔ اس تصور سے نا آشنا تھے کہ یہ دولت ختم ہونے والی بھی ہے۔^۳

(ط) خدا سے بے تعلق، خدا پرستی سے بے گانہ، کج بحث، زبان زوری سے اپنے عیبوں کو چھپانے والے۔^۴

یہی لوگ تھے جو پورے مکہ پر چھائے ہوئے تھے اور چونکہ مکہ ہر لحاظ سے پورے عرب کا مرکز تھا تو ان کے اثرات پورے عرب پر غالب تھے۔

ایک شخص جس نے بچپن، جوانی اور ادھیڑ عمر کا ایک حصہ شہر کی گھلی ملی زندگی میں اس طرح گزارا ہو کہ وہ لوگوں کی آنکھ کا تار ابنار ہا ہو۔ اس کی زندگی میں خاص طرح کی تبدیلی آئے اس کے کچھ ساتھی ہو جائیں۔ ان میں وہ بھی ہوں جو شہری زندگی میں اونچا درجہ رکھتے ہوں۔^۵ کچھ مالدار گھرانوں کے نوجوان ہوں۔^۶ اور یہ سب ایک خاص قسم کی انقلاب انگیز زندگی بنانے لگیں۔ مان لیجئے

^۱ القلم آیت ۸ تا ۱۵

^۲ ایضاً

^۳ سورہ ۱۰۴ ہزہ آیت ۲

^۴ سورہ ۷۴ مدثر آیت ۱۶ تا ۲۵ و آیت ۳۵ و ۳۶ سورہ ۱۸۳ لطفین آیت ۲ و ۳ و آیت ۱۲ و ۱۳ سورہ ۱۹۶ لعلق آیت ۷ و ۷

^۵ جیسے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

^۶ جیسے حضرت عثمان بن عفان، عبدالرحمن بن عوف، مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہم

یہ کسی کو اپنی طرف نہیں بلاتے مگر کیا خود ان کا عمل اور غیر معمولی انداز لوگوں کو متوجہ نہیں کرے گا۔ خصوصاً وہ بڑے لوگ جو اپنے اقتدار کو سنبھالنے کے لئے ہر خطرہ کے موقع پر خوردبین سے کام لیتے ہیں۔ کیا وہ ان کے طرز زندگی سے ہر اسام اور چوکنے نہیں ہونگے اور کیا یہ بات ان کو سر اسیمہ اور پریشان نہ کر دے گی کہ یہ جماعت جس طرح شرک اور بت پرستی کے خلاف توحید کی قائل اور خدا پرستی کی عاشق ہے وہ سرمایہ دارانہ نظام حیات سے بھی اتنی ہی متنفر ہے اور جذبات نفرت کی پرورش کر رہی ہے۔

رد عمل:

یہ قدرتی بات تھی کہ سرداران قریش نے جیسے ہی اس چھوٹی سی جماعت کے انداز سے خطرات کو بھانپنا۔ مخالفت شروع کر دی۔ مگر جس طرح دعوت عام نہیں تھی مخالفت بھی عام نہیں تھی۔ نجی مجلسوں میں تبصرے ہوتے۔ پشیمیلے والے اثرات کو زائل کیا جاتا اور مخالفانہ رائے پختہ کی جاتی تھی۔ مگر گفتگو اور تبادلہ خیالات کے ذریعہ مثلاً: سب سے پہلے قرآن پاک کی معجزانہ فصاحت و بلاغت تھی جو ہر ایک صاحب ذوق کو متاثر کر دیتی تھی اور جب کوئی صاحب فکر معنی اور مقصد پر غور کرتا تو حیران رہ جاتا اور بسا اوقات وارفتہ ہو جاتا تھا۔ یہ وارفتگی گرویدگی کی حد تک پہنچتی تھی جو اس کو سب سے چھڑا کر حضرت محمد ﷺ سے وابستہ کر دیتی تھی۔ جو حضرات اب تک مسلمان ہو چکے تھے اگرچہ ان کی تعداد تھوڑی تھی مگر وہ قرآن پاک کی اس تاثیر کی بہترین مثال اور نمونہ تھے۔ قرآن پاک کی اس تاثیر کو معاذ اللہ جادو کہا جاتا تھا۔ کہ یہ منتر ہے جو کسی سے محمد ﷺ کو ہاتھ لگ گیا ہے وہ اس منتر سے متاثر کر تار ہتا ہے۔^①

ان تمام آیتوں اور سورتوں میں جن عقائد اور نظریات کی تلقین ہے جب ان پر بحث ہوتی تو بڑے لوگوں کا چلتا ہوا جواب یہ ہوتا تھا: پرانے زمانہ کی دقیاوسی باتیں ہیں۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب یہ باتیں نہیں چل سکتیں۔^②

جب خدا پرستی اور توحید کا ذکر ہوتا تو جواب دیا جاتا: اپنے باپ دادوں کے مذہب سے ہٹ کر گمراہ ہو رہے ہیں۔^③

جب ان کی شب و روز کی عبادت اور غیر معمولی شب بیداری کا تذکرہ ہوتا تو رساء قریش کی

① سورہ مدثر آیت ۲۴ تنبیہ: سورہ مدثر اور سورہ قلم کی تمام آیتیں اگرچہ ایک ہی دفعہ میں نازل نہیں ہوئیں کچھ پہلے نازل ہوئیں کچھ تھوڑے وقفہ کے بعد۔ مگر بہر حال تمام آیتیں نبوت کے ابتدائی دور میں ہی نازل ہوئیں۔

② سورہ ۶۸ قلم آیت ۱۵

③ ایضاً آیت

مجلسوں میں تبصرہ یہ کیا جاتا: دیوانے ہو گئے ہیں۔

لیکن ظاہر ہے اس طرح کے جوابات وقتی طور پر کام کر سکتے ہیں۔ واقعی اور حقیقی اثرات کو زائل اور سوال کرنے والوں کو مطمئن نہیں کر سکتے۔ تو اب ان لوگوں نے یہ چاہا کہ اس سے پہلے محمد ﷺ کے اثرات متعدی ہوں، ان سے کوئی سمجھوتہ ہو جائے چنانچہ سرداران قریش کا ایک وفد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

ارکان وفد پر ایک نظر ڈال لیجئے:

(۱) ولید بن مغیرہ، مکہ کا رئیس اعظم جو دولت مندی اور خوش حالی کی تمام عظمتیں اپنے اندر رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کو وحید کہا جاتا تھا۔

(۲) ابو جہل، سب سے زیادہ ہوشیار اور چالاک سردار۔

(۳) اسود بن عبد یغوث، مکہ کا بہت بڑا تاجر اور رئیس۔

(۴) اخنس بن شریق، طائف کا سب سے بڑا سردار اور رئیس۔

وفد نے آپ کے سامنے تین صورتیں پیش کیں:

- اگر دماغی غلش ہے تو اجازت دیجئے ہم بہترین علاج کا انتظام کریں۔
- اگر عیش و عشرت مقصود ہے تو ہم دولت اور حسن دونوں فراہم کر سکتے ہیں۔
- اگر اقتدار مطلوب ہے تو مکہ کے اقتدار کی باگ ڈور آپ کے حوالے کرتے ہیں۔ مگر آپ اپنے انداز کو ہلکا کیجئے۔ آپ کے نظریات جو سننے میں آرہے ہیں نہایت سخت ہیں۔ وہ ہیجان برپا کر دیں گے۔

مگر وحی الہی نے اسی طرح کی پیش کشوں کی شدت سے تردید کر دی۔ ا۔

تبلیغ کا آغاز

سب سے پہلے اپنا خاندان

حضرت محمد ﷺ کو جب حکم ہوا ”قُمْ فَأَنْذِرْ“^① اٹھو اور لوگوں کو آگاہ کرو (کہ ان کے موجودہ عمل اور کردار کا مستقبل کیا ہوگا) تو آپ نے انداز اور تبلیغ کا سلسلہ اپنے خاندان سے شروع کیا۔ خدا کا حکم بھی یہی تھا۔^②

① سورہ مدثر کی آیت ۱۱ اور من خلقت وحید اُکے تحت حضرات مفسرین نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔

② سورہ مدثر ۷۳ آیت ۲

آپ نے کھانے کا انتظام کیا اور ان رشتہ داروں کو دعوت دی جو آپ کے پردادا (دوسری پشت کے دادا) ہاشم کی اولاد تھے۔ ان میں وہ بھی تھا جس کا نام عبدالعزیٰ تھا۔ اور ابو لہب کی کنیت سے مشہور تھا^①۔ یہ آنحضرت ﷺ کے والد ماجد کا سب سے بڑا بھائی تھا۔ عمر، سرمایہ اور دولت کے لحاظ سے خاندان میں سب سے اونچا تھا۔ عبدالعزیٰ سمیت تقریباً چالیس آدمی اس دعوت میں آئے۔ کھانا کھایا، پھر آنحضرت ﷺ نے کچھ فرمانا شروع کیا ابھی آپ نے بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ عبدالعزیٰ نے پکار کر کہا:

لہدما سحرکم صاحبکم^② (یہ جادو بہت ہی عجیب ہے جو تمہارے دوست نے تم پر کیا ہے) جادو کا نام سن کر کون ٹھہر سکتا تھا۔ مجمع منتشر ہو گیا۔

ابو لہب کی یہ حرکت بہت ہی ہمت شکن تھی۔ مگر اس کے مقابلہ پر تھی جس کی ہمت نے ٹوٹنا نہیں سیکھا تھا۔ وہ نئے حوصلہ سے اٹھا۔ کچھ وقفہ کے بعد دوبارہ دعوت کی اور اس مرتبہ حلقہ وسیع کر دیا۔ پہلے ہاشم کی اولاد کو دعوت دی تھی اس مرتبہ ہاشم کے والد عبد مناف کی اولاد کو دعوت دی۔ اور ابو لہب کی پہلی حرکت کا رد عمل یہ ہوا کہ سب ہی آگئے اور آخر تک جے رہے۔ آپ نے بھی اپنی بات پوری فرمادی۔ آپ نے فرمایا:

”میں وہ پیغام پہنچا رہا ہوں کہ عرب کے کسی جو اس ہمت نے یہ پیغام نہیں پہنچایا تھا۔ یہ دنیا اور آخرت کی کامیابی کا پیغام ہے۔ امتہ عرب اس پیغام سے دنیا میں بھی سر بلند ہوگی اور آخرت کی کامیابیاں بھی اس کو نصیب ہو گئی^③۔ یہ پیغام عمل کا پیغام ہے انسان کا عمل ہی اس کو کامیاب کر سکتا ہے۔ ایک کا عمل دوسرے کو کامیاب نہیں کر سکتا۔

اے معشر قریش! اپنے آپ کو جس درجہ پر رکھنا چاہتے ہو تو اس کی قیمت خود ادا کرو۔ عذاب الہی سے بچنا چاہتے ہو تو نجات کا سودا تم خود کرو۔

اے آل عبد مناف! خدا کے مقابلہ میں تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا جب تک تم خود عمل نہ کرو۔ میں تمہیں قانون قدرت کی گرفت سے نجات نہیں دلا سکتا۔

اے عباس^④ بن عبد المطلب! خدا کے مقابلہ پر میں تمہارے کام نہیں آسکتا۔ اے رسول خدا کی پھوپھی ”صفیہ!“ میں اللہ کی گرفت سے تمہیں بچا سکتا۔ اے رسول کی بیٹی فاطمہ!

① سورہ شعر ۲۶ آیت ۲۱۴ لہب کے معنی آگ کی لپٹ کے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کا رنگ سفید سرخ تھا، چہرہ انگارے کی طرح دکھتا رہتا تھا اسی لئے یہ کنیت دی گئی۔ گویا وہ آگ کے انگارے اور لپٹ کی تصویر ہے۔

② البدایہ والنہایہ ص ۳۹ ج ۳ مجمع البحار لفظ حد

③ ایضاً ص ۳۹ ج ۳

④ عباس اگرچہ چچا تھے مگر ہم عموں اور ہم جویں تھے۔ تقریباً دو سال بڑے تھے

میرے مال میں سے جو کچھ مانگنا چاہو مانگو میں دوں گا مگر خدا سے بے نیاز ہو کر میں تمہارے کچھ کام نہیں آسکتا۔ اللہ کے مقابلہ پر میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔^①

تقریر بے حد موثر اور بلوغ تھی۔ سننے والوں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا مگر دلوں کا پرانا مرض آسانی سے نکلنے والا نہیں تھا۔ یہاں بھی عبدالعزیٰ ابو لہب نے اپنی عمر کی بڑائی اور رشتہ کی برتری سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔

عجب بات یہ تھی کہ اس مجمع میں سب سے زیادہ سن رسیدہ ابو لہب تھا اور سب سے چھوٹے حضرت علی رضی اللہ عنہ جن کی عمر تقریباً بارہ سال تھی۔ بیمار اور کمزور بھی تھے۔ پیٹ بڑھا ہوا، آنکھیں آتی ہوئیں۔ پنڈلیاں پتلی پتلی۔ کھڑا ہونا مشکل تھا۔

آنحضرت ﷺ نے تقریر کے بعد مجمع کی طرف سے جواب کا انتظار کیا تو صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ (طفل پیار) نے آپ کی تصدیق کی اور حمایت کا وعدہ کیا۔ آپ نے ان کی حوصلہ افزائی کے الفاظ کہے۔ ابو لہب کو موقع مل گیا۔ اس نے طنز کرتے ہوئے تہقک لگایا۔ مجمع کا رخ بدل گیا۔ پھر منتشر ہو گیا۔^②

صفا کی اسٹیج سے اعلان حق

مکہ کی ایک پہاڑی کا نام ”صفا“ ہے اس پہاڑی کا وجود اب بھی باقی ہے۔ کعبہ شریف سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلہ پر ہے۔ اب یہ پہاڑی شہر مکہ کی سطح کے برابر ہو گئی ہے مگر اس زمانہ میں یہ بلند تھی۔ خانہ کعبہ کا حرم^③ (میدان) اس کے دامن میں تھا۔ عام طور پر قریش کی یہاں نشست رہتی تھی۔ محمد رسول اللہ ﷺ اس پہاڑی پر چڑھے اور قبائل قریش کو نام بنا پکارا۔ یا بنی فہر۔ یا بنی عدی وغیرہ وغیرہ۔

محمد۔ وہی محمد جن کا اثر و احترام یہ تھا اور قریش کے عوام و خواص اس درجہ گردیدہ تھے کہ آپ کو الصادق اور الامین کہہ کر خوش ہوا کرتے تھے۔ انہیں الصادق اور الامین کی آواز کانوں میں پڑی تو لوگ پہاڑی کے دامن میں آکر جمع ہو گئے اور جو نہیں آسکتے تھے انہوں نے اپنا کوئی آدمی بھیج دیا۔

سب پہنچ گئے تو آپ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

① بخاری شریف ص ۷۰۲

② البدایہ والنہایہ ص ۳۴۰ ج ۳

③ چار دیواری اس زمانہ میں نہیں تھی۔ بیچ میں خانہ کعبہ تھا۔ اس کے چاروں طرف میدان تھا۔ میدان کے کنارے پر روضہ مکہ او خدا مان کعبہ کے مکانات تھے۔ میدان میں ان روضہ کی نقشیں رہتی تھیں۔

اگر میں یہ بتاؤں کہ یہ وادی جو اس پہاڑ کی آڑ میں ہے یہاں دشمن کی فوج پہنچ گئی ہے اور وہ عنقریب تم پر حملہ کرنے والی ہے تو کیا آپ صاحبان میری بات سچ مانیں گے۔

سب نے جواب دیا: بیشک آپ کے متعلق ہمارا تجربہ یہی ہے کہ آپ سچ ہی بولتے ہیں^۱ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

عذاب خداوندی کا لشکر آنے والا ہے اس سے پہلے کہ عذاب کا یہ لشکر آئے میں تمہیں آگاہ کر رہا ہوں۔

آپ نے اسی موضوع پر تقریر فرمائی۔ بہت ممکن تھا لوگ اثر لیتے مگر خاندان ہاشم کا (وہی عمر رسیدہ عبدالعزیٰ ابولہب) بھڑکتا ہوا اٹھا اور یہ کہتا ہوا چل دیا:

”محمد! تیرے ہاتھ تو ٹھیں کیا اس لئے ہمیں یہاں جمع کیا ہے۔“^۲

خاندان کا بڑا پورے خاندان کا سرپرست اور مربی مانا جاتا ہے اور قاعدہ عرب کے مطابق وہ ولی یعنی جواب دہ اور ذمہ دار بھی ہوا کرتا تھا۔ چوٹوں کے حق میں اس کی بات مانی جاتی تھی۔ ابولہب کو یہ ولایت اور سرپرستی حاصل تھی کیونکہ وہ آنحضرت ﷺ کے والد ماجد کا بڑا بھائی تھا۔ اس کے علاوہ مکہ کا بااثر دولت مند تھا۔ مجمع نے جب اتنے بڑے آدمی کو خفا ہو کر جاتے ہوئے (واک آؤٹ کرتے ہوئے) دیکھا تو مجمع بھی چل دیا۔ لیکن ذہنوں میں ایک سوال گھر کر چکا تھا (داعی حق کی یہی کامیابی تھی)۔

اتنا اشتعال (بوکھلاہٹ) کیوں؟

کوہ صفا سے جس نے پکارا وہ وہی محمد تھا جس کا نام لینا لوگ بے ادبی سمجھتے تھے۔ جس کو ”الصادق“ اور ”الامین“ کہا کرتے تھے۔ جس سے دعائیں کرایا کرتے تھے۔ برکتیں حاصل کیا کرتے تھے۔ جس نے کچھ عرصہ پہلے اس خوفناک ہنگامہ کو نہایت خوبصورتی سے ختم کیا تھا جو تعمیر کعبہ کے وقت حجر اسود کے سلسلہ میں سر اٹھا چکا تھا۔

کوہ صفا کی مختصر تقریر میں جن خرابیوں کی طرف آنحضرت ﷺ نے اشارہ کیا ان کا احساس خود قریش کو بھی تھا۔ انہی کمزوریوں اور خرابیوں کی اصلاح کے لئے چند سال پہلے وہ انجمن بنائی تھی اور وہ عہد نامہ طے کیا تھا جو حلف الفضول کے نام سے مشہور تھا۔

یہ ابولہب جو اس وقت سب سے پہلے مشتعل ہوا آنحضرت ﷺ کا وہی عم بزرگ ہے جو

آنحضرت ﷺ کی ولادت پر اتنا خوش ہوا تھا کہ اپنی باندی ثویبہ کو فوراً آزاد کر دیا۔ اسی ثویبہ نے سب سے پہلے اس نو نہال محمد ﷺ کو دودھ پلایا تھا۔

پھر یہ خنک اور اتنی بوکھلاہٹ کیوں؟

اس کا سبب وہ انقلاب تھا جس کی تصویر اس مختصر جماعت کے آئینہ کردار میں ان کو نظر آرہی تھی جو اس چند سال کے عرصہ میں (جو تربیت کیلئے مخصوص تھا) محمد ﷺ کے دامن میں تربیت پاکر تاریخ عالم کے پلیٹ فارم پر جلوہ گر ہو چکی تھی، جو ایک طرف شرک والحاد کے مقابلہ میں توحید۔ فسق و فجور کے مقابلہ میں مکارم اخلاق۔ حیوانیت اور بہیست کے مقابلہ میں انسانیت اور شرافت کی علبردار تھی، تو دوسری جانب راتوں کو اٹھ اٹھ کر کلام الہی کی وہ آیتیں بھی گنگنایا کرتی تھی جو مفاد پرست، دولت و ثروت اور ظالمانہ سرمایہ داری کے خلاف گرج رہی تھیں۔ جس کا کردار یہ تھا کہ اپنی دولت کو راہ خدا میں لٹا کر ان آیتوں کے مفہوم و مقصود کا وہ نقشہ پیش کر رہی تھی، جو ان دولت پرستوں کے لئے بہت ہی وحشتناک تھا۔ جھنجھلاہٹ اور اشتعال کا باعث یہ بھی تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو سمجھانے کی جتنی کوششیں کیں وہ ناکام ہو چکی تھیں۔

ابولہب جیسا سرمایہ پرست جو خزانہ کعبہ کے غزالہ زریں پر بھی ہاتھ مار دے، عاص بن وائل جیسا ذخیرہ اندوز جو مزدوری بر سوں تک ٹلاتا رہے۔ ولید بن مغیرہ جیسا حریص جو سب سے بڑا دولت مند ہونے پر بھی صبر نہ کرے، اور اس کی طمع اور لالچ کا جہنم ”هَلْ مِنْ مَّيِّدٍ“ (ق-۳۰) پکارا رہے۔ عتبہ بن ربیعہ اور مسعود ثقفی جیسے جاگیر دار جن کی زندگی کا نصب العین ہی جاگیر داری اور زراعت و زنی ہو۔ ابو جہل اور عقبہ بن ابی معیط جیسے باغی اور طاغی بڑے بڑے کاروبار کے مالک جو مکہ اور مکہ سے گزر کر پورے عرب پر چھائے ہوئے ہوں سورہ حمزہ میں انہی جیسوں کے لئے فرمایا گیا ہے:

”جہنم کی ہلاکت اور بربادی ہر ایسے شخص کے لئے جو دوسروں کے عیب نکالے اور ان کو نظر حقارت سے دیکھتے ہوئے طعنے دے۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے مال بٹور رکھا ہے اور اس کو بار بار گنتا رہتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا (اس کی سرمایہ داری پائیدار ہوگی)۔ ہر گز نہیں، بلاشبہ ایسا ہو گا کہ اس کو حطمہ میں ڈال دیا جائے گا۔ تم جانتے ہو حطمہ کیا ہے۔ وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں کو جھانک^۱ لیتی ہے۔ بلند اور دراز ستونوں کی طرح اس آگ کے شعلے ہو گئے ان لوگوں کو ان آتشیں ستونوں میں گھیر کر بند کر دیا جائے گا۔ (سورہ حمزہ)

سورہ حمزہ کو بار بار پڑھئے آپ کو سرمایہ داروں کے اس غیر معمولی اشتعال کا سبب معلوم

^۱ ایمان ہو تو نہیں جلاتی کفر ہو تو جلا ڈالتی ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحب

^۲ ماجربناعلک الاصدقا بخاری شریف ص ۷۰۲

^۳ بخاری شریف ص ۷۰۳

ہو جائے گا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ابتدائی دور میں اسلام سے مشرف ہو گئے تھے۔ آپ کی مشہور روایت ہے^۱ کہ آنحضرت ﷺ دیوار کعبہ کے سایہ میں تشریف فرما تھے۔ میں سامنے پہنچا تو آپ فرما رہے تھے ”ہم الاخسرون و رب الکعبة یوم القیامة“ رب کعبہ کی قسم قیامت کے روز یہی لوگ خسارہ میں ہوں گے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے یہ الفاظ سنے تو میں چونک گیا۔ مجھے خیال ہوا کہیں میرے بارے میں بھی کوئی آیت نازل ہوئی ہے؟ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ آپ پر میرے ماں باپ قربان۔ یہ بد نصیب کون ہیں؟ فرمایا: جو سب سے زیادہ دولت مند ہیں۔ صرف وہ مستثنیٰ ہیں جو آگے پیچھے دائیں بائیں سب طرف خرچ کرتے رہیں۔

تعلیمات کا دوسرا رخ

پڑھنا، لکھنا، تہذیب، تمدن

۱۔ تخلیق نواز اور انقلاب انگیز تعلیمات کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ مشہور مثل ”کلام الملوک ملوک الکلام“ کی وجد آفرین مثال بھی آپ کے سامنے آجائے گی۔ وحی کا آغاز لفظ ”اقْرَأْ“ سے ہوا۔ اور اس اہمیت کے ساتھ کہ نام رب بھی بعد میں لایا گیا۔ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ ”پڑھ اپنے رب کے نام سے“ پھر پروردگار (رب) کی تین صفیتیں بیان کی گئیں خَلَقَ، الْأَكْثَرُ، عَلَّمَ زیادہ زور عَلَّمَ پر دیا گیا (عَلَّمَ بِالْقَلَمِ) عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ تعلیم دی قلم کے ذریعہ۔ سکھایا انسان کو وہ جو نہیں جانتا تھا۔

کیا اس اسلوب کلام سے ہمیں یہ سبق^۲ نہیں ملتا کہ جو شخص اس وحی پر ایمان لائے اس کا

^۱ ترمذی شریف ص ۷۸ ج ۱۰، مسلم شریف ص ۳۲۰ ج ۱۰ وغیرہما

^۲ جس طرح یہ سبق ملتا ہے کہ معلم حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ انسان کو وہ باتیں سکھاتا ہے جو وہ نہیں جانتا۔ وہ جس طرح قلم کے ذریعہ سکھاتا ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ اسی شخص محمد ﷺ کو بلا کسی واسطہ کے علم الدین والآخرین سے نواز دے۔ علق (خون بست) یعنی بھوک پیچکی اس کو علم سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ خون کی پیچکی کے لئے علم کا تصور بھی بے محل ہے۔ لیکن خدا قادر پروردگار عالم اس علق سے انسان کو پیدا کرتا ہے اور علم بے پایاں کی دولت سے نوازتا ہے۔ وہی رب ذوالجلال محمد ﷺ جیسے امی کو جو ہر علم سے آراستہ کر رہا ہے۔ بلاشبہ کسی امی کو نہیں کہا جاسکتا کہ پڑھ۔ پڑھنے کا حکم امی کے حق میں تکلیف مالا بلاق ہے۔ مگر رب محمد کا حکم محمد کے لئے تکلیف مالا بلاق نہیں ہے کیونکہ جو حکم کر رہا ہے وہ پہلے ہی محمد ﷺ کو وہ ہر عطا کر چکا ہے جس نے محمد ﷺ کو خطاب اقرأ کا اہل اور محل بنادیا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

پہلا فرض قرأت اور تعلیم ہے^۱۔ اور تعلیم بھی وہ نہیں جو ماں باپ بچوں کو زبانی دے دیتے ہیں بلکہ تعلیم ایسی جس میں پڑھنا بھی ہو اور قلم سے لکھنا بھی۔

۲۔ کچھ توقف کے بعد دوبارہ سلسلہ وحی شروع ہوا تو اس کا پہلا لفظ تھا يٰاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ (اے لحاف میں لپٹنے والے)

اس المدثر کو چھ کاموں کی ہدایت کی گئی۔ (۱) دعوت و تبلیغ قُمْ فَأَنْذِرْ (۲) تعظیم رب (عبادت) وَ رَبِّكَ فَكْبِّرْ (۳) ظاہر کی پاکی اور صفائی وَ تَبَيَّنْكَ فَطَهِّرْ (۴) باطن کی پاکی و صفائی وَ الزَّجُّرُ فَاهْجُرْ (۵) بے لوث خدمت لَا تَتَّبِعْ تَتَّبِعْكَ (۶) رضا مولیٰ کو نصب العین بنا کر اس پر جرم جانا۔ صبر و استقامت سے کام لینا۔ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (المدثر ۷۔۸)

لفظ المدثر^۲ سے خطاب اور اس کے بعد یہ احکام کیا ان کا اشارہ یہ نہیں ہے کہ خدا پرستی اور تلاش حق، ہمدوش تہذیب و تمدن ہونی چاہئے۔

^۱ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے کے لئے یہ موضوع بہت دلچسپ ہے کہ وہ تحقیق کرے کہ اس وقت تعلیم کے بارے میں اقوام عالم کی حالت کیا تھی اور ان کا ذوق تعلیم کہاں تک سرد پڑ چکا تھا۔ مغربی یورپ، انگلینڈ، جرمنی وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ وہاں تو انسان ابھی پہاڑ کی گھاٹی اور پھولس کی جھونپڑی سے بھی نہیں نکلا تھا۔ رات کو ایک ہی جھونپڑی میں اپنے مویشی کے ساتھ بند ہوتا تھا۔ مشرقی یورپ جہاں ”رومن“ کا اقبال چمک رہا تھا وہاں بھی علم اور تعلیم کی کچھ دولت تھی تو صرف کلیسا کے تاریک کناروں میں بچھی ہوئی۔ کلیسا سے باہر یا دولت علم سے آشنائی نہ تھی یا تعلیم ان کے لئے ممنوع تھی اور کلیسا کے علماء بھی صرف نفع اندوزی کی حد تک علم کے قدر دان تھے۔ اگر نفع کسی کتاب کی فروخت سے ہوتا یا چمڑے پر لکھی ہوئی کتاب کے حروف مناکر چمڑہ فروخت کر دینے میں نفع ہوتا تو وہ اس سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ (موسیٰ لیان)

ہندوستان کا حال معلوم ہے کہ یہاں صرف براہمہ ہند علم کے مالک سمجھے جاتے تھے اور غیر برہمن میں سے آدمی سے زیادہ مخلوق شہور تھی، وہ علم حاصل تو کیا کر سکتی اگر علم کی بھوک بھی کان میں پڑ جاتی تو کان میں سیسہ پگھلا دیا جاتا۔ (منو سرتی)

ایران اور فارس میں عیش پرستی علم پر غالب تھی اور چین و افریقہ کا ماضی ان کے موجودہ حال سے معلوم ہو رہا ہے۔ امریکہ و کناڈا، آسٹریلیا، رلیغ مسکون سے خارج تھا تو انسانی دنیا سے بھی خارج تھا۔

^۲ المدثر و ثار سے ماخوذ ہے۔ و ثار کا ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نے لاف فرمایا ہے کیونکہ و ثار اس کپڑے کو بھی کہا جاتا ہے جس سے گرمائی حاصل کی جائے (جمع البجار)۔ لیکن عرف میں و ثار اس کپڑے کو کہتے ہیں جو اس کپڑے کے اوپر پہنا جائے جو بدن سے متصل رہتا ہے۔ جو کپڑا بدن سے لگا رہتا ہے اس کو شاعر کہتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے حضرات انصار کے متعلق فرمایا تھا ”انتم شعراء والناس دثار“ یعنی تم میرا وہ لباس ہو کہ اگر تم الگ ہو جاؤ تو بدن ننگا ہو جائے اور دوسرے لوگ اوپر کا آرا کٹی کٹی کپڑا پہنیں۔ وہ اگر الگ ہو جائیں تو بدن برہنہ نہیں ہو گا۔ مختصر یہ کہ دثار میں صرف ستر پوشی نہیں ہوتی بلکہ اس سے ایسی آرائش ہوتی ہے جو تہذیب کے تقاضے کو پورا کرے جیسے ہندوستان میں شیر دانی یا انچن اور عرب کے پرانے قاعدہ کے مطابق چادر اور دور حاضر میں عبا۔ پس لفظ المدثر اور اس کے بعد کے الفاظ تَبَيَّنْكَ فَطَهِّرْ یہ تصور پیدا کر رہے ہیں کہ داعی الی اللہ کو پورے لباس سے آراستہ ہونا چاہئے اور لباس بھی ایسا ہو جو پاک صاف ہو۔ یعنی اسلام جب رہبانیت یا سادہ صوفیہ کے پسند نہیں کرتا تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ

دلیل صداقت •

آنحضرت ﷺ کی صداقت کی بہت سی دلیلیں پیش کی گئی ہیں۔ مستقل کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ احادیث اور تاریخی روایات کے علاوہ خود قرآن حکیم نے بہت سی دلیلوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہاں صرف دو دلیلیں پیش کی جا رہی ہیں۔ ہر ایک انصاف پسند کے لئے یہ دو دلیلیں کافی ہیں۔

پہلی دلیل:

خود آپ کی زندگی (صلوات اللہ علیہ وسلم ابد ادا نما) آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سامنے بھی آپ کی سابقہ زندگی تھی۔ اسی زندگی کے معیار پر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے غار حرا کے واقعہ کو پرکھا اور غیر اختیاری طور پر آپ کی نبوت کی معترف ہو گئیں۔ اور جب آپ نے پوری قوم کے سامنے دعوت پیش کی تو وہی خداوندی نے ہدایت کی کہ آپ اپنی قوم سے یہ کہیں کہ یہ دعوت تو میں آپ کو پیش کر رہا ہوں۔ لیکن

”واقعہ یہ ہے کہ میں اس سے پہلے تم لوگوں کے بیچ میں اپنی پوری عمر بسر کر چکا ہوں۔

کیا تم سمجھ بوجھ سے کام نہیں لیتے“۔ (سورہ یونس ۱۰۱ آیت ۱۶)

تشریح: وحی الہی کی تلقین یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ اپنی صداقت کے ثبوت کے لئے لوگوں سے کہیں کہ ساری باتیں چھوڑ دو۔ صرف اسی بات پر غور کرو کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی ہوں، جس کے حالات و کردار کی تمہیں خبر نہ ہو۔ میں تم ہی میں سے ہوں اور اعلان وحی سے پہلے ایک پوری عمر تم میں بسر کر چکا ہوں۔ اس تمام مدت میں میری زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے رہی۔ بتلاؤ اس تمام عرصہ میں کوئی ایک بات بھی سچائی اور امانت کے خلاف مجھ میں دیکھی۔ تم نے نہ صرف صادق

اس کا داعی برہنہ یا صرف ستر پوش (لنگوٹی کسے والا) نیم برہنہ ہو۔ برہنگی یا نیم برہنگی دونوں حرام ہیں۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ پورا لباس اسی وقت ہو سکتا ہے جب تمدن اس حد تک پہنچا ہو کہ کپڑا تیار ہو سکتے وہ سل سکے وغیرہ وغیرہ۔ پس اس بات سے انکار کرنے کی گنجائش نہیں ہے کہ کلام اللہ شریف کے اس اسلوب خصوصاً ان الفاظ سے جیسے تہذیب و تمدن کی قدر افزائی ہوئی ہے ایسے ہی صنعت و حرفت، تہذیب و تجارت وغیرہ ان تمام عوامل کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ جو کسی انسان کے ”المدثر“ حلف پوش، یا مہذب لباس پوش ہونے کے لئے ضروری ہوں۔ اور جب ستر پوشی فرض ہے تو لباس و پوشاک کا تیار کرنا اور اس کی تیاری کے جملہ ذرائع مہیا کرنا بھی مسلمانوں کے حق میں اجتماعی فریضہ ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سیرۃ فی عام کتابوں میں یہ عنوان نہیں ہوتا مگر کتاب اللہ نے آغاز قرآن میں جب نوع انسان کو عبادت کا حکم دیا تو ساتھ ساتھ صداقت کتاب اللہ کی دلیل بھی ایسی پیش کی جس کے ساتھ رسول خدا کی صداقت بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے سورہ بقرہ، رکوع ۳

اور امین کہا بلکہ صادق اور امین میرا لقب کر دیا۔ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کسی انسانی معاملہ میں جھوٹ بولوں، تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب خدا پر بہتان باندھنے کے لئے تیار ہو جاؤ اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں کہ مجھ پر اس کا کلام نازل ہوتا ہے؟ کیا اتنی سی موٹی بات بھی تم سمجھ نہیں سکتے؟

دوسری دلیل خود قرآن شریف (کلام اللہ)

سچے آدمی کی سچائی کی سب سے بڑی دلیل خود اس کی زندگی ہے اور اپنی زندگی کو دلیل صداقت کے طور پر وہی پیش کرتا ہے جو فی الواقع سچا ہو اور اپنی سچائی پر اس کو پورا یقین ہو، جس کے عمل نے کبھی ضمیر سے بغاوت نہ کی ہو، اور جس کا ضمیر اپنے کردار عمل سے ہمیشہ مطمئن رہا ہو۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب، لیکن آفتاب دلیل انہیں کے لئے بن سکتا ہے جو آفتاب کو دیکھ رہے ہیں۔ جنہوں نے آفتاب نہیں دیکھا انہیں تو کسی اور ہی شاہد کی ضرورت ہوگی۔ قرآن حکیم (کلام اللہ) کہتا ہے: وہ شاہد میں ہوں۔ خود اپنی صداقت کی بھی دلیل ہوں اور صداقت محمد ﷺ کی دلیل بھی میں ہی ہوں۔

وہ عرب جن کو مطمئن کر کے تمام دنیا کے لئے داعی بنانا تھا۔ کلام الہی کا خطاب ان سے ہے۔ ”تم اہل لسان ہو، اپنی زبان کے عاشق ہو، ایسے عاشق کہ شعر و سخن ہر ایک کی گھٹی میں پڑا ہے۔ شعر و سخن کی یہی گرم بازاری ہے کہ قومی میلوں اور تہواروں کے موقع پر خصوصاً زمانہ حج میں جب عرب کے چنیدہ دماغ مٹی میں جمع ہوتے ہیں تو کئی کئی روز تک مشاعروں کی محفلیں گرم رکھتے ہو۔ ان میں بڑی شان سے مقابلہ کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ پھر جو قصیدے سب سے اونچے مانے جاتے ہیں ان کی یہاں تک قدر کرتے ہو کہ خانہ کعبہ میں جہاں تمہارے بہت سے معبود رہتے

تمام علماء اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس سال کا زمانہ اس کے اخلاق اور خصال کے ابھرنے اور پختہ ہونے کا اصل زمانہ ہوتا ہے۔ پس اگر ایک شخص چالیس برس تک صادق و امین رہا ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ آگے چل کر اس میں قدم رکتے ہی ایسا کذاب اور مفتری بن جائے کہ انسانوں پر ہی نہیں بلکہ اس خدا پر بہتان باندھنے لگے جس کو وہ اپنا خالق و مالک جانتا ہے۔ جس کی عظمت کا معترف ہے جس کے قہر و غضب سے وہ خود بھی ڈرتا ہے اور لوگوں کو بھی ڈراتا ہے جس کی عبادت میں شب و روز مشغول رہتا ہے جس کا ذکر ہر وقت اس کی زبان پر رہتا ہے اور ہر وقت وہ اپنی کوتاہیوں کی معافی اسی رب سے مانگتا رہتا ہے جیسا کہ احادیث میں ہے کہ ایک ایک مجلس میں ستر ستر بار الفاظ استغفار زبان مبارک پر آجاتے تھے پھر یہی خدا پرستی اور خدا ترسی کی لگن ہے، جس کی وجہ سے اس کی قوم اس سے ناراض ہو رہی ہے اور وہ قوم کی نگاہوں میں معتبور ہو رہا ہے۔ کیا یہ شخص جھوٹا ہو سکتا ہے؟

جب کہ کلام بھی ایسا ہو کہ اس کا کوئی فقرہ بھی خدا کے ذکر سے خالی نہ ہو۔ کہیں اس کے قہر و غضب کا ذکر ہو، کہیں لطف و کرم کا، کہیں اس کے ہمہ گیر علم کو بیان کر کے بتایا گیا ہو کہ انسان جو بھی کرتا ہے اللہ اس کو دیکھ رہا ہے، سن رہا ہے۔ انسان کو اپنے ہر فعل اور ہر ایک قول کا جواب دینا ہو گا۔ وغیرہ وغیرہ

ہیں اس قصیدہ کو بھی ایک معبود بنا کر آویزاں کرتے ہو اور تمہارے ذوق و شوق کا عالم یہ ہوتا ہے کہ ان کے سامنے ماتھار گرتے ہو، ان کو سجدہ کرتے ہو اور صرف قصیدے ہی کو نہیں بلکہ شاعر کو بھی غیر معمولی طاقت کا انسان سمجھنے لگتے ہو کہ اس کے ساتھ جن رہتا ہے۔ جو ایسا غیر معمولی شعر اس کو سکھا دیتا ہے۔ اب دیکھو ”محمد“ ﷺ بھی تمہارے سامنے ہیں، جنہوں نے کبھی کسی استاد کے سامنے زانو تلمذ طے نہیں کیا۔ کبھی کسی کی شاگردی نہیں کی۔ کبھی کسی مکتب سے نہیں پڑھا، کبھی کوئی شعر نہیں کہا، کبھی شعر و سخن کی مجلس میں شرکت نہیں کی۔ تم نے اس کو صادق اور امین تو کہا مگر نہ کبھی شاعر کہانہ کبھی خطباء اور مقررین میں ان کو شمار کیا۔ اس محمد ﷺ کی زبان سے ایک کلام تمہارے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ محمد کہتے ہیں کہ یہ کلام میرا نہیں خدا کا کلام ہے جو میرے اوپر نازل ہوتا ہے جیسا نازل ہوتا ہے بجنہ اور یعنہ آپ کو سنا دیتا ہوں۔ پس

”اگر تمہیں اس کلام کی سچائی میں شک ہے جو ہم نے (اللہ تعالیٰ) اپنے بندے محمد ﷺ پر نازل کیا ہے تو اس کا فیصلہ بہت آسان ہے۔ اگر یہ محض انسانی دماغ کی بناوٹ ہے تو تم بھی انسان ہو۔ زیادہ نہیں۔ اس جیسی صرف ایک ہی سورت بنالائے۔ (اگر تمہارا عقیدہ ہے کہ جنات شعراء کے مددگار ہوا کرتے ہیں تو تم ایسا کرو کہ) اللہ کے سوا جن (طاقتوں) کو تم نے اپنا حمایتی سمجھ رکھا ہے، ان سب کو بھی اپنی مدد کے لئے بلاؤ۔ اگر تم سچے ہو تو ایسا ضرور کر لو۔ اور اگر تم ایسا نہ کر سکو اور حقیقت یہ ہے کہ ایسا ہرگز نہ کر سکو گے تو اس آگ کے عذاب سے ڈرو جو (لکڑی کی جگہ) انسان اور پتھر کے ایندھن سے سلگتی ہے اور مکمرین حق کے لئے تیار کی جا چکی ہے۔“ (سورہ بقرہ ۲۳ آیات ۲۳)

کلام اللہ کی شوکت و قوت اور اپنی صداقت کا یقین حیرت انگیز ہے۔ ایک شخص جس کے ساتھ صرف چند افراد ہیں، جن کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ وہ نہ صرف قریش کو نہ صرف اہل مکہ کو بلکہ ہر ایک عربی بولنے والے بلکہ پوری دنیا میں جو بھی شک و شبہ کرے خواہ وہ کوئی ہو، ان سب کو چیلنج کر رہا ہے۔ چیلنج معمولی نہیں ہے، ایسا سخت اور تلخ چیلنج جو معمولی سے معمولی انسان کی غیرت کو بھی اس درجہ مشتعل کر دے کہ وہ اپنے تمام ذرائع اور وسائل کو کام میں لا کر چیلنج کا جواب دینے کیلئے بولکھا جائے۔ مضمون دوبارہ ملاحظہ فرمائیے:

”اگر تم اس چیلنج کو قبول نہیں کر سکتے اور اس جیسی کوئی ایک سورت نہیں لاسکتے تو یقین کر لو کہ تم باطل پر ہو۔ تم حق کا مقابلہ کر رہے ہو۔ تم عذاب الہی کے مستحق ہو تمہارا ٹھکانا دوزخ ہوگا، جس کا ایندھن تم جیسے انسان اور پتھر ہو گئے“ (بقرہ ۲۳، ۲۴)

قرآن حکیم کی ایک سورت ۱۰۸ سورہ کوثر بھی ہے جس میں صرف تین آیتیں (جملے) ہیں جن کے کل الفاظ (کلمات) اٹھارہ ہیں۔

چیلنج کا خلاصہ یہ ہے کہ حق و باطل اور سچائی اور بناوٹ کا فیصلہ اس پر ہے کہ تم صرف ایسا کلام پیش کر دو جو ۱۸ لفظوں پر مشتمل ہو۔ مگر وہ اپنے ظاہری اور معنوی کمالات میں اس جیسا ہو۔ تمام دنیا کے ادیبوں کی مجلسیں اور شعر و سخن کے کمالات کا فیصلہ کرنے والے جج موجود ہیں۔ کسی بھی عدالت، کسی بھی ادبی مجلس میں موازنہ کے لئے پیش کر دو۔ اگر تمہارے حق میں فیصلہ ہو جائے تو مان لیا جائے گا کہ یہ کلام، اللہ کا کلام نہیں ہے محمد کی من گھڑت ہے (معاذ اللہ)۔

پھر یہ چیلنج صرف ایک مرتبہ اتفاقی طور پر نہیں بلکہ مختلف عنوانوں سے بار بار دہرایا گیا اور اسی قوت کے ساتھ دہرایا گیا مثلاً:

(۱) سورہ ہود مکہ معظمہ میں نازل ہوئی۔ اس کی آیت ۱۳ جو اس سلسلہ کی سب سے پہلی آیت ہے اس کا ترجمہ یہ ہے۔

”کیا لوگ ایسا کہتے ہیں کہ محمد ﷺ نے یہ قرآن اپنے جی سے گھڑ کر خدا پر بہتان باندھا ہے۔ آپ کہہ دیجئے اگر تم اپنی اس بات میں سچے ہو تو اس طرح کی دس سورتیں گھڑی ہوئی بنا کر پیش کر دو اور اللہ کے سوا جس کسی کو اپنی مدد کے لئے پکار سکتے ہو اس کو پکار لو۔“

پھر دو آیتوں کے بعد آیت ۱۶ کا ترجمہ یہ ہے:

”یہ لوگ (جو صرف دنیاوی مفاد اور آسائش کے لئے حق سے اعراض کرتے ہیں اور اس کلام کو اللہ کا کلام نہیں مانتے) یہی وہ ہیں جن کے لئے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔“

(۲) سورہ ۱۰ یونس بھی مکہ میں نازل ہوئی۔ اس کی آیت ۳۸ میں بھی اس چیلنج کو دہرایا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:

”کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اللہ کے نام پر یہ بہتان باندھا ہے۔ تم کہہ دو اگر تم اس قول میں سچے ہو تو قرآن کی مانند ایک سورت بنا کر پیش کر دو۔ اور خدا کے سوا جن جن ہستیوں کو اپنی مدد کے لئے بلا سکتے ہو (تمہیں پوری اجازت ہے) بلاؤ“ (آیت ۳۸)

(۳) پہلے دس سورتوں کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس مرتبہ صرف ایک سورت کا۔ پھر سورہ ۵۲ طور میں ”سورہ“ کا لفظ بھی نہیں بلکہ حدیث (کلام، بات) کا لفظ آیا ہے:

فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِثْلِهِ ۚ اٰیٰتِ ۳۴ اس طرح کا کوئی کلام لے آئیں اگر سچے ہیں۔

(۴) سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۸ میں یہ اعلان کیا گیا:

”اگر تمام انسان اور جن اکٹھے ہو کر چاہیں کہ اس قرآن کے مانند کوئی کلام پیش کر دیں تو کبھی بھی پیش نہیں کر سکیں گے۔ اگر چہ ان میں سے ایک دوسرے کا

مددگار ہی کیوں نہ ہو۔“

(۵) یہ آیتیں وہ ہیں جن میں یہ چیلنج صراحت کے ساتھ کیا گیا:

”اس جیسا قرآن پیش کر دیں“ (۸۸ / ۱۷)

”دس سورتیں بنالائیں“ (۱۱ / ۱۳)

”ایک سورت بنا لائیں“ (۱۰ / ۳۸)

”ایک سورت بنا لائیں“ (۲ / ۲۳)

”اس طرح کا کوئی کلام لے آئیں“ (۵۲ / ۳۳)

ان آیتوں کے علاوہ اور بہت سی آیتیں ہیں جن میں بطور اشارہ و کنایہ اس چیلنج کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ اس چیلنج کے مخاطب عرب کے وہی فصحاء اور بلغاء ہیں جن کو اپنی ادبیت اور فصاحت و بلاغت پر ناز تھا، جو اپنے زمانہ میں بھی عربی ادب کے استاد مانے جاتے تھے اور آج بھی استاد مانے جاتے ہیں۔ کیا قرآن پاک اور قرآن پاک کے پیش کرنے والے محمد ﷺ کی صداقت کے لئے یہ آفتاب جیسی کھلی ہوئی دلیل کافی نہیں ہے کہ نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا جس میں اکثریت قرآن اور اسلام کے مخالفین کی ہے چودہ سو برسوں سے اس چیلنج کو سن رہی ہے۔ مگر اس کو منظور کرنے سے آج بیسویں صدی عیسوی میں بھی اسی طرح عاجز ہے جیسے ساتویں صدی عیسوی میں عاجز تھی جب یہ قرآن نازل ہو رہا تھا۔

قریش جو اس کے مخاطب اول تھے ان سے یہ نہ ہو سکا کہ ۱۸ الفاظ کا کوئی مرتب کلام اس چیلنج کے جواب میں پیش کر سکیں۔ اس کے سوا جو کچھ تدبیریں وہ کر سکتے تھے وہ سب کر لیں۔ مثلاً منصوبہ بند طریقے سے ممانعت کر دی کہ کوئی قرآن نہ سنے اور جب محمد ﷺ نے بازاروں، میلوں اور پبلک مقامات پر کھڑے ہو کر سنانا شروع کیا تو منصوبہ یہ تھا کہ اتنا شور مچایا جائے کہ محمد ﷺ کی آواز کسی کے کان میں نہ پڑ سکے۔^۱

اگر کوئی اجنبی شخص اس شور و غل پر اعتراض کرنے لگے تو کبھی کہہ دیا جائے معاذ اللہ مجنون ہو گیا ہے۔ کبھی یہ کہہ دیا جائے کہ یہ جادو گر ہے۔ یہ منتر پڑھتا ہے تو ماں بیٹے سے نفرت کرنے لگتی ہے۔ بیوی اپنے شوہر سے اور بھائی بھائی سے جدا ہو جاتا ہے۔^۲

یہ ابتدائی تدبیریں تھیں۔ پھر جو کچھ کیا گیا، اسلام لانے والوں کو طرح طرح ستایا گیا۔ پھر ان کا بائیکاٹ کیا گیا۔ ان کو ترک وطن پر مجبور کیا گیا اور جب وطن ترک کر چکے تو مدینہ پر بار بار حملے کر کے ان کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب کچھ کیا گیا مگر یہ نہ ہو سکا کہ قرآن حکیم

^۱ حم سجدہ آیت ۲۶

^۲ سورہ الذاریات آیت ۵۲، سورہ الطور آیت ۲۹ وغیرہ ذلک

کے چیلنج کا جواب دے دے اور ایک سورت اس کے مقابلہ میں پیش کر کے صداقت قرآن اور صداقت محمد کی تردید کر دیں۔

یہ صداقت کی دوسری دلیل تھی جو آنحضرت ﷺ نے پیش کی اور یہ دلیل جس طرح آنحضرت ﷺ کے ورود مسعود میں برحان قاطع اور حجتہ کاملہ تھی۔ آج چودہ سو برس کے بعد ایسی ہی درخشاں اور تاباں دلیل ہے جو پوری دنیا کو لگا رہی ہے

”قُلْ لِّیْنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ یَّاتُوْا بِسُورٍ مِّثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِسُورٍ مِّثْلِهٖ وَلَوْ کَانَ بَعْضُهُمْ

لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا“ (بنی اسرائیل-۸۸)^۱

ضمیر سے بغاوت کی یہ بدترین مثال تاریخ نے فراموش نہیں کی کہ قریش کے یہی سرغنہ ابو جہل، اخنس بن شریق اور ابوسفیان جو دوسروں کو قرآن شریف سننے سے منع کرتے تھے راتوں کو چھپ چھپ کر خود قرآن شریف سنا کرتے تھے۔ رات کے آخری حصہ میں جب رسول خدا ﷺ بھینی بھینی آواز سے قرآن شریف پڑھتے تھے تو قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت صدائے سوز میں عجیب کیفیت پیدا کر دیتی تھی۔ جو ایک دفعہ سن لیتا وہ بار بار سننے کے لئے بے چین رہتا۔ ان سرداروں کو کسی طرح سننے کا اتفاق ہو گیا تو پھر جب موقع ملا غلوت کدہ کے آستانہ مبارک پر پہنچ جاتے اور کان لگائے سنتے رہتے۔ کبھی آپس میں مڈ بھیر بھی ہو جاتی تو ہر ایک دوسرے کو ملامت کرتا۔ مگر یہ ایک ایسا جرم تھا جس سے باز رہنا مشکل تھا۔ البتہ نوجوانوں کو منع کرتے ہیں۔ سب کا اتفاق تھا کہ اگر وہ گرویدہ ہو گئے تو ہماری طرح اپنے ضمیر سے بغاوت نہیں کر سکیں گے۔^۲

محمد ﷺ کی حیثیت

فرائض اور خصوصیات

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے ”محمد“ ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَهِيدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِآذِنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا

(سورہ احزاب-۳۵، ۳۶)

اے نبی ہم نے تم کو بھیجا ہے اس شان سے کہ آپ

^۱ اگر تمام انسان اور سارے جن اس پر متفق ہو جائیں کہ اس قرآن جیسا قرآن پیش کر دیں تو وہ اس جیسا قرآن پیش نہیں کر سکیں گے۔ خواہ وہ اس میں ایک دوسرے کی کتنی ہی مدد کریں۔

^۲ سیرۃ ابن ہشام ص ۱۹۳، البدایہ والنہایہ ص ۶۶۳، الاصابہ ص ۲۳۱، ذکر اخنس بن شریق

۱۔ شہادت دینے والے ہیں

۲۔ بشارت دینے والے ہیں

۳۔ آگاہ کرنے والے ہیں

۴۔ خدا کی طرف بلانے والے ہیں

۵۔ خدا کی طرف سے دعوت دینے کے مجاز ہیں

۶۔ چراغ ہیں روشنی دینے والے۔

یہ معجزانہ بلاغت ہے کہ خطاب ایسے الفاظ سے کیا گیا جس سے یہ بنیادی حیثیت پہلے ظاہر ہو گئی کہ آپ خدا کے بھیجے ہوئے نبی ہیں۔ اس کے بعد مندرجہ بالا چھ خصوصیتیں بیان کی گئی ہیں۔

پہلی خصوصیت اور نبی اور فلسفی کا فرق:

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ آپ حق بات کو اس یقین اور ایسے وثوق اور بھروسے سے بیان کرتے ہیں جیسے کوئی آنکھوں دیکھی چیز کی شہادت دیتا ہے۔

یہ فرق ہے نبی اور فلسفی میں۔ فلسفی کے پاس قیاس، تخمینے اور تجربے ہوتے ہیں۔ تجربوں کی بنیاد اگرچہ بسا اوقات مشاہدہ پر ہوتی ہے مگر انسان کا مشاہدہ بھی بسا اوقات غلطی کرتا ہے۔

ہزاروں برس تک دنیا کے فلسفی جن میں سقراط، ارسطو اور افلاطون جیسے ماہر بھی داخل ہیں جو فلاسفہ کے امام مانے جاتے ہیں۔ یہی یقین کرتے رہے کہ چاند اور سورج آسمانوں میں گڑے ہوئے ہیں۔ آسمان زمین کو گھیرے ہوئے ہیں اور وہ زمین کے گرد گھوم رہے ہیں۔ زمین اپنی جگہ ساکن ہے یہ نہ حرکت کرتی ہے نہ کر سکتی ہے۔ یہ سب کچھ وہ اپنے مشاہدہ کی بنا پر کہتے رہے۔ ان کی عظیم الشان رصد گاہیں اسی یقین کی تصدیق کرتی رہیں اور اپنے اس یقین کی بناء پر انہوں نے نجوم، جوتش وغیرہ بہت سے فن ایجاد کئے اور یقین کرتے رہے کہ یہ تمام فنون اور ان کی یہ تمام تحقیقات صحیح اور درست ہیں، ان میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔^① مگر آج سائنس کی تحقیق یہ ہے کہ یہ جو کچھ تھافریب نظر تھا۔ آج کی دنیا میں اس سے بڑا احمق اور جاہل کوئی نہیں جو آسمان کو گھومتا ہوا مانے اور چاند سورج کو اس میں جڑا ہوا سمجھے۔

ان فلاسفہ کو پورا یقین تھا کہ ہماری زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں وہ فوراً ہی فنا ہو جاتے ہیں۔ ان کے فلسفی ضابطہ کا فیصلہ یہی تھا کہ حرکت اور اس کے اثرات کا کوئی اپنا وجود ہی نہیں ہے۔ لہذا ان کے بقاء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہماری آواز اور ہمارے الفاظ زبان کی حرکت کا اثر ہے جو ساتھ

① ان کے اس یقین میں بسا اوقات جارحیت ہوتی تھی۔ وہ اپنے مخالف کو سخت سزا کا مستحق سمجھتے تھے۔ انہیں کے پیش رو وہ تھے جنہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نذر آتش کرنے کے لئے جہنم تیار کیا تھا۔

ساتھ ختم ہو تارہتا ہے۔ لیکن آج مشاہدہ یہ ہے کہ جو لفظ زبان سے نکلتا ہے باقی رہتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جو الفاظ انسانوں کی زبان سے بولے گئے وہ سب فضا میں موجود ہیں۔

بہر حال سابق فلاسفہ نے جو باتیں صرف ذہانت سے معلوم کی ہیں اور موجودہ فلسفی جن باتوں کا مشاہدہ کر رہے ہیں ان تمام تحقیقات اور مشاہدات کے باوجود یہ سب قدیم اور جدید فلاسفہ اور ماہرین سائنس یہی سمجھتے رہے اور یہی سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہماری تحقیق ہے وہ حرف آخر نہیں ہے۔ ممکن ہے کوئی جدید تحقیق اس تحقیق کو غلط قرار دے دے۔ لہذا یہ یقین کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہی حرف آخر ہے اور وہی حق ہے اس کے سوا باطل ہے یہ یقین فلسفی کو میسر نہیں آتا۔ اس کو خود اپنی تحقیق کے اندر شک رہتا ہے۔ اس بناء پر وہ اطمینان سے محروم رہتا ہے۔ اور جب اطمینان کی دولت خود اس کے پاس نہیں ہوتی تو وہ کسی دوسرے کو یہ دولت کہاں سے دے سکتا ہے؟ اور جب اس کو اپنی تحقیق پر مکمل اطمینان اور یقین نہیں ہوتا تو اس کے لئے فدا ہو جانے اور قربان ہونے کا جذبہ بھی اس کے اندر نہیں ہوتا۔ لہذا عمل کے لحاظ سے وہ عموماً کوتاہ رہتا ہے۔

مادہ کی طرح روح اور خدا سے تعلق رکھنے والے مسائل (مثلاً خالق کائنات کی ذات و صفات، اس سے انسان کا تعلق، حیات بعد المات، عمل اور پاداش عمل جیسے مسائل) میں بھی فلسفی کا فیصلہ دو ٹوک نہیں ہوتا۔ اس کا ترقی پذیر دماغ جس چیز کو آج روشنی سمجھتا ہے وہی چیز اگلے روز اس کو تاریک نظر آتی ہے اور سکون و اطمینان کے بجائے اس کا دماغ نئے غلجیان میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے پیر و کار جو بصیرت سے محروم اور اندھی تقلید کے عادی ہوں فلسفی کے کسی نظریہ کے معتقد ہو جائیں، مگر ان کی یہ تقلید بھی شک و شبہ کی گرد سے پاک نہیں ہو سکتی۔ اور یہی سبب ہوتا ہے کہ اس کے مخالف اور متضاد نظریہ کو بھی^② حق سمجھنے لگتے ہیں۔ قرآن حکیم میں بار بار کہا گیا ہے کہ ان عقل پرستوں کے پاس جو کچھ ہے وہ ”ظن“ ہے جو شک و شبہ اور غلجیان کے گرد و غبار سے پاک اور صاف نہیں۔ جہاں حق کی ضرورت ہو وہاں ظن کام نہیں دے سکتا۔^③

مکڑی کا جالا کرم شب تاب کو الجھا تو سکتا ہے اس کو منزل تک نہیں پہنچا سکتا۔ قطب مینار کی بلندی تک وہی رسی پہنچا سکتی ہے جو نہایت مضبوط ہو۔ نبی کے پاس حق اور یقین کی یہی مضبوط رسی ہوتی ہے جو اس کو اس کا رب اور معبود عطا کرتا ہے۔^④ اور اس کو یقین ہوتا ہے کہ یہ رسی خود اس

① برادران وطن کے دھرم کا مداد رچی پر نہیں ہے کیونکہ وہ نبوت کو نہیں مانتے ان کے دھرم کا مداد فلسفہ پر ہے وہ اپنے ریشیوں اور منیوں کو فلسفی ہی مانتے ہیں۔ اسی کا اثر ہے کہ کسی ایک عقیدہ اور نظریہ پر ان کو یقین نہیں ہوتا وہ ہر ایک عقیدہ کو صحیح مانتے لگتے ہیں۔ وہ اس کو وسعت نظر اور فراخی ظرف سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا سبب کم عقلی نظر اور فہم ان یقین ہے۔

② سورۃ النجم ۲۸۔

③ سورہ بقرہ آیت ۲۵۶ قَدْ أَشْتَبْنَاكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى

کے رب کی عطا کردہ ہے۔ وہ اپنی جان قربان کر سکتا ہے مگر اس رسی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اس یقین کا ثمرہ وہ غیر معمولی اعتماد اور توکل ہوتا ہے جو نبی کو اپنے رب پر ہوتا ہے۔ جو بڑی سے بڑی جابر و ظالم طاقت کے مقابلہ میں بھی اس کو پہاڑ کی چٹان بنائے رکھتا ہے اور سخت سے سخت خطرہ کے موقع پر بھی اس کا تصور یہ ہوتا ہے۔

”ہم خدا پر اعتماد اور بھروسہ کیوں نہ کریں جن کا (فضل و کرم یہ ہے کہ روحانی اور مادی زندگی کے) تمام راستوں میں اس نے ہماری رہنمائی کی۔ بلاشبہ ہمیں یہ کرنا ہے کہ ہم ان تمام اذیتوں کے مقابلہ پر استقلال اور ضبط و تحمل سے کام لیں جو تم ہمیں پہنچا رہے ہو اور اللہ ہی ہے جس پر بھروسہ کرنے والوں کو بھروسہ کرنا چاہئے“۔ (سورہ ابراہیم - ۱۱)

مختصر یہ کہ اللہ کے رسول ﷺ کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شاہد ہیں یعنی جو کچھ بتاتے ہیں وہ ایسے یقین کے ساتھ جو مشاہدہ سے بھی بڑھا ہوا ہوتا ہے، جس کی پشت پر حق و صداقت کی سرفروشانہ اور فداکارانہ چٹنگی ہوتی ہے۔

دوسری خصوصیت:

یہ کہ جو لوگ اس حق و صداقت کو قبول کر لیتے ہیں ان کو پہلی بشارت^۱ یہ ہوتی ہے کہ انہوں نے سچائی کا راستہ پایا اور خدا پرستی کے جس صراط مستقیم کی تلاش میں وہ سرگرداں تھے وہ صراط مستقیم ان کو مل گیا۔ وہ تشنہ کام، جو تلاش حق میں سالہا سال سے سرگرداں رہے ان کیلئے اس سے زیادہ بشارت کیا ہو سکتی ہے کہ وہ گوہر مراد ان کے دامن میں آگیا جس کے لئے وہ بے چین تھے اور جس کی جستجو میں وہ اپنی عمر کھپا رہے تھے۔ دوسری بشارت یہ ہے کہ اس کے بہترین فوائد اور نتائج ان کو موجودہ زندگی میں بھی میسر آئیں گے اور اس عالم میں بھی میسر آئیں گے جہاں حق و باطل کا فیصلہ ہو گا۔ جہاں کی زندگی حقیقی زندگی ہے اور جہاں کی کامیابی ابدی کامیابی ہے۔

تیسری خصوصیت:

یہ کہ جو لوگ سچائی کے سامنے گردن نہ جھکائیں جو اس سے منہ موڑیں ان کو آگاہ کر دیں کہ وہ موجودہ اور آخرت کی زندگی کی کامیابیوں سے منہ موڑ رہے ہیں۔ اس کے بدترین نتائج اس زندگی میں بھی ان کے سامنے آئیں گے اور اس زندگی میں بھی جو حقیقی زندگی ہے۔ آپ کی حیثیت یہ ہے کہ آپ نذیر ہیں (آگاہ کرنے والے)

^۱ ایک سبق: نبی اور نہ صرف نبی بلکہ ہر ایک داعی حق کا یہ کام ہے کہ وہ پر امید رہے اور جس کو وہ دعوت دے تو پہلے اس دعوت کے فائدہ بخش اور روشن پہلو اس کے سامنے رکھے۔

چوتھی خصوصیت:

یہ کہ آپ داعی الی اللہ ہیں۔

پانچویں خصوصیت:

یہ ہے کہ آپ محض فطری خیر اندیشی اور خیر سگالی کی بنا پر دعوت نہیں دیتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس جلیل اور عظیم خدمت کے لئے مامور ہیں۔

چھٹی خصوصیت:

وہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی کالب لباب ہے۔ آپ کی تمام سوانح حیات ان دو لفظوں میں سمائی ہوئی ہے کہ آپ سراج منیر ہیں، یعنی نوع انسان کی محفل میں رونق افروز ہیں۔ مگر اس طرح کہ سراسر سوز و گداز ہیں اور یہ سوز و گداز ہی وہ نور ہے، جو دوسروں کو روشن کر رہا ہے۔

اس چھٹی خصوصیت کا مشاہدہ کرانے کے لئے حیات مقدسہ کی مختصر سوانح آئندہ صفحات میں پیش کی جا رہی ہے۔ (واللہ الموفق وھوالمعین)

شمع سوزاں اور سراج منیر کو گل کرنے کی کوشش

وہی محمد ﷺ، سرداران قریش جس کو الصادق اور الامین کہا کرتے تھے اس کی مقدس تعلیم کو جب انہوں نے اپنے مفادات کے لئے خطرہ عظیم اور برق خرمن سوز سمجھا تو اب رات دن ان کی کوشش یہ تھی کہ اس آواز کو دبائیں اور اس شمع کو گل کر دیں۔ چنانچہ باپ دادا کے مذہب قدیم کے نام پر عوام میں اشتعال پیدا کر دیا۔ جس پر وہ آنحضرت ﷺ اور گئے چنے مٹھی بھر مسلمانوں کے درپے ہو گئے۔ اس کے علاوہ خود ان کی سرگرمیاں نئے نئے ستم ایجاد کرنے میں مصروف رہنے لگیں۔ خانہ کعبہ کا حرم محترم جہاں خود ان کے عقیدے کے بموجب کسی بھی جاندار کو ستانا گناہ تھا، محمد رسول اللہ ﷺ وہاں اپنے رب کی عبادت کرتے تو ستائے جاتے اور طرح طرح سے ستائے جاتے تھے۔ ایک دفعہ ابو جہل نے اپنے ساتھیوں سے کہا: اگر میں نے دیکھ لیا کہ حرم کعبہ میں محمد اپنا چہرہ زمین پر رکھے ہوئے ہیں تو میں اسکی گردن اپنے پیر سے روند دوں گا^۱۔ ابو جہل نے تو ایسا نہیں کیا لیکن اس کا دوست عقبہ بن ابی معیط اس سے بھی زیادہ حرکت کر گزرا۔

^۱ بخاری شریف ص ۴۰۷ الاطنع عنہ ۱۲

آنحضرت ﷺ حرم کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے عقبہ بن ابی معیط نے چادر گردن میں ڈال دی اور اتنی زور سے اس کو اینٹھا کہ محبوب خدا ﷺ کا سانس گھٹ گیا آنکھیں باہر کو آنے لگیں۔ اتفاق سے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ وہاں پہنچ گئے۔ عقبہ کو دھکیل کر پیچھے کیا چادر گردن مبارک سے ڈھیلی کی اور ان دشمنان حق سے کہا:

اَتَقْتُلُونَ رَجُلًا اَنْ يَقُولَ رَحِمَ اللّٰهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ (المومن-۲۸)

”کیا تم ایک آدمی کو اس پر قتل کر رہے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے وہ روشن دلیل لایا ہے جن کا تم انکار نہیں کر سکتے۔“

خانہ کعبہ کے قریب اکثر سرداران قریش کی نشست رہتی تھی۔ ایک روز آنحضرت ﷺ نماز میں مصروف تھے، ابو جہل نے اپنے ساتھیوں سے کہا: فلاں محلہ میں اونٹنی ذبح ہوئی ہے ایسا کرو کہ اس کا بچہ دان ۱۰ اٹھا لاؤ اور محمد کے سر پر رکھ دو۔ یہی بد بخت عقبہ بن ابی معیط کھڑا ہو گیا۔ اس محلہ میں گیا۔ بچہ دان اٹھا کر لایا اور جب آپ سر بسجود تھے پورا ملعونہ سر مبارک پر ڈال دیا۔ آنحضرت ﷺ کو حرکت کرنی مشکل ہو گئی (یا بارگاہ خداوندی میں مظلومانہ التجا کے لئے قصداً حرکت نہیں کی) مگر یہ بد بخت اپنی اس بد مستی پر خوش تھے اور قہقہے مارتے ہوئے ایک دوسرے پر ڈھلک رہے تھے۔ آنحضرت ﷺ کی چھوٹی صاحبزادی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خبر ہوئی وہ دوڑی ہوئی آئیں اور گندگی کے اس بوجھ کو سر مبارک سے ہٹایا۔ ۱۱

جب حرم پاک میں رہنماؤں اور سرداروں کی یہ حرکتیں تھیں تو مکہ کے عوام، مکہ کی گلیوں، کوچوں میں جو کچھ کر گزرتے کم تھا؟ چنانچہ ایسا بھی ہوا کہ اوپر سے کوڑا کرکٹ جسد اطہر پر ڈالا گیا اور ایک پڑوسی عورت کا محبوب مشغلہ یہ تھا کہ وہ آپ کے راستے میں کانٹے بچھا دیا کرتی تھی۔ ۱۲

اس قسم کی حرکتیں خدا جانے کتنی ہوئیں اور لطف یہ ہے کہ یہ حرکتیں اصل پروگرام سے زائد تھیں۔

۱۰ بخاری شریف ص ۱۱۱

۱۱ سلا جزر سلا بچہ دان (بخاری شریف وغیرہ)

۱۲ بخاری شریف ص ۳۷ آنحضرت ﷺ کو جو تکلیف پہنچائی جاتی تھی آپ اس کا انتقام تو کیا لیتے کبھی بد دعا بھی نہیں کرتے تھے۔ البتہ حقوق اللہ کی توہین کی جاتی تھی تو آپ بے چین ہو جاتے تھے اور اس وقت بد دعا کے الفاظ بھی زبان مبارک پر آ جاتے تھے۔ یہاں اس وقت جو کچھ کیا گیا اس میں اول حرم کعبہ کی توہین تھی جو خود عقیدہ قریش کے بموجب بھی حق اللہ کی توہین تھی، دوم یہ کہ بارگاہ خدا میں سجدہ ریزی کی توہین تھی جس کو ہر ایک سلیم الفطرت انسان کی فطرت حق اللہ کی توہین سمجھتی ہے۔ چنانچہ اس موقع پر ان سرداران قریش کے حق میں آپ کی زبان سے بد دعا یہ کلمات نکلے اور وہ اس طرح پورے ہوئے کہ یہ سب سردار جنگ بدر میں مارے گئے۔ (بخاری شریف ص ۳۷)

۱۳ یہ ابو لہب کی بیوی تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چچی بھی ہوتی تھی اور اس نے آپ کو بچپن میں گود کھلایا بھی تھا۔ (طبقات ابن سعد ص ۱۳۳ ج ۱)

منصوبہ بند کوششیں

ابھی آنحضرت ﷺ نے دعوت نہیں دی تھی۔ آپ خاموشی سے ذکر و فکر اور اپنی اور اپنے ساتھیوں کی تربیت میں مصروف تھے۔ اس وقت بھی قریش کے تازنہ والوں نے یہ کوشش کی تھی کہ یہ سلسلہ آگے نہ بڑھے اور محمد رسول اللہ ﷺ سے کسی طرح کی مفاہمت ہو جائے۔ مگر ان کی یہ کوششیں ناکام رہی تھیں۔ لیکن جب آنحضرت ﷺ نے پورے قریش بلکہ پورے عرب کو مخاطب کر کے تبلیغ شروع کی تو مخالفانہ کوششوں کا بھی نیا دور شروع ہوا۔

قریش کے لئے یہ سوال بہت اہم اور بہت پیچیدہ تھا کہ جس کا وہ احترام کرتے رہے تھے اور جس کو الصادق اور الامین کہا کرتے تھے اب اس کی تردید کس طرح کریں اور عوام کو کس طرح مطمئن کر کے صادق اور الامین کے خلاف مشتعل کریں۔ حج کا زمانہ قریب آیا تو یہ سوال بہت اہم ہو گیا، کیونکہ یہ یقین تھا کہ محمد ﷺ اس اجتماع عظیم سے فائدہ اٹھائیں گے۔ اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے قباں مکہ کے ذمہ داروں کا اجتماع کیا گیا۔ بحث و مباحثہ کے بعد طے کیا گیا کہ پہلے محمد ﷺ سے الگ گفتگو کر لی جائے۔ ولید بن مغیرہ ۱ کو گفتگو کے لئے منتخب کیا گیا۔ ولید بن مغیرہ مکہ کا سب سے بڑا دولت مند تھا۔ بہترین خطیب، بلند پایہ شاعر، جہاں دیدہ، عمر رسیدہ، تجربہ کار اور ایسا سلیقہ مند کہ شاہان ایران، افریقہ اور شام کے درباروں میں جاتا رہتا تھا اور وہاں اس کی عزت کی جاتی تھی۔ ولید آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ گفتگو کی، آنحضرت ﷺ نے اپنے مقصد کی وضاحت کی اور چند آیتیں قرآن پاک کی پڑھ کر سنائیں۔

ولید آیتیں سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ آنحضرت ﷺ کو تبلیغ سے منع تو کیا کرتا، خود گم ہو گیا۔ خاموشی سے مجلس سے اٹھا اور جب مجلس قریش میں واپس پہنچا تو حالت عجیب تھی۔ لوگوں کو خیال ہوا ولید بہک گیا۔ محمد کا ہو گیا مگر ولید باہمہ عقل اور دانش حیران تھا کہ جو کلام سنا ہے اس کے بارے میں اور خود محمد ”رسول اللہ ﷺ“ کے بارے میں کیا فیصلہ کرے۔ پورے غور و فکر اور موازنہ کے بعد ولید نے ارکان مجلس سے کہا:

محمد کو کاذب نہیں کہہ سکتے، اس کو کافران بھی نہیں کہہ سکتے۔ شعر و سخن کا میں ماہر ہوں اس کا کلام شعر بھی نہیں ہے۔ کافرانوں کی تک بندیوں کو بھی میں جانتا ہوں۔ محمد جو کلام پیش کرتے ہیں وہ ان سب سے بہت بلند ہے، اس کا کوئی جواب نہیں۔ اس کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ مجھ جیسا پختہ اور ٹھوس آدمی بھی چکر اگیا۔

۱ ولید بن مغیرہ کا آسان تعارف اب یہ ہے کہ اسلام کے مشہور اور کامیاب ترین جرنیل حضرت خالد رضی اللہ عنہ اس کے نامور فرزند تھے جو اس واقعہ سے تقریباً پندرہ سال بعد حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

اصل سوال کے متعلق ولید نے رائے دی کہ محمد ﷺ کی شانستہ اور شیریں گفتگو اور اس کلام کی غیر معمولی تاثیر کا توڑ یہی ہو سکتا ہے کہ پوری قوت سے پروپیگنڈہ کرو کہ

(۱) محمد ﷺ جادو گر ہے۔ وہ ایسے منتر پڑھتا ہے کہ گھر گھر میں پھوٹ پڑ جاتی ہے۔ لہذا اس کی بات نہ سنو۔

(۲) وہ دین سے پھر گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم سب، تمہارے باپ دادا، اور تمہارے وہ دیوتا جن کی پوجا کرتے ہو، یہ سب دوزخ کا ایندھن ہیں۔

(۳) تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ محمد ﷺ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

ولید کی رائے سے سب نے اتفاق کیا۔ اور صرف طے ہی نہیں کیا بلکہ اس شد و مد سے عمل بھی شروع کر دیا کہ ابھی قبائل کے لوگ حج کے لئے روانہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ محمد ﷺ کی بے دینی کا چرچا ان کی گلی کوچوں تک پہنچ گیا اور نہ صرف محمد ﷺ بلکہ آپ کے خاندان "آل ہاشم" کے متعلق بھی نفرت کی لہر ان تمام قبائل میں دوڑ گئی جو حج کیلئے آنے والے تھے۔ ابو لہب کے متعلق طے کیا گیا کہ وہ محمد ﷺ کی نگرانی رکھیں گے اور جہاں وہ تقریر کرنا چاہیں یا لوگوں سے گفتگو کریں وہ ان کو منتشر کر دیں۔

"ابو لہب" آنحضرت ﷺ کا سب سے بڑا چچا (تایا) تھا۔ مالدار اور باوجاہت بھی تھا۔ عرب کے قاعدے کے مطابق خاندان کا بڑا شخص خاندان کے ہر فرد کا ولی مانا جاتا تھا اور اس کو حق ہوتا تھا کہ وہ اپنے چھوٹے کے متعلق کوئی اعلان کر دے۔ قصاص وغیرہ کے قضیوں میں ایسے ولی کے قول کی خاص اہمیت ہوتی تھی۔ اسی غرض سے اس کو اس خدمت کے لئے مقرر کیا گیا تھا کہ خاندان کے سب سے بڑے شخص کی حیثیت سے لوگوں کو بتائے کہ محمد ﷺ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہ اپنے خاندانی بزرگوں کو جہنمی بتاتا ہے اور دیوتاؤں کی توہین کرتا ہے۔ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ خاندان کے سب سے بڑے شخص کے قول سے زیادہ کس کی بات معتبر ہو سکتی ہے۔

حج کے موقع پر انتظام کے متعدد شعبے خصوصاً سقایہ یعنی حاجیوں کیلئے پانی کا انتظام (جو سرزمین حجاز خصوصاً مکہ میں سب سے سخت کام تھا) آل ہاشم کے سپرد ہوتا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ابو لہب کے علاوہ آپ کا پورا خاندان اگرچہ مسلمان نہیں ہوا تھا مگر آپ کا حامی تھا۔ خواجہ ابو طالب ان میں پیش پیش تھے۔ سرداران قریش کے پروپیگنڈے کے باعث جو نفرت خاندان ہاشم سے عرب میں پھیل گئی تھی، خواجہ ابو طالب کو اس کا اندازہ تھا۔ انہیں خطرہ ہوا کہ حج کے موقع پر یہ نفرت بغاوت کی شکل اختیار کر لے گی اور وہ ان خدمات سے محروم ہو جائیں گے جو حج کے موقع پر ان کے سپرد ہوتی تھیں۔ قبائلی رقابت اس فتنہ کو اور ہوا دے سکتی تھی۔

لہذا خواجہ ابو طالب^۱ نے تقریباً سو شعر کا طویل قصیدہ لکھا۔ جس میں خانہ کعبہ، حرم شریف کی عظمت و حرمت، اس کے واجب الاحترام ہونے کے متعلق مسلمہ روایات، پھر خاندان ہاشم کی عظیم اشان خدمات کا تذکرہ کیا۔ اس قصیدہ میں آنحضرت ﷺ کی سیرت پر بھی روشنی ڈالی کہ ان کے اخلاق و اوصاف کیا ہیں اور قریش کس طرح ان کی تعظیم کرتے رہے ہیں۔ اسی قصیدہ کا وہ مشہور شعر ہے جو نعت شریف کے موقع پر عام طور سے پڑھا جاتا ہے۔

وایبض^۲ یستسقی الغمام بوجہہ

ثمال البیتا من عصۃ لارامل

آنحضرت ﷺ کے حامد بیان کرنے کے بعد یہ بھی واضح کیا کہ اگرچہ وہ ایک نئے مذہب کی دعوت دے رہے ہیں مگر ابتداء ہاشم جو حجاج کی خدمت کرتے ہیں وہ ان کے مذہب کے حامی نہیں ہیں۔ وہ بدستور اپنے قدیم مذہب پر قائم ہیں اور ان کے عقائد وہی ہیں جو سرداران قریش اور عام عرب کے عقائد ہیں۔ وہ اسی طرح دیوتاؤں کو مانتے ہیں اور ان کی پوجا کرتے ہیں۔ بایں ہمہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ "محمد" کو مخالفین کے حوالے کر دیں۔ خاندان ابو طالب اپنی جانیں قربان کر دینا مگر اپنی موجودگی میں محمد ﷺ کا بال بیکا نہیں ہونے دے گا۔

عرب شعر کے دلدادہ ہوتے تھے۔ شاعروں کے قصیدے جیسے ہی پڑھتے جاتے تھے، بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ جاتے تھے اور پھر جگہ جگہ وہ نقل کئے جاتے تھے۔ اس وقت شعراء کے قصائد کو وہی طاقت حاصل تھی جو دور حاضر میں کسی مضبوط پریس کو حاصل ہے۔ چنانچہ خواجہ ابو طالب کا یہ قصیدہ تمام قبائل میں پھیل گیا اور اس طرح وہ فتنہ فرد ہوا جو بنو ہاشم کے خلاف کھڑا کیا جا رہا تھا۔ مگر آنحضرت ﷺ کی دعوت کے متعلق اس کی وہی قوت باقی رہی بلکہ خواجہ ابو طالب کے قصیدے نے اور تائید کر دی کہ محمد ﷺ نے مذہب کے داعی ہیں۔ چنانچہ خواجہ ابو طالب اور ان کے ساتھیوں کو تو اپنی خدمات کی انجام دہی میں کوئی نئی دشواری پیش نہیں آئی مگر آنحضرت ﷺ کا تعاقب پوری طرح کیا گیا۔ آنحضرت ﷺ جہاں تشریف لے جاتے عرب کا گورا چٹا^۳ ایک

۱ ابن ہشام نے اس پورے قصیدہ کو نقل کیا ہے اور اس کی وجہ تصنیف یہی بیان کی ہے جو اوپر گزری۔ ص ۱۶۶ تا ص ۱۷۱ ج ۱

۲ یعنی محمد ﷺ کی ایک تعریف یہ ہے کہ ایسا روشن چہرہ جس کا واسطہ دیکر بادل سے بارش مانگی جاتی ہے (یہ ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ بارش نہیں ہوتی تھی تو قریش نے آپ سے دعا کرانی تھی اور بارش ہو گئی تھی) یتیموں کی پناہ ہیں، بے سہارا بیوہ عورتوں کی عصمتوں کے محافظ۔

۳ ابو لہب کا رنگ سفید، سرخی رخساروں میں گہمی ہوئی، اس کے رخساروں کو شعلوں سے تشبیہ دیتے ہوئے اس کا لقب ابو لہب رکھا گیا تھا یعنی شعلوں والا۔

باد جاہت سردار (ابولہب) ان کے پیچھے ہوتا، جو لوگوں کو ڈانٹتا رہتا کہ ان کی بات نہ سنو، یہ پاگل ہو گئے ہیں^① (معاذ اللہ)

ہڑ بونگ اور انتشار:

ابولہب کا یہ طریقہ انفرادی نہیں رہا بلکہ اجتماعی بن گیا۔ اور یہ طے کر دیا گیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ جہاں بھی تقریر کریں یا قرآن پاک کی آیتیں سنائیں انتشار مچاؤ کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ اور محمد ﷺ زچ ہو کر رہ جائیں^②۔ قریش مکہ کی شرارت پسندی کو داد دینی چاہئے کہ کئی سال تک یہ پروگرام چلاتے رہے۔

ناکہ بندی:

ابوذر رضی اللہ عنہ قبیلہ غفار کے نمایاں شخص تھے۔ دل میں صداقت کی تڑپ رکھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کے دعویٰ نبوت کا چرچا آپ تک پہنچا۔ حقیقت معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چھوٹے بھائی (انیس) سے کہا: مکہ معظمہ جاؤ اور تحقیق کر کے آؤ۔ انیس کہ آئے، طے چلے اور واپس جا کر رپورٹ دی۔ ایک صاحب ہیں اچھی باتیں بتاتے ہیں بری باتوں سے روکتے ہیں۔

ابوذر اس دو حرفی رپورٹ سے مطمئن نہیں ہوئے۔ خود سفر کا ارادہ کر لیا اور فوراً ہی تیار ہو کر چل دیئے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ مکہ میں آئے لیکن تحقیق کس سے کریں؟ جہاں نام لینا بھی مصیبت کا سر لینا تھا۔ لوگ مارنے اور پیٹنے کو تیار ہو جاتے تھے، وہاں راستہ کون بتاتا اور تعارف کون کراتا۔ کئی دن اس شش و پنج میں گذر گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کو دیکھا کرتے تھے ایک روز ان کو دیکھ کر ٹھٹھے اتار پتہ اور مکہ آنے کا سبب معلوم کیا اور جب مقصد معلوم ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ میرے ساتھ چلو۔ مگر اس طرح چلو کہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ میرے ساتھ چل رہے ہو۔ میں کوئی اندیشہ محسوس کروں گا تو چپل ٹھیک کرنے کے بہانے دیوار سے لگ کر کھڑا ہو جاؤں گا تم آگے چلتے رہنا۔ غرض حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بڑی رازداری سے کام لیا، تب حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ منزل مقصود پر پہنچ سکے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی نظر روئے انور پر پڑی دل نے تصدیق کی کہ گوہر مراد حاصل ہو گیا۔ آپ نے اسلام کا پیغام معلوم کیا اور بقول ابوذر رضی اللہ عنہ وہیں کے وہیں^③ (نوراً) مسلمان ہو گئے۔

① طبقات ابن سعد ص ۱۳۵ ج ۱ وغیرہ

② قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ (م سجدہ - ۳۱)

③ اسلمت مکانی بخاری شریف ص ۳۹۹

زدو کو ب اور مشق ستم:

ایمان کا نور تھا یا جرأت و ہمت کا فولاد جو ابوذر رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا۔ واپس ہو کر حرم کعبہ میں پہنچے۔ قریش کے کئی سردار حرم میں موجود تھے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی نظر ان فرعون منش سرداروں پر پڑی تو جوش آگیا۔ ایسی سیدھی راہ اور ایسی سچی بات۔ اور ان لوگوں نے اس کے ناکہ بند کر رکھے ہیں اور یہ ”محمد“ مجسم صداقت و ہدایت ان کا کوئی نام تک زبان پر نہیں لاسکتا۔ اس تصور نے جذبہ کی قوت حاصل کی۔ چنانچہ آپ نے ان رواساء کو خطاب کر کے فرمایا: یا معشر قریش۔ انی اشہد ان لا الہ الا اللہ۔“

قریش کے سردار اس جرأت کو کب نظر انداز کر سکتے تھے، آواز دی: قوموا الی هذا الصابی۔ اٹھ کھڑے ہو اس بے دین کی طرف (مارو اس بے دین کو)۔ سب طرف سے لوگ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ پر ٹوٹ پڑے اور جاں بلب کر دیا۔ حضرت عباس جواب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے وہاں موجود تھے۔ انہیں خطرہ ہوا کہ ابوذر رضی اللہ عنہ کی جان جاتی رہے گی وہ ان کے اوپر اوندھے بڑ گئے اور پکار کر کہا: ”یہ قبیلہ غفار کا آدمی ہے۔ اس کے قبیلہ والوں نے اگر تمہارا راستہ بند کر دیا تو بھوکے مر جاؤ گے۔ غلہ کا ایک دانہ تم تک نہ پہنچ سکے گا۔“

غلہ کا نام سن کر لوگوں نے ان کو چھوڑا۔

اگلے روز پھر یہی ہوا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اسلام کا نعرہ بلند کیا اور قریش کے نوجوانوں نے ان کو پینٹا شروع کیا، تب بھی حضرت عباس ہی کسی طرح وہاں پہنچ گئے اور یہی کہہ کر ان کو بچایا۔^① اس طرح کے واقعات اسلام لانے والوں کے ساتھ مسلسل ہوتے رہتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کئی بار اس طرح تنہا مشق بن چکے تھے مگر مارنے والوں میں کوئی بچانے والا بھی کھڑا ہو جاتا تھا جس سے جان بچ جاتی تھی۔ لیکن ایسا بھی ہوا کہ کوئی بچانے والا نہیں پہنچ سکا تو جان بھی جاتی رہی۔

حارث بن ابی حالہ۔ جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے لڑکے اور آنحضرت ﷺ کے پروردہ تھے، ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کو چھڑانے آئے۔ لوگوں نے آپ کو تو چھوڑ دیا مگر ان کو اتنا مارا کہ شہید ہو گئے۔ اسلام کی راہ میں یہ پہلا خون تھا جس سے حرم مکہ کی وہ زمین رنگین ہوئی جہاں اللہ کے بندے طواف کیا کرتے ہیں۔^②

حضرت عمار رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں ان کے والد کا نام یاسر اور والدہ کا نام سمیہ رضی اللہ عنہا تھا۔ ابو جہل نے حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کے اندام نہانی میں بر چھی ماری وہ غریب شہید ہو گئیں۔ یہ پہلی خاتون

① بخاری شریف ص ۳۹۹،

② اول من قتل فی سبیل اللہ تحت الرکن الیابانی الاصابہ (ص ۳۰۶ ج ۱)

تھیں جو راہ خدا میں شہید ہوئیں۔ ^①

حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو جلتی ہوئی زمین پر لٹاتے اور اتا مارتے کہ بے ہوش ہو جاتے تھے، مگر زندگی تھی باقی رہ گئے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ: امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ جب ٹھیک دوپہر ہو جاتا تو ان کو تپتے ہوئے بالو پر لٹایا جاتا اور پتھر ان کے سینہ پر رکھ دیا جاتا کہ جنبش نہ کرنے پائیں۔ اور ان سے کہا جاتا کہ اسلام سے باز آئیں، مگر ان کی زبان سے ”احد“ ہی نکلتا یعنی معبود ایک ہی ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

جب دھوپ میں تیزی نہ رہتی تو گلے میں رسی بند ہوا کر لڑکوں کے حوالے کر دیا جاتا کہ مکہ کے اُس سرے سے اس سرے تک گھینٹے پھریں۔

حضرت ابو لکھیم رضی اللہ عنہ۔ صفوان بن امیہ کے غلام تھے۔ صفوان ان کو بھی یہی سزا دلاتا تھا کہ ان کو گھینٹے ہوئے تپتے ہوئے ریت پر ڈال دیا جاتا اور سینہ پر پتھر رکھ دیا جاتا۔ ایک روز اتنا بھاری پتھر سینہ پر رکھ دیا گیا کہ ان کی زبان نکل آئی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ: جو تیسرے خلیفہ ہوئے، بہت اونچے خاندان کے باحیثیت رئیس تھے۔ جب مسلمان ہوئے تو دوسروں نے نہیں خود ان کے چچانے ان کو رسی سے باندھ کر مارا۔

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ: اسلام لائے تو ان کے چچا ان کو چٹائی میں لپیٹ کر ان کی ناک میں دھواں دیتے تھے۔

حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ: مسلمان ہوئے تو ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دی گئیں۔ ایک روز دیکھتے ہوئے کوئلوں پر لٹا دیا گیا۔ ایک شخص چھاتی پر پیر رکھ کر کھڑا ہو گیا کہ کروٹ نہ لے سکیں۔ یہاں تک کہ کوئلے خون اور چربی سے تر ہو کر ٹھنڈے ہو گئے۔ مدتوں کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں انہوں نے یہ واقعہ بیان کیا اور پیٹھ کھول کر دکھائی جو برص کے داغ کی طرح بالکل سفید تھی۔ ^②

الغرض اس طرح کے مظلوموں کی فہرست بہت طویل ہے اور مظالم کی داستان اس سے بھی زیادہ طویل۔ مقصد یہ ہے کہ اس طرح کے مظالم جو سوچے سمجھے منصوبے کے بموجب قریش کی طرف سے کئے جا رہے تھے انہوں نے مکہ کی پوری فضا کو اس درجہ دہشت زدہ اور مرعوب کر دیا تھا کہ کھلے بدوں اعلان حق تو درکنار لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی زبان پر لانے کی ہی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ بعض روایتوں کے بموجب ایک ماہ تک حرم

① اول شہیدۃ فی الاسلام۔ الاستیعاب ص ۶۳۵

② یہ تمام واقعات ان حضرات کے حالات میں الاستیعاب اور الاصابہ وغیرہ میں درج ہیں۔

شریف میں پڑے رہے۔ صرف زحرم پر گزارا رہا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچ سکے۔ کسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اندازہ ہوا تو بڑی رازداری کے ساتھ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے۔ (جس کی تفصیل اوپر گزری ہے)

اس طرح کے بے پناہ مظالم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجبور کر دیا کہ کسی خفیہ مقام پر قیام فرمائیں۔ چنانچہ اک مدت تک دار بنی ار قم میں آپ اور آپ کے ساتھی جن کی تعداد تیس کے قریب تھی پناہ گزین رہے۔ نہایت عجیب بات یہ ہے کہ ان تمام مظالم کے مقابلہ میں رحمۃ اللعالمین کی زبان مبارک اگر متحرک ہوتی تو صرف دعائے خیر کیلئے۔ یہی حضرت خباب رضی اللہ عنہ جن کو انگاروں پر لٹایا گیا تھا انہوں نے ایک روز درخواست کی کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ان ظالموں کے لئے بددعا فرمادیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خباب رضی اللہ عنہ کے الفاظ سے سیدھے بیٹھ گئے۔ روئے انور سرخ ہو گیا فرمایا: پہلی امتوں میں یہاں تک ظلم ہوئے ہیں کہ لوہے کے کنگھے سے ہڈیوں اور پٹھوں تک گوشت کھرچ دیا جاتا تھا۔ کسی داعی حق کے سر پر آہ رکھ کر کھجور سے چیر دیا گیا، مگر ان حضرات کے پائے استقلال میں جنبش نہیں آئی۔ پھر فرمایا: یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو مکمل فرمائے گا۔ یہاں تک ایک مسافر تنہا صفا میں سے حضر موت تک پہنچ جایا کرے گا، راستہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا اس کو کسی کا خوف نہیں ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ بھیڑیے کا خطرہ ہو گا جو اس کے گلہ پر حملہ کر سکے گا۔ ^①

مقصد:

حضرت عمار رضی اللہ عنہ ان کے والد اور والدہ تینوں کو طرح طرح ستایا جا رہا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس طرف سے گزرے۔ ان کو مبتلا عذاب دیکھ کر فرمایا: صد یا آل یاسر! ان موعد کم الجنة۔ ^② آل یاسر! صبر کرو تم سے جنت کا وعدہ ہے۔ یعنی اس انقلابی پارٹی کی پہلی شرط یہ تھی کہ اس کے مجاہدین کی نظر صرف آخرت پر ہوگی۔ ان کی ہر قربانی اللہ کے لئے ہوگی۔ غلبہ اور اقتدار حاصل ہونے کے بعد یقیناً دنیاوی مفادات بھی حاصل ہو گئے۔ مگر وہ اللہ تعالیٰ کا فضل و انعام ماننا جایگا مجاہد کا نصب العین نہیں ہو گا۔ قرآن حکیم نے اعلان فرمادیا ہے:

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ۝ یہ عالم آخرت ہم انہیں لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا۔ اور نیک نتیجہ متقی لوگوں کے لئے ہوتا ہے۔

① بخاری شریف ص ۵۳۳

② الاستیعاب ص ۶۳۲ نمبر ۲۷۹۳

③ سورہ قصص ۲۸ آیت ۸۳

ہجرت حبشہ

قریش اور ترقی پذیر قبائل عرب کے پاس نہ فوج تھی نہ پولیس۔ البتہ معاہدات کا سلسلہ ایسا تھا جو فوج اور پولیس کا کام دیتا تھا۔

معاہدہ ایک حصار ہوتا تھا جو جان کا بھی محافظ ہوتا تھا اور مال کا بھی۔ اور ان معاہدات کے ذریعے طاقت کا بھی توازن قائم رہتا تھا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو اسی چیز نے بچایا تھا کہ قبیلہ غفار (جس سے قریش کا معاہدہ تھا) اگر بگڑ گیا تو قریش کا اس طرف سے گزرنا اور غلہ برآمد کرنا ناممکن ہو جائیگا۔ ابو بکر صدیق، عبد الرحمن بن عوف، سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہم) خود اپنے طور پر مختلف قبائل سے معاہدے کئے ہوئے تھے۔ ابتداء میں آنحضرت ﷺ براہ راست کسی قبیلہ سے معاہدہ کئے ہوئے نہیں تھے۔ مگر ان کی حفاظت کی ذمہ داری خواجہ ابو طالب نے لے رکھی تھی۔ خواجہ ابو طالب دوسرے قبائل سے معاہدے کئے ہوئے تھے، اس بناء پر آنحضرت ﷺ جس طرح خواجہ ابی طالب کی پناہ میں تھے اور خواجہ ابو طالب آپ کی پناہ کے ذمہ دار تھے اسی طرح وہ تمام قبائل بھی آنحضرت ﷺ کی حفاظت کے ذمہ دار تھے جو ابو طالب سے معاہدہ کئے ہوئے تھے۔ مگر اسلام سے مشرف ہونے والوں میں بڑی تعداد وہ تھی جن کے کسی سے خود اپنے معاہدے نہیں تھے کیونکہ وہ اپنے قبیلوں کے شیوخ اور سربراہ نہیں تھے، سربراہ دوسرے تھے یہ ان کے تابع تھے۔ شیوخ اور سربراہوں کے معاہدات کے باعث یہ فائدہ تو تھا کہ غیر قبیلہ کے لوگ ان کو مظالم کا نشانہ نہیں بنا سکتے تھے۔ مگر خود قبیلہ کے لوگوں کی مخالفت سوبان روح تھی۔ یہ مسلمان ہو گئے تھے مگر جس مقصد سے مسلمان ہوئے تھے وہ حاصل نہیں تھا۔ یعنی یہ لوگ خدا واحد کی عبادت نہیں کر سکتے تھے۔ چھپ کر قرآن شریف پڑھتے۔ اگر راز فاش ہو جاتا تو طرح طرح کے ظلم سہنے پڑتے۔ آنحضرت ﷺ اذیتیں اور تکلیفیں سہ رہے تھے۔ مگر آپ کو اپنی تکلیف کا احساس نہیں تھا۔ البتہ ان ساتھیوں کی اذیت کا احساس آپ کو بے چین رکھتا تھا۔ آپ کو معلوم ہوا کہ حبش کا بادشاہ نیک نفس عیسائی ہے۔ اس کی مملکت میں لوگوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ لہذا آپ نے مشورہ دیا کہ جو جا سکتے ہوں وہ حبش چلے جائیں۔

اس مشورہ پر عمل ہوا۔ پہلے پندرہ صحابہ کا قافلہ روانہ ہوا۔ گیارہ مرد تھے اور چار عورتیں۔ یہ قافلہ ساحل سمندر پر پہنچا۔ ایک جہاز روانہ ہونے والا تھا، اس میں نہایت سستے محصول پر جگہ مل گئی قریش کو اس قافلہ کی روانگی کا علم ہوا تو ایک جماعت ان کو پکڑنے کے لئے دوڑادی، مگر جب وہ ساحل سمندر پر پہنچی تو جہاز روانہ ہو چکا تھا۔

ان حضرات کو وہاں اطمینان میسر آیا تو پھر اور مسلمانوں نے بھی یہ راستہ اختیار کیا۔ مکہ معظمہ سے خفیہ طور سے اکادکا روانہ ہو کر پہلے ساحل پر جمع ہو گئے اور وہاں سے حبش روانہ ہو گئے۔ اس

دوسرے قافلہ میں تقریباً ستر افراد تھے۔

قریش کے لئے یہ بہت بڑا المیہ تھا کہ اتنے مسلمان وہاں جمع ہو گئے۔ انہوں نے بہت کچھ ہدیوں اور تحفوں کے ساتھ بادشاہ حبش کے پاس سفارت بھیجی کہ یہ لوگ بھاگ کر چلے آئے ہیں ان کو حوالہ کر دیا جائے۔ بادشاہ نے مسلمانوں کو طلب کر کے ان کا مقصد معلوم کیا۔

حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی ترجمانی کرتے ہوئے جو تقریر فرمائی وہ تمام مورخین نے نقل کی ہے اس کا اردو پیر ہن یہ ہے:

بادشاہ علیجاہ!

یہ درست ہے کہ ہماری قوم بت پرست ہے، جاہل ہے، اس کو حلال حرام کی تمیز نہیں، مردار کھا جاتی ہے، بدکاریاں کرتی ہے ہمایوں کو ستاتی ہے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا ہے، لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا ہے۔ جو برائی ہو سکتی ہے وہ سب ہمارے معاشرہ (سماج) میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر اپنا فضل فرمایا، ہم میں ایک شخص پیدا ہوا۔ عمر کے چالیس سال اس نے ہمارے بیچ میں رہ کر اس طرح گزارے کہ پوری قوم اس کی شرافت کی قائل ہو گئی۔ اسکی صداقت اور سچائی سے یہاں تک متاثر ہوئی کہ اس کو الصادق اور الامین کہنے لگی۔ اس نے بتایا کہ خدا نے اس کو نبی بنا کر بھیجا ہے اور خدا کا حکم یہ ہے کہ صرف خدا واحد کی عبادت کرو، بت پرستی چھوڑ دو، کمزوروں کی مدد کرو، غریبوں پر رحم کرو، ایک دوسرے سے محبت کرو، آپس میں شفقت اور مہربانی سے کام لو، سچائی اختیار کرو، بری باتیں چھوڑ دو، نیک اور دیانتدار بن جاؤ۔

اے بادشاہ! ہمیں یہ باتیں اچھی معلوم ہوئیں ہم نے اس کا دامن سنبھال لیا ہے اور اس کے کہنے پر عمل شروع کر دیا ہے۔

سفارت قریش کے ارکان نے یہ دیکھا کہ بادشاہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تقریر سے متاثر ہو رہا ہے تو انہوں نے بادشاہ سے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کے متعلق ان کا عقیدہ معلوم کیجئے۔ یہ کچھ اور کہتے ہیں اور عیسائیوں کی تردید کرتے ہیں۔

بادشاہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کے متعلق ان کا عقیدہ معلوم کیا تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے سورہ مریم کا دوسرا پارہ کو پڑھ کر سنا دیا، جس میں حضرت مریم علیہا السلام کی پاکدامنی بیان کر کے بتایا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے نہیں ہیں بلکہ خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے معجزے عطا فرمائے تھے۔ اور پہلا معجزہ یہ تھا کہ انہوں نے گہوارے ہی میں بولنا شروع کر دیا تھا۔

بادشاہ قرآن پاک کی آیتوں اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تقریر سے یہاں تک متاثر ہوا کہ اس کی

آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ پادریوں کو خطاب کر کے کہا کہ میرے یقین ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیثیت اس سے ایک تنکے کی برابر بھی زیادہ نہیں ہے جو انہوں نے قرآن شریف کے حوالہ سے بیان کی ہے۔ پھر قریش کے سفیروں سے کہہ دیا کہ یہ لوگ آپ کے غلام نہیں ہیں، آپ کے مقروض نہیں ہیں، پھر ان کو آپ کے حوالے کیوں کیا جائے۔ مسلمانوں سے کہا کہ وہ اس کی مملکت میں اطمینان سے رہیں۔^①

مسلمان وہاں پر رہے۔ ایک مرتبہ ایک غنیم کا حملہ ہوا تو مسلمانوں نے شاہی فوج کی مدد بھی کی۔^②

قریش کا تاثر:

قریش کو اس سفارت کی ناکامی کا علم ہوا تو مسلمانوں کے خلاف ان کا غیض و غضب اور بڑھ گیا اور خواجہ ابوطالب اور آل ہاشم پر پورا زور ڈالنا شروع کر دیا کہ محمد ﷺ کی ذمہ داری سے دست کش ہو جائیں۔ چنانچہ روساء قریش کا ایک وفد خواجہ ابوطالب کے پاس پہنچا اور بہت زور ڈالا کہ آنحضرت ﷺ کو منع کر دیں، ورنہ ان کو ہمارے حوالہ کر دیں۔ مجبور ہو کر ابوطالب نے آنحضرت ﷺ سے گفتگو کی۔ آپ نے فرمایا:

”چچا جان! آپ کی شفقت و محبت کا شکریہ! آپ یقیناً معذور ہیں۔ آپ میری امداد سے دست کش ہو جائیے۔ مگر مجھے میرے رب نے جس مقام پر کھڑا کر دیا ہے میں اس سے ذرہ برابر بھی نہیں ہٹ سکتا۔“

خواجہ ابوطالب نے یہ چٹنگی دیکھی تو قریش کو جواب دیدیا کہ وہ محمد کی حمایت نہیں چھوڑ سکتے اور آنحضرت ﷺ کو اجازت دی کہ وہ اپنا کام کرتے رہیں۔ لیکن آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے لئے یہ نئی صورت پیدا ہو گئی تھی کہ ایک سو کے قریب مسلمان حبشہ چلے گئے تو اب صرف تیس چالیس مسلمان رہ گئے جن کے لئے مکہ کی غضبناک فضا میں زندگی اور بھی دو بھر ہو گئی تھی۔ ان میں کافی تعداد غلاموں کی تھی۔ اگرچہ ان میں سے زیادہ تر کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خرید کر آزاد کر دیا تھا، لیکن آزادی کے بعد بھی وہ بے پناہ تھے۔ مسلمان ان کی پناہ ہو سکتے تھے مگر وہ خود چھپ چھپ کر زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔

① یہ بادشاہ مسلمان ہو گیا تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو آنحضرت ﷺ نے اسی روز اس کے انتقال کی خبر دیدی اور غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔

② اسبوط السمری ص ۹۸ ج ۱۰ باب نکاح اہل الحرب ودخول الحجار الیہم بلان۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مسلمان ہونا:

مسلمانوں کی تعداد سو سے زیادہ ہو گئی تھی۔ ان میں طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص اور شیر خدا حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے جنگجو بہادر بھی تھے، جنہوں نے مستقبل میں عظیم الشان کارنامے انجام دیئے اور غزوات میں بہادری کے بے نظیر جوہر دکھائے۔ مگر یہ حضرات اس وقت ایسے نہیں تھے جن کی مکہ میں دھاک ہو اور جن سے پورا شہر مرعوب رہتا ہو۔ یہ بات صرف دو^① کو حاصل تھی: عمر بن الخطاب اور ان کے ماموں ابو جہل بن ہشام کو۔ مگر یہ دونوں اسلام کے مقابلہ میں بہت سخت تھے۔ آنحضرت ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے کہ خداوند ان دونوں میں جو تجھے زیادہ محبوب ہو اس سے اسلام کو تقویت فرما۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی یہ جرأت ہی تھی کہ ایک روز طے کر لیا کہ محمد ﷺ کا قصہ تمام کر کے اس خلفشار کا خاتمہ کر دوں جس سے قریش کی زندگی تلخ ہو گئی ہے اور آئے دن ایک ہنگامہ برپا رہتا ہے۔

عمر بن الخطاب نے تلوار ہاتھ میں لے لی اور محمد ﷺ کی تلاش میں نکلے۔ راستہ میں ایک صاحب نعیم^② بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے آپ کو دیکھا۔ تیور چڑھے ہوئے تھے دریافت کیا: ابن الخطاب کیا ارادہ ہے؟

عمر بن الخطاب: اس فتنہ کو ختم کرنے جا رہا ہوں جو محمد نے برپا کر دیا ہے (ﷺ) نعیم بن عبد اللہ: خاندان ہاشم اور جو ان کے حلیف ہیں ان سے کیسے منگو؟ اور دیکھو ابن الخطاب! محمد کو ختم کرنے سے پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔ تمہاری بہن فاطمہ اور بہنوئی سعید بن زید مسلمان ہو چکے ہیں۔

عمر رضی اللہ عنہ ان طعن آمیز، اشتعال انگیز فقروں کو کب برداشت کر سکتے تھے وہ فوراً پلٹے اور محمد رسول اللہ ﷺ کی تلاش چھوڑ کر بہن کے مکان پر پہنچ گئے۔ وہاں حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ قرآن شریف پڑھا رہے تھے۔ جیسے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دروازے پر پہنچ کر آواز دی، ہمیشہ صاحبہ نے حضرت خباب رضی اللہ عنہ کو اندر کر دیا مگر تلاوت کی کچھ بھنک عمر کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ عمر جیسے ہی مکان میں داخل ہوئے پوچھا: تم کیا پڑھ رہے تھے؟ بہن بہنوئی نے بات کو چھپانا چاہا۔ کچھ

① نام دونوں کا عمر، ایک عمر بن الخطاب دوسرے عمر بن ہشام جو ابوالحکم کی کنیت سے مشہور تھا پھر ابو جہل کے نام سے مشہور ہوا۔

② نعیم بن عبد اللہ النخام، مسلمان ہو چکے تھے۔ مگر اپنے اسلام کا اظہار نہیں کیا تھا۔ النخام، نمر سے ماخوذ ہے نمر کے معنی ہیں آہٹ یا کھنکھار کی آواز۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے متعلق فرمایا تھا: سبعت نحستہ فی الجنة میں نے جنے میں ان کا نمر سنا ہے۔ اسی بشارت کی بنا پر ان کا خطاب نخام ہو گیا۔ (سیرت حلبیہ ص ۳۴۹ ج ۱)

خاموش رہے تو عمر رضی اللہ عنہ نے اسی تیزی میں کہا: میں نے سنا ہے تم بے دین ہو گئے ہو۔ یہ کہہ کر بہنوئی پر ہاتھ اٹھایا۔ بہن اپنے شوہر کو بچانے کے لئے آگے بڑھیں تو ان کے سر پر بھی اتنی زور سے مارا کہ خون بہنے لگا۔ اب بہن کو جوش آگیا۔ فرمایا: عمر رضی اللہ عنہ جو چاہو کرو۔ ہم مسلمان ہو چکے ہیں اور ہم قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔

بہن کے سر سے خون بہتا ہوا دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کچھ پیچھے۔ غصہ ٹھنڈا ہوا تو فرمایا: مجھے دکھاؤ کیا پڑھ رہے تھے۔

بہن نے فرمایا: تم دیکھنا چاہتے ہو تو پہلے غسل کرو۔ تم کافر ہو، ناپاک ہو، قرآن کو نہیں چھو سکتے۔ اب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا غصہ ختم ہو چکا تھا اور اصل حقیقت معلوم کرنے کا شوق اتنا بڑھ چکا تھا کہ بہن کے توہین آمیز کلام کو برداشت کیا اور غسل کر کے کلام اللہ کے اوراق پڑھنے شروع کئے۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ السَّمٰوٰتِ ۝ وَ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيْمُ ۝ لَكَ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ السَّمٰوٰتِ ۝ وَ يُعِيْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ مَلَكٍ ۝ هُوَ الْاَوَّلُ ۝ وَ الْاٰخِرُ ۝ وَ الظَّاهِرُ ۝ وَ الْبَاطِنُ ۝ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ السَّمٰوٰتِ ۝ وَ الْاَرْضَ ۝ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۝ يَعْلَمُ مَا يَلِيْكَ فِي الْاَرْضِ ۝ وَ مَا يَخْفٰهُ مِنْهَا ۝ وَ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ ۝ وَ مَا يَرْجُوْهُ فِيْهَا ۝ وَ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۝ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ لَكَ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ السَّمٰوٰتِ ۝ وَ الْاَرْضِ ۝ وَ اِلٰى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ يُدَلِّجُ الْاَيْلَ فِي السَّحَابِ ۝ وَ يُنَزِّلُ السَّمٰوٰتِ فِي الْاَيْلِ ۝ وَ هُوَ عَلِيْمٌ بِذٰتِ الْغُضُوْرِ ۝ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ ۝ وَ اَنفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلِفِيْنَ فِيْهِ ۝ قَالَتِيْنَ اٰمِنُوْا مِنْكُمْ وَ اَنفِقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝ (سورہ حدید ۱ تا ۷)

ترجمہ: آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے اللہ کی پاکی بیان کرتا ہے (کہ وہ ہر ایک نقص سے مبرا ہے)۔ وہ زبردست حکمت والا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی سلطنت اسی کی ہے۔ (مستحق بادشاہت وہی ہے) وہی زندگی بخشتا ہے۔ اور موت دیتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ پہلے ہے۔ وہی پیچھے۔ وہی ظاہر ہے اور وہی مخفی (باطن)۔ اور وہ ہر چیز کا پورا علم رکھنے والا ہے۔ وہ ایسا ہے کہ اس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ روز (دور) میں۔ پھر وہ عرش پر رونق افروز ہوا (پوری کائنات کو اپنے اقتدار میں لے لیا)۔ ہر چیز کا اس کو علم ہے۔ وہ جانتا ہے ہر اس چیز کو جو زمین کے اندر داخل ہوتی ہے اور جو زمین سے نکلتی ہے۔ جو آسمان سے اترتی ہے جو آسمان پر چڑھتی ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو وہ تمہارے تمام اعمال دیکھتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی سلطنت اسی کی ہے اور تمام باتوں کا مرجع وہی اللہ کی ذات ہے۔ وہ ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں۔ وہ دل کی باتوں کو پوری طرح جانتا ہے۔ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر۔ اور اس مال میں سے خرچ کرو جس پر اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔ پس جو لوگ تم میں سے ایمان لے آئیں اور مال خرچ کریں ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔

اوپر کی آیتوں میں اللہ کی ذات اور صفات کا ذکر ہے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیان فرمایا کرتے تھے: میں یہ آیتیں پڑھ رہا تھا اور جب اللہ کا نام آتا تھا دل کانپ جاتا تھا یہاں تک کہ جب ساتویں آیت پر پہنچا ”ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر“ تو بے اختیار زبان سے نکلا ”اشھدان لا الہ الا اللہ و اشھدان محمدا رسول اللہ“

حضرت خباب رضی اللہ عنہ جن کو اندر چھپا دیا گیا تھا انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے کلمہ شہادت سنا تو خوش ہوتے ہوئے باہر آئے اور فرمایا: عمر رضی اللہ عنہ بشارت ہو۔ آنحضرت ﷺ نے دعا فرمائی تھی کہ خداوند!! ابو جہل اور عمر میں سے جو تجھے زیادہ محبوب ہو اس سے اسلام کی تقویت فرما۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ بشارت سن کر فوراً ہی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ آنحضرت ﷺ دار بنی ارقم میں کوہ صفا کے دامن میں پناہ گزین تھے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور کچھ اور صاحبان حاضر خدمت تھے۔ ان صاحبان نے عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا، تلوار ہاتھ میں لئے آرہے ہیں، کچھ خیال پیدا ہوا مگر یہ بھی سوچ لیا کہ بھرپور جواب دیا جائے گا۔ لیکن عمر رضی اللہ عنہ پہنچے تو انداز دو سرا تھا۔ آگے بڑھے تو رحمت عالم ﷺ نے کھڑے ہو کر استقبال کیا اور چادر یا کرتے کا کنارہ پکڑ کر فرمایا: عمر کیسے آئے۔ پھر فرمایا: عمر بانه آؤ گے۔ کیا خدا کے قہر کا انتظار کر رہے ہو۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ: حضرت باز آچکا ہوں۔ اشھدان لا الہ الا اللہ و اشھدان محمدا عبدا ورسوله۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہونے کی اتنی مسرت ہوئی کہ خود آنحضرت ﷺ نے بھی زور سے تکبیر کہی اور آپ کے ساتھیوں نے بھی زور سے تکبیر کہی۔ یہاں تک کہ یہ دامن کوہ نعرہ تکبیر سے گونج اٹھا۔^۵

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہوجانے سے اسلام کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اب تک یہ موقع نہیں ملتا تھا کہ مسلمان حرم کعبہ میں نماز پڑھ سکیں۔ مگر عمر فاروق رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو پہلے سرداران قریش میں سے ہر ایک کی ڈوڑھی پر پہنچ کر ہر ایک کو آگاہ کیا کہ عمر مسلمان ہو گیا ہے۔ اس کے بعد تمام مسلمانوں کو ساتھ لے کر حرم شریف میں داخل ہوئے اور کھلے بندوں نماز پڑھی۔ لیکن قریش نے سب کی پوری طرح تواضع کی۔ خصوصاً حضرت عمر فاروق ہر ایک کا نشانہ بنے۔^۶

^۵ البدایہ والنہایہ ص ۸۱ ج ۳

^۶ ماخوذ از البدایہ والنہایہ ص ۷۹ تا ۸۲ ج ۳۔ السیرۃ الحلبیہ ص ۳۳۹ تا ۳۵۳ و تاریخ الخلفاء

^۷ ماخوذ از تاریخ الخلفاء جلال الدین السیوطی والبدایہ والنہایہ ص ۷۲ تا ۷۹ ج ۳۔ السیرۃ الحلبیہ ص ۳۳۹ تا ۳۸۲ ج ۱

کافی مار پیٹ کے بعد کسی طرح یہ ہنگامہ ختم ہوا۔ مگر عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا مسلمان ہو جانا ایسا حادثہ نہیں تھا جس پر قریش آسانی سے صبر کر لیتے۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی دو بھر کر دی۔ حتیٰ کہ وہ بھی مکان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ لیکن عرب کے مشہور اور باہیت قبیلہ بنی سہم سے ان کا معاہدہ تھا یہ معاہدہ اس وقت کام آیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے ”عمر فاروق رضی اللہ عنہ مکان میں چھپے ہوئے تھے۔ باہر میدان میں اتنا جھوم تھا کہ پوری وادی آدمیوں سے پنی ہوئی تھی، اور یہ شور تھا کہ عمر بے دین ہو گیا ہے۔ میں مکان کی چھت پر کھڑا ہوا یہ ہنگامہ دیکھ رہا تھا۔ میں پریشان تھا کہ کیا ہو گا۔ دفعہ ایک صاحب نمودار ہوئے۔ ریشی کفوں دار قمیض پہنے ہوئے۔ اس کے اوپر ریشی قبا اور شیوخ عرب کے قاعدے کے بموجب ایک بڑھیا چادر اوڑھے ہوئے وہ اندر مکان میں پہنچے۔ والد صاحب سے دریافت کیا۔ کیا واقعہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ جرم یہ ہے کہ مسلمان ہو گیا ہوں۔ اس سردار نے کہا: ہرگز نہیں۔ یہ کچھ نہیں کر سکتے۔ میں آپ کو پناہ دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر یہ سردار باہر آیا اور اعلان کر دیا کہ عمر کو میں نے پناہ دیدی ہے۔“

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جیسے ہی اس سردار نے یہ اعلان کیا وہ تمام مجمع کا ئی کی طرح چھٹ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا: یہ صاحب کون ہیں۔ جواب دیا قبیلہ بنی سہم کا شیخ و رئیس عاص بن وائل سہمی^۱۔

بائیں ہمہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے مسلمانوں کی ڈھارس بندھی اور بقول حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وہ قوت حاصل ہوئی جو پہلے نہیں تھی۔^۲ ہم کھلے بندوں حرم کعبہ میں پہنچے، طواف کیا، نماز پڑھی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مسلمان ہونا اسلام کی فتح تھی۔ ان کی ہجرت نصرت اور ان کی حکومت رحمت۔^۳

شعب ابی طالب میں پناہ

قریش کی طرف سے قومی بایکٹ

پے درپے ناکامیوں نے قریش کو اور زیادہ مشتعل کر دیا۔ کھلم کھلا قتل کرنے میں قبائلی جنگ چھڑ جانے کا خطرہ تھا۔ لیکن خفیہ طور پر قتل کرنے میں پہلے ثبوت کی ضرورت تھی، جس کا مہیا کرنا بنو

ہاشم کے لئے تقریباً ناممکن تھا۔ چنانچہ خفیہ طور پر جان جہاں محمد رسول اللہ ﷺ کی جان لینے کی سازش ہونے لگی۔ خواجہ ابوطالب کے چوکنے دماغ نے اس کو بھانپا۔ انہیں صرف محمد ﷺ کے متعلق ہی نہیں بلکہ خاندان ہاشم کے اور لوگوں کے متعلق بھی خطرہ ہوا۔ مثلاً خواجہ ابوطالب کے بڑے صاحبزادے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اگرچہ ہجرت کر کے حبش چلے گئے تھے لیکن چھوٹے صاحبزادے حضرت علی رضی اللہ عنہ یہیں تھے جو ہر دم آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ خواجہ ابوطالب نے خاندان کے لوگوں سے مشورہ کیا اور یہ طے کیا کہ شہر کے خطرناک ماحول سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر پناہ لی جائے۔

پہاڑیوں کے بیچ میں ایک مقام ”خیف بنی کنانہ“ تھا۔ یہ بنو ہاشم کا موروثی رقبہ تھا۔ طے یہ ہوا کہ وہاں جا کر قیام کیا جائے۔ چنانچہ پورا خاندان (جس کے بہت سے افراد ابھی مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے) اس مقام پر چلا گیا، جس کا دوسرا نام شعب ابی طالب تھا۔ صرف ابولہب اور اس کا گھرانہ مکہ میں رہ گیا جو اپنے خاندان کے خلاف قریش کا سرگرم حامی تھا۔ ابوطالب یہاں پہنچ کر بھی اپنے بھتیجے کی نگرانی راتوں کیا کرتے تھے۔ ان کے سونے کی جگہ بھی بدلتے رہتے تھے۔ قریش کے سرداروں نے اس کا جواب یہ دیا کہ تمام مخالف گروپوں کو ملا کر ان سب کا مقاطعہ کر دیا، جو خواجہ ابوطالب کے ساتھ اس گھائی میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ قریش کے ساتھ قبیلہ بنی کنانہ بھی اس معاہدہ میں شریک ہوا^۱۔ مقاطعہ صرف رشتے ناتے کا نہیں تھا بلکہ کھانے پینے کی چیزیں بھی بند کر دیں۔ ایک عہد نامہ لکھا گیا کہ ان کے ساتھ نہ نکاح بیاہ کیا جائیگا نہ خرید و فروخت۔ اور کوشش کی جائے گی کہ مکہ سے باہر بھی کہیں سے یہ لوگ کچھ نہ خرید سکیں۔ بیوپاریوں کو آمادہ کیا گیا کہ مکہ کے راستوں کی نگرانی رکھیں اور باہر سے آنے والی جنس کو مکہ میں پہنچنے سے پہلے ہی خرید لیا کریں۔ سرداران قریش کے اس معاہدہ پر دستخط ہوئے اور یہ عہد نامہ قومی حفاظت خانہ (خانہ کعبہ کے خزانہ) میں محفوظ کر دیا گیا۔^۲

نبوت کے ساتویں سال۔ محرم کی پہلی تاریخ سے یہ مقاطعہ شروع ہوا تھا۔^۳ جو تقریباً تین سال تک رہا۔ اس عرصہ میں درختوں کے پتے اور جڑیں کھا کر زندگی گزارنی پڑی۔ بچے بلبلاتے تھے مگر ان کو دودھ میسر نہیں آتا تھا۔ بکریاں ختم ہو گئی تھیں اور پے درپے فاقوں سے ماؤں کے دودھ خشک ہو گئے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جیسے

^۱ بخاری شریف ص ۴۳۰

^۲ البدایہ والنہایہ بحوالہ موسیٰ بن عقبہ عن الزہری ص ۸۴ ج ۳

^۳ ابن سعد ص ۱۴۰ ج ۱

^۱ بخاری شریف ص ۵۴۵

^۲ بخاری شریف ص ۵۲۰

^۳ البدایہ والنہایہ ص ۷۹ ج ۳

رفقاء اگرچہ بنو ہاشم نہیں تھے مگر وہ ان کے ساتھ تھے تو مقاطعہ ان سے بھی انتہائی سخت تھا۔^①
حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو سوکھا چڑا ہاتھ آگیا۔ میں نے اس کو پانی سے دھویا پھر آگ پر بھونا اور پانی ملا کر کھایا۔^②
مکہ میں جو رشتہ دار تھے ان میں وہ بھی تھے جن کو اس حالت پر ترس آتا تھا۔ مگر پابندیاں ایسی سخت تھیں کہ کوئی کچھ امداد نہیں کر سکتا تھا۔
اس معاہدہ کی کوئی مدت نہیں تھی۔ اس کی انتہا یہ تھی کہ محمد ﷺ کو قتل کے لئے حوالہ کر دیں۔^③

تین سال پورے ہونے لگے تو یک طرفہ متواتر ظلم و ستم کچھ اہل قربت کے دلوں میں نرمی پیدا کی اور یہ بحث شروع ہوئی کہ معاہدہ کی پابندی کب تک کی جائے۔ لیکن پہلے ان کا بھاری تھا جن کے سینوں میں دلوں کی جگہ پتھر بھرے ہوئے تھے۔ دفعۃً ایک قدرتی حل سامنے آگیا۔
آنحضرت ﷺ نے چچا ابوطالب کو خبر دی کہ کیڑوں نے معاہدہ کے تمام حرف چاٹ لئے ہیں۔ صرف اللہ کا نام باقی رہ گیا ہے۔ خواجہ ابوطالب نے یہ الہامی خبر سنی تو قریش کے سرداروں کے پاس پہنچے کہ آج ہمارا تمہارا معاملہ طے ہے۔ محمد نے یہ خبر دی ہے اگر یہ خبر جھوٹی ہے تو میں تمہارے ساتھ ہوں اور اگر سچی ہے تو جب معاہدہ ہی نہیں رہا تو اس کی پابندی کیسی۔
سرداران قریش نے یہ فیصلہ منظور کیا۔ ان کو یقین تھا کہ جیت ہماری ہوگی۔ مگر جب خزانہ کھول کر دستاویز نکالی گئی تو دیکھا ”الصادق الامین“ کی خبر حرف بحرف صحیح ہے۔ سنگدلوں کے پیشواؤں نے پھر بھی یہ کہہ کر ٹالنا چاہا کہ یہ محمد کا جادو ہے (ﷺ)۔ مگر اب وہ اپنے اصرار میں کامیاب نہ ہو سکے اور مجبوراً تسلیم کرنا پڑا کہ معاہدہ ختم ہو گیا۔ اس قدرتی کرشمہ کے بعد ایسی فضا ہو گئی کہ بنو ہاشم شعب سے نکل کر مکہ میں آ گئے۔^④

ایسے سخت امتحان میں روحانی ترقی کہاں تک ہو سکتی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ چنانچہ اسی زمانہ میں آنحضرت ﷺ کو معراج کا شرف عظیم حاصل ہوا۔ معراج میں بیچ وقتہ نمازیں فرض ہوئیں۔ نماز کے آخر میں اتحیات پڑھی جاتی ہے جس میں نہ صرف آنحضرت ﷺ اور ان بزرگوں پر جو اس امتحان میں کامیاب ہوئے تھے بلکہ ان کے طفیل میں تمام عباد صالحین پر سلام بھیجا جاتا۔ السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین

① سیرۃ ابن اسحاق بحوالہ ازالۃ الخفاء ص ۱۰ ج ۲

② روض الانف بحوالہ سیرۃ النبی ج ۱

③ مولیٰ بن عقبہ بحوالہ زہری۔ البدایہ والنہایہ ص ۸۴ ج ۳

④ البدایہ والنہایہ ص ۹۶ ج ۳

پناہ کی دیواریں منہدم

قریش کا مقاطعہ جو بعثت مبارکہ کے ساتویں سال شروع ہوا تھا تین سال بعد (سہ ۱۰ بعثت مبارکہ میں) ختم ہوا۔ چند ماہ بعد رمضان کا مہینہ آیا۔ اس مہینہ میں چند روز کے فرق سے خواجہ ابوطالب اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہما کی وفات ہو گئی۔ سیدہ خدیجہ وہ خاتون تھیں جو سب سے پہلے ایمان لائیں اور ابوطالب وہ شیخ قبیلہ تھے جو آخر تک ایمان نہیں لائے اور یہ اعلان کرتے ہوئے مرے کہ میں نے اپنے باپ دادا کا مذہب نہیں چھوڑا۔ مگر آنحضرت ﷺ کے دونوں جاں نثار تھے۔
پناہ کی یہ دونوں دیواریں منہدم ہو گئیں، تو اب دشمنوں کا راستہ صاف تھا۔ عقبہ بن ابی معیط اور ابولہب جو بدترین موذی دشمن تھے اور دونوں پڑوسی تھے۔^① ان کا طریقہ یہ تھا کہ راستہ میں کانٹے پکھوادیتے۔ دروازہ میں غلاظت کا بھرا ہوا ٹوکرا ڈالوا دیتے تھے۔ ان کے چھوٹے ان سے بھی آگے تھے۔ وہ کاشانہ نبوی میں گھس کر برتنوں کو خراب کرتے۔ پکتی ہوئی ہڈیا کو اوندھی کر دیتے یا اس میں پلیدی ڈال دیتے تھے۔^②

خدا جانے کتنی مرتبہ ایسا ہوا کہ آنحضرت ﷺ باہر سے تشریف لائے۔ سر مبارک اور کپڑے گرد و غبار اور پلیدی سے آلودہ۔ صاحبزادیاں یہ حالت دیکھ کر دلگیر ہو رہی ہیں، کپڑے دھو رہی ہیں، سر مبارک صاف کر رہی ہیں۔ زبان سے بد دعا دیتی ہیں تو ارشاد ہوتا ہے: (اتبکی یابینۃ فان اللہ مانع اباک) (بیٹی دلگیر نہ ہو اللہ تمہارے باپ کا محافظ ہے)

پناہ کی تلاش:

نبی کا بھروسہ خدا پر ہوتا ہے۔ اور شروع میں جب یہ حکم نازل ہوا تھا کہ ”اپنے قریبی رشتہ داروں کو دعوت اسلام دو“^③ تو ساتھ ہی حضرت حق جل مجدہ نے یہ ہدایت بھی فرمائی تھی۔
”بھروسہ کر خدا قادر و رحیم پر جو تم کو دیکھتا رہتا ہے جب تم کھڑے ہوتے ہو اور نمازیوں کے ساتھ تمہاری نشست و برخاست کو وہ دیکھتا رہتا ہے۔“^④

مگر چونکہ نبی کی زندگی کا ہر ورق امت کے لئے سبق ہوتا ہے اس لئے وہ اللہ تعالیٰ پر مکمل اور کامل بھروسہ کے باوجود ظاہری ذرائع اور اسباب سے دامن نہیں جھٹکتا۔ کیونکہ اگر سلسلہ اسباب کو چھوڑ دیا جائے تو اس عالم اسباب کا نظام ہی درہم برہم ہو جائے۔ بہر حال جب خواجہ ابوطالب کی

① ابن سعد ص ۱۳۳ ج ۱

② البدایہ والنہایہ ص ۱۲۲ ج ۲

③ البیضا

④ سورہ شعراء آیت ۲۱۴

⑤ سورہ شعراء، آیت ۲۱۹ و ۲۱۷

وفات کے بعد قریش کو موقع مل گیا کہ جو کچھ وہ اب تک نہیں کر سکتے تھے اس کو کر گزریں تو آپکو بھی ایسے ذریعہ کی تلاش ہوئی جو قانون عرب کے بموجب آپ کے لئے پناہ بن سکے۔ مگر مٹھی بھر مسلمانوں یا آل ہاشم کے علاوہ مکہ کا بچہ بچہ دشمن تھا اور کوئی ہمدرد بھی تھا تو کس کی ہمت تھی کہ قریش کے مقابلہ میں ڈھال بن سکے۔ لہذا آپ نے مکہ سے باہر نظر دوڑائی۔

طائف کا سفر

طائف:

مکہ سے تقریباً چالیس میل کے فاصلہ پر ایک سرسبز پہاڑ ہے۔ نہایت زرخیز۔ وہاں بڑے بڑے باغات اب بھی ہیں اور اس وقت بھی تھے۔ مکہ کے رئیسوں کی وہاں کوٹھیاں تھیں۔ قبیلہ ثقیف کا وہاں تسلط تھا۔ وہ عرب کا طاقتور قبیلہ مانا جاتا تھا۔ قریش بھی اس کا لوہا مانتے تھے۔ اس قبیلہ سے ان کی رشتہ داریاں بھی تھیں۔

روساء طائف اور ان کے اجواب:

تین بھائی عبد اللیل، مسعود، اور حبیب یہاں کے رئیس اعظم اور قبیلہ ثقیف کے سردار تھے۔ آنحضرت ﷺ کی نظر ان پر پڑی کہ اگر وہ پناہ میں لے لیں تو آپ کو فریضہ تبلیغ کی ادائیگی میں آسانی ہو۔ چنانچہ آپ رمضان گزرنے کے بعد ماہ شوال میں طائف تشریف لے گئے^①۔ دس روز وہاں قیام فرمایا۔^② عوام و خواص اور ہر ایک کے سامنے دعوت اسلام پیش کی۔ روساء اور معززین کے مکانوں پر پہنچ کر گفتگو کی۔^③ ان تینوں بھائیوں سے بھی ملاقات کی۔ اپنا مقصد واضح کیا۔ مگر کسی ایک نے بھی انسانیت سے جواب نہیں دیا۔

ایک نے کہا اگر خدا نے تمہیں رسول بنا کر بھیجا ہے تو وہ خانہ کعبہ کے کپڑے کھسوٹ رہا ہے (اس کی عزت پامال کر رہا ہے)۔

دوسرے نے کہا۔ اللہ کو آپ کے سوا کوئی اور نہیں ملا تھا جس کو رسول بنا کر بھیجتا۔

تیسرے نے کہا: واللہ میں تم سے بات نہیں کروں گا۔ کیونکہ جیسا تمہارا دعویٰ ہے اگر واقعی تم خدا کے رسول ہو تو رسول کی شان یہ نہیں ہے کہ اس سے بحث کی جائے اور اگر تم خدا پر جھوٹ باندھ رہے ہو تو میری شان یہ نہیں ہے کہ میں جھوٹے سے بات کروں۔^④

① یہ سفر غالباً پایادہ ہوا۔ کسی سواری کا کوئی تذکرہ روایتوں میں نہیں ملتا۔ محمد میاں

② ابن سعد ص ۱۴۲ ج ۱

③ ایضاً

④ البدایہ والنہایہ ص ۱۳۵ ج ۳

ان لوگوں کے بھونڈے جواب سن کر آپ نے فرمایا کہ اتنی مہربانی کرو کہ میرے آنے کی خبر کسی کو نہ دو۔ آپ کو خیال ہوا کہ مکہ والوں کو میرے آنے اور ان کے جوابوں کی خبر ہوگی تو وہ اپنی حرکتوں میں اور دلیر ہو جائیں گے۔ مگر ان بد نصیبوں نے اس فرمائش کی تعمیل اس طرح کی کہ طائف کے آوارہ گردوں کو اشارہ کر دیا۔ وہ آپ کے پیچھے پڑ گئے اور گستاخیاں کرنے لگے۔ اور جب کسی طرح ان سے جان چھڑا کر آگے بڑھے تو طائف کے لوگوں نے جو دونوں طرف صف بنائے کھڑے تھے ذات اقدس پر دونوں طرف سے پتھر برسائے شروع کر دیئے۔ سنگ باری سے پتھریاں مجروح ہو گئیں۔ گھٹنے چور ہو گئے، بدن مبارک لہو لہان ہو گیا۔ ایک جاں نثار حضرت زید بن حارثہ ساتھ تھے۔ وہ کبھی آگے کبھی پیچھے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر تنہا کیا کر سکتے تھے۔ پتھروں سے ان کا سر بھی پھٹ گیا۔^① بالآخر کسی طرح آبادی سے باہر نکلے تو بیہوش ہو کر گر پڑے۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے اٹھایا۔ قریب ہی کچھ پانی تھا۔ وہاں لے گئے تاکہ خون کے دھبے دھوویں۔ نعل مبارک اتارنے چاہے تو خون سے اس طرح جم گئے تھے کہ اتارنا مشکل پڑا۔ طبیعت سنبھلی تو قریب کے ایک باغ میں تشریف لے گئے۔ ایک درخت کے سایہ میں تشریف فرما ہوئے اور اپنے معبود کی بارگاہ میں مشغول دعا ہو گئے۔^②

بارگاہ رب العزت میں عجز و انکسار

پتھر برسائے والوں کے حق میں خیر اندیشی اور ہمدردی اہل طائف کی وحشیانہ حرکتوں سے مجروح و مضروب محمد رسول اللہ ﷺ انگوڑ کی ٹہنی کے سایہ میں نڈھال بیٹھے ہیں۔ دل میں درد ہے، زخموں میں ٹیس، مگر پیشانی بارگاہ رب العزت میں جھکی ہوئی ہے اور زبان مبارک مصروف دعا ہے^③ (ترجمہ یہ ہے)

”میرے اللہ میں تجھ ہی سے اپنی بے بسی کا شکوہ کرتا ہوں۔ میں لوگوں میں ذلیل

ہو رہا ہوں۔ اس کا شکوہ تجھ ہی سے کرتا ہوں۔ اے سارے مہربانوں میں سب سے

زیادہ مہربان۔

ان کا رب (نگران و مددگار) تو ہی ہے جو دنیا میں کمزور سمجھے جاتے ہیں، جن کا کوئی

سہارا نہیں ہوتا، جن کے پاس وسیلے اور ذریعے نہیں ہوتے اور ہاں میرا رب تو ہی

① طبقات ابن سعد ص ۲۴۱ ج ۱

② البدایہ والنہایہ ص ۳۲۳ ج ۳

③ غور کیجئے کیا ایسا شخص (معاذ اللہ) کا ذنب یا ساحر یا شاعر ہو سکتا ہے؟

ہے۔ اے میرے پروردگار تو مجھے کن کے حوالے کر رہا ہے، ان کے جو مجھ سے دور ہیں! جو مجھ سے بات بھی کرتے ہیں تو منہ بگاڑ کر، یا ان کو جو میرے دشمن ہیں۔ کیا تو نے میرے معاملہ کا مالک ان کو بنادیا ہے؟

اے اللہ! اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے، خداوند اگر مجھ پر تیرا عتاب نہیں ہے تو مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں ہے۔ خداوند اتیری عافیت کا دامن بہت وسیع ہے، میری سائی تیری عافیت کی گود ہی میں ہے۔

تیرے چہرہ کا وہ نور۔ جس سے اندھیریاں روشنی بن جاتی ہیں جس کے ادنیٰ جلوے سے دنیا اور آخرت کے بگڑے ہوئے کام سنور جاتے ہیں، میں اسی نور کی پناہ لیتا ہوں۔

میں پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ مجھ پر تیرا غضب پڑے یا عتاب نازل ہو۔ تجھ ہی کو منانا ہے اور اس وقت تک منانا ہے جب تک تو راضی نہ ہو۔ اے اللہ مجھ میں نہ طاقت ہے نہ زور ہے۔ جو کچھ طاقت ہے تیرا ہی صدقہ ہے۔ جو کچھ قوت ہے وہ تیری ہی عطا ہے۔ میری کوئی تدبیر کارگر نہیں کار ساز تو ہی ہے بگڑی کو بنانے والا تو ہی ہے۔“

یہاں سے اٹھے دل غمگین تھا، حسرت و افسوس کے دھوئیں سے دم گھٹ رہا تھا۔ سر جھکائے ہوئے تشریف لے جا رہے تھے۔ کچھ دھیان پلٹا تو دیکھا پہاڑی سانسے ہے جس کو قرن الثعالب یا قرن المنازل کہتے ہیں۔ آپ یہاں ٹھکے۔ اوپر نظر اٹھی تو دیکھا ایک بادل آپ پر چھایا ہوا ہے۔ بادل پر نظر ڈالی تو دیکھا حضرت جبرائیل امین جلوہ افروز ہیں اور فرما رہے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے سن لیا، دیکھ لیا، تم نے جو کچھ کہا جو لوگوں نے جواب دیا، جس طرح تم کو واپس کیا اور جو سلوک تمہارے ساتھ کیا وہ بھی دیکھ لیا۔ اب یہ پہاڑوں کے فرشتے (ملک الجبال) موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھیجا ہے۔ اب حکم کیجئے یہ تعمیل کریجئے۔

پھر ملک الجبال سانسے آیا۔ سلام عرض کیا پھر کہا:

یا محمد تمہاری قوم کی تمام باتیں خدا نے سنیں، دیکھیں، اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے آپ جو چاہیں حکم کریں میں تعمیل کروں گا۔ آپ حکم دیں مکہ کے دونوں طرف جو پہاڑ ہیں ان کو ملا کر ان تمام گستاخے ادب لوگوں کو پیس ڈالوں۔

ایک آزمائش وہ تھی کہ اہل طائف ہر طرف سے پتھر برسارہے تھے۔ دوسری آزمائش یہ ہے کہ جبرائیل امین اور ملک الجبال ان سب کو پیس ڈالنے کی فرمائش کے منتظر ہیں۔ وہ امتحان تھا

صبر و ضبط، تحمل اور استقلال کا۔ یہ امتحان ہے وسعت ظرف، فراخی حوصلہ اور دعویٰ رحم و کرم کا۔ جس خدا نے آپ کو اس امتحان میں ثابت قدم رکھا۔ اس نے آپ کو اس امتحان میں بھی کامیاب فرمایا۔

فرشتے کی درخواست سن کر دل مبارک بیتاب ہو گیا۔ یہ خدا کی مخلوق جو نبی کی کھیتی ہے برباد کر دی جائے؟
آپ نے فرشتوں کو جواب دیا:

ارجوان یخربہم اللہ من اصلاہم من یعبد اللہ ولا یشرك بہ شیناً*
اگر یہ بدنصیب راہ راست پر نہ آئیں تو ان کی نسل سے میں ناامید نہیں ہوں۔ مجھے توقع ہے کہ ان کی نسل میں وہ ہوں گے جو خدا واحد کی عبادت کریں گے اور شرک سے باز رہیں گے۔^①

باغ کے مالک اور ان کا غلام:

یہ باغ عتبہ^② اور شیبہ بن ربیعہ کا تھا جو مکہ کے مشہور رئیس تھے۔ یہ دونوں بھائی باغ میں موجود تھے۔ انہیں غیرت آئی کہ شہر کے ایک شخص کے ساتھ طائف والوں نے یہ سلوک کیا۔ مگر یہ ہمت پھر بھی نہیں ہوئی کہ آنحضرت ﷺ سے آکر بات کرتے۔ انگوروں کے خوشے تھالی میں رکھ کر غلام کو دیئے کہ وہ ان مظلوم مہمانوں کے پاس لیجائے جو سایہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

غلام کا نام عداس تھا، مذہب اعیسائی تھا۔ وہ آپ کے پاس انگور لے کر آیا۔ آپ نے انگوروں کی طرف ہاتھ بڑھایا تو زبان مبارک پر آیا: بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

عداس الرحمن الرحیم سن کر چونکا، کہنے لگا: یہاں کے آدمی تو الرحمن الرحیم نہیں کہتے۔^③
آپ نے فرمایا: تم کہاں کے ہو۔ عداس نے جواب دیا: میرا آبائی وطن ”نینوی“ تھا۔
آنحضرت ﷺ: وہی نینوی جو میرے بھائی یونس (علیہ السلام) کا وطن تھا۔

* بخاری شریف ص ۳۵۸ مسلم شریف ص ۱۰۹ ج ۱

① حضرت نوح علیہ السلام کو اس کی توقع نہیں تھی آپ نے بارگاہ رب العزت میں یہ عرض کیا تھا انک ان تذہم یصلوا عبادک ولا یلدوا الا فاجراً کھار آ۔ (سورہ نوح-۲) ”اگر ان کو مہلت رہی تو یہ بدگان خدا کو گمراہ ہی کریں گے۔ اور صرف انہیں کو جنم دینگے جو بدکار اور بدترین کافر ہوں گے“

② یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نانا، حضرت ابوسفیان کے خسر تھے، غزوہ بدر میں سب سے پہلے یہ دونوں بھائی اور عتبہ کا لڑکا ولید بن عتبہ ہی حضرت حمزہ، حضرت علی اور حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہم کے ہاتھ سے مارے گئے تھے۔ تفصیل سلسلہ غزوات میں ملاحظہ فرمائیے۔

③ ملاحظہ فرمائے سورہ قان کی آیت ۶۰ جب ان مشرکین مکہ سے کہا جاتا ہے کہ سجدہ کرو رحمن کو تو وہ (انجمن بن کر کہتے ہیں) رحمن کون؟

عداس: آپ حضرت یونس علیہ السلام کو کیسے جانے دیں۔
 آنحضرت ﷺ نے جواب دیا: میرے اور ان کے درمیان نبوت کا رشتہ ہے وہ بھی اللہ کے نبی تھے۔ میں بھی اسی خدا کا بھیجا ہوا نبی ہوں۔
 عداس یہ سن کر تڑپ گیا۔ آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پیر چومنے لگا۔ عتبہ اور شیبہ نے دور سے دیکھا تو کہنے لگے اس کو تو محمد نے بگاڑ دیا۔
 جب عداس واپس پہنچا تو دونوں بھائیوں نے غلام سے پوچھا: تم یہ کیا حرکت کر رہے تھے۔
 عداس: یہ نبی ہیں ان سے بہتر کوئی آدمی نہیں۔ انہوں نے مجھے دو باتیں بتائیں جو نبی ہی بتا سکتا ہے۔
 دونوں رئیس: اس کی باتوں میں نہ آؤ۔ اپنے مذہب پر رہو۔ تمہارا مذہب اس کے دین سے بہت اچھا ہے۔^①

مطعم بن عدی کی قدر دانی:

طائف میں یہ سب کچھ ہوا۔ مگر وہ سوال پھر بھی رہ گیا، جس کے لئے آپ نے یہ سفر اختیار کیا تھا۔ آپ نے مکہ پہنچنے سے پہلے یکے بعد دیگرے روساء مکہ اخنس بن شریق اور سہیل بن عمرو کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ حمایت کا وعدہ کر لیں مگر دونوں نے انکار کر دیا کہ وہ قریش کے حلیف ہیں۔ وہ قریش کے خلاف کسی کو پناہ نہیں دے سکتے۔ پھر آپ نے اس کے پاس پیغام بھیجا جس کے لئے یہ شرف مقدر تھا۔
 یہ رئیس مکہ مطعم بن عدی تھا۔ اس نے حمایت کا وعدہ بھی کیا اور یہ فرمائش بھی کی کہ آپ اس کے یہاں تشریف لائیں۔
 آنحضرت ﷺ مطعم کے یہاں تشریف لے گئے۔ رات ان کے یہاں گزاری۔ صبح ہوئی تو مطعم نے خود ہتھیار سجائے۔ اس کے چھ سات لڑکے تھے سب کو مسلح کیا۔ پھر آنحضرت ﷺ کو لے کر چلا۔ حرم کعبہ میں پہنچا۔ آنحضرت ﷺ سے کہا آپ طواف کریں۔ آنحضرت ﷺ نے طواف کیا۔ مطعم اور بیٹے حفاظت کرتے رہے۔ جب طواف سے فارغ ہوئے تو مطعم نے اعلان کر دیا کہ ”محمد ﷺ میری پناہ میں ہیں۔“
 ابوسفیان، مطعم بن عدی کے پاس آیا دریافت کیا: تم نے محمد کو اپنی پناہ میں لیا ہے یا ان کا مذہب قبول کر لیا ہے۔ مطعم نے جواب دیا میں نے مذہب نہیں بدلا صرف محمد کو پناہ دی ہے۔ ابوسفیان نے کہا: تب آپ کے اعلان کا احترام کیا جائے گا۔^②

① البدایہ والنہایہ ص ۱۳۶ ج ۳

② البدایہ والنہایہ ص ۱۳۷ ج ۳

یثرب۔ مدینۃ النبی

(۱)

مکہ معظمہ سے شمال کی جانب تقریباً دو سو میل (سواتین سو کلومیٹر) کے فاصلہ پر ایک زرخیز علاقہ میں آبادیوں کا ایک سلسلہ ہے۔ ان میں سب سے بڑی آبادی کا نام یثرب ہے۔ اس کے دو طرف دو سنگلاخ ہیں ان کو لابتین کہا جاتا ہے اور حرتین بھی کہلاتے ہیں۔

جانب مشرق میں تقریباً آٹھ میل تک چھوٹی چھوٹی آبادیوں کا سلسلہ چلا گیا ہے ان کو عوالی کہا جاتا ہے۔ موضع قبا اسی طرف ہے دوسری جانب بھی اسی طرح کی آبادیاں ہیں۔ ان کو اسافل کہا جاتا ہے۔

یثرب کے نشیبی حصہ میں برسات میں پانی بھر جاتا ہے جس کی وجہ سے یہاں کی آب و ہوا مرطوب رہتی ہے۔ یہاں کا بخار ”حمی یثرب“ پورے عرب میں مشہور ہے۔ یثرب نام میں آب و ہوا کی خرابی کو بھی دخل ہے۔ (کیونکہ ثرب جو یثرب کا ماخذ ہے۔ ملامت کرنے کے معنی میں آتا ہے) اس پورے علاقے میں کاشت ہوتی ہے مگر خاص پیداوار کھجور ہے۔ کھجوروں کے بڑے بڑے باغات ہیں۔ یہاں کے کھجور دور دور جاتے ہیں۔

وكانت يثرب امرقوى المدينة وهي ما بين طرف قنات الى طرف الجوف وما بين المال الذي يقال له البنى الى زباله (وقاء الوفاء ص ۱)

آنحضرت ﷺ نے یہاں قیام فرمایا تو اس کا نام مدینۃ النبی ہو گیا (ﷺ)۔ کثرت استعمال نے مدینۃ النبی کو مختصر کر کے صرف مدینہ کر دیا۔ مگر عاشقان رسول نے محبوب رب العالمین ﷺ کے شہر کے بہت سے نام رکھ ڈالے۔ طاہر، طیب، محبوبہ، مبارکہ، عاصمہ، مرزوقہ، قاصمہ، اکالہ البلدان۔ غرض اس طرح نوے (۹۰) سے زیادہ نام ہو گئے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: وقاء الوفاء ص ۱

لاہ اور حرہ کے معنی تقریباً ایک ہی ہیں یعنی ایسا سنگلاخ جس کے پتھر اس طرح کے کالے ہوں جیسے کوئی پرانا پتھر مسلسل کالی چھڑنے سے کالا ہو جاتا ہے۔ (مجمع البحار و قاموس) یہ کئی میل تک چلے گئے ہیں۔ ان پر نہ کاشت ہو سکتی ہے نہ ان پر آبادی ہے۔ فوج بھی ان پر نہیں گزر سکتی۔ یہ دو طرف حفاظت کی قدرتی دیواریں ہیں۔

مجمع البحار و مجمع البلدان
مجمع البلدان

(۲)

کم و بیش ایک ہزار سال پہلے یمن سے اجڑ کر دو بھائی سرزمین حجاز میں داخل ہوئے اور یہاں آکر آباد ہو گئے۔ ان میں سے ایک کا نام ”اوس“ تھا دوسرے کا نام ”خزرج“ باپ کا نام حارثہ ماں کا نام قیلہ۔ اس لئے اوس اور خزرج کی اولاد کو بنو قیلہ بھی کہتے ہیں۔

اب (یعنی آنحضرت ﷺ کے دور مسعود میں) اوس اور خزرج دو قبیلے ہیں جن کی بہت سی شاخیں (بطن) الگ الگ نام سے مشہور ہیں (بنو نجار، بنو ساعدہ، بنو عمرو بن عوف وغیرہ) اس طرح یہ دو قبیلے بہت سے بطنوں میں بٹ گئے۔

یثرب کی آبادی تقریباً چھ ہزار ہے۔ اور اتنی ہی آبادی عوالی اور اسافل کی ہے۔ ان سب کا ایک ”دیوتا“ ہے۔ ”المناة الطاغیہ“۔

مشلل، مکہ اور یثرب کے بیچ میں ایک مقام ہے وہاں اس کا مندر ہے۔ یہ سب المناة الطاغیہ کے بھگت ہیں۔ مگر اصل تیر تھ کعبہ ہے۔ وہاں ہر سال حج کو جاتے ہیں اور ان بتوں کی بھی پوجا کرتے ہیں۔ جو قریش نے کعبہ میں رکھ رکھے ہیں۔ قریش ان کے مہنت ہیں اور یہ سب ان کے ہم مذہب اور ان کے تابع ہیں۔ ان سب کی نسل بھی ایک ہی ہے کیونکہ یہ بھی حضرت اسماعیل اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا مورث اعلیٰ مانتے ہیں اور اس بنا پر رشتہ داریاں بھی ہیں۔ یہ سب کاشکار اور زمیندار ہیں۔ عموماً ناخواندہ، جاہل، کسی وقت یہ اس پورے علاقہ کے فرماں روا تھے۔ اس زمانہ کے قلعوں کے اونچے اونچے آثار (کھنڈر) اس وقت بھی موجود ہیں ان کو ”اطام یثرب“

سیرۃ ابن ہشام ص ۱۷

مجمع البلدان و فتح الباری وغیرہ

ہجرت کے چوتھے سال غزوہ احزاب میں تین ہزار مسلمانوں نے شرکت کی جبکہ ان میں کئی سو مہاجرین بھی شامل تھے۔ اس سے یہاں کی آبادی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

قدیدہ کے قریب، والقدیدہ اسم موضع قریب بمکہ مجمع البلدان

بخاری شریف ص ۲۲۲ و ص ۲۳۱ وغیرہ

احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ بخاری شریف ص ۳۹۷ باب نسبت البین الی اسماعیل علیہ السلام اور قریش سے ان کی رشتہ داری تھی۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں اگرچہ ماہرین انساب کا خیال یہ بھی ہے کہ قحطان جو اہل یمن کا مورث اعلیٰ ہے وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے نہیں ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اوس اور خزرج بنو اسماعیل یعنی عرب مستعربہ نہیں تھے بلکہ عرب عاربہ تھے۔

مورخین نے بیان کیا کہ یہ قلعے زیادہ تر یہود نے بنائے تھے جب وہ جمہا اس علاقہ میں صاحب اقتدار تھے۔ اوس اور خزرج یہودیوں کے دور اقتدار میں یہاں آئے۔ پہلے یہ صرف دو بھائی تھے پھر ان کی اولاد نے ترقی کی۔ یہود کو حسد ہوا۔ انہوں نے ان کو ختم کر دینا چاہا مگر نتیجہ انکار ملا۔ مقابلہ ہوا تو یہود کا اقتدار ختم ہو گیا اور اوس و خزرج کے قبائل اس علاقہ کے حکمران بن گئے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو وقاء الوفاء ص ۱۲۵ تا ص ۱۳۲ ج ۱ و مجمع البلدان (کچھ تفصیل بعد کے حاشیہ میں ملاحظہ فرمائے۔)

کہا جاتا ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو اس کا نام مدینہ النبی رکھ دیا گیا۔ پھر کثرت استعمال کے باعث صرف مدینہ (ادام اللہ شرفها) کہا جانے لگا۔

(۳)

اس علاقہ میں دوسری نسل ۱ بنو اسرائیل ۲ کی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماننے ہیں۔ اور

۱ یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بھائی حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کے فرزند رشید حضرت یعقوب علیہ السلام تھے ان کو اسرائیل بھی کہا جاتا تھا۔ ان کی اولاد کو بنو اسرائیل کہتے ہیں۔ حضرت اسحاق علیہ السلام میں رہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر میں اقتدار حاصل ہوا تھا تو حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے لڑکے مصر چلے گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک ان کی تعداد کئی لاکھ ہو گئی تھی لیکن اب اقتدار کے بجائے طوق غلامی ان کی گردن میں تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو لے کر مصر نکلے۔ اول یہ پوری قوم تیہ میں رہی۔ پھر ان کا مرکز شام ہو گیا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو عہد زریں اور مقدمہ سیرۃ مبارکہ۔

۲ مدینہ میں بنو اسرائیل کی آمد اور ان کا اقتدار: ایک روایت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے فرعون کے مقابلہ میں کامیابی بخشی اور تیہ میں جا کر مقیم ہوئے تو انہوں نے دوسرے علاقوں میں مجاہدین بھیجے شروع کئے جو بزور شمشیر اپنے دین کی اشاعت کرتے تھے اور جو ان کے مذہب میں داخل نہ ہوتا اس کو قتل کر دیتے تھے۔ ان مجاہدین کی ایک فوج یثرب بھیجی۔ ایک روایت یہ ہے کہ اہل روم کے حملہ کے وقت کچھ لوگ شام سے یہاں چلے آئے۔ ایک روایت یہ ہے کہ بخت نصر نے جب یرودھم کو تباہ کیا تب یہ لوگ یثرب آئے۔ بہر حال روایتیں اگرچہ متعدد ہیں مگر علماء تاریخ نے ان کو متضاد قرار نہیں دیا کیونکہ ان سب روایتوں کا حاصل یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے جانشین کے زمانہ سے ان کی آمد شروع ہوئی اس کے بعد مختلف اوقات میں آمد ہوتی رہی۔ ان سیاسی محرکات اور اسباب کے علاوہ ایک مذہبی محرک بھی بیان کیا گیا ہے کہ کچھ باخدا علماء یہود کو جب توریت کے اشارات سے معلوم ہوا کہ نبی آخر الزماں کا ظہور مدینہ میں ہو گا تو وہ یثرب منتقل ہو گئے کہ اگر ان کو نبی آخر الزماں کی زیارت نہ ہو سکے تو کم از کم ان کی اولاد اس سعادت و شرف سے مشرف ہو سکے گی۔ آنحضرت ﷺ کے ظہور سے پہلے بنو قریظہ یہی کہا کرتے تھے کہ ان کے بزرگ انہیں پیش گوئیوں کی بنا پر یہاں آکر قیام پذیر ہوئے تھے۔

عروج: بنو اسرائیل (یہود) نے یہاں کافی ترقی کی۔ اس پورے علاقہ پر وہ چھا گئے۔ حکومت بھی تھی اور دولت بھی اور نسلیں بڑھیں تو بیس اکیس قبیلے ان کے ہو گئے اور شام تک انہیں کی بستیوں کی کثرت ہو گئی۔ وادی قری، تہام خیر ان کے اہم اور خاص مرکز تھے۔ اس اور خزرج یہاں آباد ہوئے تو ان سے معاہدہ کر کے اور ان کے حلیف بن کر آباد ہوئے۔ زوال: یہودیوں میں ایک راجہ (ملک) ہوا جس کا نام فطیون تھا یہ نہایت عیاش اور بدکار تھا۔ اس نے یہ حکم دیا کہ ہر ایک دلہن اس کے عشرت کدہ میں خراج عیش دے۔ یہود نے اس کو گوارا کر لیا مگر جب اس اور خزرج کی نوبت آئی تو انہوں نے سر تابی کی۔ اس زمانہ میں قبیلہ خزرج کا ایک سردار مالک بن جحان تھا اس کی بہن کی شادی ہوئی تو وہ عین شادی کے دن گھر سے نکلی اور اپنے بھائی مالک بن جحان کے سامنے سے بے پردہ گزری۔ مالک کو غیرت آئی وہ اٹھ کر گھر میں آیا اور بہن کو سخت ملامت کی۔ بہن نے کہا ہاں لیکن کل کو جو کچھ ہو گا وہ اس سے بھی سخت ہو گا۔ دوسرے دن جب حسب دستور مالک کی بہن دلہن بن کر فطیون کی خلوت گاہ میں گئی تو مالک بھی زنانہ کپڑے پہن کر سہیلیوں کے ساتھ اندر چلا گیا اور فطیون کو قتل کر کے شام بھاگ گیا۔ یہاں غسانیوں کی حکومت تھی اور ابو جہلہ حمران تھا اس کو یہ

یہودی کہلاتے ہیں۔ یثرب (مدینہ) کے اطراف میں تین تین چار چار میل کے فاصلہ پر ان کے قبیلے آباد ہیں۔ ان میں سے مشہور یہ تین ہیں: بنو قریظہ، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ یہ سب خوش حال ہیں۔ ان کی آبادیاں قلعہ نما ہیں۔ شاداب باغات میں گھری ہوئیں ہر طرح سے محفوظ۔ باغات کے علاوہ ان کے تجارتی سلسلے بھی ہیں اور ان کا سودی کاروبار بھی بہت پھیلا ہوا ہے۔ اپنی اپنی حیثیت میں یہ سب قبیلے آزاد ہیں۔ ان کی مجموعی آبادی بھی یثرب کی آبادی کے لگ بھگ ہے۔ ان کے یہاں تعلیم کا انتظام بھی ہے۔ ایک تعلیمی ادارہ ”بیت المدارس“ کے نام سے قائم ہے جس میں توریت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یثرب کے عام باشندے ان کی تعلیمی برتری سے متاثر ہیں۔ یہاں تک کہ بعض خوش عقیدہ اپنے ہونہار بچوں کو یہود کے حوالے کر دیتے ہیں کہ علمی شانستگی حاصل کر سکیں۔

اوس اور خزرج کبھی بھائی برادر کی طرح رہے ہونگے، مگر اب وہ جنگجو حریف ہیں۔ اور تقریباً سو سو برس سے برابر لڑائی کا سلسلہ جاری ہے۔ حال ہی میں نہایت خونریز لڑائی ہوئی جو ”حرب بعاث“ کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ میں دونوں قبیلوں کے بڑے بڑے سردار کام آچکے ہیں۔ یہودی ان لڑائیوں میں شریک نہیں ہوتے البتہ ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکاتے رہتے ہیں۔ پھر ان کی بد حالی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سودی قرض دیکر ان کی بہت سی جائیدادیں قبضہ میں لے چکے ہیں۔

یثرب کے دولیڈر:

اوس اور خزرج کے بڑے لوگوں میں اب صرف دو باقی رہ گئے تھے۔ عبد اللہ بن ابی بن سلول۔ قبیلہ خزرج کا رئیس اور لیڈر اور ابو عامر بن صیفی بن نعمان۔ قبیلہ اوس کا رئیس و امیر۔ ۱

یثرب میں آنے والے نبی کا چرچا

توریت کی پیش گوئیوں کے موجب یہودی ایک آنے والے نبی کے منتظر تھے وہ اس کی علامتیں بھی بیان کیا کرتے تھے۔ ان یہودیوں میں کچھ خاندان وہ بھی تھے جن کے مورث اور اجداد اسی امید پر یہاں آکر آباد ہوئے تھے کہ نبی آخر الزماں کا ظہور اس سر زمین میں ہو گا۔ مگر وہ

تکلیف دہ حالات معلوم ہوئے تو وہ لنگر لیکر آیا اور اوس اور خزرج کو انعامات دیئے اور ایک عام دعوت کر کے روماء یہود کو مدعو کیا اور ان کو قتل کر دیا۔ اب یہود کا زور ٹوٹ گیا۔ اوس اور خزرج نے قوت حاصل کر لی۔ مگر پھر ان دونوں قبیلوں میں جنگ شروع ہوئی جو سو سال سے زیادہ رہی۔ یہود نے ان کو لڑانے میں بھی اپنی تمام چال بازی ختم کر دیں اور ان کو سودی رقم دیکر بنگا بھی کر دیا۔ یہی حالت تھی جب آنحضرت ﷺ کا ظہور ہوا (بمقام البلد ان ابن ہشام) ۱ وفاء الوفاء ص ۱۵۵ اج ۱

تعصب، گروہ پرستی اور صرف اپنے گروہ کو سب سے اونچا اور خدا کا محبوب سمجھنے کا غلط عقیدہ جو ان کے ذہنوں میں رچا ہوا تھا اور ایک جذبہ بن گیا تھا اس نے اس خوش آئند تصور کو اور اس تمنا کو یقین کا درجہ دے دیا تھا کہ آنے والا نبی انہیں کے گروہ میں سے ہو گا۔^۱ اس سلسلہ میں بہت سی روایتیں بھی گھڑی تھیں۔^۲ وہ سمجھتے تھے کہ جیسے ہی وہ نبی ظاہر ہو گا ان کا اقبال نقطہ عروج پر پہنچ جائے گا۔ چنانچہ مشرکین یعنی اوس اور خزرج سے کسی بات پر بحث ہوتی یا کسی موقع پر مشرکین کے سامنے زچ ہونا پڑتا تو یہی روایتیں اور پیش گوئیاں بیان کر کے ان کو مرعوب کیا کرتے تھے کہ ”مستقبل کی سر بلندی ہمارے لئے ہے۔“ مشرکین اگرچہ ان کے ہم عقیدہ نہیں تھے مگر چونکہ جاہل تھے وہ متاثر ہو جاتے تھے۔ اس طرح ان کے کان آنے والے نبی کے تذکرہ سے نا آشنا نہیں رہے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہی آشنائی ان کے لئے مشعل راہ بنی۔^۳

یثرب میں آنحضرت ﷺ کا ذکر خیر

اوس اور خزرج کی طویل جنگ نے ایک فریق کو اتنا دبایا کہ اس نے کسی بڑے طاقتور قبیلہ کی مدد حاصل کرنی ضروری سمجھی۔ چنانچہ اس فریق کا ایک وفد زمانہ حج میں مکہ پہنچا اور اس نے قریش کو اپنا مددگار اور حلیف بنانا چاہا۔ یہ وفد اس مقصد میں تو کامیاب نہیں ہوا مگر یہ سعادت اس کو ضرور حاصل ہو گئی کہ اس کے ایک رکن (ایاس بن معاذ) داعی حق کی صداقت کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ باقاعدہ مسلمان تو نہیں ہوئے مگر دعوت حق کے اثر سے اپنا دامن جھٹک بھی نہیں سکے۔ یہ وفد واپس یثرب پہنچا تو روئید اس سفر میں لامحالہ اس دعوت کا تذکرہ بھی شامل تھا۔ ایاس اگرچہ آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے پہلے انتقال کر گئے، مگر ان کے خاندان والوں کا یقین یہ تھا کہ ان کی وفات اسلام پر ہوئی ہے کیونکہ وفات کے وقت ان کی زبان پر لا الہ الا اللہ اور سبحان اللہ الحمد للہ اور اللہ اکبر کے کلمات جاری تھے۔^۴

^۱ ان کی یہ دلیل ایک حد تک معقول تھی کہ صدہا سال سے نبوت انہیں کے گروہ میں چلی آرہی ہے یہاں تک کہ جتنے انبیاء علیہم السلام کے نام ان کو معلوم تھے وہ سب اسرائیلی تھے۔ قرآن حکیم نے پوری اہمیت کے ساتھ یہود کے قومی جرائم شمار کر کے اس دلیل کی تردید کی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ یہ درست ہے کہ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے نوع انسان کے تمام طبقات پر فضیلت دی تھی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے ان قومی جرائم نے ان کو اس فضیلت سے محروم کر دیا۔ سورہ نساء آیات ۴۳، ۴۶، ۴۷، ۵۱، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱

بیعت عقبہ اولیٰ

وعدہ پورا کرنے کی بہترین مثال ان چھ حضرات نے اپنے عمل سے پیش کی جو گزشتہ سال دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ باہمی نفرت اور بغض و عداوت کے دھکتے ہوئے ماحول میں ان حضرات نے ایسے سلیقہ سے کام کیا کہ معرکہ بعاث کے اشتعال انگیز تذکرہ کے بجائے ہر ایک گھر میں اسلام اور پیغمبر اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ اور جب حج کا زمانہ آیا تو بارہ افراد نے اپنے آپ کو محمد رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا۔ مگر یہ پیشی نہایت رازداری کے ساتھ ہوئی۔

مکہ معظمہ سے چند میل کے فاصلہ پر منیٰ کا میدان ہے جہاں ۱۰ ذی الحجہ ۱۳ھ میں زائرین بیت اللہ کا اجتماع ہوا کرتا ہے۔ اس وسیع میدان میں وہ جگہ بھی ہے جس کو عقبہ کہتے ہیں، جو شہر مکہ سے تقریباً دو میل کے فاصلہ پر ہے ① اسی کے قریب ایک گھاٹی میں یہ حضرات جمع ہوتے ہیں۔ چاندنی رات ہے، نور کی چادر پھیلی ہوئی ہے۔ اسی نورانی فضا میں محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لاتے ہیں جو سراسر نور ہیں۔ آپ خدائے واحد کی پرستش کی دعوت دیتے ہیں سننے والوں کی دلوں کی گہرائیوں سے آمنا کی صدا بلند ہوتی ہے۔ پھر ان سب سے چھ باتوں کا عہد لیا جاتا ہے:

۱۔ ہم صرف خدائے واحد کی عبادت کیا کریں گے۔ کسی کو اس کا شریک نہیں مانیں گے۔

۲۔ چوری نہیں کریں گے۔

۳۔ زنا نہیں کریں گے۔

۴۔ اولاد کو قتل نہیں کریں گے۔

۵۔ کسی پر بہتان نہیں باندھیں گے (جھوٹی تہمت نہیں لگائیں گے)۔

۶۔ آپ جس اچھی بات کا حکم فرمائیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے۔ (نافرمانی نہیں کریں گے) ②

یہ معاہدہ عمل کرنے کے لئے تھا۔ عمل کرنے کے لئے معلم اور مربی کی ضرورت تھی۔ ان لوگوں نے معلم کی درخواست کی۔ آنحضرت ﷺ نے ایک باعمل معلم کو ان کے ساتھ کر دیا۔ یہ سیدنا حضرت مصعب بن عمیر ہیں۔ دولت مند گھرانے کے چشم و چراغ۔ ناز و نعم میں پلے۔ جب گھوڑے پر سوار ہو کر چلا کرتے تھے تو آگے پیچھے ہٹو پچو کہتے ہوئے غلام دوڑا کرتے تھے۔ بدن پر سیکڑوں درہم سے کم کا لباس نہیں ہوتا تھا، جو طرح طرح کے عطر سے معطر ہوتا تھا مگر جب دولت اسلام سے مالا مال ہوئے تو دولت دنیا ان کی نظر میں گرد بن گئی۔ روح نے وہ لذت پائی کہ ساز و سامان بار گننے لگا۔ اب معلم خیر کا لباس ایک کبیل تھا۔

① بم المدا

② بخاری شریف ص ۵۵۰

یہ یثرب کے چھ یا آٹھ آدمی تھے جو حج کے لئے آئے تھے۔ اور اب مراسم حج کے بموجب ایک جگہ سروں کے بال منڈوا رہے تھے۔ آنحضرت ﷺ وہاں پہنچے، کچھ موقع مناسب معلوم ہوا آپ نے اپنی دعوت پیش کرنی شروع کر دی۔ کلام اللہ شریف کی آیتیں تلاوت کیں، سننے والوں کی پاک رو میں متوجہ ہوئیں، ان کے آپس میں کچھ باتیں اشاروں میں ہوئیں:

”یہودی جس نبی کی خبر دیا کرتے تھے معلوم ہوتا ہے یہ وہی نبی ہیں۔ بیشک یہ کلام سچا اور یہ دعوت برحق ہے۔ اب ہمیں ہمت کر کے پہل کر دینی چاہئے کہیں ایسا نہ ہو یہودی سبقت کر جائیں اور اقبال مندی کا جو تاج ہمارے سروں کو بوسہ دینے کو تیار ہے، وہ یہودیوں کو میسر آجائے“

اس طرح کی کچھ باتیں ہوئیں۔ پھر سب نے اپنی گردنیں قبول دعوت کے لئے خم کر دیں۔ ان حضرات نے مکہ شہادت پڑھ لیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: میری زندگی کا مقصد اسی دعوت کی اشاعت ہے۔ مکہ کی زمین میرے لئے تنگ ہو گئی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے میں آپ کے ساتھ یثرب چلوں اور یثرب کو دعوت و تبلیغ کا مرکز بنالوں؟ ان حضرات نے عرض کیا: ہم بسر و چشم تیار ہیں، مگر فی الحال آپ کا تشریف لے چلنا مصلحت کے خلاف ہے۔ ہمارے یہاں ابھی ایک سال پہلے بعاث کا نہایت سخت معرکہ ہو چکا ہے، جس کے زخم اب تک ہرے ہیں۔ جذبات براہیختہ ہیں اور دماغوں میں نفرت بھری ہوئی ہے۔ اس حالت میں آپ کی دعوت صدا بصرہا ہوگی۔ کیونکہ اس وقت دونوں کا جمع ہونا ناممکن ہے۔ آپ کسی بھی فریق سے رابطہ پیدا کریں گے تو دوسرا فریق دشمن بن جائے گا۔ آپ ہمیں موقع دیں۔ ہم یثرب پہنچ کر جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کریں۔ خدا کرے کوئی اصلاح کی صورت پیدا ہو اور فضا ہموار ہو جائے تو آپ کا تشریف لے چلنا مفید ہو گا۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ سال اسی مقام پر حاضر ہوں گے اور امید ہے کہ اس وقت تک ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ آپ کو یثرب آنے کی دعوت دے سکیں۔

بات معقول اور ہمدردانہ تھی، آنحضرت ﷺ نے منظور فرمائی۔ ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

(۱) رافع بن مالک (۲) عبادہ بن الصامت (۳) ابو عبد الرحمن یزید بن ثعلبہ (۴) عویم بن ساعدہ (۵) عوف بن حارث بن عفرہ (۶) قطبہ بن عامر بن حدیدہ (۷) عتبہ بن عامر بن نابی (۸) جابر بن عبد اللہ بن رناب۔ (رحمۃ اللہ علیہم)

① (الف) ابن سعد نے چند روایتیں پیش کی ہیں اور ہر روایت میں کچھ نام شمار کرائے ہیں ہم نے کمر نام حذف کر دیے ہیں۔ ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد ص ۱۴۵ تا ص ۱۴۷ ج ۱ (الجزء الاول من کتاب الطبقات فی السیرۃ الشریفہ النبویہ القسم الاول) (ب) ان حضرات میں سے دو بزرگوں کا تعلق اوس سے ہے: ابو عبد الرحمن، یزید بن ثعلبہ اور عویم بن ساعدہ.... (رحمۃ اللہ علیہم) اور باقی چھ حضرات خزرجی ہیں۔ (ج) چھ یا آٹھ کی تعداد میں اگرچہ اختلاف ہے مگر اس پر اتفاق ہے کہ ان سب حضرات نے جو اس وقت بیعت ہوئے تھے راہ خدا میں قتل ہو کر درجہ شہادت حاصل کیا۔ (الاستیعاب ص ۱۷۹ تذکرہ رافع بن مالک)

بیعت عقبہ دوم

پچھلے سال چھ مسلمانوں کی کوشش سے یثرب کے گھر گھر میں اسلام کا چرچا ہونے لگا تھا۔ اس سال حضرت مصعب بن عمیر مرقی رضی اللہ عنہ کی رہنمائی میں بارہ حضرات نے کوشش کی تو نہ صرف یثرب بلکہ یثرب سے باہر موضع قبا تک اسلام پہنچ گیا۔

اسلام کیا تھا؟ صرف کلمہ توحید پڑھ لینا؟ بیشک قانونی اور فقہی نقطہ نظر سے کسی کو مسلمان قرار دینے کے لئے یہی کافی ہے۔ لیکن سیدنا مصعب بن عمیر جس کا درس دے رہے تھے وہ قانونی نمائش سے بہت بلند تھا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا مکتب، مکتب عشق تھا۔ یہاں ایثار اور فدائیت کا درس دیا جاتا تھا۔ مثلاً طریقت کے یہاں درجہ فنا آخری منزل ہے یہ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کی خانقاہ کا پہلا سبق ہوتا تھا۔

قرآن حکیم نے مومن کی شان یہ بتائی ہے: وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ (البقرہ-۱۶۵) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنَ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ^۱
حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کی دعوت کی خصوصیت یہ تھی کہ جیسے ہی زبان پر کلمہ توحید جاری ہوتا، دل کے خلوت کدہ میں عشق و محبت کی شمع روشن ہو جاتی جو نہ صرف ظلمت دور کرتی بلکہ انانیت کو بھی فنا کر دیتی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یثرب میں تشریف لانے کی دعوت دینا صرف ایک معزز مہمان کو بلانا نہیں تھا بلکہ ایک ہیبت انگیز اور حد سے زیادہ پر خطر اقدام تھا۔ آپ کو تشریف لانے کی دعوت دینا ایک عظیم ترین انقلاب کو دعوت دینا تھا۔ یعنی ایسی حاکمیت کو تسلیم کرنا تھا جس کے مقابلہ میں ہر ایک حاکمیت ختم ہو رہی تھی۔ اوس اور خزرج کے روسا اور شیوخ خصوصاً عبداللہ بن ابی بن سلول رئیس خزرج اور ابو عامر بن صیفی بن نعمان رئیس اوس، جو نہ صرف حاکمیت بلکہ ملوکیت اور بادشاہت کے خواب دیکھ رہے تھے، آپ کا مدینہ تشریف لے آنا ان سب کے لئے پیغام ناکامی تھا، جو ان سب کے لئے مایوس کن تھا، جو ان کی حاکمیت تسلیم کرانے کے لئے ایسے سرگرم اور پر جوش تھے کہ عبداللہ بن ابی بن سلول کے لئے شاہانہ تاج کی تیاری کی فرمائش بھی دے چکے تھے۔ دوسری طرف آپ کی تشریف آوری قریش کی ناکامی تھی اور تشریف آوری کی دعوت دینا قریش جیسی جماعت کے مقابلہ پر سینہ سپر ہونا تھا، جس کی عظمت کی چھاپ ہر ایک عربی بولنے والے کے دل پر

^۱ جو ایمان لائے وہ بہت مضبوط ہوتے ہیں اللہ کی محبت میں

^۲ کوئی مومن کہلانے کے لائق نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کو باپ اولاد اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

مدینہ پہنچ کر حضرت اسعد بن زرارہ کے یہاں ان کا قیام ہوا۔ اس وقت تک جتنا قرآن نازل ہو چکا تھا وہ لوگوں کو یاد کرتے، سمجھاتے، اس پر عمل کرتے۔ لوگ ان کو مرقی^۱ کہا کرتے تھے۔

نیا دار، ہجرت:

اب تک حبش دار ہجرت تھا۔ اس بیعت کے بعد ایک دار ہجرت کا اضافہ ہو گیا۔ مکہ کو خیر باد کہنے والے اب یثرب آنے لگے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ارادہ ہجرت:

ماہ شوال ختم ہو رہا تھا۔ ذی قعدہ^۲ شروع تھا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی ہجرت کا ارادہ کر لیا۔ اجازت لینے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا: کچھ توقف کیجئے۔ امید یہ ہے کہ مجھے بھی ہجرت کی اجازت مل جائے گی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہ ارشاد سنا تو تعجب ہوا^۳ مکرر دریافت کیا۔ کیا آپ کو یہ توقع ہے میرے ماں باپ آپ پر قربان؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، امید تو یہی ہے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے لئے اس سے زیادہ مسرت کی بات کیا ہو سکتی تھی کہ شرف رفاقت حاصل ہو۔ آپ نے اس وقت ارادہ ملتوی کر دیا اور اپنے آقا کے ساتھ سفر کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ فوراً دو عمدہ سانڈیاں خرید لیں۔^۴ اور اس خیال سے کہ نہ معلوم کس وقت حکم ہو جائے۔ ان سانڈیوں کو چرواہے کے حوالے نہیں کیا بلکہ گھر پر کھڑا رکھا اور بازار سے چارہ خرید کر کھلاتے رہے۔ اس انتظار میں چار ماہ گزر گئے۔ اس اثناء میں بیعت عقبہ ثانیہ بھی ہوئی جس کا ذکر آگے آئے گا۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دو سانڈیاں ہی نہیں خریدیں بلکہ سفر کا نقشہ ذہن میں جما کر ضرورت کی تمام چیزیں فراہم کر لیں۔ حتیٰ کہ سفر میں ایک تحریر لکھنے کی ضرورت پیش آئی تو تحریر کا تمام سامان ساتھ تھا۔ ٹھنڈے پانی کا اور نہ صرف پانی بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پانی پلانے کے برتن کا بھی یہ انتظام تھا کہ اس کے منہ پر کپڑا باندھا رہتا تھا۔ جیسا کہ سراقہ جعشم کے واقعہ میں آئندہ معلوم ہو گا۔ (انشاء اللہ)

^۱ ابن سعد و استیعاب وغیرہ

^۲ بخاری شریف وغیرہ کی روایتوں میں یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ چار ماہ تک ان سانڈیوں کو گھر پر رکھ کر چارہ کھلاتے رہے جن کو آپ نے سفر ہجرت کے لئے خریدا تھا۔ سفر ہجرت ربیع الاول کے آغاز میں ہوا تو ان سانڈیوں کو شوال کے آخر یا ذی قعدہ کے شروع میں خریدا ہو گا۔

^۳ ابھی تک بیعت عقبہ ثانیہ نہیں ہوئی تھی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی گفتگو ہوئی اور حضرات انصار سے عہد لیا گیا۔

^۴ بخاری شریف ص ۵۵۳

سال بیعت ہوئی تھی۔ سرور کائنات محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ وہاں رونق افروز ہو چکے تھے۔

یہ بھی خواجہ ابوطالب کی طرح آنحضرت ﷺ کے سچے ہی خواہ، محافظ اور جان چھڑکنے والے مددگار تھے اور اگرچہ عمر میں صرف دو سال بڑے تھے مگر خود کو اپنے عزیز بھتیجے کا سرپرست سمجھتے تھے^۱ اور تجارتی کاروبار کے باعث باہر آنا جانا رہتا تھا تو قبائل سے واقف تھے، شیوخ قبائل سے تعلقات تھے ان کو جانتے پہچانتے تھے۔ اس تعارف کے ساتھ خوبی یہ تھی کہ بات کرنے کا بھی اچھا سلیقہ تھا۔ چنانچہ جب آنے والے آگئے تو سلسلہ کلام آپ نے ہی شروع کیا:

آپ جس ارادہ سے آئے ہیں یقین ہے کہ اس کی ذمہ داری کا بھی آپ صاحبان نے بخوبی اندازہ کر لیا ہو گا۔ محمد کی حمایت پورے عرب کی مخالفت ہے۔ محمد اپنے خاندان کے سب سے زیادہ باعزت رکن ہیں۔ خاندان کا ہر فرد ان کی حفاظت کے لئے سربکف رہتا ہے جو ان کے ہم نوا ہو گئے ہیں وہ ہم نوائی کی وجہ سے اور جو ان کے ہم نوا نہیں ہوئے ہیں وہ خاندانی حمایت، قربت اور خود ان کے اخلاق و کردار کی وجہ سے ان کے جاں نثار ہیں۔ محمد کی حفاظت سے ہم نہ اکتائے ہیں نہ تھکے ہیں۔ محمد نے خود ہی آپ کی دعوت منظور کی ہے اور وہ ہم سے الگ ہو کر آپ کے یہاں جانا چاہتے ہیں۔

آپ پوری طرح غور کر لیں، اپنی طاقت اور ہمت کا موازنہ کر لیں۔ پورے عرب کی متحدہ طاقت سے آپ کو مقابلہ کرنا ہو گا۔ سارا عرب ایک کمان سے آپ پر پتھر برسائے گا۔ کیا آپ میں مقابلہ کی طاقت ہے؟ آپ صاحبان کو لڑائیوں کا تجربہ ہے؟ کیا آپ لوگ نامعلوم مدت تک پامردی اور استقلال سے پورے عرب کے مقابلے میں ثابت قدم رہ سکیں گے؟ صاف بات اچھی ہوتی ہے پوری طرح سوچ لو جدا ہونے سے پہلے پختہ فیصلہ کر لو۔ بعد کی شرمندگی سے اس وقت کی صاف بات ہزار درجہ بہتر ہے۔^۲

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی بات ختم ہوئی تو حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ نے مجمع کی ترجمانی

۱۔ تعمیر کعبہ کے وقت جب پتھر ڈھورے تھے تو آپ نے اسی بزرگانہ شفقت کی وجہ سے بھتیجے حضرت محمد ﷺ کو فرمائش کی تھی کہ لنگی کھول کر مونڈھے پر رکھ لیں تاکہ پتھر کی رگڑ نہ لگے۔

۲۔ ابن سعد ص ۱۳۹ ج ۱

۳۔ یہ سب سے زیادہ سن رسیدہ اور اپنی جماعت کے سردار تھے۔ سیدنا و کبیرنا (کعب بن مالک رضی اللہ عنہ) (سیرۃ ابن ہشام ص ۱۲۶ ج ۱) مگر آنحضرت ﷺ کی مدینہ میں تشریف آوری سے ایک ماہ پہلے وفات پا چکے تھے (تجاری) لطیف: جب یہ حضرت (براء بن معرور رضی اللہ عنہ) یثرب سے روانہ ہوئے تو راستہ میں سوال یہ پیدا ہوا کہ نماز کس رخ پر پڑھنی چاہئے۔ شام کا رخ کر کے یا کعبہ کا رخ کر کے۔ سب کی رائے ہوئی کہ شام کی طرف۔ مگر حضرت براء رضی اللہ عنہ نے طے کیا کہ وہ کعبہ کی طرف نماز پڑھا کریں گے۔ راستہ بھر یہی رہا کہ ساتھی شام کی طرف نماز پڑھتے رہے اور یہ کعبہ کی طرف۔ جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے استفسار کیا تو آنحضرت ﷺ نے شام کی طرف نماز پڑھنے کی ہدایت فرمائی۔ (سیرۃ ابن ہشام ص ۲۶۳-۲۶۵ ج ۱)

تھی اور جس کی ناکامی پورے عرب کی ناکامی تھی۔ اس کے علاوہ اقتصادی مسائل بھی نہایت اہم تھے۔ مثلاً محمد رسول اللہ ﷺ کے جاں نثار جو اہل و عیال کو ساتھ لے کر آئیں گے ان کی ضروریات زندگی کس طرح فراہم ہوں گی۔

یہ تمام مسائل تھے۔ جو ایمان لانے والے تھے وہ دانشمند تھے۔ ان تمام باتوں کو سمجھتے تھے، مگر ان کے ایمان کی حرارت اس طرح کے تمام خطرات کے لئے برق خرمن سوز تھی:

عشق چوں خام ست باشد بستہ ناموس و ننگ

پختہ مغزان جنوں را کے حیا زنجیر پاست

با ہر کمال اندکے آشتگی خوش ست

ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مباح

یہ نو مسلم تھے ان کا اسلام نیا تھا۔ مگر یہ نیا اسلام سراسر عشق تھا، جس نے محبوب کے لئے ہر ایک قربانی اور ایثار کو محبوب بنا دیا تھا:

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے

لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

حج کا زمانہ آیا۔ اوس اور خزرج کے تقریباً پانچ سو افراد حج کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ اہل ایمان بھی اس عزم کے ساتھ روانہ ہوئے کہ محبوب رب العالمین کو دعوت دیں کہ وہ مکہ کی خشک پہاڑیوں کو خیر باد کہیں اور یثرب کے سبزہ زار کو ایمان کا کشت زار بنائیں۔ لیکن یثرب کے سربراہ جو قریش کے ہم مشرب وہم نواتھے اس جرات کیلئے تیار نہیں تھے جس میں قریش سے براہ راست تصادم تھا لہذا ان فدکاروں نے اپنے منصوبہ کو پوشیدہ رکھا۔ ان کی تعداد تہتر تھی۔^۱ ان میں دو عورتیں تھیں تیس نوجوان باقی ادھیڑ عمر۔

مکہ پہنچ کر بھی اس منصوبہ کو راز ہی رکھا اور رازداری کے ساتھ ہی تاریخ، وقت اور مقام طے کیا گیا۔

۱۱ ذی الحجہ^۲ کی رات چاند آدمی مسافت طے کر چکا لوگ سو گئے تو طے کردہ خفیہ قرارداد کے بموجب اسلام کے یہ جاں نثار فرداً فرداً روانہ ہوئے۔^۳ اور اسی گھاٹی میں پہنچے جہاں گزشتہ

۱۔ ابن ہشام ص ۲۶۶ ج ۱ ابن اسحاق نے ان کے نام بھی شمار کرائے ہیں ص ۲۷۳ تا ۲۷۹ ج ۲

۲۔ وسط ایام التشییق لیلة النفر الاول اذا هدأت الرجل (ابن سعد ص ۱۳۹ ج ۱) فتسلل تسلل القطام مستخفین (ابن ہشام ص ۲۶۶ ج ۱)

۳۔ سب سے پہلے رافع بن مالک زرقی رضی اللہ عنہ باریاب ہوئے۔ ابن سعد ص ۱۳۹ ج ۱

آنحضرت ﷺ نے یہ الفاظ سنے تو مسکراتے ہوئے فرمایا:

یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کا خون میرا خون، آپ کی ناکامی میری ناکامی، میں آپ کا آپ میرے، جن سے تمہاری جنگ ان سے میری جنگ، جن سے تمہاری صلح ان سے میری صلح۔

اس کے بعد سلسلہ بیعت شروع ہوا۔ حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے بیعت کی۔^① بیعت میں اسی عہد کو دہرایا گیا^② و پہلی بیعت (عقبہ اولیٰ) کی بیعت کے وقت کیا گیا تھا کہ (۱) خدا واحد کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے (۲) اللہ کا کسی کو شریک نہیں گردانیں گے (۳) چوری نہیں کریں گے (۴) زنا نہیں کریں گے (۵) اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے (۶) کسی پر بہتان نہیں باندھیں گے، جس اچھی بات کا حکم کیا جائے گا تعمیل کریں گے (نافرمانی نہیں کریں گے)۔

اس کے علاوہ یہ بھی عہد لیا گیا:

(۷) کسی کو ناحق قتل^③ نہیں کریں گے (۸) لوٹ نہیں ڈالیں گے^④ (۹) ہر موقع پر حق بات

① ابن اسحاق کا بیان ہے کہ بنو نجار کا دعویٰ ہے کہ سب سے پہلے حضرت اسعد بن زرارہ نے بیعت کی اور بنو عبد الاشہل کہتے ہیں کہ سب سے پہلے حضرت ابو الہیثم بن تیہان نے بیعت کی۔ مگر ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ یہ حضرات بہت پہلے مسلمان ہو چکے تھے اس وقت ان حضرات نے مکرر بیعت کی۔ نئے بیعت کرنے والوں میں اس وقت حضرت براء ہی تھے رضی اللہ عنہ، واللہ اعلم بالصواب۔

② سورہ ممتحنہ میں آنحضرت ﷺ کی فرمائش کی گئی ہے کہ جو عورتیں ہجرت کر کے آئیں ان سے آپ بیعت لیجئے۔ اس بیعت میں انہیں چھ چیزوں کا تذکرہ ہے۔ اس مناسبت سے اس بیعت کو بیعت نساء کہتے ہیں۔ مردوں سے اس موقع پر انہیں باتوں کا عہد کرایا گیا۔ اس کے بعد بہت سے موقع آئے ہیں جن میں آنحضرت ﷺ نے خاص اس موقع کے لحاظ سے صحابہ کرام سے بیعت لی ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ اس پر بیعت لی اور عہد کرایا کہ کسی سے کوئی سوال نہیں کریں گے۔ ایک مرتبہ اس پر بیعت لی کہ ہر ایک کے حق میں خیر خواہی کریں گے۔ (بخاری شریف ص ۱۳) یا مثلاً حدیبیہ کے موقع پر بیعت لی گئی، جس کو بیعت رضوان کہا جاتا ہے کہ مر جائیں گے مگر میدان سے نہیں ہٹیں گے۔

③ ولا تقتلوا النفس التي حرام الله الا بالحق ولا تنهب ولا تلعصم۔ بخاری شریف ص ۵۵۰۔ ۵۵۱

④ یاد رکھئے غنیمت کو لوٹ نہیں کہا جاسکتا۔ لوٹ کو آنحضرت ﷺ نے گناہ کبیرہ قرار دیا ہے۔ جس طرح مثلہ (ناک کان کاٹ ڈالنے) سے منع فرمایا ایسے ہی (لنہب) لوٹ سے منع فرمایا: اس پر بیعت لی کہ لوٹ نہیں ڈالیں گے۔ (بخاری شریف ص ۳۳۶) لوٹ ڈالنے والے کے متعلق فرمایا: لیس مناسیک (ابوداؤد شریف) گویا وہ مسلمان ہی نہیں ہے۔ لوٹ کا مقصد ذاتی مفاد ہوتا ہے۔ خوف خدا جماعتی نظم یا امانت اور دیانت کا کوئی ضابطہ لوٹ میں نہیں ہوتا۔ غنیمت میں یہ تمام باتیں شرط ہوتی ہیں۔ غنیمت میں جو کچھ لیا جاتا ہے وہ پوری احتیاط اور دیانتداری کے ساتھ جمع کرایا جاتا ہے۔ ایک شخص میدان جنگ میں مارا گیا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ہونی النار (یہ دوزخ میں گیا)۔ صحابہ کو توجہ ہوا۔ سامان کی تلاشی لی تو ایک عبا (اچکن) برآمد ہوئی جو مال غنیمت میں سے بلا اجازت اس شخص نے رکھ لی تھی۔ (بخاری شریف ص ۳۳۲) انتہائی کہ جو تہ کے تسمہ کے متعلق بھی ارشاد ہوا: شرک وشراکین من نار (بخاری شریف ص ۶۰۸) غنیمت کے متعلق یہی کہا جاسکتا ہے کہ غنیمت کے مال کو سرکاری طور پر ضبط کر لینے کا نام غنیمت ہے۔ کچھ ناأشاد ب مصنف جو بظاہر اپنا درجہ حضرات صحابہ سے کم رکھنا نہیں چاہتے وہ غنیمت کے لئے بلا تکلف لوٹ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ معاذ اللہ

کرتے ہوئے فرمایا: آپ نے جو فرمایا ہم پہلے سے ہی سمجھتے ہوئے ہیں۔ ہم وفاداری، سچائی اور رسول اللہ ﷺ کی حفاظت میں اپنی جانیں قربان کر دینے کا عزم مصمم لے کر یہاں آئے ہیں لیکن ہم چاہتے ہیں حضرت والا (جن کے لئے سر ہتھیلی پر رکھ کر ہم یہاں آئے ہیں) وہ خود فرمائیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے کلام پاک کی چند آیتیں تلاوت فرمائیں، پھر فرمایا: میں

(الف) اپنے رب (پروردگار) کے لئے یہ چاہتا ہوں کہ صرف اسی ”وحدہ لا شریک لہ“ کی عبادت کرو۔ اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو۔

(ب) اپنی ذات اور اپنے صحابہ (ساتھیوں) کے لئے یہ چاہتا ہوں کہ ہمیں رہنے کو جگہ دو، ہماری مدد کرو اور جس طرح تم اپنی جانوں کی حفاظت کرتے ہو ہماری بھی حفاظت کرو۔

ایک روایت میں ہے کہ جس طرح اپنے بچوں اور عورتوں کی حفاظت کرتے ہو ہماری حفاظت کرو۔

مجمع نے دریافت کیا: ہمیں کیا ملے گا،^① فرمایا: ”جنت“^②

اس کے بعد جوابی تقریریں شروع ہوئیں۔

(۱) سید القوم حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ نے دست مبارک پر اپنا ہاتھ رکھا اور عرض کیا: یقیناً ہم اسی طرح حفاظت کریں گے۔ ہم کسی کے مقابلہ سے جان چرانے والے نہیں ہیں۔ (ہم ابناء الحرب ہیں) لڑائیوں کی گود میں پلے ہیں۔ آباؤ اجداد سے یہی ترکہ میں ملا ہے۔

(۲) عباس بن عبادہ بن فضالہ انصاری رضی اللہ عنہ مجمع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

حضرات! آپ سمجھتے ہیں کیا ہو رہا ہے۔ ہم عہد کر رہے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی حمایت میں پوری دنیا کا مقابلہ کریں گے۔ ہر ایک گورے اور کالے کے مقابلے میں سینہ سپر ہو گئے، جانیں قربان کریں گے۔ مال لٹائیں گے۔ ہمارے سردار مارے جائیں گے، کیا ہم تیار ہیں؟ اگر ایسا نہ کر سکیں تو کل کے بجائے آج الگ ہو جائیں۔ آج دامن بچالینا کل کی رسوائی سے بہتر ہے۔

(۳) حضرت ابو الہیثم تیہان: یا رسول اللہ! گستاخی معاف۔ ایک بات واضح کرنی ہے: یہودیوں اور دوسرے قبائل سے ہمارے تعلقات ہیں۔ یہ تعلقات اب باقی نہیں رہیں گے۔ مگر ایسا تو نہ ہو گا کہ جب اللہ تعالیٰ آپ کو کامیاب فرمادے آپ ہمیں چھوڑ کر اپنے لوگوں میں چلے جائیں۔

① مسند امام احمد ص ۱۲۰ ج ۳ سیرۃ ابن ہشام ص ۲۶۶ ج ۱

② کسی دنیاوی ترقی یا برتری کا وعدہ نہیں ہے جو کچھ ہو آخرت کے لئے ہو۔ صرف اسی کا وعدہ ہے اور یہی نصب العین ہے۔ محمد میں غنی عنہ

ﷺ کے تشریف لے جانے کے بعد مدینہ میں سب سے پہلے انہیں کی وفات ہوئی۔ خود آنحضرت ﷺ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ یہ سب سے پہلی نماز جنازہ تھی جو پڑھائی گئی۔ (الاستیعاب واصابہ) یہودیوں نے طعنہ دیا کہ محمد اپنے ساتھی کو بچانہ سکے تو اور کیا کر سکیں گے۔ (مسند احمد)

حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ:

آنحضرت ﷺ نے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ مہاجر سے مواخاۃ (برادرانہ رشتہ قائم فرمایا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے مہاجر بھائی سے کہا کہ میں انصار میں سب سے زیادہ خوش حال اور صاحب جائیداد ہوں۔ آدمی جائیداد آپ کی ہے اور میری دو بیویاں ہیں ان میں سے جس کو آپ مناسب سمجھیں مجھے بتادیں، میں طلاق دیدوں گا آپ نکاح کر لیتا۔ عبدالرحمن نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ آپ کے اہل اور مال میں برکت دے۔ مجھے تو (زیادہ چلنے والا) بازار بتا دیجئے۔ میدان احد میں معرکہ ٹھنڈا ہوا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ سعد بن ربیع کو تلاش کرو۔ یہ میدان میں پڑے ہوئے تھے۔ بارہ زخم جسم مبارک پر تھے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ جو تلاش کرنے گئے تھے ان سے کہا کہ آقا دو جہاں سے میرا سلام عرض کر دینا اور مسلمانوں کو یہ پیغام پہنچا دینا کہ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ رہ گیا اور سرتاج دوعالم شہید ہو گئے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی کوئی معذرت قابل قبول نہیں ہوگی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ان کی صاحبزادی آئیں تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنی چادر بچھادی۔ اس پر ان کو بٹھایا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے فرمایا یہ ان کی صاحبزادی ہیں جو مجھ سے بھی بہتر تھے اور تم سے بھی۔ وہ آنحضرت ﷺ کے سامنے راہ خدا میں قربان ہو گئے اور میں بھی زندہ ہوں اور تم بھی زندہ ہو (الاصابہ)

حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ:

شاعر تھے۔ ان کے ترانے بڑے شوق سے سنے جاتے تھے اور پڑھے جاتے تھے۔ خود آنحضرت ﷺ کو بھی دلچسپی ہوتی تھی۔ صلح حدیبیہ کے بعد جب آنحضرت ﷺ حسب معاہدہ عمرہ کرنے کے لئے تشریف لے گئے تو مکہ میں آنحضرت ﷺ کے آگے آگے یہ ترانہ پڑھتے جارہے تھے:

خلو ابی الکفار عن سبیلہ الیوم نصرکم علی تنزیلہ

ضرباً یزیل الھام عن مقیلہ ویذھل الخلیل عن خلیلہ

ترانہ کا مفہوم یہ ہے کہ ”کافر بچو! راستہ سے ہٹ جاؤ، آج ہم بذور شمشیر اپنے آقا کو یہاں اتاریں گے، ہماری شمشیر زنی ایسی ہوگی جو کھوپڑیوں کو گردنوں سے اڑا دے گی اور دوست کو

کہیں گے، کسی کی مذمت و ملامت کا خوف ہمیں کبھی بھی حق بات کہنے سے نہیں روک سکے گا۔ (۱۰) جب رسول اللہ ﷺ یثرب تشریف لے آئیں گے تو اپنی اولاد اور خود اپنی جانوں کی طرح ان کی حفاظت کریں گے۔^۱ ان سب باتوں کا بدلہ جنت ہوگا۔^۲

بارہ نقیب:

آنحضرت ﷺ نے اس جماعت میں بارہ نقیب منتخب فرمائے تاکہ حالات^۳ کی نگرانی رکھیں۔ ان کے نام خود انصار نے پیش کئے تھے۔ ان میں سے نو خزر ج کے تھے اور تین اوس کے۔ بردایت ابن اسحاق^۴ ان کے نام یہ ہیں:

ابو امامہ، اسعد بن زرارہ، سعد بن ربیع، عبداللہ بن رواحہ، رافع بن مالک، براء بن معرور، عبداللہ بن عمرو حرام، عبادہ بن صامت، سعد بن عبادہ، منذر بن عمرو بن خنیس، اسید بن حضیر، سعد بن خبیثمہ، رفاعہ بن عبدالمنذر (رضی اللہ عنہما)

جلسہ ختم ہوا۔ سب حضرات اپنی اپنی قیام گاہوں پر خاموشی سے واپس ہو گئے۔ طے یہ ہوا کہ صبح سویرے الگ الگ اپنی اپنی قیام گاہ سے مدینہ روانہ ہو جائیں گے۔

حضرات نقباء کا تعارف اور مختصر حالات

حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ:

کنیت ابو امامہ۔ یہ سب سے کم عمر تھے مگر اسلام میں سب سے مقدم، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ سب سے پہلے یثرب میں اسلام کا تعارف انہیں کے ذریعے ہوا۔ پھر ہر بیعت کے موقع پر حاضر اور ہر بیعت میں شریک رہے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مبلغ اور معلم بن کر آئے تو انہیں کے یہاں قیام رہا۔ دعوت و تبلیغ میں ان کے شریک رہے۔ نماز جمعہ کا سلسلہ بھی آپ ہی نے شروع کیا۔ مگر عمر نے وفات نہیں کی۔ ابھی مسجد نبوی کی تعمیر ہو رہی تھی کہ وفات ہو گئی۔ آنحضرت ﷺ بار بار مزاج پرسی کے لئے تشریف لے گئے۔ علاج میں بھی شریک مشورہ رہے۔ آنحضرت

^۱ بیہقی بحوالہ البدایہ والنہایہ ص ۱۶۳

^۲ بخاری شریف ص ۵۵۱

^۳ لیکو نو انقباء علی قومہم ہبافیم (ابن ہشام ص ۲۶۷ ج ۱)

^۴ سیرۃ ابن ہشام ص ۶۲ ج ۱ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے ایک قصیدہ میں ان سب ناموں کو جمع کر دیا ہے (ص

۸۶۲ ج ۱ ابن ہشام)

دوست سے جدا کر دی گئی۔“

آنحضرت ﷺ نے حضرت مقداد بن الاسود سے رشتہ اخوت قائم کیا تھا۔ وہ بھی ایسے ہی جو شیعے تھے۔ جاں باز عبد اللہ بن رواحہ نے غزوہ موتہ میں جام شہادت نوش کیا۔ ﷺ۔

حضرت رافع بن مالک رضی اللہ عنہ:

مدینہ کے سب سے پہلے مسلمان ہونے والے ہیں۔ پہلی بیعت میں بھی شریک تھے جس میں چھ یا آٹھ آدمیوں نے بیعت کی تھی، پھر بارہ اور ستر میں بھی شریک تھے۔ جتنا قرآن اس وقت تک نازل ہوا تھا سب حفظ کر لیا تھا۔ غزوہ احد میں درجہ شہادت حاصل کیا۔ (استیعاب و اصابہ)

حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ:

جب یہ قافلہ مکہ جا رہا تھا تو راستہ میں اور ساتھیوں نے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی مگر انہوں نے کعبہ کی طرف نماز پڑھی۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے کعبہ کی طرف نماز پڑھی۔ آنحضرت ﷺ ابھی ہجرت کر کے مدینہ میں تشریف لائے تھے کہ ان کی وفات ہو گئی مگر وفات کے وقت وصیت کر دی کہ ترکہ کا ایک ٹلٹ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے صاحب خیر ہیں جنہوں نے تہائی ترکہ کی وصیت کی۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن حرام رضی اللہ عنہ:

غزوہ بدر میں شریک نہیں ہو سکے، بہت صدمہ ہوا، غزوہ احد ہوا تو تمنا پوری ہوئی۔ بیٹے کو بٹھا کر رات ہی کو سمجھا دیا۔ مجھے امید ہے کہ میں کل کو سب سے پہلے جان فدا کروں گا۔ آنحضرت ﷺ کے بعد مجھے سب سے زیادہ تم محبوب ہو۔ تم سب سے پہلے میرا قرض ادا کرنا اور اپنی بہنوں کا خیال رکھنا بہنیں سات تھیں۔ جابر ان کے سعادت مند صاحبزادے تھے۔ یہودی کا قرض تھا۔ خیال تھا کہ باغ کے پھل سے قرض ادا نہیں ہو سکے گا، لہذا کچھ اب وصول کر لے کچھ بعد میں۔ مگر یہودی راضی نہیں ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے سفارش کی تب بھی راضی نہیں ہوا۔ آنحضرت ﷺ باغ میں تشریف لے گئے ٹوٹے ہوئے کھجوروں کے ڈھیر پڑے تھے، ان سب کے پاس پہنچ کر ملاحظہ فرمایا: پھر حکم دیا کہ تمام قرض ادا کر دو۔ یہ آنحضرت ﷺ کی برکت تھی کہ تمام قرض ادا کر دیا۔ اور کھجوروں کے ڈھیر جوں کے توں باقی رہ گئے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ:

آنحضرت ﷺ نے حضرت ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ سے برادرانہ رشتہ قائم فرمایا۔ تمام معرکوں میں شریک رہے۔ سنہ ۴۵ھ میں وفات ہوئی۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ:

قبیلہ خزرج کے سردار، رکیس گھرانے کے چشم و چراغ بہت بڑے حوصلہ مند سخی، باپ دادا بھی ایسے ہی رکیس اور سخی تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے گھر کو بیت جو د فرمایا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا گیا تو انہوں نے بیعت نہیں کی مگر کوئی مخالفت بھی نہیں کی بلکہ وطن چھوڑ کر شام چلے گئے۔ حوران میں قیام کیا وفات دفعۃً ہو گئی، غسل خانہ میں مردہ پائے گئے۔ یہ سنہ ۱۱ھ کا واقعہ ہے یا ۱۴ھ یا ۱۵ھ کا (علی اختلاف الاقوال) الاستیعاب

حضرت منذر بن عمرو بن خنیس رضی اللہ عنہ:

آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے برادرانہ رشتہ قائم فرمایا۔ بیر معونہ کے حادثہ میں شہید ہونے والے ستر حضرات جو اس موقع پر شہید کئے گئے وہ انہیں کی قیادت میں سفر کر رہے تھے (الاستیعاب و بخاری وغیرہ) یہ سب حضرات خزرجی تھے قبیلہ اوس کے یہ تین حضرات تھے مندرجہ ذیل

حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ:

قبیلہ اوس کے سردار بہت بڑے سخی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ۲۰ھ یا ۲۱ھ میں وفات ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے وصی تھے۔ چار ہزار دینار قرض چھوڑا، جس کو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے باغ کی آمدنی سے ادا کیا۔ (الاستیعاب) غزوہ بدر میں مشیر خاص تھے۔

حضرت سعد بن حیشم رضی اللہ عنہ:

جب آنحضرت ﷺ کا قباء میں قیام تھا تو عام نشست ان کے یہاں ہوئی تھی۔ جو حضرات مہاجرین تن تھا آئے تھے وہ بھی انہیں کے یہاں ٹھرتے تھے۔ جب غزوہ بدر کے موقع پر آنحضرت ﷺ روانہ ہونے لگے تو باپ (حیشم) اور بیٹے سعد نے طے کیا کہ ہم میں سے ایک مکان پر رہے ایک ساتھ جائے، پھر باپ بیٹے میں بحث ہوئی کہ کون ساتھ جائے۔ بحث ختم کرنے کے لئے قرعہ ڈالا تو قرعہ میں بیٹے (حضرت سعد رضی اللہ عنہ) کا نام نکلا۔ باپ نے بیٹے سے اپیل کی کہ اپنا حق مجھے

دیدیں اور مجھے جانے دیں تو بیٹے نے کہا کوئی اور معاملہ ہوتا تو میں آپ کے لئے اپنا حق بخوش چھوڑ دیتا مگر یہ راہ خدا میں قربان ہونے اور رضا مولیٰ حاصل کرنے کا معاملہ ہے اس میں تو میں اپنا حق نہیں چھوڑ سکتا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ گئے اور جام شہادت نوش جان کیا۔ (رحمۃ اللہ علیہما)

حضرت رفاعہ بن عبد المنذر رضی اللہ عنہ:

ابولہبہ کنیت، یہ کنیت ہی سے مشہور ہیں۔ غزوہ بدر اور غزوہ سویق کے موقع پر جب آنحضرت ﷺ تشریف لے گئے تو انہیں کو مدینہ کا ناظم امور (والی) بنا گئے۔ غزوہ خندق کے بعد بنو قریظہ کا مسئلہ پیش ہوا۔ جنہوں نے غزوہ خندق کے وقت غداری کی تھی۔ بنو قریظہ منتظر تھے کہ ان کے متعلق کیا فیصلہ کیا جائیگا۔ ابولہبہ رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا تو انہوں نے گردن کی طرف اشارہ کیا کہ سب غداروں کو قتل کیا جائے گا۔ پھر احساس ہوا کہ میں نے راز فاش کر دیا تو مسجد شریف میں آکر اپنے آپ کو کھنبے سے باندھ دیا اور کھانا پینا سب بند۔ نماز کے وقت ان کی صاحبزادی آکر ان کو کھول دیتی تھیں تو نماز میں شریک ہو جاتے تھے۔ چھ روز تک اور بعض روایتوں کے بموجب چودہ پندرہ دنوں تک اسی طرح بندھے رہے۔ پھر سورہ توبہ نازل ہوئی، آپ کو بشارت دی گئی اور کھولنے کا ارادہ کیا گیا۔ آپ نے منع کر دیا کہ میں قسم کھا چکا ہوں کہ جب تک آنحضرت ﷺ خود نہ کھولیں گے میں نہیں کھولوں گا۔ چنانچہ خود سرور کائنات ﷺ نے اپنے دست مبارک سے ان کو کھولا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ان کی وفات ہوئی۔ بغیر کھائے پیئے بندھے رہنے کا اثر ظاہری جسم پر یہ پڑا کہ قوت ساعت ختم ہو گئی تھی۔ (الاستیعاب)

قریش کا تعاقب:

یہ اجلاس جو پہاڑ کی گھاٹی میں ریت کے فرش پر چاند کی چاندنی میں کیا گیا تھا بہت ہی خفیہ تھا۔ جانے والے بھی ایک ایک کر کے گئے تھے۔ اسی طرح نہایت خاموشی سے واپس ہوئے۔ لیکن بھتر آدمیوں کی نقل و حرکت چھپنے والی نہیں تھی۔ لوگوں نے بھانپا، کچھ بھنک قریش کے کانوں میں بھی پڑی۔ فوراً دوڑے اور جیسے ہی صبح ہوئی تحقیقات شروع کر دی۔ اہل مدینہ کے خیموں میں پہنچے اور کہا: ”ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگ اس لئے آئے ہیں اور کوئی ایسا معاہدہ کر چکے ہیں کہ اس صابی (آنحضرت ﷺ) کو اپنے ساتھ لے جائیں گے اور ہمارے مقابلہ پر محاذ قائم کریں گے۔ ہم آگاہ کئے دیتے ہیں محمد کو لے جانا ہمارے لئے چیلنج ہو گا۔ طاقت آزمائی ہو تو ایسا کر لو۔“

رؤسا مدینہ عبد اللہ بن ابی بن سلول وغیرہ سے قریش کے تعلقات تھے انہیں سے تعارف تھا۔ انہیں سے تحقیقات کا سلسلہ شروع کیا گیا اور انہیں سے یہ باتیں کہی گئیں۔ ان میں سے کوئی بھی

اس بیعت میں شریک نہیں ہوا تھا نہ ان کو خبر تھی، انہوں نے قسمیں کھا کھا کر انکار کیا۔ عبد اللہ بن ابی بن سلول نے کہا: میری قوم اگر ایسا کرتی تو وہ یقیناً مجھ سے مشورہ کرتی ورنہ کم از کم خبر ضرور دیتی۔ یہ ممکن نہیں میری اطلاع کے بغیر کوئی ایسا عمل ہو جائے۔ یہ انکار کرنے والے سچے تھے لیکن بیعت کرنے والوں کو فکر تھی کہ ان سے دریافت کیا گیا تو کیا جواب دیں گے۔ وہ خاموش تھے اور ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ دفعۃً حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی نظر ایک قریشی رئیس زادے حارث بن ہشام مخزومی کی نئی جوتیوں پر پڑ گئی جو قیمتی اور خوبصورت تھیں۔ انہیں مذاق کرنے اور لوگوں کی توجہ ہٹانے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے عبد اللہ بن ابی بن سلول کو مخاطب کر کے کہا: دیکھئے جوتیاں ایسی ہونی چاہئیں۔ آپ رئیس مدینہ اور قوم کے سردار ہیں۔ آپ بھی ایسی ہی جوتیاں پہنا کیجئے۔ اس مزاحیہ فقرہ کو حارث نے طنز سمجھا۔ اس نے دونوں جوتیاں نکال کر کعب رضی اللہ عنہ کی طرف پھینک دیں۔ لو تم پہنو ضرور پہنو خدا کی قسم ضرور پہنو۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عبد اللہ بن ابی نے دیکھا کہ حارث کو ناگواری ہوئی تو اس نے مجھے ڈانٹا: تم نے خواہ مخواہ ان کو ناراض کر دیا۔ ان کی جوتیاں واپس کر دو۔ میں نے کہا یہ دے چکے ہیں اب میں واپس نہیں کروں گا اور دل میں سوچا یہ فال نیک ہے عنقریب وہ وقت آئے گا کہ میں ان تکلفات کو ان لوگوں سے ختم کر دوں گا۔

بہر حال اس طنز اور مذاق میں اصل بات دل گئی ہماری جان بچ گئی۔ ہم سے کسی نے نہیں پوچھا۔ جب یہ لوگ ہمارے خیموں سے باہر نکل گئے تو طے شدہ پروگرام کے بموجب بیعت کرنے والے حضرات نے کھسکا شرع کیا۔ قریش کو پھر احساس ہوا۔ وہ پھر دوڑے۔ مگر ہم سب نکل چکے تھے۔ دو آدمی کسی طرح باقی رہ گئے تھے ان کو راستہ میں پکڑ لیا۔ یہ قبیلہ خزرج کے رئیس سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ تھے اور اسی قبیلہ کے دوسرے صاحب مندر بن عمرو رضی اللہ عنہ۔ یہ دونوں نقیب بھی منتخب ہوئے تھے۔ حضرت مندر رضی اللہ عنہ پھر بھی کسی طرح بچ کر نکل آئے لیکن حضرت سعد رضی اللہ عنہ نہ نکل سکے۔ اونٹ کے کجاوہ میں سے چڑھ کا تمہ نکال کر ان کی مشکلیں کس دیں ان کے سر پر بڑے بال تھے۔ مارتے پیٹتے اور ان کے بڑے بال کھینچتے ہوئے مکہ میں لے گئے۔ وہاں لوگوں نے بہت ذلیل کیا، مارا پیٹا، کسی نے منہ پر بھی تھوک دیا۔

انہیں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک شخص آیا، بظاہر نہایت سنجیدہ نیک خصلت، شریف صورت تھا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ مجھ پر رحم کرے گا اور میری جان چھڑا دے گا۔ مگر ”بھولی بھالی شکل والے ہوتے ہیں جلا دہی“

میرے پاس پہنچا تو اس نے رحم کے بجائے بڑے زور سے کھینچ کر طمانچہ مارا۔ تب میں نے سوچا کہ ان انسان نما وحشیوں میں کم از کم مسلمانوں کے حق میں شرافت کا نام و نشان نہیں رہا۔ ایک

اور شخص جو غالباً یہ حرکتیں دیکھتے دیکھتے تھک گیا تھا، اس نے کہا کیا مکہ میں تمہارا کوئی حلیف نہیں ہے۔ تب مجھے خیال آیا میں نے کہا: میرے بہت سے حلیف ہیں۔ جبیر بن مطعم بن عدی سے میرے تجارتی تعلقات بھی ہیں۔ حارث بن حرب بن امیہ سے بھی میرے تعلقات گہرے ہیں۔ آپ کی عنایت ہوگی ان میں سے کسی کو خبر کر دو۔ یہ شخص گیا حرم کعبہ کے قریب ان سے ملاقات ہو گئی۔ ان کو میرا نام بتایا یہ دونوں آئے اور ان غالموں سے مجھے نجات دلائی۔^۱

مکہ معظمہ میں اصول کار (پروگرام) ہاتھ نہیں اٹھا سکتے

تیرہ سال مکہ معظمہ میں گزرے۔ اس طویل مدت میں پروگرام یہ تھا:

- ۱۔ کُفُّوا إِلَيْكُمْ^۲ ہاتھ روکو
- ۲۔ اقْبِلُوا الصَّلَاةَ نماز قائم کرو (اللہ سے تعلق مضبوط کرو)
- ۳۔ اتُّوا الزَّكَاةَ زکوٰۃ ادا کرو۔

۴۔ وَاقْرَءُوا اللَّهَ قُرْآنًا حَسَنًا^۳ اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دیتے رہو

مگر اس موقع پر جب بیعت اس پر بھی لی گئی کہ حضرات انصار جس طرح اپنی جانوں اور اپنی اولاد کی حفاظت کرتے ہیں آنحضرت ﷺ کی بھی حفاظت کریں گے تو امام المغازی ابن اسحاق رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ یہ اس طرف اشارہ تھا کہ ہاتھ روکنے کا پروگرام آئندہ نہیں رہے گا۔ بلکہ ہاتھ اٹھانے کی بھی اجازت ہوگی^۴۔ چنانچہ جب بیعت ہو چکی تو ایک محلے بھادر حضرت عباس بن عبادہ بن فضلہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر اجازت ہو تو ہم صبح ہی کو ان لوگوں کو تلوار کے ہاتھ دکھا دیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ابھی مجھے اس کا حکم نہیں ملا ہے۔

^۱ طبقات ابن سعد ص ۱۵۰ ج ۱، یہ تفصیل امام المغازی ابن اسحاق کی روایت سے ماخوذ ہے۔ سیرۃ ابن ہشام ص ۲۷۰ ج ۱۔

^۲ سورہ نساء آیت ۷۷

^۳ یہ پہلے گزر چکا ہے کہ مکہ معظمہ میں زکوٰۃ اور قرض حسن کا فرق محض مصرف کے لحاظ سے تھا یعنی غریبوں مسکینوں کو جو کچھ دیا جاتا وہ زکوٰۃ اور غلاموں کو خرید کر رہا کرنا یا دوسرے ملی اور اجتماعی کاموں میں خرچ کو قرآن حکیم میں قرض سے تعبیر فرمایا گیا۔ حاصل یہ کہ جو کچھ ہو خرچ کر ڈالو اور جو کچھ خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس سے بہتر ملے گا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

^۴ سورہ الزلزلہ آیت ۲۰

^۵ سورہ حج اگرچہ مدنی ہے مگر ماہرین قرآن کی ایک جماعت کی تحقیق یہ ہے کہ اذن قتال کی آیت ۳۹ (اذن للذین یقاتلون۔ تا آخر) مکہ معظمہ ہی میں نازل ہو چکی تھی یعنی الفاظ بیعت میں جس کی طرف اشارہ تھا اس کے متعلق صریح حکم بھی مکہ معظمہ ہی میں نازل ہو چکا تھا۔ البتہ ابھی عمل کا حکم نہیں ہوا تھا۔ عمل کا حکم جب ہوا جب مدینہ منورہ میں طاقت جمع ہو گئی اور محاذ قائم ہو گیا۔ واللہ اعلم بالصواب (ماخوذ از سیرۃ ابن ہشام ص ۲۸۰ ج ۱)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ہجرت مدینہ کی اجازت

فتنہ کفر سے بچنے اور اپنے ایمان کو محفوظ رکھنے کی خاطر کسی امن کی جگہ جا کر پناہ لینے کا سلسلہ پہلے سے جاری تھا، اسی غرض سے ایک جماعت حبشہ گئی تھی اور حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ، حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن حبش بن ربیعہ رضی اللہ عنہ وغیرہم کو جب معلوم ہوا کہ یثرب میں ان کو امن مل سکتا ہے تو وہ بیعت عقبہ سے پہلے ہی یثرب چلے آئے تھے۔^۱

پھر جب مدینہ کے چند افراد کو آنحضرت ﷺ نے اسلام کی دعوت دی تو آپ نے اس خواہش کا بھی اظہار فرمایا تھا کہ آنحضرت ﷺ بہ نفس نفیس ان کے ساتھ چلیں۔ مگر مدینہ کی فضا خانہ جنگی کے باعث خراب تھی تو ان حضرات نے اس وقت تعمیل فرمائش سے معذرت کر دی تھی۔ لیکن سب باتیں اس وقت تک اس بناء پر تھیں کہ وہاں امن مل جانے کی توقع تھی۔ لیکن جس مقصد عظیم کے لئے آنحضرت ﷺ کی بعثت ہوئی تھی اس کو سامنے رکھ کر کس مقام کو مرکز بنایا جائے جو ضرورت کے وقت ایک مضبوط محاذ بھی ثابت ہو سکے یہ اب تک طے نہیں ہوا تھا۔ اسی اثناء میں ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مجھے تین مقامات بتائے گئے ہیں ان میں سے کسی کو منتخب کر لو۔ مدینہ، بحرین، یا قنسرین۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں مکہ سے ہجرت کر کے ایک ایسے مقام پر جا رہا ہوں جہاں کھجور کے باغات ہیں۔ مجھے خیال ہوا کہ یہ مقام میامہ ہو گا یا بجر۔^۲ لیکن جس طرح اہل مدینہ نے اسلام کا استقبال کیا اس نے طے کر دیا کہ یہ مرکز وہ ارض پاک ہے جس کو یثرب کہا جاتا تھا۔ جس نے بعد میں مدینہ النبی اکا غیر فانی اسم گرامی اختیار کیا۔

انتہائیہ کہ مقام عقبہ پر جو آخری بیعت ہوئی اس میں باقاعدہ وعدہ ہو گیا کہ حضرات مہاجرین وہاں پہنچیں گے اور اہل مدینہ ان کا انتظام کریں گے۔ چنانچہ اس کے بعد نہ صرف یہ کہ آنحضرت ﷺ نے اجازت دیدی بلکہ ایک اصول طے ہو گیا کہ جو دائرہ اسلام میں داخل ہو اس پر لازم ہے کہ وہ مدینہ منورہ کو اپنا قیام گاہ بنائے۔^۳

سیدنا بلال رضی اللہ عنہ روئے انور رضی اللہ عنہ کے عاشق، جاں نثار اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام۔ یہ ان دونوں سے جدا ہونا نہیں چاہتے تھے۔ مگر اسی اصول کی پابندی نے ان کو ہجرت پر مجبور

^۱ سیرۃ ابن ہشام ص ۳۸۱ ج ۱، فتح الباری ص ۱۸۰ ج ۷

^۲ ترمذی شریف و فتح الباری ص ۱۸۱ ج ۷

^۳ بخاری شریف ص ۵۵۱

^۴ قرآن حکیم نے سچا مومن اسی کو قرار دیا جو ہجرت کر کے آئے یا ہجرت کرنے والوں کے لئے قیام کا انتظام کرے اور راہ خدا میں جان اور مال سے جہاد کرے۔ (سورہ انفال کی آخری آیت)

کیا۔^۱ چنانچہ بیعت عقبہ کے بعد ہجرت کرنے والوں میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ، حضرت عمار بن یاسر اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے اسماء گرامی سب سے پہلے ہیں۔ ان کے بعد سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیس نفر کے قافلہ کے ساتھ تشریف لائے اور قبائل رفاعہ بن عبد المنذر کے یہاں فروکش ہوئے۔^۲ پھر رفتہ رفتہ جس کو موقع ملا وہ مکہ سے نکل کر مدینہ پہنچا رہا۔

شوق استقبال :

حضرات انصار نے اس دعوت پر ہی اکتفا نہیں کی جو بیعت عقبہ کے سلسلہ میں دے چکے تھے۔ بلکہ بیعت کے بعد جب مدینہ واپس آ گئے تو یہاں سے چند حضرات مکہ تشریف لے گئے اور حضرات مہاجرین کے ساتھ واپس ہوئے ان کو مہاجر انصاری کہا جاتا ہے۔^۳

آنحضرت ﷺ کو دعا کی تلقین اور ہجرت کا اشارہ

سورہ اسراء کی چند آیتیں یہ ہیں:

اقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِ النَّبِيِّ إِلَى عَسَقِ اللَّيْلِ وَكُنْ مِنَ الْفَجْرِ إِنَّ فُتْرَانَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّخْمُودًا ۝ وَقُلْ رَبِّ ادْخُلْنِي مَدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مَخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِي مِنْ لَدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِيرًا ۝

ترجمہ: اے رسول نماز قائم کر سورج ڈھلنے کے وقت سے لے کر رات کے اندھیرے کے وقت تک (ظہر، عصر، مغرب، عشاء کے وقتوں میں) اور نماز فجر میں خاص اہتمام سے قرآن پڑھو۔ بلاشبہ صبح کے وقت تلاوت قرآن ایک ایسی تلاوت ہے جس میں حاضری زیادہ سے زیادہ ہوتی ہے۔^۴

اور اے نبی رات کا کچھ حصہ (یعنی پچھلا حصہ) شب بیداری میں بسر کر یہ تیرے لئے ایک مزید عمل ہے۔ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے ایسے مقام پر پہنچا دے جو نہایت پسندیدہ مقام ہو (جس کی تعریف کی جاتی ہے) اور تیری دعا یہ ہونی چاہئے کہ اے پروردگار (مجھے جہاں کہیں پہنچا تو) سچائی کے ساتھ پہنچا اور (جہاں کہیں سے نکال تو) سچائی کے ساتھ نکال۔ اور مجھے اپنے حضور سے

^۱ فتح الباری ص ۲۰۸ ج ۷

^۲ البیاض ص ۲۰۹ ج ۷

^۳ ان حضرات کے اسماء گرامی یہ ہیں: حضرت ذکوان بن عبد قیس، حضرت عقبہ بن وہب بن کلدہ، حضرت عباس بن عبادہ بن فضلہ، حضرت زیاد بن لبید رضی اللہ عنہم (ابن سعد ص ۱۵۲ ج ۱)

^۴ آفتاب پرستوں کی عبادت طلوع آفتاب کے وقت ہوتی ہے اور توحید پرستوں کی عبادت اس سے پہلے ہوتی ہے یا اس وقت جب ان معبودان باطل کا زوال ہوتا ہے۔

^۵ رات اور دن کے کارپرداز فرشتے اس وقت جمع ہوتے ہیں (بخاری شریف ص ۶۸۶ و ۹۰)

قوت عطا فرما۔ ایسی قوت کہ ہر حال میں مددگاری کرنے والی ہو۔ (آیات ۷۸ تا ۸۰ سورہ ۱۱ اسراء) تشریحات: (۱) سورہ اسراء جس کا آغاز معراج کے واقعہ سے ہوا۔ اسی کے نوں رکوع کی یہ آیات ہیں جن میں اس دعا کی تلقین ہوئی ہے۔ قُلْ رَبِّ ادْخُلْنِي مَدْخَلَ صِدْقٍ جہاں سے نکالنا ہو سچائی کے ساتھ نکال اور جہاں پہنچنا ہو سچائی کے ساتھ پہنچا جن میں بقول ابن عباس رضی اللہ عنہ (ہجرت) کا ایماء ہے۔

(۲) معراج شریف ابتلاء اور آزمائش کے اس نازک دور میں ہوئی جب آنحضرت ﷺ اور آپ کے حامی اور مددگار یعنی بنو ہاشم شعب ابی طالب میں پناہ گزیں اور محصور تھے اور اہل مکہ اور بالفاظ دیگر پوری دنیا آپ سے بایکٹ کئے ہوئے تھے۔ اسی شب میں پانچ نمازیں فرض ہوئیں۔ جن کی طرف ان آیتوں میں اشارہ ہے۔ ان کی تشریح آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیم اور عمل متواتر سے فرمائی۔

شعب ابی طالب میں محصور ہونے کا دورہ اور اس کے بعد کے سال وہ تھے جن میں آنحضرت ﷺ اور آپ کے رفقاء کی مظلومیت، لاچارگی اور بے ماگی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ ایسی حالت میں کون امید کر سکتا تھا کہ انہیں مظلومینوں سے فتح اور کامرانی پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن وحی الہی نے صرف فتح و کامرانی ہی کی بشارت نہیں دی کیونکہ فتح و کامرانی کی عظمت کوئی غیر معمولی عظمت نہیں تھی بلکہ ایسے مقام تک پہنچنے کی خبر دی جو نوع انسان کے لئے عظمت اور ارتقاء کی سب سے آخری منزل ہے۔ عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّخْمُودًا (بنی اسرائیل ۷۹)

فضل و کمال کا ایسا مقام جہاں پہنچ کر محمودیت خلافت کی عالمگیر اور دائمی عظمت حاصل ہو جائے۔ کوئی عہد ہو، کوئی ملک ہو، کوئی نسل ہو لیکن کروڑوں دلوں میں اس کی سائش ہوگی۔ ان گنت زبانوں پر اس کی مدحت طرازی ہوگی۔ محمود یعنی سر تا سر محمود ہستی ہو جائے گی:

ما شئت قل فیہ فانت مصدق فالحب یقضو والحباسن تشهد

”جو تعریف تم کرنا چاہو کرلو، تمہاری تعریف درست اور تم راست گو ہو گے، محبت کا یہی تقاضا ہے اور محاسن و کمالات اس کی شہادت دیتے ہیں“

یہ مقام انسانی عظمت کی انتہا ہے اس سے زیادہ اونچی جگہ اولاد آدم کو نہیں مل سکتی، اس سے زیادہ انسانی رفعت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ انسان کی سعی اور ہمت ہر طرح کی بلندیوں تک اڑ سکتی ہے لیکن یہ بات نہیں پاسکتی کہ روحوں کی ستائش اور دلوں کی مداحی کامرکز بن جائے، خالق کائنات اس کی مدح کرے اور وہ کائنات انسانی کی اس وقت مدد کرے جس وقت ہر ایک نفس خواہ

^۱ ترمذی شریف کتاب التفسیر ص ۱۴۲ ج ۲

منیٰ الفین کا منصوبہ

إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ^① كَيْدًا وَأَكِيدُ كَيْدًا فَمَهْلِكُ الْكُفْرَيْنَ أَهْلَهُمْ زُودُوا

(سورہ طارق۔ ۱۷-۱۸)

”وہ ایک منصوبہ بنا رہے ہیں اور میں ایک منصوبہ بنا رہا ہوں سو ڈھیل دیجئے منکروں کو تھوڑے دن ڈھیل دیجئے۔“^②

وَأَذِّنْكُمْ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُغْلِبُوا أَكِيدُ كَيْدًا ۖ وَتَكِيدُونَ^③ كَيْدًا ۖ وَاللَّهُ خَيْرٌ
الْمُكِيدِينَ (سورہ الانفال ۳۰)

”اور (اے نبی) وہ وقت یاد کرو جب مکہ میں کافر تیرے خلاف اپنی چھپی تدبیروں میں لگے تھے کہ تجھے باندھ کر ڈال دیں۔“^④ یا قتل یا جلاوطن کر دیں اور وہ اپنی مخفی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی مخفی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔“

وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفِزُّوكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا وَإِذَا لَا إِلَهَ إِلَّا قَلِيلًا سُنَّةٌ مِنْ قَدْ
أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا

(سورہ بنی اسرائیل آیت ۷۶، ۷۷)

اور انہوں نے اس میں بھی کوئی کسر اٹھانہ رکھی تھی کہ تجھے اس سرزمین (مکہ عرب) سے عاجز کر کے نکال دیں اور اگر ایسا کر بیٹھے تو (یاد رکھیں) تیرے (نکالے جانے کے پیچھے) مہلت نہ پاتے مگر بہت تھوڑی، (وہ سب تباہ کر دیئے جاتے) ہم تجھ سے پہلے جو پیغمبر بھیج چکے ہیں، ان سب کے معاملہ میں ہمارا قاعدہ یہی رہا ہے اور ہمارے ٹھہرائے قاعدے کو تو بدلتا ہوا نہ پائے گا۔“

تشریح: جس قوم نے اپنا نصب العین یہ بنا رکھا تھا کہ اسلام کا نام و نشان مٹا ڈالے اس کی ناکامی اس سے زیادہ کیا ہو سکتی تھی کہ جس کو وہ مٹانا چاہتی تھی وہ بڑھ رہا تھا، پھیل رہا تھا، اس کی حفاظت اور ترقی کے مرکز قائم ہو رہے تھے۔

عرب سے باہر افریقہ میں (مملکت حبش میں) مسلمانوں کی ایک جماعت پہنچی ہوئی تھی وہ ایک مرجع اور ایک مرکز بن گئی تھی۔ قریش کا نمائندہ وفد جو اس کو اکھاڑنے کے لئے گیا تھا وہ ناکام ہو چکا تھا۔ اب تازہ ناکامی یہ تھی کہ یثرب میں اور خاص ان میں جو نہ صرف قریش کے ہم عقیدہ اور پیرو تھے بلکہ

① قال ابن عباس هذا وعيد من الله عز وجل وقد اخذهم الله يوم بدر (تفسير مظہری)

② البیہ وہ لگے ہیں ایک داؤ کرنے میں اور میں لگا ہوں ایک داؤ کرنے میں۔ سو ڈھیل دے منکروں کو۔ ڈھیل دے

ان کو (مہر کر) (حضرت شاہ عبدالقادر)

③ تجھ کو بٹھادیں (حضرت شاہ ولی اللہ صاحب)

وہ نفس عوام ہو یا نفس خواص، کسی ولی مقرب کا نفس ہو یا کسی ادا العزم نبی مرسل کا نفس ”نفسی نفسی“ پکار رہا ہو۔

(۳) جس اولوالعزم نبی اور رسول کے بلند ترین درجات کا زینہ معراج تھا اور سطح اعلیٰ مقام محمود۔ اسی کی حیات مقدسہ کا اہم واقعہ ہجرت ہے۔

یہ ترک وطن معاذ اللہ جان بچانے کے لئے نہیں تھا بلکہ اس جہاد عظیم کے لئے تھا جس کا شمرہ مقام محمود ہے۔

یعنی رحمت کاملہ اور امن عالم کی وہ مقدس دعوت جس کا نام اسلام ہے، جس کے مبلغین اور داعیان کرام کی تربیت تیرہ سال تک مکہ کی سنگلاخ امتحان گاہ میں ہوتی رہی، اب وقت آیا ہے کہ اس کو وقف عام کیا جائے اور ایک شہر یا ایک علاقہ یا ملک کی تنگنائی سے نکال کر پورے عالم کو اس سے آشنا کیا جائے، اور وہ تمام مشقتیں برداشت کی جائیں اور تمام مصیبتیں جھیلی جائیں۔ جن کی نذر پیش کرنا ایسی غیر معمولی عظیم الشان دعوت کے لئے ضروری ہے، جس کی بنا پر رہتی دنیا تک آنحضرت ﷺ کی تعریف ہوتی رہے اور قیامت کو مقام محمود کا شرف اعظم حاصل ہو۔

یہ ترک وطن اسی جہاد عظیم کے لئے تھا۔ اسی لئے یہ ایک ایسا شرف تھا کہ اگر اللہ رب العالمین کو منظور نہ ہوتا کہ یہ شرف عطا کیا جائے تو محبوب رب العالمین ﷺ (مکی یا ہاشمی اور قریشی ہونے کے بجائے حضرات انصار میں سے ہوتے۔)^①

اسی ہجرت نے اس موقف کی بنیاد رکھی جہاں سے رحمۃ اللعالمین ﷺ اعلان فرمایا:

قُلْ يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رُسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَبِيْعًا ۚ الَّذِیْ لَکُمْ مِلْكُ السَّعٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

(سورہ اعراف آیت ۱۵۸)

(اے افراد نسل انسانی میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں، وہ خدا کہ آسمانوں اور زمین کی ساری بادشاہت اسی کی ہے۔)

مسجد جو اسلامی تعلیمات کے بموجب حیات اجتماعی کی علامت بلکہ شرط اول ہے، اس ہجرت کے بعد ہی وہ پہلا دن میسر آیا جس میں تاسیس مساجد کا سلسلہ شروع کیا گیا۔^② اسی پہلے دن کو اسلام کی نشات اجتماعی کا پہلا دن مانا گیا جس سے اسلامی سنہ (سنہ ہجری) کا آغاز کیا گیا۔^③

① لولا الهجرة لکننت امراً من الانصار (بخاری شریف ص ۵۳۳)

② قال اللہ تعالیٰ: لبسجد اسس علی التقوی من اول یوم قال السہیلی من اول یوم حل النبی صلی اللہ علیہ وسلم

بدار الهجرة (تفسیر مظہری)

③ بخاری شریف ص ۵۶۰ حدیث سہل بن سعد

ان میں قریش کی رشتہ داری اور قربت بھی تھی^۱ اسلام کی جڑیں مضبوط ہو رہی تھیں۔ یہاں تک کہ ساری دنیا کا مقابلہ کرنے کے عزم اور حوصلہ کے ساتھ فداکاروں کی ایک جماعت منظم ہو چکی تھی۔ وہ سخت جان جو دس بارہ سال تک مکہ میں ہر طرح کی مصیبتیں جھیل کر اور امتحان و آزمائش کی بھٹی میں تپ کر کندن ہو چکے تھے وہ مکہ سے نکل نکل کر یثرب پہنچ رہے تھے، اور اس طرح ایک محاذ مضبوط ہو رہا تھا۔ اس پر قریش کے رہنما جتنے بھی خوف زدہ ہوں جتنے بھی چراغ پا ہوں کم تھا۔ کیونکہ زندگی اور موت کا سوال جو پہلے چلمن کے پیچھے سے جھانک رہا تھا اب بے نقاب ہو کر سامنے آچکا تھا۔ لہذا ضروری تھا کہ قریش کے تمام سردار سر جوڑ کر بیٹھیں اور پوری سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور کریں۔ چنانچہ مکہ کے تاریخی پہنچائت گھریا کو نسل ہاؤس (دارالندوہ) میں خاص اجلاس طلب کیا گیا۔ ارکان ندوہ کے علاوہ دوسرے ہمنوا رہنماؤں کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی۔ ایجنڈا (غور طلب اور فیصلہ طلب مسئلہ) یہی تھا کہ اسلام اور اس کے داعی کا قصہ کس طرح ختم کیا جائے۔

ربیع الاول کے پہلے ہفتہ میں یہ اجتماع ہوا اور پوری سنجیدگی سے مسئلہ پر غور کیا گیا۔ چند تجویزیں پیش کی گئیں:

(۱) محمد ﷺ کو بیڑیاں پہنا کر لوہے کی سلاخوں کے پیچھے باندھ کر ڈال دو^۲۔ محمد کا ایک شخص جو وہاں وقت پر پہنچ گیا تھا اس نے کہا: اس سے محمد ﷺ کی مقبولیت بڑھے گی۔ لوگوں کی ہمدردیاں زیادہ ہوگی اور بہت ممکن ہے اس کے ساتھی کسی طرح اس کو چھڑا کر لے جائیں، اس سے قریش کی بدنامی اور ہوا خیزی ہوگی۔

(۲) محمد ﷺ کو دوطن سے نکال دو۔^۳ تمہیں چھٹی مل جائے گی۔ تم اپنا نظام قائم کر سکو گے

^۱ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور ان کے تقریباً تیس ساتھی یمن سے بذریعہ جہاز روانہ ہوئے کہ خدمت مبارک میں حاضر ہو کر اسلام قبول کریں۔ مگر باد مخالف نے جہاز کو بندر گاہ حجاز کے بجائے افریقہ کی بندر گاہ پر پہنچا دیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی ایک جماعت جشن میں موجود ہے تو اس کے پاس پہنچے اور اسلام قبول کر کے اس کے ساتھ رہنے لگے اور فتح خیبر کے موقع پر سہ ماہی میں وہ سید الانبیاء ﷺ کی بارگاہ اقدس میں باریاب ہوئے۔ (بخاری شریف ص ۵۴ وغیرہ)

^۲ پیش کرنے والا: رئیس قریش ابوالختری، مقتول غزوہ بدر

^۳ یٰٰیثُیٰثُؤَنَّ (الانفال-۳۰)

^۴ اَوْ یُخْرِجُوكَ (الانفال-۳۰) نیز آخری آیت وَ اِنْ كَاذِبُوْا لَنَسْتَعْرِضْكَ مِنْ اَلْاَرْضِ۔ (بنی اسرائیل-۷۶) پورا ترجمہ اوپر گزر چکا ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تجویز بھی کافی اہمیت اختیار کر چکی تھی کہ وہ آنحضرت ﷺ کو پریشان اور عاجز کر کے سرزمین عرب سے ہی نکال دیں۔ بظاہر اس پر عمل اس لئے نہیں ہوا کہ اس میں یہ خطرہ محسوس کیا گیا کہ یہ جہاں پہنچ جائیں گے وہاں اپنا مرکز قائم کر کے حملہ کر دیں گے اور قریش کو تباہ کر دیں گے۔ مگر ارشاد ربانی کا تقاضا ہے کہ حضرت حق جل مجدہ اس قوم عرب یا قبیلہ کو برباد کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے یہ تجویز منظور کی گئی کیونکہ اگر وہ ایسا کرتے تو سنت اللہ یہ ہے کہ وہ قوم برباد ہو جاتی ہے جو اپنے نبی کو جلا وطن کر دے۔

اور موجودہ انتشار ختم ہو جائے گا۔

نجدی شیخ: بہت غلط رائے ہے، وہ ہوشیار ہے اور اس کے کلام میں ایسی طاقت ہے کہ جہاں جائے گا اپنا جتنا بنالے گا۔ تمہارے لئے عذاب بن جائے گا۔

(۳) ابو جہل: میری تو قطعی رائے یہ ہے کہ محمد کا کام تمام کر دیا جائے۔ باقی یہ خطرہ کہ اس کے ولی (بنو ہاشم) انتقام لیں گے اور اس طرح قبائلی جنگ بھڑک اٹھے گی تو اس سے نجات کی صورت یہ ہے کہ کسی ایک قبیلہ کے آدمی قتل نہ کریں بلکہ ہر ایک قبیلہ سے آدمی منتخب کئے جائیں، یہ سب مل کر حملہ کریں اس صورت میں خون کی ذمہ داری سب پر ہوگی۔ بنو ہاشم اس اجتماعی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ لامحالہ دیت اور خون بہاٹے ہوگا جس کو ہم لامحالہ سب مل کر ادا کریں گے۔ تمام اراکین نے ابو جہل کی تجویز سے اتفاق کیا اور اس کی تیاری شروع کر دی۔^۱

مُخْرِجُ صِدْقِ (مکہ سے ہجرت) اور امداد خداوندی

اٰخِرُ حَیٰثِیْ مُخْرِجُ صِدْقِ (بنی اسرائیل آیت ۸۰)

”اے رب جہاں سے تو مجھ کو نکالے تو سچائی کے ساتھ نکال“

اَلَا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الْاٰیْمٰنِیْنَ کَفَرًا (توبہ آیت ۴۰)

”اگر تم مدد نہ کرو گے رسول کی تو اللہ نے اس کی مدد کی ہے جب نکالا اس کو کافروں نے“

گرمیوں کا موسم، ستمبر کی ۳۱ تاریخ، ربیع الاول کی یکم^۲، پیر کا دن، مکہ والے گرمیوں میں مکان سے باہر ڈیوڑھیوں کے سامنے راستہ کے کنارے پر چار پائیاں بچھا لیتے ہیں اور آدھی رات تک گپ شپ کرتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا معمول یہ ہے کہ تہائی رات تک نماز عشاء سے فارغ ہو جاتے ہیں پھر کچھ سورتوں کی تلاوت فرماتے ہوئے با وضو بستر پر اور عموماً کھری چار پائی پر آرام فرماتے ہیں اس وقت کچھ آنکھ لگ جاتی ہے۔ صحن میں آپ تنہا ہی ہوتے ہیں یا آپ کی زوجہ مطہرہ۔

لیکن آج خلاف معمول آرام نہیں فرما رہے اور آج آپ تنہا بھی نہیں ہیں آپ کے چچا زاد بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ جن کی عمر تقریباً بائیس سال ہے وہ بھی حاضر ہیں اور کچھ باتیں ہو رہی ہیں

^۱ الہدایہ والنبایہ ص ۷۵ ۷۶ ۷۷ ۷۸ ۷۹ ۸۰ ۸۱ ۸۲ ۸۳ ۸۴ ۸۵ ۸۶ ۸۷ ۸۸ ۸۹ ۹۰ ۹۱ ۹۲ ۹۳ ۹۴ ۹۵ ۹۶ ۹۷ ۹۸ ۹۹ ۱۰۰ ۱۰۱ ۱۰۲ ۱۰۳ ۱۰۴ ۱۰۵ ۱۰۶ ۱۰۷ ۱۰۸ ۱۰۹ ۱۱۰ ۱۱۱ ۱۱۲ ۱۱۳ ۱۱۴ ۱۱۵ ۱۱۶ ۱۱۷ ۱۱۸ ۱۱۹ ۱۲۰ ۱۲۱ ۱۲۲ ۱۲۳ ۱۲۴ ۱۲۵ ۱۲۶ ۱۲۷ ۱۲۸ ۱۲۹ ۱۳۰ ۱۳۱ ۱۳۲ ۱۳۳ ۱۳۴ ۱۳۵ ۱۳۶ ۱۳۷ ۱۳۸ ۱۳۹ ۱۴۰ ۱۴۱ ۱۴۲ ۱۴۳ ۱۴۴ ۱۴۵ ۱۴۶ ۱۴۷ ۱۴۸ ۱۴۹ ۱۵۰ ۱۵۱ ۱۵۲ ۱۵۳ ۱۵۴ ۱۵۵ ۱۵۶ ۱۵۷ ۱۵۸ ۱۵۹ ۱۶۰ ۱۶۱ ۱۶۲ ۱۶۳ ۱۶۴ ۱۶۵ ۱۶۶ ۱۶۷ ۱۶۸ ۱۶۹ ۱۷۰ ۱۷۱ ۱۷۲ ۱۷۳ ۱۷۴ ۱۷۵ ۱۷۶ ۱۷۷ ۱۷۸ ۱۷۹ ۱۸۰ ۱۸۱ ۱۸۲ ۱۸۳ ۱۸۴ ۱۸۵ ۱۸۶ ۱۸۷ ۱۸۸ ۱۸۹ ۱۹۰ ۱۹۱ ۱۹۲ ۱۹۳ ۱۹۴ ۱۹۵ ۱۹۶ ۱۹۷ ۱۹۸ ۱۹۹ ۲۰۰ ۲۰۱ ۲۰۲ ۲۰۳ ۲۰۴ ۲۰۵ ۲۰۶ ۲۰۷ ۲۰۸ ۲۰۹ ۲۱۰ ۲۱۱ ۲۱۲ ۲۱۳ ۲۱۴ ۲۱۵ ۲۱۶ ۲۱۷ ۲۱۸ ۲۱۹ ۲۲۰ ۲۲۱ ۲۲۲ ۲۲۳ ۲۲۴ ۲۲۵ ۲۲۶ ۲۲۷ ۲۲۸ ۲۲۹ ۲۳۰ ۲۳۱ ۲۳۲ ۲۳۳ ۲۳۴ ۲۳۵ ۲۳۶ ۲۳۷ ۲۳۸ ۲۳۹ ۲۴۰ ۲۴۱ ۲۴۲ ۲۴۳ ۲۴۴ ۲۴۵ ۲۴۶ ۲۴۷ ۲۴۸ ۲۴۹ ۲۵۰ ۲۵۱ ۲۵۲ ۲۵۳ ۲۵۴ ۲۵۵ ۲۵۶ ۲۵۷ ۲۵۸ ۲۵۹ ۲۶۰ ۲۶۱ ۲۶۲ ۲۶۳ ۲۶۴ ۲۶۵ ۲۶۶ ۲۶۷ ۲۶۸ ۲۶۹ ۲۷۰ ۲۷۱ ۲۷۲ ۲۷۳ ۲۷۴ ۲۷۵ ۲۷۶ ۲۷۷ ۲۷۸ ۲۷۹ ۲۸۰ ۲۸۱ ۲۸۲ ۲۸۳ ۲۸۴ ۲۸۵ ۲۸۶ ۲۸۷ ۲۸۸ ۲۸۹ ۲۹۰ ۲۹۱ ۲۹۲ ۲۹۳ ۲۹۴ ۲۹۵ ۲۹۶ ۲۹۷ ۲۹۸ ۲۹۹ ۳۰۰ ۳۰۱ ۳۰۲ ۳۰۳ ۳۰۴ ۳۰۵ ۳۰۶ ۳۰۷ ۳۰۸ ۳۰۹ ۳۱۰ ۳۱۱ ۳۱۲ ۳۱۳ ۳۱۴ ۳۱۵ ۳۱۶ ۳۱۷ ۳۱۸ ۳۱۹ ۳۲۰ ۳۲۱ ۳۲۲ ۳۲۳ ۳۲۴ ۳۲۵ ۳۲۶ ۳۲۷ ۳۲۸ ۳۲۹ ۳۳۰ ۳۳۱ ۳۳۲ ۳۳۳ ۳۳۴ ۳۳۵ ۳۳۶ ۳۳۷ ۳۳۸ ۳۳۹ ۳۴۰ ۳۴۱ ۳۴۲ ۳۴۳ ۳۴۴ ۳۴۵ ۳۴۶ ۳۴۷ ۳۴۸ ۳۴۹ ۳۵۰ ۳۵۱ ۳۵۲ ۳۵۳ ۳۵۴ ۳۵۵ ۳۵۶ ۳۵۷ ۳۵۸ ۳۵۹ ۳۶۰ ۳۶۱ ۳۶۲ ۳۶۳ ۳۶۴ ۳۶۵ ۳۶۶ ۳۶۷ ۳۶۸ ۳۶۹ ۳۷۰ ۳۷۱ ۳۷۲ ۳۷۳ ۳۷۴ ۳۷۵ ۳۷۶ ۳۷۷ ۳۷۸ ۳۷۹ ۳۸۰ ۳۸۱ ۳۸۲ ۳۸۳ ۳۸۴ ۳۸۵ ۳۸۶ ۳۸۷ ۳۸۸ ۳۸۹ ۳۹۰ ۳۹۱ ۳۹۲ ۳۹۳ ۳۹۴ ۳۹۵ ۳۹۶ ۳۹۷ ۳۹۸ ۳۹۹ ۴۰۰ ۴۰۱ ۴۰۲ ۴۰۳ ۴۰۴ ۴۰۵ ۴۰۶ ۴۰۷ ۴۰۸ ۴۰۹ ۴۱۰ ۴۱۱ ۴۱۲ ۴۱۳ ۴۱۴ ۴۱۵ ۴۱۶ ۴۱۷ ۴۱۸ ۴۱۹ ۴۲۰ ۴۲۱ ۴۲۲ ۴۲۳ ۴۲۴ ۴۲۵ ۴۲۶ ۴۲۷ ۴۲۸ ۴۲۹ ۴۳۰ ۴۳۱ ۴۳۲ ۴۳۳ ۴۳۴ ۴۳۵ ۴۳۶ ۴۳۷ ۴۳۸ ۴۳۹ ۴۴۰ ۴۴۱ ۴۴۲ ۴۴۳ ۴۴۴ ۴۴۵ ۴۴۶ ۴۴۷ ۴۴۸ ۴۴۹ ۴۵۰ ۴۵۱ ۴۵۲ ۴۵۳ ۴۵۴ ۴۵۵ ۴۵۶ ۴۵۷ ۴۵۸ ۴۵۹ ۴۶۰ ۴۶۱ ۴۶۲ ۴۶۳ ۴۶۴ ۴۶۵ ۴۶۶ ۴۶۷ ۴۶۸ ۴۶۹ ۴۷۰ ۴۷۱ ۴۷۲ ۴۷۳ ۴۷۴ ۴۷۵ ۴۷۶ ۴۷۷ ۴۷۸ ۴۷۹ ۴۸۰ ۴۸۱ ۴۸۲ ۴۸۳ ۴۸۴ ۴۸۵ ۴۸۶ ۴۸۷ ۴۸۸ ۴۸۹ ۴۹۰ ۴۹۱ ۴۹۲ ۴۹۳ ۴۹۴ ۴۹۵ ۴۹۶ ۴۹۷ ۴۹۸ ۴۹۹ ۵۰۰ ۵۰۱ ۵۰۲ ۵۰۳ ۵۰۴ ۵۰۵ ۵۰۶ ۵۰۷ ۵۰۸ ۵۰۹ ۵۱۰ ۵۱۱ ۵۱۲ ۵۱۳ ۵۱۴ ۵۱۵ ۵۱۶ ۵۱۷ ۵۱۸ ۵۱۹ ۵۲۰ ۵۲۱ ۵۲۲ ۵۲۳ ۵۲۴ ۵۲۵ ۵۲۶ ۵۲۷ ۵۲۸ ۵۲۹ ۵۳۰ ۵۳۱ ۵۳۲ ۵۳۳ ۵۳۴ ۵۳۵ ۵۳۶ ۵۳۷ ۵۳۸ ۵۳۹ ۵۴۰ ۵۴۱ ۵۴۲ ۵۴۳ ۵۴۴ ۵۴۵ ۵۴۶ ۵۴۷ ۵۴۸ ۵۴۹ ۵۵۰ ۵۵۱ ۵۵۲ ۵۵۳ ۵۵۴ ۵۵۵ ۵۵۶ ۵۵۷ ۵۵۸ ۵۵۹ ۵۶۰ ۵۶۱ ۵۶۲ ۵۶۳ ۵۶۴ ۵۶۵ ۵۶۶ ۵۶۷ ۵۶۸ ۵۶۹ ۵۷۰ ۵۷۱ ۵۷۲ ۵۷۳ ۵۷۴ ۵۷۵ ۵۷۶ ۵۷۷ ۵۷۸ ۵۷۹ ۵۸۰ ۵۸۱ ۵۸۲ ۵۸۳ ۵۸۴ ۵۸۵ ۵۸۶ ۵۸۷ ۵۸۸ ۵۸۹ ۵۹۰ ۵۹۱ ۵۹۲ ۵۹۳ ۵۹۴ ۵۹۵ ۵۹۶ ۵۹۷ ۵۹۸ ۵۹۹ ۶۰۰ ۶۰۱ ۶۰۲ ۶۰۳ ۶۰۴ ۶۰۵ ۶۰۶ ۶۰۷ ۶۰۸ ۶۰۹ ۶۱۰ ۶۱۱ ۶۱۲ ۶۱۳ ۶۱۴ ۶۱۵ ۶۱۶ ۶۱۷ ۶۱۸ ۶۱۹ ۶۲۰ ۶۲۱ ۶۲۲ ۶۲۳ ۶۲۴ ۶۲۵ ۶۲۶ ۶۲۷ ۶۲۸ ۶۲۹ ۶۳۰ ۶۳۱ ۶۳۲ ۶۳۳ ۶۳۴ ۶۳۵ ۶۳۶ ۶۳۷ ۶۳۸ ۶۳۹ ۶۴۰ ۶۴۱ ۶۴۲ ۶۴۳ ۶۴۴ ۶۴۵ ۶۴۶ ۶۴۷ ۶۴۸ ۶۴۹ ۶۵۰ ۶۵۱ ۶۵۲ ۶۵۳ ۶۵۴ ۶۵۵ ۶۵۶ ۶۵۷ ۶۵۸ ۶۵۹ ۶۶۰ ۶۶۱ ۶۶۲ ۶۶۳ ۶۶۴ ۶۶۵ ۶۶۶ ۶۶۷ ۶۶۸ ۶۶۹ ۶۷۰ ۶۷۱ ۶۷۲ ۶۷۳ ۶۷۴ ۶۷۵ ۶۷۶ ۶۷۷ ۶۷۸ ۶۷۹ ۶۸۰ ۶۸۱ ۶۸۲ ۶۸۳ ۶۸۴ ۶۸۵ ۶۸۶ ۶۸۷ ۶۸۸ ۶۸۹ ۶۹۰ ۶۹۱ ۶۹۲ ۶۹۳ ۶۹۴ ۶۹۵ ۶۹۶ ۶۹۷ ۶۹۸ ۶۹۹ ۷۰۰ ۷۰۱ ۷۰۲ ۷۰۳ ۷۰۴ ۷۰۵ ۷۰۶ ۷۰۷ ۷۰۸ ۷۰۹ ۷۱۰ ۷۱۱ ۷۱۲ ۷۱۳ ۷۱۴ ۷۱۵ ۷۱۶ ۷۱۷ ۷۱۸ ۷۱۹ ۷۲۰ ۷۲۱ ۷۲۲ ۷۲۳ ۷۲۴ ۷۲۵ ۷۲۶ ۷۲۷ ۷۲۸ ۷۲۹ ۷۳۰ ۷۳۱ ۷۳۲ ۷۳۳ ۷۳۴ ۷۳۵ ۷۳۶ ۷۳۷ ۷۳۸ ۷۳۹ ۷۴۰ ۷۴۱ ۷۴۲ ۷۴۳ ۷۴۴ ۷۴۵ ۷۴۶ ۷۴۷ ۷۴۸ ۷۴۹ ۷۵۰ ۷۵۱ ۷۵۲ ۷۵۳ ۷۵۴ ۷۵۵ ۷۵۶ ۷۵۷ ۷۵۸ ۷۵۹ ۷۶۰ ۷۶۱ ۷۶۲ ۷۶۳ ۷۶۴ ۷۶۵ ۷۶۶ ۷۶۷ ۷۶۸ ۷۶۹ ۷۷۰ ۷۷۱ ۷۷۲ ۷۷۳ ۷۷۴ ۷۷۵ ۷۷۶ ۷۷۷ ۷۷۸ ۷۷۹ ۷۸۰ ۷۸۱ ۷۸۲ ۷۸۳ ۷۸۴ ۷۸۵ ۷۸۶ ۷۸۷ ۷۸۸ ۷۸۹ ۷۹۰ ۷۹۱ ۷۹۲ ۷۹۳ ۷۹۴ ۷۹۵ ۷۹۶ ۷۹۷ ۷۹۸ ۷۹۹ ۸۰۰ ۸۰۱ ۸۰۲ ۸۰۳ ۸۰۴ ۸۰۵ ۸۰۶ ۸۰۷ ۸۰۸ ۸۰۹ ۸۱۰ ۸۱۱ ۸۱۲ ۸۱۳ ۸۱۴ ۸۱۵ ۸۱۶ ۸۱۷ ۸۱۸ ۸۱۹ ۸۲۰ ۸۲۱ ۸۲۲ ۸۲۳ ۸۲۴ ۸۲۵ ۸۲۶ ۸۲۷ ۸۲۸ ۸۲۹ ۸۳۰ ۸۳۱ ۸۳۲ ۸۳۳ ۸۳۴ ۸۳۵ ۸۳۶ ۸۳۷ ۸۳۸ ۸۳۹ ۸۴۰ ۸۴۱ ۸۴۲ ۸۴۳ ۸۴۴ ۸۴۵ ۸۴۶ ۸۴۷ ۸۴۸ ۸۴۹ ۸۵۰ ۸۵۱ ۸۵۲ ۸۵۳ ۸۵۴ ۸۵۵ ۸۵۶ ۸۵۷ ۸۵۸ ۸۵۹ ۸۶۰ ۸۶۱ ۸۶۲ ۸۶۳ ۸۶۴ ۸۶۵ ۸۶۶ ۸۶۷ ۸۶۸ ۸۶۹ ۸۷۰ ۸۷۱ ۸۷۲ ۸۷۳ ۸۷۴ ۸۷۵ ۸۷۶ ۸۷۷ ۸۷۸ ۸۷۹ ۸۸۰ ۸۸۱ ۸۸۲ ۸۸۳ ۸۸۴ ۸۸۵ ۸۸۶ ۸۸۷ ۸۸۸ ۸۸۹ ۸۹۰ ۸۹۱ ۸۹۲ ۸۹۳ ۸۹۴ ۸۹۵ ۸۹۶ ۸۹۷ ۸۹۸ ۸۹۹ ۹۰۰ ۹۰۱ ۹۰۲ ۹۰۳ ۹۰۴ ۹۰۵ ۹۰۶ ۹۰۷ ۹۰۸ ۹۰۹ ۹۱۰ ۹۱۱ ۹۱۲ ۹۱۳ ۹۱۴ ۹۱۵ ۹۱۶ ۹۱۷ ۹۱۸ ۹۱۹ ۹۲۰ ۹۲۱ ۹۲۲ ۹۲۳ ۹۲۴ ۹۲۵ ۹۲۶ ۹۲۷ ۹۲۸ ۹۲۹ ۹۳۰ ۹۳۱ ۹۳۲ ۹۳۳ ۹۳۴ ۹۳۵ ۹۳۶ ۹۳۷ ۹۳۸ ۹۳۹ ۹۴۰ ۹۴۱ ۹۴۲ ۹۴۳ ۹۴۴ ۹۴۵ ۹۴۶ ۹۴۷ ۹۴۸ ۹۴۹ ۹۵۰ ۹۵۱ ۹۵۲ ۹۵۳ ۹۵۴ ۹۵۵ ۹۵۶ ۹۵۷ ۹۵۸ ۹۵۹ ۹۶۰ ۹۶۱ ۹۶۲ ۹۶۳ ۹۶۴ ۹۶۵ ۹۶۶ ۹۶۷ ۹۶۸ ۹۶۹ ۹۷۰ ۹۷۱ ۹۷۲ ۹۷۳ ۹۷۴ ۹۷۵ ۹۷۶ ۹۷۷ ۹۷۸ ۹۷۹ ۹۸۰ ۹۸۱ ۹۸۲ ۹۸۳ ۹۸۴ ۹۸۵ ۹۸۶ ۹۸۷ ۹۸۸ ۹۸۹ ۹۹۰ ۹۹۱ ۹۹۲ ۹۹۳ ۹۹۴ ۹۹۵ ۹۹۶ ۹۹۷ ۹۹۸ ۹۹۹ ۱۰۰۰

محمد خالدي صاحب ایم اے (عثمانیہ) کے لحاظ سے یہ تاریخ اور دن مقرر کیا ہے (واللہ اعلم بالصواب)

جیسے حساب سمجھا رہے ہیں۔

دوسری طرف عجیب بات یہ ہے کہ مکان سے باہر کچھ آدمی آرہے ہیں، تلواریں ان کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ نہایت خاموشی سے آتے ہیں اور دروازے کے قریب بیٹھ جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ دس بارہ آدمی آگئے ہیں ان میں ابو جہل بھی ہے ابولہب بھی۔ اور عقبہ بن ابی معیط اور امیہ بن خلف بھی۔ ان میں سے کوئی اٹھتا ہے اور کواڑوں کی دراز سے اندر جھانکتا ہے۔

اب آدمی رات گزر چکی ہے۔ آخری پہر شروع ہو گیا پورے مکہ پر سنانا چھا گیا۔ یہ کافر جو باہر آگئے تھے غالباً کھڑے کھڑے تھک گئے۔ اس لئے قطار لگا کر دروازہ کے سامنے بیٹھ گئے ہیں۔ دفعۃً آنحضرت ﷺ اٹھتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر لٹاتے ہیں اپنی چادر ان کے اوپر ڈال دیتے ہیں پھر دروازہ سے باہر تشریف لاتے ہیں۔ سورہ یسین تلاوت فرما رہے ہیں اور جب کافروں کے برابر پہنچتے ہیں تو یہ آیت زبان مبارک پر ہے:

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ

(یسین۔ ۹)

ترجمہ: ”کردی ہم نے ان کے آگے دیوار اور ان کے پیچھے دیوار، پھر اوپر سے ڈھانک دیا۔ سو ان کو نظر نہیں آتا۔“

اب نہیں کہا جاسکتا کہ ان کافروں کو نیند آگئی تھی یا جیسا کہ آیت کا مفہوم ہے ان کی آنکھوں کے سامنے دیوار کھڑی کر دی گئی تھی۔ لیکن جو اطمینان آنحضرت ﷺ کو ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے قدرت نے کوئی دیوار کھڑی کر دی ہے جس کو آپ محسوس فرما رہے ہیں (ﷺ)۔ اطمینان کی بھی انتہا ہوئی کہ آپ یونہی نہیں گذر جاتے بلکہ دست مبارک میں مٹی ① لیتے ہیں اور ہر ایک کے سر پر مٹی رکھتے ہوئے تشریف لے جاتے ہیں۔ یہ نبی کا اعتماد، وثوق اور یقین ہے خدا پر اور خدا کے کلام پاک پر۔

خدا پر بھروسہ اور اطمینان کی دوسری مثال یہ نوجوان علی رضی اللہ عنہ پیش کر رہے ہیں کہ وہ بستر پر آرام سے لیٹے ہیں۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ آج کی شب، شب مقتل ہے۔ دشمن اسی لئے اکٹھے ہو رہے ہیں کہ اس بستر والے کو ذبح کریں، آرام گاہ کو ذبح خانہ بنائیں۔ بستر والا نہ ہو تو جو بستر پر ہو گا وہ ذبح ہو گا۔ مگر یا تو اللہ کی حفاظت پر اطمینان کامل ہے یا دیدار محبوب کے شوق مضطر نے موت کو بھی محبوب بنا دیا ہے۔

اگر مشاہدہ دوست از پس مرگ است حیات خضر و مسیحا نصیب دشمن باد

① ابن سعد وابن ہشام (وغیرہ)

یہی تسکین بخش اطمینان ہے کہ جیسے ہی لیٹتے ہیں سو جاتے ہیں۔ خدا جانے کتنی دیر تک یہ دشمن جو تلواریں لئے بیٹھے تھے غافل بیٹھے رہے۔ انہیں ایک شخص نے آخر چوکا یا جس نے خبر دی کہ جس کو تم قتل کرنے آئے تھے وہ نکل گیا اور تمہاری غفلت کی انتہا ہے کہ خاک تمہارے سروں پر ہے اور تمہیں خبر نہیں۔ اب یہ گھبرا کر اٹھے، سروں پر ہاتھ پھیرے تو خاک آلود تھے۔ یقین ہو گیا کہ یہ شخص سچ کہتا ہے۔ دروازہ دیکھا تو وہ بھی کھلا ہوا تھا۔

کسی کے مکان میں گھسنا بہت معیوب تھا، مگر یہ لوگ ضابطہ اخلاق سے دامن جھاڑ کر خاص منصوبہ کے تحت آئے تھے اور اب ناکامی کی جھونک بھی تھی۔ غصہ اور جوش میں اندر گھس گئے، دیکھا کہ ایک سن رسیدہ (محمد ﷺ فداہ روحی) کی جگہ خواجہ ابوطالب کا سب سے چھوٹا لڑکا علی بستر پر دراز خراٹے لے رہا ہے۔

حواس باختہ دشمنوں نے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ پوچھا محمد ﷺ کہاں ہے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: مجھے کیا خبر؟ جواب صحیح تھا، انہیں خبر نہیں تھی بہت پوچھ کچھ کی ڈرایا دھمکایا مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کچھ نہیں بتا سکے۔

یہاں سے دوڑتے ہوئے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مکان پر گئے۔ ایک لڑکی (بڑی صاحبزادی حضرت اسماء) سامنے آئی۔ پوچھا تمہارے باپ کہاں ہیں؟ مجھے خبر نہیں۔ لڑکی نے جواب دیا۔ ابو جہل نے اس معصومہ کے اتنی زور سے طمانچہ مارا کہ کان کی بالی گر گئی۔ ①

جب ان بد بختوں کو یقین ہو گیا کہ شکار ہاتھ سے نکل گیا تو اس کی تلاش میں دوڑے۔ مکہ کی گلی گلی چھان ماری اور جب کہیں پتہ نہ چلا تو فوراً منادی کرا دی کہ جو محمد اور اس کے ساتھی کو زندہ گرفتار کر کے لائے یا ان کا سر لائے اس کو (ایک دیت کے بموجب) سو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے ②۔ سو اونٹ کا انعام معمولی نہیں تھا۔ انعام کے شوق میں بہت سے من چلے دوڑے مگر کامیابی کسی کو بھی نہیں ہوئی۔ کیونکہ رب محمد اپنے محمد کی مدد کر رہا تھا۔ (ﷺ) یہی تو ہے ارشاد خداوندی فَقَدْ نَصَرْنَا اللَّهَ (التوبہ۔ ۴۰) بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اس کی (آنحضرت ﷺ کی مدد کی) اور وہ جو دعائیں گئی تھی جس کا ایک جز تھا ”وَاجْعَلْنِي مِنْ لَدُنْكَ سُلْطٰنًا نَصِيْرًا“ (بنی اسرائیل۔ ۸۰) ”اور مجھے اپنے حضور سے قوت عطا فرما ایسی قوت جو ہر حال میں میری مددگار ہو“ تو اس اطمینان سے زیادہ جس سے پوری طرح مسلح ہو کر آنحضرت ﷺ بستر سے اٹھے اور روانہ ہوئے تھے، سُلْطٰنًا نَصِيْرًا ③ کیا ہو سکتا ہے۔

① ابن سعد وابن ہشام وغیرہ

② بخاری شریف ص ۵۵۴

③ ایسی قوت جو ہر حال میں مددگار ہو

صادق و امین کی امانت داری:

دشمنوں نے اگرچہ یہ خطاب^۱ اب چھوڑ دیا تھا مگر آپ کی صداقت و امانت ان دشمنوں کی خاطر نہیں تھی۔ بلکہ اس لئے تھی کہ آپ کی فطرت مبارکہ کا جو ہر تھی۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جو سمجھا رہے تھے وہ ان امانتوں کا حساب ہی تھا جو انہیں دشمنوں کی آپ کے پاس تھیں، جو اب منصوبہ قتل ناحق کو کامیاب بنانے کے درپے تھے۔ آپ نے اس خطرناک اور بیت ناک فضا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اسی لئے چھوڑا تھا کہ جن کی امانتیں ہیں ان کو واپس کر کے اور پوری طرح حساب سمجھا کر تشریف لائیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تین دن بعد روانہ ہوئے جب امانتیں ادا کر چکے اور حساب سمجھا چکے۔

غار ثور میں قیام اور ضروری انتظامات

ثَانِي الثَّيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَخَوْنِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (البقرہ: ۲۰)

”صرف دو تھے دو میں سے ایک اللہ کے رسول تھے۔ جب کہ یہ دونوں غار میں تھے اور اللہ کے رسول اپنے صاحب (ساتھی) سے کہہ رہے تھے غمگین نہ ہو، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“ انبیاء علیہم السلام خدا پر پورا بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ اعلیٰ درجہ کے متوکل بلکہ آداب توکل کے معلم اور متوکلین کے امام و پیشوا ہوتے ہیں۔ اس غیر معمولی توکل اور اعتماد کے نتیجے میں غیبی تائید اور نصرت خداوندی کی وہ غیر معمولی صورتیں بھی پیش آتی رہتی ہیں جو انہیں کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں جن کو معجزہ کہا جاتا ہے۔ اس کے باوجود وہ ظاہری اور مادی اسباب کو نظر انداز نہیں کرتے کیونکہ وہ صرف خانقاہ نشین درویش نہیں ہوتے، ان کی زندگی صرف ان کے لئے نہیں ہوتی وہ نوع

۱ آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ عجیب بات ہے اللہ تعالیٰ نے میرے نام کو سب دشمن سے بچالیا۔ ان کو میرا نام لینا گوارا نہیں ہوتا یہ مذم کو برا بھلا کہتے ہیں حالانکہ میں محمد ہوں میرا نام مذم نہیں۔ (بخاری شریف ص ۵۰۱)

۲ یہ خطاب استعمال نہیں کرتے تھے مگر آپ کی صداقت اور امانت سے انکار نہیں تھا۔ ماننے تھے، جانتے تھے، پہچانتے تھے کہ آپ صادق و امین ہیں۔ اسی پر تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهَمْ لَمْ يَكْنُوْهُنَّ (مومنون: ۶۹) کیا ان لوگوں نے اپنے رسول کو پہچانا نہیں ہے کہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ قرآن حکیم نے اصل مرض کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِذَا دَا (البقرہ: ۱۶۵) (معبودان باطل) کی محبت ان لوگوں سے یہ حرکتیں کرتی تھی وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِذَا دُعِيَ لِلْحَيٰتِ يَوْمَئِذٍ كَذِبًا ۚ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشْكُوْا حُبًّا لِّهٖ (بقرہ: ۱۶۵) کچھ لوگ وہ ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر ان کو مانتے ہیں جن کو انہوں نے خدا کا شریک ٹھہرا رکھا ہے اور ان سے ایسی ہی محبت کرتے ہیں جیسی خدا سے کرنی چاہئے اور جو ایمان والے ہیں وہ بہت سخت ہوتے ہیں اللہ کی محبت میں۔ جب آمد ادینی معبودان باطل کی محبت اور خدا کی محبت میں یہ فرق ہوتا ہے کہ اللہ سے محبت کرنے والا ہٹ دھرمی نہیں کر سکتا کیونکہ اللہ کا حکم ہے کہ ہر موقع پر عدل و انصاف سے کام لو، حق کی شہادت دینے والے رہو، تَوَكَّلْ عَلٰی قُوْمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ بَيْنَہُمْ (نساء: ۱۳۵) اور معبودان باطل کا کوئی حکم ہی نہیں اگر ہے تو باطل پرستی لہذا وہ جو کچھ کر بیٹھے کم ہے۔

انسان کے معلم ہوتے ہیں اور ان کی زندگی پوری نوع انسان کے لئے سبق ہوتی ہے۔ مکان سے نکلنے وقت قدرت نے خاص طرح کی مدد کی، مگر آپ نے اور آپ کے رفیق خاص نے روپوش رہنے اور خفیہ روانگی کا جو نظام قائم کیا تھا وہ امت کے لئے بہترین سبق ہے۔ اس کی تفصیل خاص طور پر قابل مطالعہ ہے۔

دارالندوہ کا وہ اجلاس جس میں آپ کے متعلق غیر معمولی تجویز منظور کی گئی اور مشترکہ طور پر شہید کرنے کا منصوبہ طے کیا گیا۔ وہ غالباً صبح کے وقت ہوا۔ اس کی اطلاع بطور تائید غیبی آنحضرت ﷺ کو فوراً ہی ہو گئی^۱ اور فوراً ہی آپ نے روانگی کی تیاری شروع کر دی۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کا معمول یہ تھا کہ روزانہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے یہاں تشریف لایا کرتے تھے مگر صبح یا شام کو۔ ایک روز ہم نے دیکھا کہ ٹھیک دوپہر کے وقت تشریف لا رہے ہیں۔ سر مبارک پر کپڑا ڈالے ہوئے ہیں چہرہ مبارک کو کچھ کپڑے سے چھپائے ہوئے ہیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خبر دی گئی فوراً حاضر ہوئے۔ یا رسول اللہ آپ پر میرے ماں باپ قربان یہ ناوقت تشریف آوری کیسی؟

ارشاد ہوا: کچھ بات کرنی ہے تنہائی ہونی چاہئے۔ کوئی غیر آدمی ہو تو اسے ہٹا دو۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ: غیر کوئی نہیں دولڑکیاں ہیں ایک آپ کی خادمہ عائشہ دوسری اس کی بہن اسماء۔ فرمایا تمہیں معلوم ہے؟ مجھے ہجرت کی اجازت^۲ مل گئی ہے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ: یہ خادمہ ساتھ رہے گا۔^۳ آپ پر میرے ماں باپ قربان یا رسول اللہ۔ آنحضرت ﷺ: بہت اچھا۔

یہ اجازت ایسی بشارت تھی کہ فرط مسرت سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا کہ خوشی میں آنسو آجاتے ہیں۔

۱ ابن سعد کی روایت کا مفہوم یہ ہے کہ یہ منصوبہ طے کر کے لوگ منتشر ہو گئے (اجلاس ختم ہو گیا) جبرئیل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے یہ خبر سنائی اور کہا کہ آج کی شب اپنے اس بستر پر آرام نہ فرمائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر صدیق کے یہاں پہنچے ص ۱۱۵ ج ۱ اس تفصیل سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اجلاس صبح کے وقت ہوا۔

۲ بخاری شریف ص ۵۵۲ تا ۵۵۳

۳ یعنی آج یہ سفر اس لئے نہیں ہے کہ دشمنوں نے قتل کا منصوبہ بنا رکھا ہے بلکہ اس لئے ہے کہ اب تک ہجرت کی اجازت نہیں تھی آج مل گئی ہے۔ اور اگر دارالندوہ کا اجلاس رات کے وقت ہوا تھا تو اگرچہ اس کی اطلاع آنحضرت ﷺ کو فوراً مل گئی تھی مگر وہ پہر تک آپ نے روانگی کا قصد اس لئے نہیں کیا کہ اب تک ہجرت کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اب جیسے ہی اجازت ملی آپ نے تیاری شروع کر دی۔ واللہ اعلم بالصواب

۴ یہ ہے عشق رسول۔ اہل و عیال، مال اور جدائیداد وغیرہ کا کوئی تصور سامنے نہیں تھا قلب مضطر کی تڑپ صرف یہ ہے: الصابۃ بانی انت یا رسول اللہ (بخاری شریف ص ۵۵۳) آپ کی رفاقت میرے باپ آپ پر قربان یا رسول اللہ۔

پھر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: دو سائڈ نیاں تیار ہیں ان میں سے ایک منظور فرمائیے۔
آنحضرت ﷺ: ضرور مگر قیمت لین ہوگی۔^①

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم نے بڑی تیزی سے سلمان سفر کی تیاری شروع کر دی اور جلدی جلدی میں جو ناشتہ تیار ہو سکتا تھا وہ تیار کر لیا، پھر ہم نے چڑے کے تھیلے میں ناشتہ بھر دیا۔ ایک مشکیزے میں پانی بھر دیا، لیکن تھیلے کا منہ بند کرنے کے لئے کپڑے کی ضرورت تھی اور مشکیزے میں بھی تمہ نہیں تھا جس سے اس کو اٹھایا جاسکے، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بڑی ہمشیرہ (حضرت اسماء رضی اللہ عنہا) نے فوراً اپنے نطاق کے دو حصے کر لئے ایک میں کھانے کا تھیلہ باندھ دیا، دوسرے میں مشکیزہ باندھ دیا تاکہ اس کو اٹھایا جاسکے۔

رواگی: آنحضرت ﷺ دولت کدہ سے روانہ ہو کر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچے۔ پھر یہ دونوں مکان کی پشت کی طرف سے کھڑکی سے نکل کر کوہ ثور کی طرف روانہ ہو گئے جو مکہ معظمہ سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر ہے، اور جس کی چوٹی پر یہ غار ہے جس نے غار ثور کے نام سے غیر فانی شہرت حاصل کی۔

جب آپ روانہ ہوئے تو یہ دعا زبان مبارک پر تھی:

”الحمد لله الذي خلقني ولم اكن شيئا اللهم اعني على هول الدنيا و بوائق الدهر و مصائب الليالي و الايام - اللهم اصحبني في سفرى و اخلفني في اهلى و بارك لي فيما رزقتنى و لك فذللتنى و على صالح خلقى فتقومنى و اليك رب فصحبنى و الى الناس فلا تكلنى - رب البستف عفوين و انت ربى - اعوذ بوجهك الكريم الذي اشرفت له السبلت و الارض و كشفت به الظلمات و صلح عليه امرا و اولين

① یہ پہلے گزر چکا ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ چار ماہ پہلے یہ سائڈ نیاں خرید چکے تھے اور اس خیال سے کہ نہ معلوم کس وقت حکم ہو جائے۔ ان اونٹنیوں کو چر رہے تھے کہ سپرد نہیں کیا تھا بلکہ گھر پر کھڑا کر کے ان کو چارہ کھلاتے رہے تھے۔

② واقعی کی روایت ہے کہ ان دونوں کی قیمت آٹھ سو روپے تھی۔ آنحضرت ﷺ نے جو سائڈ فی منظور فرمائی وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے قبیلہ بنی قشیر سے خریدی تھی۔ اس کا نام قصواء رکھا گیا۔ یہ آنحضرت ﷺ کی سواری میں آخر تک رہی اور آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد بہت کم زندہ رہی۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں اس کی زندگی کا خاتمہ ہوا۔ (فتح الباری ص ۱۸۷ ج ۷)

③ پرانے نہیں تھے صرف ابلا ہو رہا تھا بکری کا گوشت تھا (فتح الباری بحوالہ واقعی ص ۱۸۸ ج ۷)

④ لبس فیہا عصام (سیرۃ ابن ہشام ص ۲۹۲ ج ۱)

⑤ نطاق خاص قسم کا تہ بند ہوتا تھا اس کا عرض تقریباً ڈھائی میٹر (۱۹۰ انچ) ہوتا تھا۔ اس کو بیچ سے باندھ دیا جاتا۔ پھر اوپر کا حصہ نیچے لٹکا دیا جاتا جس سے یہ دہر ہو جاتا تھا۔ (مجمع البحار و فتح الباری ص ۱۸۸ ج ۷)

⑥ یہ ابٹار عند اللہ مقبول ہوا۔ چنانچہ آپ کا خطاب ذات النطاقین ہو گیا۔ (بخاری شریف ص ۸۱۱)

⑦ سیرۃ ابن ہشام ص ۲۹۱ ج ۱ البدایہ و النہایہ ص ۱۷۸ ج ۳

⑧ ایضاً البدایہ و النہایہ ص ۱۷۸ ج ۳

والاخرین ان تحل علی غضبک و تنزل بی سخطک - و اعوذ بک من زوال نعمتک و فجائتہ نقبتک و تحول عافیتک و جبیم سخطک - لك العقی - عندی خیر ما استلعت لاحول و لا قوۃ الا بک“^①
سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ ساتھ ساتھ تھے مگر جذبہ بیتاب قابل دید تھا۔ کبھی آگے چلتے کبھی پیچھے۔ آنحضرت ﷺ نے دریافت کیا تو عرض کیا یا رسول اللہ آگے چلتا ہوں کہ حضور کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ خیال آتا ہے کہ شاید پیچھے سے تعاقب کرنے والے پہنچ جائیں تو پیچھے ہو جاتا ہوں۔ رحمۃ للعالمین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمہیں اپنی جان کا خطرہ نہیں ہے۔ عرض کیا حضرت وہ تو قربان ہونے کے لئے ہی ہے۔^②

راستہ طے ہوا۔ غار کے کنارے پہنچے تو عرض کیا: حضرت ذرا توقف فرمائیں، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ غار کے اندر اترے، صاف کیا پھر آقا و دو جہاں رضی اللہ عنہ سے عرض کیا تشریف لائیے۔

ان کو کیا فکر جن کا ساتھی اللہ ہو:

سوانح کا انعام جو قریش کی طرف سے مقرر کیا گیا تھا معمولی نہیں تھا۔ مکہ والوں کی بہت سی ٹولیاں انعام کے شوق میں دوڑ پڑیں۔ کچھ ٹولیاں اس طرف بھی آئیں۔ ایک ٹولی غار کے قریب پہنچی تو وہاں سے کبوتر اڑے۔ ایک ٹولی جھاڑ کے قریب تک پہنچی، اس نے دیکھا کہ جھاڑ پر مکڑی کا جالانا ہوا ہے۔ وہ جالادیکھ کر واپس ہو گئی۔^③

① ترجمہ: ”اس خدا کی حمد جس نے مجھے پیدا کیا اور انحالیکہ میں کچھ بھی نہیں تھا (مجھے نیست سے بہت کیا) اے اللہ میری مدد فرما، دنیا کی دہشت، زمانہ کے ہلاکت انگیز واقعات، رات اور دنوں (گردش روز و شب) کی مصیبتوں کے مقابلہ پر اے اللہ تو میرا ساتھی بن، وہ میرے سفر میں اور میرا قائم مقام بن میرے اہل و عیال میں میرے بعد، (میری غیبت میں تو ان کا محافظ اور نگران رہ) اور اے اللہ جو تو مجھ کو رزق دے اس میں برکت عطا فرما اور اے اللہ صرف اپنی ذات کے لئے ہی ایسا کر کہ مجھے اپنا مطیع اور اپنے سامنے عاجز بنا کر اور کے سامنے مجھے عاجز اور ذلیل نہ کر۔ اے اللہ نہایت صالح اور مناسب اعمال پر میری تربیت فرما! افعال خیر کے بہترین سانچے میں مجھے ڈھال دے اور اے میرے رب صرف اپنی طرف کی محبت ہی میرے اندر بھر دے اور جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے اے اللہ مجھے تو ان کے حوالے مت کر۔ اے کمزوروں کے رب تو ہی میرا رب ہے۔ میں تیری اس باعزت ذات کی جس کی برکت سے آسمان اور زمین روشن ہیں اور جس سے تمام تاریکیاں فنا ہو جاتی ہیں اور جس کے فضل و کرم سے پہلے لوگوں اور بعد والوں کا سب کا معاملہ درست ہوا۔ پناہ لیتا ہوں اس سے کہ میرے اوپر تیرا غضب اور تیری ناراضگی نازل ہو۔ میں تیری پناہ لیتا ہوں اس سے کہ تیرا انعام مجھ کو نصیب نہ ہو یا اس سے کہ تیرا عتاب دفعۃً مجھ پر نازل ہو جائے اور پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ تیری معافی جو مجھے میسر ہے اس میں تبدیلی آجائے اور میں ایسی ہر چیز سے پناہ چاہتا ہوں جو تیری ناراضی کا سبب ہو انجام کار تیرے ہی لئے ہے۔ میں جہاں تک میرے امکان میں ہے خیر اور بھلائی ہی کی کوشش کرتا ہوں (مگر) تیرے بغیر نہ کوئی طاقت ہے نہ کوئی قوت ہے جو مجھے قوت و طاقت ہے وہ تجھ سے ہی ہے۔“

② دلائل النبوت للبیہقی بحوالہ فتح الباری ص ۱۸۹ ج ۲

③ طبقات ابن سعد جلد اول ص ۱۵۳

ایک ٹولی اوپر چڑھی اور غار کے کنارے کے اوپر سے اس طرح گزر گئی کہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے پاؤں دیکھے۔ یہ ٹولی گزر چکی تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔

لوان احدہم نظرا لقدمیہ لا یبصرنا
”اگر ان میں سے کوئی اپنے پیروں پر نظر ڈالتا تو ہمیں دیکھ لیتا“
یہ نبی کا اطمینان و اعتماد تھا کہ برجستہ جواب دیا۔

اسکتا یا ابابکر! اثنان اللہ ثالثہما^۱

”خاموش رہو ابو بکر ہم دو ہمارا تیسرا اللہ ہے۔“

وفی رواية ما ظنك يا ابابکر باثنين اللہ، ثالثہما^۲

ایک روایت میں یہ ہے: ابو بکر! ان دو کے متعلق تم کیا گمان رکھتے ہو جن کا تیسرا اللہ ہے۔
سرور کائنات ﷺ کی یہ زحمت^۳ سفر، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی رفاقت اور رحمۃ اللعالمین
ﷺ کا یہ اعتماد بارگاہ رب العزت میں قبول ہوا۔ چنانچہ سورہ توبہ کی اس آیت (مذکورہ عنوان) میں
اس کا ذکر فرمایا گیا۔

سب کچھ قربان

يُؤْتُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر-۹)

(وہ مقدم رکھتے ہیں اپنے نفسوں پر باوجودیکہ خود انکو شدید حاجت اور سخت ضرورت ہوئی ہے)

یہ آیت اگرچہ ہجرت سے کئی سال بعد حضرات انصار (رضی اللہ عنہم) کے بارے میں نازل ہوئی مگر اس کی عملی مثال حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پہلے ہی پیش کر چکے تھے۔ جب آپ نے سفر ہجرت کے وقت اپنی پوری پونجی ساتھ لے لی تھی۔ پانچ چھ ہزار آپ کے پاس نقد تھے۔ آپ روانہ ہوئے تو آپ نے سب رقم ساتھ لے لی اور اہل و عیال کو خدا کے نام پر چھوڑ دیا۔ آپ کے بچوں کا ایثار یہ تھا کہ اس کی نہ ان کو کوئی ناگواری ہوئی نہ تہی دستی سے پریشانی، گویا خود ان کی بھی یہی خواہش تھی۔ انتہا یہ کہ جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے والد ابو قحافہ کو خبر ہوئی کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ چلے گئے تو بچوں کے پاس آئے اور فرمایا: ابو بکر رضی اللہ عنہ تو چلے ہی گئے کچھ تمہارے لئے بھی چھوڑ گئے ہیں؟ میرا خیال یہ ہے کہ جو کچھ ان کے پاس تھا سب لے گئے۔

^۱ بخاری شریف ص ۵۵۸

^۲ ایضاً ص ۵۱۶ فتح الباری

^۳ یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ یہ سفر اور غار میں قیام ستمبر کے مہینہ میں ہوا جو سخت گرمی کا مہینہ ہوتا ہے۔

جان سے تو گئے ہی مال بھی لے گئے۔ تمہیں خالی چھوڑ گئے۔ تو بڑی صاحبزادی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے فوراً جواب دیا: نہیں دادا جی ہمارے لئے بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں۔ ابو قحافہ کچھ مطمئن نہیں ہوئے تو حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے اس جگہ جہاں رقم رہا کرتی تھی کنکریاں تھیلی میں بھر کر رکھ دیں۔ دادا کی بصارت جاتی رہی تھی۔ ان کا ہاتھ پکڑ کر لے گئیں اور تھیلی پر ہاتھ رکھ کر بتا دیا کہ یہ رقم محفوظ ہے۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ یہ محض دادا کو مطمئن کرنے کے لئے کر دیا ورنہ واقعہ یہ تھا کہ جو کچھ تھا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سب لے آئے تھے۔ ہمیں خالی چھوڑ آئے تھے۔^۱

حالات سے باخبر رہنے اور دوسری ضروریات کا انتظام

تین آدمیوں کے خاص خاص کام سپرد کئے گئے تھے۔^۲

۱۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے فرزند ارجمند عبد اللہ^۳ نوجوان تھے^۴ مگر نہایت ہوشیار، بہت تیز، بات کو تاڑنے والے، پرکھنے والے۔ ان کے ذمہ یہ تھا کہ مخالفین کے اقدامات پر نظر رکھیں، حالات کا جائزہ لیتے رہیں۔

یہ دن بھر مکہ معظمہ میں کنسویں لیتے رہتے۔ دن چھپے اندھیرا ہو جاتا تو غار پر پہنچتے تھے۔ تمام روئیداد سنا دیتے۔ حالات سے باخبر کر دیتے۔ پھر آخر پہر میں مکہ معظمہ پہنچ جاتے گویا رات بھر یہیں رہے ہیں۔

۲۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ^۵ غلام عامر بن فہیرہ جن کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہجرت کی اجازت نہیں دی تھی بلکہ روک لیا تھا۔ ان کے ذمہ یہ تھا کہ تازہ دودھ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کرتے رہیں۔ شام کو جب اندھیرا ہو جاتا یہ بکریاں غار پر لیجاتے دودھ دھتے پھر اس کو گرم کرتے اور سید الکونین ﷺ اور اپنے آقا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ پھر بکریوں کو ہکا کر صبح سے پہلے تڑکے میں مکہ پہنچ جاتے۔

^۱ سیرت ابن ہشام ص ۲۹۳ ج ۱

^۲ ماخوذ از بخاری شریف ص ۵۵۳

^۳ ان کے حالات آئندہ آئیں گے زیر عنوان متعلقین کی آمد حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

^۴ غلام شاب، ثقف لقرن (بخاری شریف ص ۵۵۳)

^۵ مگر آقاؤں کے آقا۔ بیر معونہ کے حادثہ میں ان کو شہید کر دیا گیا۔ قاتلوں کے سردار عامر بن طفیل نے لوگوں سے دریافت کیا یہ لاش کس کی ہے؟ میں نے دیکھا کہ اس کو اٹھا کر آسمان کی طرف لیجا دیا گیا۔ پھر احتیاط سے نیچے اتارا گیا اور رکھ دیا گیا۔ (بخاری شریف ص ۵۸۷)

میں جانتا تھا میں نے دریافت کیا کہ کیا کوئی بکری دودھ دیتی ہے اور کہا تم دودھ دے سکتے ہو؟ اس نے اقرار کیا۔ چنانچہ وہ ایک بکری پکڑ کر لے آیا۔ میں نے کہا پہلے تم بکری کے تھن پونچھ کر صاف کرو، پھر اپنے ہاتھ صاف کرو، پھر دودھ نکالو۔ اس نے میری فرمائش پر عمل کیا۔ اور تھوڑا سا دودھ دودھ کر مجھے دیا۔

میں نے آنحضرت ﷺ کے لئے ایک چھاگل میں پانی رکھ چھوڑا تھا اس کے منہ پر کپڑا باندھ رکھا تھا کہ گردوغبار نہ پڑے۔ میں نے دودھ میں اتنا پانی ڈالا کہ تلی تک تمام دودھ ٹھنڈا ہو گیا (دودھ کی لسی بنالی) پھر میں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے نوش فرمایا۔ میرا جی خوش ہو گیا۔^①

راستہ کی مختصر سرگزشت

وَاللّٰهُ يَعْصِيْكَ مِنَ النَّاسِ (المائدہ-۶۷) (اور اللہ آپ کی حفاظت کرے گا لوگوں سے)

آیت کا نزول اگرچہ بعد میں ہوا مگر حفاظت خداوندی کا عجیب و غریب ظہور اس سفر میں ہو چکا تھا۔ سراقہ بن مالک بن جشم^② کا واقعہ اس کی مثال ہے۔ یہ قبیلہ بنی مدلج کا ایک شیخ تھا۔ علاقہ نجی اس کے یہاں بھی پہنچے تھے اور یہ اعلان اس نے بھی سنا تھا جو قریش نے آنحضرت ﷺ اور آپ کے رفیق سفر کے گرفتار کرنے یا قتل کرنے والے کے متعلق کیا تھا۔ سراقہ بیان کرتے ہیں کہ میں قبیلہ میں ایک چوپال میں بیٹھا ہوا تھا کہ کچھ آدمیوں نے آکر کہا کہ سمندر کے کنارے جاتے ہوئے کچھ آدمیوں کی پرچھائیاں سی نظر آئی ہیں، ہمارا خیال ہے کہ محمد اور اس کے ساتھی ہیں۔ (ﷺ)

سراقہ کہتے ہیں کہ میرے ذہن میں بھی یہی آیا کہ ان کا خیال صحیح ہے۔ مگر اس شوق میں کہ سارا انعام تنہا میں حاصل کر لوں میں نے ان کی بات نال دی۔ میں نے کہا کہ محمد یہاں کہاں؟ فلاں فلاں آدمی ہمارے سامنے سے گزرے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہونگے۔ خبر دینے والوں نے میری بات مان لی۔ کسی اور نے کچھ خیال نہیں کیا۔ میں تھوڑی دیر وہاں بیٹھا رہا پھر خاموشی سے اٹھا اپنے مکان میں گیا۔ باندی سے کہا میری گھوڑی ٹیلے کے پیچھے چر رہی ہے اس کو لے آؤ تیار کر دے۔ میں نے بھی ضروری سامان ٹھیک کر لیا۔ پھر میں نے نیزہ لیا اور اس خیال سے کہ لوگ نیزہ دیکھ نہ لیں، اسکی بھال ہاتھ میں لی اور پھولی زمین پر ڈال کر کھینچتا ہوا چلا اور مکان کی پشت کی طرف سے نکل کر گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ وہ کبھی دکی اور کبھی پویا دوڑتی ہوئی مجھے لے چلی۔ یہاں تک کہ میں آنحضرت ﷺ کے قریب پہنچ گیا۔ اچانک گھوڑی کے ٹھوکر لگی اور میں زمین پر آ رہا۔ میں فوراً اٹھا میرے

① بخاری شریف ص ۵۵۶ و ص ۳۳۰ وغیرہ

② ماخوذ از بخاری شریف ص ۵۵۶

اس زمانہ میں سڑکیں نہیں تھیں اس لئے راستوں اور خصوصاً پہاڑی راستوں سے واقف ہونا بھی ایک خاص فن تھا۔ اس کے ماہر کو ”خریت“ کہا کرتے تھے۔ قافلہ کے ساتھ خریت ضرور ہوتا تھا۔ اس کی معقول اجرت ہوتی تھی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے قبیلہ بنی ویل کے ایک شخص کو جس کا نام عبد اللہ بن اریقہ تھا (اور عبد اللہ بن اریقہ بھی کہلاتا تھا) اس خدمت کے لئے طے کر لیا تھا۔

یہ مسلمان نہیں تھا بلکہ مشرکین مکہ کا ہم مسلک تھا۔ عاص بن وائل سہمی کے خاندان کا حلیف تھا۔ یہ تو نہیں معلوم کہ اجرت کیا طے ہوئی تھی البتہ ان دونوں بزرگوں کو اس پر پورا اطمینان تھا^① یہاں تک کہ دونوں ساڈنیاں اس کے حوالے کر دی تھیں اور بتا دیا تھا کہ تین رات گزرنے کے بعد وہ چوتھے دن صبح سویرے غار ثور میں پہنچ جائے۔

یہ خریت وعدہ کے مطابق ٹھیک وقت پر پہنچا اور یہ حضرات سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ خریت نے سیدھا راستہ چھوڑ کر ساحل سمندر کا راستہ اختیار کیا جو چکر کاٹ کر مدینہ پہنچتا تھا۔ ایک ہفتہ بعد ۱۲ ربیع الاول^② کو پیر^③ کے دن یہ مقدس قافلہ منزل مقصود پر پہنچا۔

باہوش و باتدبیر رفاقت

غار ثور سے روانہ ہوئے تو تمام رات چلتے رہے۔ اگلے دن دوپہر کا وقت ہو گیا، دھوپ تیز ہو گئی۔ اس کھلے ہوئے لٹ و لٹ میدان میں پتھر کی چٹان کے نیچے کچھ سایہ تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کو غنیمت سمجھا۔ میں چٹان پر پہنچا۔ آنحضرت ﷺ کو ساتھ لے گیا۔ میرے ساتھ ایک فروہ چڑے کا بستر تھا۔ میں نے اس کو سایہ میں بچھا دیا اور اپنے آقا (آقائے دو جہاں) کو اس پر لٹا دیا۔

پھر میں نے نظر دوڑائی تو ایک چرواہے کو دیکھا جو بکریوں کے چھوٹے سے گلہ کو ہکاتے ہوئے اس طرف لا رہا تھا۔ اور وہ بھی اس چٹان کے سایہ میں آرام کرنا چاہتا تھا۔ میں اس کے پاس پہنچا اور دریافت کیا یہ بکریاں کس کی ہیں؟ تمہارا کون مالک ہے؟ چرواہے نے ایک شخص کا نام لیا۔ جس کو

① اطمینان کا سبب بظاہر یہ حلف ہی تھا۔ اس کی تفصیل مقدمہ میں ملاحظہ ہو۔ زیر عنوان معاہدات

② ابن سعد ابن ہشام وغیرہ

③ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: آنحضرت ﷺ کی ولادت پیر (دوشنبہ) کے روز ہوئی۔ پیر ہی کو نبوت عطا ہوئی، پیر کے دن ہی مکہ معظمہ سے روانہ ہوئے اور پیر کے دن ہی مدینہ منورہ میں رونق افروز ہوئے۔ (مسند احمد) ابن سعد اور ابن ہشام وغیرہ نے بھی پیر کا دن ہی بیان کیا ہے لیکن تقویم سنہ عیسوی و سنہ ہجری کے لحاظ سے یکم ربیع الاول پیر کے دن ہوتی ہے تو ۱۲ ربیع الاول کو پیر کا دن نہیں ہوتا بظاہر تقویمات کا فرق ہے۔

ترکش میں فال معلوم کرنے والے تیر تھے۔ میں نے ان کو نکالا اور میں نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ میں ان کو نقصان پہنچا سکوں گا یا نہیں۔ اتفاق سے میری مرضی کے خلاف فال نکلی۔ مگر میں نے اس کا خیال نہیں کیا۔ میں نے فال کے فیصلہ سے بغاوت کی۔ پھر گھوڑے پر سوار ہوا اور اس کو تیز دوڑا دیا اور اتنے قریب پہنچ گیا کہ آنحضرت ﷺ کی تلاوت کی آواز میرے کانوں میں آنے لگی۔

آنحضرت ﷺ تلاوت کلام اللہ میں مشغول تھے۔ آپ کسی اور طرف دھیان قطعاً نہیں دے رہے تھے۔ البتہ ابو بکر رضی اللہ عنہ دایں بائیں سب طرف دیکھتے ہوئے چل رہے تھے۔

جب میں اتنے قریب پہنچ گیا تو دفعۃً میری گھوڑی کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے اور میں نیچے گر گیا۔ میں اٹھا میں نے گھوڑے کو اٹھایا اس کو ڈانٹا، اس کے پیر زمین سے بڑی مشکل سے نکلے۔ ساتھ ساتھ پیروں کی جگہ سے دھوئیں کی طرح غبار نکلا جو آسمان کی طرف چڑھ رہا تھا۔ اب میں نے پھر فال نکالی۔ اس مرتبہ بھی فال میری مرضی کے خلاف ہی نکلی۔ تو میں نے ہمت ہار دی، فال کی مخالفت نہیں کی اور میرے دل میں یہ بات جم گئی کہ محمد رسول اللہ ﷺ ضرور کامیاب ہونگے میں نے وہیں سے پکار کر کہا: میں آپ صاحبان سے امن چاہتا ہوں۔

یہ حضرات ٹھہرے۔ میں نے ان کے قریب جا کر قریش کی تمام باتیں جواب تک کر چکے تھے اور جو وہ آئندہ کرنے والے تھے ان کو سنا دیں۔ میں نے آپ کی خدمت میں کچھ ناشتہ اور کچھ سامان پیش کرنا چاہا مگر میری پیش کش ان حضرات نے منظور نہیں فرمائی۔

میں نے یہ بھی عرض کیا کہ میرے اونٹ آپ کو راستہ میں ملیں گے ان کے ساتھ چرواہے بھی ہیں۔ میں اپنا تیر دیئے دیتا ہوں یہ ان کو دکھا دیں اور جتنے دودھ کی ضرورت ہو آپ ان سے لے لیں۔ مگر ان حضرات نے میری کوئی پیش کش منظور نہیں فرمائی۔ صرف ایک فرمائش کی کہ کسی کو ہماری خبر نہ کرنا۔ میں نے وعدہ کیا اور ساتھ ہی یہ بھی درخواست کی کہ میرے لئے امن کا پروانہ لکھ دیں۔

آنحضرت ﷺ نے عامر بن فہیرہ کو حکم فرمایا انہوں نے چڑے کے ایک ٹکڑے پر پروانہ امن لکھ کر سراقہ کو دے دیا۔ پھر یہ حضرات مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے اور سراقہ مکہ کی طرف واپس ہوا۔

سراقہ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ راستہ میں جو ملتے رہے ان کو اطمینان دلا کر واپس کرتا رہا کہ میں دور تک دیکھ آیا ہوں اس طرف کوئی نہیں ہے۔ اس طرح بقول حضرت انس رضی اللہ عنہ سراقہ بن مالک بن جعشہ کی مختصر روایت انداز یہ ہے کہ صبح کے وقت حملہ آور، شام کے وقت محافظ۔^۱

^۱ بخاری شریف ۵۵۶

^۲ بخاری شریف ص ۵۵۳

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے ملاقات اور پیش کش:

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا عجیب کرشمہ ہے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے اپنا نطق چاک کر کے اس میں ناشتہ دان اور مشکیزہ باندھا تھا۔ ان کے شوہر حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں غلت پیش کیا۔ (جس کی تفصیل یہ ہے)

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ کچھ اور تاجر بسلسلہ تجارت شام گئے تھے وہاں سے واپس ہو رہے تھے کہ راستہ میں ان مقدس مہاجرین سے ملاقات ہو گئی۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے سفید کپڑے کا جوڑا آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا اور ایک جوڑا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو پہنایا۔^۱ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس قافلہ میں حضرت عمر، حضرت طلحہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ واپسی کے وقت حضرت زبیر رضی اللہ عنہ آگے آگئے تھے جب مدینہ کے قریب پہنچے تو باقی حضرات سے ملاقات ہوئی۔ وہاں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے بھی ان دونوں حضرات کی خدمت میں جوڑے پیش کئے۔

یشرب میں ورود مسعود

وَقُلْ رَبِّ اَنْزِلْنِي مُنْزِلًا مُّبَارَكًا وَاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ (سورہ مومنون-۲۹)

”کہو! اے میرے پروردگار مجھے برکت کے ساتھ اتار اور تو بہتر اتارنے والا ہے“

یا معشای العرب ہذا جدکم الذی تنتظرون اللہ اکبر جاء محمد اللہ اکبر جاء محمد ﷺ تذکرہ سیدنا نوح علیہ السلام کے ضمن میں اس دعا کی تلقین مکہ معظمہ میں ہوئی تھی۔ آنحضرت ﷺ اس کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ آج آپ کے حق میں اس کی مقبولیت ظاہر ہو رہی ہے جبکہ معصوم بچیوں کے معصوم جزبات اس ترانہ سے آپ کا استقبال کر رہے ہیں:

طلح البدر علینا من ثنایات الوداع

وجب الشکر علینا ماد عائلہ داع

”ثنیات^۲ الوداع سے چودھویں کا چاند طلوع ہوا، ہم پر اللہ کا شکر واجب ہو گیا جب تک کوئی دعا کرنے والا دعا کرے (ہمیشہ ہمیشہ کے لئے)

^۱ فتح الباری ص ۱۹۳ ج ۷

^۲ ثنیہ: گھائی اور وداع کے معنی ہیں رخصت کرنا۔ چونکہ لمبا سفر کرنے والوں کو رخصت کرنے کے لئے اہل یشرب یہاں تک آیا کرتے تھے اس لئے یہ نام پڑ گیا (مجم البدان)

مدینہ میں روانگی کی خبر:

ڈاک کا سلسلہ اس وقت نہیں تھا مگر آنے جانے والوں کے منہ زبانی خبریں پہنچ جاتی تھیں۔ مشتاقان دیدار کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ان کا محبوب مکہ معظمہ سے نکل چکا ہے۔ اب انتظار کے دن اور گھنٹیاں گنی جا رہی تھیں۔ طلوع آفتاب سے بہت پہلے، پوچھنے کے وقت لوگ اٹھتے اور مدینہ سے باہر حرہ^۱ پہنچ کر آفتاب رسالت کے طلوع ہونے کا انتظار کرنے لگتے۔ اسی انتظار میں دوپہر ہو جاتا۔ مسافروں کی آمد کا وقت ختم ہو جاتا تو مرجھائے دلوں کو بے تاب سینوں میں دبائے ہوئے واپس ہو جاتے۔ ایک روز اسی پڑمردگی اور افسردگی کے ساتھ واپس ہوئے تھے کہ ایک آواز نے عورتوں اور بچوں تک کو وارفتہ مسرت بنادیا۔

يامعاشا! العرب هذا جدكم الذي تنتظرون

ایک یہودی اپنی کسی ضرورت سے ایک پرانے قلعہ کی اونچی اتاری پر چڑھا تھا اس کی نظر چند سفید پوش سواروں پر پڑی جو اس طرف چلے آ رہے تھے۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ انتظار کرنے والوں کی مراد پوری ہو گئی۔ یہ خود بے تاب نہیں تھا مگر انتظار کرنے والوں کی بیتابی کا اس پر یہ اثر تھا کہ خود قابو میں نہ رہا اور زور سے چیخ اٹھا۔

”اہل عرب! یہ شہک تمہارے وہی مہمان آگئے جن کا تمہیں انتظار ہے۔“

اہل قبا کی خوش نصیبی تھی کہ یہ آواز ان کے کانوں میں پڑی۔ اب کوئی کیا بتائے جاں بازوں، جاں نثاروں اور فد اکاروں کا کیا حال تھا۔ وہ کس بے تابی سے دوڑے اور حرہ پہنچ کر کس طرح رحمۃ اللعالمین ﷺ کے زیر پائپ اپنی آنکھیں بچھائیں۔ نظر اشتیاق کو فرش راہ بنایا۔ قبیلہ بنی عمرو بن عوف جو اوس کا بطن تھا^۲ یہاں آباد تھا۔ یہ خوش نصیب اسی قبیلہ کے لوگ تھے جنہوں نے یہودی کی آواز سنی اور دوڑے۔

عرب کا دستور تھا کہ معزز مہمانوں کا استقبال ہتھیاروں سے آراستہ ہو کر کیا کرتے تھے۔ اس بے تابی میں انہوں نے اپنی اس آن کو نہیں چھوڑا پہلے ہتھیاروں کی طرف لپکے پھر استقبال کو دوڑے۔ حرہ سے آنحضرت ﷺ نے دہنی طرف رخ کیا^۳ اور پھر پورے مجمع کے ساتھ قبیلہ بنی عمرو بن عوف میں رونق افروز ہو گئے۔ لوگ آنے شروع ہوئے وہ اپنے قاعدہ سے سلام کرتے تھے اور

^۱ بخاری شریف ص ۵۵۵

^۲ اے اہل عرب یہ آگئے تمہارے آقا، جن کا تم انتظار کر رہے تھے۔

^۳ فتح الباری ص ۱۹۳

^۴ طبقات ابن سعد ص ۱۵۸ ج ۱

^۵ نثار المسلمون الی السلاخ۔ بخاری شریف ص ۵۵۲

^۶ بخاری شریف ص ۵۵۵

بیٹھ جاتے تھے۔ سید الکونین ﷺ خاموش تشریف فرما تھے۔ رفیق سفر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کھڑے تھے اور آنے والوں کا استقبال کر رہے تھے۔ جنہوں نے آنحضرت ﷺ کو پہلے نہیں دیکھا تھا وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی کو سلام کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ آنحضرت ﷺ پر دھوپ آگئی تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے سر مبارک پر اپنی چادر سے سایہ کر لیا، تب لوگ پہچان سکے کہ خادم کون ہے اور خندوم کون۔^۱

آرام گاہ اور نشست گاہ:

کلوٹم بن ہدم قبیلہ کے بڑے آدمی تھے، یہ شرف ان کو حاصل ہوا کہ آپ نے قیام^۲ ان کے یہاں فرمایا۔

دوسرے صاحب سعد بن خثیمہ رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کا مکان خالی تھا۔ ان کے متعلقین نہیں تھے۔ مکہ سے جو صحابہ رضی اللہ عنہ اس طرح کے آتے تھے وہ بھی انہیں کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ اس لئے اس مکان کو بیعت العزاب^۳ کہا جانے لگا۔ یہ مکان آنحضرت ﷺ کی نشست کے لئے طے کیا گیا^۴۔ تلقین و تذکیر بھی یہیں فرماتے تھے۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سخ میں قیام فرمایا^۵۔ یہ پیر کا دن تھا^۶ جس روز آفتاب رسالت مدینہ کے خط استواء پر پہنچا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ جن کو آنحضرت ﷺ نے امانتیں پہنچانے کے لئے مکہ معظمہ چھوڑا تھا، تین دن بعد وہ بھی تشریف لے آئے اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ قیام کیا۔^۷

^۱ ایضاً ص ۵۵۵

^۲ اکثر صحابہ جو آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے مدینہ آچکے وہ بھی انہیں کے یہاں اترے تھے۔ چنانچہ حضرت ابو عبیدہ الجراح، حضرت مقداد بن اسود، حضرت خباب، حضرت سمیل، حضرت صفوان، حضرت عیاض، حضرت عبداللہ بن عمرہ، حضرت وہب بن سعد، حضرت معمر بن ابی سرح، حضرت عمیر بن عوف رضی اللہ عنہ اب تک انہیں کے یہاں تھے۔ (ابن سعد تذکرہ کلوٹم بن ہدم) آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے چند ماہ بعد ان کی وفات ہو گئی (رضی اللہ عنہ) محمد بن الحسن بن زبالہ نے اخبار المدینہ میں وثوق سے بیان کیا ہے کہ کلوٹم بن ہدم اس وقت تک مشرک ہی تھے مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ (فتح الباری ص ۱۹۳ ج ۱) اگر یہ صحیح ہے تو اس سے اہل مدینہ کی معاشرت کا پتہ چلتا ہے کہ مذہبوں کے فرق کے باوجود آپس میں تعاون مکمل تھا۔

^۳ عزاب: عازب کی جمع ہے۔ اس شخص کو کہتے ہیں جس کے بیوی نہ ہو۔

^۴ ابن سعد ص ۱۵۸ ج ۱ و ابن ہشام ص ۲۹۶ ج ۱

^۵ غیب بن یساف خزرجی یا خازرجی کے یہاں۔ (ابن ہشام ص ۲۹۶ ج ۱)

^۶ تاریخوں میں بہت اختلاف ہے۔ اگر مکہ معظمہ سے روانگی یکم ربیع الاول کو پیر کے دن ہوئی تھی جیسا کہ راقم الحروف نے لکھا ہے، تو اس پیر کو ربیع الاول کی پندرہ ہوگی۔ خبر المدینہ ابن زبیر نے ابن شہاب (زہری) سے یہی روایت نقل کی ہے کہ نصف ربیع الاول (۱۵ ربیع الاول) کو تشریف آوری ہوئی (فتح الباری ص ۱۹۳ ج ۱)

^۷ ابن ہشام ص ۲۹۶ ج ۱

حق پرستوں کا اعتراف حق

سرزمین یثرب میں رسول اللہ ﷺ کا پہلا خطاب

حصین بن سلام ایک یہودی عالم تھے۔ مطالعہ نہایت وسیع، طبیعت انصاف پسند، اور اپنی قوم کے معزز سردار تھے۔ جو بشارتیں یہودی کتاب میں پڑھی تھیں ان کی بنا پر آنے والے نبی کے منتظر تھے۔ یہ اپنے باغ میں کام کر رہے تھے کہ خبر سنی: اللہ کے نبی تشریف لے آئے۔^① فوراً کام چھوڑ کر نبی کی زیارت کے لئے دوڑے۔ جیسے ہی چہرہ مبارک پر نظر پڑی دل نے شہادت دی۔

انہ لیس بوجہ کذاب ”جھوٹے آدمی کا چہرہ تو نہیں ہے“

آپ فرماتے ہیں: کان اول شیء تکلم به ان قال یا ایہا الناس افشوا السلام واطعموا الطعام وصلوا والناس نياما تدخلوا الجنة بسلام (ترمذی شریف ص ۲۷۷)
”سب سے پہلے جو بات آپ نے فرمائی وہ یہ تھی کہ اے لوگو سلام کا رواج عام کرو، (پھیلاؤ) کھانا کھاؤ، اور اس وقت نماز پڑھو جو لوگ سو رہے ہوں۔ اطمینان سے جنت میں داخل ہو جاؤ۔“
یہی حصین بن سلام ہیں جن کا اسلامی نام عبد اللہ بن سلام ہے۔ ﷺ ان کا سلسلہ نسب حضرت یوسف علیہ السلام پہنچتا ہے۔^②

① بخاری شریف کی روایت ص ۵۵۶ کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن سلام ﷺ قیام نہیں بلکہ مدینہ میں حاضر خدمت ہوئے جب آنحضرت ﷺ نے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے یہاں قیام فرمایا: مگر بخاری رضی اللہ عنہ کے استاد ابن اسحاق رضی اللہ عنہ نے تصریح کی ہے کہ آپ قیام قبیلہ بنی عمرو بن عوف میں تھے اس وقت عبد اللہ بن سلام حاضر ہوئے۔ (سیرۃ ابن ہشام ص ۳۱۰) اس لئے ہم نے اس واقعہ کو اس موقع پر ذکر کر دیا حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچنے پر دوسرا واقعہ ہوا۔ بخاری کے راوی صاحبان نے ان دونوں کو ایک ساتھ ذکر کیا تو اشتباہ ہو گیا کہ یہ واقعہ بھی حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے یہاں قیام کے دوران ہوا۔ مگر حقیقت یہ نہیں ہے ابن اسحاق کی روایت جو صرف ایک واسطہ سے ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن سلام مسلمان ہو گئے تو انہوں نے چاہا کہ یہود کی افتراء پر دازی اور غلط بیانی کا تجربہ آنحضرت ﷺ کو کرا دیں۔ چنانچہ ابھی عبد اللہ بن سلام کے اسلام لائے شہرت نہیں ہوئی تھی کہ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے اصرار پر آنحضرت ﷺ نے یہود کے نمائندگان کو بلا کر دریافت کیا کہ حصین بن سلام کیسے آدمی ہیں انہوں نے بہت تعریف کی اور کہا کہ سید بن سید علم بن علم اور ہم میں سب سے بہتر ہے لیکن جیسے ہی ان یہودی علماء کو معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہو چکے تو فوراً پلٹ گئے اور اسی مجلس میں کہہ دیا کہ یہ بھی جھوٹے ان کے باپ بھی جھوٹے یہ بھی بدترین انسان ہیں اور ان کے باپ بھی بدترین انسان تھے۔ (ابن ہشام و بخاری شریف وغیرہ)

② الاصابہ

قبائے مدینہ منورہ

جمعہ ① کے روز صبح سویرے مدینہ کے حضرات آراستہ ہوئے، تلواریں سجائیں اور آقاء دو جہان کو اپنے یہاں لانے کے لئے قبائے پہنچ گئے۔

کچھ دن چڑھا تو تاجدار دو عالم اناقہ قصواء ② پر سوار ہوئے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ساتھ ③ بٹھایا (ردیف بنایا) تقریباً پانچ ④ مسلح انصار کی دو صفیں دائیں بائیں ہو گئیں۔ راستہ پر زیارت کرنے والے مردوں کا اور کوٹھوں اور چھتوں پر خانہ نشین خواتین کا ہجوم تھا، جو مسلمان نہیں ہوئے تھے وہ بھی دیدار کے لئے بیتاب تھے۔ لڑکے اور بچے جوش مسرت میں نعرہ لگا رہے تھے۔

اللہ اکبر جاء محمد اللہ اکبر جاء محمد ⑤

یثرب اور اہل یثرب کے لئے اس سے زیادہ مسرت کا دن کونسا ہو سکتا ہے؟ آج آسمان نبوت کا آفتاب زمین یثرب پر اتر رہا ہے۔ آج وہ نبی روتق افروز ہو رہا ہے جس کی بشارتیں کتب سابقہ کے صفحات میں اور اہل کتاب کی زبانوں پر عرصہ سے تھیں۔ آج ہر طرف یہی صدا ہے یہی چرچا ہے، جاء نبی اللہ جاء نبی اللہ ⑥، اللہ کے نبی آگئے اللہ کے نبی آگئے۔ قبیلہ بنی سالم تک پہنچے تھے کہ نماز کا وقت ہو گیا۔ آپ نے جمعہ کی نماز یہیں ادا فرمائی ⑦۔ نماز جمع کے بعد آپ سوار ہونے لگے تو قبیلہ والوں نے مہار قحام لی اور اصرار کیا کہ آپ یہیں قیام فرمائیں۔ اس کے بعد حضرات انصار (رضی اللہ عنہم) کا جو قبیلہ بھی آتا ⑧ رہا یہی اصرار کرتا رہا کہ غریب

① مدت قیام میں اختلاف ہے۔ چار روز، چودہ روز، اٹھارہ روز اور ۲۲ روز تک کی روایتیں ہیں۔ لیکن اس پر اتفاق ہے کہ قبائے رواں گئی جمعہ کے روز ہوئی اور تشریف آوری پیر کے روز ہوئی تھی۔ اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ قبائے مدینہ دنوں جگہ نزول اجلال ربیع الاول کے مہینہ میں ہوا تو بظاہر تاریخوں کا تعین اس طرح ہوتا ہے کہ دولت کدہ سے رواں گئی کیم ربیع الاول دوشنبہ کے روز غار ثور سے رواں گئی ۱۲ ربیع الاول بیخ شنبہ، قیامیں تشریف آوری ۱۵ ربیع الاول پیر کے روز مدینہ منورہ میں تشریف آوری ۲۶ ربیع الاول یوم جمعہ، واللہ اعلم بالصواب
② یہ وہی ناقہ ہے جس پر آپ نے سفر ہجرت طے فرمایا تھا (ابن سعد)

③ بخاری شریف ص ۵۵۶ و ص ۵۶۰

④ فتح الباری ص ۶۱۰ بحوالہ تاریخ صغیر للبخاری والہدایہ ص ۱۹۷ ج ۳ بحوالہ مسند احمد

⑤ البدایہ والنہایہ ص ۱۹۷ ج ۳

⑥ بخاری شریف ص ۵۵۶ و ص ۵۶۰

⑦ ابن سعد ص ۱۶۰ ج ۱ نے نمازوں کی تعداد سو لکھی ہے۔ لیکن تاریخ بخاری اور مسند احمد کی روایتوں کے بموجب اگر استقبال کے لئے جانے والوں کی تعداد پانچ سو تھی تو ظاہر ہے نماز جمعہ میں یہ سب ہی شریک ہوئے ہونگے۔ واللہ اعلم بالصواب

⑧ وقاء الوفا میں ان قبائل کی تفصیل ہے اور جو گفتگو ہوتی رہی وہ بھی نقل کی گئی ہے (ص ۱۸۴ و ۱۸۵ ج ۱)

خانہ کو دولت خانہ بنائیے۔ مکان حاضر ہے، مال حاضر ہے، جان حاضر ہے۔ لیکن وہ رؤف رحیم جس کا دامن شفقت ہر ایک کے لئے پھیلا ہوا تھا، جس کو کسی کی دل شکنی گوارا نہیں تھی جس طرح اس کا پورا سفر نبی اشاروں پر ہوا تھا۔^۱ اس کے رحم الرحیم رب نے یہاں بھی ایسی صورت کر دی کہ رحمۃ اللعالمین ﷺ کی طرف سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ آپ نے خود ہی ناقہ کی مہار چھوڑ دی اور اصرار کرنے والوں سے بھی یہی فرمایا کہ وہ مہار چھوڑ دیں۔ یہ ناقہ^۲ مامور ہے جہاں بیٹھ جائے گی وہیں قیام ہوگا۔

ناقہ چلتی رہی یہاں تک کہ قبیلہ بنی نجار آگیا۔ اس قبیلہ میں جب ناقہ اس جگہ پہنچی جہاں مسلمان نماز پڑھا کرتے تھے تو ناقہ بیٹھ گئی۔ آپ نے فرمایا اِذَا اِشَاءَ اللہ منزِل^۳۔ ”یہیں انشاء اللہ قیام ہوگا۔ (مکان بنے گا)“
ابھی آپ اترے نہیں تھے کہ ناقہ کھڑی ہو گئی۔ کچھ چلی۔ پھر آکر اسی جگہ بیٹھ گئی اور اپنی گردن زمین پر پھیلا دی۔^۴
بنی نجار کو یہ سعادت میسر آئی تو بچہ بچہ کے دل کی کلی کھل گئی۔ لڑکیوں نے فوراً ایک شعر موزوں کر لیا۔

نحن جواد من بنی نجار یا حبذا محمد من جاد

^۱ پہلے گزر چکا ہے کہ صحابہ کرام ہجرت کر رہے تھے مگر آنحضرت ﷺ کے حکم کے منتظر تھے اور جب من جانب اللہ اجازت ہوئی تو آپ فوراً دہری میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچے اور فرمایا کہ مجھے اجازت ہو گئی ہے۔ فوراً ہی روانگی کا پروگرام بنالیا اور پھر یہ سفر ہی نہیں بلکہ دار ہجرت کا تعین بھی الہام ربانی سے ہوا تھا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔
^۲ ابن سعد ص ۱۶۰ ج ۱ و فتح الباری ص ۱۹۶ ج ۷ علامہ شبلی کو یہ بات عجیب معلوم ہوئی۔ آپ نے یہ واقعہ حذف کر دیا۔ میزبانی کے سلسلہ میں جو بحث ہوئی تھی صرف اس کا ذکر فرمایا کہ قرعہ ڈالا گیا اور آخر یہ دولت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی۔ اور حاشیہ میں فائدہ کے واقعہ کی تردید کرتے ہوئے مسلم شریف کی ایک حدیث سے استدلال کیا جس میں راوی نے بہت اختصار سے کام لیا ہے اور لطف یہ ہے کہ قرعہ اندازی کا تذکرہ فقہ منا البدینہ لیلۃ علامہ نے اس کو نظر انداز فرمادیا۔ علامہ نے مسلم شریف کے باب الحجۃ کا حوالہ دیا ہے حالانکہ مسلم شریف میں باب الحجۃ کوئی نہیں۔ اس کا عنوان حدیث الحجۃ ہے اور علماء محدثین کی اصطلاح میں اس کو حدیث الرجال بھی کہا جاتا ہے۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے جلد ثانی کے آخر میں اس کو نقل کیا ہے۔ ص ۴۱۹ ج ۲ واقعہ یہ ہے کہ سلسلہ قیام چند مرحلے پیش آئے تھے۔ مثلاً سب سے پہلے قبیلہ کا انتخاب، پھر قبیلہ میں وہ جگہ جہاں آنحضرت ﷺ مستقل قیام فرمائیں۔ جہاں مکان بنایا جائے یا مسجد بنائی جائے۔ پھر مکان بننے تک عارضی قیام، عارضی قیام کے بعد کھانے وغیرہ کا انتظام۔ اصطبل کا انتخاب جہاں سواری رکھی جائے۔ ان تمام مرحلوں پر بحث ہوئی اور ہر ایک جاں نثار نے سعادت حاصل کرنی چاہی۔ بحث کے بعد معاملہ طے ہوا کبھی قرعہ سے بھی، الہام ربانی سے، کبھی کسی اور صورت سے آئندہ سطور میں یہ تمام مراحل ترتیب وار بیان کئے گئے ہیں۔ واللہ الحمد

^۳ بخاری شریف ص ۵۵۵

^۴ ابن ہشام ص ۲۹۸ ج ۱

”ہم بنی نجار کی لڑکیاں ہیں یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ محمد ﷺ ہمارے پڑوسی بنے۔ محمد کیسے اچھے پڑوسی ہیں۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ محمد ﷺ ہمارے پڑوسی ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ازارہ شفقت فرمایا: تمہیں مجھ سے محبت ہے؟“
سب نے یک زبان ہو کر کہا: اے واللہ یا رسول اللہ (ہاں خدا کی قسم یا رسول اللہ)
ارشاد ہوا:^۱

انا واللہ احبکم انا واللہ احبکم انا واللہ احبکم
”خدا کی قسم مجھے بھی تم سے محبت ہے خدا کی قسم مجھے بھی تم سے محبت ہے خدا کی قسم مجھے بھی تم سے محبت ہے۔“
اب قیام کا مسئلہ پیش ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ہمارے رشتہ داروں^۲ میں کسی کا مکان قریب ہے۔ یہ خوش نصیبی حضرت خالد بن زید^۳ ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو میسر تھی۔ آپ فوراً بول اٹھے: انا یا نبی اللہ ہذا داری و ہذا بابی (میں حاضر ہوں یا رسول اللہ یہ میرا مکان ہے یہ میرا دروازہ ہے)

عجیب بات یہ ہے کہ حضرات انصار نے آپس میں قرعہ ڈالا کہ حضور ﷺ کا قیام کس کے یہاں ہوگا؟ اس میں بھی حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ ہی کا اسم گرامی برآمد^۴ ہوا تھا۔
قیام کا مسئلہ طے ہو گیا تو ارشاد ہوا:

^۱ البدایہ والنہایہ ص ۲۰۰ ج ۳ بحوالہ بیہقی

^۲ بخاری شریف ص ۵۵۶ چونکہ آنحضرت ﷺ کے دادا عبد المطلب کے نانہالی رشتہ دار اسی قبیلہ کے تھے تو آپ نے یہ فرمایا: ”ای بیوت اهلنا اقرب“ ہمارے رشتہ داروں میں سے کس کا مکان قریب ہے۔ اس وقت آقا دو جہان کی زبان مبارک سے قرابت و رشتہ داری کا اظہار ان رشتہ داروں کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا جیسا کہ مسلم کی روایت میں ہے۔ آپ نے اس کا اظہار بھی فرمایا مگر یہ بھی صحیح نہیں کہ ناقہ کا واقعہ پیش نہیں آیا۔ اور آپ نے رشتہ داری کی بنیاد پر بنو نجار کو منتخب فرمایا۔ ورنہ پھر قرعہ اندازی کی بھی ضرورت نہیں تھی جس کو علامہ شبلی نے بہت اہمیت دی ہے۔

^۳ اصل نام خالد، پسر زید، کنیت ابو ایوب، یہ اپنی اس کنیت ہی سے مشہور ہیں۔

^۴ اصحاب ص ۲۹۰ ج ۲ بحوالہ احمد علامہ شبلی نے اس روایت کو لے کر ناقہ وغیرہ کے تمام واقعات کو حذف کر دیا جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔ حالانکہ اس روایت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل حضرات انصار نے از خود کیا تھا۔ اور بہت ممکن ہے آنحضرت ﷺ کے یہاں رونق افروز ہونے سے پہلے کیا ہو، کیونکہ روایت میں مدینہ میں تشریف آوری کا ذکر ہے قبیلہ بنو نجار میں رونق افروز ہونے کا ذکر نہیں۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں روی احمد من طریق جبید بن نضید۔ عن ابی ایوب قال لباقدر النبی ﷺ المدينۃ اقتضت الانصار اہم بیوید فقرعہم ابو ایوب۔ یعنی حضرات انصار نے خود قرعہ اندازی کی کہ آنحضرت ﷺ کو کون مکان دے گا (کس کے یہاں قیام ہوگا)۔ تو سب کے مقابلہ میں ابو ایوب کا نام قرعہ میں برآمد ہوا جو حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ بھی موفقت صحابہ کی ایک مثال ہے۔ یعنی صحابہ کرام نے بھی وہی فیصلہ کیا جو پہلے مشیت خداوندی نے طے کر چکی تھی۔ بعد کے الہام یا وحی نے اس کی توثیق کر دی۔ واللہ اعلم

فاصلت فہم لنا مقبلا^۱ ”تشریف لے جائیے ہمارے قبولہ کا انتظام کیجئے۔“

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے اندر جا کر آرام فرمانے کا انتظام کیا پھر ان کو لے گئے اور آرام کرایا۔^۲

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہمیشہ خوش ہوا کرتے تھے کہ سید عالم ﷺ حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے یہاں جیسے ہی تشریف لے گئے سب سے پہلا ہدیہ میری والدہ کا تھا جو آپ نے خود بھی تناول فرمایا اور حاضرین کو بھی اس میں شریک کیا۔ میری والدہ نے روٹیوں پر مٹی لگا کر دودھ میں چورا اور ایک بڑے بادیہ میں بھر کر میرے ہاتھ بھیجا۔ یہ میری سعادت تھی کہ سب سے پہلا یہ ہدیہ یہی پیش ہوا۔ میں نے عرض کیا کہ میری والدہ نے یہ ہدیہ بھیجا ہے تو آپ نے دعا فرمائی: بارک اللہ فیک (اللہ تعالیٰ تمہیں برکت عطا فرمائے)۔ پھر حاضرین کو بلا کر سب کے ساتھ یہ ہدیہ تناول فرمایا اور ابھی میں دروازہ سے نکلا نہیں تھا کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے یہاں سے شرید آگیا۔ آپ نے اُسے بھی منظور فرمایا۔ پھر اگرچہ آپ مہمان ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے تھے مگر روزانہ تین چار انصار کے یہاں سے نمبردار کھانے کا ہدیہ آتا رہتا تھا۔^۳ دسترخوان مبارک پر چار پانچ کھانے والے ضرور ہوتے تھے۔ کبھی پندرہ سولہ بھی ہو جاتے تھے۔^۴

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ خود بھی کھانا پکواتے، دسترخوان پر اگرچہ شریک طعام نہیں ہوتے تھے مگر جو کھانا آنحضرت ﷺ کے سامنے سے آتا تھا اس کو کھاتے اور خاص اس جگہ سے کھاتے جہاں آقا و جہاں کی انگلیوں کے نشان معلوم ہوتے تھے۔^۵

^۱ بخاری شریف ص ۵۵۶

^۲ فتح الباری ص ۲۰۱

^۳ یہ وہی زید بن ثابت ہیں جو آگے چل کر کاتب وحی اور جامع قرآن اور بہت بڑے فقیہ اور ماہر فرائض ہوئے۔ ایسے زمین کہ سریانی زبان اور سریانی خط پندرہ روز میں لکھ لیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ والدہ محترمہ کا اسم گرامی نوار تھا دختر مالک یہ بھی تجارتیہ تھیں (الاصابہ والاستیاب)

^۴ ابن سعد ۱۶۱ ج ۱ خصوصاً حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے یہاں سے تو روزانہ شربت بھر کر کھانا آتا تھا۔ وفاء الوفاء ص ۱۹۰ ج ۱

^۵ ۲۔ ایضاً

^۶ علامہ نوویؒ نے اس حدیث سے چند مسئلے اخذ کئے ہیں: (۱) ہر موقع اور ہر جگہ پر برتن کا صاف کرنا مستحب نہیں بلکہ بیچے ہوئے کھانے یا پینے والے برتن میں کچھ چھوڑ دینا مستحب ہے (۲) خصوصاً جب معلوم ہو کہ لوگ اس کو تبرک سمجھ کر کھائیں گے (۳) یا کھانا کم ہو اور دوسرے کھانے والے موجود ہوں (۴) یا جیسا کہ بعض جگہ ہوتا ہے کہ پورا کھانا مہمان کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور اہل خانہ بعد میں بچا ہوا کھانا کھاتے ہیں۔ بظاہر حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کا یہی طریقہ تھا۔ (نووی علی مسلم ص ۱۸۳ ج ۱)

بالائی منزل میں قیام:

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے مکان کی دو منزلیں تھیں۔ آپ نے نیچے کی منزل آنحضرت ﷺ کے لئے خالی کر دی۔ خود اوپر چلے گئے۔ ایک روز اتفاق سے اوپر کی منزل میں پانی کا برتن (گھڑایا مٹکا) ٹوٹ گیا۔ ابو ایوب رضی اللہ عنہ کو خدشہ ہوا کہ پانی نیچے ٹپکے گا اور تاجدار و جہان ﷺ کو تکلیف ہوگی، گھر میں ایک لحاف تھا فوراً اسی کو پانی پر ڈال دیا کہ پانی جذب ہو جائے نیچے نہ ٹپکے۔^۱ ایک روز خیال آیا کہ سردار دو جہان ﷺ نیچے ہیں اور ہم اوپر، کیسی بے ادبی ہے؟ فوراً ایک کنارے سمٹ گئے اور اسی طرح رات گزار دی۔ صبح کو آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ اوپر قیام فرمائیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: آنے جانے والوں کو اسی میں آسانی ہے، حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے دست بستہ عرض کیا:

لا اعلو سقیفة انت تحتها^۲

”میں تو اس چھت پر چڑھ نہیں سکتا جس کے نیچے حضور والا ہوں۔“

رحمت عالم ﷺ نے درخواست منظور فرمائی اور اوپر منتقل ہو گئے۔ سات ماہ اسی مکان میں قیام رہا، جب مسجد اور حجرے تیار ہو گئے تب آپ وہاں تشریف لے گئے۔ (تفصیل آگے آتی ہے۔ انشاء اللہ)

قصواء کا قیام اور حضرت اسعد رضی اللہ عنہ کا والہانہ جذبہ:

حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ جو بیعت عقبہ اولیٰ میں شریک تھے اور تبلیغی کوششوں میں آنحضرت ﷺ کے فرستادہ معلم حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے شریک رہے تھے، ان کا مکان بہت وسیع تھا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا قیام انہیں کے یہاں رہا تھا۔ ان کے علاوہ اور حضرات بھی جو تشریف لاتے تھے ان کے یہاں قیام فرمایا کرتے تھے۔

جب انہوں نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ کا قیام حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے یہاں طے ہو گیا ہے تو ناتقہ کی مہار پکڑی اور اپنے یہاں لے گئے۔^۳ کہ یہ بھی ایک شرف اور جذبہ شوق کو تسکین دینے والی ایک سعادت تھی۔

^۱ وفاء الوفاء ص ۱۸۸ سیرۃ ابن ہشام

^۲ مسلم شریف ص ۱۸۳ ج ۲

^۳ طبقات ابن سعد ص ۱۶۰ ج ۱

متعلقین کی آمد:

مدینہ میں آکر آپ نے حضرت زید بن حارثہ اور حضرت ابو رفیع (رضی اللہ عنہما) کو دو اونٹ اور پانچ سو درہم دیکر مکہ بھیجا کہ متعلقین کو لے آئیں۔ صاحبزادیوں میں حضرت رقیہ (رضی اللہ عنہا) حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ حبش میں تھیں۔ حضرت زینب (رضی اللہ عنہا) کو ان کے شوہر ابو العاص بن ربیع نے آنے نہیں دیا۔ بس حضرت زید (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ ام المومنین حضرت سودہ (رضی اللہ عنہا) اور دو صاحبزادیاں ام کلثوم (رضی اللہ عنہا) اور حضرت فاطمہ زہرا (رضی اللہ عنہا) آئیں۔ ان کے علاوہ حضرت زید اپنی اہلیہ ام ایمن اور اپنے فرزند اسامہ (رضی اللہ عنہ) کو بھی ساتھ لے آئے۔

حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) نے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ (رضی اللہ عنہ) کو بھی حضرت زید (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ بھیجا تھا۔ حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کے متعلقین کو وہ اپنے ساتھ لائے۔ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) بھی ان کے ساتھ آئیں۔ ان سب کو حارثہ (رضی اللہ عنہ) بن نعمان کے مکان میں ٹھہرایا گیا۔^①

① آنحضرت ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے، قبیلے تھے۔

② حضرت عبداللہ بن ابی بکر (رضی اللہ عنہ) حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کے سوتیلے اور حضرت اسماء (رضی اللہ عنہا) کے حقیقی (ماں شریک) بھائی تھے۔ غزوہ فح کہ اور غزوہ حنین میں شریک رہے۔ جب غزوہ حنین کے بعد طائف پر حملہ کیا گیا تو ان کے ایک تیر لگا اسکا زخم اوپر سے مندل ہو گیا۔ مگر اندر اندر پھوڑا بن گیا۔ تقریباً دو سال تک یہ پھوڑا رہا۔ آنحضرت ﷺ کی وفات سے تقریباً سات ماہ بعد شوال سنہ ۱۱ھ میں حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کے دور خلافت میں پھوڑے کے پھٹنے سے ان کی وفات ہو گئی۔ آنحضرت ﷺ کے کفن کے لئے ایک حلہ لایا گیا تھا یعنی یمن کی بنی ہوئی دھاریدار چادریں کا جوڑا۔ مگر آنحضرت ﷺ کا کفن سفید سوئی کپڑے کا بنایا گیا۔ یہ حلہ کام میں نہیں آیا تو حضرت عبداللہ نے اپنے کفن کے لئے نو دینار میں خرید لیا تھا۔ لیکن وفات کے وقت وصیت کر دی کہ اس کا کفن نہ بنایا جائے کیونکہ اگر اس کپڑے کا کفن اچھا ہوتا تو آنحضرت ﷺ کا کفن اسی کا ہوتا۔ جب آنحضرت ﷺ کے لئے اس کو منتخب نہیں کیا گیا تو میں بھی اس کو اپنے لئے پسند نہیں کرتا۔ یہ تھانازک احساس عاشقان اتباع سنت کا۔ (الاستیعاب)

③ حارثہ بن نعمان (رضی اللہ عنہ) جلیل القدر صحابی تھے۔ کسی سائل کو دروازہ سے محروم نہیں جانے دیتے تھے اور جو کچھ دیتے وہ خود اپنے ہاتھ سے دیتے تھے۔ آخر عمر میں بصارت جاتی رہی تھی تو جہاں ان کی نشست رہتی تھی وہاں سے دروازہ تک ایک رسی باندھ لی تھی۔ دروازہ میں کھجوروں کا نوکر رکھا ہوتا تھا، جب سائل آتا تو یہ رسی پکڑ کر دروازہ تک جاتے اور خود اپنے ہاتھ سے فقیر کو دیتے تھے۔ بچوں نے عرض کیا کہ یہ خدمت ہم انجام دے سکتے ہیں۔ فرمایا: آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: مناولۃ السکین تقی میتہ سو (یعنی مسکین کو خود اپنے ہاتھ سے دینا بری موت سے محفوظ رکھتا ہے)۔ ایک مرتبہ حضرت جبریل امین انسانی شکل میں نزول فرما ہوئے اور آنحضرت ﷺ کو کوئی پیغام پہنچایا: حاضرین کو نہ پیغام کی خبر ہوئی نہ حضرت جبریل کی تشریف آوری کی۔ مگر حضرت حارثہ (رضی اللہ عنہ) نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا: یہ صاحب کون تھے جو آپ سے گفتگو فرما رہے تھے۔ یہ حضرت حارثہ (رضی اللہ عنہ) کی مخصوص فضیلت تھی کہ آپ نے حضرت جبریل کو دیکھ لیا۔ آنحضرت ﷺ کو تعجب ہوا اور ایک امی کی اس فضیلت پر مسرت بھی ظاہر فرمائی۔ حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کے دور خلافت میں وفات ہوئی۔ (الاستیعاب)

④ طبقات ابن سعد ص ۱۶۱ ج ۱

نیا دور۔ غیر محدود میدان عمل

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اَلِیْکُمْ جَمِیْعًا ۚ الَّذِیْ لَکُمْ مَلٰئِکَةُ السَّلٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

(سورہ الاعراف آیت ۱۵۸)

”اے پیغمبر تم لوگوں سے کہو اے افراد نسل انسانی (اے بنی نوع انسان)! میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ وہ خدا کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اسی کے لئے ہے۔“

(۱)

وہ آفتاب جو مشرق مکہ سے طلوع ہوا تھا۔ جس کی کرنیں اب تک فاران کی چوٹیوں سے ٹکرا رہی تھیں، مدینہ کے خط استواء پر پہنچا تو وہ آفتاب نیم روز تھا۔ ویسے بھی دعوت تبلیغ کے دس سال پورے ہو چکے تھے^① اور آنے والے سال بھی دس ہی تھے۔

(۲)

اس کا دائرہ عمل نوع انسان کے کسی خاص گروہ^② کی طبقہ تک تو کبھی محدود نہیں ہوا۔ البتہ ظاہری وسائل و ذرائع کی بنیاد پر اس کا مخاطب اب تک اَقْرَبُ النَّاسِ وَ مَن حَوْلَهَا^③ تھا اور اب اس کا موقف وہ ہے جو وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلَّا کَاٰفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَ نَذِیْرًا^④ کا مطلع اور مظہر ہے۔

(۳)

سکندر اعظم جیسے فاتح عالم کی تاریخ کا پہلا باب یہ ہو گا کہ اس نے ایسی زبردست فوجی طاقت کس طرح فراہم کی جو فاتح عالم بن سکی۔ اس کی فوج کی خصوصیات کیا تھیں اور وہ خود کس درجہ کا صاحب شجاعت اور صاحب حوصلہ تھا۔ لیکن وہ فرد کامل جو پوری بنی نوع انسان کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا گیا تھا اس کی تاریخ و سیرت کا پہلا باب یہ ہونا چاہئے کہ وہ کیا اصول تھے، کیا طریقہ کار تھا اور کون سے اخلاق تھے جو وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ^⑤ کی غرض و غایت کو پورا کر سکے۔ (آنے والے صفحات میں انہیں سوالات کے جوابات ہیں)۔

① نبوت کے ابتدائی تین سال میں دعوت اور تبلیغ کا حکم عام نہیں تھا (تفصیل پہلے گزر چکی ہے)
② جیسا کہ بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام کا دائرہ عمل گروہ بنی اسرائیل تھا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل ہی کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا: اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ (سورہ صف آیت ۵)
③ سورہ الانعام ۹۲ سورہ الشوری ۱۷، اَقْرَبُ النَّاسِ مکہ۔ مَن حَوْلَهَا جو اس کے اطراف ہیں۔

④ یعنی آپ کے مبعوث کرنے کا مقصد یہ ہے کہ پوری نوع انسان کو (وہ عرب ہوں یا عجم، کالے ہوں یا گورے) ان برکتوں کی بشارت سنا دو جو ایمان و عمل سے حاصل ہوتی ہیں اور انکار حق کے جو برے نتیجے ہوتے ہیں ان سے متنبہ اور آگاہ کر دو۔ (سورہ سہ آیت ۲۸)

⑤ آپ کو یہ آخری پیغام دیکر نہیں بھیجا گیا مگر اس لئے کہ رحم کرنا تھا تمام جہانوں پر، پس آپ کی ذات سر اسر رحمت کیونکہ جو پیغام آپ کے ذریعہ بھیجا گیا وہ سر اسر رحمت ہے۔ (الانبیاء ۱۱)

دعوت الی اللہ داعی کے اوصاف و خصائل اور خصوصیات

(۱)

ارشاد ربانی ہے :

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُنِيرًا ۖ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا ۖ وَبَشِيرًا
الْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُمْ مِنَ اللَّهِ فَضْلًا كَثِيرًا ۖ وَلَا تَطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ ۚ وَدَعِمَ أَذُنُكُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ
وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا (سورہ احزاب-۳۸، ۳۹)

”اے نبی یہ حقیقت ہے کہ ہم نے آپ کو (ان خصوصیتوں کے ساتھ مبعوث کیا ہے کہ) آپ
شاہد ہیں (ایمان و عمل کے بہتر نتائج اور ان کی برکتوں کی) بشارت دینے والے، (انکار حق کے
برے نتیجوں سے) آگاہ اور متنبہ کرنے والے اور اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف دعوت دینے
والے اور (آپ ایک) چراغ ہیں نور پھیلانے والے (روشن کرنے والے) اور (اے نبی) اہل
ایمان کو بشارت دیدے کہ ان کے لئے اللہ کی طرف سے بڑا فضل (اعزاز) ہے اور کہنا نہ مان
منکروں اور منافقوں (دغا بازوں) کا اور نظر انداز کر دے ان کی ایذا رسانی کو اور بھروسہ کر اللہ پر
اور اللہ کافی کار ساز ہے۔“

(۲)

توریت ۱۰ میں آنحضرت ﷺ کے متعلق بشارت دی گئی تھی۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُنِيرًا، وَحُرًّا لِّلْأَمِينِينَ۔ انت عہدی و رسولی و سبیتک
المتوکل لیس بغظ ولا غلیظ ولا صخاب فی الاسواق ولا یدفع بالسیئة السيئة ولكن یعفو ویغفر

۱۰ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما توریت کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ حضرت عطار بن یسار رضی اللہ عنہ نے ان سے
دریافت کیا ”توریت میں آنحضرت ﷺ کا ذکر ہے یا نہیں“ اگر ہے تو آپ کے کیا اوصاف بیان کئے گئے ہیں؟“
حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے توریت کے حوالہ سے یہ اوصاف بیان فرمائے۔ (بخاری ص ۲۸۵ باب کہتہ الصحب فی
الاسواق کتاب السیور)

ولن یقیضہ اللہ حتی یقیم بہ البلة العوجاء۔ بان یقولوا لا اله الا اللہ و تفتتح بہا عین عی و اذان
صم و قلوب غلف۔ (بخاری شریف ص ۲۸۵)

”اے نبی! یہ حقیقت ہے کہ ہم نے آپ کو ان خصوصیتوں کے ساتھ مبعوث کیا ہے کہ آپ شاہد
ہیں (ایمان و عمل کے بہتر نتائج اور ان کی برکتوں کی) بشارت دینے والے، (انکار حق کے برے
نتیجوں سے) آگاہ اور متنبہ کرنے والے۔ پناہ اور محافظ ان کے جن کے یہاں پہلے کوئی نبی نہیں آیا
تھا، تم میرے بندے ہو۔ اور میرے رسول ہو میں نے تمہارا نام رکھا ہے المتوکل (اس متوکل کی
شان یہ ہے) نہ بد خلق ہے، نہ سخت دل، نہ بازروں میں شور و شغب کرنے والا، (یعنی نہ بازاری
قسم کا غیر سنجیدہ)، برائی کا جواب برائی سے نہیں دیتا بلکہ درگزر کرتا ہے اور بخش دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ
اس وقت تک (اس کی جان) قبض نہیں کریگا جب تک کہ اس کے ذریعہ اس ملت کو ٹھیک نہ
کر دے، جس کو ٹیڑھا کر دیا گیا ہے۔ ٹھیک اس طرح کرے کہ وہ قائل ہو جائیں کہ اللہ کے سوا کوئی
معبود نہیں ہے۔ اس کلمہ سے ان کی اندھی آنکھیں، بہرے کان اور وہ دل جن پر غلاف چڑھے
ہوئے ہیں کھول دیئے جائیں۔“

مندرجہ بالا قرآن پاک کی آیت اور توریت کی بشارت میں آپ کی چند خصوصیتیں بیان کی
گئی ہیں۔

(۱) شاہد ا :

گو ایسی دینے والا۔ شہادت ۱۰ اور گواہی کا مدار مشاہدہ پر ہوتا ہے۔ یعنی قیاس اور گمان و تخمینہ
کی بنا پر گواہی نہیں دی جاتی، بلکہ گواہی اس چیز کی دی جاتی ہے جو خود اپنی آنکھوں دیکھی ہو یا اپنے
کانوں سے سنی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ شاہد کو اس چیز کا یقین ہوتا ہے ۱۰ جس کی وہ شہادت دے رہا ہے۔
اگر یقین نہ ہو محض گمان اور قیاس ہو تو شہادت دینا صحیح نہیں ہے۔ پس یہ لفظ شاہد ایک فلسفی اور نبی
میں امتیاز پیدا کر دینے والا ہے۔

فلسفی کے پاس ایمان و یقین نہیں ہوتا۔ فلسفی کا سرمایہ محض فکر ہوتا ہے ۱۰ (سوچ و چار، غورو

۱۰ الشہادۃ قول صادر عن علم حصل بشہادۃ بصیرۃ اویصر (المفردات فی غرائب القرآن للراغب رحمۃ اللہ)

۱۰ انہا حقیقۃ الشہادۃ ہوتیقن الشیء و تحققہ من شہادۃ الشیء۔ اے حضورہ یعنی شرح بخاری فی شرح کلمہ

الاذان اشہدان لا اله الا اللہ ص ۲۲۵ ج ۲)

۱۰ ۳۔ یونان اور ہندوستان کے فلاسفہ قدیم کے پاس محض فکر تھا۔ اسی فکر سے انہوں نے آسمانوں کی تحقیق کی ان
میں تارے گڑے ہوئے سمجھے اور زمین کو ساکن اور آسمان کو متحرک مانا وغیرہ۔ آج ان سب باتوں کی تردید کی جارہی
ہے حالانکہ یہی باتیں تھیں جن پر ایمان لانا فلاسفہ کے نزدیک ضروری تھا۔

خصوصاً) یا تجربہ۔^۱ غور و خوض یا تجربہ سے جو نتیجہ برآمد ہو، اس پر ایسا یقین نہیں ہوتا کہ وہ قسم کھائے۔

نبی اس عالم کے فنا ہونے، قیامت اور محشر کے برپا ہونے پر قسم کھا سکتا ہے کیونکہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ اس عالم کا آخری انجام قیامت ہے۔ فلسفی کے قیاس اور فکر میں اس عالم کا جو انجام بھی ہو اس پر قسم نہیں کھا سکتا کیونکہ اس کے پاس یقین کی مضبوطی اور ایمان کی روشنی نہیں ہے۔ اس کے پاس ظن، گمان ہے، تخمینہ اور اندازہ سے وہ یہی کہے گا۔ میری تحقیق یہ ہے ممکن ہے غلط ہو۔ چونکہ فلسفی نور یقین سے محروم ہوتا ہے تو وہ اپنے نظریہ کی دعوت بھی نہیں دیتا اور خود اس کا حوصلہ بھی پست رہتا ہے۔ نہ اس میں ذوق ایثار ہوتا ہے نہ شوق فدائیت، نہ جذبہ قربانی۔

اس کے برخلاف نبی جو کچھ کہتا ہے وہ شرح صدر^۲ سے کہتا ہے، کیونکہ اس کے پاس یقین کا نور اور ایمان کی روشنی ہوتی ہے۔ وہ علم اور انکشاف کے اس دیدبان اور مینارہ پر ہوتا ہے، جہاں سے وہ غنیم کی فوجوں کو کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ جبکہ اہل شہر کو غنیم کا تصور بھی نہیں ہوتا اور فلسفی نے اگر کسی طرح اندازہ لگالیا ہو کہ دشمن کی فوجیں قریب آگئی ہیں اور اس اندازہ کے عقلی دلائل بھی اس کے پاس ہوں تب بھی وہ اپنے اندر وہ جذبہ نہیں پاتا جو اس کو قربانی پر آمادہ کرے۔ نہ اس کے دل میں وہ دہشت ہوتی ہے جو اس کو بے چین اور مضطرب کر دے۔ کیونکہ اس کا یہ انداز تذبذب کی دلدل سے پاک اور آزاد نہیں ہوتا۔

جو شخص اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے کہ آگ کی خندق اس کے سامنے ہے اور وہ اس کے کنارے اس طرح کھڑا ہے کہ آگے قدم بڑھاتا ہے تو وہ ٹھیک خندق میں جاتا ہے۔ وہ صرف اپنے

^۱ ماہرین سائنس کے پاس صرف تجربہ ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ بقول شاعر:

اے برادر بے نہایت در گیسٹ ہر چہ بروئے میری بروئے ماست

^۲ پس سائنس کی تمام تحقیقات ظنیت ہیں۔ خود ماہرین سائنس کو اعتراف ہوتا ہے کہ ان کی آج کی تحقیقات حرف آخر نہیں ہے۔ ممکن ہے کوئی نیا انکشاف اس تمام تحقیق کو فریب نظر قرار دیدے۔ اِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْتَمُونَ (سورہ الانعام۔ ۱۱۶ و سورہ یونس آیت ۶۶)

^۳ اس کا مدار وحی پر ہوتا ہے یعنی اعلام خداوندی پر جو سراسر یقین ہوتا ہے کیونکہ خالق سے بڑھ کر اپنی مخلوق کا حال کسی کو نہیں معلوم ہو سکتا۔ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (سورہ الملک آیت ۱۴)

^۴ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُمْ مُّسْوِيَةٌ اِلَٰلٰهِيًّا (انجم آیت ۲۳) وہ (فلسفی یا مشرکین) اپنے ظن کی اتباع کرتے ہیں اور ان خیالات کی جو ان کے نفس پیدا کرتے ہیں اور ان کو عقیدت کی حیثیت دیتے ہیں۔ نیز ارشاد ہے: اِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَ اِنَّ الظَّنَّ لَا يَصْلِحُ بِمَنْ اَلْحَقَّ شَيْئًا (ابن آیت ۲۸) ”وہ (فلسفی اور ماہرین سائنس) اپنے فکر یا اپنے تجربہ کی بنا پر۔ اور مشرکین اپنے دعویٰ کی چاہ اور ان عقائد اور خیالات کے بموجب جو خاندانوں میں پشتپشت سے چلے آ رہے ہیں اور دلوں میں رچ گئے ہیں (ظن کی اتباع اور پیروی کرتے ہیں اور جہاں حق کی غیر فانی سچائی اور اصل حقیقت کی ضرورت ہو وہاں یہ وہم و گمان کام نہیں آتا۔“

قدم کو آگے بڑھنے سے نہیں روکے گا۔ بلکہ وہ پوری قوت صرف کر دے گا کہ وہ اپنی جگہ جم رہا ہے۔ اس کا قدم آگے نہ بڑھ سکے اور جس قوت سے وہ اپنے قدم کو آگے بڑھنے سے روکے گا اتنی ہی قوت سے وہ دوسروں سے بھی اصرار کرے گا کہ اس طرف نہ بڑھیں۔ اگر اس کو مزاحمت کرنی پڑے تو وہ مزاحمت میں بھی کمی نہیں کرے گا۔ یہاں تک کہ اگر اس مزاحمت میں اس کی جان بھی جاتی رہے تو وہ اس کو شہادت سمجھے گا کہ اس نے بے شمار مخلوق کے ساتھ خیر خواہی کی اور اپنی ایک جان دیکر بہت سی جانیں بچا دیں۔

یہ جذبہ، یہ جوش اور ولولہ فلسفی میں نہیں ہوتا۔ جبکہ نبی ہر لمحہ اس جذبہ سے سرشار رہتا ہے۔ لفظ شاہد نے جس طرح محمد ﷺ کے یقین کا مل اور ایمان مکمل کی خبر دی اس نے یہ بھی بتا دیا کہ داعی کے لئے لازم ہے کہ اس کے پاس وثوق کامل اور اعتماد ہو اور وہ متاع یقین کا سرمایہ دار ہو۔

(۲) مبشر آ:

بشارت دینے والا۔ لفظ بشارت بشرہ سے ماخوذ ہے۔ کمال کے بیرونی اور ظاہری حصہ کو بشرہ کہتے ہیں۔ غیر معمولی خبر کا اثر بشرہ پر بھی پڑتا ہے۔ خوشی کی خبر سے بشرہ، کھل جاتا ہے اور رنج کی خبر سے ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ بسا اوقات بشرہ کا رنگ زرد ہو جاتا ہے۔

(۳) نذیر آ:

مستقبل کے خطرات سے آگاہ کرنے والا۔ یہ دو لفظ دعوت کی اہمیت و عظمت کی طرف بھی اشارہ کر رہے ہیں۔ یعنی اس کو مان لینا غیر معمولی خیر و برکت کا ذریعہ ہو گا (جو بشارت عظیم ہے اہل ایمان کے لئے) اور انکار کرنا ایسا عمل ہو گا جس کا نتیجہ تباہ کن اور ہلاکت انگیز ہو گا۔ (یہ تنبیہ اور انداز و اعلام ہے اہل کفر کے لئے)

(۴) داعی الی اللہ:

اللہ کی طرف بلانے والا۔ خدا کا نام لینے والے بہت ہیں۔ اسی طرح خدا کا نام لیکر تبلیغ کرنے

^۱ یہی یقین کامل اس شہادت کی بنیاد ہو گا جو انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امتوں کے حق میں نافرمان قوموں کے برخلاف اور محمد رسول اللہ ﷺ جملہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں جملہ اقوام عالم کے برخلاف قیامت کے روز دیگے۔ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْكُمْ اُمَّةً بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَؤُلَاءِ شَهِيدًا۔ (سورہ نساء آیت ۴۰)

^۲ النذر الانذار۔ اخبار فیہ تعویف کما ان التبشیر اخبار فیہ سرور (المفردات فی غریب القرآن)

والے بھی بہت ہیں۔

مگر کیا وہ واقعی خدا کی طرف بلا تے ہیں یا اپنے ذاتی نظریات و خیالات کو منشاء قدرت اور حکم خدا سمجھتے ہوئے ہیں اور ان کی طرف لوگوں کو بلا تے ہیں۔ یا یہ صورت ہے کہ اپنی اغراض کی خاطر دعوت و تبلیغ کا بازار لگا رکھا ہے اور دین کے نام پر دنیا کمار ہے ہیں۔ داعی الی اللہ کے بعد باذنہ کے لفظ نے وضاحت کر دی کہ آپ جو پیغام یا تعلیم پیش کرتے ہیں وہ منجانب اللہ ہے اور اسکے حکم سے ہے۔ آپ کے ذاتی نظریات نہیں ہیں۔

(۵) باذنہ

کسی مملکت کا پیغام مملکت کی طرف سے نہیں مانا جاتا جب تک پیغام دینے والا مجاز نہ ہو۔ سفراء پہلے سفارت پیش کرتے ہیں اس کے بعد ان کو اجازت ہوتی ہے کہ اس مملکت میں سفارتی فرائض انجام دے سکیں۔ باذنہ کے لفظ نے ایک سند عطا فرمادی کہ آپ کو اللہ کی طرف سے مجاز کی حیثیت حاصل ہے گویا اس فرض اور اس خدمت کے لئے آپ لائسنس دار ہیں۔

(۶) سر اجا منیراً:

چراغ، روشنی بخشنے والا۔ کہتے ہیں کہ آفتاب سر اسر آگ ہے اور چاند اگرچہ روشن ہے مگر اس کا نور اپنا نہیں۔ وہ آفتاب کی عکاسی کرتا ہے لیکن چراغ کی چند خصوصیتیں ایسی ہیں جو آفتاب میں ہیں نہ چاند میں۔

سب سے پہلی خصوصیت وہ سوز و گداز ہے جو نہ آفتاب کو میسر ہے نہ چاند کو۔ دوسری خصوصیت یہ کہ چراغ شریک محفل ہوتا ہے جب کہ آفتاب اور چاند بزم انسان سے لاکھوں میل دور ہیں۔

تیسری خصوصیت فیض رسانی اور تکمیل تربیت ہے۔ آپ چراغ کی عثمانی بتی سے بے شمار چراغ جلا سکتے ہیں اور قدیل روشن کر سکتے ہیں، جبکہ آفتاب جہاں تاب نے آج تک کسی دوسرے کو آفتاب نہیں بنایا اور نہ چاند اپنے وجود سے کوئی دوسرا چاند بنا سکا۔

(۴) چراغ کی حقیقت مٹی یا روئی کا وہ گالا ہے۔ جس سے اس کی بتی بنائی جاتی ہے۔ مٹی میں آگ نہیں لگتی روئی آگ پکڑتی ہے، مگر شعلہ نہیں بنا سکتی۔ پس چراغ کی ہستی اور اس کی روشنی کا سرمایہ وہ تیل ہے جو چراغ روشن کرنے والا اس کے ظرف میں بھرتا ہے۔

یہ ہیں چراغ کی خصوصیتیں۔ ان خصوصیتوں کے ملاحظہ کے بعد آیت پر نظر ثانی فرمائیے۔ آیت میں داعی الی اللہ کے بعد سر اجا منیراً فرما کر اس حقیقت کو طشت از باہم فرمادیا کہ

(الف) محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا سرمایہ وحی الہی کا وہ روغن ہے جو اس کے تن بدن سے پیوست ہے بلکہ وہ روغن کہ داعی کا تن بدن اس کی تراوٹ میں غرق ہے۔ اس کا نور تمام تراوی کا فیض ہے۔

(ب) داعی کی دعوت شاعرانہ تفریح نہیں بلکہ شعلہ ہے اس سوزش کا جو اس کے بدن کو پگھلا رہی ہے۔ یہ سوزش، ہمدردی، نوع انسان کی سوزش ہے۔ انسان اپنے اعمال کے نتائج سے غافل ہے، یہ نبی ان کو دیکھ رہا ہے اور پگھل رہا ہے۔

(ج) اہل محفل مشغول ہیں مگر چراغ اپنا کام برابر کر رہا ہے۔

(د) سورج اور چاند روشنی بخشتے ہیں مگر ایثار اور قربانی کا سبق نہیں دیتے۔ یہ خصوصیت چراغ کی ہے کہ اس کی بتی جل کر فنا ہو رہی ہے اور ہر ایک داعی کو داعیانہ جہاد میں فنا ہونے کا سبق دے رہی ہے۔ یعنی داعی کی دعوت اس وقت نور بخش ہو سکتی ہے جبکہ خود داعی سوز و گداز میں بن جائے۔ اپنے تن بدن کو مقاصد دعوت کے لئے قربان کر دے۔ اور اس ایثار اور قربانی کو اپنے وجود کا مقصد اعظم اور اپنے ظہور کی آخری غرض وغایت بنالے (حقیقت یہ ہے کہ محمد ﷺ کی پوری سیرت اسی لفظ سر اجا منیراً میں سموئی ہوئی ہے۔ آپ سیرت مقدسہ کا جتنا گہرا مطالعہ کریں گے آپ کا ضمیر اس کی شہادت دیتا رہے گا۔

(ه) ارشاد ربانی ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمُ النَّبِيِّينَ (سورہ احزاب، ۴۰)
ترجمہ: ”نہیں ہیں محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ، لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں“ (سب کے ختم پر ہیں)

وَمَا يَنْطَلِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۖ (النجم، ۵-۴) وقال رسول الله ﷺ انا انا قاسم والله يعطى

لَعَلَّكَ بَاحِثٌ فَنَفْسِكَ أَلا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۖ (شعراء، ۳)

حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ آپ وقت سے پہلے بوڑھے ہو گئے۔ فرمایا: مجھے سورہ ہود اور اس جیسی دوسری سورتوں نے بوڑھا کر دیا۔ (بخاری ترمذی ص ۴) ان سورتوں میں ان ناعاقبت اندیش انسانوں کے نتائج بد بیان کئے گئے ہیں جنہوں نے انبیاء کی دعوت سے گریز کر کے کفر کی راہ اختیار کی۔ ان نتائج کے صدمہ نے آپ کو بوڑھا بنا دیا۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۚ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَغْتَ رِسَالَتَهُ (انعام، ۱۰)

خاتم کے معنی ہیں مہر، اسی لئے حضرت شاہ عبد القادر صاحبؒ نے ترجمہ کیا ہے: مہر سب نبیوں پر یعنی جس طرح مہر آخر میں ہوتی ہے اور مہر لگا دینے کے معنی ہوتے ہیں ختم کر دینا اور اس سلسلہ کو بند کر دینا، ایسے ہی آپ کے بعد نبی بنانے کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ کوئی نبی نہیں بنایا جائے گا۔ بانی عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری ہوگی تو آپ کی نبوت ختم ہوگی بلکہ آپ کی نبوت وہی ہوگی جو آپ کو آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے تقریباً چھ سو سال پہلے عطا ہوئی تھی۔ آپ کی نبوت وہی ہے۔ البتہ دور دوری میں آپ تشریف لائیں گے تو شریعت محمدیہ پر عمل کریں گے کیونکہ اس دور کا تقاضا یہی ہے۔ صلوات اللہ علیہم اجمعین۔

یعنی بقول حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ کے رسول ہیں۔ اس حساب سے سب آپ کے بیٹے ہیں۔ (موضح القرآن) اگر آپ کے بعد کوئی اور نبی آتا تو نوع انسان کا یہ تعلق اس سے ہو جاتا۔ مگر چونکہ آپ خاتم الانبیاء ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آنے والا، تو آپ کا یہ تعلق ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے۔ اسی سورہ احزاب میں پہلے یہ ارشاد ہوا ہے:

الَّذِي أَوَّلَىٰ بِالْأَنْفُسِ مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَآزَوَاجَهُ أَمَّهُتُهُمْ (ع، آیت ۶)

ترجمہ: نبی سے لگاؤ ہے، ایمان والوں کو زیادہ اپنی جان سے اور اس کی عورتیں ان کی (مومنین کی) مائیں ہیں۔

تشریح: آیت کا اشارہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی شفقت باپ سے بھی زیادہ ہے۔ اسی لئے جب ازواج مطہرات کو امت کی مائیں قرار دیا گیا تو یہ نہیں فرمایا گیا کہ آپ امت کے باپ ہیں کیونکہ باپ کی شفقت رشتہ پداری میں محدود ہوتی ہے اور آنحضرت ﷺ کی شفقت ان حدود سے بہت بالا ہے۔ ہمارے الفاظ اس کی کوئی حد نہیں بیان کر سکتے۔ البتہ عمل سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً اس آیت کے نزول کے بعد آنحضرت ﷺ نے اعلان فرمادیا کہ اگر کوئی مفلس مسلمان وفات پا جائے اور ترکہ کے بجائے اس کے ذمہ دار قرض ہو اور اس کے لاوارث بچے ہوں جن کا کوئی پرسان نہ ہو تو اس کا قرض آنحضرت ﷺ ادا فرمائیں گے اور اس کے بچوں کی ذمہ داری بھی آنحضرت ﷺ کے اوپر ہوگی۔ آپ ان کے مربی بھی ہو گئے اور متکفل بھی ہوں گے۔ لیکن اگر کوئی مسلمان ترکہ چھوڑ کر وفات پاتا ہے تو اس کا ترکہ اس کے وارثوں پر تقسیم ہوگا۔ (رشتہ کا باپ ترکہ میں حصہ دار ہوتا ہے) مگر آنحضرت ﷺ نے ترکہ میں سے کوئی حصہ نہیں لیا۔ البتہ لاوارث بچوں کی اور مرنے والے کے قرض کی ذمہ داری لے لی۔ (بخاری شریف وغیرہ) اس لئے کہ آپ کی شفقت، شفقت پداری کی حدود سے آگے بڑھی ہوئی تھی۔

ہدایات

وہ نبی جس کو ان خصوصیات کے ساتھ مبعوث کیا گیا تھا، اس آیت کے دوسرے حصہ میں اس کو چند ہدایات فرمائی گئی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) پہلی ہدایت:

اہل ایمان کو بشارت دیدیجئے کہ ان کے لئے اللہ کی طرف سے بہت بڑا فضل (اعزاز) ہے۔ تشریح: اس ہدایت میں (الف) جس طرح طریقہ دعوت و تبلیغ کی تلقین ہے کہ داعی الی اللہ کو تخویف و ترہیب (ڈرانے، دھمکانے اور مرعوب کرنے) کے بجائے ترغیب اور تشویش کا طریقہ

اختیار کرنا چاہئے یعنی خدا کے قہر و غضب کے تذکرہ سے پہلے ان نعمتوں اور ان فوائد کو ذہن نشین کرنا چاہئے جو دعوت کے قبول کرنے پر صاحب ایمان کو میسر آئیں گے۔

(ب) اور جس طرح حوصلہ افزائی ہے ان اہل ایمان کی جو دعوت قبول کر رہے ہیں۔

(ج) اسی طرح پیشین گوئی ہے ان امتحانات کی جو دعوت قبول کرنے والوں کے ہوا کرتے

ہیں جن کی بنا پر اللہ کے یہاں ان کا اعزاز^① ہوتا ہے۔ سورہ بقرہ آیت ۲۱۴ میں فرمایا گیا ہے۔

”کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ (محض ایمان کا زبانی دعویٰ کر کے) تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تو تمہیں وہ آزمائشیں ہی نہیں آئی ہیں جو تم سے پہلے لوگوں کو پیش آچکی ہیں۔ ہر طرح کی سختیاں انہیں بھگتنی پڑیں۔ ہولناک مصائب سے ان کو بھجھوڑا گیا، یہاں تک کہ اللہ کے رسول اور جو لوگ ایمان لائے تھے پکار اٹھے، اے نصرت خداوندی تیرا وقت کب آئے گا۔ (تب اچانک پردہ غیب چاک ہوا اور خداوند عالم کی نصرت یہ کہتی ہوئی نمودار ہو گئی) ہاں گھبراؤ نہیں خدا کی نصرت تم سے دور نہیں ہے۔

اس عام ضابطہ قدرت کے علاوہ خاص اس امت کو بھی آگاہ کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

سورہ بقرہ کی آیات ۱۵۴ تا ۱۵۷ جن کا ترجمہ یہ ہے:

”یاد رکھو یہ ضرور ہونا ہے کہ ہم تمہارا امتحان لیں۔ خطرات کا خوف، بھوک کی تکلیف، مال و جان کا نقصان، پیداوار کی تباہی، وہ آزمائشیں ہیں جو تمہیں ضرور پیش آئیں گی۔ پھر جو لوگ صبر کرنے والے ہیں انہیں (فتح و کامرانی) کی بشارت دے دو۔ یہ وہ لوگ ہیں جب کبھی کوئی مصیبت ان پر آتی ہے (تو بے قرار اور بدحواس ہونے کے بجائے ذکر الہی سے اپنی روح کو تقویت پہنچاتے ہیں اور ان کی زبان حال کی صدا یہ ہوتی ہے کہ) انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہم اللہ کے ہیں (ہماری زندگی اور موت، رنج و غم، سود و زیان جو کچھ بھی ہے سب اللہ کے لئے ہے اور ہم سب کو بالآخر مرنا اور) اس کی طرف لوٹنا ہے۔ سو یقیناً ایسے ہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کے الطاف و کرم ہیں جن پر ان کے رب کی رحمت اترتی ہے اور یہی ہیں جو اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔ (سورہ بقرہ آیت ۱۵۴ تا ۱۵۷)

① یعنی جب فضل و اعزاز کی بشارت ہے تو لامحالہ ان امتحانات کی بھی پیشین گوئی ہے جن میں کامیاب ہونے پر فضل و اعزاز کا تمغہ ملتا ہے۔

② أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخِلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ * مَسْتَهْمُ النَّاسِئَةِ وَالْفَرَاءَةِ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ * أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ (سورہ بقرہ ۲۱۴)

③ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالْعُمَلِ * وَبَشِيرِ الْيُسْرَيْنِ ۚ الَّذِينَ إِذَا أصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا اللَّهُ وَآلَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ ذَلِكُمْ عَلَيْنَا مِصْرُتُنَا * وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (سورہ بقرہ ۱۵۵ تا ۱۵۷)

(۲) دوسری ہدایت :

اور کہنا نہ مان منکروں اور منافقوں کا۔

سورہ الدھر کی آیت ۲۴ میں یہ ارشاد ہے :

”آپ اپنے پروردگار کے حکم پر مضبوطی سے قائم رہیں۔“

ان (دشمنان دین) میں سے کسی گنہگار اور ناشکرے کا کہنا نہ مانئے۔

پیشک داعی الی اللہ، اللہ کے حکم پر مضبوطی سے قائم رہے گا۔ وہ غیر اللہ کے حکم کی تعمیل نہیں کرے گا۔ ان سے قطع تعلق کریگا۔ مگر یہ قطع تعلق خاص رکھ رکھاؤ کے ساتھ ہوگا۔ دل آزاری کے ساتھ نہیں ہوگا، کیونکہ جس رب کی طرف لوگوں کو دعوت دے رہا ہے اس کا حکم یہ بھی ہے کہ

”یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان پر صبر کرو، اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ“

(سورہ ۳۷، مزمل، آیت ۱۰)

(۳) تیسری ہدایت :

وَدَعَا إِلَى اللَّهِ - (احزاب- ۴۸) نظر انداز کر دے ان کی ایذا رسانی کو یعنی معاف کرو، درگزر کرو، صبر و ضبط اور تحمل سے کام لو، داعی الی اللہ کی یہی شان ہے اور یہی اس کا فرض ہے۔ چنانچہ سورہ آل عمران کی آیت ۱۸۵ میں فرمایا گیا ہے^۱

”یاد رکھو ایسا ہونا ضروری ہے کہ تم جان و مال کی آزمائشوں میں ڈالے جاؤ، یہ بھی ضرور

^۱ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی ایک طویل روایت جس کو بخاری نے اس آیت کی تفسیر میں ص ۶۵۶ اور باب کنیۃ المشرک میں ص ۹۱۶ پر تفصیل سے نقل کیا ہے۔ اس کے آخری الفاظ سے یہ وہم ہوتا ہے کہ یہ حکم اس وقت تک تھا جب تک جہاد کی اجازت نہیں ہوئی تھی اس کے بعد یہ حکم نہیں رہا۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ دعوت اور تبلیغ کے سلسلہ میں یہ حکم ہمیشہ کے لئے ہے۔ چنانچہ سورہ توبہ میں جہاں یہ حکم ہے فَاِذَا اَنْتَلَخْتُمُ الْاَشْهُارَ الْمُحَرَّمَةَ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ (آیت ۵) ”جب حرمت کے مہینے گزر جائیں تو جنگ کی حالت قائم ہو جائے گی اس وقت مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ گے اس آیت کے بعد اگلی آیت یہ ہے۔ وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ آیت ۶ یعنی ”اے نبی اگر مشرکوں میں سے کوئی آدمی آئے اور تم سے امان مانگے تو اسے ضرور امان دو یہاں تک کہ وہ (اچھی طرح) اللہ کا کلام سن لے، پھر اسے امن کے ساتھ اس کے ٹھکانے پر پہنچا دو (اسلام قبول کرے یا نہ کرے)“

دراصل حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا تعلق پورے واقعہ سے ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب تک جہاد کی اجازت نہیں ہوئی تھی اور صرف صبر ہی کی ہدایت تھی تو اس وقت تک عبد اللہ بن ابی بن سلول اور ان کی پارٹی کے آدمی کھلے بندوں آنحضرت ﷺ کی مخالفت کیا کرتے تھے، جو بسا اوقات توہین آمیز ہوتی تھی اور جب جہاد کی اجازت ہو گئی اور غزوہ بدر میں مسلمانوں کو فتح بھی حاصل ہو گئی تو ان لوگوں نے ظاہر و داری کے لئے اسلام قبول کر لیا اور کھلم کھلا مخالفت کے بجائے دہ پردہ سازشیں شروع کر دیں۔

ہونا چاہیے کہ اہل کتاب اور مشرکین عرب سے تمہیں دکھ پہنچانے والی باتیں بہت کچھ سنی پڑیں، اگر تم نے صبر کیا (یعنی مصیبتوں میں ثابت قدم رہے) اور تقویٰ کا طریقہ اختیار کیا۔ (اللہ تعالیٰ کے احکام کی پوری تعمیل کی اور نافرمانی سے پوری احتیاط برتی) تو بلاشبہ یہ ہونگے بہت (بڑے حوصلہ) کے کام۔“

(۴) چوتھی ہدایت :

اللہ پر بھروسہ کر۔ یعنی جملہ ذرائع استعمال کرو۔ ذرائع کا مہیا کرنا بھی فرض ہے مگر بھروسہ ذرائع پر نہ ہو، بھروسہ خدا پر ہو کہ ہدایت بخشا اس کا کام ہے، وہی جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ اَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ

(سورہ القصص آیت ۵۶)

”تم جس کو چاہو راہ راست پر نہیں لگا سکتے، اللہ جس کو چاہے راہ راست پر لگا دیتا ہے اور ہدایت پانے والوں کا پورا علم اسی کو ہے۔“

سیرۃ مبارکہ کا اہم اور اصل جزد دعوت ہے۔ داعی کی حیثیت سے آپ کے اوصاف و خصائل سطور بالا میں بیان کئے گئے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر دعوت کے آداب اور طریقہ کار بھی بیان کر دیا جائے۔ یہ بھی سیرت مبارکہ کا سب سے مقدم باب ہے۔ آئندہ سطور میں آداب اور طریقہ کار بیان کیا جا رہا ہے جو وحی الہی نے مقرر فرمایا ہے۔

آداب دعوت و طریقہ کار

(۱)

(الف) اُدْعُ اِلٰی سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ ۚ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِسَبِيلٍ عَنْ سَبِيْلِهِ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِشَيْءٍ مَّا عَوْضْتُمْ بِهٖ ۚ وَكَيْنَ صَدْرَتُمْ لَّهُمْ خَيْرًا لِّلصَّدِيْقِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ وَاصْبِرْ وَمَا صَدْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ صَبِيْقٍ مِّمَّنْ يَّتُخَذُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَالَّذِيْنَ هُمْ مُحْسِنُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ (النحل- ۱۲۵-۱۲۸)

”اے نبی اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ اس طرح کہ حکمت اور دانشمندی کی باتیں بیان کرو اور اچھے طریقہ پر پند اور نصیحت کرو۔ اور مخالفوں سے بحث و نزاع کرو تو (وہ بھی) ایسے طریقہ پر کہ وہی طریقہ سب سے بہتر (اور زیادہ سے زیادہ حسن و خوبی) کا طریقہ ہو۔ تمہارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک گیا ہے اور وہی

ظرف میں وسعت، نگاہ میں بلندی عطا فرما کر اس کی مدد کرے۔ اس کو یقین رکھنا چاہئے کہ اگر وہ احتیاط اور تقویٰ سے کام لے رہا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہے، اس کا حامی اور مددگار ہے۔

(۲)

لَتَبْلُغَنَّ فِيْ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۖ وَلَتَسْبَعَنَّ مِنَ الدِّينِ اَوْتُوْا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَنْ الدِّينِ اَشْرَ كَؤَا اَذٰى كَثِيْرًا ۗ وَاِنْ لَّصَبِيْرًا اَوْ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ اَلْاُمُوْر (آل عمران-۱۸۶)

”ایسا ضرور ہونا ہے کہ تم جان و مال کی آزمائشوں میں ڈالے جاؤ۔ یہ بھی ضرور ہونا ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین کی طرف سے تمہیں دکھ پہنچانے والی باتیں بہت کچھ سننی پڑیں۔ اگر تم صبر (ضبط و تحمل) سے کام لو اور پرہیزگاری کرو (تقوے سے کام لو) احکام حق کی نافرمانی سے بچو تو یہ ہیں ہمت کے کام۔“

داعی کے اوصاف و خصائل کے سلسلہ میں تیسری ہدایت گزر چکی ہے۔ وَدَعَمْ اَذُنْهُمْ۔ ”نظر انداز کر دے ان کی ایذا رسانی کو۔“

سوال یہ ہو سکتا ہے کہ نظر انداز کب تک کرتا رہے، اس کا جواب اس آیت سے اخذ کیا جاسکتا ہے کہ کب تک کی کوئی حد ہی نہیں۔

چاہتے ہو کہ حق کا بول بالا ہو تو یہ تمنا آسان نہیں ہے۔ باطل تمہارے مقابلہ میں ضرور آئے گا۔ پوری قوت سے آئے گا، اور آتا رہے گا جب تک دنیا میں نور و ظلمت، اندھیری اور اجالا ہے، حق و باطل کی جنگ بھی جاری ہے اور پیر و دان دعوت حق کے لئے یہ امتحانات بھی باقی ہیں۔ داعی الی اللہ کی کامیابی یہی ہے کہ ان امتحانات میں وہ کامیاب ہو۔ ہدایت دینا اور بھٹکے ہوؤں کو راہ راست پر لانا خدا کا کام ہے۔ السعی منی والاتمام من اللہ۔

دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو دعوت اور طریقہ دعوت

اہل کتاب:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنِنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران-۶۴)

”(اے نبی) تم اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے کہو: اے اہل کتاب (اختلاف و نزاع کی ساری باتیں چھوڑ دو) اس بات (اصول) کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے دونوں کے لئے یکساں طور پر تسلیم شدہ ہے یعنی یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ کسی کی ہستی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ ہم میں سے ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرے گویا خدا کو چھوڑ کر

جانتا ہے کہ کون راہ راست پر ہے اور مخالفوں کی سختی کے جواب میں اگر سختی کرو تو چاہئے کہ ویسی ہی اور اتنی ہی کرو جیسی تمہاری ساتھ کی گئی اور اگر تم نے صبر کیا یعنی جھیل گئے اور سختی کا جواب سختی سے نہیں دیا تو بلاشبہ صبر کرنے والوں کے لئے صبر ہی بہتر ہے۔ اے پیغمبر صبر کرو اور تیرا صبر کرنا نہیں ہے مگر اللہ کی مدد سے۔ اور ان لوگوں کے حال پر غم نہ کھا، نہ ہی ان کی مخالفانہ تدبیروں سے دل تنگ ہو۔ یقیناً اللہ انہیں کا ساتھی ہے جو متقی ہیں اور نیک عملی میں سرگرم رہتے ہیں۔“

(ب) خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰہِلِيْنَ (سورہ اعراف، ۱۹۹، ۲۰۰)

”درگزر اور معافی کا طریقہ اختیار کر، نیک کام کو کہہ اور کنارہ کر جاہلوں (نادانوں) سے اور اگر ابھاردے تجھ کو شیطان کی چھیڑ (یعنی اگر ایسا ہو کہ کسی بات پر جھو نخل آجائے جو یقیناً شیطان کی حرکت ہوگی، داعی الی اللہ کو جھو نخل نہ آئی چاہئے) تو فوراً اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ، اس کی پناہ پکڑو (جھو نخل کو ختم کر دو) بلاشبہ اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔“ (سورہ الاعراف، آیت ۱۹۹)

تشریح: ذہنی صلاحیت ہر ایک کی یکساں نہیں ہوتی۔ کوئی صاحب علم و دانش ہوتا ہے کوئی سادہ طبیعت اور کوئی کھود کرید اور بحث و مباحثہ کا شوقین ہوتا ہے۔ ان آیات کا اشارہ یہ ہے کہ داعی الی اللہ کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ مخاطب کی ذہنیت کو پرکھے، اگر وہ صاحب علم و دانش ہے تو اس کو عالمانہ اور دانش مندانہ دلائل (حکمت) سے سمجھائے۔ عوام کے لئے ہمدردانہ نصیحت اور وعظ و پند سے کام لے۔ اور بحث کے شوقین سے بحث بھی کر سکتا ہے مگر اس طرح کہ پہلے مخاطب کو سمجھے پھر وہ انداز اختیار کرے جو حق بات کے سمجھنے اور سمجھانے کا ہوتا ہے، جس سے مخاطب میں یقین پیدا ہو۔ اس کے دل کی گرہ کھلے، ایسی کوئی بات نہ ہو جس سے اس کا دل دکھے۔ اپنی حق پرستی کا زعم اور گھمنڈ اور اس کی باطل پرستی کی تحقیر و تذلیل کا انداز ہرگز نہ ہو۔ دل پر خوف خدا غالب رہے کہ دلوں کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے۔ مگر اور ہدایت یافتہ کو وہی خوب پہنچاتا ہے۔ اپنے انجام کی خبر کسی کو نہیں۔ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کس کا انجام کیا ہوگا۔ داعی الی اللہ کے لئے یہ بھی درست نہیں کہ وہ مخالف کی مخالفانہ حرکتوں سے دل تنگ ہو۔ اس کے مزاج میں جھو نخل بھی نہ آئی چاہئے۔ اگر مخالف کی طرف سے زیادتی ہوئی ہے تو اجازت ہے کہ اس کا جواب دے سکتے ہو مگر نپاتلا کہ اس میں داعی اور مبلغ کی طرف سے کوئی زیادتی نہ ہو مگر صرف یہ اجازت ہے۔ داعی کی شان یہ نہیں کہ وہ بدلہ لے۔ اس کا کام ہے عفو و درگزر اور ضبط و تحمل، صبر، اس کا یہ صبر اللہ کے لئے ہے اور اللہ کی مدد سے ہے۔ لہذا داعی کا فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے کہ اس کے

اسے اپنا پروردگار بنا لیا ہے۔“

وجہ اختلاف :

لِكُنْ أُمَّةً جَعَلْنَا مَنَسَكَاهُمْ تَاسِكُوهُ فَلَا يُنَاوِئُكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۚ
إِنَّكَ لَعَلَىٰ هَذِهِ مُسْتَقِيمٌ ﴿١٤﴾ وَإِنْ جَدَلْتَهُ فَقُلْ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْبُدُونَ ﴿١٥﴾ (سورہ الحج ١٣ ر کو ٩)
”اے نبی ہم نے ہر امت کے لئے عبادت کا ایک طور طریقہ ٹھہرا دیا ہے۔ جس پر وہ چل رہی ہے۔ بس لوگوں کو اس معاملہ میں (یعنی اسلام کے طور طریق میں) تجھ سے جھگڑنے کی کوئی وجہ نہیں، تو اپنے پروردگار کی طرف لوگوں کو دعوت دے (کہ اصل دین یہی ہے) یقیناً تو ہدایت کے سیدھے راستے پر چل رہا ہے۔ اگر (اس پر بھی) لوگ تجھ سے جھگڑا کریں تو کہدے کہ اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔ تم جن باتوں میں آپس میں اختلاف کر رہے ہو، قیامت کے دن وہ تمہارے درمیان فیصلہ کر کے حقیقت حال آشکار کر دیگا۔“

تشریح: ان آیتوں کا اشارہ یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کا اسلوب اور طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ (الف) ان باتوں کو مقدم نہ رکھا جائے جن کو مخاطب بھی مانتے ہیں۔ مثلاً یہ بات کہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ ہونی چاہئے غیر اللہ کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کرنا چاہئے کہ معلوم ہو کہ خدا کو چھوڑ کر ان کو معبود مان لیا ہے۔ اس کو اہل کتاب بھی مانتے ہیں لہذا پہلے اسی پر زور دیا جائے۔ (ب) یہ سمجھا یا جائے کہ اللہ ایک ہے تو اس کا دین بھی ایک ہی ہے، اس کی بنیادی باتیں بھی ایک ہی ہیں، عبادت کا حکم ہمیشہ رہا، اختلاف اس کے طور و طریق میں ہوا۔ کیونکہ ہر ایک عہد اور ہر ایک دور اور ہر ایک قوم کی حالت یکساں نہیں تھی۔ جس کی جیسی حالت اور جیسی صلاحیت اور قابلیت تھی اس کے مطابق اس کو طور طریق دیا گیا جو ہر دور میں ترقی کرتا اور آگے بڑھتا رہا۔ بس یہ اختلاف فطری اور قدرتی تھا جو واقع ہوا۔

(ج) دعوت دینے والے کے دل میں دوسرے مذہب کے طریقوں کا یہ احترام ہو کہ وہ سمجھے کہ بنیادی طور پر وہ من جانب اللہ تھے تو اس سے اس کے انداز دعوت میں لامحالہ ٹپک ہوگی، دوسری طرف جن کو دعوت دی جا رہی ہے ان کو بھی اس دعوت سے وحشت نہ ہوگی کیونکہ وہ سمجھے گا کہ یہ دعوت پہلی بنیادوں کو اکھاڑ نہیں رہی بلکہ ان کو اپنی جگہ تسلیم کرتے ہوئے تعمیر میں اضافہ کر رہی ہے۔

(د) ان حقیقتوں کو ذہن نشین کرانے کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ مخاطب یہ اثر لیں گے کہ جب سابق امتوں میں ان کی صلاحیتوں کے بموجب عبادت کے قواعد و قوانین میں فرق ہوتا رہا ہے تو

ترقی یافتہ حالات کے مطابق اگر کوئی طریقہ معین کیا گیا، جو مکمل اور آخری طریقہ ہے، تو وہ بھی قابل تسلیم ہونا چاہئے اس سے وحشت نہ کرنی چاہئے۔

(ہ) پس تقاضا انصاف یہ ہے کہ سابق امتوں کے لوگ (اہل کتاب) اس دعوت کو اختلاف اور نزاع کا نشانہ نہ بنائیں بلکہ اس کو پرکھیں، حقیقت پسندی سے کام لیں اور صداقت کو تسلیم کریں۔ (و) لیکن اگر مخاطب لوگ تمام حقیقتوں کو پس پشت ڈال کر نزاع کرنا اور جھگڑنا ہی پسند کریں تو داعی الی اللہ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ بھی ان کی طرح ضد، عناد اور نزاع میں پڑے بلکہ وہ اللہ اعلم بِمَا تَعْبُدُونَ (الحج- ٦٨) کہہ کر الگ ہو جائے اور ان کا معاملہ خدا کے حوالے کر دے کہ قیامت کے دن وہی ان نزاعات کا فیصلہ کرے گا۔ واللہ اعلم

اہل شرک:

إِنَّهُمْ مَا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۖ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٦﴾ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكُوا ۚ وَمَا جَعَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيفًا ۚ وَمَا أَنتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ ﴿١٧﴾ وَلَا تَسْأَلُوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسْأَلُوا اللَّهَ عَنْذَ وَابِعِزِّعِلَمْ كَذَلِكَ زَيْنًا لِّكُنْ أُمَّةً عَاسِلَةً ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ مَرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٨﴾ (الانعام- ١٠٦-١٠٨)

(اے نبی) تمہارے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تم پر وحی کی گئی ہے، تم اس کی پیروی کرو کہ کوئی معبود نہیں ہے مگر صرف اسی کی ذات۔ اور کنارہ کرو مشرکین سے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو (وہ اس کی قدرت رکھتا ہے کہ انسان کو اس طرح بنا دیتا کہ سب ایک ہی راہ پر چلنے والے ہوتے اور) یہ لوگ شرک نہ کرتے (لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ مشیت خداوندی کا یہی فیصلہ ہوا کہ ہر انسان) اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی راہ رکھے۔ پس تمہارا کام یہی ہے کہ سچائی کی راہ دکھا دو۔ (انہیں جبراً اپنی راہ پر چلانا تمہارا کام نہیں ہے) ہم نے تمہیں نہ تو ان پر پاسبان بنایا ہے (کہ ان کی رائے اور عمل کی نگرانی کرو) اور نہ تمہارے حوالہ ان کی ذمہ داری ہے (کہ ان کے نہ ماننے کا کوئی الزام تم پر آئے)۔

اور (مسلمانو!) جو لوگ خدا کے سوا دوسری ہستیوں کو پکارتے ہیں تم ان کے معبودوں کے متعلق بدکلامی نہ کرو کہ پھر وہ بھی حد سے بڑھ کر بے سوچے سمجھے خدا کو برا بھلا کہنے لگیں۔ ہم نے اسی طرح ہر قوم کیلئے اس کے کاموں کو خوش نما بنا دیا (کہ ہر قوم اپنی راہ رکھتی ہے اور اپنی ہی راہ اسے اچھی دکھائی دیتی ہے) پھر آخر سب کو اپنے

تمہارے عمل کو جو تم کر رہے ہو خدا خوب جانتا ہے۔

پروردگار کی طرف لوٹنا ہے۔ اس وقت وہ ان سب پر ان کے کاموں کی حقیقت کھول دے گا جو وہ (دنیا میں) کرتے رہے ہیں۔“

تشریح: یعنی یہ تو حقیقت ہے کہ شرک ظلم عظیم ہے ❶۔ شرک کرنے والا خدا پر ظلم نہیں کرتا بلکہ خود اپنے اوپر بہت بڑا ظلم کرتا ہے کہ اپنی عظمت اور اپنی خودداری کو خود ہی پامال کرتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بلندی پر ہو پھر خود اپنے کو پستی کے گڑھے میں گر ادے، جہاں اس کو مردار خور پرندے ٹکا بوٹی کر دیں یا ہواؤں کے جھوکوں کی لپیٹ میں آکر برباد ❷ ہو جائے۔ اس ظلم عظیم کا نتیجہ لامحالہ ہے کہ شرک کے لئے بخشش کی گنجائش نہیں ❸۔ اور مشرک کا جنت میں داخل ہونا ایسا ہی ہے جیسے اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا۔ ❹ لیکن ان تمام قباحتوں اور نفرت انگیز خرابیوں کے باوجود داعی الی اللہ کے انداز میں نفرت اور تحقیر و تذلیل کی جھلک نہ ہونی چاہئے۔ وہ جب دعوت دے تو اس کی نظر اس پر ہونی چاہئے کہ اس کائنات میں رنگ برنگی اس کے خالق اور پروردگار کی حکمت و قدرت کا ملکہ کا تقاضا ہے۔ اس چمن کی رونق ہی گہوارہ نگارنگ سے ہے۔ اور اس کی زیبائش نہیں نکھرتی جب تک اس میں خاردار درخت اور پودے نہ ہوں۔ پھر ظاہر ہے کہ پھول پھول ہے۔ کانٹا کانٹا ہے۔ پھول کا جو مقام ہے وہ کانٹے کو میسر نہیں ہو سکتا۔ مگر چمن کی کیاریوں میں جس طرح پھول کا پودا اپنی تازگی میں مست ہے۔ کانٹے کا جھاڑ بھی گمن ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ سارا چمن اسی کا ہے اور اسی کیلئے ہے۔ اس جھاڑ سے اگر پوچھا جائے تو اسے اس کا احساس نہیں کہ وہ کانٹا ہے اور دنیا کی نگاہوں میں ذلیل ہے۔ اسے اگر اس کا احساس ہو تا تو وہ چمن کی کیاری کے پاس بھی نہ جاتا، بلکہ اس کی نظر میں کچھ اپنی خوبیاں ہیں۔ اس کو احساس ان خوبیوں کا ہے۔ اسی لئے وہ چمن کی کیاری میں پھوک کے پودے سے زیادہ سینہ زور ہے اور اپنی آن میں مست ہے۔ پس داعی الی اللہ کا فرض ہے کہ دعوت اور تبلیغ کے وقت وہ اس فلسفہ قدرت کو سامنے رکھے۔ اگر وہ کانٹے کی اصلاح چاہتا ہے تو اس کو خار ہونے کا طعن و بکر اصلاح نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کی اصلاح جب ہوگی جب اس ذہنیت کی اصلاح ہو کہ وہ کانٹا ہے مگر اپنے آپ کو پھول کا ہمدوش سمجھتا ہے بلکہ خیابان پر پھول سے زیادہ اپنا حق جتنا ہے۔

آیت میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر خدا چاہتا تو انسان کو بھی حیوانات کی طرح بنادیتا کہ سب اپنی حالت میں ایک ہی طرح کے ہوتے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں چاہا۔ اس

❶ سورہ لقمان آیت ۱۳

❷ سورہ الحج آیت ۳۱

❸ سورہ نساء آیت ۱۱۵

❹ سورہ الاعراف آیت ۳۹

نے انسان کی طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ ہر گروہ میں اپنی اپنی رائے اور اپنی اپنی پسند رکھتا ہے اور ہر گروہ کی نظر میں وہی کام اچھا ہے جو وہ کر رہا ہے۔ تمہاری نظر میں اس کی راہ کتنی ہی بری ہو، لیکن اس کی نظر میں وہ ایسی اچھی ہے جیسی تمہاری راہ تمہاری نظر میں۔ پس ضروری ہے کہ اس بارے میں برداشت اور رواداری سے کام لو۔ جو لوگ شرک و بت پرستی میں مبتلا ہیں تم انہیں دعوت حق دو مگر برا بھلا نہ کہو۔ اگر تم ان کے بتوں کو برا بھلا کہو گے تو وہ بھی خدا کو برا بھلا کہیں گے۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم انہیں گالیاں دو گے وہ تمہیں گالیاں دیں گے۔ طلب حق کی بات نہیں رہے گی۔ گالی گلوچ کی بات ہو جائے گی۔

لاذہب کے منکر پرست اور خدا کے منکر (معاذ اللہ):

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلِكِ وَجَّعَتْ بِكُمْ رَيْنَحٌ فَتَقُولُونَ لَا تَرْجِنَا عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَظَلَمُوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ أَنجَيْتَنَا مِنْ هَذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿٣١﴾ فَلَمَّا أَكُنْهُمْ إِذَا هُمْ يَنْتَعُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ يَلْعَابُ النَّاسُ إِنَّهُمَا بَغْيُكُمْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ مَتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٣٢﴾

(سورہ یونس آیت ۲۲ و ۲۳)

”وہی ہے جس نے تمہارے لئے سطح زمین پر اور سمندر میں سیر و سیاحت کا سامان کر دیا ہے۔ پھر جب ایسا ہوتا ہے کہ تم جہازوں میں سوار ہوتے ہو اور جہاز موافق ہوا پر تھم کر تھم کو لے اڑتے ہیں مسافر خوش ہوتے ہیں (کیسی اچھی ہوا چل رہی ہے) پھر اچانک ہوائے تندہ کے جھوکے آچنچتے ہیں اور ہر طرف سے موجیں اٹھ اٹھ کر گھیر لیتی ہیں اور مسافر خیال کرتے ہیں کہ بس اب ان میں گھر گئے (اور بچنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی) تو اس وقت انہیں (خدا یاد آتا ہے) وہ دل کے اخلاص کے ساتھ اسے پکارنے لگتے ہیں: اے خدا اگر اس مصیبت سے نجات دیدے تو ہم ضرور تیرے شکر گزار ہونگے پھر (دیکھو) جب اللہ انہیں نجات دے دیتا ہے تو اچانک اپنا عہد و پیمان بھول جاتے ہیں اور ناحق ملک میں سرکشی اور فساد کرنے لگتے ہیں۔ اے لوگو! تمہاری سرکشی کا وبال خود تمہاری جانوں پر پڑنے والا ہے۔ یہ دنیا (چند روزہ) زندگی کے فائدے ہیں۔ اٹھالو پھر تمہیں ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اُس وقت ہم تمہیں بتائیں گے کہ جو کچھ دنیا میں کرتے رہے، اس کی حقیقت کیا تھی۔“

تشریح: یہ ایک ایسی مثال ہے، اس طرح کی صورتیں انسان کی زندگی کے اتار چڑھاؤ میں اکثر پیش آتی رہتی ہیں کہ تمام ذرائع اور وسائل ختم ہو جاتے ہیں کوئی سہارا باقی نہیں رہتا۔ فطرت انسان اس وقت بیدار ہوتی ہے۔ وہ لامحالہ ایک بن دیکھی ہستی کی طرف متوجہ ہوتی ہے جس کو وہ قادر، کار ساز

اور بگڑی کا بنانے والا سمجھتی ہے، وہی خدا ہے۔

قرآن شریف کا تقریباً ایک تہائی حصہ اس طرح کی مثالوں سے بھرا ہوا ہے، جن میں خود انسان کے مشاہدات، تجربات اور خود اس کے وجدانی جذبات کو پیش کر کے خداوند عالم کے وجود اور اس کی صفات قدسیہ کو ثابت کیا گیا ہے اور داعی الی اللہ کے لئے ناقابل تردید دلائل کا ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے۔ مثلاً بحری سفر ہی کی ایک مثال دوسرے عنوان سے سورہ بنی اسرائیل میں دی گئی ہے ترجمہ یہ ہے:

”اے لوگو! تمہارا رب وہ ہے جو تمہاری کار بر آریوں کے لئے سمندر میں جہاز چلاتا ہے تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو، (بحری راستوں سے فائدے اٹھاؤ) بلاشبہ وہ تم پر بڑی ہی رحمت کرنے والا ہے۔ اور جب کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم سمندر میں ہوتے ہو اور مصیبت آگتی ہے تو اس وقت وہ تمام ہستیاں تم سے کھوجاتی ہیں جنہیں تم پکارا کرتے ہو، صرف ایک اللہ ہی کی یاد باقی رہ جاتی ہے۔ پھر جب وہ تمہیں مصیبت سے نجات دے دیتا اور خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو اس سے گردن موڑ لیتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔ پھر کیا تمہیں اس سے امن مل گیا ہے کہ وہ تمہیں خشکی کے کسی گوشے میں دھندلے۔ یا تم پر پتھر برسانے والی آندھیاں بھیج دے، اور تم اس حالت میں کسی کو اپنا مددگار نہ پاؤ، یا تم اس بات سے بے خوف ہو گئے ہو کہ اللہ تمہیں دوبارہ ویسی ہی مصیبت میں ڈال دے اور ہو اکا ایک سخت طوفان بھیج دے اور تمہاری ناشکری کی پاداش میں تمہیں غرق کر دے، پھر کسی کو نہ پاؤ جو اس کے لئے ہم پر دعویٰ کرنے والا ہو۔ اور البتہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور خشکی اور تری دونوں کی قوتیں اس کے تابع کر دیں کہ اسے اٹھائے پھرتی ہیں۔ اور اچھی چیزیں اس کی روزی کے لئے مہیا کر دیں۔ نیز جو مخلوقات ہم نے پیدا کی ہے ان میں اکثر پر اُسے برتری دیدی، پوری برتری جیسی کہ ہونی چاہئے۔ (بنی اسرائیل آیت ۶۵-۷۰)

طرز عمل

(الف) لَا اَنْكُمُ الْاَقْلٰی الدِّیْنِ (سورہ بقرہ رکوع ۲۴ آیت ۲۵۶)

”نہیں کوئی زور (جبر و قہر یا زبردستی) دین کی بات میں^۱ کیونکہ دین کا مدار^۲ اس پر ہے

^۱ ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ۔

^۲ اذالاکہ الامام الغیر فعلاً لا یرضی بہ الفاعل وذا الایصور الا فی افعال الجوارح اما الایمان فهو عقد القلب والقیادۃ لا یوجد بالاکراہ (تفسیر مظہری) وغیرہ۔

کہ دل مان لے^۱ اور تسلیم کر لے^۲۔ جبر و قہر سے زبانی اقرار کرایا جاسکتا ہے۔ دل سے منوایا نہیں جاسکتا۔ کوشش یہ کرو کہ دل کی آنکھیں کھلیں، مگر اپنی کو گراہی اور ہدایت کو ہدایت سمجھنے لگے۔

(ب) اِذْفَعُم بِالْبَیِّنٰتِ هٰی اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِی بَیْنَکُمْ وَبَیْنَہُمْ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهُ وِلٰی حَبِیْمٌ ﴿۳۳﴾

(حم السجدہ: ۳۳)

”برائی کا جواب دو ایسی صورت میں کہ وہی صورت سب سے اچھی (اخلاقاً سب سے زیادہ موثر) ہو تو تم دیکھو گے کہ جس سے تمہاری دشمنی ہے وہ ایسا ہو جائیگا جیسے مخلص دوست (سرگرم محبت)۔“

(ج) وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِشَلِّ مَا عُوْذِبْتُمْ بِہٖ ۚ وَلَیِّنٌ صَدِیْقٌ لَّہٗوَ خَیْرٌ لِّلْضَلٰیْمِیْنَ ﴿۱۲۱﴾

(نحل۔ آیت ۱۲۱)

”اور اگر مخالفوں کی سختی کے جواب میں سختی کرو تو چاہئے کہ دیسی ہی اور اتنی ہی کرو جیسی تمہارے ساتھ کی گئی۔ اور اگر تم نے صبر کیا (جھیل گئے اور سختی کا جواب سختی سے نہیں دیا) تو بلاشبہ صبر کرنے والوں کے لئے صبر ہی بہتر ہے۔

تشریح: (۱) قانون یہ ہے:

وَجَزَاءُ سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُہَا (آیت ۴۰ سورہ شوریٰ)

”برائی کی سزا اسی جیسی برائی ہے۔“

(۲) داعی الی اللہ اگر اس ضابطہ پر عمل کرتے ہوئے سختی کے جواب میں بالکل اتنی ہی اور

۱۔ ایک مسلمان اگر اسلام سے برگشتہ ہو کر معاذ اللہ کفر اختیار کرتا ہے تو اس کی وہ سزا ہے جو باغی کی ہوتی ہے یعنی وہ واجب القتل ہے۔ لیکن ایسا شخص جس سے جبراً قہراً اقرار کرالیا گیا وہ اگر اسلام سے منحرف ہوتا ہے تو کتب فقہ میں صراحت کر دی گئی ہے کہ اس کو قتل نہیں کیا جائیگا۔ بدایہ النیرین میں ہے: ولو اکرہ علی الاسلام حتی حکم بالاسلام ثم رجع لم یقتل (کتاب الاکراہ) یعنی اگر مجبور کر کے مسلمان بنالیا گیا یہاں تک کہ اسلام کے احکام اس پر جاری ہو گئے (مثلاً مسلمان رشتہ دار کا ترکہ اس کو مل گیا یا کسی مسلمان عورت سے اس کا نکاح کرادیا گیا وغیرہ) پھر اس نے اسلام سے رجوع کر لیا اور عدالت میں بھی یہی بیان دے دیا کہ اس کو جبراً مسلمان بنایا گیا تھا تو مرتد کی سزا (قتل) اس کو نہیں دی جائے گی۔ شرح میر کبیر میں یہ ضابطہ بیان کیا گیا ہے۔ اقرار الیکراہ باطل سوادکان الاکراہ بالحبوب والقتل (شرح میر کبیر ص ۳۲ ج ۴) یعنی جس سے زبردستی کچھ کہلوایا گیا اس کا یہ اقرار باطل (قطعاً ناقابل اعتبار ہے) خواہ اس کو قیدی دھمکی دی گئی ہو یا قتل کی۔

۲۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ قبیلہ بنی سالم میں عوف کے ایک انصاری صاحب جن کا اسم گرامی حصین رضی اللہ عنہ تھا ان کے دو لڑکے مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اجازت چاہی کہ وہ لڑکوں کو مجبور کریں کہ وہ اسلام لے آئیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ لَا اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ (تفسیر مظہری وغیرہ) دین کی بات میں زور زبردستی نہیں۔

صلاحیت کے بموجب دعوت کا طرز اختیار کرے۔ اہل دانش سے دانش مندانہ، عوام سے ان کے حال کے بموجب وعظ و پند اور خیر خواہانہ نصیحت کا اسلوب اختیار کرے۔ اور جو بحث کے شوقین ہوں ان سے گفتگو مدلل ہو۔

(۷) مخاطب کے مذہب کے لحاظ سے بھی دعوت کا انداز جدا جدا ہو گا۔ اہل کتاب کو دعوت اور طرح دی جائے گی، مشرک کو اس کے بموجب اور منکرین خدا، عقل پرستوں سے افہام و تفہیم کا طرز و انداز جدا ہو گا۔^۱

(۸) داعی کے مزاج میں ضبط و تحمل ہو۔ وہ گستاخیوں اور سختیوں کو برداشت کرے، کڑوی بات کا جواب میٹھے بول سے دے۔ مخالف کو موافق اور دشمن کو دوست بنائے۔

(۹) داعی الی اللہ کا تعلق اپنے رب سے (جس کی طرف وہ دعوت دے رہا ہے) مضبوط ہو۔ اس کا اعتماد اور بھروسہ خدا پر ہو۔ وہ دعوت کو اپنا ایک فریضہ سمجھے جس کی ادائیگی اس کے ذمہ ہے۔ نتیجہ خدا کے حوالے کر دے۔

”محمد رسول اللہ ﷺ داعی اعظم بلکہ تمام داعیان حق کے امام و مقتدا تھے قرآن پاک کی مندرجہ بالا آیتیں اور اس طرح کی بہت سی آیتیں شہادت دے رہی ہیں کہ داعی الی اللہ کے جملہ اوصاف و خصوصیات بدرجہ اتم و اکمل آنحضرت ﷺ کے اندر موجود تھے۔“

(”کان خلقہ القرآن“ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا)

بلکہ حق یہ ہے کہ آپ کی ذات باجود منبع اور مرکز تھی۔ اوصاف داعی اور خصوصیات دعوت اس سے اخذ کئے جاتے ہیں۔

حضرت حق جل مجدہ نے جب آپ کو تمام امتوں اور پوری کائنات انسانی کے لئے داعی بنایا تو ہر ایک فرقہ اور ہر ایک گروہ سے خطاب کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا۔ قرآن حکیم ان سب کا مجموعہ ہے۔ چند مثالیں اوپر گزر چکی ہیں۔

دعوت الی اللہ کی دشوار گزار گھاٹی ”جہاد فی سبیل اللہ“

یقیناً دعوت الی اللہ کے سلسلہ میں کوئی جبر و قہر اور کوئی زبردستی نہ ہونی چاہئے۔ بے شک داعی حق کا کام صرف یہ ہے کہ دلوں کے دروازوں پر دستک دیدے۔ اگر کوئی نہیں کھولتا تو بلاشبہ

۱۔ نمبر ۶ دے پر عمل جب ہی ہو سکے گا جب مخاطب کے مذہب سے واقفیت ہو۔ دعوت و تبلیغ کا نظام قائم کرنا اجتماعی فریضہ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک داعی جملہ مذاہب سے واقف ہو۔ لیکن جس حلقہ کو دعوت کے لئے منتخب کیا جائے اس کے لئے داعی معین ہوں۔ اور وہ اس حلقہ کے مذہبی رجحانات، معاشرتی رسومات و میلانات اور جذبات سے واقف ہوں۔

اس جیسی ہی سختی کرے تو اس کے جواز سے انکار نہیں ہے مگر اس سے برائی اور سختی کا سلسلہ ختم نہیں ہو گا۔ کیونکہ جواب میں جو چیز وجود میں آرہی ہے وہ بھی سختی اور برائی ہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ابتداء نہیں ہے جو اب ہے۔

(۳) جب کوئی شخص مقام دعوت اپنائے ہوئے ہے تو یہ ناپ تول اس کی شان کے شایان نہیں ہے۔ اس کی شایان شان یہ ہے کہ وہ ضبط و تحمل اور صبر سے کام لے اور جواب دے جو اس کی شان کے لحاظ سے بہتر ہو۔

(۴) داعی الی اللہ کا نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ وہ ایسی صورت اختیار کرے اور اس کی کوشش کرے کہ برائی کا سلسلہ ختم ہو۔ جس کی شکل مثلاً یہ ہے کہ جو دشمن ہیں وہ سرگرم محبت دوست بن جائیں۔

(۵) یہ بات بہت اونچی ہے۔ ہر شخص اس درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس اونچے درجے کو وہی حاصل کر سکتا ہے جو بڑا صاحب نصب ہو۔ (آیت ۳۵، سورہ حم مجید)

بدی را بدی سہل باشد جزا اگر مردی احسن الی من اسما

خلاصہ

(۱) داعی جس بات کی دعوت دے ضروری ہے کہ اس کے متعلق اس کو پورا یقین ہو، جیسے مشاہدہ کرنے والے کو اپنے مشاہدہ کا یقین ہوتا ہے اور وہ اس پر شاہد ہوتا ہے۔

(۲) ضروری ہے کہ داعی کی فطرت با احساس ہو، ہمدرد اور غم خوار ہو۔ اس کے اندر شفقت ہو، درد ہو، سوز ہو، گداز ہو، وہ شمعِ یاس کا چراغ کی طرح ہو۔

(۳) دعوت اس کے درد کا فغان ہو۔ اس کے سوز و دروں کا شعلہ ہو۔

(۴) داعی مشفق طیب کی طرح ہو اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ داعی اس شفقت اور اس ہمدردی اور خیر خواہی کا پیکر اور مجسمہ ہو جو شفقت و ہمدردی باپ کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے۔

(۵) باپ کی تمنائیں اچھی ہی ہوتی ہیں۔ وہ اپنی اچھی تمنائوں کا خواب دیکھتا ہے تو اولاد کو بشارت بھی دیتا ہے کہ یہ کر لو گے تو اعلیٰ درجہ پا لو گے۔ اور یہ بات بہت ہی درد اور دکھ کی ہوتی ہے کہ اولاد نا بھار اور بدکار ہو، یہ اس کی بدکاری کو دیکھ کر گھٹے، رنجیدہ ہو اور اولاد کو اس کی بدکاری کے خطرناک نتائج پر بار بار آگاہ اور متنبہ کرے۔

پس باپ اپنی فطری تمنائوں کے لحاظ سے پہلے مبشر ہوتا ہے اور نذیر مجبوراً ہوتا ہے۔ یہی شان داعی کی بھی ہوگی۔ وہ پہلے مبشر ہو گا اور نذیر بدرجہ مجبوری ہو گا۔

(۶) دعوت کا انداز سنجیدہ اور دانش مندانہ ہو۔ وہ مخاطب کو جانچے، تولے، پرکھے پھر اس کی

یہی وہ جدوجہد ہے جو داعی پر بحیثیت داعی فرض ہے اور جس کو اسلام جہاد فی سبیل اللہ کہتا ہے۔

تمام جہانوں کا رب اور ساری مخلوق کا پروردگار اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ النِّعْمَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً ۚ (سورہ نساء آیت ۷۵)

”اور مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے حالانکہ کتنے ہی بے بس مرد ہیں، کتنی ہی عورتیں ہیں، کتنے ہی بچے ہیں (جو ظالموں کے ظلم سے عاجز آکر) فریاد کر رہے ہیں، خدا یا ہمیں اس بستی^۱ سے جہاں کے باشندوں نے ظلم پر کرباندہ لی ہے، نجات دلا۔ اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا کارساز بنا دے او کسی کو مددگاری کے لئے کھڑا کر دے۔“

یہ ہے جہاد فی سبیل اللہ۔ کیا اس کو دعوت الی اللہ کا ایک نہایت ضروری شعبہ نہیں کہا جائیگا۔ اور کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ دعوت الی اللہ بے دست و پا رہے گی، جب تک اس میں قوت مقابلہ نہ ہو جو ظالم کے ہاتھ روک سکے اور مظلوموں کو نجات دلانے کے لئے اقدام بھی کر سکے۔

یہ جہاد کب تک رہے گا؟ رب العالمین نے اس کی یہ حد بیان فرمائی ہے۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كَلْكُلًا ۗ (سورہ الانفال آیت ۳۹)

۱ نزول آیت کے وقت یہ حالت مکہ کی تھی کہ وہاں بہت سے مسلمان مشرکین مکہ کے ظلم و ستم کا تحقیر مشق بنے ہوئے تھے۔ ابو جہل کے جھگڑنے والے بھائی حضرت سلمہ بن اکوعہ ان کے ماں شریک بھائی عیاش بن ابی ریحہؓ اور مکہ کے رئیس اعظم ولید بن مغیرہ کے لڑکے کہ ان کا نام بھی ولید بنی تھا (ولید بن الولید) مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کو باندھ کر ڈال دیا گیا تھا کہ ہجرت نہ کر سکیں۔ اس طرح اور بھی عورتیں اور مرد تھے جو مجبور و مقبور تھے اور مکہ سے نکل نہیں سکتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نمازوں میں ان کے لئے دعا کیا کرتے تھے (بخاری شریف ص ۱۱۰ ص ۱۳۶ ص ۹۳۶ وغیرہ)۔ لیکن ظاہر ہے آیت میں مکہ کی قید نہیں۔ جب بھی اور جہاں بھی یہ صورتحال ہو تو مسلمانوں کو جہاد کی ہدایت کی گئی ہے۔ بیشک دور حاضر کا بین الاقوامی قانون یہ ہے کہ کسی مملکت کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا کسی دوسرے ملک کو حق نہیں ہے۔ مگر ظاہر ہے یہ بین الاقوامی قانون انسانی ہمدردی اور خلق خدا کے فلاح و بہبود کے جذبہ سے نا آشنا ہے، کیونکہ دور حاضر کی حکمران قوموں کا نصب العین صرف یہ ہے کہ ان کا اقتدار باقی رہے اور عظمت کے جس مینار پر وہ رونق افروز ہیں اس میں جنبش نہ آئے۔ بیشک ان قوموں کے افراد میں خلق خدا کی ہمدردی کا جذبہ موجود ہے اور اسی جذبہ کی بنا پر ان کے یہاں بہت سے خیراتی ادارے اور بڑے بڑے خیراتی فنڈ قائم ہیں۔ مگر ان کی حکومتوں کا نصب العین نہ خلق خدا کی خدمت ہے نہ انسانی ہمدردی، نہ کوئی اخلاقی اور روحانی دعوت ان کے مقاصد میں داخل ہے۔ یہی سبب ہے کہ ممالک کی اندرونی تحریکات خواہ کتنی ہی انسانیت کش اور ہلاکت انگیز ہوں مگر بین الاقوامی ہنجاریت کوئی مداخلت نہیں کرتی۔ اسلام اس سنگدلی کو برداشت نہیں کرتا۔

اس کو حق نہیں کہ کسی دروازے کو زبردستی کھولے یا کسی درستی کو توڑے۔

یہ بھی درست ہے کہ داعی الی اللہ کو صبر و تحمل اور مسلسل برداشت سے کام لینا چاہئے۔ لوہے کے کنگھے سے اس کا گوشت کھرچا جائے، اس کی ہڈیاں نوچی جائیں، اس کو کھولتے ہوئے کڑھائی میں ڈال دیا جائے۔ اس کے سر پر آ رہ رکھ کر پورا بدن چیر کر دو ٹکڑے کر دیئے جائیں، تو اس کا کمال یہی ہے کہ وہ ضبط و تحمل، صبر اور برداشت سے کام لے، ظالم کے حق میں یہی دعا کرے، اللھم اھد قومی فانھم لایعلمون (اے اللہ میری قوم کو سیدھا راستہ دکھا دے، وہ مجھے جانتے نہیں ہیں)۔ لیکن اگر شکل یہ ہو کہ مخلوق خدا ظلم کی چکی میں پیسی جا رہی ہو، رائے کی آزادی سلب کر لی گئی ہو، پیٹ کو اگرچہ آسودگی میسر ہو مگر ضمیر کی آزادی پر تالے پڑے ہوئے ہوں، طائر فکر کو آہنی قفس میں گھونٹ دیا گیا ہو، ایک شخص کا ضمیر ایک بات کو حق سمجھتا ہو، وہ مضطر اور بے چین ہو کہ اس حق کو قبول کر لے، مگر اس کو مجبور کیا جا رہا ہو کہ وہ اپنے ضمیر کے فیصلہ پر عمل نہ کرے، وہ حق کو حق نہ سمجھے بلکہ غلط اور باطل کو حق سمجھے۔ اگر وہ اپنے ضمیر کے فیصلہ پر عمل کرے اور باطل کے دائرے سے نکلنا چاہے تو پہلے اپنی جان سے ہاتھ دھو لے، پہلے پھانسی کا پھندا گلے میں ڈالے۔ پھر قدم بڑھانے کا ارادہ کرے۔

اگر صورت حال یہ ہو تو کیا داعی حق کا فرض اب بھی یہی ہو گا کہ وہ ظلم کے شعلوں کو بھڑکتا ہوا دیکھتا رہے۔ اور ان کو بجھانے کی کوشش نہ کرے۔ وہ مظلوموں کو جھٹکتا ہوا دیکھے اور ان کی آہیں سنے اور اپنی جگہ سمٹا ہوا بیٹھا رہے، ظالم کا ہاتھ روکنے کی کوشش نہ کرے۔ اگر اس وحشت انگیز صورت حال کو ختم کرنے کے لئے داعی کے پاس کوئی چارہ کار نہیں ہے تو اس کی دعوت کا پروگرام ناقص ہے، ادھر اور ہے، ناقابل قبول ہے۔

اگر داعی کی دعوت کا تعلق کسی خاص گروہ سے ہے اور اسی گروہ کے نجات دہندہ کی حیثیت سے ظہور پذیر ہوا ہے تب بھی ممکن ہے کہ اس گروہ کے علاوہ باقی مخلوق سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہو، کوئی ظالم ہو یا مظلوم، لیکن اگر داعی سارے جہاں کا درد اپنے دل میں لے کر آیا ہے۔ اس کی خیر خواہی اور خیر اندیشی کا رشتہ پوری نوع انسان اور نوع انسان کے ہر طبقہ سے جڑا ہوا ہے، اس کا نصب العین یہ ہے کہ تمام دنیا جہاں کیلئے رحمت ہو، ہر ایک کے درد کا درمان اور ہر ایک کے دکھ کا علاج ہو، تو لامحالہ اس کا فرض ہو گا کہ وہ ظالم کی اس چیرہ دستی کو ختم کرے اور مظلوموں کی آہ و بکا اور گریہ و زاری کو قلب مضطر کے کانوں سے سنے وہ ان کی فریاد رسی کے لئے اٹھے اور اس عزم کے ساتھ اٹھے کہ

یا جاں رسد بجاناں یا جاں زتن بر آید

کہے گا: کیا میرے رسول نے تمہارے پاس پہنچ کر تبلیغ نہیں کی تھی، کیا یہ تمام باتیں تمہیں نہیں بتادی تھیں، کیا میں نے تجھ کو مال نہیں دیا تھا؟ کیا تیرے اوپر میں نے اپنا فضل نہیں کیا تھا، پس بتا تو خود اپنے لئے کیا لے کر آیا ہے۔ یہ شخص اپنے دائیں دیکھے گا، اپنے بائیں دیکھے گا، اسکی دولت کا کہیں نام و نشان نہ ہوگا، وہ آگے کی طرف نظر ڈالے گا وہاں دیکھتے ہوئے جہنم کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔ بس دیکھو دوزخ کی آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ، جو کچھ امکان میں ہو خرچ کرو اور اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ کچھ نہ ہو چھوڑو، ایک ریزہ ہو، وہی خرچ کرو، جس کے پاس یہ بھی نہ ہو وہ بیٹھے بول، اچھی بات سے غریبوں کی دلداری کرے، اس کا بھی اس کو ثواب ملے گا۔ نیکی کا ثواب دس گنے سے شروع ہوتا ہے اور سات سو گنے تک پہنچتا ہے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ“

(۲)

”بیشک تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ میں اس کی حمد کرتا ہوں اس سے مدد مانگتا ہوں، ہم اپنے نفسوں کی شرارت سے اور اپنے اعمال بد کے شر سے خدا کی پناہ لیتے ہیں۔ جس پر اللہ تعالیٰ ہدایت کے راستے کھول دے، پھر کوئی اس کو گمراہ نہیں کر سکتا، اور جس کو بھٹکا دے تو کوئی نہیں ہے جو اس کو سیدھی راہ پر لگا سکے۔

میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ تنہا ہے اور اسکا کوئی شریک نہیں، وہ اکیلا ہے اس کا کوئی ساجھی نہیں ہے۔ بیشک سب سے اچھا کلام کتاب اللہ ہے۔ یقیناً وہ شخص کامیاب ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ اپنے کلام کو سجادے اور جس کو اللہ تعالیٰ کفر سے ہٹا کر اسلام میں داخل کر دے۔ یقیناً وہ شخص کامیاب ہے جس نے انسانوں کے کلام اور ان کے قصوں کے مقابلے میں اللہ کے کلام کو منتخب کیا ہو، کیونکہ کلام اللہ ہی سب سے بہتر بات، سب سے بہتر کلام، اور سب سے بلند قصہ ہے۔

(دیکھو) اس سے محبت کرو، جو اللہ سے محبت کرتا ہے (دیکھو) خدا سے محبت کرو، دل کی گہرائی سے اپنے دلوں کو اسی میں لگا دو۔ اللہ کے کلام اور اس کے ذکر سے نہ اکتاؤ۔ تمہارے دلوں میں یہ سختی ہرگز نہ ہو کہ تم اس کی یاد سے غافل ہو جاؤ۔

(یاد رکھو اور سمجھ لو) اللہ تعالیٰ جو مخلوق پیدا کرتا ہے اس میں سے کچھ کو منتخب کر کے اپنے لئے مخصوص کر لیتا ہے۔ جو اعمال اس کو پسند ہیں۔ جن بندوں کو وہ پسند کرتا ہے جو بات اس کو پسند ہے، اس نے نام لیکر ان کو بتا دیا ہے اور معین کر دیا ہے

”ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ ظلم و فساد باقی نہ رہے اور دین کا سارا معاملہ اللہ ہی کے لئے ہو جائے (انسان کا ظلم اس میں مداخلت نہ کر سکے)۔“

خطابات و عمومی ارشادات

مکہ معظمہ سے تشریف لا کر چند روز قبا میں قیام رہا۔ پھر جمعہ کے روز قبا سے روانہ ہوئے تو قبیلہ بنی سالم بن عوف کے میدان^۱ میں جمعہ کی نماز^۲ پڑھی۔ پھر آپ مدینہ منورہ میں رونق افروز ہوئے۔ ان مقامات پر آپ نے جو تقریریں فرمائیں مورخین نے ان کو جمع کیا ہے۔ وہ تقریریں ابن اسحاق نے نقل^۳ کی ہیں۔ ان کا ترجمہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱)

”ایہا الناس! (اے لوگو) خوب سمجھ لو، کچھ پہلے سے بھیج دو، جو خود تمہارے کام آئے گا۔ خدا کی قسم یقیناً ایسا ہوگا کہ ہر شخص پر (قیامت کی) بے ہوشی طاری ہوگی (جس کے پاس جو کچھ ہے یہیں رہ جائے گا) بکریوں والا بکریاں چھوڑ جائے گا ان کا کوئی گلہ بان نہ ہوگا۔ وہ اپنے رب کے سامنے کھڑا ہوگا یقیناً ایسا ہوگا کہ اس کا پروردگار براہ راست اس سے خطاب فرمائے گا، نہ کوئی بیچ میں ترجمان ہوگا نہ کوئی رکاوٹ کی چیز درمیان میں حائل ہوگی (جو اس کے لئے آڑ بن سکے) اس کا پروردگار

^۱ آیت میں لفظ فتنہ ہے یعنی لڑتے رہو جب تک فتنہ نہ رہے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے اس کی تفسیر یہ فرمائی: کان الاسلام قلیلاً کان الرجل یفتن فی دینہ اما قتلہ واما یعد بہ حق کثراً لا سلام فہم تکن فتنہ۔ بخاری شریف ص ۶۴۸ یعنی مسلمان تھوڑے تھے، جو شخص مسلمان ہوتا وہ اپنے دین کے بارے میں مصیبت میں مبتلا ہو جاتا تھا یا اس کو قتل کر دیتے تھے یا عذاب میں مبتلا کر دیتے تھے یہاں تک کہ اسلام کی کثرت ہو گئی تو یہ فتنہ نہ رہا۔ یعنی مخالفین دین کا ظلم و فساد نہیں رہا۔

^۲ یعنی اعتقاد کی آزادی حاصل ہو جائے اور دین کا معاملہ جس کا تعلق صرف اللہ سے ہے خدا اور انسان کا باہمی معاملہ ہو جائے انسان کے ظلم و تشدد کی مداخلت باقی نہ رہے۔

^۳ اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ ملک جہاں اس طرح کا بیجا دباؤ اور ظلم و زیادتی ہو وہ اسلامی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے باجگزار ہو جائے یا وہ افراد جو اس طرح کے ظلم میں شریک اور اس کے معاون و مددگار ہیں اسلامی حکومت کے تحت میں آکر حقائق ٹیکس (جزیہ) ادا کرنے لگیں۔ حکومت ان کی جان و مال کی عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ دار ہو جائے، سورہ ۹ توبہ آیت ۲۸ میں اس کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔

^۴ اس میدان کا نام وادی رانواتا ہے۔ البدایہ والنہایہ ص ۳۱۲ ج ۳

^۵ اس موقع پر جو آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا حافظ ابن کثیر نے ابن جریر کے حوالہ سے اس کو نقل کیا ہے ملاحظہ ہو ص ۳۱۲ البدایہ والنہایہ جلد ۳ طویل خطبہ ہے اس کے کچھ حصے خطبات ماثورہ میں بھی دیئے گئے ہیں

^۶ سیرۃ ابن ہشام ص ۳۰۰ ص ۳۰۱ ج ۱

(تم بھی اسی کو پسند کرو) اس نے حلال اور حرام کو کھول کر بتا دیا ہے۔ بس اللہ کی عبادت کرو، کسی کو اس کا شریک نہ گردانو، پورا پورا تقویٰ کرو، تمہاری زبان سے جو باتیں نکلتی ہیں ان میں یہ خوبی پیدا کرو کہ ان سے اللہ تعالیٰ کی تصدیق ہو، وہ اس کی مرضی کے مطابق ہوں۔ اللہ کی بھیجی ہوئی روح (ذات اقدس محمد رسول اللہ ﷺ) تمہارے درمیان ہے اس سے پوری پوری محبت کرو، تمہاری فطرت اپنے رب سے ایک عہد کئے ہوئے ہے (کہ رب وہی ہے اس کے سوا کوئی رب نہیں ہے) اس عہد کو پورا کرو۔ اللہ تعالیٰ کا غضب اس پر نازل ہوتا ہے کہ اس عہد و پیمان کو توڑا جائے، جو فطرت انسان اپنے رب سے کئے ہوئے ہے۔“

مدینہ طیبہ میں سب سے پہلا خطبہ جمعہ

حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمہ اللہ نے ابن جریر کے حوالے سے وہ پورا خطبہ نقل کیا ہے جو آنحضرت ﷺ نے بنی سالم بن عمرو بن عوف میں نماز جمعہ کے وقت ارشاد فرمایا تھا۔ ہم اس خطبہ کو تبرکاً پورا نقل کرتے ہیں۔ اس کے بعد ترجمہ بھی کر دیا گیا ہے۔ ائمہ صاحبان جمعہ کے روز یہ خطبہ پڑھیں تو نور علی نور و سعادت بالاسعادت کا مصداق ہو:

خطبہ التقویٰ:

ترجمہ: ”میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں، اس سے مدد کی درخواست کرتا ہوں، گناہوں کی مغفرت چاہتا ہوں اور نیک ہدایت کی التجا کرتا ہوں۔ میں اس پر ایمان لاتا ہوں، میں اس ذات برحق کا منکر نہیں ہوں، میں اس کا دشمن ہوں جو اس ذات برحق کا انکار کرے۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ جو یکتا اور تنہا ہے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اس خدا کا کوئی شریک اور سا جھی نہیں ہے اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔^۱ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس رسول محمد کو ہدایت، دین حق، نور کامل اور پند و نصیحت اور حکمت و دانش کی نعمتیں سپرد کر کے ایسے وقت معبود فرمایا کہ صدیاں گزر گئی تھیں، سلسلہ رسالت منقطع ہو چکا تھا، علم مولیٰ ناپید اور مفقود تھا۔ مگر اہی کی گرم بازاری تھی، نور ہدایت پر اندھیری چھائی ہوئی تھی۔

^۱ اپنے رسول اور نبی ہونے پر یقین رکھنا نبی اور رسول کو بھی ضروری ہے۔ گورنر فرائض منصبی جب ہی ادا کر سکتا ہے جب اس کو اپنے گورنر ہونے کا یقین ہو اور خود بھی اپنے آپ کو گورنر مانتا ہو، اس کے بغیر اپنے فرائض کا احساس نہیں کر سکتا۔ یہ تکبر نہیں ہے بلکہ اعتراف ہے۔

(دوسری طرف حالت یہ ہے کہ) یہ دنیا جس کو زمانہ کہتے ہیں اس کا سلسلہ ازل سے چل رہا ہے اب ٹوٹنے کے قریب ہے۔ قیامت سر پر ہے اور اس عالم کی آخری میعاد ختم ہو رہی ہے (اب اللہ تعالیٰ کا کوئی اور پیغام آنے والا نہیں ہے) اب جس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت اور کامیابی حاصل کر لی اور جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت سے روگردانی کر رہا ہے وہ گمراہ ہے اپنا فرض ادا کرنے میں حد سے زیادہ کوتاہی کر رہا ہے اور صحیح راستہ سے بہت دور بھٹک رہا ہے۔

اے لوگو! میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرنے کی وصیت کرتا ہوں^۱ اور دیکھو سب سے بہتر نصیحت جو ایک مسلمان دوسرے کو کرے یہی ہے کہ اس کو آخرت پر آمادہ کرے (یعنی ایسے کاموں کا شوق دلانے جو مرنے کے بعد کار آمد ہوں) اور یہ کہ خدا ترسی کی ہدایت کرتا رہے اور تاکید کرتا رہے کہ پرہیزگاری اور پارسائی کی زندگی اختیار کریں۔

اے لوگو! ان باتوں سے پرہیز کرو جن سے بچنا اور پرہیز کرنا اتنا ضروری ہے کہ خدا اللہ تعالیٰ جل مجدہ نے ان سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ اس سے افضل کوئی نصیحت ہو سکتی ہے اور نہ کوئی تذکیر اور یاد دہانی اس سے زیادہ ضروری اور مفید ہو سکتی ہے۔

دیکھو اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرنا اور اس طرح تقویٰ کرنا کہ دل لرز رہا ہو اور خوف خدا ذہن و دماغ پر چھایا ہو اہو۔ یہ تقویٰ ایک عمل کرنے والے کے لئے بہت بڑا معاون اور بہت بڑا مددگار اور نہایت مخلص رفیق ہے۔

اور جو شخص ظاہر و باطن میں اپنا معاملہ اللہ سے درست کر لے جس سے مقصود محض رضا خداوندی ہو، کوئی دنیاوی غرض اور مصلحت پیش نظر نہ ہو، تو یہ ظاہر و باطن کی خالصانہ اصلاح دنیا میں اس کے لئے باعث یادگار، اور مابعد الموت کے لئے بہترین ذخیرہ ہے۔ جس وقت انسان ان اعمال کا سب سے زیادہ ضرورت مند ہو گا جو اس نے پہلے سے بھیجے ہوں۔

(دیکھو) (خدا ترسی اور ظاہر و باطن کی اصلاح کی کوشش کار آمد چیزیں یہی ہیں جو مرنے کے بعد انسان کی بہترین رفیق ہوں گی) ان کے علاوہ جو بھی ہے وہ انسان کے لئے یہاں تک بے کار ہے کہ قیامت کے روز انسان تمنا کرے گا کہ کاش اس عمل کے اور میرے درمیان مدت دراز کی مسافت ہوتی۔

^۱ یعنی درد مند اند نصیحت جس میں وہ اخلاص ہو جو ایک مرنے والے کے قول میں ہو سکتا ہے جب آخری منزل میں ہوتا ہے اور عقوبت کا نظارہ اس کے سامنے ہوتا ہے۔

(بات صاف ہے) اللہ تعالیٰ کی حکومت ہے وہ انسانوں پر حکومت کرتا ہے اور انسانوں کے حق میں اپنے فیصلے نافذ کرتا ہے۔ انسان اپنے پروردگار کے مالک نہیں ہیں، نہ انہیں خالق ارض و سما کی کسی بات پر کوئی قابو ہے۔ کبریائی اور عظمت صرف اللہ کے لئے ہے۔ ہم میں نہ کوئی طاقت ہے نہ قوت ہے جو کچھ قدرت و طاقت ہے وہ خدا کی مہربانی اور اس کی مدد سے ہے جو بلند وبالا اور بہت بڑی شان والا ہے۔

مقام فکر اور دلیل صداقت

ان تمام خطبوں پر ایک دفعہ اور نظر ڈالئے۔ موضوع خطاب کیا ہے، بار بار زور کس بات پر دیا جا رہا ہے۔

خدا کا خوف۔ اللہ سے ظاہر و باطن ہر طرح سے ڈرتے رہنا، ظاہر و باطن کی اصلاح، اللہ کو یاد رکھنا اور کثرت سے یاد کرنا۔

غور فرمائیے یہ خطبے کب دیئے جا رہے ہیں؟ یہ خطبے خاص اس وقت جب مخالفین تحریک اور دشمنان اسلام کی منصوبہ بند کوششوں سے جان بچا کر سانس لینے کا پہلا موقع ملا ہے جبکہ آپ کا سر قلم کرنے والوں یا گرفتار کرنے والوں کے لئے بڑے سے بڑے انعام کا اعلان فضا میں گونج رہا ہے۔

اول سے آخر تک خطبوں کے ایک ایک حرف پر نظر ڈال لیجئے۔ کیا کہیں کوئی ایک لفظ، کوئی اشارہ، کوئی کنایہ بھی ان دشمنوں کی طرف ہے؟
ان تیرہ سالہ زندگی کی بے پناہ اور مسلسل مصیبتوں کا جو خود اپنے عزیزوں اور اہل قبیلہ کی طرف سے ڈالی گئی تھیں کیا کوئی ذکر ہے؟

غور فرمائیے! وسعت ظرف، علو حوصلہ، بلندی ہمت، سوچئے! کیا ایسی ذات بابرکات کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ اس نے خدا کے نام پر جھوٹ بولا۔ (معاذ اللہ)

ناطقہ سر بگریاں ہے اسے کیا کیجیے

یاد رکھو! اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے اس کی بے انتہا مہربانی اور اس کے بے پایاں رحم و کرم ہی کا تقاضا ہے کہ وہ خود اپنی ذات کا تم کو خوف دلارہا ہے (کہ تم غافل، لاعلم، غافل، نفس پرست نہ بنو کہ اللہ کے عذاب کے مستحق ہو جاؤ کہ اللہ کا عذاب بہت سخت ہوتا ہے اس کی طاقت بھی بے پایاں ہے جس کو عذاب دینا چاہے تو کوئی نہیں جو اس کے عذاب کو روک سکے)

اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے کہ اس کا قول حق ہے، جو کچھ کہتا ہے سچ کہتا ہے جو وعدہ کرتا ہے پورا کرتا ہے اس میں خلاف نہیں ہوتا۔ اس کا ارشاد ہے کہ اس کی بات پلٹی نہیں جاتی اور وہ بندوں پر ظلم بھی نہیں کرتا۔ پھر وہی بات ہے۔ اللہ سے تقویٰ کرو، موجودہ وقت اور حالت میں بھی اور مستقبل میں بھی۔ پوشیدہ بھی اور اعلانیہ بھی۔ جو اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا کفارہ فرماتا اور اس کے اجر کو بڑھاتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرے وہ کامیاب پورا پورا کامیاب۔ بہت بڑی کامیابی کے ساتھ کامیاب۔

غرض یہ ہے کہ بہر صورت خوف خدا کو سامنے رکھو۔ خوف خدا اند اکسیر ہے جو عذاب خدا سے بچاتا ہے اس کی سزا اور اس کی ناراضی سے محفوظ رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرنا اور خوف خدا وہ تریاق ہے جو چہرہ کو روشن کر دیتا ہے، رب کو راضی کرتا ہے اور درجہ کو بلند کرتا ہے۔ پس جہاں تک ممکن ہو تقویٰ کا حصہ پورا پورا حاصل کرو اور دیکھو بارگاہ رب العزت کے حق میں کوتاہی مت کرو، اللہ تعالیٰ کے اس احسان عظیم کی قدر کرو کہ اس نے اپنی کتاب میں تمہیں کامل و مکمل تعلیم دی ہے۔ تمہارے لئے واضح طور پر راستہ مقرر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اس لئے کر دیا کہ جھوٹے اور سچے کھل کر سامنے آجائیں۔ پس جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان فرمایا ہے تم بھی احسان کرو۔ تمہارا احسان یہ ہے کہ خود اپنے افعال اور اعمال کو درست کرو، اللہ تعالیٰ کے دوستوں سے دوستی رکھو، اس کے دشمنوں کو اپنا دشمن جانو، وہی رب العزت ہے وہی مولا برحق ہے جس نے تمہیں اپنے دین کامل کے لئے منتخب فرمایا: تمہارا نام مسلم رکھا تا کہ جو برباد ہو تو اس حالت میں برباد ہو کہ کھلی حجت اس کے سامنے ہو، اس کو یہ عذر نہ رہے کہ اس کے سامنے بات واضح نہ ہو سکی اور جو زندہ رہے تو اس طرح زندہ کہ اپنے زندہ رہنے کی دلیل اور حجت اس کے پاس ہو ولا حول ولا قوۃ الا باللہ (اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر ہماری نہ کوئی فکری طاقت ہے نہ عملی قوت)۔

دیکھو مختصر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرتے رہو اور مابعد الموت کے لئے عمل کرتے رہو۔ (اور پوری طرح سمجھ لو) کہ جو بندہ اس رشتہ کو درست کر لیتا ہے جو اس کے اور اس کے پروردگار کے مابین ہے تو خود اللہ تعالیٰ ذمہ دار بن جاتا ہے کہ ان معاملات کو درست کر دے جو اس بندے اور دوسرے انسانوں کے درمیان ہیں۔

نئے میدان عمل میں پہلے کام

(۱) تعمیر مساجد و اقامت صلوٰۃ

(۱) لَتَسْجُدْ أُنَاسٌ عَلَى النَّفْثَى مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فِيهِ ۖ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَخَفَّضُوا ۖ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُتَضَعِّينَ (سورہ توبہ- ۱۰۸)

”البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد اول دن^۱ سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے، اس کی پوری پوری حقدار ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو (اور بندگان الہی تمہارے پیچھے نماز پڑھیں) اس میں ایسے لوگ (آتے) ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ پاک صاف رہیں اور اللہ تعالیٰ (بھی) پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“

(۲) إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللَّهَ فَعَسَىٰ أُولَٰئِكَ أَنْ يَكُونُوا مِنَ الْمُهْتَدِينَ (سورہ توبہ- ۱۸)

”فی الحقیقت مسجدوں کو آباد کرنے والا تو صرف وہ ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے، نماز قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے اور اللہ کے سوا اور کسی کا ڈرنہ مانے جو لوگ ایسے ہیں انہیں سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ہدایت یاب (سعادت اور کامیابی کی راہ پانے والے) ہوں گے۔“

(۳) وَاقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ (سورہ بقرہ- ۴۳)

”نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور سر نیاز خم کرو ان کے ساتھ جو اللہ کی بارگاہ میں سر جھکا رہے ہیں۔“

• اول یوم کے معنی یہی کئے گئے ہیں کہ اول یوم وجود وہ یوم بنا یعنی وجود میں آنے کے پہلے دن سے یا تعمیر کے پہلے دن سے لیکن یہاں یہ نکتہ بھی نظر انداز نہ ہونا چاہئے کہ یوم کے معنی دور کے بھی آتے ہیں۔ کئی قولہ تعالیٰ خلق الارض فی یومین (الفرجات فی غریب القرآن) یعنی ہجرت کے بعد جو دور شروع ہوا اس کے آغاز میں۔ اور یہی سبب ہے کہ اس اول یوم کو تاریخ یعنی سنہ ہجری کا پہلا دن مانا گیا۔ افاذہ السہیل ان الصحابة رضی اللہ عنہم اخذوا التاریخ من قولہ تعالیٰ لَتَسْجُدْ اُنَاسٌ عَلٰی النَّفْثَى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ (وفاء الوفاء ص ۷۷ ج ۱) یعنی صحابہ کرام نے لَتَسْجُدْ اُنَاسٌ عَلٰی النَّفْثَى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ سے ہی استدلال کرتے ہوئے سنہ ہجری کا آغاز اس دن سے کیا ہے۔

مسجد قبا:

قبا کا قیام عارضی تھا مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا کوئی لمحہ اس فرض کی انجام دہی میں صرف نہ ہوتا جس کے لئے وہ خدا کے رسول اور پیغمبر بنائے گئے تھے۔

اقامتہ دین^۱ جو انبیاء علیہم السلام کا نصب العین ہوتا ہے اس کا پہلا کام ہے اقامت الصلوٰۃ یعنی ایسا ماحول بنانا اور ایسی جماعت تیار کرنا جس کی آنکھوں کی ٹھنڈک نماز اور جس کے دل کا چین ذکر اللہ ہو۔ قبا پہنچ کر سب سے پہلے آپ نے اس فرض کو انجام دیا۔ اس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے جو نمبر اول میں تحریر کی گئی ہے۔

جماعت:

خدا پرستی یعنی خدا واحد کی عبادت آپ ﷺ کی فطرت تھی۔ شب معراج میں خاص نوعیت کی تعلیم دی گئی اور اگلے روز حضرت جبرئیل علیہ السلام نے نازل ہو کر پانچوں وقت کی نمازوں کی عملی تعلیم بھی دیدی۔ دو روز تک پانچوں وقت کی نمازیں پڑھا کر جس طرح حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ارکان اور اوقات نماز کی تعلیم دی: جماعت اور نماز باجماعت کا طریقہ بھی بتادیا، لیکن جب تک آنحضرت ﷺ مکہ معظمہ میں رہے تسلسل کے ساتھ نماز باجماعت کا موقع نہیں مل سکا۔ جہاں اسلام کا نام لینا ہی مشکل تھا وہاں جماعت کا سلسلہ کس طرح قائم ہو سکتا تھا۔ مدینہ کے حضرات اسلام سے مشرف ہوئے۔ ان کی تعلیم کے لئے خاص خاص حضرات کو بھیجا گیا۔ یہاں کچھ حلقے مسلمانوں کے قائم ہوئے تو نمازوں کی جماعتوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔

پھر ان حضرات نے اپنے ہی اجتہاد سے ہفتہ میں ایک روز عمومی جماعت کے لئے بھی مقرر کر لیا اور سرور کائنات رسول اللہ ﷺ ابھی مکہ معظمہ میں تھے کہ نماز جمع کی فرضیت بھی نازل ہو گئی۔ جس نے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجتہاد کی تصدیق کر دی۔ صحابہ کرام کا یہ اجتہاد وہ تھا جس پر آنحضرت ﷺ فخر کیا کرتے تھے کہ یہود اور نصاریٰ نے ہفتہ میں ایک دن عمومی اجتماع کے لئے مقرر کیا مگر وہ منشاء خداوندی کے مطابق نہیں تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اس دن کی توفیق بخشی جو منشاء خداوندی کے عین مطابق تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کوئی مسجد تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ اور تاریخ اسلام اب تک ہجری ایک مسجد کے جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مکہ معظمہ میں اپنے مکان کے سامنے میدان میں بنائی تھی^۲، کسی اور مسجد کی تعمیر سے نا آشنا تھی، کوئی

• یعنی دین کے منشاء اور مقصد کو صحیح طور سے سمجھنا اس کے تمام پہلوؤں کا خیال رکھنا اور پوری مستعدی سے اس کو جامہ عمل پہنانا۔

• بخاری شریف ص ۵۵۳

مکان کوئی میدان یا کسی میدان کا کوئی حصہ نماز کے لئے مقرر کر لیا جاتا تھا۔ وہاں لوگ نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ عموماً بکریوں کے باڑے^۱ میں کسی حصہ کو نماز کے لئے مخصوص کر لیا کرتے تھے۔ ورنہ جہاں وقت آتا نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔

قباء کا قیام عارضی تھا۔ اس میں اختلاف ہے کہ کتنے روز قیام رہا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ صرف تین روز قیام رہا، مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اس عارضی قیام میں آنحضرت ﷺ نے مسجد کی بنیاد ڈال دی^۲۔ کلثوم بن ہدم جو آنحضرت ﷺ کے میزبان تھے انہیں کا ایک میدان تھا جس میں کھجور سکھائے جاتے تھے۔ اسی میدان میں یہ مسجد تعمیر کی گئی۔ سب سے پہلے آپ نے پتھر رکھا۔ دوسرا پتھر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور تیسرا فارق اعظم رضی اللہ عنہ سے رکھوایا۔ پھر جملہ صحابہ نے حصہ لیا۔ خود ہی مزدور تھے اور خود ہی معمار، مزدوروں میں خود آقا دو جہاں بھی شامل رہے۔ بھاری بھاری پتھر اٹھاتے وقت جسم مبارک خم ہو جاتا۔ مٹی بدن اطہر پر پڑتی، کوئی صحابی آگے بڑھ کر پتھر لے لیتا تو آپ دوسرا اٹھا لیتے تھے۔^۳

مسجد کی تعمیر کے ساتھ آداب معاشرت اور اخلاق کی تعمیر بھی ہوئی حتیٰ کہ کلام اللہ شریف میں جب مسجد کا تذکرہ فرمایا تو ساتھ ساتھ اہل مسجد کی بھی تحسین فرمائی: **فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَكَبَّرُوا** (توبہ-۱۰۸) (اس میں وہ لوگ ہیں جو محبت کرتے ہیں۔ اس بات سے کہ پاک صاف رہیں) پھر ان کو شرف لازوال اور فخر دائم یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت کا پروانہ بھی عطا ہو گیا **وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَهَّرِينَ** (توبہ-۱۰۸) (اللہ تعالیٰ محبت فرماتے ہیں پاک صاف رہنے والوں سے)

مسجد مدینہ، مسجد النبی ﷺ:

قباء سے مدینہ تشریف آوری ہوئی تو جس جگہ ناقد بیٹھا تھا، وہی جگہ مسجد کے لئے منتخب کی گئی۔ یہ جگہ ایک میدان کے کنارہ پر تھی۔ قبیلہ بنی نجار کے حضرات یہاں نماز پڑھا کرتے تھے۔^۴ زمین کے مالک یہاں کھجوریں بھی سکھایا کرتے تھے۔ میدان کے باقی حصہ میں کھجور کے

^۱ یہ باڑے رہائشی مکانوں کے قریب ہوتے تھے اور عام لوگ انہیں باڑوں میں رہا بھی کرتے تھے۔

^۲ واسس المسجد الذی اس علی التوقی بخاری شریف ص ۵۵۵ وفاء الوفاء کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تکمیل بعد میں ہوئی۔ مدینہ میں قیام فرمانے کے بعد آپ صحابہ کرام کے ساتھ قباء تشریف لائے اور مسجد کی تعمیر کرائی۔ وفاء الوفاء ص ۷۹ ج ۱۔

^۳ وفاء الوفاء ص ۱۸۰ ج ۱

^۴ حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے یہاں ایک دیوار بیت المقدس کے رخ پر بنادی تھی۔ یہیں جمعہ کی نماز بھی پڑھایا کرتے تھے۔ سایہ کی کوئی چیز دیوار پر نہیں تھی۔ ابن سعد ص ۲ ج ۲ ہماری اصطلاح میں ایسی مسجد کو قناتی مسجد کہتے ہیں۔ عید گاہیں عموماً ایسی ہی ہوتی ہیں۔

درخت کھڑے تھے۔ کچھ پرانی قبریں اور کچھ مکانوں کے کھنڈر تھے۔ ایک طرف کچھ نشیب تھا وہاں پانی بھر جاتا تھا۔ اس خرابہ کی قسمت جاگی، سید الانبیاء ﷺ نے اسی کو مسجد کے لئے منتخب فرمایا۔ یہ طول و عرض میں سو سو گز سے کچھ زائد تھا۔^۱

سہل اور سہیل کے والد رافع بن ابی عمرو کا انتقال ہو چکا تھا۔ حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ ان کے مربی تھے۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ میدان ان ہی یتیموں کا تھا۔ انہوں نے چاہا کہ بلا کسی معاوضہ کے مسجد کے لئے پیش کر دیں، مگر آنحضرت ﷺ اس طرح کی پیشکش^۲ بڑے آدمیوں سے بھی منظور نہیں فرمایا کرتے تھے۔ یتیم بچوں سے کیسے منظور فرمالیتے۔ دس دینار قیمت تجویز کی گئی۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ قیمت ادا کر کے زمین مسجد کے لئے وقف کر دی۔^۳ زمین ہموار کی گئی، پانی ستیج دیا گیا، قبروں سے ہڈیاں نکلیں ان کو الگ دبا دیا گیا۔ درخت کنوائے گئے، بنیاد کھودی گئی، تعمیر شروع ہوئی، یہاں بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہ ہی مزدور تھے، وہ ہی معمار، سید الانبیاء ﷺ بھی برابر کے شریک تھے۔

عجیب و غریب پُر تقدس جذبہ سے کام ہو رہا تھا۔ پتھر اٹھائے جاتے تو یہ رجز پڑھا جاتا تھا:

هذا الحبال لاحبال خيبر هذا ابرر بننا واطهر

”خیبر (جو کھجوروں کی منڈی ہے) وہاں سے بھی بوجھ اٹھایا جاتا ہے اور لا دیا جاتا ہے۔ یہ بوجھ اس جیسا نہیں ہے (بلکہ) اے ہمارے رب تو جانتا ہے یہ اس سے بہت اچھا نیکی والا اور بہت پاکیزہ ہے۔ کبھی یہ رجز پڑھا جاتا اور سید الانبیاء ﷺ کی زبان مبارک بھی ساتھ ساتھ ترنم فرما ہوتی تھی۔“^۴

اللهم لا خيبر الا خيبر الاخرة فانصر الانصار والمهاجرة^۵

کبھی اس میں یہ ترنیم فرمالیتے:

^۱ ابن سعد ص ۲ ج ۲۔

^۲ یعنی آنحضرت ﷺ کوئی ضرورت ظاہر فرماتے اس پر بطور ہدیہ وہ چیز آپ کو پیش کی جاتی تو بطور ہدیہ اس کو منظور نہیں فرماتے تھے بلکہ قیمت ادا فرماتے تھے۔ جیسے مکہ معظمہ سے روانگی کے وقت حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک ناقہ پیش کیا تو آپ نے قیمتاً منظور فرمایا۔ البتہ بغیر آنحضرت ﷺ کی طلب کے کوئی ہدیہ پیش کیا جاتا تو اس کو منظور فرمالیتے تھے۔

^۳ ابن سعد ص ۲ ج ۲ غزوہ خیبر کے بعد جب مسجد بڑھائی گئی تو اس کے لئے جو زمین خریدی گئی تھی اس کی قیمت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ادا فرمائی۔ ترمذی شریف مناقب عثمان، ص ۲۰۹ ج ۲۔ مگر اب زمین کی قیمت بہت بڑھ گئی تھی اس نکلنے کی قیمت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دس ہزار اور ایک روایت ہے کہ مچھیس ہزار ادا کی ہے۔ وفاء الوفاء ص ۲۳۱ ج ۱۔

^۴ بخاری شریف ص ۵۵۵ و ابن سعد ص ۲ ج ۲

^۵ ”اے اللہ صرف آخرت کی بھلائی ہی بھلائی ہے، پس مدد فرما انصار کی اور مہاجرین کی“

اللهم ان الاجرا والآخرۃ فارحم الانصار والبہاجرۃ^۱

یہ مسجد اگرچہ دوسری ہے۔ مگر اس لحاظ سے اولیت اس کو ہی حاصل ہے کہ جو آبادی مستقل قیام کے لئے طے فرمائی گئی اس میں پہلی مسجد یہی ہے۔ اس بنا پر حسب ارشاد رحمۃ اللعالمین ﷺ مسجد اس علی التقویٰ من اول یوم کا اصل مصداق یہی ہے کیونکہ قباصرف نزول گاہ تھا اور جو مستقل قیام گاہ اور رقتہ الاسلام تھا وہ یہی مقام ہے جہاں ناقہ نبی ﷺ نے گردن پھیلا دی تھی اور جہاں تیج یمن^۲ نے سیکڑوں سال پہلے خاتم الانبیاء ﷺ کے لئے نزول گاہ تعمیر کر دیا تھا۔ بس مسجد النبی ﷺ کی اولیت قیام گاہ مستقل کی اولیت ہے^۳۔ اور مسجد قبا کی اولیت عارضی قیام گاہ کی اولیت۔ عارضی اور مستقل جو فرق ہونا چاہیئے وہ یہاں بھی کارفرما ہے۔

تعمیر:

اس وقت بیت المقدس کی جانب نماز پڑھی جاتی تھی۔ لہذا قبلہ اسی طرف یعنی شمال کی جانب رکھا گیا۔ اس طرف کی دیوار ستر ہاتھ لمبی بنائی گئی، دوسری جانب ساٹھ ہاتھ۔ بنیادیں پتھروں سے بھری گئیں۔ تین ہاتھ کی اونچائی تک دیواریں بھی اسی پتھر سے چنی گئیں۔ ان کے اوپر کچی اینٹوں کی تعمیر کی گئی۔ البتہ دروازوں کے بازو پتھروں کے رہے، ساٹھ ہاتھ (تیس گز) چوڑی چھت کے سہارے کے لئے بیچ میں کھبے (ستون) کھڑے کئے۔ تین تین کھبوں کی دو لائنیں ایک طرف (شرقی جانب میں) اور دو لائنیں غربی جانب میں۔ دونوں لائنوں

^۱ ”اے اللہ حقیقت یہ ہے کہ آخرت کا اجر ہی اجر ہے جو مقصود و مطلوب ہونا چاہئے، پس رحم فرما انصار اور مہاجرین پر“
^۲ تیج بن الاقرن یمن کا بادشاہ تھا۔ اس کی اولاد میں جو بادشاہ ہوئے ان کو تیج ہی کہا گیا۔ انہیں میں سے ایک تیج ایک فوجی ہم کے سلسلہ میں یثرب بھی پہنچا۔ وہ یہاں قتل عام کر کے اس آبادی کو ختم کرنا چاہتا تھا کہ اہل علم نے اس کو خبر دی کہ نبی آخر الزماں کا یہ دارالہجرہ ہوگا۔ وہ متاثر ہوا، برباد کرنے کے ارادہ کو ملتوی کیا اور یہاں ایک مکان تعمیر کر دیا کہ آنحضرت ﷺ جب تشریف لائیں تو یہاں قیام فرمائیں اور ایک تحریر بھی لکھ کر دے دی۔ جو سلا بعد نسل محفوظ رہی اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تک پہنچی۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس تیج کا نام اسعد تھا۔ کنیت ابو کرب، اس نے آنحضرت ﷺ کی شان میں دو شعر بھی کہے تھے۔

شهدت علی احمد انه رسول من اللہ ہاری النسم

فلو مد عبری الی عبرۃ لکننت و ذیلا لہ و ابین عم

ترجمہ: ”میں شہادت دیتا ہوں کہ احمد اس خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہو گئے جو جانوں کا پیدا کرنے والا ہے اگر میری عمر ان کے زمانہ تک دراز ہو گئی تو میں ان کا وزیر بھی ہو گا۔ (سلسلہ نسب کے لحاظ سے) ابن عم بھی“ (معارف ابن قتیبہ ص ۱۱۱ و فاء الوفاء ص ۱۳۴ ج ۱)

^۳ ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آغاز کے لحاظ سے اگرچہ مسجد قبا اولیٰ ہے کہ اس کی تعمیر پہلے شروع ہوئی لیکن تکمیل کے لحاظ سے مسجد مدینہ مقدم ہے۔ ملاحظہ ہو فاء الوفاء ص ۱۷۹ ج ۱

کے بیچ کا حصہ وسیع رکھا گیا، میدان میں سے جو کھجور کاٹے گئے تھے ان کے کھبے اگلی لائن میں لگائے گئے جو قبلہ کی جانب تھی۔ چھت میں نیچے بلایاں رکھ کر ان کے اوپر کھجور کے پٹھے (شاخیں جن پر پتے ہوتے ہیں) پتوں سمیت بچھا دیئے گئے۔ ان کے اوپر ہلکی ہلکی مٹی پھیلا دی گئی اور چھپر کی طرح ڈھلوان رکھی گئی، مگر پھر بھی بارش ہوتی تو ٹپکتی تھی۔ نیچے پختہ فرش نہیں تھا صرف ہموار زمین تھی۔ پانی ٹپکتا تو کچھ ہو جاتی تھی۔ اسی لئے کچھ دنوں بعد چھت پر مٹی زیادہ کر دی گئی اور فرش پر کنکریاں بچھا دی گئیں۔ چھت کی اونچائی سات ہاتھ (ساڑھے تین گز یعنی ساڑھے دس فٹ)

تین طرف دروازے رکھے گئے۔ قبلہ کی طرف کوئی دروازہ نہیں تھا۔ جنوب اور مشرق و مغرب کی جانب دروازے تھے۔^۱ کچھ دنوں بعد جب بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دیا گیا (جو مدینہ سے جنوب کی جانب ہے) تو اس طرف کی دیوار کا دروازہ بند کر دیا گیا اور جانب شمال کی دیوار جو پہلے دیوار قبلہ تھی اس طرف دروازہ کھول دیا گیا^۲ اور اسی دیوار^۳ سے متصل وہ سابان بنادیا گیا جو صفہ کہلاتا تھا، جو ان اصحاب کا مسکن تھا جن کے اہل و عیال نہیں ہوتے تھے اور تعلیم، روحانی تربیت، نیز رضا کارانہ خدمات کی غرض سے یہاں رہا کرتے تھے۔ معاش کے لئے دن کو لکڑیاں چن لیتے تھے۔ مگر رات کی تاریکی میں تلاوت قرآن اور نوافل کے قندیل روشن رکھتے تھے۔ ابتداء میں منبر نہیں تھا تو ایک ستون کی برابر میں مٹی کی چوکی (چوتری) بنادی گئی تھی۔ آقائی دو جہان ﷺ اسی پر رونق افروز ہو کر خطاب فرمایا کرتے تھے اور ستون پر سہارا لگا لیا کرتے تھے۔

حجرات امہات المؤمنین:

مسجد کی تعمیر سے فراغت ہوئی تو مسجد سے متصل ہی ازواج مطہرات کے لئے مکان بنوائے۔ اس وقت تک حضرت سودہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما نکاح میں آچکی تھیں، اس لئے دو ہی حجرے بنوائے۔ جب ازواج مطہرات آتی گئیں تو اور مکانات بنتے گئے۔ مسجد سے متصل حضرت حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کی جائیداد تھی۔ ہر ایک مکان کے لئے وہی

^۱ وفاء الوفاء ص ۲۴۲ ج ۱، اس عمارت کے لئے کوئی چندہ نہیں کیا گیا۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے پیش کرنا چاہا اور درخواست کی کہ باقاعدہ چھت ڈلوادی جائے۔ فرمایا نہیں۔ عریش کعریش موسیٰ خشیات و ثمام والشان اعلیٰ۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام کے چھپر کی طرح (یہ چھت ہوگی) کہ نیچے لکڑیاں (بلایاں) ان کے اوپر پھونس، (پھر فرمایا) انسان کا معاملہ تو اس سے بھی زیادہ عجالت لئے ہوئے (نازک ہے) (ابن سعد ص ۲ ج ۲ وفاء الوفاء ص ۲۴۲ ج ۱)

^۲ آنحضرت ﷺ نے ایک سال شب قدر کے متعلق فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ میں پانی اور کچھڑ میں سجدہ کر رہا ہوں۔ اس وقت بادل کا نام و نشان نہ تھا۔ مگر دفعہ رات کو بارش ہوئی تو واقعی صبح کو پانی اور کچھڑ میں سجدہ کرنا پڑا۔ آنحضرت ﷺ کی پیشانی مبارک پر بھی مٹی لگی ہوئی تھی۔ (بخاری شریف ص ۷۰ ج ۲ وفاء الوفاء ص ۲۴۲)

^۳ وفاء الوفاء ص ۲۶۲ ج ۱۔ ان حضرات کو مسجد ہی میں سونے کی اجازت تھی۔ ابن سعد ص ۱۳ ج ۲ بخاری ص ۲۳۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ستر اصحاب صفہ کو دیکھا کہ ان کے پاس چادر تک نہ تھی فقط تہہ بند تھا یا صرف کمر جس کو اپنی گردنوں میں باندھ لیتے تھے۔ کمر بھی اس قدر چھوٹا کہ کسی کی آدھی پنڈلیوں تک پہنچتا، کسی کے ٹخنوں تک۔ نماز میں ستر کھلنے کا خطرہ رہتا تو ہاتھ سے تھامے رکھتے تھے۔^①

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھانے کی چیز صدقہ میں آتی تو ان کو دیدیتے، خود تناول نہیں فرماتے تھے کیونکہ صدقہ آپ کے لئے حرام تھا۔ جو چیز بطور ہدیہ آتی تو ان کو بلا لیتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے۔^②

یہ حضرات فاقہ سے نہیں گھبراتے تھے کیونکہ خود اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے کہ کئی کئی وقت گزر جاتے اور فاقہ نہیں ٹوٹتا، بھوک سے کبھی اتنا ضعف ہو جاتا کہ نماز کی حالت میں گر پڑتے، لوگوں کو خیال ہوتا کہ دورہ پڑ گیا ہے حالانکہ دورہ فاقہ کا ہوتا تھا۔^③ کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو انصار پر تقسیم فرمادیتے کہ اپنے بساط کے موجب ہر شخص ایک ایک دودو کو لیجائے اور اپنے ساتھ ان کو کھانا کھلائے۔^④

مسجد مبارک کے دوستوں میں ایک رسی بندھی رہتی تھی۔ کھجوروں کے موسم میں حضرات انصار کھجوروں کے گچھے (خوشے) اپنے باغات سے لاکر لٹکا دیتے تھے، جو کھجور پک جاتا اس کو لکڑی سے جھاڑ کر کھالیا کرتے تھے۔^⑤ ان بہادر و جاں باز فقراء اور درویشان باوقار کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بشارت دیا کرتے تھے۔

لَو تَعْلَمُونَ مَا لَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ لَا حَبِيبَتُمْ أَنْ تَزِدُوا فَقْرًا وَحَاجَةً۔^⑥

”اگر تم جان جاؤ کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تمہارے لئے کیا تیار ہے تو تم آرزو کرو کہ ہمارا یہ فقر و فاقہ اور بڑھ جائے۔“

ان حضرات کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔

① بخاری شریف ص ۶۳، ج ۱، فتح الباری ص ۴۲۶ ج ۱

② ترمذی شریف باب فی معیشت اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ص ۵۹ ج ۲،

③ ترمذی شریف باب فی معیشت اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ص ۵۹ ج ۲،

④ یہ بھی صورت ہوئی کہ آپ فرمادیتے کہ جن کے یہاں دو کھانے والے ہوں وہ تیسرے کو لیجائے اور جس کے یہاں کھانے والے چار ہوں وہ دودو کو لیجائے اور ساتھ کھانا کھلائے۔ ایک روز آپ نے اسی طرح اصحاب صفہ کو تقسیم فرمادیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے یہاں چار کھانے والے تھے۔ خود حضرت ابو بکر، ان کے صاحبزادے اور اہلیہ اور ایک خادم مگر آپ اپنے ساتھ تین کو لے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سات اصحاب کو لے گئے (بخاری شریف ص ۸۳ و ۵۰۶ وغیرہ)

⑤ وقاء الوفاء ص ۲۲ ج ۱

⑥ ایضاً ص ۲۲ ج ۱ و ترمذی شریف باب فی معیشت اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ص ۵۹ ج ۲،

اپنی جائیداد کا کلچر اپنایا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ تمام جائیداد محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے نذر کر دی۔ مسجد کی طرح چار حجرے بھی کچی اینٹوں کے تھے اوپر کھجور کے پٹھوں اور پتوں کی چھت چھوٹے سے صحن کے گرد کھجور کی کچھپیوں (پٹھوں) کی دیواریں جن پر مٹی لیس دی گئی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کا ایک کواڑ تھا۔ باقی کے دروازوں پر ٹٹیاں تھیں۔ پانچ حجرے ایسے بنائے گئے کہ ان میں کچی اینٹیں بھی نہیں لگائی گئیں بلکہ ٹٹیاں کھڑی کر کے ان پر مٹی کھینس دی گئی اور اوپر کھجور کے پٹھوں اور پتوں کی ہلکی سی چھت ڈال دی گئی۔ ان کے دروازوں پر نہ ٹٹیاں تھیں نہ کواڑ، بلکہ ٹاٹ یا کمر کے پردے پڑے رہتے تھے جو طول میں تین ہاتھ اور عرض میں ایک ہاتھ سے کچھ زائد تھے۔ چھتیں ایسی نیچی کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا دور تھا، جب میں ذرا بڑا ہو گیا تھا میں ان حجروں میں جاتا تو کھڑے ہو کر ان حجروں کی چھتوں کو ہاتھ لگا لیا کرتا تھا۔ رات کو گھروں میں چراغ جلانے کا رواج نہیں تھا، لہذا ان حجروں میں رات کو صرف نور حق کی روشنی رہتی تھی۔

سنہ ۸ھ میں اموی خلیفہ ولید بن عبد الملک نے مسجد نبوی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کی توسیع کی تو ان مبارک حجروں کو مسجد میں شامل کر لیا۔

ابو امامہ حضرت سہیل بن حنیف فرمایا کرتے تھے۔ کاش ان حجروں کو اسی طرح چھوڑ دیا جاتا تاکہ لوگ دیکھتے کہ جس نبی کے دست مبارک پر تمام خزانوں کی کنجیاں رکھ دی گئی تھیں اس نے خود اپنے لئے کیا پسند کیا تھا۔^①

صفہ و اصحاب صفہ :

پہلے گزر چکا ہے کہ تبدیلی قبلہ کے بعد جب نماز جنوب کی جانب رخ کر کے پڑھی جانے لگی تو اس طرف کی دیوار میں جو دروازہ تھا وہ بند کر دیا گیا اور پہلی دیوار قبلہ (شالی دیوار) میں دروازہ کھول دیا گیا۔ اس سے متصل چبوترہ بنا دیا گیا اور اس پر سائبان ڈال دیا گیا۔ اسی کو صفہ کہا جاتا تھا۔^② نادار مسلمان جن کے اہل و عیال نہیں ہوتے تھے ان کا مسکن یہی ہوتا تھا۔ توکل ان کا سرمایہ ہوتا تھا۔ سوال کرنا ممنوع، تعلیم، روحانی تربیت اور رضا کارانہ خدمات ان کے فرائض اور مشاغل ہوتے تھے۔

① ابن سعد ص ۱۸۱ ج ۲ وقاء الوفاء ص ۳۲ ج ۱ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ اور دوسرے اکابر تابعین نے بھی اسی جذبہ کا اظہار فرمایا۔

② قال عیاض الصفہ بضم الصاد و تشدید الفاء قلعة فی موضع مسجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم یا ذی الیہا البساکین۔ (وقاء الوفاء ص ۳۲ ج ۱)

نماز جنازہ کی جگہ:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو جس کسی بیمار کی نزعی کیفیت ہوتی (مرنے کے قریب ہوتا) تو آنحضرت ﷺ کو اطلاع دی جاتی۔ آپ تشریف لاتے اس کے لئے دعا فرماتے۔ وہ شخص وفات پا جاتا تو اکثر ایسا ہوتا کہ تجہیز و تکفین آپ کے سامنے ہی ہوتی اور آپ دفن کے وقت تک وہاں رہتے تھے۔ اس میں آپ کو بہت دیر ہو جاتی تھی۔ اس کا ہمیں احساس ہوا تو ہم نے یہ کر لیا کہ وفات کے بعد آنحضرت ﷺ کو اطلاع دیتے۔ آپ تشریف لاتے، نماز جنازہ پڑھاتے پھر کبھی واپس تشریف لے جاتے اور کبھی دفن ہونے تک وہاں تشریف رکھتے۔ پھر ہمیں محسوس ہوا کہ آپ کو اس میں بھی زحمت ہوتی ہے تو یہ طے کر لیا کہ آنحضرت ﷺ کو تکلیف نہ دی جائے بلکہ جنازہ لے کر خود آپ کی خدمت میں پہنچ جایا کریں گے۔ چنانچہ اس پر عمل ہوا۔ جب جنازہ لیکر کاشانہ نبوت پر پہنچے تو قریب ہی ایک جگہ تھی وہاں آپ نماز پڑھاتے۔ پھر یہی معمول ہو گیا کہ اسی خاص جگہ پر نماز جنازہ پڑھائی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ اس جگہ کا نام ہی موضع الجنائز پڑ گیا۔^①

نماز باجماعت

عبادت، عربی لفظ ہے جس کا ترجمہ پوجا کیا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت ہے غایت التذلل یعنی انتہا درجہ عاجزی، بے چارگی، بے بسی، اسی کے اظہار کو عبودیت کہتے ہیں۔ اپنے مالک اور خالق کے سامنے اپنی بے بسی اور عاجزی کے اظہار کے لئے جماعت کی ضرورت نہیں بلکہ گوشہ خلوت کی ضرورت ہے۔ کیونکہ پرکھ اور پر خلوص وہ عاجزی ہوتی ہے جو تنہائی میں ہو، جہاں بندہ تصور معبود میں غرق ہو۔ معبود اور مالک کے سوا کسی کا وجود تو کیا کسی کا تصور بھی نہ ہو۔ اسلام نے اس کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:^②

① طبقات ابن سعد ص ۱۴ جلد اول قسم ثانی، آنحضرت ﷺ کا معمول یہی تھا کہ موضع الجنائز میں نماز پڑھایا کرتے تھے جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ نے باب الصلوٰۃ علی الجنائز بالمصلیٰ والمسجد میں پیش کی ہیں۔ ص ۷۷۱ مگر بعض مرتبہ کسی عارض کی وجہ سے مسجد میں بھی نماز پڑھ لی ہے۔ (فتح الباری ص ۱۵۵ ج ۳ باب مذکور) اسی وجہ سے امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کا مذہب یہ ہے کہ کسی خاص ضرورت کے بغیر مسجد میں نماز جنازہ مکروہ ہے۔ البتہ امام شافعی رحمہ اللہ جائز قرار دیتے ہیں (واللہ اعلم بالصواب)۔
② قرآن فیہ کے علاوہ نوافل میں سنت بھی ہے کہ اپنے مکان میں پڑھی جائیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سید العقلمین رحمہ اللہ سے دریافت کیا کہ افضل کیا ہے، مکان میں یا مسجد میں۔ ارشاد ہوا تم دیکھتے ہو میرا مکان مسجد سے کتنا قریب ہے۔ اس کے باوجود اپنے مکان میں نماز پڑھوں یہ مجھے زیادہ محبوب ہے بمقابلہ مسجد میں نماز پڑھنے کے۔ (الآیہ کہ فرض نماز ہو (ابن ماجہ) ارشاد ہوا مکان میں نماز پڑھنا تو رہے لہذا اپنے مکانات کو منور کرو (ابن خزیمہ)۔ ارشاد

أَدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً (سورہ الاعراف۔ ۵۵)

”پکارو اپنے رب کو عاجزی کرتے ہوئے، گڑگڑاتے ہوئے پوشیدہ طور پر“
دوسرے موقع پر ارشاد ہے:

وَأَذْكُرُكَ بِذَنبِكَ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً وَذَوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِينَ ﴿٢٠٥﴾ (سورہ الاعراف، آیت ۲۰۵)

”یاد کر اپنے رب کو دل ہی دل میں عاجزی اور نیاز مندی کے ساتھ ڈرتے ڈرتے اور زبان سے بھی آہستہ آہستہ بغیر پکارے صبح و شام اور ایسا نہ ہو کہ تم ان میں ہو جاؤ جو غافل رہتے ہیں۔“
لیکن جس طرح اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے عبادت کو مکمل کیا۔ مثلاً پہلی امتوں میں کسی امت کی نماز میں صرف سجدہ ہوتا تھا۔ رکوع نہیں ہوتا تھا۔ کسی امت کی نماز میں صرف رکوع اور کسی امت کی نماز میں صرف قیام ہوتا تھا۔ کھڑے کھڑے دعائیں پڑھا کرتے تھے، نہ سجدہ کرتے نہ رکوع۔ مگر محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ جس نماز کی تعلیم دی گئی اس میں قیام اور قعدہ بھی ہے اور سجدہ اور رکوع بھی۔ پھر جس طرح ظاہری ارکان کے لحاظ سے مکمل ہے۔ معنی کے لحاظ سے بھی مکمل ہے کہ سب سے پہلے اللہ اکبر کہا جاتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور عظمت کا اقرار۔ پھر اس کی حمد و ثناء^① اور اس کے ارشادات^② اور آیات الہیہ کی تذکیر، پھر جملہ نقائص سے اس کی پاکی اور عظمت^③، اس کی پروردگاری اور بلندی و برتری کا اعتراف اور اس بات کا اظہار کہ وہ حمد

ہو کچھ نمازیں (نفلیں) گھروں میں پڑھا کر اپنے مکانات کو قبریں نہ بناؤ (بخاری شریف وغیرہ)۔ ایک ارشاد یہ ہے کہ جہاں لوگ نماز پڑھتے ہوئے دیکھیں (مثلاً مسجد) ایسی جگہ نماز پڑھی جائے۔ اس کے مقابلہ میں گھر میں نماز پڑھنے کی وہی فضیلت ہے جو فرض نماز کی فضیلت نقل نماز پر ہے۔ ترغیب ترہیب (بحوالہ بیہقی)

① سورہ فاتحہ کا پڑھنا فرض یا واجب ہے جس کے شروع میں ہے۔ الحمد للہ رب العالمین، الرحمن الرحیم، مالک یوم الدین۔ اور اس سورت کی اہمیت یہ ہے کہ حدیث میں اس سورت کو نماز سے تعبیر کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف تقسیم کر دیا ہے اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو وہ ملتا ہے (تقسیم کی تفصیل یہ ہے) کہ بندہ کہتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ تُو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری ثناء کی، پھر بندہ کہتا ہے: مُلِکُ یَوْمِ الدِّیْنِ تُو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے میری عظمت بیان کی، پھر بندہ کہتا ہے: اِنَّکَ ذُو الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ تُو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے اور بندہ کی درخواست منظور ہے۔ پھر بندہ کہتا ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ، صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ وَلَا الضَّالِّیْنَ، تُو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ بندے نے اپنے لئے درخواست کی ہے اس کی درخواست منظور ہوگی۔ مسلم شریف ص ۷۰ ج ۱

② سورہ فاتحہ کے بعد قرآن پاک کا کچھ حصہ پڑھنا ضروری ہے۔ قرآن پاک میں احکام بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور توہید رسالت کے دلائل بھی۔ مشاہدات یا تاریخی واقعات کے ذریعہ پیش کئے گئے ہیں۔

③ سبحان ربی العظیم رکوع میں۔ سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ

④ رکوع سے کھڑے ہوتے ہوئے سبحان اللہ لمن حمدہ (وہ اس کی سنا ہے جو اس کی حمد کرتا ہے۔)

حاصل نہیں ہو سکتے۔

تعلیم و تبلیغ اور اصلاح کے نقطہ نظر سے فائدہ یہ ہے کہ دوسروں کو ترغیب ہوتی ہے، شہری زندگی میں خدا پرستی کا رواج ہوتا ہے اس کا شوق بڑھتا ہے۔ معاشی اور سماجی لحاظ سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مل جل کر کام کرنے کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ تعاون اور اشتراک عمل کی رسم پڑتی ہے اور جب ”ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں محمود وایاز“ تو اخوت اور مساوات بھی نظریہ کی حد سے آگے بڑھ کر میدان عمل میں جلوہ گر ہوتی ہے اور جب ایک صف میں کھڑے ہوں گے ① سے کندھا ملا کر سیدھے کھڑے ہوتے ہیں کہ نہ کوئی آگے نکلا ہو اور نہ کوئی پیچھے ہٹا ہو۔ ہر ایک کا ٹخنہ دوسرے کے ٹخنہ کی سیدھ میں ہو۔ اور یہ سب خواہ ان کی تعداد لاکھوں ہو، ایک ہی امام کی آواز پر کبھی ہاتھ کانوں تک اٹھائیں، کبھی ہاتھ باندھ لیں، کبھی سیدھے کھڑے ہوں کبھی ایک ساتھ جھک جائیں، کبھی زمین پر ماتھے رکھ دیں کبھی دوڑا نو بیٹھ جائیں، تو ایک عسکری تربیت اور فوجی نظم و ضبط کی شکل رونما ہوتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ مسجد مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کا مرکز بھی بنی۔ یہیں ان کو انصاف مہیا کرنے کے بندوبست ہونے لگے اور یہیں مسلمانوں کی ضرورتوں، ان کے دکھ درد میں شریک ہونے کے اقدامات ہونے لگے۔ غرض اس طرح کے بہت سے فائدے وجود پذیر اور ظہور فرماہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ جب مدینہ میں آزاد فضا میسر آئی اور یہ موقع ملا کہ اللہ کا نام کھلم کھلا لیا جائے تو آنحضرت ﷺ نے جماعت کو لازم قرار دیا ②۔ یہاں تک کہ حضرات صحابہ کا عام مذاق یہی بن گیا کہ جماعت کے بغیر وہ نماز کو جائز ہی نہیں سمجھتے تھے ③۔ بیمار آدمی بھی ساتھیوں کے سہارے مسجد میں آتا اور جماعت میں شریک ہوتا تھا اور سستی وہی کرتا تھا جس کے دل میں نفاق ہوتا تھا۔ پھر شہر یا آبادی ہی نہیں بلکہ جہاں بھی تین مسلمان ہوں ان کے لئے یہی حکم ہوا کہ اگر وہ جماعت سے نماز نہیں پڑھتے تو ان پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے۔ (کہ ان کے مذہبی معاملات درہم برہم ہو جاتے ہیں ان کا صحیح نظم قائم نہیں ہوتا۔)

① ارشاد خداوندی ہے: إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَرْصُوعٌ (سورہ صف-۳) اللہ تعالیٰ محبت فرماتا ہے ان سے جو راہ خدا میں اس طرح صف باندھ کر مقابلہ باطنی دشمن یعنی شیطان اور شیطانی جذبات سے ہوتا ہے۔

② حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں نے ارادہ کیا کہ میں لکڑیاں جمع کروں۔ پھر نماز پڑھنے کیلئے نماز کی اذان دیدی جائے تو کسی کو کہدوں کہ وہ نماز پڑھائے پھر میں ان کے یہاں جاؤں جو جماعت میں حاضر نہ ہوں اور ان کے گھروں کو آگ لگا دوں (بخاری شریف ص ۸۹) اندازہ فرمائیے رحمتہ اللعالمین ﷺ جو اہل ایمان کے حق میں ایسے رؤف رحیم ہیں کہ ہر وہ بات ان کو شاق ہوتی ہے جو مسلمانوں کے لئے پریشانی کا سبب بنے، ترک جماعت پر اتنے ناراض ہوں) کتنی ضروری ہوئی۔

③ قدروی عن غیر واحد من اصحاب النبی ﷺ انہم قالوا من سلم بقاء صلواتہ (ترمذی شریف ص ۳۰)

کرنے والوں کی حمد سنتا ہے۔ پھر بارگاہ رب ذوالجلال میں جملہ تعظیبات ① کی پیش کش۔ اس کے رسول پر درود و سلام۔ پھر اپنے لئے دعا۔

اس ظاہری اور معنوی تکمیل کے ساتھ ایک خصوصیت یہ ہے کہ انفرادی عمل کو اجتماعی عمل بنایا گیا اور جو کام الگ الگ کرنے کا تھا اس میں سب کی شرکت لازم کر دی گئی یعنی پانچ وقت کی نمازیں، جن کا پڑھنا ہر ایک عاقل بالغ مسلمان کے لئے ہر حالت میں ضروری ہے ②۔ جن کو فرض کہا جاتا ہے ان کے متعلق نہایت تاکید ③ سے حکم ہوا کہ سب مل کر ایک ساتھ پڑھیں۔ ایک پڑھانے والا ہو (امام) باقی سب اس کی پیروی کرنے والے (مقتدی)۔

اس جماعت کا ایک مرکز ہونا چاہئے ④ جس کو مسجد کہا جاتا ہے۔ پنج وقتہ نمازوں میں ایک مخصوص اور محدود حلقہ (مثلاً محلہ) کے خدا پرستوں کا اجتماع ہونا چاہئے۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ اس سے وسیع پیمانہ پر اور اسلامی تہوار یعنی عید، بقر عید کے موقع پر اس علاقہ کے تمام حلقوں کا مشترکہ اجتماع، آبادی سے باہر کسی وسیع مقام پر ہونا چاہئے۔

جماعت کے فوائد :

بیشک بندہ اور خدا کے درمیان جو تعلق اور رشتہ ہے اس کے تسلیم کرنے اور اس کے بروئے کار لانے کے لئے مظاہرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر یہ تو ضروری ہے کہ بندگان خدا میں یاد خدا کا جذبہ پیدا ہو، خدا پرستی کا رواج ہو، پرستش حق کی فضا بنے۔ اللہ تعالیٰ کا نام کھلم کھلا لیا جائے۔ اس کی عظمت و معبودیت کی شان دکھائی جائے تاکہ جو خدا کو بھولے ہوئے ہیں انہیں اللہ یاد آئے، جو اپنے رب سے ٹوٹے ہوئے ہیں وہ اپنا رشتہ رب سے جوڑیں۔ ظاہر ہے یہ مبارک مقاصد اجتماع ⑤ کے بغیر

① التحیات لله والصلوات والطیبات۔

② مسافر ہو یا مقیم، بیمار ہو یا تندرست۔

③ اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کے ارشادات آگے آئیں گے (انشاء اللہ) یہاں قرآن پاک کے اسلوب سے سبق لیجئے۔ قرآن پاک میں جہاں نماز کا حکم ہوا ہے عموماً جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ حُفَّتُوا عَنِ الْمَسْجِدِ وَالْمَسْجِدَ الْوُضُوْطِ وَفُتُوْا بِشُحْتَيْنِ (سورہ بقرہ-۲۳۸) اَتَيْنَاكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (سورہ اعراف-۲۸) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذْ كُنُوْا وَاٰسِرُوْا (سورہ حج-۷۷) وغیرہ، نیز صلوات (نماز پڑھو) کے بجائے جگہ جگہ اَقِمُوا الصَّلَاةَ ارشاد ہوا ہے۔ اقامۃ الصلوات یہی ہے کہ نماز کسی شان سے پڑھی جائے کہ دینداری اور خدا پرستی کی فضا بنے۔ کلمۃ اللہ سر بلند ہو شان حق نمایاں ہو۔

④ قرآن حکیم نے اس مرکز کو یہ اہمیت دی ہے کہ ستر پوچی کا حکم دیا تو نماز کو مسجد سے تعبیر کیا۔ ارشاد ہے: خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (سورہ اعراف-۳۱) ”لے لو اپنی آراستگی مسجد کے وقت (یعنی ہر نماز کے وقت)“ یعنی باقاعدہ نماز وہی ہے جو اس طرح ہو کہ آپ آراستہ ہو کر مسجد میں جائیں۔

⑤ امام ابوحنیفہؒ نے اس اجتماع میں ایک وحدت تسلیم کی کہ امام کو اصل قرار دیا اور مقتدیوں کو اس کا تابع۔ قرأت فاتحہ اور قرأت قرآن کا فریضہ امام اور کریگا۔ اس کی قرأت سب کی قرأت ہوگی: من کان له امام فقرأه الامام له (قرآۃ الحدیث)

عموماً بیچ مسلم^۱ (بدھنی) کی شکل میں یا سود پر بیٹنگی رقم لے لی جاتی تھی اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ پوری پیدوار اس مسلم یا سود کی نذر ہو جاتی تھی۔
ان قبیلوں کے کچھ لوگ ان حالات سے مستثنیٰ تھے مگر ان میں سے چند کے سوا باقی سب صاحب جائیداد، بڑے لوگ اپنے سابق مذہب پر قائم تھے۔
(۴)

اللہ کے گھر (مسجد مبارک) کی تعمیر شروع ہوئی تو رحمتہ اللعالمین ﷺ کے سامنے ان درمائدہ پر دیسی مہاجرین کی بود و باش کا مسئلہ بھی تھا کہ اگر ان کے رہنے کا ٹھکانا ہو جائے تو دارالہجرت میں وطن کی کچھ آسائش میسر آسکے اور پرانہ حالی ختم ہو۔
ممکن تھا ان کے لئے الگ محلہ آباد کر دیا جاتا۔ معاشرت کا جو فرق تھا کہ اہل مدینہ کا شکار اور زمیندار تھے اور مہاجرین تاجر پیشہ، شہری زندگی کے عادی، اس کا بھی تقاضا یہی ہونا چاہئے کہ ان کی آبادی الگ ہوتی۔ نئی آبادی کے لئے مالی مشکلات کا حل وہ باہمی تعاون تھا جس نے بلا کسی غیر معمولی خرچ کے مسجد مبارک اور ازواج مطہرات کے حجرات کی تعمیر کرا دی تھی۔ لیکن علیحدہ آبادی سے مہاجرین اور انصار میں شیر و شکر جیسی یگانگت نہیں پیدا ہو سکتی تھی اور باہمی انسیت و الفت کی وہ نعمت جو اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو عطا فرمائی تھی (جس کو کلام پاک میں خاص طور پر نمایاں فرمایا گیا تھا)^۲ وہ مشاہدہ بن کر سامنے نہیں آ سکتی تھی۔

جن کو مساوات، اشتراک عمل اور ایک دوسرے کے لئے ایثار و اخلاص کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرنا تھا۔ علیحدہ آبادی نہ ان کے لئے مناسب تھی نہ وہ خود یہ علیحدگی برداشت کر سکتے تھے جو اسلامی معاشرہ میں اونچ نیچ کی بنیاد بن جاتی۔
اس کے علاوہ تعلیم و تربیت کے لحاظ سے جس مساوی سطح کی ضرورت تھی علیحدہ آبادی اس کے لئے خلج بن جاتی۔

حضرات مہاجرین کم و بیش دس بارہ سال تک برکات نبوت سے فیضیاب ہو کر تربیت یافتہ عالم و فاضل بن چکے تھے۔ حضرات انصار کی مخلصانہ ذہانت اگرچہ ان کے لئے رہنما ہوتی تھی مگر اس ذہانت میں رحمتہ اللعالمین ﷺ ”رؤف رحیم“ کا رنگ بھرنے اور حضرات انصار کو مہاجرین کی سطح پر لانے کے لئے جس تواریح بالحق^۳ باہمی احتساب، افادہ اور استفادہ، تعلیم و تعلم کی ضرورت تھی

^۱ بخاری شریف ص ۲۹۸،

^۲ هُوَ الَّذِي آتَاكَ بَنُصْرَهُ وَبِأَنفُسِهِمْ كَوْنُفَقَّتْ مَارِي الْأَرْضِ جَبِينًا مَّا أَكْفَتْ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ
وَلَكِنَّ اللَّهَ أَلْفَ بَيْنَهُمْ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (الأنفال، آیت ۶۲، ۶۳)

^۳ ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے اور اس پر عمل کرنے کی نصیحت کرنا۔

مواخات

مہاجرین اور انصار (رضوان اللہ علیہ) میں بھائی چارہ

(۱)

پچاس کے قریب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ آچکے ہیں۔ باقی آرہے ہیں۔ آنے والوں میں وہ بھی ہیں جو مکہ میں صاحب حیثیت تھے۔ جائیدادوں اور کاروبار کے مالک تھے، مگر اب یہ سب قرآن پاک کے الفاظ میں ”الْفُقَرَاء“ ہیں^۱، کیونکہ نہ صرف جائیدادوں پر بلکہ ان کے مال و متاع اور سامان و اسباب پر بھی دوسروں کا قبضہ ہو چکا ہے۔
عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے رعب و داب اور دھاک کے آدمی چند ہی تھے جنہوں نے کھلم کھلا ہجرت کی۔ باقی سب وہ تھے جو چھپتے چھپاتے خالی ہاتھ بمشکل تمام مدینہ پہنچے تھے۔ ان کے بدن کے کپڑے بھی سالم نہیں تھے۔ (کسی قدر تفصیل گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہے)

(۲)

پوری دنیا میں صرف وہ مٹھی بھر جاں نثاران، پردیسی فقراء اور تہی دستوں کے مددگار تھے جنہوں نے بیعت عقبہ کے موقع پر ان کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی تھی، مگر یہ کتنے تھے؟ ان کے ذرائع کیا تھے؟ صرف تہتر یا پچھتر جب کہ ان میں دو عورتیں بھی تھیں۔^۲

(۳)

یثرب اول تو کاروباری قصبہ نہیں تھا اور جو کاروبار تھا اس پر یہودیوں کا قبضہ تھا۔ قبیلہ اوس اور خزرج کے لوگ جن سے حضرات انصار کا تعلق تھا وہ کاشتکار تھے۔ کسی کے پاس اپنی زمین تھی کوئی دوسروں کی زمین میں بٹائی پر کاشت کرتا تھا۔ جن کی زمینیں اپنی تھیں اقتصادی ڈھانچہ ان کا بھی بگڑا ہوا تھا۔ جس کے پاس جو کچھ پس انداز تھا وہ اوس اور خزرج کی آپس کی لڑائی میں ختم ہو چکا تھا جن کا سلسلہ تقریباً ایک سو بیس سال کے بعد تین چار سال پہلے ختم ہوا تھا۔

^۱ سورہ ۵۹، حشر، آیت ۸،

^۲ جو حضرات بیعت کے موقع پر حاضر نہیں ہو سکے اور مسلمان ہو چکے تھے ان کی تعداد بھی اس سے زیادہ نہ ہو گی۔

کے مزاج برادرانہ تھے۔ وہ حقیقی بھائیوں سے بھی زیادہ ایک دوسرے کے ہمدرد اور مددگار بن گئے اور مزاجوں کی موافقت کے ساتھ جب حضرات مہاجرین سے لیلہیت اور اعلیٰ اخلاق کا بھی ظہور ہوا تو حضرات انصار کے اخلاص نے عقیدت کی شان اختیار کر لی۔

ام العلاء رضی اللہ عنہا ایک انصاری خاتون تھیں جن کے گھرانے کے حصہ میں حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ آئے تھے۔ وہ اپنے مہمان کی اتنی معتقد ہو گئیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو ام العلاء رضی اللہ عنہا نے بڑے وثوق سے کہا: شہادت علیک لقد اکرمک اللہ یعنی میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے یقیناً آپ کو بخش دیا ہے۔^①

رشتہ اخوت اور حضرات انصار کا ایثار

وَالَّذِينَ عَقَدَتْ آيَاتُكُمْ فَاثْوَهُمْ فَصِيبُهُمْ (سورہ نساء- ۳۳)

”اور جن سے اقرار باندھنا تم نے ان کو پہناؤ ان کا حصہ (شاہ عبد القادر)

عرب میں عقد موالات کا اثر مرنے کے بعد یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مولیٰ (جس سے یہ معاملہ ہوتا تھا) وہ چھٹے حصے کا مستحق ہوا کرتا تھا۔ مندرجہ بالا آیت کے بموجب رشتہ اخوت کا اثر وفات کے بعد ظاہر ہونا چاہئے تھا کہ ایک دوسرے کا وارث ہوتا۔ مگر حضرات انصار نے بیعت عقبہ کے سلسلہ میں جب دعوت دی تھی تو امداد کا وعدہ بھی کیا تھا۔ آقا و دو جہاں رضی اللہ عنہ نے جب رشتہ اخوت قائم فرمایا تو حضرات انصار کی مخلصانہ اور ایثار شیعہ ذہانت نے اس کے معنی یہ سمجھے کہ امداد کا طریقہ برادرانہ ہونا چاہئے۔

امداد کرنے کے لئے املاک تقسیم نہیں کی جاتی مگر برادر زندگی میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔ لہذا حضرات انصار نے فیصلہ فرمایا کہ مہاجر بھائیوں کو اپنی زندگیوں میں برابر کا شریک بنالیں۔ چنانچہ دربار رسالت میں درخواست پیش کر دی:

اقسم بیننا وبنی اخواننا النخیل^②

”ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے درمیان باغات تقسیم فرما دیجئے۔“

① آنحضرت رضی اللہ عنہ نے اس طرح وثوق کر لینے اور قسم کھانے کو پسند نہیں فرمایا۔ کیونکہ کسی کو معلوم نہیں ہے کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہو گا۔ آپ نے تعلیم دی کہ یہ کہنا چاہئے کہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بخش دیا ہو گا۔ (بخاری شریف ص ۱۶۶) مگر حضرت ام العلاء رضی اللہ عنہا کا یہ وثوق اور یقین اس بناء پر تھا کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ غیر معمولی تقویٰ اور آپ کے اعلیٰ اخلاق نے ان کو گرویدہ اور معتقد بنا دیا تھا۔

② بخاری شریف ص ۳۱۲ و ص ۵۳۴

الگ آبادی کی صورت میں وہ پوری نہیں ہو سکتی تھی۔

(۵)

عرب میں عقد موالات کا طریقہ رائج تھا۔ غیر قبیلہ کا آدمی کسی بھی قبیلہ میں پہنچتا، اور ایک معاہدہ کر کے اس قبیلہ میں داخل ہو جاتا، اب اسی قبیلہ کی طرف منسوب ہوتا۔ معاہدات صلح و جنگ میں شریک رہتا اور مرنے کے بعد اس کا ترکہ بھی اسی قبیلہ میں تقسیم کیا جاتا۔ حضرات مہاجرین اور انصار میں یہ عقد ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ عقد موالات کچھ روایتیں رکھتا تھا۔ ان میں ایسی روایات^① بھی تھیں جن کو اسلام برداشت نہیں کر سکتا۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو بدبودار^② فرمایا۔ اور قرآن حکیم نے انکی مخالف اور متضاد بنیادوں^③ پر اسلامی تہذیب و اخلاق کی عمارت بلند کی۔ اب یہ پیغمبرانہ تدبیر تھا کہ عقد موالات کے بجائے آپ نے عقد مواخات کی بنیاد ڈالی۔

(۶)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے مکان میں حضرات مہاجرین و انصار (رضی اللہ عنہم) کا اجتماع ہوا۔ یہ کل نوے حضرات تھے۔ پینتالیس مہاجرین، پینتالیس انصار، آنحضرت ﷺ نے اپنی صوابدید کے موجب ان میں سے ایک ایک انصاری کو ایک ایک مہاجر کا نام بنام بھائی قرار دے دیا۔ یہ رحمتہ العالمین ﷺ کی پیغمبرانہ فراست اور مردم شناسی تھی کہ جن کو آپ نے بھائی بنایا فطری طور پر ان

① ہمارے زمانہ کا سیاسی گھوڑا اور پارٹی بندی اس کا نمونہ ہے کہ حق و انصاف کا نام لینا بھی جرم ہوتا ہے۔ جابجا، جائز و ناجائز پارٹی کی حمایت کی جاتی ہے اور اسی کو تدبیر اور دانش مندی سمجھا جاتا ہے۔

② دعوہ افانہا منتمہ بخاری شریف ص ۲۹۹

③ زمانہ جاہلیت میں اس تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی کہ حق پر کون ہے اور تقاضا انصاف کیا ہے۔ صرف یہ معاہدہ (عقد موالات) ہی دلیل ہوتا تھا یعنی چونکہ ہمارا حلیف میدان جنگ میں ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم بھی اس کی حمایت میں میدان جنگ میں ہوں۔ اسلام نے اس قسم کے معاہدہ ہی کو حرام قرار دیا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کا مشہور ارشاد ہے لا حلف فی الاسلام اور مسلمانوں کیلئے قرآن پاک کی خاص ہدایت یہ ہے یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ (النساء- ۱۳۵) ترجمہ: مسلمانو! ایسے ہو جاؤ کہ انصاف پر مضبوطی سے قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے یہ اللہ کے لئے گواہی (سچی گواہی) خواہ خود تمہارے خلاف ہو یا باپ اور قرابت والوں کے خلاف ہو۔ نیز ارشاد ہے: ”اگر کسی قوم سے کسی بنا پر ناراضگی بغض اور غصہ ہے تو ہرگز ہرگز ایسا نہ ہو کہ یہ بغض تمہیں ابھاردے۔ اس بات پر کہ اس کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ ہر حال میں انصاف کرو۔ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے“ (سورہ مائدہ کو ع ۲ آیت ۸) ”اور ایک گروہ نے اگر تمہیں خانہ کعبہ میں جانے سے روک دیا ہے جس سے تمہیں غم و غصہ ہے تو اس کا یہ اثر ہرگز نہ ہونا چاہئے کہ یہ غم و غصہ تمہیں اس بات پر ابھاردے کہ تم زیادتی کرنے لگو (تمہارا دستور تو یہ ہونا چاہئے کہ نیکی اور پرہیز گاری کے کام میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم کے کام میں مدد نہ کرو)“ (سورہ مائدہ آیت ۲)

حضرات انصار رضی اللہ عنہم کا تصور یہی تھا اگرچہ آنحضرت ﷺ نے اس کو منظور نہیں فرمایا۔
حضرات مہاجرین کی حیثیت کو عارضی قرار دیا۔ چنانچہ جب حضرات مہاجرین کو افتادہ زمینیں مل گئیں تو حضرات انصار کی جائیدادیں واپس کر دی گئیں۔

یہ ایثار کیوں تھا؟

قرآن شریف میں ہم بھی پڑھتے ہیں:

إِنَّمَا هِيَ الصِّفَةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ۚ وَإِنَّ الْآخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ۚ (سورہ المؤمن - ۳۹)

”یہ دنیا (موجودہ زندگی) صرف چند دن کا کام چلانا ہے اور برت لینا ہے۔ بیشک آخرت ہی ٹھیراؤ (مستقل قیام) کا مقام ہے۔“

وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِیَ الْحَيَوَانُ (سورہ العنکبوت - ۶۴)

”بیشک اصل زندگی عالم آخرت ہے“

وَمَا تَقْدِرُ مَوْلَا أَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ هُوَ غَفِيرٌ ۚ (سورہ مرمل - ۲۰)

”اور جو نیک عمل اپنے لئے آگے بھیج دو گے اس کو اللہ کے پاس پہنچ کر اس سے اچھا اور ثواب میں بڑا پاؤ گے۔“

ہمارا عقیدہ یہی ہے اور بلاشبہ ان آیتوں پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن ہمارے ایمان و عقیدہ کو یقین کا وہ درجہ حاصل نہیں ہے جو مشاہدہ کی شان رکھتا ہو۔ پھر مشاہدہ بھی غلطی کر جاتا ہے۔ ہماری آنکھیں آفتاب کو گردش کرتا ہوا دیکھتی ہیں۔ ہر صبح و شام کو طلوع و غروب ہمارا مشاہدہ ہے۔ لیکن سائنس کے ماہرین کہتے ہیں کہ یہ مشاہدہ غلط ہے۔ آفتاب گردش نہیں کرتا زمین گھومتی ہے۔ جب مشاہدہ بھی غلط ہو جاتا ہے تو یقین کا کوئی اور درجہ بھی ہو سکتا ہے جو مشاہدہ سے بالا ہو۔ جو سراسر یقین ہی یقین ہو۔ اس میں کسی طرح بھی شک و شبہ یا کسی قسم کے احتمال کی گنجائش نہ ہو۔ جس کو اصطلاحاً عین الیقین^۱ کہتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یقین کا یہی درجہ^۲

۱۔ یہ جو زندگی ہے دنیا کی سورت لینا ہے اور وہ گھر جو پچھلا ہے وہی ہے ٹھیراؤ کا گھر ”حضرت شاہ عبدالقادر“
۲۔ مشاہدہ آتش یقین پیدا کر دیتا ہے کہ یہ آگ ہے اور یہ جلانی ہے۔ لیکن جو یقین آتش سوزاں میں جھسم ہونے والے کو ہو سکتا ہے وہ صرف مشاہدہ کرنے والے یا ناپنے والے کو نہیں ہو سکتا۔ جلنے اور خاکستر ہونے والے کا یقین ہی ہے عین الیقین ہے۔

۳۔ یہی عین الیقین صحابہ کرام کی افضلیت کا سبب ہے کیونکہ امت میں یہ درجہ کسی کو بھی حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ امت میں کسی کو بھی یہ شرف حاصل نہیں ہے کہ صادق مصدق محمد ﷺ کی زبان مبارک سے بلاشفافہ کوئی ارشاد نہ ہو جس سے یقین کا آفتاب روشن ہوا ہو۔

منصوبہ یہ تھا کہ بھائیوں کا حصہ بھائیوں کے قبضہ میں دیدیا جائے۔ وہ اس کو اپنی ملک سمجھیں، اپنی صوابدید کے بموجب اس میں تصرف کریں اور فائدہ اٹھائیں لیکن رحمت عالم ﷺ کی شفقت نے یہ منظور نہیں فرمایا کہ حضرات انصار کی املاک سے ان کی ملکیت ختم ہو۔ دوسری طرف دشواری یہ تھی کہ خود حضرات انصار کا جو مقصد تھا وہ اس پیشکش سے پورا نہیں ہوتا تھا۔ حضرات انصار کا مقصد تو یہ تھا کہ مہاجرین کی مالی مشکلات ختم ہوں لیکن اس طرح تقسیم کے بعد حضرات مہاجرین ”صاحب زمین“ ضرور ہو جاتے مگر یہ حضرات تاجر پیشہ کاشتکاری اور زراعت سے ناواقف تھے۔ وہ ان افتادہ زمینوں سے پیداوار کر کے وہ امداد حاصل نہیں کر سکتے تھے جس کے لئے حضرات انصار نے یہ ایثار کیا تھا۔

رحمت عالم ﷺ نے حضرات انصار کو اس دشواری کی طرف توجہ دلائی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: امداد کی صورت یہ ہے کہ زمین و باغ کے بجائے پیداوار کا حصہ مہاجرین کو دو۔ باغات کی خدمت اور زمین میں کاشت کی ذمہ داری آپ صاحبان لیں اور پیداوار مہاجرین کو دیدیں۔^۱

حضرات مہاجرین نے بھی یہی فرمائش کی: کام کی ذمہ داری آپ لیں اور پیداوار میں ہمیں شریک کر لیں۔

حضرات انصار نے جیسے ہی یہ تجویز سنیں، دفعہ ان کے جذبات کی صدا بلند ہوئی: ”سَبِّغْنَا وَ أَطْعَمْنَا“ (ہم نے سن لیا ہے ہم پوری پوری تعمیل کریں گے۔ البقرہ - ۲۸۵) دنیا نے بہت سے انقلاب دیکھے مگر اس انقلاب کی کوئی مثال چشم عالم کے سامنے نہیں آئی کہ مالک خود اپنی مرضی سے کاشتکار اور اجنبی لوگ پردیس سے آئے ہوئے خود بخود حصہ دار بن گئے۔^۲

۱۔ البدایہ والنہایہ ص ۲۲۹ ج ۳ و ص ۲۲۸ ج ۳

۲۔ عام طور پر یہی صورت ہوئی اگرچہ بعض حضرات نے یہ بھی کہا کہ زمینیں اور باغ لے لیا اور خود کام کیا۔ حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کو جو درخت دیئے گئے تھے وہ ان پر مالکانہ تصرف کرتی رہیں اور اپنی ملک ہی سمجھتی رہیں۔ حتیٰ کہ جب ان سے واپس کرنے کو کہا گیا تو تیار نہ ہوئیں۔ آنحضرت ﷺ نے تقریباً دس گنی جائیداد دیکر ان کو واپس کرنے پر راضی کیا (ص ۷۹ و ۸۰ ج ۳ البدایہ والنہایہ بحوالہ مسند احمد) علامہ علی بن برہان الدین حلبی کی تحقیق یہ ہے کہ حضرات انصار کی پیش کش اگرچہ یکساں تھی کہ وہ اپنی نصف املاک دینا چاہتے تھے۔ مگر حضرات مہاجرین میں سے بعض نے تو اس کو اس صورت سے منظور کیا کہ حضرات انصار ہی کام کریں گے اور ان کی پیداوار مہاجرین حضرات کو دیتے رہیں گے اور بعض نے ان اراضی کو بطور بٹائی منظور کیا کہ وہ خود کام کریں گے اور نصف حصہ انصار کو دیتے رہیں گے۔ (سیرۃ حلبیہ ص ۲۹ ج ۲)۔ مگر اس دوسری صورت میں کوئی خاص ایثار نہیں ہے حالانکہ حضرات انصار کا ایثار اتنا تھا کہ مہاجرین حضرات کو یہ فکر ہو گیا کہ تمام اجر و ثواب یہ سیٹھ لینگے ہم تہی دامن رہ جائیں گے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

ایثار و اخلاص کی مثالیں

وَيُؤْتُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (سورہ حشر-۹)

”اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ ان پر فاقہ ہی ہو“

اس آیت میں حضرات انصار کی جو خصوصیت بیان فرمائی گئی اس کی مثال^۱ حضرت ابو طلحہ کا واقعہ ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ:

ایک فاقہ زدہ شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا کہ یا رسول اللہ میں سخت بھوکا ہوں^۲۔ آپ نے گھر والوں سے دریافت کر لیا کچھ کھانے کو ہے؟ ہر ایک گھر سے جواب آیا صرف پانی ہے۔ آپ نے حاضرین سے فرمایا: کوئی صاحب ان کو اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں حاضر ہوں۔ غرض وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ گھر میں جا کر بیوی سے کہا: رسول اللہ ﷺ کے مہمان کی عزت کرو (ادب و احترام سے مدارات کرو) اہلیہ محترمہ نے کہا: صرف بچوں کے سہارے کا کھانا موجود ہے۔ حضرت ابو طلحہ نے فرمایا: جو کچھ ہے۔ تیار کرو، چراغ^۳ روشن کر لو بچوں کو بہلا کر سلا دو۔ محترم خاتون نے ایسا ہی کیا۔ کھانا تیار کیا چراغ جلایا جب کھانے بیٹھے تو یہ خاتون انھیں بظاہر اس لئے کہ چراغ کی بتی بڑھادیں (تو تیز کردیں) مگر بڑھانے کے بجائے میاں بیوی کی آپس کی تجویز کے مطابق چراغ بجھا دیا۔ اندھیری میں کھانا شروع کیا۔ میاں بیوی صرف ہاتھ اور منہ چلاتے رہے گویا کھا رہے ہیں، کھایا کچھ نہیں۔ بھوکے پیٹ رات گزاری۔^۴

یہ تھا ایثار۔ اب اخلاص ملاحظہ فرمائیے کہ آنحضرت ﷺ نے ظاہر فرمادیا تھا کہ اقتدار میں حضرات انصار کا حصہ نہیں ہو گا۔ ان کے مقابلہ میں دوسروں کو بڑھایا جائے گا۔ مگر ان حضرات کو نہ اپنے اقتدار کی طلب تھی نہ اولاد کے لئے۔ وہ خود بھی عشق مولا میں گم تھے۔ اسی عشق کا متوالا اپنی اولاد کو دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کو اپنے آقا محمد ﷺ کی خوشنودی مطلوب تھی اور اس آقا کی

۱۔ ایک اور مثال بھی بیان کی گئی ہے کہ ایک صاحب کو بکری کی سری چسپ کی گئی۔ انہوں نے کہا فلاں صاحب اور ان کے بچے زیادہ ضرورت مند ہیں چنانچہ سری ان کے یہاں بھیجی گئی۔ انہوں نے ایک دوسرے صاحب کا نام لے کر اور ان کی ضروریات ظاہر کر کے ان کے یہاں بھجوا دی۔ اسی طرح سات آدمیوں میں گھوم کر پہلے شخص کے پاس آئی۔ ہر ایک دوسرے کو اپنے سے مقدم رکھتا تھا (ص ۹۵ ج ۷ فتح الباری بحوالہ ابن مردویہ)

۲۔ فتح الباری ص ۹۴ ج ۷

۳۔ گویا مہمان کے اعزاز میں۔ کیونکہ کسی ضرورت سے ہی چراغ جلایا جاتا تھا، ورنہ عام طور پر گھر میں چراغ جلانے کا دستور نہیں تھا۔ بخاری شریف ص ۵۶

۴۔ عام عادت تھی اس لئے دوبارہ چراغ جلانے کا اہتمام نہیں کیا گیا۔

بخاری شریف ص ۵۳۵ و ص ۵۳۶

حاصل تھا۔ اسی یقین کی بنا پر حضرات انصار اپنی جائیدادیں تقسیم کرنے پر خوش تھے کہ ہم نے آخرت کی حقیقی زندگی کے لئے بہت بڑا سرمایہ حاصل کر لیا اور جس کو راہ خدا میں اپنی ملک سے نکالا اس پر ابدی اور لازوال ملک کی مہر لگ گئی جو کبھی مٹنے والی نہیں ہے۔ دوسری طرف اسی یقین اور عین الیقین نے ان حضرات مہاجرین کے پاک دلوں میں اضطراب پیدا کر دیا جو مفت میں صاحب جائیداد اور زمیندار بن گئے تھے۔ اضطراب اس پر تھا کہ حضرات انصار کے اس ایثار کا ثمرہ یہ ہو گا کہ اجر و ثواب کا ہر ایک درجہ حضرات انصار ہی حاصل کر لیں گے۔ (فتح الباری ص ۹۵ ج ۷)

ہم اس درجہ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔

چنانچہ حضرات مہاجرین نے اپنے آقا کی خدمت میں (ﷺ) عرض کیا:

”یا رسول اللہ جن لوگوں میں ہم آکر اترے ہیں ہماری چشم بصیرت نے ان جیسے ہمدرد و غمگسار نہیں دیکھے۔ تنگی ہو یا فراخی ان کی ہمدردی میں فرق نہیں آتا۔ اپنی جائیدادیں ہمیں دیں پھر کام کی ذمہ داری بھی خود لے لی۔ محنت وہ خود کریں گے اور نفع میں ہمارا حصہ لگائیں گے پس سارا اجر و ثواب وہی سمیٹ لیں گے۔“

آنحضرت ﷺ نے حضرات مہاجرین کو اطمینان دلایا کہ:

”اگر تم ان کا احسان^۱ مانو اور ان کے لئے دل سے دعا کرتے رہو تو تمہارا ثواب بھی کم نہ ہو گا۔“

حضرات انصار کے اسی یقین کا یہ اثر تھا کہ جو ایثار کر چکے تھے اس پر وہ قانع نہیں تھے۔ چنانچہ جائیداد کے اس بٹوارہ کے بعد بھی ان کا دست کرم کو تہ نہیں ہوا وہ ان کی طرف بھی بڑھتا رہا۔ جنہیں جائیداد نہیں ملی تھی جو گرجہ ہستی اور صاحب اہل و عیال نہیں تھے، یہ اصحاب صفہ تھے ان کی خدمت بھی وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔

۱۔ ہمارے ایک بزرگ تحریر فرماتے ہیں: دعا کا احسان درہم و دینار کے احسان سے کم نہیں ہے۔ پھر فرماتے ہیں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے یہاں جب کوئی سائل آتا اور دعائیں دیتا جیسا کہ سائلوں کا طریقہ ہے تو ام المومنین بھی اس فقیر کو دعائیں دیتیں اور بعد میں خیرات دیتیں۔ کسی نے کہا: اے ام المومنین آپ سائل کو صدقہ بھی دیتی ہو اور جس طرح وہ آپ کو دعا دیتا ہے آپ بھی دعا دیتی ہیں۔ فرمایا: میں اگر اس کو دعائے دوں اور فقط صدقہ دوں تو اس کا احسان مجھ پر زیادہ رہے گا کیونکہ دعا، صدقہ سے کہیں بہتر ہے۔ اس لئے دعا کی مکافات دعا سے کر دیتی ہوں تاکہ میرا صدقہ خالص رہے دعا کے مقابلہ میں نہ ہو۔ کذا فی المغنی شرح المصابیح۔ لہذا جو شخص دراہم معدودہ دیکر خالصانہ دعاؤں کا سودا کر سکتا ہے وہ بھی نہ چو کہ اور اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دے دعا ضرور حاصل کرے۔

جمادے چند دادم جاں خریدم بجز اللہ زہے ارزان خریدم

سیرۃ الصلوی از حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی ص ۳۳۱ ج ۱

۲۔ البدایہ و النہایہ ص ۲۲۸ ج ۱

اللہ ﷺ کا حق قرار دیا۔^①

رسول خدا رحمۃ اللعالمین ﷺ کے سامنے سب سے پہلے حضرات صحابہ کی مشکلات تھیں۔ آپ نے حضرات انصار کو جمع فرما کر استصواب فرمایا کہ اس علاقہ کی اراضی انصار اور مہاجرین دونوں کو دی جائیں یا صرف حضرات مہاجرین کو دی جائیں تاکہ وہ حضرات انصار کی جائیدادیں واپس کر دیں اور ان کے مکانات خالی کر دیں؟

ارشاد گرامی کا جواب دینے کے لئے قبیلہ اوس اور خزرج کے دونوں سردار سعد بن عبادہ (خزرج)، سعد بن معاذ (اوس) کھڑے ہوئے۔ عرض کیا یا رسول اللہ جو کچھ آپ تقسیم فرمائیں حضرات مہاجرین کو تقسیم فرمادیں۔ ہمیں نہ اپنے مکانات کی ضرورت ہے نہ جائیدادوں کی۔ بلکہ ہم بہت خوش ہونگے اگر ہماری جائیدادوں اور ملکیتوں میں سے کچھ اور مہاجرین کو عنایت فرمادیں، جو راہ خدا میں وطن سے بے وطن ہوئے، گھروں سے اجڑے، جائیدادوں سے محروم ہوئے۔ آنحضرت ﷺ نے یہ حوصلہ مندانہ جواب سنا تو مطمئن ہوئے اور دعا دی:

اللهم ارحم الانصار وابناء الانصار

(اے اللہ رحم فرما انصار پر اور انصار کی اولاد پر)

اور بعض دوسری روایتوں میں تیسرے لفظ ابناء ابناء الانصار بھی ہے۔

اب آپ نے اس علاقہ کا ایک حصہ حضرات مہاجرین کو عنایت فرمایا۔ حضرات انصار میں سے دو صاحب بہت ضرورت مند تھے۔ حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ ان کو کچھ جائیداد عطا فرمائی، باقی علاقہ اپنے پاس رکھا جس میں آنحضرت ﷺ کی طرف سے کاشت ہوتی تھی^② اور اسکی آمدنی میں سے ازواج مطہرات کا نفقہ ادا فرماتے تھے۔ باقی تمام آمدنی مسلمانوں کی جماعتی^③ اور انفرادی خصوصاً جہاد کی ضرورتوں میں صرف کر دیتے تھے۔

① اس وقت تک مملکت کی ضرورتیں بھی غیر معمولی تھیں کہ ایک مملکت کی بنیاد رکھی جا رہی تھی اور حضرات مہاجرین و انصار میں اگرچہ ایسے صاحب استطاعت بھی تھے جو ضروریات زندگی فراہم کر سکتے تھے مگر کچھ ایسے تھے دست بھی تھے کہ فاقہ کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں تھا تو اگر یہ جائیداد مجاہدین پر مساویانہ تقسیم کر دی جاتی تو نہ مملکت کی بنیادی ضرورتیں پوری ہو سکتی تھیں نہ فاقہ زدہ انصار و مہاجرین کو قابل اعتماد امداد مل سکتی تھی۔ اب قرآن پاک کے الفاظ میں ان جائیدادوں پر آنحضرت ﷺ کا تسلط تسلیم کر لیا گیا۔ وَلَئِنْ اللَّهُ يُنْزِلْ مِنْ شَيْءٍ فَتُفْسِدُوا (حشر آیت ۶) یعنی تمام جائیداد پر آپ کا اختیار تیزی تسلیم کیا گیا تو آپ نے مساویانہ تقسیم کے بجائے ایسا بندوبست فرمایا کہ افراد کی ضرورتیں بھی پوری ہوئیں اور جماعت کی اقتصادی اور جنگی ضرورتوں کو بھی مدد مل سکی۔ واللہ اعلم

② السيرة الطولية ص ۲۹ ج ۲

③ فیجعله فجعل مال اللہ۔ بخاری شریف ص ۵۵۷ و ۸۰۷ وغیرہ فی السلام والکرام عند فی سبیل اللہ (ص ۷۲۷ بخاری شریف و قطلانی)

خوشنودی کے ذریعہ تمام آقاؤں کے آقا حضرت حق جل مجدہ کی رضا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کو اس پر ناز تھا کہ جہاں یہ پیشین گوئی کی جاتی تھی:

انکم ستلقون بعدی اثرۃ ”تم میرے بعد دیکھو گے کہ دوسروں کو تم پر ترجیح دیجائیگی۔“

ان کو بڑھایا جائے گا تم کو نظر انداز کیا جائے گا۔

وہاں بشارت بھی ساتھ ساتھ دی جاتی تھی۔

فاصلہ و احقی تلقون و موعدا کم الحوض^①

”صبر کرنا یہاں تک کہ تمہاری میری ملاقات ہو اور ملاقات کا مقام حوض کوثر ہوگا، اسی کا وعدہ ہے۔“

اور جب ان حضرات کے ایثار و اخلاص کا یہ عالم ہے تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ جس کی ایک نظر نے پوری جماعت میں یہ اخلاص و ایثار پیدا کیا وہ خود اخلاص و ایثار سے تہی دامن ہو (معاذ اللہ) اور کیا محمد رسول اللہ کے ایثار، اخلاص اور آپ کی صداقت و حقانیت کی یہ کھلی ہوئی دلیل نہیں ہے۔ ﷺ صلوات اللہ علیہ وعلیٰ اصحابہ الکرام واتباعہ اجمعین۔ امین

اخلاص و للہیت کی انتہا

جو آپ کے کام آئے وہ بہتر ہے اُس سے جو ہمارے پاس رہے

وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ مِّنْ الْأُولَى (الاعلیٰ۔ ۱۷)

يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا۔ (سورہ حشر۔ ۹)

”محبت کرتے ہیں ان سے جو وطن چھوڑ کر آئے ان کے پاس اور نہیں پاتے اپنے دلوں میں کوئی رشک اس سے جو دیا جائے مہاجرین کو۔“

سنہ ۴ھ میں قبیلہ نبی نصیر کے یہودیوں نے آنحضرت ﷺ کو شہید کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ان کے شر سے محفوظ رکھا۔ مگر ظاہر ہے ان کے اس منصوبے سے وہ معاہدہ ختم ہو گیا جو بقاء باہم کے متعلق سنہ ۱ ہجری میں ہوا تھا۔ (تفصیل آگے آئے گی) لامحالہ ان کو وہ سزا دی گئی جو ازروئے معاہدہ لازم تھی یعنی ان کو اس علاقہ سے خارج کر دیا گیا، انکی جائیدادیں اسلامی محروسہ میں داخل ہوئیں۔ چونکہ یہ علاقہ جنگ کے بغیر قبضہ میں آیا تھا تو اس کو مجاہدین پر تقسیم نہیں کیا گیا بلکہ وحی الہی^② نے اس کو خاص رسول

① بخاری شریف ص ۵۳۵

② سورہ ۱۵۹ کشر آیت ۶

بہر حال حضرات انصار نے نہ صرف یہ کہ اس زمین میں حصہ لینے سے معذرت کر دی بلکہ اپنی باقی جائیدادوں کے متعلق بھی پیش کش کر دی۔ یہ ہے عملی مثال اس بلندی حوصلہ اور وسعت قلب کی جس کو زیب عنوان آیت میں سراہا گیا ہے۔

چند سال بعد بحرین کا علاقہ محروسہ اسلامیہ میں داخل ہوا تو آنحضرت ﷺ نے چاہا کہ حضرات انصار کو کچھ زمینیں عطا فرمادیں۔ مگر حضرات انصار نے ان کے لینے سے صرف انکار ہی نہیں بلکہ بضد ہو گئے کہ جتنی زمینیں ہمیں عطا فرمائی ہیں اتنی ہی حضرات مہاجرین کو بھی عنایت فرمادیں۔ اتنی گنجائش نہیں تھی۔ ارشاد ہوا:

امالافاصدواحق تعلقونی انہ سیصیکم اثرہ (بخاری شریف ص ۵۳۵)

اگر آپ صاحبان منظور نہیں کرتے تو صبر سے کام لو یہاں تک کہ تم (حوض کوثر پر) مجھ سے ملو گے (یعنی اس ایثار کے جواب میں ایثار نہیں ہوگا) بلکہ تمہیں ترجیحات سے واسطہ پڑے گا کہ دوسروں کو تم پر مقدم رکھا جائے گا۔ تمہارے حقوق کا لحاظ نہیں رکھا جائے گا۔

اسماء گرامی برادران مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم

رجسٹروں کو اس وقت توفیق نہیں ہوئی تھی کہ حضرات صحابہ کے اسماء گرامی اپنے صفحات میں محفوظ کریں اور بھائی بننے والوں کو لکھاؤ کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ تاہم راوی حضرات کے سینوں نے جو نام محفوظ رکھے عیون الاثر فی الباری و سیرۃ ابن ہشام کے حوالہ سے یہاں درج کئے جاتے ہیں:

حضرات مہاجرین	حضرات انصار	حضرات مہاجرین	حضرات انصار
ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ	خارجہ بن زید رضی اللہ عنہ	حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ	عومیم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ
عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ	عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ	ابو مرثد رضی اللہ عنہ	عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ
ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ	سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ	عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ	عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ
عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ	سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ	عتبہ بن غزوہ رضی اللہ عنہ	ابودجانہ رضی اللہ عنہ
زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ	سلامہ بن سلامہ و قش رضی اللہ عنہ	ابو سلمہ بن عبدالاسد رضی اللہ عنہ	سعد بن خثیمہ رضی اللہ عنہ
عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ	اوس بن ثابت رضی اللہ عنہ	عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ	ابو لہبیم بن تیہان رضی اللہ عنہ
طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ	کعب بن مالک رضی اللہ عنہ	عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ	عمیر بن الحمام رضی اللہ عنہ

سعید بن زید رضی اللہ عنہ	ابی بن کعب رضی اللہ عنہ	طفیل بن الحارث رضی اللہ عنہ	سفیان نسر خزرجی رضی اللہ عنہ
مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ	ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ	صفوان بن بیضاء رضی اللہ عنہ	رافع بن معلى رضی اللہ عنہ
ابو حذیفہ بن عتبہ رضی اللہ عنہ	عبادہ بن یشر رضی اللہ عنہ	مقداد رضی اللہ عنہ	عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ
عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ	حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ	ذوالشمالین رضی اللہ عنہ	یزید بن الحارث رضی اللہ عنہ
ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ	منذر بن عمرو رضی اللہ عنہ	ارقم رضی اللہ عنہ	طلحہ بن زید رضی اللہ عنہ
سلمان الفارسی رضی اللہ عنہ	ابو الدرداء عویم بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ	زید بن الخطاب رضی اللہ عنہ	معن بن عدی رضی اللہ عنہ
بلال رضی اللہ عنہ	ابو یحییٰ عبد اللہ بن عبد الرحمن رضی اللہ عنہ	عمرو بن سراقہ رضی اللہ عنہ	سعد بن زید رضی اللہ عنہ
عاقل بن بکیر رضی اللہ عنہ	مبشر بن عبد المنذر رضی اللہ عنہ	عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ	مجذربن و ماء رضی اللہ عنہ
خنسب بن حذافہ رضی اللہ عنہ	منذر بن محمد رضی اللہ عنہ	عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ	حارث بن صمہ رضی اللہ عنہ
سرہ بن ابی رهم رضی اللہ عنہ	عبادہ بن الشحاش رضی اللہ عنہ	صح موی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ	سراقہ بن عمرو بن عطیہ رضی اللہ عنہ

مواخات قبل ہجرت

تعاون و تناصر اور افادہ و استفادہ کی ضرورت جیسی مدینہ طیبہ میں تھی ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ میں بھی تھی، کیونکہ اس سے بے سہاروں کو سہارا مل جاتا تھا اور بے پناہوں کو پناہ۔ چنانچہ بقول علامہ حافظ ابن عبد البر: مکہ میں بھی رشتہ اخوت مواخات کے ذریعہ مضبوط کیا گیا تھا۔ یہ برادران مہاجرین ۱۸ تھے۔ ان کے مبارک اسماء گرامی سے اس صفحہ کو آراستہ کیا جا رہا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ

۱۔ سیدنا مولانا محمد رسول اللہ ﷺ

عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ

۲۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ

عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ

۳۔ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

۴۔ حمزہ رضی اللہ عنہ

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

۵۔ زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ

بلال بن رباح رضی اللہ عنہ

۶۔ عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

۷۔ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ

سالم موی ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ

۸۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ

طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ

۹۔ سعید بن زید رضی اللہ عنہ

(ماخوذ از عیون الاثر ص ۱۹۹ ج ۱، حافظ ابن سید الناس)

آپ کو فراموش نہ ہونا چاہئے کہ حضرات صحابہ نے اس دور کو تعمیر ملت کا دور اول قرار دیا تھا۔ چنانچہ اسی سال کو اسلامی سنہ (سنہ ہجری کا پہلا سال) مانا گیا۔ کلام الہی نے بھی من اول یوم^۱ کا لفظ استعمال کر کے صحابہ کرام کے اس تخیل کی تائید فرمائی۔

آج ہر طرف پس ماندہ قوموں کو ترقی دینے کا شور ہے۔ لیکن جب ان کی ہمدردی کے دعویدار سیاسی رہنما مساوات اور سوشلزم کا نام لے کر کہتے ہیں ”معیار زندگی بلند کرو“ تو مسجد مبارک اور تعمیر حجرات کا سادہ نقشہ خاموشی سے اشارہ کرتا ہے کہ قوم کی تعمیر ایسے نعرے سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس طرح کے عمل سے ہوتی ہے۔ ہمدردی یہ نہیں کہ آپ اپنی کوٹھی کی سب سے اونچی منزل پر رونق افروز ہو کر خاک نشین غریبوں کو حکم دیدیں کہ ایسی ہی کوٹھی تم بھی بناؤ تاکہ مساوات اور برابری رونما ہو۔ اس کو ہمدردی نہیں کہا جاسکتا یہ ستم ظریفی ہے۔ اس نعرے سے آپ اپنے کردار کو مشتبہ کر دیتے ہیں کہ آپ اس نمائندگی نعرے سے غریبوں کو سبز باغ دکھا کر اپنی عیش پرستی کے لئے وجہ جواز^۲ نکالتے ہیں۔

ہمدردی یہ ہے کہ آپ قصر معلیٰ کی سطح بالا سے نیچے اتریں، غریبوں کی ٹوٹی چٹائی پر ان کے برابر بیٹھیں، پھر ان کو ساتھ لے کر آگے بڑھیں۔ یعنی پہلا مرحلہ یہ ہے کہ بلند کرنے کے بجائے آپ معیار زندگی کو برابر کریں۔ سیرت مبارکہ کا ایک روشن باب یہ ہے کہ آپ نے اقتصادی تعمیر و ترقی کیلئے یہی اسلوب اختیار فرمایا۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

(۱) ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ ٹٹیوں کا تھا۔ ٹٹیوں میں سوراخ ہو گئے تھے جب آنحضرت ﷺ غزوہ دومتہ الجندل میں تشریف لے گئے تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اس غیبت میں حجرے کی دیواریں کچی اینٹوں کی بنوالیں۔ آنحضرت ﷺ غزوہ سے واپس ہوئے تو سب سے پہلے انہیں کے یہاں تشریف لے گئے۔ دریافت کیا: یہ تعمیر کیسی۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے معذرت کی کہ دیوار اس لئے بنوائی ہے کہ پردہ ہو جائے کسی کی نظر نہ پڑ سکے فرمایا: مال کا بدترین^۳ مصرف یہ تعمیر^۴ ہے۔ حاصل یہ ہے کہ آپ نے (ﷺ) عذر قبول فرمایا: مگر اس عمل کی تائید اور حمایت نہیں فرمائی جس سے ایک امتیاز پیدا ہو رہا تھا۔

۱۔ لَتَسْجُدَ آدَمُ عَلَى النَّحْلِ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ (سورہ توبہ)
 ۲۔ یعنی جب معیار زندگی بلند کرنا نصب العین قرار دیا گیا تو جس کا معیار بلند ہو گیا ہے وہ قابل اعتراض نہیں۔ گویا وہ منزل پر پہلے پہنچ گیا ہے۔
 ۳۔ یعنی کرایہ کے لئے مکانات بنوانا بھی ایک قسم کی زمینداری ہے جو پسند نہیں ہے (واللہ اعلم بالصواب)
 ۴۔ طبقات ابن سعد ۲/۱۸۱ (الجزء الاول من القسم الثانی)

مسجد اور حجرات کی تعمیر اور مواخات پر دوبارہ نظر

اقتصادی تعمیر، بنیادی نظریہ، طریقہ تعمیر اور دور حاضر کی اقتصادی تحریکات محمد رسول اللہ (فدائہ روجی ﷺ) اور حضرات مہاجرین جو مسجد کی اور پھر حجروں (ازواج مطہرات کے بیوت) کی تعمیر کر رہے ہیں، اسی شہر کے رہنے والے ہیں جو ملک عرب کا مرکزی شہر ہے، جو اپنے تمدن میں دنیا کے متمدن شہروں سے پیچھے نہیں ہے۔ جس کی آبادی باقاعدہ ہے۔ مختلف محلوں میں بٹی ہوئی۔ بیچ میں سڑکیں، بازار پر رونق، مکانات پختہ، ہر طرح کی آرائش سے آراستہ۔ ایک مکان وہ بھی ہے جس کو ”دارالتواریر“^۱ کہا جاتا تھا۔ (شیش محل) آنحضرت ﷺ اور آپ کے مہاجر رفقاء نے انہیں محلوں میں پرورش پائی تھی، انہیں گلیوں اور کوچوں میں کھیلے تھے۔ انہیں سڑکوں پر دوڑے اور چلے تھے۔ پھر تاجر بن کر انہیں بازاروں میں خرید و فروخت کرتے رہے تھے۔

دارالہجرت (مدینہ طیبہ) میں جب یہ حضرات خود مزدور اور معمار بن کر چکی اینٹوں، چھوٹے بڑے ناہوار پتھروں، کھجور کی ٹٹیوں اور کھجور کے پٹھوں اور پتوں سے مسجد مبارک اور حجروں کی تعمیر کر رہے تھے۔ تو اپنے خاندانی مکانات اور مکہ کے محلات کا نقشہ ان کے ذہنوں سے محو نہیں ہوا تھا۔ نبوت کے ابتدائی تین سال میں جو تربیت دی گئی تھی اس کا نصاب اور طریقہ تربیت پہلے گزر چکا ہے۔ یہ تربیت صرف تین سال تک ہی نہیں رہی بلکہ قیام مکہ کی پوری مدت میں اس کا سلسلہ جاری رہا اور وہ رنگ جو پہلے تین سال میں کھلا تھا وہ پختہ اور زیادہ پختہ ہوتا رہا۔ بلاشبہ یہ اسی تربیت کا نتیجہ ہے کہ تمدن کے تمام نقوش کو چھوڑ کر جفاکش، زاہدانہ اور درویشانہ زندگی کا نقشہ جمایا جا رہا ہے۔

مگر قرآن پاک میں حضرت حق جل مجدہ کا ارشاد تو یہ ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ (سورہ الاعراف۔ ۳۲)

”تو کہہ! کس نے منع کیا ہے رونق اللہ کی جو پیدا کی اُس نے اپنے بندوں کے واسطے اور ستھری چیزیں کھانے کی۔ تو کہہ وہ ہے ایمان والوں کے واسطے دنیا کی زندگی میں نری (مخصوص طور پر) اُن کی ہیں قیامت کے دن۔“
 پھر زینت سے یہ اجتناب کیوں؟

کپڑے کا پردہ آراستہ کر دیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت موجود نہیں تھے۔ واپس ہوئے تو حضرت فاطمہ غمگین بیٹھی تھیں جب انہیں معلوم ہوا کہ غمگین اس لئے ہیں کہ آنحضرت ﷺ تشریف لائے تھے اور خلاف معمول باہر سے ہی واپس ہو گئے تو خدمت مبارک میں حاضر ہو کر کبیدگی کا سبب دریافت کیا۔ ارشاد ہوا: ”دروازہ پر کپڑے کا پردہ سجا رکھا ہے مجھے ایسے تکلفات سے کیا واسطہ۔“

اب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ناراضگی کا سبب معلوم ہوا تو معافی چاہی اور عرض کیا جو حکم ہو اس کی تعمیل کروں۔

آنحضرت ﷺ نے ایک غریب عیالدار کا نام لیا اور فرمایا کہ یہ کپڑا ان کے یہاں پہنچا دو۔^①
(۵) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا وغیرہا کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عورتوں کو سونے کے زیورات سے منع کیا۔ یہاں تک فرمادیا کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اپنے محبوب کو آگ کا کنگن پہنائے وہ اس کو سونے کا کنگن پہنادهے۔^②
(۵) علماء کا اتفاق ہے کہ یہ ممانعت ابتداء میں تھی اس کے بعد عورتوں کو سونے کے زیورات کی اجازت دی گئی، البتہ یہ ضروری قرار دیا گیا کہ ہر سال ان کی زکوٰۃ بلاناغہ پوری ادا ہوتی رہے)

سلسلہ مواخات اور سیاسی رہنماؤں کیلئے ایک سبق

وَيُؤْتِيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (آل عمران آیت ۱۶۳)

آنحضرت ﷺ مدینہ میں قیام فرما ہوئے تو آپ کی حیثیت سیاسی سربراہ (امیر) کی بھی تھی۔ آپ مہاجرین کی آباد کاری کیلئے کوئی قانون بنا سکتے تھے۔ مگر سیرۃ مبارکہ کا سبق یہ ہے کہ قانون بنانا کارگر نہیں، دلوں کو بنانا چاہئے۔ سیاسی یا اقتصادی انقلاب کے بجائے دلوں کی دنیا میں انقلاب برپا کرو۔

آنحضرت ﷺ کا ایک بہت مشہور ارشاد ہے جس کا مفہوم یہ ہے:
”جسم انسان میں ایک پارچہ گوشت ہے اگر وہ ٹھیک ہے تو بدن کی پوری عمارت آباد، اگر وہ خراب ہے تو بدن کی پوری عمارت ویران۔ یاد رکھو وہ قلب ہے۔“

① ابوداؤد شریف باب فی اتحاد السور

② ابوداؤد شریف باب ما جاء فی الذہب النساء ص ۲۳۰ ج ۲ مجتہبی

③ ان کو (اہل ایمان کو) پاک صاف کرتے ہیں (سنوارتے ہیں) اور ان کو کتاب اور حکمت (دانش و بینش) کی تعلیم

دیتے ہیں۔ سورہ ۳، آیت ۱۶۳

④ بخاری شریف وغیرہ صحاح

(۲) اسی دور کا یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک راستے کے کنارے پر ایک مکان دیکھا جو حال میں تعمیر ہوا تھا۔ اس کا پھانک شاندار بنایا گیا تھا اور پھانک پر قبہ نما حراب بھی رکھی گئی تھی۔ دریافت فرمایا: یہ مکان کس کا ہے۔ ایک انصاری کا نام بتایا گیا۔ آنحضرت ﷺ خاموش ہو گئے۔ اگلے روز یہ انصاری دربار رسالت میں حاضر ہوئے تو خلاف معمول آقا دو جہاں ﷺ کا رخ پلٹا ہوا پایا۔ حاضرین مجلس سے اس بے اتفاقی کی وجہ معلوم کی تو کوئی خاص سبب کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ البتہ کل کے واقعہ کا تذکرہ کیا گیا کہ جب حضرت والا ﷺ آپ کے مکان کی طرف سے گزرے تھے تو قبہ دار پھانک کو دیکھ کر دیانت فرمایا تھا کہ یہ پھانک کس کا ہے۔ انصاری جاں نثار نے یہ بات سنی، واپس مکان پر پہنچے اور پورے پھانک کو منہدم^① کر کر زمین کے برابر کر دیا۔^②

(۳) یمن کا ایک قبیلہ بنو اشعر تھا۔ اس قبیلہ کے جو خاندان مسلمان ہو گئے تھے وہ مدینہ میں رہتے تھے اور فوجی خدمات (جہاد) میں حصہ لیا کرتے تھے۔ ہر ایک خاندان اپنے آمد و خرچ کا خود ذمہ دار تھا۔ لیکن ان کا یہ بھی دستور تھا کہ اگر کسی کی آمدنی میں کمی ہو جاتی (مثلاً موسم کے ختم پر نئی فصل سے پہلے تنگی ہو جاتی یا سفر میں کسی کا توشہ ختم ہو جاتا) تو ایسا کرتے تھے کہ تمام خاندانوں میں جس کے یہاں جو غلہ یا توشہ ہوتا وہ سب ایک جگہ اکٹھا کر لیتے تھے پھر سب کو برابر تقسیم کر دیتے۔ یہ آپس کی ہمدردی اور باہمی اتفاق کی صورت آنحضرت ﷺ کو اتنی پسند تھی کہ مجمع میں اس کی تعریف فرماتے ہوئے یہاں تک فرماتے:

ہم منی وانا منہم (وہ میرے ہیں میں ان کا) (بخاری شریف ص ۳۳۸)

(۴) حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ آنحضرت ﷺ کو ان سے بہت زیادہ تعلق خاطر تھا۔ جب آپ سفر پر تشریف لے جاتے تو سب سے آخر میں ان سے رخصت ہوتے۔ اور جب سفر سے واپس ہو جاتے تو سب سے پہلے ان کے یہاں تشریف لے جاتے۔ ایک مرتبہ آپ سفر سے واپس ہوئے اور حسب معمول ان کے یہاں تشریف لے گئے مگر حجرہ (کمرہ) کے اندر نہیں داخل ہوئے، دروازہ سے ہی واپس تشریف لے آئے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس مرتبہ نئی بات یہ کی تھی کہ حجرے کے دروازے پر

① اخلاص کی انتہا یہ ہے کہ منہدم کر دینے کی اطلاع بھی نہیں دی۔ کچھ دنوں بعد جب دوبارہ اس طرف سے آنحضرت ﷺ کا گزر ہو تو خود آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس پھانک کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ تب آپ نے فرمایا اما ان کل بناء وہاں علی صاحبہ الاملا الاملا الاملا ہر ایک تعمیر اس کے بانی کے حق میں وہاں ہے مگر وہ جو ضروری ہو بہت ضروری ہو جس کے بغیر چارہ نہ ہو

② ابوداؤد شریف باب فی البناء ص ۳۶۲ ج ۲ مجتہبی

سیرت مبارکہ کے اشارات

اور

تحریکات دور حاضر کے نظریات میں بنیادی فرق

وَبُضَيْدٌ هَاتَتَيْنِ الْأَشْيَاءُ

سیرت مبارکہ کے پر تقدس سلسلہ میں سوشلزم کیونرم وغیرہ دور حاضر کی تحریکات کا ذکر کرنا سوء ادب اور گستاخی ہے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بُضَيْدٌ هَاتَتَيْنِ الْأَشْيَاءُ (یعنی کسی حقیقت کی پوری وضاحت جب ہوتی ہے جب اس کی مقابل اور برعکس چیز کو سامنے رکھا جائے) نور آفتاب کی قدر اسی وقت ہوتی ہے جب ظلمت شب کی مصیبت جھیلی ہو۔ لہذا ان تحریکات کے بنیادی نظریات کا کسی قدر تذکرہ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سیرت مبارکہ کے ان اشارات کی وضاحت ہو سکے جن کا تعلق اقتصادیات سے ہے اور انصاف پسند اہل بصیرت ان کی قدر و منزلت معلوم کر سکیں۔ اس کے علاوہ واقعہ یہ ہے کہ تحریکات حاضرہ کے متوالوں میں ایسے بھی ہیں جو ان تحریکات کا پوندامن اسلام سے جوڑنا چاہتے ہیں اور اس کو اسلام پر ایک احسان سمجھتے ہیں۔ لہذا بنیادی فرق کی وضاحت اس لئے بھی ضروری ہے کہ ایسے محسنین اسلام کے سامنے حقیقت جلوہ گر ہو سکے۔

(۱)

سب سے پہلا فرق یہ ہے کہ ان تحریکات کے بانیوں نے اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جس کا سمجھنا سب سے پہلے ضروری تھا۔

ان تحریکات کا منشاء اگر انسانی سماج کی فلاح و بہبود ہے تو سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ انسان کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ انسان کیا ہے۔ انسانیت کیا ہے، تاکہ انسان کی فلاح و بہبود کے معنی اور ترقی کا معیار معین ہو سکے۔

کلام اللہ شریف نے آنحضرت ﷺ کی شان یہ بیان فرمائی تھی:

”تمہارا (اہل ایمان کا) رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق (سخت ناگوار) گذرتا ہے۔ تمہاری بھلائی کا حریص (بہت خواہشمند) ہے وہ مومنوں کے لئے شفقت رکھنے والا رحمت والا ہے۔^۱ وہ ان کو (اہل ایمان کو) اللہ کی آیتیں سناتا ہے اور ان کو سنوایا ہے (ہر طرح کی برائیوں سے انہیں پاک کرتا ہے)“^۲

قانون کے سامنے چاروناچار گردنیں جھک جاتی ہیں مگر دل نہیں سنوڑتے۔ یہ نبی رحمت، رؤف رحیم کی نظر کیسا اثر کی برکت تھی کہ حضرات انصار کے دل ایسے سنوڑے، بخل اور حب مال کی برائی ختم ہو کر ایثار، فدائیت اور سخاوت کے وہ بے پناہ جذبات ان میں موجزن ہوئے کہ جیسے ہی رشتہ اخوت قائم ہوا انہوں نے خود درخواست پیش کر دی۔

اقسم بیننا وبين اخواننا النخيل^۳

ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے درمیان باغات تقسیم کر دیجئے۔“

حضرات انصار کا اصرار یہ تھا کہ حضرات مہاجرین کو ان جائیدادوں کا مالک بنا دیا جائے لیکن رحمۃ اللعالمین ﷺ جیسے غریب اور پردیسی مہاجرین کے حق میں مشفق و محسن تھے، اسی طرح آپ کا دامن رحمت انصار پر بھی پھیلا ہوا تھا۔ ان کے حق میں بھی آپ رؤف رحیم تھے۔ آپ نے ملکیت کی تقسیم منظور نہیں فرمائی۔ صرف پیداوار کی تقسیم کا فیصلہ فرمایا۔ تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ (یہ ہونی چاہیے شان سیاسی سربراہ اور رہنماء قوم کی)

^۱ سورہ توبہ آیت ۱۲۸

^۲ سورہ آل عمران آیت ۱۶۳

^۳ بخاری شریف ص ۳۱۲ و ص ۵۳۳

خصوصیت بیان کی گئی ہے جو اس کو باقی تمام مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ ساتھ ساتھ اس کی وہ حیثیت واضح کی گئی ہے جو اس کو پوری کائنات یعنی عالم مخلوقات میں حاصل ہے۔

(۳)

صرف اسلام ہی نہیں بلکہ جملہ مذاہب اس پر متفق ہیں کہ

(۱) انسان کا خاتمہ موت پر نہیں ہو جاتا بلکہ وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو موت کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ موت کی حقیقت فنا ہو جانا نہیں ہے بلکہ موت ایک تبدیلی اور انتقال ہے یعنی عالم مشاہدہ سے ایک ایسے عالم کی طرف منتقل ہو جانا جو ہمارے مشاہدہ سے بالا ہے۔

(۲) اور یہ کہ انسان کا حقیقی اور دائمی مستقبل وہ ہے جس کا آغاز اس انتقال اور اس تبدیلی

کے بعد ہو گا جس کو موت کہا جاتا ہے۔

لیکن اگر حقیقی مستقبل اور حقیقی زندگی وہ ہے جو موت کی گھائی کو پار کرنے کے بعد سامنے آئے گی تو موجودہ زندگی کا تعلق اس سے کیا ہو گا؟ اس زندگی کا آغاز از سر نو ہو گا یعنی نیست سے ہست اور عدم کی جگہ ایک وجود کا آغاز ہو گا یا وہ زندگی موجودہ زندگی کا نتیجہ اور ثمرہ ہوئی۔ گویا آج ہم بورہ ہیں اور مرنے کے بعد اس کو کٹائیں گے یا وہ ایک قدرتی ارتقا ہو گا۔ یعنی جس طرح انسان کا موجودہ وجود ایک ارتقائی^۱ درجہ ہے جو تخلیق کے بہت سے مراحل طے کرنے کے بعد ظہور پذیر ہوا ہے۔ ایسے ہی مابعد الموت بھی ایک ارتقائی درجہ ہو گا۔ سائنس نے اس کا جواب نہیں دیا۔ مذہب اس کا جواب دیتا ہے اور قرآن حکیم اس جواب کو سامنے رکھ کر نہ صرف اقتصادیات و سیاسیات بلکہ انسان کی پوری زندگی کے لئے ضابطہ حیات مقرر کرتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی سیرۃ مبارکہ جو قرآن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے اس کی عکاسی کرتی ہے۔

(۴)

خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان اس کو مانے۔ انسان کو ضرورت ہے کہ اپنے آپ کو باہوش ثابت کرنے کے لئے خدا کو مانے۔ اس شخص کو باہوش نہیں کہا جاسکتا جس کا دعویٰ یہ ہو کہ

۱ ڈارون کا نظریہ ہمارے پیش نظر نہیں ہے۔ ہمارے پیش نظر قرآنی آیات ہیں جن میں یہ ترتیب قائم کی گئی ہے کہ انسان کی سرشت مٹی سے ہوئی۔ پھر ہر انسان کے مراتب تولید میں نطفہ، پھر حلقہ (خون بت)، پھر گوشت کالو، پھر ہڈیاں، پھر ریح، پھر ولادت، پھر بچپن، جوانی، کبوتر، پھر بڑھاپا، پس جس طرح روح (جان) پڑ جانے کے بعد (بدن) بدن مادر میں رہا اور وہاں سے اس عالم میں آیا۔ یہ بھی ایک انتقال ہے۔ اسی طرح موجودہ عالم بدن مٹی سے جہاں وہ اپنے اوصاف و خصائص اور اپنے کردار عمل کے ساتھ نشوونما پا رہا ہے اور مرنے کے معنی کہ وہ بدن مٹی سے دوسرے عالم میں منتقل ہو گا اور جس طرح ماں باپ کی خصلتیں اور ان کے امراض عموماً بچے میں سرایت کر جاتے ہیں انسان کے اعمال و کردار کے اچھے برے اثرات بھی انسان میں اثر کر جائیں گے۔ دوسرے عالم میں ان کے اثرات ظاہر ہوں گے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ تحریکات دور حاضر کی پیداوار ہیں اور اس سے پہلے انسان کے دماغ پر تالے پڑے ہوئے تھے۔ ان تالوں کی کنجیاں بیسویں صدی عیسوی میں انسان کے ہاتھ آئی ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ صرف ڈیزائن اور نقشہ بدلا ہے ورنہ ان تحریکات کی بنیادیں بہت قدیم ہیں اور اس طرح کے انقلاب سے دنیا ہمیشہ دوچار ہوتی رہی ہے۔^۱

موجودہ تحریکات اور ان کی ہم جنس سابق تحریکات کی مشترکہ کوتاہی یہ ہے کہ ان کی بنیاد صرف خدا فراموشی پر نہیں ہے بلکہ خود فراموشی بھی ان کی بنیادوں کا کنکریت اور اینٹ گارا ہے۔ انسان کیا ہے، کیوں پیدا ہوا، اس کا مستقبل کیا ہے۔ اس کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے۔ موت کی حقیقت کیا ہے؟ وہ فنا ہے یا انتقال (یعنی حالت کی تبدیلی اور ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہو جانا)

اگر موت انتقال ہے اور انسان موت کے بعد بھی باقی رہنے والی حقیقت ہے تو مابعد الموت کا تعلق موجودہ زندگی سے کیا ہے؟ قول و عمل اگر باقی رہنے والی حقیقتیں ہیں تو کس طرح؟ اور ان کا کچھ اثا مابعد الموت ہو گا یا نہیں۔ عاقبت اندیش انسان کا فرض ہے کہ میدان عمل میں قدم رکھنے سے پہلے ان سوالات کو حل کر لے۔ ان سوالات سے غفلت خود فراموشی ہے جس کا نتیجہ خدا فراموشی ہوتا ہے۔ من لم یعرف نفسه لم یعرف ربہ۔

انسان ایک جاندار ہے۔ جو اپنے اندر غور و فکر اور تحقیق و تنقید کی طاقت رکھتا ہے۔ جس کی بنا پر اس نے خاص طرح کی زندگی اختیار کی۔ جس نے درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے موجودہ تمدن کی صورت اختیار کر لی۔ جس کے بہت سے شعبوں میں سے ایک شعبہ وہ ہے جس کو سائنس اور فلسفہ کہا جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ کائنات کی آخری سرحد تک پرواز کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کو کچھ ایسے ضابطوں اور قوانین کی ضرورت ہے جو اس زندگی کو محفوظ رکھ سکیں۔ اور اس کو خوشگوار بنا سکیں۔ چنانچہ وہ یہ ضابطے بناتا ہے اور ان کو رائج کرتا ہے۔

یہ ہیں وہ انکشافات جو تحریکات کے بانی صاحبان کو حقیقت انسان کے متعلق خود بخود یا اس سائنس اور فلسفہ کے ذریعے سے ہو گئے جس کا دعویٰ ہے کہ وہ ہر چیز کی حقیقت سے واقف ہے۔ لیکن اس کائنات میں انسان کی حیثیت کیا ہے اس کا جواب سائنس اور فلسفہ نے بھی نہیں دیا۔ اس کے برعکس قرآن حکیم کے شروع ہی میں چند تمہیدی فقرہوں کے بعد سب سے پہلے انسان کی وہ

۱ فارسی زبان اور تاریخ ایران سے دلچسپی رکھنے والے مزدک سے واقف ہیں جس نے تقریباً پانچویں صدی عیسوی میں تحریک چلائی تھی کہ زن، زن اور زمین سب کے لئے مشترک ہے۔ زنان را خلاص گردانید و اموال را مباح داشت و ہمہ مردمان را در خواستہ زن شریک ساخت چنانکہ در آتش و آب و علف انہا نہ (دربستان مذہب) و الملل و ملل ص ۲۷۸، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو احقر کی تصنیف ”اقتصادی تحریکات اور اسلامی تعلیم کے اشارات۔“

یہ ہے انسان کی حیثیت اسلام کی نظر میں اور خود فراموشی یہ ہے کہ انسان اپنی اس حیثیت سے اور اس حیثیت کے بموجب جو اس کے فرائض ہیں ان سے غافل ہو۔

فرائض :

خلافت و نیابت کے منصب جلیل کا جس طرح یہ تقاضا ہے کہ خلیفہ اپنے آقا کا فرمانبردار اور وفادار ہو۔ ایسے ہی اس کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے آقا کے کمالات کا مظہر ہو۔ اور ان فرائض سے پاک ہو جو کمالات کی ضد ہیں اور عیب سمجھے جاتے ہیں۔ قرآن حکیم نے سب سے پہلے فقیروں میں خالق کائنات کا تعارف ان الفاظ میں کر دیا ہے۔

- ۱۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ بہت رحم کرنے والا بہت مہربان
- ۲۔ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ تمام جہانوں کا پالنے والا
- ۳۔ مُلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ مالک انصاف کے دن کا

(۱) سب سے پہلے ضروری ہے کہ انسان میں رحم ہو۔ شفقت اور مہربانی ہو۔
(۲) اس کی فطرت میں تربیت ہو (یعنی پرورش کرنا، سکھانا، سدھانا، ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرنا) سخاوت، بخشش اور سیر پیشی جیسے صفات سے وہ آراستہ ہو۔
رب العالمین خود نہیں کھاتا دوسروں کو کھلاتا ہے۔ وہ بھوک پیاس سے بھی بے نیاز ہے لیکن انسان (جو کھانے پینے کا محتاج ہے) اگر بھوکوں کی ضرورت کو اپنی بھوک سے مقدم رکھے تو اس کا نام ایثار اور قربانی ہے۔

(۳) رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سب سے بڑا منصف ہے اس کے خلیفہ کو بھی عدل و انصاف کا پیکر ہونا چاہئے۔
(۴) خالق کائنات رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ عَلِیْمُ غَیْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۱ ہے یَعْلَمُ مَا فِی الْبَیْزِ الْاَنْجَمِ ۲۔ اس کی صفت ہے اس کے خلیفہ اور نائب کو بھی ذی علم ہونا چاہئے۔ وہ عَلِیْمُ غَیْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور عَلِیْمُ مَا فِی الْبَیْزِ الْاَنْجَمِ نہیں ہو سکتا، مگر اس کا فرض ہے کہ اپنے علم کو زیادہ سے زیادہ وسعت دے اور دعا کرتا ہے۔ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ۳
(۵) رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ صرف خالق ہی نہیں بلکہ اس کی صفت ہے: بِدِیْنِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۴ نئی طرح بنانے والا (ایجاد کرنے والا) زمینوں اور آسمانوں کا۔

۱۔ ان تمام باتوں کا جاننے والا جو پردہ آسمان میں یا سینہ زمین میں چھپی ہوئی ہیں۔ (الفاطر-۳۸)
۲۔ ان تمام باتوں میں ان تمام طاقتوں کو جانتا ہے جو سمندر یا خشکی میں ودیعت ہیں۔ (الانعام-۵۹)
۳۔ سورہ طہ آیت ۱۱۴
۴۔ سورہ الانعام آیت ۱۰۱

تاج محل خود بخود وجود میں آگیا۔

یہ شخص اگر اسی کو باطنی کے ساتھ تاج محل کی سیر کرتا ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ بانی اور معماروں کی قدر نہیں کرے گا۔ بلکہ یہ کہ وہ سنگ تراشی، نقش سازی، ڈیزائن سازی اور انجینئرنگ وغیرہ کے تصورات سے بھی محروم رہے گا۔ اس کے ذہن میں بھی نہیں آئے گا کہ ڈیزائن سازی بھی کوئی خاص فن ہے۔ سنگ خار اور سنگ مرمر پر پھول اور بوٹیاں بنانا پھر ان میں رنگ بھرنا اور ایسے مسالے تیار کرنا کہ صد ہا سال کی سیکڑوں برسانیں ان پر کوئی اثر نہ کر سکیں۔ عمارت کے طول و عرض، بلندی وغیرہ کو موزوں رکھنا بھی قابل قدر ہنر ہیں۔

یہ ظالم تاج محل کو خود رومان کران تمام فنون اور ان کے ماہرین پر ظلم کرتا ہے۔ ان فنون کے ایجاد کرنے اور ترقی دینے کا کوئی سوال اس کے سامنے نہیں آتا۔ وہ خود اپنے اوپر بھی ظلم کرتا ہے اور اپنی ظالمانہ فطرت سے ان تمام فنون کو بھی مجروح اور مفلوج کر دیتا ہے۔ ایسے کو باطنوں کو اگر اقتدار کی باگ ڈور دیدی جائے تو کیا تھمن ایک قدم بھی آگے بڑھ سکے گا۔
کائنات کے اس تاج محل میں جو حسن اور خوبیاں ہیں ان کو صحیح طور پر وہی پہچان سکتا ہے جو اس کے پیدا کرنے والے کو پہچانے۔ اسی کو معرفت حق کہا جاتا ہے۔ معرفت حق حقیقت پسندی اور خدا پرستی کی بنیاد ہے۔ اس کو مضبوط کرنے اور ترقی دینے کا نام روحانیت ہے۔
(۵)

انسان کی حیثیت :

انسان کی حیثیت اگر یہ ہے کہ وہ ایک جاندار ہے جس کو عقل کی نعمت دے دی گئی ہے۔ تو اس سے اعلیٰ اخلاق، شرافت اور روحانیت کا مطالبہ خاص وزن نہیں رکھتا۔ اگر وزن رکھتا ہے تو صرف اتنا جو بقاضاء عقل ضروری ہو۔ مگر اسلام نے انسان کی حیثیت بہت بلند قرار دی ہے۔ وہ کمالات تخلیق کا بہترین نمونہ ۱ اور نظام قدرت کا شاہکار ہے جس کو یہ عزت اور عظمت ۲ دی گئی ہے کہ وہ اس پوری کائنات میں خالق کائنات کا خلیفہ ۳ ہے۔ کائنات کی بڑی سے بڑی مخلوق حتیٰ کہ چاند سورج اور زمین و آسمان کو بھی خالق و قادر ذوالجلال نے اس کے لئے مسخر ۴ کر دیا ہے۔ وہ ہر ایک پر حکم چلا سکتا ہے جس کو چاہے اپنے کام میں لاسکتا ہے۔

۱۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (سورہ التین-۴)

۲۔ وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ اٰدَمَ (سورہ بنی اسرائیل-۷۰)

۳۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (سورہ بقرہ آیت ۳۰)

۴۔ وَسَخَّرَ لَکُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنَّجْمِ الْوَاللَّهَارَ (سورہ براہیم-۳۳) وَسَخَّرَ لَکُمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا قَبْلَہُ (سورہ جاثیہ آیت ۱۲)

(۶)

ٹیکس کی عربی ضریبہ ہے۔ آپ پورے قرآن شریف کا مطالعہ کر لیجئے آپ کو کہیں کوئی ایسا لفظ نہیں ملے گا جو مالی نظام کے سلسلہ میں ٹیکس اور ضریبہ کے مفہوم کو ادا کرتا ہو۔ کیونکہ ٹیکس کی تہ میں جبر اور قہر ہوتا ہے۔ قانون کے بنانے والے اگرچہ عوام کے نمائندے ہوتے ہیں مگر اس کے نفاذ کی پشت پر حکومت کی مسلح طاقت ہوتی ہے۔ اس طرح استحصال تو ہو سکتا ہے کہ حکومت کو رقم مل جائے اور اس کے بجٹ کا خسارہ پورا ہو جائے مگر ادا کرنے والوں کے اخلاق کی اصلاح اور دلوں کا تزکیہ نہیں ہو سکتا۔ بخل، طمع، حرص جیسے امراض بدستور رہتے ہیں اور آرڈی ننس یا قانون کی بھیناک طاقت ان امراض میں نفرت، غصہ، بغض اور عداوت جیسی بیماریوں کا اضافہ کر دیتی ہے۔

جاگیر داری نظام، سرمایہ داری، زمیندارہ، انتہائیہ کہ فرد کی ملکیت ختم کر دی جائے تو بہت سے محشر تو برپا ہو سکتے ہیں مگر دلوں کی پاکی اور اخلاق کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ بلکہ خاتمہ ملکیت سے عالمی نظام^۱ درہم برہم ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ^۲ وہ نفرت انگیز اتار کی ہوتا ہے جو دامن عصمت و عفت کے بھی تار پود بکھیر دیتا ہے۔

جس مالی نظام کی قرآن حکیم رہنمائی کرتا ہے اس کا نتیجہ اگرچہ یہ ہو سکتا ہے کہ سرمایہ داری، جاگیر داری حتیٰ کہ ملکیت بھی ختم ہو جائے^۳، مگر یہ خاتمہ اس طرح ہو گا کہ دلوں کی دنیا بھی بدل

۱ صاحب خانہ کا اثر اور دباؤ نہ رہے تو ظاہر ہے گھر کا نظام درہم برہم اور اثر اور دباؤ صرف اس بنا پر نہیں کہ بیوی کا شوہر یا بچوں کا باپ ہے بلکہ دباؤ اور اثر اس لئے ہوتا ہے کہ وہ مالک و قابض ہے۔ بے دست و پا صاحب خانہ کا اثر صرف اخلاقی مطالبہ ہوتا ہے اور جب باپ کا دباؤ نہ ہو تو کیا اولاد بااخلاق بن سکتی ہے؟
۲ خانگی نظام ختم ہونے کے بعد جب سرکاری پرورش گاہوں میں بچے پرورش پائیں گے تو ایک طرف قربت اور رشتہ داری کے جملہ حقوق ختم بلکہ رشتہ داروں کو پہچاننا مشکل بھی ہو گا اور بے کار بھی، دوسری جانب جنسی تعلقات کے لئے سلسلہ ازدواج بے معنی ہو جائے گا۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیے احقر کی تصنیف ”دور حاضر کے سیاسی اور اقتصادی مسائل“ اور اسلامی تعلیم کے اشارات“

۳ انسان اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے تو ہر چیز کا اصل مالک اللہ ہے۔ بندہ کی ملکیت صرف نایبیت ہے جو مالک حقیقی کی مشا اور اس کی مصلحت کے تحت اور اس کے احکام کے تابع ہوگی۔ پھر اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے۔ اپنے بندوں کا محافظ مشکلات کو حل کرنے والا۔ حاجتوں کو پورا کرنے والا (حل المشكلات قاضی الحاجات) پس جب بھی پرورش، حفاظت، تعلیم و تربیت وغیرہ کی ضرورتیں پیش آئیں گی، انسان پر بحیثیت نائب و خلیفہ ان ضرورتوں کو پورا کرنا ضروری ہو گا۔ انفرادی ضرورتیں افراد سے پوری ہوں گی۔ زکوٰۃ و صدقات اسی لئے ہیں کہ ضرورت مند افراد کی انفرادی ضرورتیں پوری کی جائیں۔ لہذا ان کی ادائیگی کے لئے حکومت کا توسط ضروری نہیں ہے وہ وہاں بھی لازم نہیں جہاں اسلامی حکومت نہیں ہے۔ صاحب استطاعت کا فرض ہے کہ وہ ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرے۔ اسی لئے ان میں تملیک بھی ضروری ہے یعنی ضرورت مند کو محض اجازت دے دینا کافی نہیں بلکہ مالک بنانا بھی ضروری ہوتا ہے۔ البتہ اجتماعی ضرورتیں بیت اجتماعیہ یعنی خلافت کے ذریعہ پوری ہوں گی۔ یہ اجتماع بیت خلافت اللہ تعالیٰ کی حیثیت سے افراد پر اقتدار رکھتی ہے اور افراد کی مملوکات پر بھی۔ وہ کسی کی ملک چھین نہیں سکتی مگر پابندی لگا سکتی ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے ”دور حاضر کے سیاسی و اقتصادی مسائل“

فکر انسان کو بھی چاہئے کہ تخلیق و ایجاد کی باریکیوں کی تلاش کرنے میں مصروف رہے۔ وہ نیست کو ہست اور معدوم کو موجود تو نہیں کر سکتا۔ یہ تو وہی کر سکتا ہے جس کے ایک حکم ”کن“ پر نیست ہست بن جائے^۱ اور عدم محض جامہ وجود سے آراستہ ہو جائے۔ البتہ وہ یہ ضرور کر سکتا ہے کہ موجودات کی پوشیدہ صلاحیتوں کا کھوج لگائے اور مخفی طاقتوں کے اسباب و ذرائع معلوم کر کے جدید ایجادات کو بروئے کار لائے۔

مختصر یہ کہ یہ اوصاف کمال کا سلسلہ ہے۔ ان کے برعکس اوصاف نقص ہیں۔ رحم، مہربانی اور شفقت کے مقابلہ میں سخت مزاجی، سنگ دلی، جبر و قہر، سخاوت اور سیر چشمی کے مقابلہ میں بخل، تنگ دلی اور کنجوسی، حاجت روائی اور کار سازی کے مقابلہ میں خود غرضی اور نفع اندوزی، ایثار کے مقابلہ میں حرص طمع، رشوت ستانی اور ذخیرہ اندوزی، عدل و انصاف کے مقابلہ میں ظلم، علم کے مقابلہ میں جہل و سفاہت، تحقیق و تنقید کے مقابلہ میں اندھی تقلید۔

انسان میں قدرت نے دونوں صلاحیتیں رکھی ہیں۔ وہ اوصاف و کمال کو اپنا کر کامل و مکمل بھی بن سکتا ہے اور اوصاف نقص کو اختیار کر کے، ذلیل، کمینہ اور شیطان اخرس بھی بن سکتا ہے۔ شریعت^۲ کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان اوصاف نقص سے پاک ہو کر اوصاف کمال اختیار کرے۔ اسی کو تقدس کہا جاتا ہے۔ اس مطالبہ کو پورا کرنے کی کوشش تزکیہ ہے جو آنحضرت ﷺ کی بعثت کا اہم مقصد اور آپ کی زندگی کا اہم ترین کارنامہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ دور حاضر کی تحریکات کا مقصد یہ ہے کہ ملک کا ہر ایک باشندہ خوشحال ہو، زندگی کی ضرورتیں اس کو میسر ہوں، باشندگان ملک اطمینان کی زندگی گزار سکیں۔ یہ مقصد بہت مبارک ہے لیکن جب تک انسان بری خصلتوں سے پاک نہ ہو کیا یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے؟ یہ دوسرا فرق ہے جو سیرت مبارکہ کی تعلیمات کو موجودہ تحریکات سے ممتاز کرتا ہے کہ سوشلزم و نیشنلزم وغیرہ کا اسکول تزکیہ اور اصلاح اخلاق کے مفہوم سے نا آشنا بلکہ اس کے ماحول میں یہ الفاظ قطعاً بے جوڑ اور معطلہ انگیز ہیں جبکہ سیرۃ مبارکہ کی تعلیمات تزکیہ کو ایسا محور قرار دیتی ہیں کہ ہر ایک نظام اسی کے گرد گھومتا ہے اور اسی کی درگاہ سے سند جواز حاصل کرتا ہے۔ کوئی بھی نظام ہو اگر اس کی بنیاد تزکیہ پر نہیں ہے تو باطل اور فاسد ہے، کیونکہ سیرت مبارکہ کی تعلیمات کا مطمح نظر صرف حیوانی زندگی نہیں جو چند روزہ عارضی ہے بلکہ اس کا مطمح نظر وہ حقیقی زندگی ہے جو ابدی اور دائمی ہوگی جس کی خوش گواہی تزکیہ پر موقوف ہے۔

۱ ہو جا۔ یعنی عالم کون و ہست میں آ جا۔ عالم وجود میں آ جا۔

۲ اِنَّا عَرَضْنَا الْاٰمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ اَنْ يَّخْلِفْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ فَاٰسِقًا جَهْلُوْلًا۔ (سورہ الاحزاب۔ ۷۲)

جائے گی۔

خارجی طاقت یعنی آرڈیننس یا قانون کی شورشوری۔ اہل ثروت اور ارباب دولت کو سراسیمہ اور پریشان نہیں کرے گی بلکہ خود اپنے اندرونی جذبات کی سوزش ان کی نظر میں اس دولت کو وبال جان اور اس کے خرچ کرنے کو راحت و اطمینان بنا دے گی۔

مالی نظام کے سلسلہ میں جو الفاظ قرآن حکیم یا سنت نبویہ نے استعمال فرمائے ان پر نظر ڈالئے۔ وہ سب انقلاب انگیز ہیں مگر بجٹ کے خسارہ کو پورا کرنے کے لئے نہیں بلکہ دلوں کی پیاریوں کو دور کرنے کیلئے۔

سب سے پہلا اور سب سے مشہور لفظ زکوٰۃ ہے جس کے مفہوم میں، تزکیہ، داخل ہے۔ زکوٰۃ کے معنی پاک ہیں اور تزکیہ کے معنی پاک کر دینا۔ یعنی زکوٰۃ اس لئے فرض ہوتی ہے کہ دلوں کو پاک کر دے۔ نخل وہ ناپاکی ہے جو دلوں کو بھی نہیں بلکہ اس ملکیت کو بھی ناپاک کر دیتی ہے جو اس کے زیر اثر ہو۔ زکوٰۃ دل کو نخل سے پاک کرتی ہے تو ساتھ ساتھ دولت کو بھی پاک کر دیتی ہے۔ دوسرا لفظ صدقہ ہے جو صدق سے ماخوذ ہے۔ یعنی صدقہ اس بات کی عملی دلیل ہے کہ ملی ضرورتوں کے احساس یا غریبوں اور فقیروں کی ہمدردی کا دعویٰ ایک سچی حقیقت ہے۔ محض نمائش اور بناوٹ نہیں۔ یہ دو مدد لازمی ہیں۔ ان کے مصارف بھی معین ہیں۔ یہ ضرورت مند افراد کی امداد کے لئے مخصوص ہیں۔ ان دو مددوں کے ذریعہ قوم کی غریبی دور ہو سکتی ہے۔ ان کے لئے حکومت کا واسطہ بھی ضروری نہیں براہ راست صاحب دولت پر فرض ہے کہ اتنی مقدار اپنی ملک سے نکالے اور ضرورت مند کی ملکیت میں دیدے۔ مملکت یا ملت کی اجتماعی ضرورتوں پر زکوٰۃ و صدقات واجبہ کی رقم صرف نہیں کی جاسکتی۔ ان ضرورتوں کے لئے قرآن حکیم نے فرض یا اتفاق فی سبیل اللہ کا لفظ استعمال کیا ہے :

وَأَقْرَضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا (سورہ مزمل-۱۴)

”قرض دو اللہ کو اچھی طرح قرض دینا۔“

وَأَنْفَقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ (سورہ بقرہ آیت ۱۹۵)

”اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور (خرچ کو بند کر کے یعنی نخل کر کے) مت ڈالو اپنے ہاتھوں

اپنے آپ کو ہلاکت میں“

فرض کیجئے اسلامی مملکت کی مخالف حکومتیں اپنی جنگی طاقتیں زیادہ سے زیادہ مضبوط کر رہی ہیں۔ اسلامی مملکت کی آمدنی کے عام ذرائع دفاعی ضرورتیں نہیں پوری کر سکتے۔ ہنگامی امداد کی

ضرورت ہوتی ہے، حکومتیں ایسی صورتوں میں قومی قرض^۱ یا قرضہ جنگ کی اپیل کرتی ہیں۔ مگر قرآن حکیم یہ قرض اللہ کے لئے طلب کرتا ہے۔ اتفاق یعنی خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے تو وہ بھی فی سبیل اللہ یعنی پہلے انسان کا رشتہ اللہ سے جوڑتا ہے۔ غیر اللہ سے اس کے دل کو پاک کرتا ہے۔ مال و دولت اور ہر چیز کے مقابلہ میں اللہ کی محبت بڑھاتا ہے اور ایمان کا معیار یہ قرار دیتا ہے کہ:

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ (سورہ بقرہ آیت ۱۶۵)

”جو ایمان لائے وہ بہت بڑھے ہوئے ہیں اللہ کی محبت میں“

اسی محبت کے نتیجہ میں وہ اس سے مالی قربانی کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ ہے تزکیہ قلب۔

(۷)

تزکیہ کس طرح ہوتا ہے :

تزکیہ کا آغاز خود اپنے نفس سے ہوتا ہے۔ پہلے خود اپنی اصلاح کرے، اپنے نفس کو نخل، طمع، حب مال جیسی آلودگی سے پاک کرے، تب درجہ بدرجہ دوسروں سے اصلاح قبول کر لینے کی توقع کر سکتا ہے۔ اس سلسلہ تحریر کا تعلق جناب رسالت مآب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ سے ہے لہذا وہی مثالیں پیش کی جا رہی ہیں جن کا تعلق خود ذات اقدس سے ہو (ﷺ)۔

دولت پرستی اور حب مال سے قلب کو پاک کرنے کی ایک مثال یہ ہے کہ آپ نے (ﷺ) طے فرمایا کہ جو کچھ آمد ہو وہ شام تک خرچ کر دی جائے۔ کاشانہ نبوت میں رات کو کوئی ایک جہر بھی باقی نہ رہ سکے۔

گردنوں کو پھاند کر گزنا خلاف ادب ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کی ممانعت فرمائی ہے۔ ہاں کسی مجبوری کی صورت میں یہ بے ادبی معاف سمجھی جائے گی۔ آنحضرت ﷺ کو ایک روز خود ایسا کرنا پڑا۔ آپ عصر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ آپ کو خیال آیا کہ فلاں زوجہ مطہرہ کے یہاں آپ کی کچھ چاندی رکھی ہوئی ہے، جیسے ہی آپ نے سلام پھیرا بڑی پھرتی سے آپ کھڑے ہوئے اور ان زوجہ مطہرہ کے یہاں تشریف لے گئے فوراً ہی واپس تشریف لے آئے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ

^۱ بہت ممکن ہے حکومتوں نے قرض کی اصطلاح بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآن سے ہی سیکھی ہو۔ لیکن اگر یہ اصطلاح قرآن سے سیکھی ہے تو محض الفاظ قرآن کے ہیں روح قطعاً غیر قرآنی ہے۔ قرآن صاحب دولت سے اس خلق کی بنا پر دولت لیتا ہے جو اس کا خدا کے ساتھ ہے اور حکومتیں سود کا لالچ دیکر قرض لیتی ہیں۔ قرآن والے قرض سے دولت کی محبت کم ہوتی ہے، نخل کے مرض میں تخفیف ہوتی ہے اور سرکاری قرض سے ان امراض میں کمی کے بجائے اضافہ ہوتا ہے اور سب سے زیادہ یہ ہے کہ قرآنی قرض کا بار صرف صاحب دولت پر پڑتا ہے کیونکہ وہ یہ سمجھ کر قرض لیتا ہے کہ اس کا جرد دنیا میں کچھ نہیں ملے گا اللہ کے یہاں ملے گا۔ اور سرکاری قرض کا بار غریبوں پر پڑتا ہے کیونکہ سود کی ادائیگی نئے ٹیکس لگا کر یا ٹیکسوں میں اضافہ کر کے کی جاتی ہے، جس کے نتیجہ میں غریب کی غریبی میں اضافہ ہوتا ہے اور دولت مند اور زیادہ دولت مند ہو جاتا ہے۔

استحصال کی بندش:

تزکیہ کا مطلب صرف یہی نہیں رہا کہ اکتنا نہ ہو۔ یعنی حاصل شدہ درہم و دینار کو شب بآشی کا موقع نہ ملے (شام سے پہلے ہی خرچ کر دیا جائے) بلکہ تزکیہ کا دوسرا رخ یہ تھا کہ آمدنی صرف وہ ہو جو ہر طرح مقدس، طیب اور پاک ہو۔ پھر اس پاک میں بھی یہ پابندی کہ زکوٰۃ یا صدقہ نہ ہو۔ یہ پابندی نہ صرف اپنے لئے بلکہ

(الف) نسل بعد نسل اپنی تمام اولاد کے لئے۔

(ب) تمام خاندان کے لئے جو آل ہاشم کہلاتا تھا (انتہایہ کہ)

(ج) اپنے خاندان کے تمام آزاد کردہ غلاموں کے لئے

پھر لطف یہ کہ (۱) محمد رسول اللہ ﷺ کا تمام تر ترکہ صدقہ، آپ کے وارثوں کو یہ حق نہیں کہ اس کو تقسیم کر سکیں۔ مگر صدقہ یا زکوٰۃ کی یہ مجال نہیں کہ وہ آل ہاشم کا دامن چھو سکے۔ (۲) پوری امت کے لئے یہ ضابطہ کہ

توخذ من اغنیاءہم وتردد علی فقرائہم

یعنی جس قوم یا گروہ کے دولت مندوں سے زکوٰۃ لی جائے وہ اسی گروہ یا قوم کے ضرورتمندوں کو دیدی جائے۔ مگر آنحضرت ﷺ اور آپ کے خاندان کے لئے اس میں یہ ترسیم کہ اس ضابطہ کا جزو اول تو واجب العمل کہ اگر دولت مند ہوں تو عام مسلمانوں کی طرح ان سے بھی زکوٰۃ و صدقہ لیا جائے۔ لیکن دوسرا جزو (کہ ان کے ضرورت مندوں کو دیا جائے) حرام۔ یعنی آل ہاشم کے دولت مند یہ نہیں کر سکتے کہ عام دستور کے بموجب وہ اپنی زکوٰۃ کی رقم یا صدقہ فطر اپنے کسی ہاشمی رشتہ دار یا اس کے آزاد غلام کو دے دیں۔ یہ رقم لا محالہ کسی غیر ہاشمی مسلمان کو ہی دینی ہوگی۔

صدقہ کے کھجور آئے ہوئے پڑے تھے۔ جگر گوشہ رسول اللہ ﷺ حضرت حسن رضی اللہ عنہ بچے تھے۔ انہوں نے ایک کھجور منہ میں رکھ لیا۔ جیسے ہی سرکار دو عالم ﷺ کی نظر پڑی لخت جگر کو تنبیہ فرماتے ہوئے ارشاد ہوا:

کخ کخ اما شعرت انا لانا کل الصدقہ

”اے خٹو۔ اے خٹو۔ تمہیں اتنی تیز نہیں کہ ہم صدقہ نہیں کھایا کرتے۔“

① جن کو مولیٰ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ عربوں کا حوصلہ یہ تھا کہ وہ اپنے مولیٰ کو بھی اپنے خاندان کا فرد سمجھا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے سوال کو یہی حیثیت دی ہے۔ ارشاد ہے: ان الصدقہ لاتحل لنا وان موالی القوم من انفسہم۔ ترمذی شریف ص ۸۳ ج ۱، ابوداؤد شریف ص ۲۴۰ ج ۱ و حذافی النسانی ص ۳۶۶ ج ۱

② پیدائش نصف رمضان سنہ ۳ھ (تاریخ الخلفاء) آنحضرت ﷺ کی وفات کے وقت تقریباً ساڑھے چھ سال عمر تھی۔

③ بخاری شریف ص ۲۰۲، تاریخ الباری

لوگ حیران ہیں کیا جا رہے؟ خلاف معمول اس طرح تیزی سے کیوں تشریف لے گئے ابھی کوئی دریافت نہیں کرنے پایا تھا کہ آپ نے خود ہی فرمادیا: مجھے نماز پڑھتے ہوئے یاد آیا^① کہ کچھ چاندی رکھی ہوئی ہے۔ مجھے گوارا نہیں کہ شام کا وقت ہو اور چاندی میرے پاس رہے (ایک روایت میں یہ ہے کہ چاندی میرے گھر میں رات گزارے) لہذا میں کہہ آیا ہوں کہ اس کو تقسیم^② کر دیں۔^③

یہ احساس لطیف کی نزاکت ہے کہ عصر کا وقت ہے۔ شام ہونے اور رات آنے میں کافی دیر ہے۔^④ مگر یہ دیر بھی دیر نہیں معلوم ہوئی۔ گویا دولت کی آلودگی سے جس قدر جلد ممکن ہو دامن پاک ہو جائے۔ یہ تھوڑی سی چاندی کا معاملہ تھا ممکن ہے دو تین تولہ ہی ہو مگر دولت کے بڑے سے بڑے انبار کے متعلق بھی آپ کا جذبہ یہی تھا۔

ایک دن کا واقعہ ہے رات کی چاندنی میں آپ تشریف لے جا رہے تھے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے۔ سامنے احد کا پہاڑ تھا۔ آپ نے فرمایا اگر احد پہاڑ کی برابر سونا میرے پاس ہو تو میری خوشی یہ ہوگی کہ تین راتیں نہ گزرنے پائیں کہ وہ سب راہ خدا میں خرچ ہو جائے۔ ایک دینار بھی میرے پاس باقی نہ رہے بجز اس دینار کے جو کسی مطالبہ کو ادا کرنے کے لئے محفوظ رکھنا پڑے۔^⑤

زندگی بھر درہم و دینار کو یہ سعادت میسر نہ ہوئی کہ کاشانہ نبوت میں رات گزار سکے۔ بعد وفات کے لئے ارشاد ہوا:

لا تقسم و رثتی دیناراً و لاد رہباً۔ ماترکت بعد نفقة نسائی و موتته عاملی فہو صدقہ^⑥

(یعنی) یہ تو ہو گا ہی نہیں کہ میرے وارث دینار یا درہم تقسیم کر سکیں۔ (البتہ کچھ جائیدادیں میری تحویل میں ہیں۔ تو) ازواج کے نفقہ اور کارندے کے حق المحت کے علاوہ جو کچھ میرا ترکہ ہو وہ صدقہ ہے۔“

① نماز میں کسی بات کا یاد آ جانا غیر اختیاری ہے اور یہ بھی فطری بات ہے کہ انسان کا ذہن اور دماغ ہر وقت کام کرتا رہتا ہے۔ لہذا فطری اور غیر اختیاری پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ البتہ نماز سے غافل ہو کر خیال میں مصروف اور مشغول نہ ہو جانا چاہئے۔ اس خیال کو ہٹا کر نماز ہی کی طرف دھیان لگا دینا چاہئے۔ سنت مبارکہ کی تعلیم یہی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

② ضرورت مند اور مستحق لوگوں کی کمی نہیں تھی۔

③ بخاری شریف ص ۱۶۳ و ص ۱۱۷

④ سلک احتاف کے بموجب گرمیوں میں تقریباً دو گھنٹے اور حضرات شوافع کے مسلک کے بموجب دوسرے مثل ہی میں عصر کی نماز پڑھی گئی تھی تو ابھی تقریباً ایک تہائی دن باقی تھا۔ مگر الفاظ حدیث (کہرت ان پیسو ادیبیت عندنا) بخاری شریف ص ۱۶۳ سے وی متاثر ہے جس سے مسلک احتاف کی تائید ہوتی ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

⑤ بخاری شریف ص ۹۵۳ و ص ۳۲۱ وغیرہ

⑥ بخاری شریف ص ۳۸۹

رازدرون پردہ گد اران کی کیفیت :

ان تمام پابندیوں اور احتیاطوں کے بعد اندرون نشین کیا حالت رہا کرتی تھی۔ ذرا جھانک کر دیکھو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب بھی میں کھانا کھانے بیٹھتی ہوں، طبیعت ایسی بھر آتی ہے کہ اگر چاہوں تو خوب رو سکتی ہوں۔ مجھے وہ حالت یاد آ جاتی ہے جو آنحضرت ﷺ کی موجودگی میں رہی۔ یہاں تک کہ ایسی حالت میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ خدا کی قسم کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ دونوں وقت آپ روٹی اور گوشت سے شکم سیر ہوئے ہوں۔^①

میدہ آپ نے عمر بھر نہیں دیکھا۔ کبھی آپ کے لئے چپاتی نہیں پکائی گئی۔ جو کا آنا بھی بے چھنا پکنا تھا، یہی خوراک تھی۔ اس پر بھی دو دو ماہ گزر جاتے تھے کہ چولہے میں آگ نہیں جلتی تھی۔ دو کالی چیزیں یعنی کھجور اور پانی غذا ہوا کرتی تھیں، البتہ انصاری پڑوسی دودھ بھیج دیا کرتے تھے۔^② حضرت انس رضی اللہ عنہ (آنحضرت ﷺ کے خادم خاص) فرماتے ہیں: گھر کے آدمی نو تھے۔ دن رات کے خرچ کیلئے ان سب کے واسطے صرف ایک صاع^③ ہوتا تھا اور ایسا بھی ہوا کہ آپ نے یہودی کے یہاں زرہ رہن رکھ کر جو منگوائے اور ایسا بھی ہوا میں آنحضرت ﷺ کے لئے جو کی روٹی اور باسی چربی لے گیا۔^④ اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔

بچانے کا گد اچڑے کا تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی،^⑤ اکثر کھڑے چارپائی پر آرام فرماتے تھے۔ چٹائی کے پٹھے جسم مبارک میں گڑ جایا کرتے تھے۔^⑥ وفات ہوئی تو زرہ ایک یہودی کے یہاں^⑦ تیس صاع جو کے عوض میں رہن تھی۔^⑧

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک موٹا کبیل پیوند لگا ہوا اور ایک موٹے کپڑے کی لنگی نکال کر ہمیں دکھائی اور فرمایا ان دو کپڑوں میں رسول اللہ ﷺ کی روح قبض ہوئی۔^⑨

① ترمذی شریف ص ۲۵۸

② بخاری شریف ص ۹۵۶

③ ازواج مطہرات۔ دسویں خود آنحضرت ﷺ

④ ایک صاع کا وزن دو سو ستر تولہ (تین سو چھ چھانک) تقریباً ۲ کلوچھ ۶ سو گرام

⑤ بخاری شریف ص ۳۳۱

⑥ بخاری شریف ص ۹۵۶

⑦ بخاری شریف ص ۳۳۵

⑧ تیس صاع تقریباً ڈھائی من

⑨ بخاری شریف ص ۳۰۹ و شاکل ترمذی شریف

⑩ بخاری شریف ص ۸۱۵ ترمذی شریف ص ۲۰۶ ج ۱

وفات کے بعد ترکہ یہ تھا: (ضروری) اسلحہ، ایک خنجر، قطعہ آراضی جس کو صدقہ کر دیا تھا۔^①

ایک معمرہ :

سنہ ۷ھ میں خیبر فتح ہوا۔ اس کے بعد ازواج مطہرات کے نفقے مقرر کر دیئے گئے۔ ہر ایک خاتون کا سالانہ نفقہ اسی (۸۰) دسق کھجور اور بیس دسق جو^②۔ ایک دسق ۲ کا وزن پانچ من ڈھائی سیر۔ اس حساب سے اسی دسق کھجور چار سو پانچ من اور بیس دسق جو ایک سو ایک من دس سیر۔ کھجور اور جو کا جو بھی نرخ مانا جائے۔ جب ایک شخص کی خوراک کے لئے مہینہ میں ایک من اور سال بھر میں بارہ من جو یا کھجور بہت کافی ہوتے ہیں تو یہ کئی سو من کی مقدار فاضل ہی تھی۔ اس کے ذریعہ زندگی بہت خوش حال بن سکتی تھی پھر یہ تنگی کیوں تھی؟ جواب: کوئی حساب داں اس معمرہ کو حل نہیں کر سکتا۔ قرآن حکیم نے اس کا جواب دیا ہے۔ جب صحابہ کرام کی شان یہ بیان فرمائی:

وَيُؤْتُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (سورہ حشر-۹)

” (ضرورت مندوں کو) اپنے اوپر مقدم رکھتے ہیں باوجودیکہ خود ان کو شدید ضرورت ہوتی ہے۔“

اور اللہ کے پاک بندوں کی یہ شان بیان فرمائی:

وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا (الدر-۸)

”اور کھلاتے ہیں کھانا اس کی محبت پر (جب کھانا خود ان کو بھی محبوب ہوتا ہے اور وہ خود بھی ضرورت مند ہوتے ہیں) مسکین کو، یتیم کو اور قیدی کو۔“

ان آیات کو سامنے رکھتے ہوئے اگر عوام کی اقتصادی حالت معلوم ہو جائے تو معمرہ حل ہو جائے گا۔

عوام کی حالت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا گیا تو آپ کا مع اہل و عیال یومیہ وظیفہ نصف بکری^③ مقرر کیا گیا تھا کیونکہ متوسط درجہ کے مہاجر کی یومیہ آمدنی کا اوسط یہی تھا یہ آمدنی فی کس نہیں بلکہ فی گھر تھی۔

① بخاری شریف ص ۲۱۳

② ایک دسق ساٹھ صاع کا اور ایک صاع ۳ سیر چھ چھانک (۲۷۰ تولہ)

③ تاریخ الخلفاء ص ۵۸ چٹائی بخوالہ طبقات ابن سعد

مقرر کئے تو اسی نسبت سے یعنی فی کس پانچ درہم یومیہ۔^①

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ: فضائل، خدمات اور مناصب کا لحاظ کرتے ہوئے وظائف مقرر فرمائے جو بارہ ہزار درہم^② سالانہ تک تھے۔ جہاں تک عام مسلمانوں کا تعلق تھا تو یہ ضابطہ مقرر کر دیا کہ جیسے ہی بچہ پیدا ہوا اس کا وظیفہ جاری کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ یمن کا علاقہ زرخیز تھا تو وہاں یہ حالت ہو گئی کہ ایسے ضرورت مند نہ رہے جن کو زکوٰۃ دی جاسکے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ یمن کے والی (گورنر) تھے انہوں نے جو زکوٰۃ و صدقات کی رقمیں وصول کیں ان کا ایک تہائی مرکز بیت المال (مدینہ) میں بھیجا مگر بجائے مبارکباد کے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی جانب سے تنبیہ نامہ پہنچا:

”آپ کو یمن اس لئے نہیں بھیجا گیا کہ وہاں سے چندہ یا جزیہ وصول کر کے یہاں بھیجیں۔ آپ کو اس لئے بھیجا گیا ہے کہ وہاں کے اہل استطاعت سے زکوٰۃ و صدقات وصول کریں اور اسی علاقہ کے ضرورت مندوں پر تقسیم کر دیں۔ پھر آپ نے یہ رقم کیسے بھیجی؟“

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھا:

سب کو دے دیا گیا جب یہاں کوئی لینے والا نہ رہا تو یہ فاضل رقم بھیج دی۔“

اگلے سال حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے نصف اور تیسرے سال زکوٰۃ کی پوری رقم مرکزی بیت المال میں بھیج دی اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مرتبہ بھی اتنی سختی سے لکھا تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا دو لفظی جواب یہ تھا۔

ما وجدت احدا يأخذ مني شيئا^③

کوئی نہیں ملا جو مجھ سے کچھ لے لے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا دور شروع ہوا تو مدینہ کی یہ حالت ہو گئی کہ لوگ زکوٰۃ کی رقم لئے پھرتے تھے اور کوئی شخص ایسا نہیں ملتا تھا جو اسے قبول کر لے۔

سنہ ۷ھ میں خیبر فتح ہوا تھا۔ اس وقت سے اسلامی مملکت اس قابل ہوئی تھی کہ کسی درجہ پر مالی نظام قائم ہو سکا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا دور خلافت سنہ ۲۳ھ سے شروع ہوا اس سولہ سال کے عرصہ میں پوری مملکت کی یہ حالت ہو گئی کہ غربی کا نام و نشان نہیں رہا۔^④ ساتھ ساتھ تعمیرات

① کتاب الاموال لابی عبیدہ حدیث ۶۳۶ ص ۶۳۔

② حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارہ ہزار درہم سالانہ باقی تمام ازواج کے دس دس ہزار۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور تمام مہاجرین کے جو غزوہ بدر میں شریک تھے پانچ پانچ ہزار۔ حضرات انصار جو بدر میں شریک تھے ان کے چار چار ہزار (کتاب الاموال لابی عبیدہ حدیث ۵۳۹ صفحہ ۲۲۳)

③ کتاب الاموال لابی عبیدہ حدیث ۱۹۱، صفحہ ۵۹۶۔

④ اس نظام کی بنیادیں اتنی مضبوط تھیں کہ شدید خانہ جنگی کے باوجود خوشحالی کا دور دورہ رہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت یعنی خلافت راشدہ کے تیس سال ختم ہونے کے بعد اگرچہ وصول اور خرچ کے بارہ میں وہ احتیاط باقی نہیں رہی

اور جب متوسط درجہ کے مہاجرین کی یہ آمدنی تھی تو غریبوں کی آمدنی کا اوسط تو فی گھر اس سے بھی کم ہو گا جس کا لازمی تقاضا عمومی افلاس تھا۔ پس عمومی افلاس اور عوام کی خستہ حالی اس معمرہ کا حل ہے۔ اسکی وضاحت حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے اس واقعہ سے ہوتی ہے:

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں جب از سر نو وظائف مقرر کئے تو ہر ایک زوجہ مطہرہ کا سالانہ وظیفہ دس ہزار درہم مقرر کیا۔ ام المومنین حضرت زینب بنت جحش (رضی اللہ عنہا) کے یہاں یہ رقم پہلی مرتبہ پہنچی تو فرمایا: اللہ تعالیٰ امیر المومنین پر رحم فرمائے۔ یہ رقم میرے پاس بھیجی حالانکہ میری سہیلیوں میں ایسی ہیں جو مجھ سے زیادہ باہمت ہیں وہ زیادہ مستعدی سے اس رقم کو تقسیم کر سکتی تھیں۔

جب پیش کرنے والوں نے کہا: محترمہ! یہ تقسیم کرنے کے لئے نہیں ہیں یہ تو آپ کے جیب خرچ کے لئے ہیں تو فرمایا: اچھا یہاں ڈال دو۔ ان کو رکھو اگر ان پر کپڑا ڈلوادیا۔ اور اپنی خادمہ سے فرمایا: کپڑے کے نیچے ہاتھ ڈال کر فلاں خاندان کے لئے رقم نکالو۔ فلاں خاندان کے لئے نکالو۔ اسی طرح خاندان شار کرتی رہیں اور ان کے لئے رقومات علیحدہ کرائی رہیں۔ خادمہ نے کہا: سیدہ میں بھی تو حاضر ہوں کچھ میرے لئے بھی، فرمایا: جو کچھ کپڑے کے نیچے رہ گیا ہے وہ تمہارا ہے۔

خادمہ نے کپڑا اٹھایا تو صرف پچاسی درہم باقی تھے۔ وہ اس کو عطا فرمادیئے۔^①

یہ تھا اسلامی سوشلزم، اگر اس کو سوشلزم کہا جاسکتا ہے جو تقسیم دولت کا قانون نہیں بنواتا بلکہ دلوں میں دولت سے نفرت اور غریبوں کی ہمدردی کا وہ جذبہ بھر دیتا ہے کہ ان کو اطمینان جب ہی ہوتا ہے جب پوری دولت تقسیم ہو جائے اور امیر غریب کی سطح پر آجائے۔ اسی کو تزکیہ کہا جاتا ہے کہ بخل، حب مال اور حرص و طمع کے جراثیم سے وہ پارہ گوشت پاک و صاف ہو جائے جس کو دل کہا جاتا ہے۔

نتیجہ:

یہ بحث بظاہر بے محل ہے مگر جب شروع ہو گئی تو اب یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ یہ اقتصادی نظام جس کی بناء مساوات پر رکھی گئی تھی جس کے لئے دولت مند غریب کی سطح پر آجاتے تھے وہ کتنی جلد کامیاب ہوا اور کیسا کامیاب ہوا۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا وظیفہ یومیہ نصف بکری معین کیا گیا تھا یعنی پانچ درہم یومیہ۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دو سالہ دور خلافت میں درجہ رجسٹر مسلمانوں کے وظائف

پنچاقتی قسم کے کچھ قاعدے اصول متعارفہ کے طور پر رائج تھے جو عام طور پر تسلیم کئے جاتے تھے۔ ان کے بموجب قتل کی بعض صورتوں میں ”قصاص“ ہوتا تھا۔ یعنی جان کے بدلے جان بعض صورتوں میں جان کے بدلے جان نہیں بلکہ دیت لازم ہوتی تھی۔ دیت کے سوا وراثت مقرر تھے۔ دیت اور بعض صورتوں میں ”خون بہا“ صرف قاتل یا قاتل کے اہل خانہ سے وصول نہیں کیا جاتا تھا بلکہ قاتل کی سوسائٹی سے وصول کیا جاتا تھا۔ جس کو عاقلہ کہتے تھے۔ اس کی حدود ہوتی تھیں اس میں (سوسائٹی میں) قاتل کے قبیلے کے آدمی بھی ہوتے تھے۔ حلیف قبیلوں کو بھی اس میں شریک ہونا پڑتا تھا اور معاہدات میں یہ طے ہوتا تھا کہ اگر دیت لازم ہو تو کس قبیلہ کو دیت میں کتنا حصہ لینا ہو گا۔ ان شرائط کو جو قصاص، خون بہا اور دیت کے متعلق ہوا کرتی تھیں ان کو ”معادل“ کہا جاتا تھا۔

(۲)

قریشی حضرات جو ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے ایک نیا عنصر تھے۔ اگرچہ حضرات انصار نے ان کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا اور اس طرح کی اور مدنی مسلمانوں کا ایک گروپ بن سکتا تھا جو ایک نئی سیاسی اور مذہبی پارٹی کی حیثیت میں رونما ہوتا؟ مگر رحمت عالم ﷺ نے یہ صورت اختیار نہیں فرمائی۔ یہ گروپ ایک وزن رکھتا تھا اور اگر صرف سیاسی انقلاب مقصود ہوتا تو یہ گروپ کار آمد ہو سکتا تھا لیکن جس کا نصب العین دعوت الی اللہ تھا وہ اس جتھہ بندی کو پسند نہیں کر سکتا تھا۔ حضرات انصار یعنی قبیلہ اوس اور قبیلہ خزرج کے جو افراد مسلمان ہوئے تھے ان کے پورے قبیلے اور کتنے بطن مسلمان نہیں ہوئے تھے اور بہت سے وہ تھے کہ ان کے گھر کے بھی سب آدمی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ وہ سابق مذہب پر قائم تھے۔ اس طرح کی جتھہ بندی آپس میں تصادم اور مقابلہ کی شکل پیدا کر دیتی جس کا نتیجہ فساد فی الارض اور قطع ارحام ہوتا جو اسلام میں بدترین جرم ہے۔

جتھہ بندی اور علیحدگی کے برخلاف رحمت عالم ﷺ نے اتفاق و اتحاد اور میل ملاپ کا راستہ اختیار کیا۔ آپ نے اس علاقہ کے تمام باشندوں میں خیر سگالی اور تعاون و امداد باہمی کی روح پیدا کرنی چاہی۔ مواخات جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے اس کی پہلی کڑی تھی۔ جس سے آپ نے مہاجرین اور انصار میں نہ صرف تعاون اور خیر سگالی کا رشتہ قائم کیا بلکہ انصار اور مہاجرین کو بھائی بھائی بنا دیا۔

یثرب میں ایک فرقہ مشرکین کا تھا جو قریش مکہ کا ہم مذہب تھا اور قریش مکہ اس کو آسانی سے اپنا آلہ کار بنا سکتے تھے۔ دوسرا فرقہ یثرب کے قرب و جوار میں یہود کا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے حضرات مہاجرین کا رابطہ ان سے بھی قائم کر دینا چاہا۔

کا سلسلہ شروع ہوا تو وہی مدینہ جس میں قبہ دار پھاٹک ناپسند فرمایا گیا تھا اب اس کی تعمیرات محدود علاقہ سے آگے بڑھ کر کوہ سلح تک پہنچ گئیں۔ جو احد کے قریب مدینہ سے تقریباً چار میل کے فاصلہ پر ہے۔

تیسرا کام: قریش و اہل یثرب کا معاہدہ

یہود سے مصالحت

(۱)

یثرب و مضافات یثرب (مدینہ) اس عرب کا ایک علاقہ تھا جہاں نہ کوئی حکومت و سلطنت تھی نہ فوج اور پولیس۔ پورا عرب آزاد و خود سر قبائل کا ایک وسیع جنگل تھا۔ وہاں صرف معاہدات کا ایک نظام تھا۔ وہی قبائل کو جوڑتا تھا اور وہی حفاظت کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ دو قبیلوں میں اگر جنگ ہو گئی تو وہ ان قبیلوں تک ہی نہیں رہتی تھی بلکہ ان کے حلیف اور معاہدہ قبیلے میدان میں اتر آتے تھے۔ اس طرح دو قبیلوں کی لڑائی دو نظاموں (دو قبائلی گروپوں) کی لڑائی بن جاتی تھی۔

یثرب کے دو قبیلے اوس و خزرج کے افراد مسلمان ہوئے تھے ان کے بھی معاہدات تھے۔ یثرب کے قریب (بنو قریظہ، بنو نضیر وغیرہ) یہود کے جو قبائل آباد تھے ان معاہدات میں شریک تھے۔ بنو قریظہ، قبیلہ اوس کے حلیف تھے۔

ان معاہدات میں جس طرح دفاع کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ حملہ آور کا مقابلہ آپس کی متحدہ طاقت سے کریں گے اسی طرح یہ بھی ہوتا تھا کہ اگر حلیف قبیلہ کا کوئی شخص کسی کو قتل کر دے تو اس کی تلافی کی کیا صورت ہوگی۔

تھی مگر جو اقتصادی ساکھ قائم ہو چکی تھی وہ قائم رہی۔ جس کی ایک مثال یہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت سے تقریباً ستاون سال بعد جب حضرت عمر بن عبدالعزیز (التوئی رجب سنہ ۷۰ھ، ۷۰۷ء) نے نظام حکومت اپنے ہاتھ میں لیا تو آپ نے عبدالحمید بن عبدالرحمن (گورنر عراق) کو حکم بھیجا کہ وہ طائف مقررہ ادا کر دیں۔ گورنر صاحب نے قبیل حکم کے بعد رپورٹ بھیجی کہ تمام وظائف ادا کئے جا چکے ہیں تب بھی کافی رقم باقی ہے۔ دربار خلافت سے حکم صادر ہوا آپ کے صوبہ میں جتنے مقروض ہیں ان کا جائزہ لو اور ان سب کے قرض ادا کر دو جو فضول خرچی کی بنیاد پر مقروض نہ ہوئے ہوں۔ گورنر صاحب نے قبیل کے بعد رپورٹ بھیجی کہ سب مقروض کے قرض ادا کئے جا چکے ہیں تب بھی رقم باقی ہے۔ حکم صادر ہوا جن لوگوں کے نکاح نہیں ہوئے ان کے نکاح کر دیجئے اور مہر اس رقم سے ادا کر دیجئے۔ گورنر صاحب نے اس حکم کی تعمیل کے بعد بھی رپورٹ بھیجی کہ رقم باقی ہے۔ حکم صادر ہوا جو غیر مسلم کا شکار جزیہ ادا کرتے ہیں ان کا جائزہ لیجئے۔ ان کو تقادی کی ضرورت ہو تو ان کی تقادی دیدیجئے کہ وہ آسانی اور سہولت کے ساتھ زمیں بوسکیں۔ (کتاب الاموال لابن عیینہ ص ۲۵۱ حدیث ۱۲۱)

(۳)

مدینہ میں تشریف لانے کے بعد آپ نے جو کام سب سے پہلے کئے ان میں تیسرا کام یہ تھا کہ آپ نے مہاجرین اور ان تمام فرقوں میں بقاء باہم، تعاون اور خیر خواہی اور خیر اندیشی کا رشتہ قائم کرنے کے لئے ایک تحریر مرتب فرمائی اس کو عہد نامہ بھی کہہ سکتے ہیں اور ایک وفاق کا دستور اساسی بھی۔ قریش کہہ کہ تمام کوششوں کو ناکام بناتے ہوئے جس کامیابی کے ساتھ آنحضرت ﷺ اور حضرات مہاجرین مکہ سے نکل کر مدینہ تشریف لائے تھے اور یہاں ایک مرکز کی بنیاد ڈال دی تھی اس نے جس طرح قریش کو چراغ پا کر دیا تھا حتیٰ کہ انہوں نے فوراً ہی اس مرکز کو ختم کرنے کی سازش شروع کر دی تھی اس کا بھی تقاضا تھا کہ حضرات مہاجرین اور باشندگان یثرب و مضافات یثرب کے درمیان تعاون، تحفظ اور بقاء باہم کا عہد و پیمان ہو۔ اس عہد نامہ سے یہ تقاضا بھی پورا ہو رہا تھا۔

(۴)

اس عہد نامہ کا ایک فریق حضرات قریش میں جو ایمان و اسلام سے مشرف ہوئے اور ہجرت کر کے مدینہ میں قیام پذیر ہوئے جن کو عہد نامہ میں المؤمنین والمؤمنات من قریش سے تعبیر کیا گیا ہے، دوسرا فریق اہل یثرب ہیں (کسی مذہبی فرقہ کی بناء پر نہیں بلکہ باشندہ یثرب کی حیثیت سے) ان میں حضرات انصار کے علاوہ وہ بھی شامل ہیں جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اپنے کفر و شرک پر قائم تھے۔ ان میں عبد اللہ بن ابی بن سلول جیسے رؤسا بھی تھے جو کھلم کھلا^۱ آنحضرت ﷺ اور اسلام کی مخالفت کیا کرتے تھے۔

یہود بنو نضیر، بنو قریظہ، بنو قینقاع وغیرہ اہل یثرب نہیں ہیں۔ یہ قبائل یثرب سے باہر مضافات یثرب میں آباد تھے۔ اہل یثرب (اوس اور خزرج) سے ان کے معاہدات تھے۔ ان معاہدات کو آنحضرت ﷺ نے نظر انداز نہیں فرمایا بلکہ ان کو مستحکم اور مضبوط کیا ہے۔ چنانچہ انہیں معاہدات کے واسطے سے ان کو اس عہد نامہ میں شامل فرمایا ہے:

آنحضرت ﷺ کوئی فریق^۲ نہیں ہیں آپ ایک سرپرست ہیں اور اس معاہدہ کے بانی کی حیثیت سے آپ کو مرکزی شخصیت تسلیم کیا گیا ہے اور یہ طے کیا گیا ہے کہ باہمی نزاعات میں آپ

۱ چنانچہ اپنے ہم مشرب یعنی مشرکین مدینہ کو خط لکھا کہ مسلمانوں کو نکال دو یا ان سے جنگ کرو، ورنہ ہم مدینہ پہنچیں گے اور تمہارے جوانوں کو قتل کر دیں گے۔ عورتوں کی آبرو خراب کریں گے (ابوداؤد شریف باب خیر النضیر) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو عہد زریں جلد اول (قریش کی طرف سے یثرب میں مخالف حماز)
۲ ملاحظہ ہو بخاری شریف ص ۶۵۶ و ص ۹۱۶ و ص ۹۲۳ وغیرہ حدیث اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ جس میں مذکر ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک مجمع کو خطاب فرمایا چاہا تو عبد اللہ بن ابی بن سلول نے توہین آمیز انداز سے مخالفت کی۔
۳ جو تمام جہانوں کے لئے رحمت بن کر آیا وہ تو سب کا تھا وہ کسی ایک کا کیسے ہو سکتا تھا۔

کی ذات پاک مرجع ہوگی اور آپ کا فیصلہ آخری ہوگا۔

آپ کی یہ مرکزی حیثیت کسی مادی طاقت کی بنیاد پر نہیں ہے۔ انصار و مہاجرین کی مٹھی بھر جماعت جو آپ کے ساتھ تھی یہ طاقت نہیں رکھتی تھی کہ مشرکین یثرب اور قبائل یہود کو اس پر مجبور کر دے کہ وہ آپ کو مرکز اور مرجع تسلیم کریں۔ یہ آپ کی پر تقدس شخصیت کا اعجاز تھا کہ مخالفین کے قلوب بھی اس اعتراف پر مجبور ہو گئے کہ آپ سے صرف سچائی، انصاف اور ہمدردی و خیر خواہی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ آپ جیسا شخص کاذب و ظالم نہیں ہو سکتا۔ آپ کی اسی مقبولیت نے جو چند روز میں حاصل ہو گئی تھی آپ کو مرجع اور مرکز بنایا اور آپ کی اسی مقبولیت نے ان کا بھی وزن بڑھا دیا جو آپ کے جاں نثار تھے۔ پھر اس معاہدہ کے ایک ایک لفظ پر نظر ڈالنے کوئی بات بھی ایسی نہیں جس کا انکار کیا جاسکے۔ سچائی، تقویٰ اور نیک کردار کی تاکید بار بار کی گئی ہے جس سے انکار کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا۔

سرپرستانہ حیثیت کے علاوہ (جو نزاع کے وقت مرجع بنے گی) اور کوئی اختیار آپ نے اپنے لئے منظور نہیں کرایا۔

دنیا کی تاریخ نے اس عہد نامہ کو یہ اہمیت دی ہے کہ اس کو ”اقدام دستور مسجل فی العالم“ (دنیا میں بنیادی حقوق کی سب سے پہلی باقاعدہ دستاویز) بھی کہا گیا۔ لہذا ہم اس کو بجنسہ نقل کرتے ہیں۔ اردو داں حضرات کی آسانی کے لئے ہر ایک فقرہ کے سامنے اس کا ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ فقروں کے شروع میں نمبر عہد نامہ میں نہیں ہیں۔ یہ مترجم کا اضافہ ہے تاکہ منشاء اور مفہوم پوری طرح واضح ہو جائے۔ اس عہد نامہ کی حیثیت ابن ہشام نے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

قال ابن اسحاق و کتب رسول اللہ ﷺ کتاباً بین المہاجرین والانصار و ادم فیہ یہود و عاہدہم و اقراہم علی دینہم و اموالہم علیہم و شرط و اشتراط لہم (ترجمہ: فن مغازی کے امام علامہ ابن اسحاق نے بیان فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے ایک کتاب (تحریر) لکھی۔ مہاجرین اور انصار کے درمیان اس تحریر میں یہود سے بھی مصالحت کی صورت اختیار کی۔ ان سے معاہدہ کیا اور ان کو اپنے دین پر قائم رکھا اور جو جائیدادیں ان کی تھیں ان پر قائم رکھا۔ کچھ شرطیں ان پر لگائیں اور کچھ شرطیں ان کے لئے تسلیم کیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(۱) ہذا کتاب من محمد النبی رسول اللہ بین البومنین والمسلمین من قریش و اہل یثرب ومن تبعہم فلحق بہم و جاہد معہم
”یہ تحریر ہے محمد اللہ کے نبی کی طرف سے جو اللہ کے رسول ہیں قریش کے مومنین و مسلمین

بہا اور دیت کے متعلق جو ان کا دستور ہے اور جو ان کے معاہدات ہیں وہ بدستور رہیں گے۔ ان کا کوئی شخص قید ہو جائے گا تو اس کا فدیہ وہ خود ادا کریں گے۔ یہ تمام باتیں اسی طرح ہوں گی کہ مسلمانوں کے ساتھ بھی عام دستور کے مطابق بھلائی اور انصاف کا معاملہ کیا جائے گا۔

(۵) ان المومنین لایترکون مفرجاً^۱ ان یعطوا بالمعروف فی فداء وعقل
یہ کہ مسلمان کسی ایسے شخص کو جو قرض میں دبا ہوا اکثر اللعیال ہو اس بات سے نہیں چھوڑیں گے (محروم نہیں کریں گے) کہ اس کو اچھی طرح عطیہ دیں۔ فدیہ یا دیت کے سلسلہ میں^۲

(۶) وان لایحالف مومن مومن مومن دونہ
اور یہ کہ کسی مسلمان کو یہ حق نہیں ہو گا کہ وہ کسی مسلمان کو نظر انداز کر کے اس کے حلیف سے معاہدہ کر لے (جو مسلمان پہلے سے حلیف ہے اس کو بھی اس معاہدہ اور عہد و پیمان میں شریک رکھنا ہو گا)

(۷) وان المومنین المتقین ایذیہم علی کل من بغی منهم اذابتغی^۳ دسیعۃ ظلم۔ اواثم
اوعدوان اوفساد بین المومنین وان ایذیہم علیہم جیبعا ولوکان ولدا احدہم
اور یہ کہ اہل تقویٰ مومنین سب کی طاقت متحد رہے گی، اس شخص کے مقابلہ میں جو ان سے بغاوت کرے (ان پر ظلم و زیادتی کرے) یا ظالمانہ طریقہ پر ان سے وصول کرنا چاہے، یا مسلمانوں کے آپس میں گناہ، ظلم یا فساد پھیلانا چاہے۔ ایسے شخص کے مقابلہ میں ان کی طاقت متحد رہے گی خواہ (وہ ظالم) کسی کا اپنا لڑکا ہی ہو۔

(۸) ولایقتل مومن مومنائی کافر ولا یتصر کافر علی مومن
”یہ کہ کوئی مومن کسی مومن کو کسی کافر کی حمایت^۴ میں قتل نہیں کرے گا۔ نہ کسی کافر کی

^۱ البغیر المقتل من الدین الکثیر والعیال (ابن ہشام ص ۳۰۲ ج ۱)

^۲ یعنی اگر کوئی مفروض اور کثیر العیال مسلمان ہو اور اس پر کسی سلسلہ میں فدیہ یا دیت لازم ہو جائے تو مسلمانوں کو حق ہو گا کہ وہ اچھی طرح اس کی امداد کریں اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کریں جو عام مسلمانوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو اس امداد کا حق ہو گا اس پر کسی کو اعتراض کرنے کا موقع نہیں ہو گا۔ (واللہ اعلم)

^۳ ای اذبتغی منهم ان یدفعوا الیہ علی وجہ ظلمہم ای کونہم مظلومین (صحیح البخاری)

^۴ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے مشہور رئیس، دشمن اسلام امیہ بن خلف سے کاروباری سلسلہ میں معاہدہ کئے ہوئے تھے۔ غزوہ بدر میں حضرات انصار نے امیہ بن خلف کا تعاقب کیا۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اس کو بچانا چاہا اس میں خود ان کو بھی تلوار لگ گئی اور زخمی ہو گئے مگر مجاہدین انصار نے امیہ کو قتل کر دیا۔ (بخاری شریف ص ۳۰۸) اب اگر امیہ کے حامی ان انصار سے قتل امیہ کا بدلہ لینا چاہتے (جیسا کہ قاعدہ تھا، بلکہ ضروری سمجھا جاتا تھا) اور اس سلسلہ میں معاہدہ کی بنا پر یا کسی اور تعلق کی بنا پر حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ سے مدد چاہتے تو معاہدہ کی اس دفعہ کے بموجب حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کے لئے جائز تھا کہ وہ حامیانہ امیہ بن خلف کی امداد کرتے۔ اس دفعہ کے معنی یہ بھی لئے گئے ہیں کہ کوئی مسلمان کسی مسلمان کو کسی کافر کے مقابلہ میں قتل کرنے کا مجاز نہ ہو گا۔ مگر اس مفہوم کے لئے لفظ ”کافر“

اور اہل یثرب کے درمیان اور جو ان کے^۱ تابع ہیں اور ان سے الحاق کئے ہوئے ہیں۔ اور کوشش و جدوجہد میں ان کے ساتھ ہیں۔

(۲) اثمہم امة واحدة دون الناس

”یہ کہ یہ سب (اپنے ماسوا) تمام انسانوں کے مقابلہ میں ایک امت^۲ ہونگے“

(۳) البہاجون من قریش علی ربعتہم۔^۳

”قریش کے وہ افراد جو ہجرت کر کے آئے ہیں وہ اپنے حال پر بدستور رہیں گے۔ ان کی آزادی اور ان کے حقوق بدستور رہیں گے۔“

یتعاقلون بینہم دھم تعدون عانیہم بالمعروف والقسط بین المسلمین

”قصاص و خون بہا اور دیت کے متعلق جو ان کا دستور ہے اور جو ان کے معاہدات ہیں وہ بدستور رہیں گے ان کا کوئی شخص قید ہو گا تو اس کا فدیہ وہ خود ادا کریں گے (کوئی حلیف اس کا ذمہ دار نہیں ہو گا) یہ تمام باتیں اس طرح ہوں گی کہ مسلمانوں کے ساتھ بھی عام دستور کے مطابق بھلائی اور انصاف کا معاملہ طے کیا جائے گا۔“

(۴) وبنوعوف علی ربعتہم یتعاقلون معاقلمہم الاولیٰ کل طائفة تغدی عانیہا بالمعروف والقسط بین المومنین۔

بنو عوف کی آزادی اور ان کے حقوق بدستور رہیں گے۔ قصاص، خون بہا اور دیت کے متعلق جو ان کا دستور ہے اور جو ان کے معاہدات ہیں وہ بدستور رہیں گے۔ ان کا کوئی شخص قید ہو گا تو اس کا فدیہ وہ خود ادا کریں گے۔ یہ تمام باتیں اس طرح ہوں گی کہ مسلمانوں کے ساتھ عام دستور کے مطابق بھلائی اور انصاف کا معاملہ کیا جائے۔

پھر اسی طرح قبائل بنو الحارث، بنو ساعدہ، بنو جشم، بنو النجار، بنو عمرو بن عوف، بنو بنیت، بنو الاوس کے نام لئے گئے ہیں اور ہر ایک قبیلہ کے نام کے ساتھ یہ صراحت کر دی گئی ہے جو مہاجرین اور بنو عوف کے لئے کی گئی ہے کہ ان کی آزادی اور ان کے حقوق بدستور رہیں گے۔ قصاص۔ خون

^۱ نحوی قاعدہ کے لحاظ سے مطلب یہ ہو گا کہ جو اہل یثرب کے تابع اور ان کے ساتھ ہیں۔ اسی عہد نامہ کے دوسرے حصہ میں یہود کا تذکرہ ہے اس میں یہود بنی النجار، یہود بنی الحارث وغیرہ کے الفاظ میں جن سے اس کی تائید ہوتی ہے یعنی بنی النجار کے ساتھ جو یہود ہیں انہیں یہود بنی النجار کہا گیا ہے باقی دوسری صورت کہ یہ معنی لئے جائیں کہ جو یہود مسلمانوں کے تابع ہیں وہ نحوی لحاظ سے بھی صحیح نہیں ہیں اور عہد نامہ کے سیاق اور پرداخت کے بھی مخالف ہے۔ علاوہ ازیں جو یہود مسلمانوں کے ساتھ ہوں ان کو ایک علیحدہ فقرہ (۱۱) میں بیان کیا گیا ہے۔

^۲ گر وہ، قوم، جماعت یعنی اگر مذہبی آزادی حاصل رہے تو مسلمان دوسری قوم یا گروہ کے ساتھ مل کر امہ واحدہ ہو سکتے ہیں۔

^۳ ربعتہم کعبۃ ای حالۃ حسنۃ وامرہم الذی کانوا علیہ (قاموس)

کسی مومن کے مقابلہ میں مدد کی جائے گی۔“

(۹) وان ذمۃ اللہ واحداً یجیر علیہم ادناہم

یہ کہ اللہ کی ذمہ داری (پناہ) ایک ہے (یعنی اللہ کے نام پر جو ذمہ داری لی جائیگی اس کا احترام تمام مسلمانوں پر لازم ہو گا) پناہ دے سکتا ہے مسلمانوں کی ذمہ داری پر سب سے معمولی درجہ کا مسلمان بھی۔^۱

(۱۰) وان البومنین بعضهم مولیٰ بعض دون الناس

اور یہ کہ ہر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا ولی ہو گا (معادہ صلح و جنگ میں شریک ہو گا) یہ ولایت غیر مسلم کو حاصل نہیں ہوگی۔

(۱۱) وانه من تبعنا من یهود فان له النصرا الاسوة غیر مظلومین ولا متناصر علیہم

اور یہ کہ جو یہودی ہمارے ساتھ ہوں گے ان کی مدد کی جائے گی۔ ان کے ساتھ ہمدردی کی جائے گی وہ مظلوم نہیں ہونگے نہ ان کے ساتھ انتقامی کارروائی کی جائے گی۔

(۱۲) وان سلم البومنین واحداً لایسلم مومن دون مومن فی قتال فی سبیل اللہ الاعلیٰ سوا وعدل بینہم

اور یہ کہ مسلمانوں کی صلح ایک ہے۔ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کے بغیر قتال فی سبیل اللہ (راہ خدا میں جنگ) کے سلسلہ میں صلح نہیں کر سکتا مگر اس صورت میں کہ مساوات ہو اور آپس میں پوری طرح انصاف ہو (جب کسی معمولی مسلمان کے عہد و پیمان کو بھی یہ اہمیت ہے کہ وہ سب مسلمانوں کا عہد و پیمان مانا جاتا ہے تو مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ صلح یا عہد و پیمان ایسی صورت سے کرے جس میں حقوق کی مساوات اور سراسر عدل و انصاف ہو۔ اگر اس میں کوتاہی کی ہے تو صرف اپنے حق میں نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کے حق میں کوتاہی ہے) واللہ اعلم

(۱۳) وان کان غازیۃ غزت معنا یعقب بعضها بعضاً^۲

ہونا چاہئے تھا۔ یہاں ”فی کافر“ ہے فی کافر کی صورت میں معنی وہی ہو سکتے ہیں جو ترجمہ میں لکھے گئے۔ علاوہ ازیں میدان جنگ یا دارالحرب میں تو نیکی کی ہے مگر دارالاسلام میں یہ حکم نہیں ہے وہاں اگر مسلمان کسی ذی کو قتل کر دے تو امام اعظم کا مسلک یہی ہے کہ مسلمان کو ذی کافر کے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب

۱ یعنی اگر معمولی درجہ کا مسلمان جو ذمہ دارانہ حیثیت نہیں رکھتا، نہ افسر ہے نہ عہدیدار، عام مسلمان میں سے ایک ہے وہ بھی کسی غیر مسلم کو پناہ دیدے یا اس سے کوئی معاہدہ کر لے تو تمام مسلمانوں پر اس کی پابندی ضروری ہوگی۔

۲ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کے برخلاف ان کے مخالفین کی مدد نہیں کی جائے گی۔

۳ اس کے باوجود افسر اعلیٰ کو مسترد کرنے کا حق نہیں ہے۔ وہ مسترد اسی وقت کر سکتا ہے جب ایسا عہد و پیمان ہو جس میں سراسر معصیت ہے، کسی حرام کو جائز یا حلال کو حرام قرار دے دیا گیا ہو۔ تفصیلات کتب فقہ میں ہیں۔

۴ ای یكون الغزوة بینہم نبیاً فاذا خیر طائفة ثم عادت لم تکلف ان تعید ثانیۃ حتی یعقبہا اخری غیرہا (مجمع البحار تحت کلمۃ عقب)

”اور یہ کہ مجاہدین (غازیوں) کی جو جماعت ہمارے ساتھ (ہمارے نظام کے ماتحت) غزوہ کرے گی اس کا غزوہ نمبر وار ہو گا۔ ایک ہی جماعت (فوج) مسلسل نہیں جائے گی بلکہ اگر ایک مرتبہ جاچکی ہے تو اب دوسری جماعت جائے گی۔ اس کے بعد اپنے نمبر پر یہ جاسکے گی۔“

(۱۴) وان البومنین یمیء بعضهم بعضاً بئانال دماءہم فی سبیل اللہ

”اور یہ کہ مسلمان ایک دوسرے کے برابر ہو گا۔ اس (امتحان کی بنا پر جو پیش آیا ہو گا ان کے خونوں کو اللہ کی راہ میں۔ یعنی جانی قربانی معیار ہے فرق مراتب اسی معیار پر ہو گا جنکی قربانیاں مساوی ہیں ان کا درجہ بھی مساوی ہو گا۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ قبائل میں جو فرق مراتب پہلے تھا اب وہ قابل تسلیم نہیں ہو گا۔ جب تک قربانیاں بھی اس درجہ کی نہ ہوں۔“

(۱۵) وان البومنین المتقین علی احسن ہدی واقومہ

اور یہ مومن متقی بہت بہتر طور و طریق اور نہایت مضبوط اصول پر قائم رہیں گے (اہل ایمان اور اہل تقویٰ کا فرض ہو گا کہ ان کے اطوار بہتر اور ان کے اصول و اخلاق مضبوط ہوں)

(۱۶) وانه لایجیر مشرک مالاً یقریش ولا نفساً ولا یحول دونہ علی مومن

اور یہ کہ کوئی مشرک قریش کے کسی مال کی ذمہ داری نہیں لے گا نہ کسی قریش کی جان کی ضمانت کرے گا (پناہ دیگا) نہ کسی قریش کی حمایت میں کسی مسلمان کے آڑے آئے گا۔

(۱۷) وانه من اعتسب مومنناً قتلاً عن بینۃ فانه قودبھا الا ان یرضی ولا البقتول بالعقل وان

البومنین علیہ کافۃ ولا یحل لہم الا قیام علیہ

جو شخص کسی بے قصور مسلمان کو قتل کر دے جس کا بینہ (باقاعدہ) شہادت موجود ہو تو اس کے قصاص میں ماخوذ ہو گا۔ (جان کے بدلہ جان دینا ہوگی) البتہ اگر مقتول کے وارث خون بہا پر راضی ہو جائیں تو خون بہا دینا ہو گا اور تمام مسلمانوں کو جماعتی حیثیت میں اس اصول کو نافذ کرنا ہو گا جب تک اس پر عمل نہ ہو جائے کسی اور کام میں مشغول ہو جانا مسلمانوں کے لئے درست نہ ہو گا۔

(۱۸) انه لایحل لمومن اقر بئانی ہذۃ الصحیفۃ وامن باللہ والیوم الاخر ان ینصہ محدثاً^۳

۳ چنانچہ پہلے قاتل بنی تمیم، بنی اسد، بنی عامر افضل مانے جاتے تھے اور ان کے مقابلہ میں قبائل جہینہ، مزینہ، مسلم اور غفار کا درجہ کم تھا، مگر چونکہ یہ قبائل پہلے ہی اسلام سے مشرف ہوئے اور حضرات انصار و مہاجرین کے ساتھ خدمات انجام دیں تو آنحضرت ﷺ نے ان کی فضیلت بیان فرمائی۔ ارشاد ہوا: قریش والانصار وجہینہ ومزینہ واسلم وغفار واشجع میرے مددگار ہیں اور اللہ اور رسول ان کے مددگار ہیں۔ اللہ اور رسول کے علاوہ ان قبائل کا اور کوئی مددگار نہیں ہے۔ (بخاری شریف باب ذکر السلم وغفار مزینہ وجہنہ و اشجع ص ۴۹۸)

۴ محدث۔ دال پر زیر جنابت کرنے والا (مجمع البحار) یہ کوئی قتلہ اٹھانے والا سازش کرنے والا بھی ہو سکتا ہے اور بدعتی یعنی کسی بدعت کا ایجاد کرنے والا بھی ہو سکتا ہے اور اگر دال پر زیر ہو تو مراد قتلہ یا بدعت ہوگی اور یہ مطلب ہو گا کہ کسی صاحب ایمان کے لئے جائز نہیں ہو گا کہ کسی قتلہ کو پسند کرے اور اس کو بڑھنے اور پھیلنے کا موجب دے۔ وایوہ الرضا عنہ وصبرہ علیہ واقرا قاعلہ (مجمع البحار)

(متعلقین) کو برباد کر دیا اس بربادی کی ذمہ داری خود اس پر ہوگی۔
(۲۴) پھر یہ چند تشریحی اور توضیحی دفعات ہیں:

(الف) وان جفنة بطن من ثعلبية

(الف) یہ کہ جفنة، ثعلبية کا بطن (ضمنی قبیلہ) ہے۔

(ب) وان لبني الشطينة مثل ماليهود بني عوف وان اليهودون الاثم

(ب) یہ کہ بنی شطنہ کے وہی حقوق ہیں جو یہود بنی عوف کے (تسلیم کئے گئے) اور یہ کہ ہر نیکی اور بھلائی (نصب العین اور اصول کار ہو گا گناہ اور جرم نہیں۔

(ج) وان موالی ثعلبية كانفسهم

(ج) قبیلہ ثعلبہ کے موالی (حلیف آزاد کردہ غلام) کی حیثیت، خود بنی ثعلبہ جیسی ہوگی۔

(د) وان بطانة يهود كانفسهم

(د) یہود کے اہل و عیال ان کے خواص اور ماتحت خاندانوں اور افراد کی حیثیت خود یہود جیسی ہوگی (ان کے وہی حقوق ہونگے جو یہود کے ہیں)۔

(ه) وانه لا يخبر منہم احد الا باذن محمّد

(ه) اور یہ کہ جو جس کے ماتحت یا جس کے ساتھ ہے وہ اس سے علیحدہ نہیں ہو گا مگر محمد ﷺ کی اجازت سے

(۲۵) وانه لا ينحجز على ثار جرح

اور یہ کہ نہیں بندش لگائے گا کوئی زخم کے قصاص (زخم کے بدلے میں زخم) پر ۹۔

(۲۶) وانه من فتك فبنفسه واهل بيته الامن ظلم وان الله على ابھذا

”جو کسی کو بے خبری میں دھوکہ سے مار دے اس کی ذمہ داری خود اس پر ہے، اور اس کے اہل بیت پر، مگر وہ شخص جس نے ظلم کیا ہو اور ہم اللہ کو حاضر ناظر جان کر عہد کرتے ہیں کہ خوبی اور پوری ذمہ داری کے ساتھ ان شرائط پر عمل کریں گے۔“

(۲۷) وان على اليهود نفقتهم وعلى المسلمين نفقتهم

”اور یہ کہ یہود اپنے مصارف کے ذمہ دار ہوں گے اور مسلمان اپنے مصارف کے۔ (جو اس عہد نامے کی شرطوں کو پورا کرتے ہیں، کرنے پڑیں گے۔“

(۲۸) وان بينهم النصرة على من حارب اهل هذه الصحيفة

”اور یہ کہ جو فریق اس معاہدہ میں شریک ہیں وہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے

۹ بطانة الرجل اھلہ وخاصتہ وصاحبہ (قاموس)

۱۰۔ جب کہ توریت کا حکم تھا کہ زخم کے بدلے میں اسی جیسا زخم، اس اصول کو ختم نہیں کیا جائے گا۔

اویوہ وانه من نصرہ او اذاعہ علیہ لعنة الله وغضبه یوم القیمة لا یؤخذ منه صرف ولا عدل اور یہ کہ جائز نہیں ہو گا کسی صاحب ایمان کے لئے جو اس دستاویز کے مضمون کا اقرار کرے اور جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے یہ کہ کسی فتنہ پرداز کی مدد کرے یا کسی فتنہ اٹھانے والے کو پناہ دے (اپنے یہاں ٹھیرائے)۔ اور جو اس کی مدد کرے گا اور اس کو پناہ دے گا (ٹھیرنے کا موقع دے گا) اس پر اللہ کی لعنت خدا کا غضب، قیامت کے روز نہ اس کی توبہ قبول ہو نہ فدیہ (کفارہ) ۱۱

(۱۹) وانکم مہمبا اختلافتم فیہ من شیء فان مردہ الی اللہ والی محمد

اور یہ کہ جب بھی اس عہد نامہ کی کسی بات میں اختلاف کرو تو مرجع اللہ ہو گا اور محمد ﷺ اس کا فیصلہ ذات اقدس محمد ﷺ کے حوالہ ہو گا جو اس عہد نامہ کے بانی اور معاہدہ کرنے والوں کے سرپرست ہیں۔ اور آپ سے ہی فیصلہ کی اپیل ہوگی۔

(۲۰) وان اليهود ینفقون مع البومنین ماداموا محاربین

جب تک کسی جنگ کا سلسلہ رہے تو مصارف جنگ مسلمانوں کے ساتھ یہود کو بھی برداشت کرنے ہوں گے۔

(۲۱) وان یهود بنی عوف امة مع البومنین للیہود دینہم وللمسلمین دینہم۔ موالیہم و

انفسہم الامن ظلم او اثم فانه لا یوقع الانفسہ واهل بیته

اور یہ کہ بنی عوف کے یہودی اور مسلمان ایک امت ہونگے۔ یہود کے لئے ان کا دین ہو گا اور مسلمانوں کے لئے ان کا دین۔ اپنے اپنے مذہبوں میں آزاد رہتے ہوئے تیسرے کے مقابلہ میں ایک متحدہ طاقت ہونگے۔ اور جو ان کے موالی ہیں آزاد کردہ غلام یا ان کے حلیف اور وہ خود ان سب کے لئے یہی ہے (کہ وہ اپنے دین پر) مگر وہ شخص جو ظلم کرے۔ کیونکہ ایسا شخص خود اپنے آپ کو اور اپنے اہل بیت (متعلقین) ہی کو برباد کرے گا۔ (اس بربادی کی ذمہ داری خود اس پر ہوگی)۔

(۲۲) وان لیہود بنی النجار مثل مالیہود بنی عوف

یہود بنی نجار کے لئے بھی وہی شرطیں اور وہی حقوق ہیں جو یہود بنی عوف کے بیان کئے گئے۔

(۲۳) اس کے بعد یہود بنی الحارث، یہود بنی ساعدہ، یہود بنی جشم، یہود بنی الاوس، یہود بنی ثعلبہ کا نام لیا گیا ہے اور ہر ایک کے متعلق یہ الفاظ دہرائے گئے ہیں۔ مثل مالیہود بنی عوف، ان کو وہی حقوق حاصل ہونگے جو یہود بنی عوف کے حقوق ہیں۔

آخر میں یہ ہے:

الامن ظلم او اثم فانه لا یوقع الانفسہ واهل بیته

مگر وہ شخص جو ظلم کرے یا کوئی جرم کرے کیونکہ ایسا شخص خود اپنے آپ کو اور اپنے بیت

۱۱ یہ معنی بھی کئے گئے ہیں کہ نہ اس کی نفل عبادت قبول ہو نہ فرض۔ (مجمع البحار)

ان کے مقابلہ میں جو ان معاہدہ کرنے والوں سے جنگ کریں گے۔“

(۲۹) وان بینہم النصح والنصیحة والبرودون الاثم وانه لایاثم امرعہ بحلیفہ وان النصیر للمظلوم۔
”اور یہ کہ اس معاہدہ کے تمام فریق آپس میں ایک دوسرے کی خیر خواہی کریں گے، ایک دوسرے کو اچھی باتوں کی ہدایت کریں گے، نیک کردار رہیں گے جرم اور گناہ نہیں کریں گے۔ اور یہ کہ کوئی شخص اپنے حلیف کے ساتھ مجرمانہ فعل نہیں کریگا۔ اور یہ کہ مظلوم مستحق مدد ہوگا۔“

(۳۰) وان الیہود ینفقون مع البومنین ما داموا المحاربین
”اور یہ کہ جب تک کوئی جنگ ہوگی تو مسلمانوں کے ساتھ یہود بھی خرچہ جنگ برداشت کریں گے۔“

(۳۱) وان یترب حرام جرفھا لاهل هذه الصیفة
”اور یہ کہ وہ پورا علاقہ جو حدود یترب میں ہے ان سب کے لئے واجب الاحترام (محفوظ علاقہ) ہوگا جو اس عہد نامہ میں شریک ہیں۔“

(۳۲) وان الجار کالنفس غیر مضار ولا اثم
”اور یہ کہ پڑوسی کو خود اپنی جان کی برابر سمجھا جائے گا، نہ اس کو نقصان پہنچایا جائیگا نہ اس کے ساتھ کوئی مجرمانہ فعل کیا جائے گا۔“

(۳۳) وانه لاتجار حرمة الابا ذن اهلها
”اور یہ کہ نہیں حفاظت اور پناہ میں لیا جائے گا کسی خاتون کو مگر اس کے اہل (ذمہ دار) کی اجازت سے“^۱

(۳۴) وانه ماکان بین اهل هذه الصیفة من حدث او اشتجار یخاف فسادہ فان مردہ الی اللہ والی محمد رسول اللہ ﷺ وان اللہ علی اتقی مافی هذه الصیفة وابرة

”اور یہ کہ اس عہد نامہ کے فریقوں کے درمیان جو کوئی نئی بات پیش آئے یا کوئی نزاع ہو جس سے فساد کا خطرہ ہو تو اس میں اللہ اور محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے گا اور یہ کہ ہم سب اللہ کو حاضر و ناظر جان کر عہد کرتے ہیں کہ جو کچھ اس عہد نامہ میں ہے اسکی پوری پابندی کریں گے اور اس کو نیکی اور بھلائی کے ساتھ پورا کریں گے۔“

(۳۵) وانه لاتجار قریش ولا من نصرھا
”اور یہ کہ نہ قریش کو پناہ دی جائے گی نہ اس کو جو قریش کی مدد کرے۔“

(۳۶) وان بینہم النصیر علی من دھم یترب

^۱ مکہ کے مشرکین قریش اس معاہدہ میں داخل نہ تھے۔ لہذا جب صلح حدیبیہ کے بعد ان کی عورتیں مسلمان ہو کر مدینہ منورہ پہنچیں تو ان کو پناہ میں لے لیا گیا۔
^۲ دھمک (غشیک) (القاموس)

”اور یہ کہ اس عہد نامہ کے تمام شریک ایک دوسرے کی مدد کریں گے، اس کے مقابلہ میں جو یترب پر چڑھ آئے (حملہ کرے)“

(۳۷) وانه اذا دعوا الی صلح یصالحوہ ویلبسونه فانہم یصالحوہ، ویلبسونه، وانه اذا دعوا الی مثل ذلک فانہ لہم علی البومنین الامن محارب فی الدین

”اور یہ کہ اس عہد نامہ کے جملہ فریق جب (مسلمانوں کی طرف سے) ان کو کسی کے ساتھ صلح کرنے کی دعوت دی جائے گی وہ صلح کریں گے اور صلح پر عمل کریں گے اور یہ کہ جب مسلمانوں کو اسی جیسی صلح کی دعوت دی جائے تو وہ بھی صلح کریں گے۔ مسلمانوں پر یہ انکا حق ہوگا مگر یہ کہ کسی سے دین کے بارے میں جنگ ہو رہی ہو (مذہبی جنگ ہو)

(۳۸) علی کل اناس حصتہم من جانبہم الذی قبلہم

اور یہ کہ ہر فریق پر اس حصہ کی ذمہ داری ہے جو اس کی جانب میں ہے۔

وان یہود الاوس موالیہم وانفسہم علی مثل ما لاهل هذه الصیفتہ مع البر البض من اهل هذه الصیفة وان البرودون الاثم لایکسب کاسب الاعلی نفسہ وان اللہ علی اصدق ما فی هذه الصیفة وابرة۔

اور یہ کہ قبیلہ اوس کے یہود ان کے موالی (حلیف یا آزاد کردہ غلام) ان کو وہی حقوق ہونگے جو اس عہد نامہ کے تمام فریقوں کو ہونگے، پوری نیک کرداری اور مخلصانہ بھلائی کے ساتھ۔ نیک کرداری ہی ہمارا اصل اصول ہوگا۔ مجرمانہ فعل (سے کوئی تعلق نہیں ہوگا) ہر ایک عمل کرنے والا اپنے عمل کا ذمہ دار ہوگا (اس کے فعل کو کسی دوسرے پر نہیں ڈالا جاسکے گا) اور اللہ تعالیٰ کو ہم حاضر و ناظر جان کر یہ عہد کرتے ہیں کہ جو کچھ اس دستاویز میں لکھا گیا ہے اس پر پوری سچائی سے اور نیک کرداری کے ساتھ عمل کریں گے۔

(۴۰) وانه لایحول هذا الکتاب دون ظالم واثم وانه من خرج امن ومن قعد امن بالمدینة الامن ظلم واثم وان اللہ جار لمن یرو التقی ومحمد رسول اللہ ﷺ

اور یہ کہ یہ تحریر کسی ظالم اور مجرم کیلئے آڑ نہیں بنے گی۔ جو مدینہ سے باہر ہو وہ بھی امن میں اور جو اندر رہے وہ بھی امن میں رہے گا۔ مگر یہ کہ وہ ظلم کرے یا مجرمانہ حرکت کرے۔ اللہ تعالیٰ اس کا محافظ ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ اس کے محافظ ہیں جو نیک کردار رہ کر پوری پابندی کے ساتھ اس پر عمل کرے۔

تحویل قبلہ، انقلاب عظیم سب سے افضل امت۔ سب سے افضل قبلہ

جہنڈا قوم بنائی ہے۔ کسی قوم کی قومیت جہنڈے سے نہیں بنتی۔ البتہ جہنڈا نشان قومیت بن جاتا ہے۔ جہنڈے کے رنگ یا وضع قطع کا کوئی فطری تعلق قوم کی فطرت سے نہیں ہوتا۔ البتہ کچھ روایات کا لحاظ وضع اور رنگ کے انتخاب کے وقت رکھا جاتا ہے۔ پھر وہ جہنڈا خود پیکر روایات اور نشان عظمت بن جاتا ہے۔ اس کی سر بلندی یا سر گونی قسمت۔ قوم کا فیصلہ سمجھی جانے لگتی ہے۔ تقریباً یہی شان عبادت اور عبادت کرنے کے رخ قبلہ کی ہے۔ عبادت یعنی بندگی، نیاز مندی، عاجزی اور فروتنی کا تعلق، اندرونی احساس اور قلب و ضمیر سے ہے۔ نہ پورب^۱ سے ہے نہ بچھم سے۔ نیکی^۲ اور بھلائی شرافت، حسن اخلاق اور خوبی کردار کا نام ہے۔ نیکی یہ نہیں ہے کہ مشرق کی طرف منہ کر لیں یا مغرب کی طرف مگر یہ ایک عبادت گزار (حتیٰ کہ وہ بھی جوامنا ہے) کہ جس کی وہ عبادت کر رہا ہے وہ کسی ایک رخ یا کسی ایک جگہ میں نہیں ہے وہ لامکان ولا زمان ہے۔ ہر جگہ ہے، اور ہر طرف ہے۔ عبادت کے لئے ایک رخ مقرر کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ کیونکہ جس طرح عمل کی پابندی کے لئے وقت کا مقرر کرنا ضروری ہے ایسے ہی دل کے جماف اور توجہ کے ٹھہراؤ کیلئے بھی رخ کا مقرر کرنا ضروری ہے اور افراد قوم میں یکجہتی بھی اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب سب

^۱ ارشاد خداوندی ہے وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ الْآیۃ اللہ ہی کا ہے پورب اور اللہ ہی کا بچھم۔ جس طرف بھی رخ کر لو وہاں اللہ ہے۔ (سورہ بقرہ ۱۱۵)

^۲ نَیْسَ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا وُجُوْہَکُمْ (الآیۃ) یعنی نیکی اور بھلائی یہ نہیں کہ تم اپنے چہرے پھیر لو، پورب کی طرف یا بچھم کی طرف۔ ہاں نیکی اور بھلائی اور حسن کردار اس کا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، کتاب (وحی الہی) پر اور نبیوں پر، پھر اس ایمان کے تقاضے کو پورا کیا کہ جب کہ مال کی ضرورت تھی کہ وہ تندرست تھا، دنیاوی زندگی کا میدان اس کے سامنے تھا، اس نے اپنی ضرورت کو پس پشت ڈال کر دیا، مال رشتہ داروں کو، یتیموں کو، مسکینوں کو اور مسافر کو اور سائلین کو اور گردنوں کے (چھڑانے) میں۔ اور برپا کیا نماز کو (پوری شان کے ساتھ نماز باجماعت ادا کی) نہ کوٹہ ادا کی اور وہ جو پورا کریں عہد جب عہد کر لیں اور جو صبر کرنے والے ہیں سختی اور شدت میں اور خوف و ہراس کے وقت (آیت ۷۷ سورہ بقرہ)

کی عبادت ایک ہی طرف ہی رخ پر ہو۔^۱

مکہ کے مشرک اگرچہ سر نیازتوں کے سامنے خم کرتے تھے۔ مگر ان کے تحت الشعور میں یہ تھا کہ ان کا قبلہ ”کعبہ“ ہے جس کی بنیاد حضرت آدم علیہ السلام نے رکھی تھی۔ جس کی تجدید حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند رشید حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کی، جو ہمارے مذہب ہی پیشوا بھی ہیں اور خاندانی مورث اعلیٰ بھی۔

اہل شرک اور بت پرستوں کے بالمقابل اہل کتاب (یہودی اور نصرانی) تھے جن کا قبلہ بیت المقدس یا بیت اللحم تھا۔ سیدنا حضرت محمد ﷺ عبادت کے لئے اٹھے تو اگرچہ کعبہ کو آپ نے نظر انداز نہیں فرمایا۔ مگر آپ نے قبلہ اس کو بنایا جو تقریباً ڈھائی ہزار سال سے انبیاء علیہم السلام کا قبلہ چلا آ رہا تھا۔ حرم کعبہ میں آپ نماز پڑھتے تو کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر رخ شمال کی طرف کرتے تھے یعنی وہ قبلہ بھی آپ کے سامنے رہتا تھا۔ جو آل اسماعیل علیہم السلام کا قبلہ تھا اور وہ قبلہ بھی سامنے ہوتا جو بنی اسرائیل کا قبلہ تھا۔ لیکن جب آپ مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو یہاں یہ اجتماع قبلیتین ممکن نہیں تھا، کیونکہ مکہ یہاں سے جنوب میں تھا اور بیت المقدس شمال میں، لامحالہ آپ نے انبیاء علیہم السلام کے ڈھائی ہزار سالہ قبلہ ہی کو اختیار فرمایا۔ چنانچہ مسجد کی تعمیر کی تو اسی دیوار کو دیوار قبلہ قرار دیا جو بیت المقدس کی جانب تھی (شمالی دیوار)، لیکن سوال یہ تھا کہ اس دین کیلئے جو حق و باطل کے لئے فرقان عظیم ہے خالص اور گھری ہوئی توحید جس کی بنیاد ہے، جس کی تعلیم میں یہ قوت ہے کہ کبھی اس کے منسوخ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آسکتی جو ابد الابد تک باقی رہنے والا کامل و مکمل دین ہے اس کا قبلہ بھی بیت المقدس رہے جو اہل شرک کا قبلہ تو بیشک نہیں ہے۔ مگر جو اس سے وابستہ ہیں وہ خود اتحاد اور یک جہتی سے محروم دو ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ یہودی اور عیسائی ہر ایک ٹکڑی دوسرے کی تردید کر رہی ہے اور جہاں تک اخلاق و کردار کا تعلق ہے تو اخلاق و کردار میں اہل شرک کے مدد و شہ ہیں، بلکہ کچھ آگے بڑھے ہوئے ہیں کہ قتل انبیاء کے دھبے بھی ان کے دامن پر نمایاں ہیں۔ اور اگر قبلہ بدلا جاتا تو قبلہ کا مسئلہ صرف ایک رخ کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک مرکز کا مسئلہ بھی ہے۔ حضرت یعقوب (اسرائیل) علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور تک حق پرستی، توحید، دعوت الی اللہ، ہدایت و ارشاد یعنی مذہبی اور روحانی رہنمائی کا فریضہ بنو اسرائیل کے سپرد رہا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے بیشمار انعامات ان پر ہوتے رہے۔ بنو اسرائیل کا دینی مرکز بیت المقدس تھا۔ اب سوال یہ بھی تھا کہ دعوت و ارشاد کی مرکزیت، جس کو اصطلاحاً امامت، اور خلافت الہیہ کہا جاتا ہے کیا اسی قوم کے سپرد رہے گی یا اس میں تبدیلی ہوگی۔

^۱ تفسیر فخر الدین رازی رحمہ اللہ عرف تفسیر کبیر

اگر تبدیلی ہوگی تو کیوں اور تبدیلی کے بعد جس قوم کو یہ امامت سپرد ہوگی تو کیا اس کا قبلہ بھی رہے گا یا اس کو بھی بدلا جائے گا۔ اور اگر بدلا جائے گا تو کیوں؟

ان سوالات کے جوابات عقل و قیاس یا جذبات کی منطق سے نہیں دیئے جاسکتے تھے۔ کیونکہ کسی فرد یا قوم کو امامت نوع انسان کا درجہ خدا ہی کی طرف سے سپرد ہوتا ہے اور یہ کہ خدا پرست پرستش کے وقت اپنا رخ کس طرف کریں۔ یہ بھی وہی بتا سکتا ہے جس کی خوشنودی کے لئے پرستش کی جاتی ہے۔ لیکن ایک سربراہ کو انقلاب کے موقع پر جب مختلف سوالات (اور خصوصاً جب ایسے سوالات درپیش ہوں جن کا تعلق خود انقلاب اور مقصد انقلاب سے ہو) جو تردد اور تشویش ہو سکتی ہے، اس سے کہیں زیادہ تردد اس ہادی اعظم کو درپیش تھا جو اس لئے دنیا میں آیا تھا کہ طالبان حق کو ہدایت و ارشاد کی آخری منزل طے کرائے اور ان کے لئے ایسا راستہ معین کر دے کہ زمانہ کی کوئی بھی گردش اس میں کجی یا ناہمواری پیدا نہ کر سکے۔ اس لئے وہ بار بار اس سمت کی طرف نظر اٹھاتا جس سمت سے عقدہ کشائی کی توقع تھی۔ ہادی برحق کے تردد کا عکس ان ۱۰ پر بھی پڑ رہا تھا جو اس کے لئے اس لئے وابستہ ہوئے تھے کہ ذہنی تشویش و تردد کو اطمینان سے بدلیں اور وہ نور حاصل کریں جو نہ صرف دنیا کی تاریکیوں میں بلکہ ظلمات محشر میں بھی ان کے لئے شمع راہ ہو۔

اشارے:

چند سال پہلے محمد رسول اللہ ﷺ کو وہ شرف اعظم حاصل ہو چکا تھا جو نہ صرف نوع انسان بلکہ حق یہ ہے کہ پوری کائنات میں نہ آج تک کسی کو میسر آیا تھا نہ آئندہ آنے والا تھا۔ یعنی آپ شب معراج میں اس بلند ترین مقام تک پہنچ چکے تھے جہاں تک نہ کسی نبی مرسل کی رسائی ہوئی تھی نہ کسی ملک مقرب کی۔ جبرئیل امین علیہ السلام اس سے بہت نیچے در ماندہ رہ کر یہ معذرت کر چکے تھے۔

اگر یک سر موئے بالا پر م فروغ تجلی بسوزد پر م

اس عروج و سیر میں آپ نے بیت معمور ملاحظہ فرمایا تھا جس کے گرد ہر روز ستر ہزار فرشتے مصروف طواف ہوتے ہیں۔ ۱۰ وہیں بانی ملت حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تھی کہ آپ بیت معمور سے تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ ۱۱ اسی سیاحت قدسی میں پانچ نمازیں فرض ہوئیں پھر عرش

۱۰ صحابہ کرام کے تردد اور انتظار و اشتیاق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تبدیلی قبلہ کی خبر جس کو پہنچی اور جس حالت میں پہنچی فوراً عمل شروع کر دیا۔ جو صحابہ نماز پڑھ رہے تھے انہوں نے نماز میں خبر سنی تو فوراً نماز ہی میں اپنا رخ بلکہ امام سمیت پوری جماعت کا رخ شمال سے جنوب کو یعنی بیت المقدس کی جانب سے کعبہ کی سمت کو کر لیا۔ (بخاری شریف وغیرہ)

۱۱ جن کا دوبارہ کبھی نہر نہیں آتا (بخاری و مسلم حدیث معراج)

۱۲ مسلم شریف۔

معلیٰ کی اسی سیاحت سے واپسی میں یہ ہوا تھا کہ جب بیت المقدس میں نزول اجلال ہوا تو تمام انبیاء اور مرسلین صف آراستہ ہوئے اور امامت کے لئے اسی سید الثقلین علیہ السلام کو آگے بڑھایا گیا۔ ۱۰

پنچ وقت نمازوں کا قبلہ یہ بیت المقدس ہو۔ جہاں مسجد اقصیٰ ہے جو ایک گزر گاہ ہے عرش بریں پر جانے والے کا۔ یادہ کعبہ ہو جو نقطہ محاذات ہے۔ ۱۱ اس بیت معمور کا جس کا طواف ملائک کے جھمکتے ہر وقت کرتے رہتے ہیں جو تکیہ گاہ ہے ابراہیم خلیل اللہ کا (علیہ و علی نبینا الصلوٰۃ والسلام) اس طرح کے مشاہدات اشارہ کر رہے تھے کہ امام الانبیاء اور اس کی امت خیر الامم کا قبلہ خانہ کعبہ ہونا چاہئے۔ مگر جہاں نص صریح اور قطعی فیصلہ کی ضرورت ہو وہاں اشاروں کو کافی نہیں سمجھا جاسکتا۔ البتہ یہ اشارے قطعی فیصلہ اور امر واضح کی توقع ضرور دلا سکتے تھے اور یہ توقع اشتیاق اور یہ اشتیاق اضطراب بن سکتا تھا اگر انتظار طویل ہوتا۔

یہی اشتیاق و اضطراب و انتظار تھا جس کی وجہ سے آپ بار بار اس سمت کو نظر اٹھاتے تھے، جہاں سے مراد پوری ہونے کی توقع تھی۔ بالآخر انتظار ختم ہوا۔ جب ہجرت سے سو سال بعد فرمان خداوندی نازل ہوا:

قَدْ ذَايَ تَقَلَّبَ وَجْهَكَ فِي السَّيِّءِ ۚ فَلَنُؤَيِّنَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا ۚ قَوْلَ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۚ (البقرہ ۱۴۴)

”ہم دیکھ رہے ہیں کہ (حکم الہی کے شوق و طلب میں) تمہارا چہرہ بار بار آسمان کی طرف اٹھ رہا ہے تو یقین کرو ہم عنقریب تمہارا رخ ایک ایسے قبلہ کی طرف پھیر دینے والے ہیں جو تم چاہتے ہو اور اب کہ اس معاملہ کے ظہور کا وقت آگیا ہے تو چاہئے کہ تم اپنا رخ مسجد حرام (خانہ کعبہ) کی طرف پھیر لو۔ اور جہاں کہیں بھی تم ہو (نماز کے وقت) اسی طرف رخ پھیر لو“ (آیت ۱۴۴)

وجوہات:

رب المشرقین والمغربین، خالق السموات والارض، رب العرش الکرم کے کسی حکم کے متعلق وجہ دریافت کرنا بے ادبی ہے لایسئل عتایفعل (الانبیاء ۲۳) (وہ جو کچھ کرتا ہے اس پر اس سے باز پرس نہیں کی جاسکتی) اور جبکہ مشرق و مغرب اسی کا ہے اور ہر جگہ اور ہر سمت میں اس کا جلوہ یکساں ہے تو بلاشبہ اس کو اختیار ہے کہ قبلہ کے لئے جو سمت چاہے مقرر کر دے۔ چون و چرا کی گنجائش کہاں ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ حکم جس کے پانچ کلمے ہیں قَوْلَ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (البقرہ ۱۴۴) ایک انقلاب انگیز فیصلہ بھی ہے جو تَعُوْذُ مَنْ تَشَاءُ وَتُنْذِرُ مَنْ تَشَاءُ (آل عمران ۲۶)

۱۰ الہادیہ والنبایہ ص ۱۱۳ ج ۳۔

۱۱ طبری و مسند اسحاق۔ فتح الباری ص ۲۳۵ ج ۲۔

کا نام قرآن ہے۔ پھر نوع انسان کی حیثیت بیان فرمائی گئی ہے کہ اس کو زمین پر اللہ تعالیٰ کی خلافت عطا ہوئی، اس کی شان ملائک سے بھی بلند ہے۔ اب خلافت اور امامت کا ذکر شروع ہوا تو بنو اسرائیل کو یاد دلایا گیا ہے کہ یہ نعمت عظمیٰ ان کو عطا ہوئی تھی۔

یہ سورہ بقرہ کی آیت ۴۰ ہے یہاں سے سورہ بقرہ کا پانچواں رکوع شروع ہوتا ہے۔ اس آیت سے لیکر آیت ۱۲۳ تک جو پندرہ سو رکوع کے شروع میں ہے، بنو اسرائیل کا تذکرہ ہے۔ ان آیات میں ایک طرف اللہ تعالیٰ کے انعامات شمار کرائے گئے ہیں جو بنو اسرائیل کو وقتاً فوقتاً عطا ہوتے رہے۔ دوسری جانب اس کا تذکرہ ہے کہ باری تعالیٰ کے ان انعامات کو بنو اسرائیل نے کس طرح (معاذ اللہ) پامال کیا۔ اور کس طرح ان کی دھجیاں بکھیریں۔ ان تمام جرائم کی تفصیل تو بہت طویل ہے یہاں صرف ان جرائم کے عنوان پیش کئے جا رہے ہیں جو اپنے اندر خاص اہمیت رکھتے ہیں جو ان تراسی آیتوں میں شمار کرائے گئے ہیں۔

- ۱۔ اللہ سے جو عہد کیا تھا۔ اس کو توڑ ڈالا۔ اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا (آیت ۱۰۱، ۱۰۰)
- ۲۔ حیلہ بازی اور ٹال مٹول (آیت ۶۵ تا ۶۶)
- ۳۔ قبول حق سے گریز اور اس پر فخر (آیت ۸۷ تا ۹۳)
- ۴۔ سنگ دلی (آیت ۷۴ تا ۸۸)
- ۵۔ کج بجٹی (آیت ۶۸ تا ۶۹)
- ۶۔ نسلی حسد (آیت ۸۹ و ۹۰ و ۹۱)
- ۷۔ پوری دھڑائی سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پامال کرنا (آیت ۸۳ و ۸۵)
- ۸۔ داعیان حق سے عناد (آیت ۸۷) ان کا مذاق بنانا (آیت ۱۰۴)
- ۹۔ احکام خداوندی کو فروخت کرنا (آیت ۷۴ و ۷۵)
- ۱۰۔ عقائد میں تحریف (آیت ۸۰ و ۸۱)
- ۱۱۔ احکام خداوندی میں تحریف (آیت ۷۵)
- ۱۲۔ موت سے گریز، دنیاوی زندگی کی شدت حرص (آیت ۹۶)

یعنی تراسی آیتوں میں جو دس رکوع ہیں پچھلی ہوئی ہیں۔

طاعت الہی اور ایمان بانیہ کا عہد۔ توریت میں بھی اس عہد کا ذکر جابجا ہے، مثلاً تو نے آج کے دن اقرار کیا ہے کہ خداوند میرا خدا ہے۔ اور میں اس کی راہوں پر چلوں گا اور اس کے شرعوں اور اس کے حقوق اور اس کے حکموں کی محافظت کروں گا اور اس کی آواز کا شنوا ہوں گا۔ فقرہ ۱۸ باب ۲ (استثناء)

تم نے زندہ خدا رب الافواج کی باتوں کو بگاڑ ڈالا ہے یرماہ، باب ۲۳ فقرہ ۳۷

جو اپنی زبان استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ فرماتا ہے۔ یرماہ باب ۲۳ فقرہ ۳۲ و ۳۱

کی پوری شان اپنے اندر رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ امامت عظمیٰ اور خلافت اللہ کا منصب جس پر تقریباً ڈھائی ہزار سال سے بنو اسرائیل فائز تھے اب وہ ان سے چھن کر بنو اسماعیل کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ وہی احکم الحاکمین جس کی بارگاہ عظمت تک کسی باز پرس کی رسائی نہیں ہو سکتی تھی اپنی شان یہ بیان فرماتا ہے کہ ذرہ برابر بھی ظلم اس سے صادر نہیں ہوتا۔^۱

ناممکن اور محال ہے کہ جو رب ہے پالنے پونے والا ہے۔ وہ اپنے ہی پیدا کئے ہوئے بندوں پر کوئی ظلم کرے۔^۲

بلاشبہ اس کی شان یہ ہے کہ تَعُوْذُ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْدِلُ مَنْ تَشَاءُ (جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے) مگر اس مطلق العنان قدرت کے باوجود اس نے قوموں اور امتوں کی ذلت و عظمت کے لئے ضابطے مقرر کر دیئے ہیں۔

(الف) جس قوم کو جو نعمت وہ عطا فرمادیتا ہے وہ اس میں انقلاب اور تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ قوم خود اپنے اندر تبدیلی نہ کرے۔ (آیت ۵۳ سورہ الانفال) (اور اپنی عظمت آفرین خصوصیات کو ختم نہ کر دے)۔ عروج کے بعد زوال اس ضابطہ کے بموجب ہوتا ہے اور ترقی کے لئے ضابطہ یہ ہے۔

(ب) جو حالت کسی قوم کی ہوتی ہے وہ قادر ذوالجلال اس میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنے اندر تبدیلی نہ کرے۔ (آیت ۱۰ سورہ اعراف)

بہر حال رب ذوالجلال نے اپنی شان اور اپنے ہی منظور فرمودہ ضابطہ کا یہ احترام فرمایا ہے کہ اس انقلاب آفرین حکم کی وجوہات بیان فرمائیں اور اس تفصیل سے بیان فرمائیں کہ شاید کسی اور حکم کی وجوہات اس تفصیل سے بیان نہیں فرمائیں۔

آپ قرآن مجید کی تلاوت شروع کیجئے سب سے پہلے آپ سورہ فاتحہ پڑھیں گے جو نزالے رنگ کی حمد و ثناء ہے جس میں بندوں کو نہایت جامع دعا کی تلقین بھی ہے اور عبرت آموز سبق بھی۔ پھر وہ سورت شروع ہوتی ہے جو قرآن پاک کی سب سے بڑی سورت ہے۔

اس میں مقصد قرآن حکیم کی وضاحت کے بعد ان تین جماعتوں کا ذکر اور ان کے کردار کا بیان ہے جو کسی بھی تحریک کے برپا ہونے پر ظہور پذیر ہو جاتی ہیں یعنی (۱) ماننے والے (۲) کھلے ہوئے مخالف اور منکر (۳) وہ اغراض پرست بزدل جن کے دلوں میں انکار بھرا ہوتا ہے اور ظاہر یہ کرتے ہیں کہ وہ موافق اور فرمان بردار ہیں۔ اس کے بعد عبادت رب کی ہدایت ہے اور اس رسول کا ذکر ہے جو طریقہ عبادت کی تعلیم دے رہا ہے جس کی تصدیق کے لئے وہ معجزہ پیش کیا گیا ہے جس

آیت ۳۰ سورہ النساء

وَمَا رَأَيْتُ بِكَلَامٍ لَّيِّنٍ (لم جودہ آیت ۳۶)

اس یاد دہانی کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام گرامی لیکر وہ بشارت یاد دلاتا ہے جو حضرت حق جل مجدہ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دی گئی تھی:

إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا (سورہ بقرہ-۱۱۳)

”میں تمہیں انسانوں کے لئے امام بنانے والا ہوں“

پھر یاد دلاتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دریافت کیا کہ یہ شرف میری اولاد کو بھی میسر آئے گا، تو بتادیا گیا تھا:

لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ (آیت ۱۲۴)

”نہیں پہنچتا میرا اقرار نافرمانوں کو“

یعنی جو ظلم و معصیت کی راہ اختیار کریں ان کا میرے اس عہد میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

اس صغریٰ اور کبریٰ کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنو اسرائیل خود اس بشارت کے بموجب جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دی گئی تھی اس کے مستحق ہیں کہ ان کو منصب امامت سے معزول کر دیا جائے کیونکہ وہ ظالم ہیں اور ظالم بھی ایسے کہ ان جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں جن کو گزشتہ ۸۳ آیتوں میں بیان کیا گیا ہے۔

اب مستحق شرف کون؟

قرآن حکیم یاد دلاتا ہے کہ ایک ”بیت“ خانہ وہ ہے جس کو شروع ہی سے مَسَابَقَةُ لِلنَّاسِ وَآمَنًا (البقرہ-۱۲۵) بنایا گیا ہے (تمام انسانوں کا مرجع اور مرکز۔ امن و حریت کا مقام)

اس بیت سے متعلق ہدایت کردی گئی تھی: وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِرِہُمْ مَصَلًّی (البقرہ-۱۲۵) ”ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بنا لو۔“

اس بیت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند ارحمہم اجمعین کو حکم دیا تھا: طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ (البقرہ-۱۲۵) ”تم دونوں میرے گھر کو پاک صاف رکھو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے۔“

پھر فرقان حمید یاد دلاتا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہ السلام جب اس بیت کی بنیادیں (جو حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ کی تھیں) بلند کر رہے تھے تو ان کے دلوں کی گہرائیوں سے ان کی زبانوں پر یہ دعا بھی جاری تھی:

”اے پروردگار! ہمارا یہ عمل تیرے حضور قبول ہو۔ بلاشبہ تو ہی ہے جو دعاؤں کا سننے والا اور (مصالح عالم) کا جاننے والا ہے۔ اے پروردگار! (اپنے فضل و کرم سے)

۱۳۔ گو سالہ پرستی (آیت ۹۲)

۱۴۔ خدا کے بیٹا ماننا (آیت ۱۱۶)

۱۵۔ انبیاء علیہم السلام کو قتل کر ڈالنا (آیت ۹۱ و ۹۲)

۱۶۔ جادو اور کہانت (آیت ۱۰۲ و ۱۰۳)

۱۷۔ گروہ بندی اور گروہ بندی کے ساتھ جنت کی ٹھیکہ داری کہ یہود کہتے تھے کہ جب تک انسان یہودی گروہ بندی میں داخل نہ ہو نجات نہیں پاسکتا اور عیسائی کہتے تھے کہ جب تک عیسائی گروہ بندی میں داخل نہ ہو جنت میں نہیں جاسکتا۔ (آیت ۱۱۱)

قرآن پاک کی محولہ بالا آیتوں میں ان جرائم کو شمار کر لیا گیا ہے۔ پھر ان کی مثالیں اور شواہد پیش کئے گئے ہیں۔

اب ایک قدرتی سوال ہے کہ جس قوم کا یہ کردار ہو چکا ہے کیا وہ اس کی اہل ہے کہ منصب امامت کی حامل رہے اور اس کے قبلہ کو نوع انسان اور دین کامل کا قبلہ قرار دیا جائے اور اس میں تبدیلی نہ کی جائے۔

کلام اللہ کی نظر میں تبدیلی صرف مناسب ہی نہیں ہے بلکہ اتنی ضروری ہے کہ اس پر اعتراض وہی کر سکتے ہیں جو فہم و بصیرت سے محروم اور معطلہ انگیز نادانی (سفاهت) میں مبتلا ہوں۔ چنانچہ تبدیلی قبلہ کے حکم کی تمہید اس طرح فرمائی گئی ہے:

سَيَقُولُ الشُّفْهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا (البقرہ آیت ۱۴۲)

”جو لوگ عقل و بصیرت سے محروم ہیں وہ کہیں گے کس بات نے ان (مسلمانوں) کو ہٹا دیا اس قبلہ سے جس پر وہ اب تک تھے۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے رب ابراہیم کا وعدہ اور بنو اسرائیل کی محرومی کا سبب: سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت اور اسکی عظمت بنو اسرائیل میں بھی مسلم تھی اور بنو اسماعیل میں بھی۔ دونوں ان کو اپنا مورث اعلیٰ مانتے تھے۔ قرآن حکیم یہود کے جرائم شمار کرانے کے بعد خاتمہ کلام پر پھر یاد دلاتا ہے کہ ”اے بنی اسرائیل یاد کرو میری وہ نعمتیں جو میں نے تم کو بخشیں اور میں نے تم کو دنیا جہان والوں پر فضیلت دی۔“ (آیت ۱۲۲)

۱۔ یہود اور نصاریٰ دونوں ہی نے خدا کا بیٹا مان لیا تھا۔ یہود نے حضرت عزیر کو اور عسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو۔
۲۔ برہمن جس برہما کی تعظیم کرتے ہیں کیا عجب ہے وہ ابراہیم یا ابراہام ہی ہو۔ عربوں نے اگر ابراہام کا ابراہیم کر لیا ہے تو اتنی تبدیلی کا حق تو بھارت کے آریوں کو بھی ہونا چاہئے کہ وہ ابراہیم کا برہم اور برہما کر لیں جیسے آریہ کو آریہ کر لیا۔
واللہ اعلم بحقیقہ

پس منظر پر آپ نظر ڈال چکے۔ اب ان آیتوں کا مضمون مطالعہ فرمائیے جن میں تحویل قبلہ کا حکم ہے جس کا یہ پس منظر تھا۔
ترجمہ: ”جو لوگ عقل و بصیرت سے محروم ہیں وہ کہیں گے مسلمان جس قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے، کیا بات ہوئی کہ ان کا رخ اس سے پھر گیا۔ (اے نبی) تم کو پوچھو رب ہو یا پیغمبر سب اللہ ہی کے لئے ہے (وہ کسی خاص مقام یا جہت میں محدود نہیں) وہ جس کسی کو چاہتا ہے سیدھی راہ چلا دیتا ہے۔“

”اور (اے مسلمانو! جس طرح یہ بات ہوئی کہ بیت المقدس کی جگہ خانہ کعبہ قبلہ قرار پایا) اسی طرح یہ بات بھی ہوئی کہ ہم نے تمہیں امتہ وسط (نیک ترین، عادل اور معتدل) امت بنا دیا تاکہ تم گواہ رہو لوگوں پر (یعنی ایک بہتر نمونہ اور معیار کہ نوع انسان کی ہر امت کو اسی سانچہ میں ڈھلنا اور اسی معیار پر اترنا چاہئے) اور رسول گواہ رہیں تم پر (وہ تمہارے لئے نمونہ اور معیار ہیں کہ امت اسلامیہ کو اس معیار پر پورا ہونا اور اس سانچہ میں ڈھلنا چاہئے)۔ اور ہم نے تمہیں اس قبلہ پر جس کی طرف تم رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے اسی لئے رکھا تھا کہ وقت پر معلوم ہو جائے کہ کون لوگ واقعی اللہ کے رسول کی پیروی کرتے ہیں اور کون الٹے پاؤں پھر جاتے ہیں۔ یہ حکم بہت گراں (اور سخت آزمائش کا حکم ہے)۔ مگر ان لوگوں کو نہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے راہ دکھادی ہے (اور وہ اطاعت رسول کے ذوق سلیم سے بہرہ ور ہیں) اللہ ایسا نہیں کہ ضائع ہو جانے دے تمہارے ایمان کو (کہ جو نماز میں بتقاضا ایمان باللہ و ایمان بالرسول، بیت المقدس کی طرف رخ کر کے پڑھیں ان کو بیکار قرار دے)۔ بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑا شفیق ہے (خصوصاً ان پر جنہوں نے اللہ اور رسول کے حکم کی تعمیل میں کوئی کام کیا۔ اور تبدیلی قبلہ کے متعلق اس کا یہ حکم بھی سراسر شفقت ہی ہے)۔“

”(اے پیغمبر!) ہم دیکھ رہے ہیں کہ حکم الہی کے شوق و طلب میں تمہارا چہرہ بار بار آسمان کی طرف اٹھ اٹھ جاتا ہے، تو یقین کرو ہم آپ کا رخ اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس کو آپ چاہتے ہیں (اچھا) اب کر لیجئے اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف اور تم لوگ (آپ اور آپ کے ساتھی) جہاں بھی ہو اپنے چہرے پھیر لیا کرو اسی طرف، اور جن لوگوں کو کتاب مل چکی ہے (یہود اور نصاریٰ) وہ یقیناً جاننے ہیں کہ یہ معاملہ ان کے پروردگار کی طرف سے ایک امر حق ہے (کیونکہ ان کے مقدس نوشتوں میں اس کی پیش گوئی موجود ہے)۔ اور اللہ بے خبر نہیں ہے ان کی کارروائیوں سے۔ اور

• یعنی سپردگی اور حکم خدا کی تعمیل کے لئے سراسر اطاعت بن جانا جو ملت ابراہیم کی خصوصیت ہے کس میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے، کس میں نہیں پائی جاتی (واللہ اعلم)

ہمیں ایسی توفیق دے کہ ہم سچے مسلم (تیرے احکام کے فرمانبردار) بن جائیں اور ہماری نسل سے بھی ایسی امت پیدا کر جو تیرے حکموں کی فرمانبردار ہو۔ خداوند ہمیں ہماری عبادت کے طور و طریق بتا دے اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما اور اپنی عنایت سے نواز، بلاشبہ تیری ذات ہے جس کے درگزر کرنے کی کوئی انتہا نہیں جو رحم کرنے والی ہے۔“ (آیت ۱۲۷-۱۲۸)

اسی سلسلہ میں ان کی دعا یہ بھی تھی:

”اے ہمارے رب! (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کیجئے کہ اس بستی کے بسنے والوں میں تیرا ایک رسول پیدا ہو جو انہیں میں سے ہو۔ وہ تیری آیتیں پڑھ کر لوگوں کو سنائے، کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور اپنی پیغمبرانہ تربیت سے ان کے دلوں کو مانجھ دے۔“ (آیت ۱۲۹)

اس کے بعد کلام الہی تنبیہ کرتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کا مسلک تھا:

(۱) توحید خالص، خدا واحد کی پرستش، جس میں کسی طرح کے شرک کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ (آیت ۱۳۲)

(۲) سپردگی اور فرمانبرداری۔ یعنی اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دینا اور اس کے احکام کی پوری طرح تعمیل کرنا۔ (آیت ۱۳۱)

یہی توحید خالص اور تسلیم و رضا تھی جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امام الناس بنایا اور یہی نعمت بنو اسرائیل کو عطا ہوئی تھی جس کی وجہ سے ان کو عالمین دنیا جہاں پر فضیلت بخشی گئی تھی۔

ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اسی مسلک کی وصیت اپنی اولاد کو کی تھی، ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد میں جس قدر نبی آئے سب نے اسی مسلک کو مضبوطی سے اختیار کیا۔ یہ تمہاری دھڑے بندی جس کا نام یہودیت اور نصرانیت ہے ان سب انبیاء علیہم السلام کا دامن اس سے پاک رہا۔ (آیت ۱۲) تمہاری اسی دھڑے بندی کا نتیجہ ہے کہ کسی نبی کو مانتے ہو کسی کو نہیں مانا یہاں تک کہ قتل بھی کر دیا۔ اسی دھڑے بندی نے تم کو منصب امامت سے محروم کیا۔ درجہ فضیلت سے نیچے گر آکر ذلت و مسکنت کے گڑھے میں ڈالا۔ غضب الہی کو تمہاری گردنوں کا طوق بنا دیا۔ آج سب سے افضل وہ ہے جو اس دھڑے بندی سے بالا و تر ہو کر مسلک ابراہیمی کو مضبوطی سے سنبھالے۔ خدا واحد کا پرستار حقیقی بن کر اپنے آپ کو خدا کے حوالہ کر دے۔

آج یہ شرف محمد ﷺ اور آپ کی امت کو حاصل ہے۔ لہذا وہی افضل الناس اور امت وسط ہے اور اسی فضیلت کی بنا پر یہ فیصلہ بھی کیا جا رہا ہے۔ اس کا قبلہ وہ ہو گا جس کی حرمت و عظمت عہد قدیم سے چلی آرہی ہے جس کے معمار ابراہیم اور اسماعیل علیہ السلام تھے۔

اگر تم اہل کتاب کے سامنے دنیا جہان کی ساری دلیلیں بھی پیش کر دو جب بھی وہ تمہارے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں، نہ یہ ہو سکتا ہے کہ (علم و بصیرت کی پوری روشنی حاصل ہونے کے بعد) تم ان کے قبلہ کی پیروی کرنے لگو اور نہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے قبلہ کو ماننے والے ہیں۔ (یہود کا قبلہ ہیکل بیت المقدس ہے اور نصاریٰ کسی عمارت یا مکان کو نہیں بلکہ سمت مشرق کو قبلہ بنائے ہوئے ہیں (ابن جریر وغیرہ))

(اور دیکھو) اگر تم نے ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی کی باوجود یکہ تمہیں اس بارے میں علم حاصل ہو چکا ہے (قبلہ کے متعلق وحی نازل ہو چکی ہے) تو تم بھی ان میں آ جاؤ گے جو (نا فرمانی کر کے اپنے اوپر) ظلم کرتے ہیں اور جن لوگوں کو ہم کتاب دے چکے ہیں وہ آپ^۱ کو ایسا ہی پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو جانتے پہچانتے ہیں لیکن اس پر ایک گروہ ان میں ایسا ہے جو جان بوجھ کر سچائی کو چھپاتا ہے (تحويل قبلہ کا یہ معاملہ) تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک امر حق ہے، پر ہر گز ہرگز ایسا نہ ہو کہ تم شک کرنے والوں میں سے ہو جاؤ۔“

نکاح السیدہ فاطمہ الزہراء (ؑ)

ارشاد خداوندی ہے:

وَأَنكِحُوا الْأَكْيَامَ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَأَمَّا أَنْتُمْ إِنَّا يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِيهِمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۖ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝

”نکاح کر دو ان کا جو تم میں بے نکاح ہوں اور اپنے غلاموں اور باندیوں کا بھی جو اس قابل ہوں اگر مفلس ہوں گے تو خدا تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔ اور اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے خوب جاننے والا۔“ (سورہ النور ۳۲)

آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؑ کو خاص طور سے ہدایت فرمائی:

”علی! تین کام ہیں ان میں تاخیر ہرگز نہ کرنا۔ (۱) نماز جب اس کا وقت ہو جائے (۲) جنازہ جب آجائے، (۳) بے نکاح جب اس کا کفول جائے۔“

ہمارا طریقہ یہ ہے کہ ہم پہلے ”غنا“ چاہتے ہیں، پھر نکاح مگر فرمان خداوندی نے نکاح کو مقدم رکھا اور غنا کا خود وعدہ فرمایا۔

اس کی عجیب و غریب مثال حضرت علی اور سیدہ فاطمہ الزہراءؑ کا نکاح ہے۔ حضرت علیؑ اپنے والد خواجہ ابوطالب کی وفات کے وقت اگرچہ جوان تھے، تقریباً بیس سال کی عمر تھی، مگر آنحضرت ﷺ نے ان کو بچپن ہی سے اپنی تربیت میں لے لیا تھا اور خواجہ ابوطالب کو ان کی طرف سے بے فکر کر دیا تھا۔

ابوطالب دولت مند نہیں تھے کہ ان کے وارث ان کے ترکہ سے دولت مند ہو جائے۔ اس کے علاوہ ہجرت کرنے والے بزرگ وہ تھے کہ دولت مند بھی فقیر ہو گئے تھے۔ لہذا حضرت علیؑ کے

^۱ ترمذی شریف باب ما جاء فی الوقت الاول من الفضل ص ۲۴

^۲ آنحضرت ﷺ نے مکہ معظمہ میں بھی مواخات (بھائی چارہ) قائم فرمایا تھا تو حضرت علیؑ کو یہ شرف حاصل ہوا تھا کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو اپنے ساتھ شامل کیا اور اس قرار دیا۔ مدینہ منورہ میں جو مہاجرین اور انصار کرام میں مواخات رشتہ اخوت قائم فرمایا اس میں حضرت علیؑ کا اسم گرامی نہیں آتا گویا آپ کی مواخات قائم رہی جو

کی فرمائش کرنی مناسب نہیں سمجھی۔ کسی طرح حضرت حارثؓ کو معلوم ہو گیا تو سرور کائنات ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ سارے مکان آپ کے ہیں۔ حضرت علیؓ جو پسند فرمائیں وہ اس مکان کی خوش بختی ہے۔ میں اسی مکان کو جس کو آپ لیں گے زیادہ محبوب (اور مبارک سمجھوں گا) بمقابلہ اس کے جو آپ کے کام میں نہیں آئے گا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: صدقت بارک اللہ (آپ نے سچ فرمایا: اللہ آپ کو برکت دے)۔ حضرت حارثؓ نے دوسرے مکان میں منتقل ہو گئے اور حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کو اپنے مکان میں لا کر اُتارا۔“

اللہ تعالیٰ اپنے پاکباز مقررین کو کس طرح محفوظ رکھتا ہے:

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب میں اپنی دلہن (فاطمہ بنت رسول اللہ ﷺ) کو رخصت کرانے کا ارادہ کیا تو میں نے بنی قینقاع کے ایک سنہار کی شرکت سے ایک کام کرنا چاہا۔ خیال یہ تھا کہ نفع ہو گا تو ولیمہ کر سکوں گا۔

صورت یہ تھی کہ غزوہ بدر کے مال غنیمت سے مجھے ایک ناقہ ملی تھی اور ایک اونٹنی مجھ کو آنحضرت ﷺ نے عنایت فرمائی تھی۔ جب میرے پاس دو اونٹ ہو گئے تو میں نے قبیلہ بنی قینقاع کے ایک سنہار سے یہ طے کیا کہ ہم دونوں ان اونٹوں پر جنگل سے اذخر لے آیا کریں گے اور اس کو بازار میں بیچ دیا کریں گے۔ یہ معاملہ نفع ہی کا تھا اس میں نقصان کا سوال ہی نہیں تھا لیکن خدا کو منظور نہیں تھا کہ امام الادلیا بے فکری سے ولیمہ کریں۔

یہ زمانہ وہ تھا اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔ حضرت علیؓ اور آنحضرت ﷺ کے عم محترم حضرت حمزہؓ جنہوں نے غزوہ احد میں شہید ہو کر سید الشہداء کا خطاب (لسان نبوت سے حاصل کیا) وہ جیسے بہادر تھے ایسے ہی مچلے بھی تھے۔ قیام گاہ پر کچھ احباب اکٹھے تھے۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ کسی نے کہا شراب کے ساتھ اونٹنیوں کے کوہان کے کباب بھی ہونے چاہئیں حضرت علیؓ کی یہ دونوں اونٹیاں سامنے کھڑی تھیں۔ حضرت حمزہؓ فوراً اٹھے اور دونوں اونٹنیوں کے کوہان نکال لئے اور کوہیں چاک کر کے گردے وغیرہ نکال لئے۔ احباب کی فرمائش پوری کر دی مگر ولیمہ کے متعلق سیدنا علیؓ کا سارا منصوبہ ختم ہو گیا۔ اسی لئے کہتے ہیں ”نزدیکان را بیش بود حیرانی“

① بخاری شریف ص ۲۸۰
② بخاری شریف ص ۳۲۰ و ۳۳۳ وغیرہ

پاس بھی جو تھا وہ توکل کا سرمایہ تھا اور بس۔

حضرت فاطمہؓ کی عمر پندرہ سال کے قریب ہوئی تو رشتے آنے شروع ہو گئے۔ حضرت علیؓ کو بھی مشورہ دیا گیا کہ وہ بھی خواستگاری پیش کر دیں۔ مگر حضرت علیؓ کو احساس تھا کہ ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ یہی آپ نے مشورہ دینے والوں سے بھی کہا۔ مگر تہی دستی اور غربت کا عذر کسی نے بھی قابل التفات نہیں سمجھا۔ مشورہ دینے والوں نے یہی کہا کہ بارگاہ رسالت میں اس کی ضرورت نہیں کہ تمہارے پاس دولت ہو۔ اس کے علاوہ آنحضرت ﷺ آپ کے مشفق مربی ہیں۔ تمہارا گوشہ خاطر معلوم ہو جائے گا تو وہ خود منظور فرمائیں گے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں مجھ پر مشورہ دینے والوں نے اتنا اصرار کیا کہ بالآخر مجھے تعمیل کرنی پڑی۔ میں نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ خدمت مبارک میں حاضر ہوا، مگر ایک طرف میری شرم و حیا، دوسری طرف ذات اقدس کا رعب و جلال۔ حاضر ہونے کو حاضر ہو گیا مگر زبان بند، طبیعت مجھوب، خاموش بیٹھ گیا۔ آنحضرت ﷺ کی مربیانہ شفقت ہی کار فرما ہوئی۔ خود دریافت فرمایا: کیسے آئے ہو، کچھ کام ہے۔ اس کے جواب میں بھی خاموشی ہی تھی۔ پھر خود ہی فرمایا: فاطمہ سے رشتہ کے لئے آئے ہو۔ میں نے عرض کیا: ”نعم“

فرمایا: پھر کیا دو گے؟

میں نے عرض کیا، میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔

ارشاد ہوا: میں نے تمہیں زرہ دی تھی وہ کیا ہوئی۔^①

جیسے ہی آنحضرت ﷺ کا اشارہ سمجھ میں آیا، حضرت علیؓ نے زرہ بیچنے کی نیت کر لی۔ پھر حضرت عثمانؓ کے ہاتھ ۴۸۰ درہم میں بیچ کر پوری رقم اپنے مربی و سرپرست آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کر دی۔ اس میں سے تقریباً ایک تہائی خوشبو پر خرچ ہوئی باقی دوسری ضرورتوں پر۔ آپ نے احباب کو طلب فرمایا: اور نکاح پڑھ دیا۔

مکان کا انتظام:

دلہن کو لانے کے لئے مکان کی ضرورت ہوئی۔ حضرت علیؓ نے ایک مکان کرایہ پر لیا۔ دلہن کو وہیں اتارا، پھر مستقل قیام کے لئے حضرت علیؓ کو مشورہ دیا گیا کہ حضرت حارث بن نعمان کے مکان خالی پڑے ہیں، ان سے ایک مکان لے لو۔ حضرت علیؓ کی خودداری نے مکان

آنحضرت ﷺ سے مکہ معظمہ میں قائم ہو گئی تھی مقصد یہ کہ سلسلہ مواخات سے جو سہولت حضرات مہاجرین کو مل گئی تھی کہ رہنے اور کاشت وغیرہ کا انتظام ہو گیا تھا حضرت علیؓ کو یہ سہولت بھی نہیں ملی تھی۔
① مشورہ دینے۔ پھر حاضری اور گفتگو کی۔ یہ تمام تفصیل الہدایہ والنہایہ سے ماخوذ ہے ص ۳۶۶ ج ۳

مقاصد بعثت، فرائض نبوت اور تکمیل

دعاء اور قبولیت دعا

سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام جب بیت اللہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے تو دل کی تمنائوں کے ترجمان دعائیہ کلمات یہ تھے جو زبان مبارک پر جاری تھے:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (البقرہ - ۱۲۹)

”اے ہمارے رب! اٹھا ان میں سے ایک رسول انہیں میں کا۔ پڑھے ان پر تیری آیتیں اور سکھا دے ان کو کتاب اور پکی باتیں اور ان کو سنوارے۔“

قبولیت دعا:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (سورہ البقرہ - ۲)

”وہی ہے جس نے اٹھایا ان پڑھوں میں ایک رسول انہیں میں کا پڑھتا ان پاس اس کی آیتیں اور ان کو سنوارتا اور سکھاتا کتاب اور عقلمندی۔“ (شاہ عبدالقادر)

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ (سورہ آل عمران - ۱۶۳)

”اللہ نے احسان کیا ایمان والوں پر جو بھیجا ان میں رسول انہیں میں کا، پڑھتا ہے ان پر آیتیں اس کی اور سنوارتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے ان کو کتاب اور کام کی بات (شاہ عبدالقادر)

”وے آموزو آن را کتاب و علم“ (شاہ ولی اللہ)

دعاء اور قبولیت دعا کے الفاظ پر دوبارہ نظر ڈال لیجئے۔ حاصل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت مبارکہ کے مقاصد یہ تھے:

تلاوت آیات اللہ، تعلیم کتاب اللہ، تعلیم الحکمہ، تزکیہ

نکاح سے کچھ عرصہ بعد رخصتی:

ایک روایت ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا نکاح پہلے ہو چکا تھا اور رخصتی نو ماہ بعد ہوئی تھی۔ بخاری شریف کی مذکورہ بالا روایت سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔

جہیز:

تاجدار دو عالم شاہ کو نین ﷺ نے اپنی لخت جگر سیدہ نساء اہل الجینۃ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو جو جہیز دیا اس کی فہرست یہ ہے:

لحاف: ایک
چڑے کا گدا جس میں کسی درخت کی چھال بھری ہوئی تھی: ایک
چکیاں: دو
مکینزہ: ایک،
مٹی کے گھرے: دو

صلوات اللہ علیہ وعلى آلہ واصحابہ اجمعین

شاہ صاحبان کے الفاظ میں اردو اور فارسی ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

”کھڑی رکھ نماز سورج کے ڈھلنے سے، رات کی اندھیری تک اور قرآن پڑھنا فجر کا۔ بیشک قرآن پڑھنا فجر کا ہوتا ہے روبرو^①۔ اور کچھ رات جاگتا رہ۔ اس میں۔ یہ بڑھتی ہے تجھ کو۔ شاید کھڑا کرے تجھ کو تیرا رب تعریف کے مقام^② میں“ (شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ)

”برپا دار نماز را، وقت زوال آفتاب۔ تا نجوم تاریکی شب، و لازم گیر قرآن خواندن فجر را، ہر آئینہ قرآن خواندن فجر را حاضر می شود فرشتگان۔ و در بعض شب بیدار باش بقرآن شب خیزی زیادہ شد برائے تو۔ نزدیک است کہ ایستادہ

کند ترا پروردگار تو بمقام پسندیدہ“ (شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ)

وحي الہی کے کلمات کو شمار کیجئے جو ان آیتوں میں ہیں۔ کل تیس لفظ ہیں مگر آنحضرت ﷺ کے عمل اور کردار پر نظر ڈالئے تو دفتر بے پایاں ہے۔ پانچ فرض ان کے اجراء ترکیبی، قیام، رکوع، سجدہ وغیرہ۔ ان کے اوقات، پڑھنے کا انفرادی اور جماعتی طریقہ پھر ہر ایک کے ساتھ سنتیں، نفلیں، ان کے آداب اور طریقے جو احادیث کے سینکڑوں صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں، یہ سب تلاوت کے معنی واضح کر رہے ہیں۔

فریضہ نماز عام مسلمانوں کے لئے:

چار وقت کی وہ نمازیں جن کا سلسلہ آفتاب ڈھلنے کے وقت سے شروع ہو کر اندھیری رات گئے تک رہتا ہے اور پانچویں وقت کی نماز (صبح کی نماز) جس میں قرآن شریف پڑھنے کی خاص تاکید ہے، کیونکہ یہ ”مشہود“ ہوتا ہے۔ یعنی اس وقت دن اور رات کے کار گزار فرشتوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ یہ پانچ نمازیں آنحضرت ﷺ کی طرح تمام مسلمانوں پر فرض ہیں۔

آنحضرت ﷺ کی خصوصیت:

لیکن آنحضرت ﷺ کی خصوصیت یہ ہے کہ ان پانچ نمازوں کے علاوہ آپ کے لئے ایک اور حکم بھی ہے ”فَتَهَجَّدُ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ“ (بنی اسرائیل۔ ۷۹) جس کے معنی حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے

① یعنی کو اکبر پرستوں کے طریقہ کے برخلاف کو اکبر پرست طلوع آفتاب کے وقت آفتاب کی پوجا کرتے ہیں تو خدا پرستوں کی عبادت طلوع آفتاب سے پہلے ہوتی ہے یا زوال آفتاب کے بعد۔ واللہ اعلم بالصواب
② یعنی دن اور رات کے کار پرداز فرشتے اس وقت جمع ہوتے ہیں۔ وہ قرأت سنتے ہیں کیونکہ وہ قرأت نہیں کر سکتے ان کا وظیفہ تسبیح و تحمید ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

③ وہ تعریف کا مقام ہے شفاعت کا جب کوئی نہ بول سکے گاتب حضرت عرض کر کر خلق کو چھڑا دیجئے تکلیف سے (موضح القرآن)

تشریح

تلاوت آیات اللہ:

يَتْلُوْا عَلَيْنٰهُمْ كَاتِرًا مِّمَّا كَانُوْا فِيْهَا مُعْتَدِيْنَ۔ ”پڑھتا ہے ان پر آیتیں“۔ لیکن پڑھنے ہی کے لئے لفظ قرأت بھی آتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کو حکم ہوا کہ پڑھو تو قرأت کا لفظ ہی لایا گیا: اِقْرَأْ اِيَّا سَمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ مِگر یہاں دعائیں بھی یَتْلُوْنَ ہے اور قبولیت دعائیں بھی ”يَتْلُوْنَ“ ہی ارشاد ہوا ہے یعنی تلاوت کرتا ہے تو کیا قرأت اور تلاوت میں کچھ فرق ہے؟

واقعہ یہی ہے۔ تلاوت اور قرأت میں فرق ہے۔ تلاوت کے معنی ① صرف پڑھنے کے نہیں ہیں بلکہ تلاوت میں عمل بھی ملحوظ ہوتا ہے۔ پھر عمل بھی ایسا کہ تسلسل کے ساتھ ہوتا ہے۔ یعنی تلاوت میں صرف قول نہیں ہوتا بلکہ ”قول مع ② سنی پیہم“ یعنی جس طرح آپ آیتیں سنائیں گے ساتھ ساتھ عمل اور عمل کے تسلسل کا بھی مشاہدہ کرادیں گے، یعنی جس طرح یہ ایک معجزہ ہے کہ ”ایک امی محض“ جس نے عمر عزیز کے چالیس دور اس طرح گزارے کہ پڑھنے پڑھانے سے نا آشنا تھا اس کو ”قرآ“ کا حکم ہو رہا ہے اور وہ قرأت کر رہا ہے اسی طرح اس معجزہ کے ساتھ ایک عجیب و غریب مشاہدہ بھی ہے کہ پڑھ کر سنانے والا جو کچھ پڑھتا ہے وہ خود اس کی عملی تصویر بن جاتا ہے۔ یعنی پڑھنے کے ساتھ ایسا کردار بھی پیش کرتا ہے کہ آپ اس کے عمل سے بھی اس کو پڑھ سکتے ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔

ارشاد ربانی ہے:

اَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِكَ الشَّمْسِ اِلَى غَسَقِ الْاَيْلِ وَفَرَاغِ الْفَجْرِ ۖ اِنَّ فَرَاغَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا ۝ وَمِنَ الْاَيْلِ فَتَهَجَّدُ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ ۚ عَلٰى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝ (سورہ اسراء۔ ۷۸، ۷۹)

① یہ مقصد نہیں ہے کہ تلاوت قرأت اور پڑھنے کے معنی میں نہیں آتا۔ قرآن شریف میں بہت جگہ محض پڑھنے کے معنی میں بھی آیا ہے: وَاتْلُ عَلَيْنٰمْ نَبَا اٰنٰبِیْ اَوَّلِ الْبَاقِی (۲۷-۲۸) اور تَتْلُوْا عَلٰیكَ مِنْ لَّدُنَّا مَوْحٰی وَفَرَاغِ الْفَجْرِ (التقص۔ ۳) وغیرہ۔ مگر جب ماخذ کا لحاظ کیا جائے تو صرف قرأت کے معنی نہیں ہوتے بلکہ کچھ اضافہ بھی ہوتا ہے۔ تفصیل دوسرے حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیے۔

② تلاوت کا ماخذ ”تکو“ ہے جس کے معنی ہیں اتباع کرنا، پیچھے چلنا، اس طرح کہ آپ میں اور جس کے پیچھے چل رہے ہیں اس کے درمیان کوئی اور چیز حائل نہ ہو۔ تلاوة، تبعہ متابعة لیس بینہم مالیس منہا۔ وذلک لیکون تاراة بالجسم وتاراة بالاعتداعی الحکم ومصدرة تلوت وتاراة بالقراءة اوتدیر المعنی مصدره تلاوة والقبر اذا تلاها اراد به ههنا الاتباع علی سبیل الاقتداء والبرتبة وذلک انه یقال ان القبر هو یقتبس النور من الشمس وهولها بمنزلة الخلیفة (ثم قال) والتلاوة تختص باتهام کتب الله المنزلة تاراة بالقراءة وتاراة بالارتسام لباقیها من امر وھی وترغیب وترهیب واملیت وھی فیہ ذلک وهواخص من القراء فکل تلاوة قراءة ولیس کل قراءة تلاوة لایقال تلوت رفعتک وانما یقال فی القراء ان فی شئی اذا قرأته وجب علیک اتباعه (المفردات فی غریب القرآن)

بلسلسلہ عبادت آنحضرت ﷺ کی خصوصیات

نماز کے سلسلہ میں صرف یہی نہیں کہ تہجد آپ پر فرض تھا بلکہ تہجد کے علاوہ بھی اور نوافل آپ کے حق میں فرض کا درجہ رکھتی تھیں۔

روزہ :

نماز کے علاوہ روزے کے بارے میں خصوصیت یہ تھی کہ چند روز کا مسلسل روزہ کہ بیچ میں افطار قطعاً نہ ہو، امت کو اس کی اجازت نہیں۔ مگر آنحضرت ﷺ کا معمول تھا۔ ایک مرتبہ صحابہ کرام نے اصرار کر کے اجازت حاصل کی اور مسلسل روزہ رکھنا شروع کیا مگر صرف دو روز بعد ہی اندازہ ہو گیا۔

نہ ہر جائے مرکب تو اس تاخیر کہ جاہا سپر باید انداختن

حضرات علماء نے روزے کے تین درجے قرار دیئے ہیں:

- (۱) عوام کا روزہ یعنی فقہی قاعدوں کے مطابق کھانے پینے وغیرہ سے رکنا، اور مکروہات و محرکات یعنی فیبت، جھوٹ، خیانت، حسد، مکرو فریب وغیرہ سے اجتناب و احتیاط۔
 - (۲) خواص کا روزہ، یعنی صرف مکروہات و محرکات سے اجتناب نہیں بلکہ ایسی جائز چیزوں سے بھی احتیاط برتی جائے جو یاد خدا سے غافل کر دیں۔ مثلاً شعر شاعری، یا شکار وغیرہ
 - (۳) اخص الخواص کا روزہ۔ اللہ کے سوا ہر چیز سے یکسوئی اور برطرفی اور صرف ذات حق جل مجدہ، میں محویت اور اس کی ذات و صفات میں ایسی مشغولیت کہ وہی جملہ توجہات کا محور ہو۔
- آنحضرت ﷺ کے روزے کی یہی شان ہوتی تھی اور یہ شان نقطہ عروج پر پہنچ جاتی تھی جب آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔
- آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

الخلق عیال الله فاحب الخلق الى الله من احسن الى عیاله

- ① مثلاً ظہر کی سنتیں اگر وقت پر نہ پڑھی جائیں تو ان کی قضا نہیں ہے۔ لیکن ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کی ظہر کی سنتیں رہ گئیں تو آپ نے نماز عصر کے بعد ان کو پڑھا۔ بخاری شریف ص ۱۶۳ و ۱۶۵ پھر ان کو معمول بنالیا۔ بخاری شریف ص ۸۳ حالانکہ نماز عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک اور نماز صبح کے بعد سے طلوع آفتاب تک نوافل سے آنحضرت ﷺ نے ممانعت فرمائی ہے۔ بخاری شریف ص ۸۳ مگر چونکہ آپ کے حق میں نوافل فرض کا درجہ رکھتی تھیں لہذا آپ نے عصر کے بعد یہ نقلیں پڑھیں (واللہ اعلم بالصواب)
- ② بخاری شریف ص ۲۶۳ باب التکلیل کن اکثر الوصال۔
- ③ مشکوٰۃ شریف از شعب الایمان للبیہقی باب الشفعہ والرحمۃ علی الخلق۔

یہ کئے ہیں: ”کچھ رات جاگتا رہا اس میں (نماز پڑھنے میں) یہ بڑھتی ہے تجھ کو“۔ یعنی یہ خاص طور پر آپ کے حق میں اضافہ ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے ترجمہ کیا ہے۔ ”شب خیزی زیادہ شد برائے تو“ گویا نماز تہجد بھی آپ پر فرض ہے۔ یہ فرض امت پر نہیں۔ امت کے حق میں صرف سنت ہے، نہ پڑھیں تو کوئی گناہ نہیں۔ مگر آپ کے حق میں فرض ہے۔

اس خصوصیت کی علت اور حکمت بھی بیان کر دی گئی کہ آپ کو مقام محمود کا منصب عالی عطا کرتا ہے۔ عَسَىٰ اَنْ يَّتَّعَبَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا (بنی اسرائیل۔ ۷۹) (قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہیں ایسے مقام پر پہنچائے جو عالمگیر اور دائمی ستائش کا مقام ہو، جس کی ہر طرح تعریف کی جائے) جن کے رتبے ہیں سو ان کو سوا مشکل ہے:

یہ ایک عام اصول ہے یہاں یہی ظاہر کرنا ہے کہ سرور کائنات ﷺ کا جس طرح یہ مقام عالی ہے کہ ”بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر“ اسی طرح آپ کے فرائض میں بھی اضافہ ہے اور ایسا اضافہ کہ عام انسانوں کو یہ حوصلہ نہیں ہے کہ اس اضافہ کو برداشت کر سکیں۔ یہ حوصلہ بھی رب محمد نے صرف محمد ہی کو عطا فرمایا تھا۔ جس نے اس اضافہ کو برداشت کیا۔

① مگر یہ اضافہ عجیب قسم کا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یا رسول اللہ آپ تو معصوم و مغفور ہیں پھر یہ ریاضت کیوں کہ پائے مبارک پر درم آجاتا ہے تو آپ نے جواب دیا۔ افلا اکون عبدًا شکوہاً؟ کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ ہوں؟ بخاری شریف ص ۱۶۷ یعنی عام اہل ایمان کے لئے فرضیت اس لئے ہے کہ گناہوں کا کفارہ ہو اور آپ کے لئے فرضیت برنماء شکر ہے۔ اسی لئے نقلیں جو شکر ادا کرنے کے لئے ہوتی ہیں وہ آپ کے حق میں فرض ہیں (واللہ اعلم بالصواب)

② برداشت کرنے کی صورت ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نیت باندھنے میں آپ نے تین دفعہ اللہ اکبر فرمایا، پھر فرمایا: ذوالملکوت والجبوت والکبیر یا عو العظمت (مالک ملک، اقتدار اعلیٰ کا مالک، بڑائی اور عظمت والا) پھر قرأت شروع کی تو پوری سورہ بقرہ نہایت اطمینان سے پڑھی پراسی کے مناسب بہت طویل رکوع کیا۔ پھر اتنا ہی طویل قیام کیا پھر اتنا ہی طویل سجدہ کیا، سجدہ کے بعد بڑے اطمینان سے دیر تک بیٹھے رہے۔ پھر دوسرا سجدہ کر کے کھڑے ہوئے تو سورہ آل عمران پوری پڑھی۔ تیسری رکعت میں سورہ نساء مکمل چوتھی رکعت میں سورہ مائدہ یا سورہ الانعام پوری پڑھی۔ صحابی کے بعد کے راوی شعبہ کو شک ہے کہ کوئی سورت کا نام لیا تھا۔ (ابوداؤد باب ما یقول فی الرکوع) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے آنحضرت ﷺ ایسا بھی کرتے تھے کہ تین دفعہ میں تہجد پڑھا کرتے تھے یعنی ایک مرتبہ اٹھے وضو کیا مسواک کی، نقلیں پڑھیں پھر آرام فرمایا، توڑی دیر تک سوتے رہے پھر اٹھے اس طرح تین دفعہ سوئے پھر اٹھے اور نوافل پڑھتے تھے (مسلم شریف) ظاہر ہے بار بار اٹھنا کتنا شاق ہوتا ہے۔ پھر تلاوت کی صورت حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے یہ بیان فرمائی کہ ایک ایک حرف الگ الگ سمجھ کر (بخاری شریف، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آخر میں آپ تہجد کی نماز بیٹھ کر ادا فرماتے تھے مگر صورت یہ ہوتی تھی کہ پہلے بیٹھ کر پڑھتے رہتے جب تیس چالیس آیتیں رہ جاتیں تو کھڑے ہو کر پڑھتے، پر رکوع کیا کرتے تھے۔ (بخاری شریف ص ۱۲۵ و ۱۵۱ وغیرہ)

نہیں نکلے صرف ہتھیار سجائے ہیں۔ اس وقت ہر ایک مسلمان کے لئے جائز ہے کہ وہ اسلحہ اتار دے اور موقع ہو تو ارادہ جنگ بھی ملتوی کر دے۔ لیکن آنحضرت ﷺ ہتھیار سجانے کے بعد جائز نہیں سمجھتے تھے^۱ کہ اسلحہ اتار دیں جب تک فیصلہ کن جنگ نہ کر لیں۔

غرض یہ کردار تھا جس کو پیش کرتے ہوئے آپ آیات اللہ کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ جو قرآن نہیں پڑھ سکتے تھے وہ آپ کے عمل سے آیات اللہ کی تلاوت کیا کرتے تھے۔

خلاصہ کلام :

تلاوت آیات اللہ کی تشریح کو ہم تبرکاً شہید و فاعل اللہ^۲ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے اشعار پر ختم کرتے ہیں۔

- ۱۔ وفینا رسول اللہ یتلو کتابہ اذ انشق معروف من الفجر ساطع
 - ۲۔ ارانا الہدی بعد العی ققلو بنا بہ موقنات ان ماقال واقع
 - ۳۔ بییت یجانی جنبہ عن فراشہ اذا استثقلت بالبشرکین المضاجع
- (بخاری شریف ص ۱۵۵)

”ترجمہ: (۱) ہمارے پیچ میں اللہ کے رسول ہیں) ﷺ (جو کتاب اللہ کی تلاوت اس وقت کرتے ہیں جب کہ وہ معروف اور جانی پہچانی شئی جو روشن ہوتی ہے جس کو فجر کہتے ہیں۔ شق ہوتی ہے (پوچھتی ہے) (۲) اس اللہ کے رسول نے ہمیں ناپہنائی (گراہی) کے بعد ہدایت کا راستہ دکھایا۔ پس ہمارے قلوب اس کا یقین رکھتے ہیں کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ ہو کر رہے گا۔ (۳) یہ اللہ کے رسول اس طرح رات گزارتے ہیں کہ آپ کا پہلو بستر سے الگ رہتا ہے (خاص) اس وقت جبکہ مشرکین (بستر پر دراز ہوتے ہیں اور) بستر ان کے جثوں سے بوجھل ہوتے ہیں۔

تعلیم الکتاب

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابُ:

ہزاروں فتاویٰ اور فیصلے جن سے ملت اسلامیہ کے اہل علم حضرات فقہاء استدلال کرتے ہیں اور غیر مسلم فضلاء کے لئے شمع بصیرت ہیں وہ انہیں غیر متمدن اور پس ماندہ کاشکاروں یا چرواہوں کے ارشاد فرمودہ ہیں جن کی پس ماندگی کا شاہد ایران مذاق اڑایا کرتا تھا اور خود مکہ کے سردار ان کو

^۱ الہدایہ والنہایہ ص ۱۳۳ ج ۴
^۲ وہ چار غار اور فد اکا جو غزوہ موتہ میں شہید ہوئے۔

ترجمہ: ”مخلوق، اللہ کا کنبہ ہے، بس خلق خدا میں اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب وہ ہے جو اللہ کے عیال پر احسان کرے۔“

عجیب و غریب بات یہ ہوتی تھی کہ جس طرح توجہ الی اللہ اور ذات حق میں انہماک بڑھتا تھا اتنا ہی اس کی مخلوق کے حق میں رحم و کرم اور جو د و سخا کا درجہ بڑھتا تھا یعنی پروردگار کی محبت اس کی پروردہ مخلوق پر لطف و احسان کی صورت میں جلوہ گر ہوتی تھی۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شہادت ملاحظہ فرمائیے۔

کان رسول اللہ ﷺ اجود الناس وکان اجود ما یكون فی رمضان حین یلقاہ جبرئیل وکان یلقاہ فی کل لیلة من رمضان فیدارہ القرآن فلما رسول اللہ ﷺ اجود بالخیمر من الریح المرسلة^۱ ”(یعنی) رسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ سخی تھے اور آپ کی بے پناہ سخاوت کا زیادہ ظہور رمضان میں ہوتا تھا۔ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ سے ملاقات کیا کرتے تھے اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کی ملاقات رمضان شریف کی ہر ایک رات میں ہوتی تھی۔ وہ آپ سے قرآن شریف کا دور کیا کرتے تھے۔ بس واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی سخاوت اور بخشش جو سال بھر نسیم صبح رہتی تھی اس زمانہ میں وہ آندھی سے زیادہ تیز ہو جاتی تھی جس کے جھونکے کسی رکاوٹ کے پابند نہیں ہوتے ہر طرف پہنچتے ہیں اور ہر ایک کو متاثر کرتے ہیں۔

زکوٰۃ:

امت کے لئے ایک نصاب معین کیا گیا کہ اس سے کم پر زکوٰۃ ہی واجب نہیں ہوتی، اور جب واجب ہو جاتی ہے تو صرف چالیسواں حصہ دینا ہوتا ہے۔ باقی سب مال حلال و مباح بلکہ پاکیزہ اور طیب۔ مگر آنحضرت ﷺ کا دستور العمل پہلے گزر چکا ہے کہ آپ نے طے فرمایا تھا کہ کاشانہ نبوت سونے چاندی سے پاک رہے گا۔ دینار تو دینار درہم کی بھی مجال نہیں تھی کہ وہ دولت کدہ پاک میں رات گزار سکے۔*

جہاد:

جہاد کے سلسلہ میں عام مسلمانوں کے لئے زحف عن القتال (یعنی جنگ کے وقت میدان جنگ سے بھاگ جانا) حرام ہے، لیکن آنحضرت ﷺ کی شان یہ تھی کہ ابھی دو لکھدہ سے بھی

^۱ بخاری شریف ص ۲۰۵ و غیرہ
 * اس سلسلہ میں مفصل بحث پہلے گزر چکی ہے کہ کس طرح سب کچھ خرچ کر کے فاقہ اختیار کیا جاتا تھا (محمد میاں)

حقیر سمجھتے تھے، یہاں تک کہ ابو جہل کو جاکتی کے وقت صدمہ تھا تو یہ کہ اس کو مدینہ کے کسانوں نے مارا۔ یا ان کے ارشادات و فرمودات ہیں جو مکہ کے معمولی دوکاندار تھے اور تحقیق کی جائے تو ان میں کچھ وہ بھی تھے جو رہنری کیا کرتے تھے اور کچھ وہ تھے کہ بقول علامہ حالی:

فتیش تھا، غفلت تھی، دیوانگی تھی غرض ہر طرح کی حالت بری تھی

ان حضرات نے نہ کسی کالج یا یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی نہ کسی دارالعلوم یا دارالافتاء سے استفادہ کیا تھا۔ ان کی تعلیم گاہ و تربیت گاہ اسی ہادی اعظم کی خس پوش مسجد تھی جس کو رب العرش نے تعلیم کتاب کے لئے مبعوث فرمایا تھا۔

پھر ان میں سے ۲۳ سالہ دور نبوت کے رفقاء تو چند ہی تھے جن کی تعداد چالیس بھی نہیں تھی۔ مدینہ طیبہ کا دس سالہ دور بھی سب کو نصیب نہیں ہوا۔ بہت سے وہ تھے جن کو دو تین سال اور بعض وہ بھی تھے جن کو چند ماہ ہی میسر آئے مگر اخذ و استنباط کی وہ غیر معمولی بصیرت نصیب ہو گئی کہ یونیورسٹیوں اور دارالعلوموں کے تعلیم یافتہ فضلاء ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ بصیرت کے ساتھ جو وسعت ذہن میسر آئی وہ بھی پیغمبرانہ تربیت کی برکت تھی۔ یعنی جس طرح وہ خود اخذ و استنباط سے کام لیتے تھے وہ بھی یقین رکھتے تھے کہ اسی طرح اخذ و استنباط کا حق دوسرے کو بھی ہے۔ وہ جس طرح اپنی رائے کا احترام کرتے تھے دوسرے کے فیصلہ کا بھی اسی طرح احترام کرتے تھے۔

چنانچہ جن اجتہادی مسائل میں آج اختلاف ہے حضرات صحابہ کے دور میں بھی یہ اختلاف تھا۔ اسی لئے ہر ایک فریق کے پاس جس طرح آنحضرت ﷺ کی کوئی حدیث ہے کسی صحابی کا قول، یا فیصلہ بھی، وہ اپنے خزینہ یادداشت میں محفوظ رکھتا ہے، مگر باہمی تصادم سے یہ حضرات محفوظ تھے۔ اور سبق آموز بات یہ ہے کہ نہ باہمی رشک و حسد تھا، نہ شوق تعلیٰ نہ جذبہ برتری، تحقیق مسئلہ کے وقت کھلے طور پر تنقید اور جرح، مگر وقت نماز آگیا تو جماعت میں سب شریک، بسا اوقات امام وہی بنا جو نشانہ اختلاف تھا۔

یہ تھا تعلیم الکتاب کا ایک رخ اور حضرات صحابہ پر اس کا اثر۔ دوسری صورت ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) قرآن حکیم میں تغیر خلق اللہ یعنی اللہ کی بنائی ہوئی صورت میں تبدیلی پیدا کرنے کو شیطانی فعل فرمایا گیا ہے۔^① مگر تغیر خلق اللہ کا لفظ عام ہے۔ جس طرح مردوں کا خصی کرنا تغیر خلق اللہ ہے اور حرام ہے، ختنہ کرنا بھی تغیر خلق اللہ ہے۔ علیٰ ہذا بدن کے کسی حصے کے بال منڈوانا

① جیسے حضرت ابو ہریرہ ابو موسیٰ اشعری، خالد بن ولید، عمرو بن العاص، عدی بن حاتم رضی اللہ عنہم
② سورہ نساء آیت ۱۱۹

یا کٹوانا۔ یا اکھاڑنا، ناخون تراشنا یا گدھوانا، یا عورتوں کے سر کے بال مصنوعی طور پر بڑھانا یا چہرے کے بال نوچنا، دانتوں میں مصنوعی طور پر کشادگی پیدا کرنا، ان باتوں میں خدا کی بنائی ہوئی صورت میں تبدیلی ہوتی ہے۔ پس جس کو اللہ تعالیٰ نے تعلیم الکتاب کے لئے مبعوث فرمایا تھا اس نے ان تمام کی تفصیل فرمائی۔ بعض تغیرات کو مستثنیٰ فرمایا۔ مثلاً ارشاد فرمایا:

الفطرة خمس، الختان والاستحدا، وقص الشارب وتقليم الاظفار وتنشف الابط^①
یعنی یہ پانچ چیزیں، اگرچہ ان میں تغیر خلق اللہ ہے مگر یہ تغیر بتقاضاء فطرت ہے، یہ تغیر حرام نہیں ہے بلکہ فطرت ہے۔ ختنہ کرنا، موئے زیر ناف کو صاف کرنا، مونچھیں کٹوانا، ناخون کتروانا، بغل کے بال اکھیڑنا۔

اس کے مقابل دوسرا ارشاد یہ ہوا:

خالقوا البشر کین۔ وفر والدھی واعفوا الشوارب^②
”مشرکین کے خلاف یہ طریقہ اختیار کرو کہ دائرہ بڑھاؤ اور مونچھوں کو خوب باریک کتر دواؤ“

عورتوں کے متعلق ارشاد ہوا:

لعن الله الواشبات والمتوشبات والمتفلجات للحسن المغيرات لخلق الله۔^③
ترجمہ: ”ان عورتوں پر خدا کی لعنت جو گودتی ہیں جو گوداتی ہیں جو بال نوچتی ہیں جو خوبصورتی پیدا کرنے کے لئے دانتوں میں کشادگی کراتی ہیں جو خدا کی بنائی ہوئی صورت کو بدلتی ہیں۔“
خلاصہ یہ کہ تغیر خلق اللہ کی تفسیر و تشریح کہ بعض کو جائز اور مستحسن قرار دیا اور بعض کو ممنوع اور حرام۔ یہ فریضہ نبوت تھا جس کو آنحضرت ﷺ نے انجام دیا۔
(۲) ارشاد ربانی ہے

وَاحْلَأَ اللَّهُ النَّبِيَّ وَحَتَمَ الرِّبَا (سورہ البقرہ۔ ۲۷۵)

”اللہ تعالیٰ نے خرید و فروخت (تبادلہ) کو حلال قرار دیا اور ربا (ایسی زیادتی جو بدل سے زیادہ ہو) کو حرام قرار دیا۔“

اب قرض کی صورت میں اگر پانچ روپیہ کے بجائے چھ روپیہ وصول کئے جاتے ہیں تو ظاہر ہے یہ ایک روپیہ بدل سے زائد ہے۔ ربا یعنی سود ہے۔ لیکن اگر ایک تولہ چاندی کو دو تولہ

① بخاری شریف ص ۸۷۵

② بخاری شریف ص ۸۷۵

③ بخاری شریف ص ۸۷۹

آنحضرت ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم اعلیٰ بنا کر بھیجا تو آپ نے دریافت فرمایا:

کوئی مقدمہ آپ کے سامنے آئے گا تو آپ کس طرح فیصلہ کریں گے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: کتاب اللہ کے مطابق اور اگر کتاب اللہ میں اس معاملہ کے متعلق کوئی صراحت نہیں ہوگی تو رسول اللہ کی سنت کے بموجب۔ اور اگر سنت رسول اللہ یعنی آپ کے جو ارشادات یا واقعات میرے علم میں ہیں ان میں اس کی کوئی نظیر نہیں ہوگی تو اپنے اجتہاد سے کام لوں گا۔

آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے سینہ پر دست مبارک رکھ کر فرمایا: الحمد للہ وفق رسول رسول اللہ لیسری فیہ رسول اللہ

”الحمد للہ، اللہ تعالیٰ نے رسول کے رسول (فرستادہ) کو اس کی توفیق فرمائی جس کو اللہ کا رسول پسند کرتا ہے۔“

اس ارشاد گرامی نے حضرات مجتہدین کے اجتہاد کی تصویب اور تائید فرمادی۔

تعلیم الحکمہ

یعلیہم الکتب والحکمة:

سکھاتے ہیں ان کو (علماء امت کو) کتاب اور حکمت ۱ یعنی کتاب اللہ کی تعلیم کے ساتھ آپ ایسے اصول کی تعلیم بھی دیتے ہیں جن پر قانونی عدل اور دستور و آئین کی حسین اور شاندار عمارت سربلک کی جاسکے۔ آنحضرت ﷺ کے خطبات ملاحظہ فرمائیے: وہ ایسے ہی اصول کا مجموعہ ہیں یہاں خطبات کے علاوہ چند حدیثوں کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے:

ارشاد ہوا۔ حلال بھی واضح ہے حرام بھی واضح ہے۔ لیکن دونوں کے درمیان کچھ ایسے امور

۱ قرآن حکیم میں یہ الفاظ تین جگہ آئے ہیں۔ سورہ بقرہ، سورہ آل عمران اور سورہ جمعہ، حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے حکمت کا ترجمہ سورہ بقرہ اور آل عمران میں علم کیا ہے اور سورہ جمعہ میں دانش۔ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے (علی الترتیب) تین ترجمے کئے ہیں: یکی باتیں، کام کی بات، عقلندی۔ مگر ظاہر ہے یہ سب ترجمے تشریح طلب ہیں۔ احقر نے اپنے الفاظ میں اس کی تشریح کر دی ہے۔ جہاں تک حضرات مفسرین کا تعلق ہے تو ان کے ارشادات یہ ہیں۔ مایکمل نفوسهم من المعارف والاحکام وقیل فی السننہ وقیل فی القضاء وقیل الفقہ (ص ۱۳۱ تفسیر مظہری ج ۱) الحکمة العلوم الحقہ المستحکمة التي يستفيدها الحكيم من الحكيم بلاتوسط (کتاب دلائیان تفسیر مظہری ص ۱۶۶ ج ۳۲) الحکمة الشریعة المطابقة بشرائم الانبياء في الاصول المشهود عليها بالكتب السبادية بالقبول ايضا (تفسیر مظہری ص ۱۶۵ ج ۹) اصابة الحق بالعلم والعقل قضيه صادقہ (المفردات فی غریب القرآن)

چاندی، یا ایک سیر گیہوں کو دو سیر گیہوں کے بدلہ میں فروخت کیا جائے۔ تو کیا یہ بیع جائز ہوگی؟ آنحضرت ﷺ نے اس کو بھی حرام فرمایا۔ اور نہ صرف چاندی اور گیہوں بلکہ اس طرح ۱ کی اور چیزوں کے متعلق بھی نہایت سختی کے ساتھ ہدایت فرمائی کہ اگر ہم جنس سے تبادلہ ہے مثلاً سونے کی بیع سونے کی کسی چیز سے ہو رہی ہے تو اس میں بھی مساوات اور نقد ہونا ضروری ہے، نہ کم و بیش جائز ہے نہ ادھار۔ ۲

ان دو مثالوں میں سے ایک کا تعلق خرید و فروخت سے ہے دوسرے کا تعلق آرائش بدن سے۔ ان کے علاوہ ہزاروں مسائل ہیں جن کا تعلق عبادات، معاملات، معاشرت، اقتصاد، امور خانہ داری، آداب مجلس یا ملکی سیاست یا بین الاقوامی تعلقات سے ہے۔ قرآن حکیم نے ان کے متعلق اصولی تعلیم دی ہے اور کہیں صرف اشارہ کر دیا ہے۔

ارشادات رسول اللہ ﷺ جو کتب حدیث کے ہزاروں صفحات میں محفوظ ہیں ان کی توضیح اور تشریح کرتے ہیں۔ پھر حضرات ائمہ مجتہدین نے ان سے اصول اخذ کر کے پیش آنے والے معاملات کو ان اصول کے معیار پر جانچ کر احکام مرتب کئے جو کتب فقہ میں منضبط ہیں۔

ارشادات رسول اللہ ﷺ کی تصدیق حضرت حق جل مجدہ نے فرمادی کہ ارشاد ہوا:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (النجم آیت ۳)

”اپنی چاہ اور اپنے نفس کی خواہش پر آپ کچھ نہیں کہتے، آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ وحی ہوتی ہے جو آپ پر نازل کی جاتی ہے۔“

نیز حضرت حق جل مجدہ کا ارشاد ہے:

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (حشر۔ ۷)

جو کچھ تمہارے سامنے پیش کریں رسول، اس کو لے لو، اور جس سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔“

۱ حدیث میں ایسی کچھ چیزیں شمار کی گئی ہیں جن کا تبادلہ اگر ہم جنس سے ہے تو زیادتی اور ادھار حرام ہے۔ تبادلہ برابر برابر اور ہاتھ در ہاتھ ہونا چاہئے۔ چاندی، سونا، گیہوں، جو، کھجور اور نمک۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اس سے یہ اصول اخذ کیا کہ ایسی تمام چیزیں جو وزن کر کے یا صاع یا رطل جیسے پیمانہ سے ناپ کر بیچی جائیں اگر ان کا تبادلہ ہم جنس سے کیا جائے تو ان میں مساوات اور ہاتھ در ہاتھ ہونا ضروری ہے لہذا چاول، جوار، کی وغیرہ کا تبادلہ اگر ہم جنس سے کیا جائے مثلاً چاول کی بیع چاول سے کی جائے تو مساوات اور ہاتھ در ہاتھ ہونا ضروری ہے نہ اضافہ جائز ہے نہ ادھار، کیونکہ یہاں جنس کا بھی اتحاد ہے اور قدر بھی متعہ ہے کہ دونوں وزن ہیں وزن کر کے بیچی جاتی ہیں۔ واللہ اعلم

۲ پانچ سیر گیہوں کی قیمت ایک روپیہ بھی لگا سکتے ہیں اور ایک ہزار روپیہ بھی۔ یہ پانچ اور مشتری کی یا بھی رضامندی پر ہے کہ وہ پانچ سیر گیہوں کو ایک روپیہ کی برابر قرار دیں یا ایک ہزار کے برابر۔ لیکن ہم جنس میں یعنی گیہوں کی بیع گیہوں سے ہو تو وہاں پانچ سیر گندم کو دس سیر گندم کے برابر قرار دینا غلط ہو گا۔ البتہ جو جنس ایسی ہے کہ وہ میل یا وزن کر کے نہیں بیچی جاتی، گزروں سے ناپ کر یا مثلاً شمار کر کے بیچی جاتی ہے جیسے کپڑا، وہاں امام ابو حنیفہ کے مسلک کے مطابق یہ جائز ہے کہ ایک گز کپڑے کو ایک ہزار گز کپڑے کے عوض میں بیچا جائے مگر نقد۔

فرمایا: ”سائل کہاں ہے“۔ گویا اس سوال کو آپ نے معقول قرار دیا۔ پھر فرمایا: ”بیشک خیر شر کو نہیں لانا بشرطیکہ خیر کے تقاضوں کو پورا کرتے رہو“۔ (یعنی دولت کی بنا پر جو حقوق ہوتے ہیں ان کو ادا کرتے رہو)۔ پھر آپ نے مثال دیتے ہوئے فرمایا: ”دیکھو موسم بہار میں جو سبزہ پیدا ہوتا ہے اگر جانور اس کو کھائے چلا جائے تو وہ سبزہ (جو نہایت عمدہ ہے اور سراسر خیر ہے) جانور کو مار ڈالتا ہے یا نیم جان کر دیتا ہے۔ ہاں وہ جانور جو سبزہ کھا کر ساتھ ساتھ ہضم بھی کرتا ہے اور سبزہ سے شکم سیر ہونے کے تقاضے کو پورا کرتا ہے، مثلاً یہ کہ یہی مویشی جب سبزہ سے شکم سیر ہو جائے اور اس کی کہیں تن جائیں تو گھومے پھرے، دھوپ میں بیٹھے۔ پھر فضلہ خارج کرے (اس کے بعد کھائے تو مفید ہو گا) پھر ارشاد ہوا: دیکھو یہ مال ہر ابھرا اور شیریں ہے۔ پس وہ اس مسلمان کا بہت اچھا دوست ہے جو مسکینوں، یتیموں، مسافروں اور ضرورت مندوں کو فراموش نہ کرے، ان کو بھی آسودہ کرتا رہے۔ اور دیکھو جو شخص بلا استحقاق کے مال لیتا ہے (مثلاً سوال کر کے) تو اس کی مثال ایسی ہے کھاتا رہتا ہے پیٹ نہیں بھرتا۔“

ترکیہ

دیکھئے

(مولانا ابوالکلام آزاد)

ان کو مانجھتا ہے

(حضرت شاہ عبدالقادر)

ان کو سنوارتا ہے

ظاہر ہے یہ دوسرا ترجمہ زیادہ حاوی^①، جامع اور واقعہ اور حقیقتِ حال کے زیادہ مطابق ہے۔

کیونکہ آنحضرت ﷺ نے اہل ایمان کو صرف مانجھا ہی نہیں بلکہ ان کو آراستہ بھی کیا ہے ان کو حسین اور جمیل بھی بنایا ہے۔ یعنی مانجھنے کے بعد سنوارا^② بھی ہے۔ جس طرح یہ عمل بہت مشکل ہے کیونکہ یہ ایک کیمیا ہے اور کیمیا بھی وہ جو کانسٹی یا پیتل کو نہیں بلکہ زیر پاگردوس و خاشاک کو سونا بناتا ہے اسی طرح اسکی وسعت بھی اتنی زیادہ ہے کہ ہزاروں صفحات کے دامن بھی اس کو نہیں سمیٹ سکتے کیونکہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کو سنوارنے کی ضرورت نہ ہو۔

① لغت سے بھی قریب تر یہی ترجمہ ہے یعنی سنوارتا ہے۔ کیونکہ لفظ زکوٰۃ کے معنی صرف پاک کرنا نہیں ہیں بلکہ خوشگوار اور تروتازہ بنانے کے ہیں۔ ذی الرجل صلدہ وتنعم فہو ذی (قاموس) والذکوٰۃ لغة الطهارة والنباء والبركة البدن (تجلی البحار) الزکوٰۃ النبواالحاصل من بركة الله تعالى (الی ان قال) ویزکاء النفس وطهارتھا یصید الانسان بحیث یستحق فی الدنیا الاوصاف المحمودۃ وفی الاخرۃ الاجر المشوۃ (المفردات فی غریب القرآن)

ہیں جن میں کچھ مشابہت حلال کی ہے کچھ مشابہت حرام کی۔ پس جس نے ایسے مشتبہ امور سے تقویٰ اختیار کیا اور احتیاط برتی۔ اس نے اپنے دین کو بھی اعتراض سے بری کر لیا اور اپنی آبرو بھی بچالی اور جو ان مشتبہ امور میں پڑ گیا اس کی مثال اس چرواہے کی ہے جو اپنے مویشی سرکار کی محفوظ چراگاہ کے پاس چراہا ہے قریب ہے کہ وہ مویشی کو اس چراگاہ میں اتار دے۔

”یاد رکھو ہر ایک سرکار کی چراگاہ ہوتی ہے۔ یاد رکھو (احکم الحاکمین) اللہ تعالیٰ کی چراگاہ حرام امور ہیں۔ یاد رکھو بدن میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے وہ ٹھیک رہتا ہے تو بدن ٹھیک رہتا ہے۔ وہ بگڑ جائے تو بدن بگڑ جاتا ہے۔ یاد رکھو یہ گوشت کا ٹکڑا ہے جس کو ”دل“ کہا جاتا ہے۔“^①

اس ارشاد گرامی نے بہت سے اصول کی تعلیم دیدی۔ مثلاً یہ کہ^② ایسے تمام امور جن کے جواز اور عدم جواز میں کلام ہو۔ تقویٰ یہ ہے کہ ان کو نہ کیا جائے۔ اصطلاح فقہ میں ایسے امور کو مکروہ کہا جاتا ہے جو درجہ بدرجہ تنزیہی، تحریمی، پھر تحریمی قریب مجرم ہوتا ہے۔

یا مثلاً یہ کہ عقائد و خیالات کی اصلاح سب سے مقدم ہے۔ عقائد خراب ہوتے ہیں تو دل کے جذبات بھی خراب ہوتے ہیں، جو عمل کو خراب کر دیتے ہیں۔

(۲) اسی حدیث میں یہ اضافہ بھی ہے۔^③

”پس جو شخص مشتبہ کام کو چھوڑ دے وہ غیر مشتبہ حرام کو بدرجہ اولیٰ چھوڑ دیکر اور مجرمانہ جرأت کر کے مشتبہ کام کرنے لگے تو وہ عنقریب حرام میں بھی مبتلا ہو جائے گا۔“

(۳) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں^④۔ ایک روز آنحضرت ﷺ تشریف فرماتے۔ ہم بھی مجلس مبارک میں حاضر تھے۔ ارشاد ہوا:

”اپنے بعد مجھے تمہارے متعلق جس بات کا خطرہ ہے وہ دنیا کی وہ رونق و زینت ہے جو پوری زیائش کے ساتھ تمہارے سامنے آئے گی۔“

ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ کیا خیر بھی شر کو لاسکتا ہے؟ (یعنی جب یہ رونق و زینت حلال اور جائز راستہ سے آئے گی تو پھر اس سے خطرہ کیوں ہے)۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ اس سوال پر آنحضرت ﷺ نے خاص توجہ فرمائی۔ آپ خاموش ہو گئے اور دیر تک خاموش رہے۔ ہمیں خیال ہوا کہ شاید وحی نازل ہو رہی ہے۔ اس کے بعد آپ نے پسینہ پونچھا اور دریافت

① بخاری شریف ص ۱۳

② اس اصول کو سامنے رکھ کر فاتحہ، سونم، چہلم، برسی، شبِ برات، بی بی فاطمہ کی صحت و محفل میلاد قیام وغیرہ پر نظر ڈالئے۔

③ بخاری شریف ص ۲۷۵

④ بخاری شریف ص ۱۹۸

اور جو حسین و جلیل بننے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔

فرد میں بھی خرابی ہوتی ہے۔ جماعت میں بھی، باطن میں بھی، ظاہر میں بھی، مرد میں بھی اور عورت میں بھی، پھر اندرون خانہ، بیرون خانہ، حلقہ درس و تلقین، محفل طرب و نشاط، بزم شعر و سخن، انجمن خورد و نوش، بازار، تجارتی کاروبار، بارگاہ عدل و انصاف یا ایوان سیاست اجتماعی مطالبات اور ان سے متعلق خواص کے نظریات، عوام کے جذبات، طرح طرح کی تحریکات، سیاسی چالیں، شاطرانہ حرکتیں، میدان جنگ، جشن فتح یا صلح کا نفرنس وغیرہ۔ قدرتی بات ہے کہ ان میں خرابیاں بھی ہوتی ہیں اور خوبیاں بھی۔ خرابیوں کو دور کر کے خوبیاں پیدا کرنا۔ خرابیوں کے عوامل اور محرکات کو پہچان کر دلوں کو ان سے پاک کرنا اور ان کے برخلاف خدا پرستی، صدقات ہمدردی، اخلاص اور ان کے جذبات کو دلوں کے نہان خانوں میں جلوہ گر کرنا ان سب کا نام ”تزکیہ“ ہے۔^۱ ان تمام وسعتوں کے ساتھ ”تزکیہ“ کو فرائض نبوت میں شمار کیا گیا۔ یہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ خاتم الانبیاء والمرسلین ﷺ نے اس فریضہ کو حسن و خوبی اور کامیابی کے ساتھ انجام دیا۔ مگر کس طرح انجام دیا اور آئندہ کے لئے کیا کیا۔ ہدایتیں فرمائیں ان کی تفصیلات کے لئے آپ حدیث، تفسیر، فقہ، سیر و مغازی، تہذیب اخلاق، تصوف و احسان کی کتابیں ملاحظہ فرمائیں۔ اس مختصر مجموعہ میں ان کا مختصر بیان بھی ممکن نہیں ہے۔ یہاں صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ ان تمام فرائض میں جو پہلے بیان کئے گئے (علاوہ آیات اللہ۔ تعلیم الکتاب تعلیم الحکمہ) تزکیہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ گویا نصب العین تزکیہ ہی ہے اور تمام امور اس کے مقدمات اور ابتدائی مراحل ہیں۔

تزکیہ کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ نہ صرف عبادات و اخلاق اور احسان و سلوک کی بنیاد تزکیہ پر ہے بلکہ اسلام نے معاشرت، معیشت، سیاسی نظام اور اس کے لئے مالی نظام انتہائی کہ جنگ اور صلح کی بنیاد بھی تزکیہ پر ہی رکھی ہے۔ مقاتلہ و مبارزہ، دشمن کو تباہ کرنا، اس کے ملک کو برباد کرنا ”جہاد فی سبیل اللہ“ اسی وقت ہو گا جب لڑنے والے وہ ہوں جو اپنا تزکیہ کر چکے ہوں۔ تزکیہ کے بغیر یہ قتل و قاتل فساد فی الارض ہے۔ یہی تزکیہ ہے۔ جو زندگی کے ہر ایک شعبہ میں کار فرما ہے۔ مثلاً

۱۔ معاشرت اور سماجی زندگی میں سب سے پہلی چیز نکاح اور ازدواج ہے۔ وحی الہی کی ہدایت ہے۔ قُلْ لِّبَنَاتِنَا مِثْنُ مِثْنٍ يَغْفُلُونَ مِّنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَخْفَلُونَ فَرُّوْهُمْ ۚ ذٰلِكَ اَدْنٰى لِّهٖمْ ۚ اِنَّ

۱۔ مثلاً صرف مرض بخل رفع نہیں کیا بلکہ سیر چشمی، وسعت نظر اور جذبات ہمدردی خلق خدا سے ان کو آراستہ بھی کیا۔ (محمد میاں)

* ملاحظہ فرمائیے آیت ۱۶۳ سورہ آل عمران و آیت ۲ سورہ جمعہ جو قبولیت دعا کے سلسلہ میں ص ۳۶۹ پر گزری اور اس سے بڑھ کر کامیابی کیا ہو سکتی ہے کہ حضرات صحابہ کو کتاب اللہ نے ارشادوں کی سند عطا فرمادی اور انہیں کو رشد و ہدائی کا معیار قرار دیا اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰسِخُوْنَ ۝ فَضَّلَا مِّنَ اللّٰهِ وَلِغَنَّةٍ (سورہ ہجرات ۸)

اللّٰهُ خَبِيرٌۢ بِمَا يَصْنَعُونَ ۝ (سورہ نور۔ ۳۰)

”کہہ دیجئے مسلمانوں سے، نیچی رکھیں اپنی نگاہیں اور حفاظت کرتے رہیں اپنی شرمگاہوں کی۔ یہ ان کے لئے زیادہ تزکیہ (صفائی اور پاکی) کی بات ہے بیشک اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں۔“

اس تزکیہ کو سامنے رکھ کر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

يا معشر الشباب من استطاع منكم الباءة فليتزوج فانه اغض للبصر واحسن للفرج ومن لم

يستطاع فعليه بالصوم فانه له وجاء^۱

نوجوانو! جو ازدواجی زندگی کی ضروریات پورا کرنے کی استطاعت اور گنجائش رکھے وہ ازدواجی زندگی اختیار کرے^۲ کیونکہ اس سے نگاہ پوری طرح نیچی ہوتی ہے اور فرج کی پوری حفاظت ہوتی ہے اور جس میں یہ گنجائش نہ ہو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ روزے رکھے جو شہوانی رجحانات کو مفلوج اور مضحل کر دیتے ہیں۔

ایک دوسرے کے مکان میں جانے کے لئے وحی الہی نے استیذان کو ضروری قرار دیا کہ پہلے اجازت حاصل کرو۔ استیذان کے ساتھ سلام بھی کرو۔ پھر ارشاد ہوا:

وَ اِنْ قِيْلَ لَكُمْ اِذْجِعُوْا فَاِذْجِعُوْا هٰذَا اٰذْنٰى لَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (سورہ نور۔ ۲۸)

”اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس ہو جاؤ تو واپس ہو جایا کرو۔ یہی تمہارے لئے صفائی اور سحرانی (تزکیہ) کی بات ہے اور جو تم کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے۔“^۳

۲۔ معیشت اور کاروبار کے سلسلہ میں تجارت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے لیکن تاجر کے لئے ضروری ہے کہ ”الصدوق الامین“ (پوری طرح سچا معاملہ کرنے والا امانت دار) ہو۔ خیانت اور غلط بیانی وغیرہ سے تزکیہ کر چکا ہو۔

۱۔ بخاری شریف ص ۷۵۸

۲۔ اسلام تجرد کو پسند نہیں کرتا۔ تجرد رہبانیت ہے اور سادہ موہنا ہے جو نصب العین نہیں بن سکتا۔ کیونکہ زندگی کی دلچسپیوں کو ختم کر دیا جائے تو ترقیات کی طرف بڑھنے والے قدم بوجھل ہو جائیں، دنیا اپنی رونق کو کھو بیٹھے اور معاشرہ انسانی کی چمک چمک پھل ختم ہو جائے۔ اسلام ارتقاء اور تعمیر کا حامی ہے۔ وہ کسی گوشہ میں بھی تخریب کو پسند نہیں کرتا صرف اس تخریب کو جائز قرار دیتا ہے جو تعمیر کے لئے ہو۔

۳۔ شروع سے پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے ”اے ایمان والو مت جایا کرو گھروں میں اپنے گھروں کے سوا۔ جب تک ان سے اجازت نہ لے لو اور (اجازت لینے سے پہلے) ان کے رہنے والوں کو سلام نہ کرلو (مثلاً یہ کہو: السلام علیکم! کیا حاضر ہو سکتا ہوں) یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ توقع ہے کہ تم اس کا پورا خیال رکھو گے۔ پھر اگر ان گھروں میں تم کو کوئی آدمی معلوم نہ ہو تب بھی ان گھروں میں نہ جاؤ جب تک تم کو اجازت نہ دیدی جائے۔ اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس جاؤ تو واپس ہو جاؤ۔ یہی تمہارے لئے صفائی سحرانی کی بات ہے۔“

ہر طرح کے کاروبار کے سلسلہ میں ارشاد ہوا: اللہ تعالیٰ طیب (پاک صاف ستھرا) ہے وہ پاک اور ستھرائی کو پسند کرتا ہے اور پاک اور ستھری چیز ہی قبول کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بھی ان باتوں کا حکم فرمایا جن کا حکم انبیاء علیہم السلام کو فرمایا تھا۔ انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”اے گروہ پیغمبران! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو“^①۔

اسی طرح مسلمانوں کو خطاب فرمایا: اے ایمان والو! کھاؤ وہ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں ”اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے اس شخص کا ذکر کیا جو لمبا سفر کرتا ہے، پر آگندہ سر، گرد سے اٹا ہوا اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا کر دعا کرتا ہے: یارب! یارب اور حالت یہ ہے کہ اس کی خوراک حرام، اس کا پانی حرام (ناجائز طریقہ سے حاصل کیا ہوا) اس کا لباس حرام، حرام غذا سے اس کا نشوونما ہوا۔ ایسے شخص کی دعا کیا قبول ہو سکتی ہے؟ (ترمذی شریف تفسیر سورہ البقرہ ص ۱۲۳ ج ۲) حرص، طمع، خود غرضی، بخل، نفع اندوزی، ناپاک خصلتیں ہیں جن سے تزکیہ ضروری ہے۔ یہی خصلتیں ربو اور سود کی علت پیدا کرتی ہیں۔ لہذا نہ صرف سود حرام ہے بلکہ ہر ایسا کاروبار اور ہر ایسا معاملہ حرام جس میں سود کا شبہ ہو۔

سیاسی نظام میں چوٹی کا فرد یعنی سربراہ وہ ہونا چاہئے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ یعنی تزکیہ نفس میں سب سے بڑھا ہوا ہو۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (سورہ حجرات- ۱۳)

”اللہ کے یہاں سب سے زیادہ مستحق احترام وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا ترس اور پرہیزگار ہو۔“

حکومت کیا ہے:

اسلام نے نماز اور روزہ کی طرح حفاظت جان و مال، عصمت اور آبرو کی حفاظت، تعلیم و تربیت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر یعنی اچھی باتیں بتانا ان پر عمل کرنا، بری باتوں سے خود رکنا اور دوسروں کو بھی روکنا، عدل و انصاف، غریبوں کی پرورش، کمزوروں کی مدد، مظلوموں کی فریاد رسی، بیمار کی تیمارداری، ملک اور قوم کی حفاظت وغیرہ کو بھی افراد کے فرائض قرار دیا ہے یعنی ہر ایک مسلمان کا خود اپنا فرض ہے کہ اپنی پوری طاقت و استطاعت ان فرائض کو انجام دینے میں مصروف کرے، ورنہ وہ عند اللہ جوابدہ ہوگا۔ لیکن جب تک باہمی تعاون نہ ہو بہت سے فرائض ایسے ہیں

① ایسے تاجر کا حشر انبیاء علیہم السلام اور صدیقین اور شہداء امت کے ساتھ ہوگا (ترمذی و ابن ماجہ وغیرہ) اس کے برخلاف جو تاجر خیانت کرے (اچھا نمونہ دکھا کر برائیاں دے یا ملاوٹ کرے، وغیرہ) اس کے متعلق ارشاد ہوا کہ اس کو مسلمان کہنا درست نہیں (من غش فليس مننا۔ ترمذی شریف ص ۱۵۷) چور بازاری کرنے والا ملعون ہے (المسکر ملعون۔ ابن ماجہ وغیرہ) ② مثلاً عدل و انصاف اور مظلوموں کی فریاد رسی کے لئے چچا نتوں یا عدالت کا قیام، غریبوں اور کمزوروں کے وظائف، تعلیم و تربیت کے لئے تعلیمی اور اصلاحی ادارے، بیماروں کی تیمارداری کے لئے ہسپتال اور شفا خانے، ملک و قوم کی حفاظت کیلئے قوت و دفاع یعنی فوج اور سامان جنگ وغیرہ۔

جو انجام نہیں پاسکتے۔ اسی باہمی تعاون کے وسیع نظام کا نام نظام حکومت ہے اس کے سربراہ کو خلیفہ المسلمین کہا جاتا ہے یعنی تمام مسلمانوں کا نائب اور ان کا قائم مقام۔

مالی نظام:

سیرۃ مبارکہ کا دامن اس جبر و قہر سے پاک ہے جو ٹیکسوں کے وصول کرنے کے لئے عمل میں لایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظام حکومت کی مالی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لئے جو مالیہ وصول کیا جائے اسلام نے اس کی بنیاد بھی تزکیہ پر رکھی ہے۔ خود غرضی، حرص و طمع، حب مال اور بخل وہ ناپاک خصلتیں ہیں جن سے نفس مومن کا پاک ہونا ضروری ہے۔ یہ نفس کی خباثت ہے کہ دولت و ثروت کی محبت قومی اور ملی ضرورتوں سے اس کی آنکھ بند کر دے۔

جس طرح نماز روزہ فرض ہے ایسے ہی جہاد بھی فرض ہے، جو مال سے بھی ہوتا ہے اور جان سے بھی، جو اسلام اور ایمان کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کی بیداری یہ ہے کہ مسلسل ① جہاد کرتا رہے۔ صاحب مال جہاد الممال بھی کرے گا۔ یہ جہاد درحقیقت خود اپنے نفس سے ہوگا۔ وہ نفس جو بارگاہ بخل ② اور دربار حرص و طمع میں ہر وقت حاضر رہتا ہے اس کو مجبور کرنا ہوگا کہ وہ اس ظلمت کدہ سے نکلے۔ خود غرضی کی غلاطت سے اپنا دامن پاک کرے۔ ③

ہنگامی اور غیر معمولی ضرورتوں کے لئے جو امداد حاصل کی جائے قرآن حکیم نے اس کو اتفاق فی سبیل اللہ یا قرض کا عنوان دیا ہے۔ لیکن ایک مقررہ چندہ جو صاحب نصاب پر سال بہ سال

① مقصد یہ ہے کہ تمام فرائض جو حکومت کے فرائض قرار دیئے جاتے ہیں اسلام نے ان کو اہل ایمان کے شخصی اور ذاتی فرائض قرار دیا ہے۔ اسلامی تعلیم کے بموجب اگر ان فرائض کا احساس ہوگا تو اس کا مبارک نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت کوئی ہے نہ تاجرہ اور چہرہ دست طاقت نہیں ہوگی جو قانون کے ذریعے اپنی چیرہ دستی کا مظاہرہ کرے بلکہ نظام حکومت ذریعہ تعاون اور امداد باہمی کا ایک رابطہ ہوگا جس میں ہر ایک فریق دوسرے کا مددگار، احسان مند اور دعا گو ہوگا۔ قوم اپنے سربراہ اور اس کے کارپردازوں کی شکر گزار اور احسان مند اس لئے ہوگی کہ ان کے ذریعہ اس کے ذاتی فرائض حسن و بخوبی سے انجام پارہے ہیں۔ سربراہ اور اس کے اعمال قوم کے شکر گزار اس لئے ہونگے کہ قوم کے تعاون نے ان کی ذمہ داری کی مشکلات کو آسان کر دیا۔ آنحضرت ﷺ کے ایک ارشاد کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے جو اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ترجمہ یہ ہے: ”تمہارے بہترین سربراہ وہ ہیں کہ تم ان سے محبت کرو وہ تم سے محبت رکھیں۔ تم ان کو دعائیں دو وہ تم کو دعائیں دیں اور بدترین سربراہ وہ ہونگے کہ تم ان سے بغض رکھو وہ تم سے بغض رکھیں۔ تم ان پر لعنت بھیجو وہ تم پر لعنت بھیجیں۔“ (مسلم شریف ص ۱۲۹ ج ۲) إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ

أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ (البقرہ- ۱۱۱)

② وَأَخْضَرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ (النساء- ۱۲۸)

③ وَمَنْ يُؤْتِ شَيْئًا فَنَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْبَاقُونَ (الحشر- ۹)

فرض ہوتا ہے اس کا نام زکوٰۃ ہے کیونکہ اس کا مقصد تزکیہ ہے۔ یعنی نفس مومن کو بخل کی آلودگی سے پاک کرنا۔ اس تمہید کے بعد ارشاد ربانی کے مضمرات پر گہری نظر ڈالئے۔
ارشاد ربانی ہے:

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ (توبہ، ۱۰۳)
ترجمہ: ”اے رسول! ان لوگوں کے مال سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرو (یہ اس لئے کہ) تم ان کو (بخل اور حب مال کی پلیدی سے) پاک کرو اور ان کا تزکیہ کرو (ان کو سدھارو اور ان کی تربیت کرو کہ ہمدردی خلق خدا، سیر چشمی، داد و دہش اور امداد باہمی وغیرہ کے وہ عادی ہو جائیں اور یہ باتیں ان کی طبیعت ثانیہ بن جائیں) اور ان کو دعا دو۔ بیشک آپ کی دعا ان کے دلوں کے لئے راحت و سکون ہے۔

حب مال سے صحابہ کرام کے مبارک قلوب کس درجہ پاک ہوئے، حضرات مہاجرین اور حضرات انصار کی قربانیاں اس کی مثال پیش کرتی ہیں۔ حضرات مہاجرین کے پاس جو کچھ تھا وہ انہوں نے مکہ میں خرچ کیا اور اس حالت میں مدینہ پہنچے کہ قرآن حکیم نے ان کے لئے لفظ فقراء استعمال کیا۔

حضرات انصار کی قربانیاں آپ اسی کتاب میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ تمام جائیدادیں نصف نصف تقسیم کر چکے۔ پھر بھی ان کی آرزو رہتی تھی کہ راہ خدا میں زیادہ سے زیادہ خرچ کریں۔ آنحضرت ﷺ نے بحرین کی جائیدادوں سے ان کے نقصانات کی کچھ تلافی کرنی چاہی تو اس کو لینے سے معذرت کر دی کہ پہلے مہاجرین کو آپ عنایت فرمائیں۔ تب یہ جائیدادیں لیں گے ورنہ ہمیں ضرورت نہیں ہے۔

حب جان سے تزکیہ کا اندازہ کرنے کے لئے اس بے پناہ شوق شہادت پر نظر ڈالئے جو ان حضرات کے مبارک دلوں اور سینوں میں بھر دیا گیا تھا۔

”فَوَيْلٌ لِلْكَعْبَةِ“ (میں کامیاب ہو گیا ہوں خدا کی قسم) کسی مجاہد نے دشمن کے قتل کرنے پر نہیں کہا تھا۔ حرام بن طحان کے جب دھوکہ سے نیزہ مارا گیا اور خون کا فوارہ ابل پڑا تو اس خون شہادت سے وضو کرتے ہوئے آپ نے نعرہ لگایا تھا:
”فَوَيْلٌ لِلْكَعْبَةِ“ (رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا)

① لَقَدْ آتَيْنَا الْكُرَيْشَ الْإِسْلَامَ فَجَاءُوا مِنْ دُونِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ (سورہ حشر-۸)

② قال بدمه فكذا فنفذه على وجهه وراسه ثم قال فَوَيْلٌ لِلْكَعْبَةِ (بخاری شریف ص ۵۸۷) اشارہ کر کے بتایا کہ خون کو اس طرح چلو میں لیا اور اس کو چہرہ پر ڈالا سر پر چھڑکا اور کہا فَوَيْلٌ لِلْكَعْبَةِ

(میں اپنی مراد کو پہنچ گیا) یہ پڑ تو تھا اس آرزو شہادت کا جس کے لئے سید الانبیاء کا قلب مبارک بیتاب رہا کرتا تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے میری تمنا ہے کہ راہ خدا میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔^①
حضرت عبداللہ بن حبشی رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: سب سے افضل جہاد کون سا ہے؟
ارشاد ہوا: ”مذاہیق دمہ وعقہ جوادہ“^② جس کا گھوڑا بھی مارا گیا اور خود اس کا خون بھی بہا دیا گیا۔

تزکیہ کا عجیب و غریب طریقہ:
مرض کے علاج کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ کسی مقوی خمیرہ سے بدن کی اصل طاقت کو بڑھا دیا جائے تو قوت غریزیہ مرض کو دور کر دیگی۔ شراب جو عرب کی کھٹی میں پڑی تھی اس کے انسداد کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔
وحی الہی ناطق ہوئی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَغْرُبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ (نساء-۴۳)
”مسلمانو! (ایسا نہ کرو کہ تم نشہ کی حالت میں ہو اور نماز پڑھنی شروع کر دو) نشہ کی حالت میں تو نماز کے پاس بھی نہ جاؤ (نماز کے لئے ضروری ہے کہ) تم ایسی حالت میں ہو کہ جو کچھ زبان سے کہو ٹھیک طور پر اسے سمجھتے ہو۔“

یہ ارشاد ربانی خمیرہ مقوی تھا۔ نماز اور اپنے خالق کی بارگاہ میں سر نیاز خم کرنے کی عادت ہو چکی تھی۔ شوق نماز نے شوق نشہ کو کار فور کر دیا۔ شراب سے وحشت ہونے لگی۔ محفل میں دوراب بھی چلتا تھا۔ مگر دلوں کا سرور ختم ہو چکا تھا۔ اچانک حرمت شراب کا اعلان ہو گیا۔ تو نہ شراب باقی رہی نہ محفل شراب۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت ابو عبیدہ بن الجراح، حضرت ابی بن کعب، حضرت ابو طلحہ (رضی اللہ عنہ) جیسے اکابر کی مجلس تھی۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ ساقی میں خود تھا۔ میں عمر میں بھی سب سے کم تھا۔ منادی کی آواز کانوں میں پڑی۔ مجھ کہا گیا: باہر نکل کر دیکھو آواز کیسی ہے۔ میں نے آواز سنی اور آکر کہا۔ اعلان ہو رہا ہے:
”الان الخبر قد حرمت“ (آگاہ ہو جاؤ، شراب حرام کر دی گئی ہے)

① بخاری شریف ص ۳۹۲،

② ابوداؤد شریف باب بعد باب فی فضل الطلوع فی البیت ص ۲۱۱ و ص ۲۱۲۔ مجتہبی

میزبان محفل صاحب خانہ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے فوراً فرمایا: ”جاؤ مٹکے اندھا دو“ میں نے تعمیل کی۔ اب پورے مدینہ کی حالت یہ تھی کہ شراب گلیوں میں بہہ رہی تھی۔ جیسے ہی اعلان کانوں میں پڑا مٹکے اوندھے کر دیئے گئے، کسی نے اس تحقیق کی بھی ضرورت نہیں سمجھی کہ اعلان کون کر رہا ہے، کس بنا پر کر رہا ہے۔^①

تزکیہ کا عجیب و غریب نمونہ جینا و بال جان :

ایک مومن کامل^② سے زنا سرزد ہو گیا۔ دوسرے موقع پر یہی حرکت ایک مومنہ سے بھی سرزد ہو گئی۔ تلافی کا ایک راستہ یہ بھی تھا کہ پورے اخلاص کے ساتھ توبہ کر لیتے۔ ناامیدی کی کوئی وجہ نہیں تھی جب کہ ارشاد ربانی کا سہارا موجود تھا: ”اے میرے بندو، جنہوں نے زیادتی کی اپنے اوپر (گناہ کئے) ناامید مت ہو اللہ کی رحمت سے اللہ تعالیٰ سب گناہ بخش دیتا ہے۔“ (الزمر- ۵۳)

مگر آئینہ کو مانجنے سے بہتر یہی ہے کہ آئینہ ہی کو توڑ دیا جائے۔ وہ آئینہ ہی کیا جس پر دھبہ پڑ گیا۔ غور فرمائیے اس سے زیادہ تزکیہ کیا ہو سکتا ہے کہ خود اپنی جان و بال ہونے لگے۔ یہ صاحب ان کا نام ماعز تھا۔ ابن مالک۔ خدمت مبارک میں حاضر ہوئے۔ فریاد کر رہے تھے:

”یا رسول اللہ طہی“ (یا رسول اللہ مجھے پاک کر دیجئے)

ارشاد ہوا: ”ویحک ارجع فاستغفر اللہ وتب الیہ“ (بندہ خدا! جاؤ، استغفار کرو، توبہ کر لو) یہ ارشاد سن کر کچھ چلے۔ مگر دل مضطرب کا اضطراب ختم نہیں ہوا، پھر لوٹ کر آئے فریاد کرتے ہوئے:

”یا رسول اللہ طہی“ (یا رسول اللہ مجھے پاک کر دیجئے)

آنحضرت ﷺ نے پھر واپس کر دیا۔ تین مرتبہ اسی طرح ان کو واپس کیا۔ مگر ان کے اضطراب نے ہر مرتبہ انہیں لوٹنے پر مجبور کیا تب چوتھی مرتبہ فرمایا: کس ناپاکی سے پاک کر دوں۔ عرض کیا یا رسول اللہ میں نے زنا کیا ہے^③۔ پھر آپ نے باقاعدہ چار مرتبہ اقرار کیا اس

① بخاری شریف ص ۶۶۳ و ص ۸۳۷

② مسلم شریف ص ۲۶۷

③ آپ نے یہ بھی فرمایا: تمہیں جنون تو نہیں ہو گیا ہے۔ تمہیں شراب کا نشہ تو نہیں ہے۔ حضرت ماعز نے انکار کیا اور اپنے اعتراف پر قائم اور پاک کرنے کے اصرار کرتے رہے۔ حضرت ماعز پھر بھی مرد تھے۔ ان سے زیادہ حیرت انگیز اور سبق آموز واقعہ قبیلہ غامد کی ایک خاتون کا ہے۔ اس نے اگر اسی طرح اعتراف کیا اور یہی اصرار کیا۔ طہی۔ مجھے پاک کر دیجئے۔ یہ حاملہ تھی۔ آپ نے فرمایا: پہلے ولادت سے فارغ ہو لو۔ جب بچہ ہو گیا تو پھر آئی اور اصرار کیا

کے بعد رجم کا حکم صادر کیا گیا۔ چنانچہ ان کو سنگسار کر دیا گیا۔ مگر یہ جو پاک ہونے کے لئے مضطرب تھے اب ان کی پاکی ملاحظہ فرمائیے۔ انہیں ماعز کے متعلق آنحضرت ﷺ نے بشارت دی کہ ایسی توبہ کی ہے کہ اگر پوری امت پر بانٹ دی جائے تو سب کے لئے کافی ہو جائے۔ تزکیہ۔ جو بعثت مبارکہ کا اہم مقصد تھا اس کو کس طرح عمل کے پیرایہ میں جلوہ گر فرمایا: اس کی وضاحت کے لئے چند مثالیں کافی ہیں ان سے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ یہ مقصد کس درجہ ہمہ گیر ہے۔

اس کتاب میں یا کسی ایک کتاب میں اس کے تمام شعبے بیان نہیں کئے جاسکتے۔ لہذا یہ کوشش لا حاصل ہے۔ البتہ اتنی تفصیل بیان کر دینی ضروری ہے جس سے شب و روز کی زندگی میں تزکیہ کا نقشہ اور تزکیہ والے کی ایک تصویر سامنے آجائے۔

رات دن میں جو کام انسان عادی کرتا ہے اور سونے جاگنے، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے میں جو حالات سامنے آتے رہتے ہیں۔ اور گزرتے رہتے ہیں ان کے آداب کیا ہیں جن کی آنحضرت ﷺ نے تعلیم فرمائی۔ اور بندہ اور اس کے خالق کے تعلق کو کس طرح نمایاں فرمایا۔

طہی۔ مجھے پاک کر دیجئے۔

آپ نے فرمایا: ابھی بچہ کو دودھ پلاؤ۔ دودھ چھوٹنے کے بعد پھر آئی۔ بچہ گود میں اور اسکے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا۔ اور یہی اصرار کہ مجھے پاک کر دیجئے۔ فرمایا: بچہ کا ذمہ دار کون ہو گا۔ ایک انصاری نے بچہ کا ذمہ لیا تب اس کو رجم کیا گیا۔ (مسلم شریف ص ۶۶۸) حیرت انگیز اور قابل قدر یہ ہے کہ یہ معاملہ خود اس کے اقرار پر تھا، شہادتوں سے اس کا ثبوت نہیں ہوا تھا تو جس مرحلہ پر بھی اعتراف کرنے والا مجرم اپنے جرم کا انکار کر دے اس پر حد نہیں جاری ہوگی۔ آنحضرت ﷺ نے یہ سوال کر کے کہ تمہیں جنون تو نہیں ہو گیا، تم نے نشہ تو نہیں پی رکھا۔ بار بار موقع دیا کہ وہ کسی طرح اپنے جرم کا انکار کر دے۔ اس خاتون کو ولادت پر دودھ پلانے تک کی مہلت دیکر انکار کر دینے کا موقع دیا۔ مگر حیرت ہوتی ہے ان کا ایمان اور اپنے ناپاک ہو جانے کا یقین اتنا مضبوط تھا کہ کسی صورت سے بھی اس میں جنبش نہیں ہوئی اور جس طرح پہلے اعتراف کے وقت اپنی زندگی کو وبال جان سمجھ رہے تھے، آخر تک وہ ان کو وبال ہی معلوم ہوتی رہی۔ مگر اس ایمان محکم کا یہ نتیجہ تھا کہ آنحضرت ﷺ نے جس طرح حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کی توبہ کی تعریف کی تھی اس خاتون کے متعلق بھی فرمایا کہ ایسی توبہ کی ہے کہ بڑے سے بڑا ظالم بھی ایسی توبہ کرے تو بخشا جائے۔

فضائل اخلاق

إِنَّكَ لَعَلَّ خُلُقٍ عَظِيمٍ

کتاب اللہ کی شہادت

رسول اللہ ﷺ عالم انسانیت کے لیے فضائل و مکارم اخلاق کا بہترین نمونہ تھے۔ جس وجود مبارک کو پوری اولاد آدم کے لیے قیامت تک اسوہ حسنہ قرار دیا گیا۔ اس کی حیثیت اس کے سوا ہو بھی کیا سکتی تھی؟ اس کا پہلا شاہد قرآن پاک ہے۔

(۱) وَإِنَّكَ لَعَلَّ خُلُقٍ عَظِيمٍ ﴿۳﴾ (سورہ قلم۔ ۳)

”(اے پیغمبر) تم اعلیٰ اخلاق پر پیدا ہوئے۔“

(۲) فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنْتَ فَطَا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۚ

(آل عمران: ۱۵۹)

”(اے پیغمبر) خدا کی یہ بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے اس قدر نرم مزاج واقع ہوئے کج خلق اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے ہٹ جاتے (یعنی ان کے دل تمہاری طرف اس طرح نہ کھینچتے جس طرح اب بے اختیار کھینچ رہے ہیں)۔“

(۳) لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ

بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۲۸﴾ (توبہ: ۱۲۸)

”(مسلمانو) تمہارے پاس اللہ کا رسول آگیا ہے، جو تم ہی میں سے ہے۔ تمہارا رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق گزرتا ہے۔ وہ تمہاری بھلائی کا بھوکا ہے۔ مومنوں کے لیے نہایت شفیق و رحیم ہے۔“

حضور ﷺ کے ارشادات

حضور ﷺ کے ارشادات ملاحظہ ہوں:

بعثت لاتبم حسن الاخلاق۔

”میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔“

انباء بعثت لاتبم مکارم الاخلاق۔

”میں تو اسی لیے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کا معاملہ درجہء اتمام پر پہنچا دوں۔“

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی خبر ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ تک پہنچی تھی تو انھوں نے اپنے بھائی کو تحقیق احوال کے لیے مکہ مکرمہ بھیج دیا تھا۔ بھائی نے مکہ مکرمہ سے مراجعت پر ابوذر رضی اللہ عنہ کو ان الفاظ میں اطلاع دی:

رايتہ يا مریب مکارم الاخلاق ۱

”میں نے آپ ﷺ کو دیکھا ہے۔ آپ ﷺ اعلیٰ اخلاق کا حکم دیتے ہیں۔“

یہ بعثت کے بالکل ابتدائی دور کا واقعہ ہے۔ اس دور میں بھی جس کسی کی نظر آپ ﷺ پر پڑی، آپ ﷺ میں جو نمایاں ترین وصف نظر آیا، اسے فضائل اخلاق ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان

امام حسین رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضور ﷺ کے اخلاق و عادات کے متعلق سوال کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

آپ ﷺ خندہ جبیں، نرم خور اور مہربان طبع تھے۔ سخت مزاج اور متنگدل نہ تھے۔ کوئی برا کلمہ کبھی منہ سے نہ نکلا۔ عیب جو اور تنگ گیر نہ تھے۔ کوئی بات ناپسند ہوتی تو اس سے انماض فرماتے۔ اپنے نفس سے آپ ﷺ نے تین چیزیں بالکل دور کر دی تھیں: (الف) بحث و مباحثہ، (ب) ضرورت سے زیادہ بات کرنا (ج) جو بات مطلب کی نہ ہو، اس میں پڑنا۔ دوسروں کے متعلق بھی تین ہی باتوں سے پرہیز کرتے تھے: (الف) کسی کو برا نہیں کہتے تھے (ب) کسی کی عیب گیری نہیں کرتے تھے (ج) کسی کے اندرونی حالات کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے۔ وہی باتیں کرتے جن سے کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا۔ آپ ﷺ کلام کرتے تو صحابہ اس طرح سر جھکا کر اور خاموش ہو کر سنتے گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔ جب آپ ﷺ خاموش ہو جاتے تو پھر (صحابہ) آپس میں بات چیت کرتے۔ کوئی دوسرا بات کرتا تو جب تک ختم نہ کر لیتا آپ ﷺ چپ سنا کرتے۔ لوگ جن باتوں پر ہنستے، آپ ﷺ محض مسکرا دیتے۔ باہر کا کوئی آدمی (یعنی اجنبی) بے باکی سے گفتگو کرتا تو آپ ﷺ تحمل فرماتے۔ دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سنا پسند نہیں کرتے تھے تاہم اگر کوئی آپ ﷺ کے احسان و انعام کا شکریہ ادا کرتا تو قبول فرما لیتے۔ جب تک بولنے والا چپ نہیں ہو جاتا تھا، آپ ﷺ اس کی بات نہیں کانٹتے تھے۔ نہایت فیاض، نہایت

۱ بخاری کتاب الادب، باب حسن الخلق واسما

بادل دیکھتے ہیں تو اس امید پر خوش ہوتے ہیں کہ بارش ہوگی۔ آپ ﷺ کے چہرے سے تکلیف نمایاں ہوتی ہے۔ فرمایا: عائشہ! کون سی بات مجھے بے خوف کر سکتی ہے کہ اس میں عذاب نہ ہوگا؟ ایک قوم کو آندھی سے عذاب دیا گیا۔ ایک قوم نے عذاب دیکھا تو کہا یہ بادل ہے۔^۱

- ۶۔ آپ ﷺ نے نام لے کر کبھی کسی پر لعنت نہ کی، نہ کبھی اپنے کسی خادم، کسی لونڈی، کسی غلام، کسی عورت اور کسی جانور کو اپنے ہاتھ سے مارا۔^۲
- ۷۔ آپ ﷺ نے کبھی کسی کی درخواست رد نہ فرمائی، الا یہ کہ وہ ناجائز تھی۔
- ۸۔ گھر میں تشریف لاتے تو مسکراتے ہوئے آتے، باتیں اس طرح ٹھہر ٹھہر کر کرتے کہ کوئی یاد رکھنا چاہے تو رکھ لے۔^۳
- ۹۔ ایک بدوی آیا اور بولا آپ ﷺ بچوں کو بوسہ دیتے ہیں ہم تو بوسہ نہیں دیتے، فرمایا: اللہ نے تیرے دل سے رحم نکال دیا، اس میں میرا کیا اختیار ہے؟^۴
- ۱۰۔ اسود بن زید نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ گھر میں کیا کیا کرتے تھے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: گھر والوں کی خدمت میں رہتے تھے یعنی ان کے کام کیا کرتے تھے، نماز کا وقت آتا تو نماز کے لیے چلے جاتے۔^۵
- ۱۱۔ اگر کسی کی کوئی حرکت پسند نہ ہوتی تو اس کا نام لے کر منع نہ فرماتے، اصل فعل کو منع فرمادیتے۔

۱۲۔ رسول اللہ ﷺ کے گھر والوں نے ایک دن میں دونوں کھائے، مگر ان میں سے ایک کھجور کا تھا۔^۶

اس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے خادم انس رضی اللہ عنہ بن مالک کا یہ بیان بھی شامل کر لیجیے کہ میں نے دس سال آپ ﷺ کی خدمت میں گزارے، اس پوری مدت میں آپ ﷺ میرے متعلق ناپسند کا کوئی کلمہ زبان پر نہ لائے۔ نہ کبھی یہ فرمایا: فلاں کام کیوں کیا؟ نہ کبھی یہ فرمایا: فلاں کام کیوں نہ کیا؟^۷

صحیح بخاری

سیرۃ النبی جلد اول حصہ دوم ص ۳۸۷ بحوالہ مسلم والیوداد۔

بخاری، کتاب الادب۔

بخاری، کتاب الادب۔

بخاری، کتاب الصلوٰۃ باب اذا دعی الی الامام الی الصلوٰۃ۔

صحیح بخاری، کتاب الرقاق۔

بخاری، کتاب الادب۔

راست گو، نہایت نرم طبع اور نہایت خوش صحبت تھے۔ اگر کوئی آپ ﷺ کو دفعۃً دیکھ لیتا تو مرعوب ہو جاتا۔ لیکن جیسے جیسے آشنا ہوتا جاتا محبت کرنے لگتا۔^۱ اور کہا کرتا کہ میں نے آپ ﷺ جیسا کوئی بھی اس سے پہلے یا بعد میں نہیں دیکھا۔ یہ محض عہد نبوت کے تئیس برس ہی نہیں بلکہ چند سال پیشتر کے عینی مشاہدات کا بھی جامع مرقع ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ہجرت سے قبل رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے بعض اہم واقعات بھی دیکھے تھے اور مدنی زندگی میں تو وہ حضور ﷺ کی رفیقہ حیات بن گئی تھیں۔ یہاں تک کہ اس دنیا میں حضور ﷺ کی حیات طیبہ کا آخری ہفتہ حضرت ممدوحہؓ کی حجرے میں گزرا۔ حضرت ممدوحہ رضی اللہ عنہا نے سہارا دے رکھا تھا، جب روح پاک اس دنیا کو چھوڑ کر عالم قدس میں پہنچی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کے حجرے کو اللہ تعالیٰ نے جسد اطہر کی آخری آرام گاہ بنایا۔ مشاہدے کے جیسے مختلف مواقع حضرت ممدوحہ رضی اللہ عنہا کو میسر آئے، وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہو سکتے تھے۔ آپ ﷺ کے بعض ارشادات ملاحظہ ہوں:

- ۱۔ جب بھی رسول اللہ ﷺ کو دو باتوں میں اختیار دیا جاتا تو آپ ﷺ ان میں سے وہ لے لیتے جو آسان اور سہل ہوتی، بشرطیکہ اس میں گناہ کا کوئی پہلو نہ ہوتا، اگر گناہ ہوتا تو آپ ﷺ سب سے بڑھ کر اس سے دوری اختیار کرتے۔^۲
- ۲۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ذات کے لئے کبھی کسی کو سزا نہ دی اور کبھی بدلہ نہ لیا۔ ہاں اللہ کے حکموں کی حرمت زایل کرنے والوں کو آپ ﷺ اللہ کے لیے سزا دیتے تھے۔^۳
- ۳۔ عادت شریف یہ تھی کہ برائی کے بدلے میں برائی سے کبھی کام نہ لیا۔ ہمیشہ درگزر کرتے اور معاف فرمادیتے۔^۴
- ۴۔ رسول اللہ ﷺ اس طرح کبھی نہ مینے کہ آپ ﷺ کا تالو نظر آیا ہو، صرف مسکرا دیا کرتے تھے۔

۵۔ ہر لحظہ دل پر خوف و خشیت الہی کا غلبہ رہتا تھا، بادل دیکھتے یا آندھی آتی تو چہرہ مبارک پر تکلیف کے آثار نمایاں ہو جاتے۔ میں نے (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے) کہا: یا رسول اللہ! لوگ

سیرت النبی جلد اول حصہ دوم ص ۲۸۹-۲۸۸ بحوالہ شاہ شمس الدین

صحیح بخاری، کتاب المناقب

سیرۃ النبی جلد اول حصہ دوم ص ۲۸۷

سیرۃ النبی جلد اول حصہ دوم ص ۲۸۷

نبوت سے پیشتر کی زندگی

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بیانات کا تعلق زیادہ تر عہد نبوت سے ہے جس کی کل مدتیں سال تھیں۔ اس سے پیشتر آپ ﷺ چالیس سال کی طویل مدت گزار چکے تھے۔ یہی زندگی ہے جسے قرآن مجید میں ایک مقام پر صداقت نبوت کی ایک قوی دلیل قرار دیا گیا ہے یعنی!

فَكَذَّبْتُكُمْ فَبِعَظْمِ عَمْرَأَةٍ مِّنْ قَبْلِهِ ۖ أَفَلَا تَتَعْقِلُونَ (یونس: ۱۶)

”یہ واقعہ ہے کہ میں اس معاملے (یعنی نبوت) سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں، کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں۔“

مشرکین عرب کو رسول اللہ ﷺ کی صداقت و فضیلت سے انکار نہ تھا، حتیٰ کہ ابو جہل کو بھی اعتراف تھا کہ آپ ﷺ سچے ہیں، مگر وہ کہتے تھے کہ آپ ﷺ ایسی باتیں کہتے ہیں جنہیں ہم قبول نہیں کر سکتے۔ اوپر کی آیت میں صداقت نبوت کی ایک سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل بیان کی ہے۔ یعنی فرمایا:

”ساری باتیں چھوڑ دو، ایسی بات پر غور کرو کہ میں تم میں نیا آدمی نہیں، جس کے خصائل و حالات کی تمہیں خبر نہ ہو۔ تم ہی میں سے ہوں اور اعلان وحی سے پہلے ایک عمر تم میں بسر کر چکا ہوں۔ یعنی چالیس برس تک کی عمر کہ عمر انسانی کی پختگی کی کامل مدت ہے۔ اس تمام مدت میں میری زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے رہی۔ بتلاؤ اس میں کوئی ایک بھی بات تم نے سچائی اور دیانت کے خلاف دیکھی؟ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ انسانی معاملے میں جھوٹ بولوں تو کیا اب ایسا ہو سکتا ہے کہ خدا پر بہتان باندھنے کیلئے تیار ہو جاؤں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں، مجھ پر اس کا کلام نازل ہوتا ہے؟ کیا اتنی چھوٹی سی بات بھی تم نہیں سمجھ پاسکتے؟

تمام علماء اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس برس کا زمانہ اس کے اخلاق و خصائل کے ابھرنے اور بننے کا اصلی زمانہ ہوتا ہے۔ جو سانچا اس عرصے میں بن گیا باقیہ زندگی میں بدل نہیں سکتا۔ پس اگر ایک شخص چالیس برس تک صادق و امین رہا تو کیونکر ممکن ہے کہ اکتالیسویں برس میں قدم رکھتے ہی ایسا کذاب و مفتری بن جائے کہ انسانوں ہی پر نہیں، فاطمہ السَّلْمٰوَاتِ وَالْاَزْهٰی (الانعام: ۱۳) پر افترا کرنے لگے؟

چنانچہ بعد میں فرمایا: دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے کہ جو شخص اللہ پر افترا کرے، اس سے بڑھ کر کوئی شریر نہیں اور جو صادق کو جھٹلائے وہ بھی سب سے زیادہ شریر انسان ہے اور شریر مفتری کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے کہ اس کا قانون ہے کہ مجرموں کو فلاح نہیں دیتا۔

چنانچہ اللہ کا فیصلہ صادر ہو گیا۔ جو مکذب تھے، ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ جو صادق تھا، اس کا کلمہ صدق آج تک قائم ہے اور قائم رہے گا۔^۱

دیا جانتی ہے کہ جس دور میں سچائی اور دیانت و امانت کی روشنی گل ہو چکی تھی، اس دور میں رسول اللہ ﷺ نے سیرۃ طیبہ کی پاکیزگی اور طہارت سے ”الصادق اور الامین“ کے لقب حاصل کیے۔ جب حرم کعبہ کی تعمیر کے سلسلے میں حجر اسود کو اصل مقام پر نصب کرنے کے متعلق رؤساء قبائل کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی تو فیصلہ یہ ہوا تھا کہ جو شخص سب سے پہلے حرم میں آئے، اسے ثالث بنالیا جائے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ سب سے پہلے آئے اور تمام لوگ پکار اٹھے: ”امین آگئے۔“ ”امین آگئے۔“ ہمیں ان کا فیصلہ منظور ہے۔ یہ حضور ﷺ کی سیرت کے متعلق ایک ایسی گواہی تھی، جس کی صداقت و محکمیت سے کسی کے لیے بھی اختلاف، بجانہ ہو گا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی شہادت

محض یہی نہیں، ایک نہایت زبردست شہادت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی ہے، جو بعثت تک پندرہ سال رسول اللہ ﷺ کی رفاقت میں گزار چکی تھیں۔ اس کے بعد دین حق کے دور غربت کی اذیتیں اور مصیبتیں بھی دس سال تک صابرانہ برداشت کر کے عالم بقا کو سدھاریں۔ یہ شہادت بھی عہد بعثت سے نہیں بلکہ بعثت سے پیشتر ہی کی زندگی سے متعلق ہے۔

سورہ علق کی آیتیں آپ ﷺ پر نازل ہو چکیں تو اول نزول وحی کی شدت کا آپ ﷺ پر بے حد اثر تھا اور یہ پہلی وحی تھی، معلوم ہے کہ اس کے بعد بھی جب وحی نازل ہوتی تھی تو چہرہ مبارک پر پسینے کے قطرے نمودار ہو جاتے تھے۔ دوم جو گراں قدر کام اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ذمے لگا دیا تھا، اس کی بے پناہ مشکلات کا آپ ﷺ کو پورا اندازہ تھا، اس لیے آپ ﷺ وہ حرا سے اتر کر گھر تشریف لائے تو قلب مبارک پر لرزہ سا طاری تھا۔ جب طبیعت ذرا سکون پذیر ہوئی تو آپ ﷺ نے پوری کیفیت غمخوار و غمگسار و فیکہ حیات کو سنا کر فرمایا: لقد خشیت علی نفسی (مجھے اپنی جان کا خوف ہے)۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کے نہایت پاکیزہ اور سراپا خیر طریق حیات سے پوری طرح آگاہ تھیں۔ انہیں خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ خلق خدا کے ساتھ محبت و شفقت کے ایسے نادر پیکر کو قدرت کامیابی کی منزل پر نہ پہنچائے گی۔ چنانچہ آپ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے کہا:

”ہر گز نہیں، خدا کی قسم، خدا آپ ﷺ کو کبھی اندوہ گیں نہ کرے گا۔ آپ ﷺ

عزیزوں اور رشتہ داروں سے حسن سلوک کرتے ہیں۔ ناتوانوں، بیکسوں اور غریبوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا، انہیں دیتے ہیں۔ مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں۔ مصائب میں حق کے معاون و مددگار ہیں۔^۱ صادق القول ہیں۔^۲

یہ شہادت ان فضائل و مکارم کے متعلق ہے جو بعثت سے پیشتر وجود گرامی میں موجود تھے اور حضرت خدیجہؓ سے بڑھ کر ان کا اندازہ شناس کون ہو سکتا تھا؟

اہل ایمان کے اوصاف و خصائل

رسول اللہ ﷺ کے فضائل اخلاق کا اندازہ کرنے کے لیے ایک معیار یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اہل ایمان کے جو اوصاف و خصائل قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں انہیں سامنے رکھ لیا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس وجود مبارک کے ذریعے سے قرآن مجید کی تعلیم مخلوق تک پہنچائی، وہ بہر حال اس تعلیم کا ایک مقدس پیکر ہوگا۔ اسی وجود مبارک کو دیکھ کر صحابہ اپنے عمل درست کرتے تھے اور اسی وجود مبارک کے زیر سایہ ان کے تزکیہ کا سلسلہ جاری تھا۔

قرآن مجید سے وہ تمام آیتیں اس مختصر مضمون میں چن کر جمع کر دینا ممکن نہیں، لیکن ان میں سے چند ملاحظہ فرمائیے، جن میں مجلسی، اجتماعی زندگی سے گہرا تعلق رکھنے والے اوصاف کا ذکر ہے:

- ۱۔ مومن وہ ہیں جو اللہ سے ڈرتے اور باہمی معاملات درست رکھتے ہیں۔ اللہ کا ذکر چھڑے تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں۔ اللہ کا کلام سنایا جائے تو ان کے ایمان زیادہ ہو جاتے ہیں۔ وہ ہر حال میں اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں، جو کچھ خدا نے انہیں دے رکھا ہے، اس میں سے راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں وہی حقیقی مومن ہیں (انفال: ۱-۲)۔
- ۲۔ بلاشبہ ایمان والے کامیاب ہوئے (ان کی خصوصیتیں کیا ہیں؟) نمازیں خشوع و خضوع سے ادا کرتے ہیں۔ نکی اور لغو باتوں سے زنج پھیرے ہوئے ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرنے میں سرگرم ہیں۔ عفت و عصمت کی نگہداشت سے کبھی غافل نہیں ہوتے امانتوں اور وعدوں کا انہیں پاس رہتا ہے۔ نمازوں کی حفاظت میں بھی کوتاہی نہیں کرتے۔ (مومن: ۱-۱۰)۔
- ۳۔ اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر دبے پاؤں یعنی عجز و فروتنی سے چلتے ہیں۔ جب جاہل یعنی کم عقل، اکھڑ اور بے ادب لوگ ان سے بات کرتے ہیں تو ملائم بات سنا کر اور صاحب سلامت

^۱ کیف کان بدالوجی

^۲ یہ ٹکڑا اسی حدیث کی روایت میں آیا ہے جو بخاری کی کتاب التبعیر میں آئی ہے۔

کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں۔ رات کا وقت (یعنی سونے کا وقت کلب کی تفریحات میں نہیں) اپنے پروردگار کے لیے قیام اور سجد میں گزارتے ہیں اور کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہم سے دوزخ کا عذاب پھیر دے جب خرچ کرتے ہیں تو نہ بیجا اڑاتے ہیں اور نہ موقع کی مناسبت کے پیش نظر تنگی کرتے ہیں۔ وہ کسی کا بے گناہ خون نہیں بہاتے جس سے اللہ نے منع کر رکھا ہے اور بدکاری سے بھی دور رہتے ہیں جھوٹے کام میں شامل نہیں ہوتے۔ کسی کی لغو بات سے گزر رہے ہوں تو سنجیدگی اور وقار سے گزر جاتے ہیں۔ (فرقان: ۷۳-۷۴)

۴۔ ”وہ (اہل ایمان) پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں، بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے دور رہتے ہیں۔ جب غصہ آئے تو معاف کر دیتے ہیں اور خدا نے انہیں جو کچھ دے رکھا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ جب ان پر کوئی زیادتی ہو تو بدلہ لیتے ہیں، برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی۔ پھر جو کوئی معاف کر دے اور نیکی کرے، اس کا ثواب اللہ کے ذمے ہے۔ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا، جو کوئی مظلوم ہو کر بدلہ لے تو اس پر کوئی ملامت نہیں۔ ملامت تو ان پر ہے جو لوگوں پر از خود ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق فساد پھیلاتے ہیں، ان کے لئے دردناک عذاب ہے اور جو ظلم سہہ جائے اور معاف کر دے تو یہ بڑی اعلیٰ ہمتی کے کاموں میں سے ہے۔“ (خوری ۳۶: ۴۳)

اصل نیکی

اصل نیکی کیا ہے؟

- ۱۔ اللہ پر ایمان۔
 - ۲۔ یوم آخرت اور فرشتوں پر ایمان۔
 - ۳۔ خدا کی اتاری ہوئی کتابوں اور خدا کے بھیجے ہوئے نبیوں پر ایمان۔
 - ۴۔ خدا کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مانگنے والوں کو دینا۔
 - ۵۔ مال خرچ کر کے غلاموں کو آزادی دلانا۔
 - ۶۔ نماز اور زکوٰۃ باقاعدہ ادا کرتے رہنا۔
 - ۷۔ عہد کر لینا تو اسے بہر حال پورا کرنا۔
 - ۸۔ تنگی، مصیبت یا خوف و ہراس میں صابر و ثابت قدم رہنا۔ (بقرہ: ۱۷۷)
- نیز فرمایا:

- ۱۔ خوش حالی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں خدا کے لیے خرچ کرنا۔
- ۲۔ غصے کو پی جانا اور لوگوں کے قصور معاف کر دینا۔

یہ دعوت حق کی محض چند جھلکیاں ہیں جنہیں ان پر عمل کرنے والوں کی شکل میں بھی پیش کیا گیا اور محض نیکیوں کی شکل میں بھی۔ کیا کسی کے لیے یہ تصور کر لینا مشکل ہے کہ جس داعی حق کو یہ پاک دعوت دے کر دنیا میں بھیجا گیا تھا، وہ خود اپنی مقدس تعلیم کا کتنا افضل و اعلیٰ اور کس درجہ منور و مزی کی نمونہ ہو گا۔

حسن اخلاق کی اہمیت

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

- ۱۔ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔
- ۲۔ کامل ایمان اس مومن کا ہے، جو اخلاق میں سب سے اچھا ہو۔
- ۳۔ قیامت کے روز اعمال کی ترازو میں حسن خلق سے زیادہ بھاری چیز کوئی نہ ہوگی۔
- ۴۔ انسانوں کو قدرت کی طرف سے جو چیزیں عطا ہوئی ہیں ان میں سب سے بہتر چیز اچھے اخلاق ہیں۔
- ۵۔ بندوں میں سے اللہ کے نزدیک سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں۔
- ۶۔ آخرت کی زندگی میں میرے لیے سب سے پسندیدہ وہ شخص ہو گا جس کے اخلاق اچھے ہوں اور وہی مجھ سے قریب تر ہو گا۔^①
- ۷۔ کسی نے سوال کیا یا رسول اللہ ﷺ مومنوں میں سے افضل کون ہے؟ فرمایا: ”احسنہم خلقاً“ (جو سب سے زیادہ خوش اخلاق ہو)^②
- ۸۔ انسان حسن اخلاق سے وہ درجہ حاصل کر سکتا ہے، جو مسلسل روزے رکھنے اور راتوں کو مسلسل عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

آخری ارشاد کے سلسلے میں اتنا عرض کر دینا چاہیے کہ یہ ایک اسلوب بیان ہے، جس میں حسن اخلاق کو اس درجے پر رکھ کر پیش کیا گیا ہے جو نماز اور روزے جیسی نقلی عبادات سے حاصل ہوتا ہے۔ جو شخص فضائل اخلاق کے ساتھ نقلی عبادت میں بھی سرگرم رہے گا، اس کا درجہ اور بھی بلند ہو گا۔

غرض ان ارشادات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ فضائل اخلاق کو دین حق میں کتنا بلند درجہ حاصل ہے اور ہونا بھی چاہیے، کیونکہ اخلاق درست ہوں گے تو افراد و جماعات میں میل جول بڑھے گا۔ ان میں محبت و ہمدردی کو فروغ حاصل ہو گا۔

① سیرۃ النبی جلد ششم ص ۲۰-۲۲

② سیرۃ ابن ہشام، القسم الثانی ص ۳۶۱

ایک دوسرے کے نفع و نقصان اور دکھ سکھ کا احساس ترقی کرے گا۔ کش مکش کے اسباب رفتہ رفتہ زائل ہوتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ پورا مجمع انسانیت ایک کنبے کے افراد اور ایک خاندان کے اعضا کی حیثیت میں رہنے سہنے لگے گا۔ ہر قلب میں احترام آدمیت کو صحیح مقام مل جائے گا۔ یہی اسلام کا اصل نصب العین تھا۔ اس کی طرف پیش قدمی جاری تھی کہ اچانک ملوکیوں اور بادشاہوں کا دور شروع ہو گیا، جس کی ظلمت و تیرگی میں قافلہ اسلام کی ہر متاع عزیز گم ہو گئی اور اب کسی بھی چیز کا ٹھیک ٹھیک سراغ لگا لینا خاصا مشکل ہو گیا ہے۔ اگر کسی کا سراغ مل بھی جائے تو ہم لوگوں کے ذہنوں میں دور ملوکی کے وقت سے دین حق کا جو نقشہ جما ہوا ہے، اس میں کسی بازیافتہ شے کے لیے موزوں جگہ نکالنا بظاہر آسان نہ ہو گا۔

باقی رہی تبلیغ اسلام تو وہ ہر مسلمان کے لئے فرداً فرداً اور ہر اسلامی جماعت کے لئے اجتماعاً اس دنیا میں اولین شے ہے، نہ محض اس لیے کہ اسلام اور حق کو پھیلانا ہر فرد و جماعت کے لیے بہترین سعادت ہے، اس لیے بھی کہ ہم جنسوں کی پُر خلوص بھی خواہی ہر مسلمان کے اہم فرائض میں داخل ہے اور تمام ہم جنسوں کو نعمت اسلام کا حامل بنادینے سے بڑھ کر بھی خواہی کوئی نہیں ہو سکتی، جس پر دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح و بہبود موقوف ہے۔ لیکن تبلیغ اسلام کے لیے بھی سازگار فضا صلح و امن ہی سے میسر آ سکتی ہے۔ اگر نفرت و مخالفت کی آگ دلوں میں بھڑک رہی ہو تو کسی کو پیغام حق سننے کی کیا صورت ہوگی؟ سیرۃ طیبہ سے ظاہر ہے کہ بد رو حنین کی فتوحات بے شائبہ ریب بہت عظیم القدر تھیں تاہم فتح مبین صلح حدیبیہ ہی قرار پائی، جس نے طول و عرض عرب میں دلوں کے دروازے اسلام کے لیے کھول دیے اور ”یدخلون فی دین اللہ افواجاً“ کا روح افروز منظر سب نے دیکھ لیا۔

ایمان کیا ہے؟

صحیح بخاری کی کتاب الایمان میں سے صرف چند حدیثیں یہاں درج کی جاتی ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ ایمان و اسلام حقیقۃً کیا ہیں؟ مثلاً:

- ۱۔ مسلمان وہ ہے، جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان کو کوئی گزند نہ پہنچے اور مہاجر وہ ہے جو اللہ کی منع کی ہوئی ہر شے ترک کر دے۔
 - ۲۔ اس وقت تک کوئی شخص حقیقۃً مومن نہیں ہو سکتا، جب تک اپنے مومن بھائی کے لیے وہی بات پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔
 - ۳۔ جس میں تین باتیں ہوں، اس نے ایمان کی حلاوت پائی۔
- الف۔ اللہ اور رسول ﷺ اس کے نزدیک ماسوا سے بڑھ کر محبوب ہوں۔

ب۔ ہر فرد کے ساتھ صرف اللہ کے لیے محبت کرے یعنی محبت کے ساتھ کوئی غرض وابستہ نہ ہو۔

ج۔ کفر کی طرف لوٹ جانا اسے اتنا ہی بُرا معلوم ہو، جتنا آگ میں ڈالا جانا۔

۴۔ تین باتیں ہیں، جس نے یہ جمع کر لیں، اس نے ایمان جمع کر لیا۔

الف۔ اپنے نفس کے مقابلے میں بھی انصاف پر قائم و استوار رہنا۔

ب۔ دنیا میں سلامتی اور حق پھیلانا۔

ج۔ تنگ دستی کے باوجود اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔

۵۔ حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا اسلام بہتر (خیر) ہے۔ فرمایا: کھانا کھانا اور سب کو سلام کہنا یعنی سلامتی کی دُعا دینا، خواہ جان پہچان ہو یا نہ ہو۔

۶۔ خود ابوذر رضی اللہ عنہ غفاری کی روایت ہے کہ میں نے غلام کو گالی دی۔ رسول اللہ ﷺ نے سُن لی اور فرمایا: ابوذر رضی اللہ عنہ ابھی تم میں جاہلیت باقی ہے، غلام تمہارے بھائی ہیں۔ اللہ نے انہیں تمہارے ماتحت کر دیا ہے، جس کا بھائی ماتحت ہو، اسے چاہیے بھائی کو ویسا ہی کھلائے جیسا آپ کھائے، ویسا ہی پہنائے جیسا آپ پہنے اور بھائی سے ایسا کام نہ لے، جو اس سے نہ ہو سکے، کوئی سخت کام ہو تو خود اس کی مدد کرے۔

۷۔ جسم میں گوشت کا ایک ایسا ٹکڑا ہے کہ وہ درست ہو تو سارا جسم درست رہتا ہے۔ وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ سنو، وہ دل ہے۔

۸۔ مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس سے لڑائی کرنا کفر ہے۔

۹۔ جب دو مسلمان تلواروں کے ساتھ مقابلے پر آئیں تو قاتل و مقتول دونوں آگ میں ہوں گے۔ عرض کیا گیا: کہ قاتل تو ہوا مگر مقتول کا یہ حال کیوں ہو گا؟ فرمایا: وہ اپنے ساتھی کو قتل کرنا چاہتا تھا (لیکن موقع نہ پاسکا اور خود مارا گیا)۔

۱۰۔ جس میں چار باتیں ہوں، وہ خالص منافق ہے:

الف۔ امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔

ب۔ بات کہے تو جھوٹ بولے۔

ج۔ عہد کرے تو اسے پورا نہ کرے۔

د۔ جھگڑے تو ناحق کی طرف چلا جائے۔

ان میں سے کوئی بھی بات کسی میں ہو تو نفاق کی علامت ہوگی تا آنکہ وہ اسے ترک کر دے۔

۱۱۔ خدا کے نزدیک پسندیدہ عمل وہ ہے، جس پر مداومت کی جائے، اگرچہ وہ تھوڑا ہو۔

۱۲۔ ”کتاب الادب“ میں ہے کہ آپ ﷺ نے تین مرتبہ فرمایا:

خدا کی قسم وہ ایمان نہیں لایا، خدا کی قسم وہ ایمان نہیں لایا، خدا کی قسم وہ ایمان نہیں لایا۔ عرض کیا: کون یا رسول اللہ ﷺ؟

فرمایا: جس کا پڑوسی اس کی بدیوں سے امن میں نہ ہو۔

ان ارشادات پر غور فرمائیے اور اندازہ کیجئے کہ رسول اللہ ﷺ نے عالم انسانیت کو کس راستے پر چلنے کی دعوت دی؟

آیا اس کے سوا امن عالم اور بہبود انسانیت کا کوئی راستہ ہو سکتا ہے؟ ساتھ ہی سوچئے کہ جس سرچشمہ فلاح و صلاح کو نین سے یہ اور ایسی ہزاروں موجیں اٹھیں، اس کے طیب و طاہر ہونے کا درجہ کتنا بلند ہو گا۔

دارِ اصلاح و درستی

قرآن پاک اور سنت رسول ﷺ میں جو کچھ بصورت امر یا نہی شکل نہی آگیا ہے، اس میں انسانی زندگی کا کوئی بھی ضروری گوشہ نظر انداز نہیں ہوا۔ خطبہ حج میں رسول اللہ ﷺ نے تین چیزوں کا ذکر بطور خاص فرمایا تھا، یعنی جان، مال اور آبرو، پھر حج کے دن، حج کے مہینے اور مکہ مکرمہ کی حرمت کی طرح جان، مال اور آبرو کی عزت و حرمت کی تاکید فرمائی تھی۔ غور کیا جائے، تو دنیا میں جتنی زیادتیاں، جتنے ظلم اور جتنے گناہ ہیں، ان میں سے بیشتر کا تعلق اصلاً انھی تین چیزوں میں سے کسی ایک سے نکلے گا جو ہر انسان کو فطرۃً عزیز ہیں۔ کتاب و سنت کی محولہ بالا تعلیمات میں کوئی چیز ایسی نہیں ملے گی، جو ضروری تھی اور اس کے کرنے یا نہ کرنے کی تاکید نہ آئی ہو۔

حُسن خلق

رسول اللہ ﷺ نہایت نرم مزاج اور خوش اخلاق تھے۔ چہرہ مبارک پر اس قسم کی کیفیت چھائی رہتی تھی جس سے دیکھنے والے پر لطف و شفقت کا اثر پڑتا۔ گفتگو و قار و متانت سے فرماتے، ایک ایک جملہ ٹھہر ٹھہر کر بولتے۔ ہر ایک کو نرمی سے سمجھاتے۔ کبھی کسی کی دل شکنی گوارا نہ فرمائی، آپ سوار ہوتے اور راستے میں کوئی صحابی مل جاتا تو اسے سوار کر دیتے اور خود اتر آتے۔

ایک صحابی کا بیان ہے کہ میں بچپن میں انصار کے نخلستان میں چلا جاتا تو ڈھیلے مار مار کر کھجوریں گراتا۔ لوگ مجھے پکڑ کر خدمت اقدس میں لے گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ زمین پر ٹپکی ہوئی کھجور کھالیا کرو، ڈھیلے نہ مارا کرو، پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی۔

ایک مرتبہ حالتِ قحط میں ایک صاحب نے باغ سے کھجور کے خوشے توڑ کر کھائے اور کچھ دامن میں رکھ لیے۔ باغ کے مالک نے اسے مارا اور کپڑے اتر والیے، پھر شکایت لے کر حضور ﷺ

کی بارگاہ میں پہنچا۔ کھجوریں توڑنے والا بھی ساتھ تھا۔ آپ ﷺ نے مالک باغ سے کہا۔ یہ جاہل تھا، اسے تعلیم دینی چاہیے تھی۔ بھوکا تھا، کھانا کھانا چاہیے تھا۔ یہ فرما کر کپڑے واپس دلوائے اور اسے ساٹھ صاع غلہ اپنے پاس سے دیا، جو ہمارے حساب سے تین من، تیرہ سیر اور دو چھٹانک ہوتا ہے۔

مجلس نبوی ﷺ میں بیٹھنے کی جگہ نہ رہتی تو نئے آنے والے کے لیے ردائے مبارک بچھا دیتے تھے۔ سلام میں پیش دستی فرماتے۔ راستہ چلتے تو مرد، عورت، بچہ جو سامنے آتا اسے سلام کرتے۔ زبان مبارک پر کبھی کوئی غیر مناسب لفظ نہ آیا۔ انس رضی اللہ عنہ بن مالک کہتے ہیں کہ جب، کسی پر عتاب کرتے تو فرماتے: ”مَالِدٌ تَرَبَّ جَبِينَهُ“ اسے کیا ہوا، اس کی پیشانی خاک آلود ہو! ^۱ محاورے میں اس فقرے کا استعمال ہلکے زجر کے رنگ میں ہوتا ہے۔

بچوں پر شفقت

حضور ﷺ بچوں پر بہت شفقت فرماتے۔ آپ ﷺ سفر سے تشریف لاتے اور لوگ استقبال کے لیے نکلے تو بچے بھی ساتھ ہوتے اور وہ معمول کے مطابق دوڑ کر ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے، جو پہلے پہنچتے انہیں آپ ﷺ ساتھ سواری پر بٹھالیتے۔ راستے میں مل جاتے تو انہیں خود سلام کرتے اور ان سے بھی شفقت کا یہی برتاؤ ہوتا۔

ایک مرتبہ ایک نہایت غریب عورت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی۔ اس کی دو بچیاں بھی ساتھ تھیں۔ اتفاق سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس اس وقت کچھ نہ تھا۔ ایک کھجور پڑی تھی وہ اس عورت کو نذر کر دی۔ اس نے کھجور کے دو ٹکڑے کئے اور ایک ایک ٹکڑا دونوں کو دے دیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کو سنایا تو فرمایا: جس کے دل میں خدا اولاد کی محبت ڈالے اور وہ اس محبت کا حق ادا کرے تو دوزخ کی آگ سے محفوظ رہے گا۔

یہ شفقت مسلمان بچوں تک محدود نہ تھی۔ ایک دفعہ کسی غزوے میں چند بچے بھی بے ارادہ و علم مارے گئے، آپ ﷺ کو اطلاع ملی تو بڑا رنج ہوا۔ کسی کی زبان سے نکلیا رسول اللہ ﷺ وہ مشرکین کے بچے تھے۔ فرمایا: مشرکین کے بچے بھی تم سے بہتر ہیں۔ خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو، خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو۔ ہر جان خدا ہی کی فطرت پر پیدا ہوتی ہے۔

جابر رضی اللہ عنہ بن سمرہ صحابی اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی پھر آپ ﷺ کے ساتھ ہو لیا۔ سامنے سے چند اور بچے آگئے۔ آپ ﷺ نے سب کو پیار کیا اور مجھے بھی پیار کیا۔

غلاموں پر شفقت

اوپر گزر چکا ہے، ابوذر رضی اللہ عنہ غفاری سے آپ ﷺ نے فرمایا تھا: تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں جو خود کھاؤ، انہیں کھاؤ، جو خود پہنو، انہیں پہناؤ۔ چنانچہ اس کے بعد سے ابوذر رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام کو ہمیشہ کھانے پہننے وغیرہ میں اپنے برابر رکھا۔

غلاموں کے لئے لفظ غلام بھی گوارا نہ تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: انہیں غلام یا لونڈی کہہ کر نہ پکارا کرو۔ ”میرا بچہ“ ”میری بچی“ کہا کرو۔ آپ ﷺ کے پاس جو غلام آتا، اسے آزاد کر دیتے۔ لیکن وہ لوگ آزاد ہو کر بھی آپ ﷺ کی شفقت کی زنجیر میں جکڑے رہتے۔ زید رضی اللہ عنہ بن حارث کا واقعہ محتاج تفصیل نہیں۔ ان کے والد اور چچا لینے کے لیے آئے اور ہر قیمت ادا کرنے کے لئے آمادہ تھے۔ آپ ﷺ پہلے ہی زید رضی اللہ عنہ کو آزاد کر چکے تھے۔ جانے نہ جانے کا معاملہ زید رضی اللہ عنہ ہی پر چھوڑ دیا۔ اس نے جانے سے انکار کر دیا اور آپ ﷺ کے آستانہ رحمت کو والدین اور دوسرے خوئی اقربا کے ظل عاطفت پر ترجیح دی ^۱۔ محبت و شفقت کے اس اعجاز کا صحیح اندازہ کون کر سکتا ہے، جس کے سامنے قریب ترین خوئی رشتے بھی بے حقیقت رہ گئے تھے؟ زید رضی اللہ عنہ کے بیٹے اسامہ رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کو جتنی محبت تھی، وہ اسی سے ظاہر ہے کہ بعض نہایت اہم معاملات میں اسامہ رضی اللہ عنہ ہی کو آپ ﷺ کی بارگاہ میں سفارشی بنایا جاتا تھا اور فتح مکہ میں داخلے کے وقت اسامہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے ردیف تھے۔

ایک صحابی اپنے غلام کو مار رہے تھے۔ پیچھے سے آواز آئی کہ خدا کو تم پر اس سے زیادہ اختیار ہے۔ صحابی نے مڑ کر دیکھا تو خود رسول اللہ ﷺ تھے۔ عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں نے اسے لوجہ اللہ آزاد کر دیا۔ فرمایا: اگر تم ایسا نہ کرتے تو آتش دوزخ تمہیں چھو لیتی۔

سب سے آخری وصایا میں سے ایک وصیت یہ تھی کہ غلاموں اور لونڈیوں کے معاملے میں خدا سے ڈرتے رہنا۔ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ غلاموں کا قصور کتنی مرتبہ معاف کروں؟ آپ ﷺ خاموش رہے۔ جب تیسری مرتبہ یہی گزارش کی تو فرمایا: ”ہر روز ستر مرتبہ“۔

غریبوں پر شفقت

رسول اللہ ﷺ اکثر دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا اور مسکینوں ہی کے ساتھ میرا حشر کر۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دریافت کیا یہ کیوں؟ فرمایا: اس لیے کہ مساکین دو لہندوں سے پہلے جنت میں جائیں گے۔ پھر فرمایا: عائشہ رضی اللہ عنہا! کسی مسکین کو اپنے

دروازے سے خالی ہاتھ نہ لوٹاؤ۔ کچھ نہ ہو تو چھو ہارے کا ایک ٹکڑا ہی سہی، ضرور دے دو۔ عائشہ رضی اللہ عنہا غریبوں سے محبت کرو۔ انہیں اپنے سے نزدیک رکھو، خدا بھی تم کو اپنے سے نزدیک کرے گا۔

عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں مسجد میں بیٹھا تھا۔ ایک طرف فقرائے مہاجرین کا حلقہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو اس حلقے میں بیٹھ گئے۔ میں بھی وہیں جا بیٹھا۔ فرمایا: فقرائے مہاجرین کو بشارت ہو کہ وہ دو تین صدوں سے چالیس برس پہلے جنت میں جائیں گے۔

فرمایا: جو شخص کسی بڑھ اور مسکین کی خبر گیری کرتا ہے۔ اس کی حیثیت اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے کی ہے یا اس شخص کی جودن کو روزے رکھتا ہے اور رات کو عبادت کے لئے کھڑا رہتا ہے۔^۱

عوالی میں ایک بڑھیا بیمار تھی، اس کے جانبر ہونے کی امید نہ تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب اس کی وفات ہو تو مجھے ضرور خبر کرنا۔ میں جنازے کی نماز پڑھاؤں گا۔ اتفاق سے بڑھیا کا انتقال کچھ رات گئے ہوا۔ صحابہ نے آپ ﷺ کو رات کے وقت اٹھانا گوارا نہ کیا اور بڑھیا کو دفن کر دیا۔ صبح کے وقت آپ ﷺ نے دریافت فرمایا اور پوری کیفیت معلوم ہوئی تو اس خاتون کی قبر پر جا کر نماز جنازہ ادا کی۔

ایک مرتبہ ایک قبیلہ مسافر وار مدینہ منورہ آیا۔ اس کی حالت بہت خستہ تھی۔ کسی کے بدن پر ثابت کپڑا نہ تھا، پاؤں نیچے تھے۔ کھالیں بدن پر بندھی ہوئی تھیں اور تلواریں گلوں میں ڈال رکھی تھیں۔ حضور ﷺ کی نظر مبارک ان لوگوں کی خشگی پر پڑی تو چہرہ انور کا رنگ بدل گیا۔ حالت اضطراب میں اندر تشریف لے گئے۔ پھر باہر آئے اور بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کا حکم دیا۔ نماز کے بعد ایک خطبے میں سب کو ان غریبوں کی امداد پر آمادہ کر دیا۔

شفقت و رافت عامہ کے باب میں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ عبادات نافلہ چھپ کر ادا فرماتے تاکہ عام لوگوں کے لئے آپ ﷺ کی پیروی میں اس قدر عبادت کرنا شاق نہ ہو۔

مساوات

مساوات کی جیسی عملی مثالیں رسول اللہ ﷺ کی سیرۃ طیبہ میں ملتی ہیں، ویسی اور کہاں ملیں گی؟ اس سے بڑھ کر مساوات کیا ہو سکتی ہے کہ اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارث کی شادی اپنی پھوپھی بھین سے کر دی تاکہ اونچ نیچ کے فرضی اور خود ساختہ سانچے ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ فتح مکہ کے بعد آپ ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا اس کے مندرجہ الفاظ پر غور فرمائیں:

”اے گروہ قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار اللہ نے مٹا دیا۔ تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔“

یہ مساوات کا محض درس و وعظ ہی نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ سب سے بڑی، موثر اور ناقابل تردید دلیل بھی تھی۔ دنیا کے تمام انسان آدم کی اولاد ہیں۔ آدم ہی سب کے مورث اعلیٰ تھے۔ اگر ایک گھرانے کے تمام ارکان درجے میں یکساں ہوتے ہیں تو پھر آدم کی اولاد میں چھوٹے، بڑے، ادنیٰ، اعلیٰ، آقا غلام کی تفریق کس بنا پر جائز سمجھی جاسکتی ہے؟ خون، رنگ، نسل، دولت وغیرہ کے امتیازات ان لوگوں نے پیدا کیے، جن کے ہاتھ سے حقیقت کا رشتہ نکل چکا تھا اور جو ہوسنا کیوں کی بنا پر انسانیت کے ٹکڑے کرنے کے درپے ہو گئے تھے۔ اللہ کے نزدیک انسانوں میں مراتب کا انحصار حسن عمل پر ہے۔ جس کے پاس عمل کا اندوختہ زیادہ ہو گا، وہ خدا کے نزدیک سب پر فائق ہو گا، اگرچہ کالا اور مفلس ہو۔ وہ لوگ اس سے نیچے رہیں گے جو حسن عمل میں اس کے برابر نہ ہونگے، خواہ ان کے رنگ کتنے ہی گورے اور ان کی دولت و ثروت کتنی ہی لامتناہی ہو۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ اقدس میں زید رضی اللہ عنہ، اسامہ رضی اللہ عنہ، بلال رضی اللہ عنہ یا دوسرے مساکین کا درجہ عباس رضی اللہ عنہ سے کم نہ تھا جو آپ ﷺ کے چچا تھے۔ جنگ بدر میں وہ قید ہو کر آئے تو انصار نے اس بنا پر ان کا زرخیز معاف کر دینا چاہا کہ عباس رضی اللہ عنہ کے والد رشتے میں انصار کے بھانجے تھے مگر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر گز نہیں، ایک دام بھی معاف نہ کرو۔

آپ ﷺ مسجد کی تعمیر میں صحابہ کے ساتھ برابر کام کرتے رہے۔ خندق کی کھدائی میں بھی آپ ﷺ نے برابر حصہ لیا۔ سفر میں صحابہ کھانا پکانے کا کام مل جل کر کرتے۔ آپ ﷺ بھی کوئی نہ کوئی کام اپنے ذمے لے لیتے۔ ایک مرتبہ کھانا پکانے کے لیے لکڑیاں لانے کا کام آپ ﷺ نے سنبالا۔ فدا نیوں نے عرض کیا کہ یہ کام ہم کر لیں گے۔ فرمایا: ”میں پسند نہیں کرتا کہ اپنے آپ کو تم سے ممتاز رکھوں۔ خدا اس بندے کو پسند نہیں کرتا جو ہمراہیوں میں ممتاز بنے۔“

جنگ بدر کے سلسلے میں مدینہ منورہ سے نکلے تو سوار یوں کی اتنی کمی تھی کہ ایک ایک اونٹ تین تین کے حصے میں آیا، باری باری ہر فرد سوار تھا۔ حضور ﷺ کے بھی دو ساتھی تھے، وہ عرض کرتے کہ آپ ﷺ سوار رہیں۔ ہم پیدل چلیں گے۔ فرمایا: نہ میں چلنے میں تم سے کم طاقت ور ہوں اور نہ ثواب کے لیے میں تم سے کم محتاج ہوں۔

مشہور واقعہ ہے کہ بنی مخزوم میں سے ایک عورت چوری کے جرم میں گرفتار ہوئی بعض لوگ اسے چھڑانا چاہتے تھے اور اس غرض سے اسامہ رضی اللہ عنہ بن زید رضی اللہ عنہ کو سفارشی بنا کر حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ آپ ﷺ نے اسامہ رضی اللہ عنہ کی درخواست سنی تو فرمایا: کیا تم حدود خداوندی میں سفارش کرتے ہو؟ پھر خطبہ دیا، جس میں ارشاد ہوا: پہلی امتیں صرف اس وجہ سے برباد ہوئیں کہ جب کوئی بڑا آدمی جرم کا مرتکب ہوتا تو اس سے چشم پوشی کی جاتی، کوئی معمولی آدمی پکڑا جاتا تو اسے سزا دلاتے۔ اگر محمد ﷺ کی بنی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی چوری کرتی تو اسے بھی قطع ید کی سزا ضرور دی جاتی۔

ایثار

اخلاق و عادات شریفہ میں ایثار کو بھی نمایاں حیثیت حاصل ہے یعنی دوسروں کو اپنی ذات بلکہ اعزہ پر بھی ہر معاملے میں مقدم رکھنا۔ آپ ﷺ کو حضرت فاطمہؓ سے جس قدر محبت تھی اس کا بیان مشکل ہے۔ جب آپ ملاقات کے لیے تشریف لاتے تو آپ ﷺ فرط محبت سے کھڑے ہو جاتے، پیشانی پر بوسہ دیتے اور اپنی جگہ بٹھاتے اور عموماً پوچھتے کوئی خاص کام تو نہیں؟ ایک مرتبہ کسی غزوے میں کچھ کنیزیں آئیں۔ رسول اللہ ﷺ انھیں تقسیم فرما رہے تھے۔ حضرت فاطمہؓ کو بھی ایک خادمہ کی سخت ضرورت تھی کیونکہ عسرت کے باعث کوئی ملازمہ نہ تھی اور گھر کا سارا کام حضرت فاطمہؓ ہی انجام دیتیں، چکی پٹتیں، پانی کی مشک بھر لاتیں۔ اس وجہ سے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے اور جسم مبارک پر نیل کے نشان نظر آتے تھے۔ سیدہ فاطمہؓ عالم حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچیں۔ حضور ﷺ نے معمول کے مطابق پوچھا، کوئی کام ہے؟ سیدہ عالم فاطمہؓ خود داری کے باعث کچھ نہ کہہ سکیں: حضرت علیؓ نے ان کی ترجمانی کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ابھی اصحاب صفہ کا انتظام نہیں ہوا۔ جب تک ان کا بندوبست نہ ہو، میں دوسری طرف توجہ نہیں کر سکتا۔ ایک روایت میں ہے حضرت زبیرؓ کی صاحبزادیاں بھی ایسی ہی درخواست لے کر آئی تھیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: بدر کے یتیم تم سے پہلے درخواست کر چکے۔

ایک دفعہ آپ ﷺ کو چادر تحفے میں ملی، آپ ﷺ کو ضرورت تھی، رکھ لی۔ ایک صاحب حاضر خدمت ہوئے اور کہا، کیا اچھی چادر ہے۔ آپ ﷺ نے اتار کر ان صاحب کو دے دی۔ وہ لے کر چلے تو لوگوں نے ملامت کی کہ تم جانتے تھے رسول اللہ ﷺ کسی کا سوال رد نہیں کرتے۔ یہ بھی معلوم تھا کہ آپ ﷺ کو چادر کی ضرورت تھی۔ اس نے کہا میں نے تو اس لیے لے لی کہ اسی چادر کا کفن بناؤں گا اور یہ میرے لیے باعث برکت ہو گا۔

ایک صحابی کے پاس ویسے کے لیے کچھ نہ تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: عائشہؓ کے ہاں جاؤ اور آٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ۔ وہ جا کر لے آئے حالانکہ شام کو حضور ﷺ کے ہاں کھانے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ اسی طرح ایک غفاری کی مہمانداری کے لئے بکری کا دودھ تھا جو خود پی کر رات گزارتے تھے۔ دودھ مہمانوں کو پلا دیا اور خود رات فاتحے سے گزاری۔

ایثار کے دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ اطمینان و راحت کا مقام ہو تو دوسروں کو اپنے آپ پر مقدم رکھا جائے۔ دوسرا یہ کہ خطرے اور تحمل شدائد کا مقام ہو تو انسان خود آگے رہے اور دوسروں کو پیچھے رکھے، یہ دونوں پہلو سیرۃ طیبہ میں جا بجا نمایاں ہیں۔

سوال اور گداگری سے کراہت

سوال اور گداگری انسانی کردار کے لئے بے حد مضر ہے۔ اس سے احساس خود داری رفتہ رفتہ مآؤف ہو جاتا ہے۔ انسان تن آسان بن جاتا ہے۔ غیرت و حمیت کا آئینہ بے طرح مکدر ہو جاتا ہے۔ محنت و مشقت سے کسب حلال کے بجائے عجز و الحاح سے مانگنے کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایسے لوگوں میں عزائم امور کے لیے کوئی تڑپ اور کوئی واہیت باقی نہیں رہتی۔ جس قوم کے افراد عزائم کی لذت سے نا آشنا ہو جائیں، سمجھ لینا چاہیے کہ وہ بامقصد زندگی کی لذت و صورت سے محروم ہو گئی۔ معذور یا واقعی ضرورت مند افراد کا معاملہ الگ ہے لیکن جو لوگ گداگری کو پیشہ بنا لیتے ہیں وہ پورے معاشرے کے لیے باعث ننگ و عار بن جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے گداگری کے انسداد پر بھی خاص توجہ فرمائی۔

ایک مرتبہ ایک انصاری نے سوال کیا۔ فرمایا: تمہارے پاس کچھ ہے؟۔ ایک بچھو نے اور پیالے کا ذکر کیا۔ آپ ﷺ نے دونوں چیزیں منگوائیں اور دودرم میں فروخت کر دیں۔ پھر فرمایا: ایک درم سے گھر میں کھانے کی جنس دے آؤ۔ دوسری سے رسی وغیرہ خرید کر جنگل میں نکل جاؤ اور لکڑیاں لاکر بیچو۔ پندرہ روز کے بعد وہ انصاری آئے تو ان کے پاس دس درہم تھے۔ کچھ کپڑا اور غلہ خرید اور اسی طرح ایک بے کار آدمی معاشرے کا نہایت فعال رکن بن گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: یہ اچھا ہے یا یہ کہ اپنے چہرے پر گدا کی کا داغ لگا کر روز قیامت حاضر ہوتے؟ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

”اگر تم میں سے کوئی رسی لے کر جائے اور لکڑیوں کا گٹھا پشت پر اٹھا کر لائے اور فروخت کرے اور یوں اللہ اس کی آبرو بچائے تو اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے سوال کرے، وہ اسے دیں یا نہ دیں“^۱ حکیم رضی اللہ عنہ بن حزام کا اپنا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے مانگا۔ آپ نے دے دیا۔ پھر مانگا، دے دیا اور فرمایا:

”حکیم! یہ مال ہر ابھرا اور میٹھا ہے جو اسے سخاوت نفس کے ساتھ لے گا، اسے برکت ہوگی۔ جو نفس کی طمع سے لے گا، اسے برکت نہ ہوگی۔ اس کی کیفیت اس شخص کی سی ہوگی جو کھاتا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا۔“

الید العلیا خیر من السفلی

”اونچا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔“

^۱ بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب قول اللہ تعالیٰ و فی البکاب والغریضین و فی سبیل اللہ۔ (توبہ۔ ۶۰)

حکیم ﷺ نے پھر عمر بھر کسی سے کچھ نہ مانگا۔^①
پھر فرمایا:

”مسکین وہ نہیں جو لوگوں کے پیچھے پھرے۔ کہیں سے ایک لقمہ یا دو لقمے یا ایک کھجور، دو کھجوریں مل جائیں تو دوسرے دروازے پر چلا جائے۔ مسکین وہ ہے جس کے پاس اتنا مال نہیں کہ ضروریات سے بے نیاز کر دے۔ نہ کوئی اس کا حال جانتا ہے کہ صدقہ دے۔ نہ وہ اٹھ کر لوگوں سے کچھ مانگتا ہے۔“^② ایک موقع پر تین چیزوں کو اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ قرار دیا:

قبیل و قال و اضاعة المال و كثرة السؤال

”فضول باتیں، مال ضائع کرنا اور زیادہ مانگنا۔“^③

یہ بھی فرمایا کہ جو شخص اللہ سے دعا کرے کہ اسے سوا لی و گداگری کی ذلت سے بچایا جائے تو اللہ بچا دیتا ہے۔ جو خدا سے غنا کا طلب گار ہو، اللہ اسے غنا میں رحمت فرماتا ہے۔ جو شخص صبر کرتا ہے اللہ اسے اور دیتا ہے اور صبر سے بہتر و وسیع تر دولت کوئی نہیں جو کسی کو دی گئی ہو۔

جو دو سخا

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

كان النبي ﷺ أجود الناس وأجود ما يكون في رمضان^④

رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور آپ ﷺ کی سخاوت کا ظہور سب سے بڑھ کر رمضان شریف میں ہوتا تھا۔
حدیث ہے کہ:

مأسئل النبي ﷺ عن شيء قط فقال لا^⑤

”رسول اللہ ﷺ سے بھی کوئی چیز نہیں مانگی گئی کہ آپ ﷺ نے جواب میں ”لا“ یعنی کلمہ نفی فرمایا ہو۔“

ایک مرتبہ کسی نے کچھ مانگا فرمایا: ”اس وقت میرے پاس کچھ نہیں، تم میرے ساتھ آؤ۔“
حضرت عمر رضی اللہ عنہ ساتھ تھے۔ انھوں نے کہا: جب آپ ﷺ کے پاس کچھ نہیں تو آپ ﷺ

① بخاری کتاب الزکوٰۃ باب الاستعفاف عن المسئلة۔

② ایضاً ایضاً باب من سال الناس بمشتر

③ ایضاً ایضاً۔

④ بخاری: کتاب الادب باب حسن الخلق و اسخا

⑤ ایضاً ایضاً۔

پر کیا ذمہ داری ہے۔ ایک اور صاحب بھی تھے، وہ بولے یا رسول اللہ ﷺ! آپ دیتے جائیں۔ عرش والا خدا آپ ﷺ کو محتاج نہ کرے گا۔ یہ سن کر آپ ﷺ فرط بشارت سے مسکرا دیئے۔

ایک مرتبہ کوئی چار اوقیہ چاندی نذر کر گیا۔ تین اوقیہ تو تین ضرورت مندوں کو دے دیے۔ چوتھا لینے والا کوئی نہ آیا۔ رات کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ حضور ﷺ کو نیند نہیں آتی۔ کبھی اٹھتے ہیں اور نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں، پھر ذرا لیٹ کر اٹھتے ہیں اور نماز شروع کر دیتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: آپ ﷺ آرام کیوں نہیں فرماتے؟ حضور ﷺ نے چاندی نکال کر دکھائی اور فرمایا مجھے ڈر ہے۔ مبادا یہ میرے پاس ہو اور موت آجائے۔

ایک مرتبہ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے ساتھ تھے۔ فرمایا: ابوذر رضی اللہ عنہ، اگر کوہ احد میرے لیے سونا ہو جائے تو میں کبھی پسند نہ کروں گا کہ تین راتیں گزر جائیں اور میرے پاس ایک بھی دینار باقی ہو، بجز اس رقم کے جو ادائے قرض کے لیے رکھ چھوڑوں۔^①

احد بہت بڑا پہاڑ ہے۔ وہ سونے کا بن جائے تو اسے ایک دن میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ کم از کم تین دن ضرور لگیں گے، ساتھ ہی قرض ادا کرنے کی اہمیت بھی واضح فرمادی اور ارشاد گرامی سے یہ بھی ظاہر ہے کہ حضور ﷺ اسی فیاضی اور سخاوت کے باعث مقروض رہتے تھے۔ کوئی چیز حضور ﷺ کے پاس آجاتی تو جب تک تقسیم نہ فرمادیتے مضطرب رہتے۔ ایسے متعدد واقعات کتب حدیث میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

آخر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ جامع ارشاد پیش نظر رکھ لیجئے۔

ما تترك رسول الله ﷺ دينارا أو درهما ولا شاة ولا بعيرا ولا اوضى يشيعي۔

”رسول اللہ ﷺ نے (دنیا سے رحلت کے وقت) کوئی دینار اور کوئی درہم اور کوئی بکری یا کوئی اونٹ نہ چھوڑا اور نہ کسی شے کے لیے وصیت فرمائی۔“

جب باقی ہی کچھ نہ رہا تو وصیت کی کیا صورت تھی؟

سادگی اور بے تکلفی

رسول اللہ ﷺ کی پوری حیات طیبہ سادگی اور بے تکلفی میں گزری۔ کسی قسم کے لوازم امارت و غنا پنہ گرد جمع نہ کیے۔ لباس، بستر، کھانا غرض ہر چیز عمر بھر بہت سادہ رہی۔ چٹائی، معمولی فرش یا زمین پر بیٹھنے میں کبھی تکلف محسوس نہ ہوا۔ عدی بن حاتم بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے تو چمڑے کا ایک گدا تھا جس میں کھجور کی پتی بھری ہوئی تھی، وہی عدی رضی اللہ عنہ کی طرف کھسکا دیا، خود زمین پر بیٹھ گئے۔ عدی رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے روبرو گدے پر بیٹھنا خلاف ادب سمجھا۔ چنانچہ دوران

① سیرۃ النبی بحوالہ صحیح مسلم۔

گفتگو میں گدا حضور ﷺ اور عدی بن مسعود کے درمیان پڑا رہا۔ فرمایا کرتے تھے، گھر میں ایک بستر اپنے لیے، ایک بیوی کے لیے اور ایک مہمان کے لیے کافی ہے، چوتھا شیطان کا حصہ ہے۔^۱

ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے لیے جو مکان بنوائے تھے وہ دس دس بارہ بارہ فٹ کے کچے حجرے تھے، جن میں سے بعض کی دیواریں چکی تھیں اور بعض کے لیے کھجور کی ٹہنیاں کھڑی کر کے اوپر سے لپائی کر دی گئی تھی۔ کھجور کی شاخوں کی چھتیں تھیں۔ اونچائی اتنی کہ آدمی کھڑا ہو کر ہاتھ اوپر اٹھائے تو چھت کو جا لگے۔ عبدالملک اموی کے عہد میں توسیع مسجد نبوی ﷺ کے لیے ان حجروں کو منہدم کرنا ضروری سمجھا گیا تو اہل مدینہ بے اختیار رو رہے تھے۔ ان کی آرزو یہ تھی کہ یہ حجرے محفوظ رکھے جاتے تاکہ دنیا دیکھی کہ رسول اللہ ﷺ نے روئے زمین پر کس سادگی، بے تکلفی اور زہد و قناعت میں دن گزارے۔

ایک مرتبہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں کھانے کے لیے بلایا گیا۔ دروازے پر پہنچے تو دیکھا کہ دیواروں پر پردے لٹک رہے ہیں، باہر ہی سے واپس ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مراجعت کا سبب پوچھا تو فرمایا: پیغمبر کی شان کے خلاف ہے کہ وہ زیب و زینت والے کسی مکان میں داخل ہو۔ اسی قسم کا واقعہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی پیش آیا۔ آپ ﷺ کسی غزوے کے سلسلے میں مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے گئے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے مکان کی چھت کے ساتھ ایک کپڑا باندھ دیا۔ واپس تشریف لائے اور چھت میں بندھا ہوا کپڑا دیکھا تو اسے اتار دیا۔ فرمایا: خدا نے ہمیں اس لیے دولت نہیں دی کہ اینٹوں اور پتھروں کو کپڑے پہنائیں۔

ایک مرتبہ کسی نے کنوؤں کی قبایت بھیجی۔ آپ ﷺ نے ذرا دیر کے لیے پہن لی۔ پھر اتار کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دی۔ وہ روتے ہوئے آئے کہ جو چیز آپ ﷺ نے ناپسند فرمائی، وہ مجھے عطا کی، فرمایا: پہننے کے لیے نہیں فروخت کر دینے کے لیے بھیجی ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے دو ہزار درہم میں فروخت کر دیا۔

صبر و حلم

صبر و حلم اور عفو و درگزر کے باب میں صرف اسی امر کا اعادہ کافی ہے کہ آپ ﷺ نے عمر بھر کسی سے ذاتی بد لانا لیا سب کو معاف فرماتے رہے۔

ایک یہودی کے آپ ﷺ مقروض تھے۔ اگرچہ ادائے قرض کے وعدے میں تین روز باقی تھے، مگر یہودی ہمیشہ سے سرمایہ پرست چلے آ رہے ہیں۔ تین روز پہلے ہی اگر متقاضی ہو بلکہ حضور ﷺ کے عفو و حلم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ بھی کہہ گزرا کہ عبدالمطلب کے خاندان کے لوگ

^۱ سیرۃ النبی بحوالہ داؤد۔

بڑے ناہند ہوتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اس وقت موجود تھے، انھوں نے یہودی کو سختی سے جھڑک دیا۔ رسول اللہ ﷺ مسکرائے اور فرمایا: عمر رضی اللہ عنہ تمہیں لازم تھا کہ میرے ساتھ اور اس شخص کے ساتھ اور طرح کا برتاؤ کرتے، مجھے حسن ادا کے لیے کہتے اور اسے حسن تقاضا سکھاتے۔ پھر یہ فرماتے ہوئے کہ اگرچہ وعدہ پورا ہونے میں ابھی تین روز باقی ہیں لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اس کا قرض ابھی ادا کر دو اور بیس صاع^۱ ہنس زیادہ دینا کیونکہ تم نے اسے سختی سے ڈانٹا تھا۔

روئے سائے طائف نے دعوت اسلام کے سلسلے میں حضور ﷺ سے جو سلوک کیا تھا، وہ بیان ہو چکا ہے۔ ادبائوں کو برا بھینٹ کر کے حضور ﷺ پر پتھر برسوائے۔ خود آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ پہاڑوں کا فرشتہ میرے پاس آیا جی حکم ہو تو دونوں طرف کے پہاڑ ان پر الٹ دوں۔ فرمایا: نہیں مجھے امید ہے ان کے اخلاف میں سے وہ لوگ انھیں گے جو خدائے واحد کو مانیں گے۔

غزوہ احد میں دندان مبارک ٹوٹ گئے اور آپ ﷺ زخمی ہو گئے۔ مگر یہی دعا فرمائی کہ اے خدا میری قوم کو سیدھا راستہ دکھا، وہ حقیقت حال سے نا آشنا ہیں۔

خطبہ حج میں آپ ﷺ نے ایام جاہلیت کے خون اور قرضے ختم کر دیے تو سب سے پہلا اپنے خاندان کا خون اور اپنے خاندان میں سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا قرضہ ختم کیا۔

عام خصائل

رسول اللہ ﷺ نے حسن معاملہ، عدل و انصاف، مہمان نوازی کے معیار قائم کیے۔ آپ ﷺ شرم و حیا، عزم و استقلال اور شجاعت کا پیکر تھے۔ عائلی زندگی کا بہترین نمونہ حضور ﷺ نے پیش کیا اور ازواج رضی اللہ عنہن سے اچھے برتاؤ کے بارے میں بار بار تاکید فرمائی۔ فرمایا: تم میں سے بہتر وہ ہے جو اہل خانہ کے لیے بہتر ہے۔ چرند و پرند سب پر شفقت فرماتے۔ دوسروں کے کام کر دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے اور اس میں ادنیٰ اعلیٰ کی کوئی تمیز نہ تھی۔ کسی کا بھی احسان لینا گوارا نہ تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر جان نثاری کا دعویٰ کون کر سکتا ہے۔ جن کے لیے فرمایا کہ ان کے مال اور صحبت کا میں سب سے زیادہ ممنون ہوں۔ تاہم ہجرت کے موقع پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جو ناقہ آپ ﷺ کے لیے پالی تھی، وہ نذر کرنی چاہی تو آپ ﷺ نے قیمت دے کر خریدی۔ مسجد النبی ﷺ کی زمین مالک اور ان کے سرپرست ہبہ کر دینے پر اصرار کرتے رہے مگر آپ ﷺ نے قیمت دے کر لی۔

^۱ قاضی سلیمان مرحوم فرماتے ہیں کہ صاع ہمارے ہاں کے اوزان کے مطابق دو سیر ساڑھے تین چھٹانک کا ہوتا ہے۔ یہی واقعہ یہودی کے اسلام کا باعث بنا۔ اس نے نبی موعود کے حکم کے مطابق جو کچھ سن رکھا تھا اس کی آزمائش کے لیے یہ حرکت کی تھی۔

ادائے عبادات میں بھی سہولت عامہ بطور خاص ملحوظ خاطر رہتی تھی۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ نماز فجر میں لمبی سورتیں پڑھتے ہیں تو فرمایا: تم میں سے جو نماز پڑھا ئے مختصر پڑھائے کیونکہ مقتدیوں میں بوڑھے، ضعیف اور کام والے سبھی طرح کے آدمی ہوتے ہیں۔ زیادہ مدح و ستائش بھی پسند نہ تھی۔ آپ ﷺ وضو فرماتے تو صحابہ دست مبارک سے گرنے والے پانی کو چلو میں لے کر برکت کے لیے بدن پر مل لیتے۔ پوچھا ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ عرض کیا خدا اور رسول ﷺ کی محبت میں، فرمایا: اگر کوئی اس بات کی خوشی حاصل کرنا چاہتا ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول ﷺ سے محبت رکھتا ہے تو چاہیے کہ جب وہ بات کرے، سچ بولے، جب اسے کوئی امانت سونپی جائے تو اس کا حق ادا کرے اور کسی کا پڑوسی ہے تو حق ہمسایگی اچھی طرح نباہے۔

بعض اہم ارشادات

آپ ﷺ کے بعض اہم ارشادات یہاں درج کیے جاتے ہیں، جن سے اسلام کی تعلیم اور خود حضور ﷺ کی عملی زندگی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

۱۔ ”تم میں سے جب کوئی شخص کسی کو مال اور صورت میں برتر و افضل دیکھے تو چاہیے کہ اس کی طرف بھی دیکھ لے جو دیکھنے والے سے کمتر اور نیچے ہے۔“^۱

(دیکھیے افضل و برتر دیکھنے سے دل میں حسد پیدا ہو گا جو گونا گون برائیوں کا سرچشمہ ہے، کمتر شخص کو دیکھنے سے شکر کا جذبہ ابھرے گا جو نیکیوں کا وسیلہ ہے۔)

۲۔ ”تو مسلمانوں کو باہم رحم، محبت اور مہربانی میں ایک جسم کی طرح دیکھے گا، جب ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو اس کے لیے پورا جسم بے خوابی اور بخار کے ساتھ پکارتا ہے۔“^۲

سعدی نے اس حدیث کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

چو عضوے بہ درد آورد روزگار دگر عضو ہمارا نہ ماند قرار

۳۔ ”جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ یا تو اچھی بات کہے یا چپ رہے۔“^۳

۴۔ ”آپس میں بغض نہ رکھو، حسد نہ کرو، باہم تعلقات نہ توڑو اور اللہ کے بندو، بھائی بھائی ہو جاؤ۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اپنے بھائی کے ساتھ تین دن سے زیادہ قطع تعلق کرے۔“^۴

۱۔ بخاری: کتاب الرقاق، باب لیستظالی من ہوا سفل منہ۔

۲۔ بخاری: کتاب الادب، باب رحمۃ الناس۔

۳۔ بخاری: کتاب الادب، باب من کان یومن باللہ۔

۴۔ بخاری: کتاب الرقاق، باب لیستظالی من ہوا سفل منہ۔

۵۔ ”سچائی اور راست بازی نیکی کی طرف لے جاتی ہے، اور نیکی جنت میں پہنچاتی ہے۔ انسان برابر سچ بولتا رہتا ہے، یہاں تک کہ صدیق ہو جاتا ہے (اسی طرح) جھوٹ برائی کی طرف لے جاتا ہے، برائی آگ میں پہنچاتی ہے۔ انسان برابر جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ خدا کے نزدیک کذاب لکھا جاتا ہے۔“^۵

۶۔ ”شہ زوری دوسرے کو بچھاڑنا نہیں، شہ زور وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے۔“^۶

کسی فارسی شاعر نے ہمارے عہد کی حالت کا نقشہ کیا خوب کھینچا۔

دستے کہ عنان خویش گیر دامر وز بہ آستین کس نیست۔

۷۔ ”راست روی اختیار کرو، باہم محبت بڑھاؤ اور لوگوں کو خدا کی طرف سے بشارت پہنچاؤ، تنہا عمل تو کسی کو بھی جنت میں نہ لے جائے گا۔“^۷

۸۔ ”جو شہرت کے لیے کام کرے گا، اللہ اسے فضیحت دے گا، جو ریا کے لیے کام کرے گا اللہ اس کی اصل حقیقت لوگوں کو دکھا دے گا۔“^۸

۹۔ ”خبردار! بدگمانی کو اپنی عبادت نہ بنانا، بدگمانی تو جھوٹ ہے، بے بنیاد باتوں پر کان نہ لگاؤ، دوسروں کے عیب تلاش نہ کرو، آپس میں بغض نہ رکھو۔“^۹

۱۰۔ ”اسیروں کو رہائی دلاؤ، بھوکوں کو کھانا کھلاؤ، بیماروں کی عیادت کرو۔“

۱۱۔ ”لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرو، انھیں تنگی اور سختی میں نہ ڈالو، خوشخبری اور بشارت سناؤ، نفرت نہ دلاؤ، مل جل کر رہو۔“

۱۲۔ ”دو نعمتیں ہیں، جن کی قدر اکثر لوگ نہیں جانتے: اول تندرستی دوم فراخ دستی۔“

۱۳۔ ”تم میں سے کوئی موت کی خواہش نہ کرے، نیک آدمی تو اس لیے کہ شاید وہ نیک کام کرے اور بد اس لیے کہ شاید وہ معافی مانگ لے۔“^{۱۰}

پانچ مذموم خصلتیں

”پانچ مذموم خصلتیں ایسی ہیں کہ جب وہ تم پر نازل ہوں تو میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ وہ

۱۔ ایضاً باب ینتھی عن الذنب

۲۔ بخاری: ایضاً باب الخذر من الغضب

۳۔ بخاری: کتاب الرقاق، باب القصد والمدلۃ علی العمل۔

۴۔ بخاری: ایضاً باب الریا داس معذ۔

۵۔ رحمۃ اللہ علیہ ص ۳۵۳ بحوالہ بخاری۔

۶۔ کتاب المرضی باب تمنی المرضی الموت۔

خصلتیں تم لوگ اختیار کرو:

- ۱۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم میں فواحش کا ظہور اس حد پر پہنچ گیا ہو کہ لوگ علانیہ ان کا ارتکاب کرنے لگیں اور اس قوم میں طاعون اور ان بیماریوں کا ظہور نہ ہوا ہو، جو ان کے باپ دادا میں موجود نہ تھیں۔
- ۲۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم نے ناپ اور تول میں کمی شروع کی ہو اور اس قوم کو قحط سالی، گرانی، سخت محنت و مشقت اور حکمرانوں کے ظلم و جودنے گرفت میں نہ لیا ہو۔
- ۳۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم نے اپنے اموال میں سے زکوٰۃ دینا بند کیا ہو اور اسے آسمان سے ہونیوالی بارش سے محروم نہ کر دیا گیا ہو، اگر بہائم نہ ہوں تو بارش بالکل روک دی جائے۔
- ۴۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم نے اللہ اور اس کے رسول کا عہد توڑا ہو اور اس پر بغاوت کو دشمن بنا کر مسلمانہ کر دیا گیا ہو اور وہ اس قوم کے اموال کا ایک حصہ نہ چھین لیں۔
- ۵۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم کے پیشواؤں اور رہنماؤں نے کتاب اللہ کے مطابق حکومت سے اعراض کر کے خدائی احکام کے خلاف زبردستی اپنے احکام نافذ کرنا شروع کیے ہوں اور اللہ نے اس قوم کے اندر جدال و قتال اور دشواریاں نہ پیدا کی ہوں۔^۹

نور حق کے لیے والہیت

قرآن مجید میں جا بجا اسلام کو نور کہا گیا ہے یعنی حق کی روشنی، مثلاً:

- ۱۔ وَأَتَّبِعُوا النَّوْرَ الَّذِي أُزِيلُ مَعَهُ - (اعراف: ۱۵۷)
- ”پیروں کی اس نور کی جو اس کے (رسول اللہ ﷺ کے) ساتھ اترے۔“
- ۲۔ أَفَمَنْ شَرَّ اللَّهُ صَدْرَكَ لَا سَلَامَ فَهُوَ عَلَى نُورٍ مِّنْ رَبِّهِ - (زمر: ۲۲)
- ”بھلا جس کا سینہ کھول دیا اللہ نے اسلام کے لیے سودہ روشنی میں ہے اپنے رب کی طرف سے۔“
- ۳۔ اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ - (بقرہ: ۲۵۷)
- ”اللہ ان کا ساتھی اور مددگار ہے، جو ایمان کی راہ اختیار کرتے ہیں انہیں تاریکیوں سے نکالتا اور روشنی میں لاتا ہے۔“
- بعض مقامات پر ”نور“ اس طرح آیا ہے کہ بعض مفسرین کرام کو خیال ہوا غالباً اس سے مراد خود رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات ہے۔ جیسے سورہ مائدہ میں ہے۔

^۹ سیرۃ ابن ہشام القسطنطنی ص ۱۳۱

قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ ۝ يَهْدِي بِهُ اللَّهُ مَنَ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ - (مائدہ: ۱۵-۱۶)

”اللہ کی طرف سے تمہارے پاس ”نور“ (رسول اللہ ﷺ یا حق کی روشنی) آچکا نیز وہ روشن کتاب آچکی جس کے ذریعے سے اللہ اپنی رضا و خوشنودی کے پیروں کو سلامتی کے راستوں کی طرف ہدایت دیتا ہے۔“

مندرجہ ذیل دعا سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ کے قلب منور میں ”نور حق“ کے لیے کس درجہ والہیت اور شیفگی تھی اور یہ دعا آپ ﷺ روزانہ پڑھتے تھے۔

اللَّهُمَّ قَلْبِي نَوْرًا أَوْ بَصْرًا نَوْرًا أَوْ سَمْعًا نَوْرًا أَوْ عَيْنًا نَوْرًا أَوْ عَن يَسَارِي نَوْرًا أَوْ فَوْق نَوْرًا أَوْ تَحْتِ نَوْرًا أَوْ أَمَامِي نَوْرًا أَوْ خَلْفِي نَوْرًا أَوْ أَجْعَلِي نَوْرًا أَوْ لِسَانِي نَوْرًا أَوْ دُمِي نَوْرًا أَوْ عَصَبِي نَوْرًا أَوْ شَعْرِي نَوْرًا أَوْ بَشَرِي نَوْرًا - اللَّهُمَّ اعْطِنِي نَوْرًا، اللَّهُمَّ اعْظِمْنِي نَوْرًا، اللَّهُمَّ اجْعَلْنِي نَوْرًا۔

”الہی! میرے قلب میں نور ہو اور میری آنکھوں میں نور ہو اور میرے کانوں میں نور ہو، اور میرے دہنے نور ہو، میرے بائیں نور ہو، میرے اوپر نور ہو اور میرے نیچے نور ہو اور میرے آگے نور ہو اور میرے پیچھے نور ہو اور نور میرا بنا دے اور میری زبان میں نور ہو، میرے خون میں نور ہو اور میرے پٹھوں میں نور ہو اور میرے بالوں میں نور ہو، میرے چہرے پر نور ہو، الہی! مجھے نور عطا فرما، الہی! میرے نور کو بڑھا، الہی! مجھے نور ہی بنا دے۔“

سنت رسول پاک ﷺ

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی سنت کے متعلق پوچھا۔ فرمایا:

- ۱۔ البعرة راس البالي
- میری اصل پونجی معرفت ہے۔
- ۲۔ والعقل اصل ديني
- عقل سلیم میرے دین کی اصل ہے۔
- ۳۔ والحب اساس
- محبت میری بنیاد ہے۔
- ۴۔ والشوق مركبي
- شوق میری سواری ہے۔
- ۵۔ والذكر انيس
- اللہ کا ذکر میرا انیس و مونس ہے۔
- ۶۔ والثقة كنز
- اعتماد الہی میرا خزانہ ہے۔
- ۷۔ والحزن رفيق
- (ہم جنسوں کی فلاح کے لیے اندوہ قلب میرا رفیق ہے)
- ۸۔ والعلم سلاحي
- علم میرا ہتھیار ہے۔
- ۹۔ والصبر رداي
- صبر میری ردا ہے۔
- ۱۰۔ والرضا غنيبي
- رضا باری تعالیٰ میری غنیمت ہے۔
- ۱۱۔ والعجز فخري
- عاجزی میرا سرمایہ فخر ہے۔

- ۱۲۔ والذہد حریفی زہد میرا پیشہ ہے۔
 ۱۳۔ والیقین فُوق یقین میری روزی ہے۔
 ۱۴۔ والصدق شفیعی راست بازی اور صداقت میری شفیع یعنی ساتھی ہے۔
 ۱۵۔ والطاعۃ حسب طاعت حق میری عزت ہے۔
 ۱۶۔ والجهاد خلقی جہاد یعنی راہ حق میں انتہائی سعی و جہد میری جہلی ہے۔ خصلت
 ۱۷۔ وقرۃ عینی فی الصلوۃ اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

کیا تاریخ عالم کی کسی شخصیت کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جس میں خصائل جمیلہ اور شمائل حسنہ اس پیمانے پر جمع ہوئے جو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی ذات بابرکات میں بہ درجہ کمال جمع کر دیے تھے؟ یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی بھی دوسری شخصیت کی ایک ایک خصوصیت، ایک ایک حرکت، ایک ایک عمل اور ایک ایک ارشاد مستند روایات کی بناء پر آج تک اس طرح محفوظ بھی نہیں ہوا، جس طرح رسول اللہ ﷺ کے متعلق ایک ایک چیز جمع ہوئی۔ صدق اللہ عزوجل۔

فَأَمَّا الرَّبُّكَ فَيَذْهَبُ جَفَاءً ۚ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَنْبُكْتُ فِي الْآخِرِ (الرعد-۱۷)

”پس جھاگ تو خشک ہو کر جاتا رہتا ہے (کیونکہ وہ کسی کام نہ تھا) اور جس میں بندگان خدا کے لیے نفع ہو، وہ چیزیں زمین میں باقی رہتی ہے۔“

رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (الانبیاء-۱۰۷)

نوع انسانی کے لیے رحمت

یہاں پیغمبر اسلام کے ظہور کا ایک ایسا وصف بیان کیا گیا ہے جو قرآن کے بیان کردہ اوصاف میں سب سے زیادہ اہم اور نمایاں ہے۔^۱ یعنی رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ! یہ ظہور کسی ایک ملک، کسی ایک قوم، کسی ایک نسل ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لیے رحمت کا ظہور ہے۔ یہ وصف بیان کر کے قرآن نے ایک کسوٹی ہمارے حوالے کر دی ہے۔ اس پر ہم اس ظہور کی ساری صداقتیں پرکھ لے سکتے ہیں۔ اگر یہ فی الحقیقت تمام نوع انسانی کے لیے رحمت کا ظہور ثابت ہوا ہے تو اس کی سچائی میں کوئی شک نہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوا ہے تو پھر سچائی نے قرآن کا ساتھ نہیں دیا۔ ہمارا فرض ہے کہ حقیقت کا اعتراف حقیقت کے لیے کر لیں۔

یہ جانچ تاریخ کی بے لاگ اور بے رحم جانچ ہونی چاہیے۔ ہر طرح کی مذہبی خوش اعتقادیوں سے منزہ، ہر طرح کی خود پرستانہ طرف داریوں سے پاک، کیونکہ یہاں حقیقت کی عدالت موجود ہے اور وہ صرف حقیقت ہی کی شہادت پر کان دھرتی ہے۔

تاریخ کا فیصلہ

جہل و تعصب نے ہمیشہ اعلان حقیقت کی راہ روکنی چاہی ہے، لیکن روک نہیں سکی۔ اس کے فیصلے میں بھی تاریخ نے دیر لگائی، لیکن بالآخر اسے تسلیم کرنا پڑا، ضروری ہے کہ فیصلہ خود اسی کی زبانی مناجائے اور ایک معتقد کی طرح نہیں بلکہ ایک مورخ کی طرح عالم انسانیت کے ایک ایک

^۱ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ

”اور اے پیغمبر ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ پوری کائنات کے لیے رحمت کا ظہور ہو۔“

گوشتے سے شہادت طلب کی جائے۔ افسوس ہے کہ اس وقت تک کوئی کوشش ایسی نہیں کی گئی، جو اس موضوع پر عملی حیثیت سے وقیع سمجھی جاسکے۔ ہم نے ”مقدمہ تفسیر“ میں اس کی کوشش کی ہے اور ایک خاص باب کا موضوع بحث یہی مسئلہ ہے۔ یہاں اتنی تفصیل کی گنجائش نہیں اور اختصار مفید مدعا نہیں، اس لیے مجبوراً قلم روک لینا پڑتا ہے۔ (سورہ انبیاء کا حاشیہ)

ابرر رحمت اور شادابی زمین

جب زمین پیاسی ہوتی ہے تو رب السموات والارض پانی برساتا ہے، جب انسان اپنی غذا کے لیے بے قرار ہوتا ہے تو وہ موسم ربیع کو بھیج دیتا ہے، جب خشک سالی کے آثار چھا جاتے ہیں تو آسمان پر رحمت کی بدلیاں پھیل جاتی ہیں:

اللَّهُ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَيُبْسِطُ فِي السَّمَاءِ كَيْفَ يَشَاءُ وَيَجْعَلُهُ كِسْفًا فَتَكْثُرُ الْوُدُقُ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ ۖ فَإِذَا أَصَابَ بِهِ مِنْ يَسَاءٍ مِنْ عِبَادَةٍ إِذَا هُمْ يَسْتَبِشِرُونَ ﴿٣٨﴾ (روم: ٣٨)

”وہ خدا ہی تو ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور ہوائیں بادلوں کو اپنی جگہ سے ابھارتی ہیں اور جس طرح اس کی مرضی نے انتظام کر دیا ہے، بادل فضا میں پھیل جاتے ہیں، پس تم دیکھتے ہو کہ ان کے اندر سے مینہ برسنے لگتا ہے اور تمام زمین سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے پھر جب وہ اپنے بندوں پر جو بارش سے مایوس ہو گئے تھے، پانی برساتا ہے، تو وہ کامیاب و خرم ہو کر خوشیاں منانے لگتے ہیں۔“

قدرتی مثالوں کی حکمت

خدا کی تمام مثالیں اور دانائیاں جو وہ اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے کھولتا ہے، ہمیشہ عام اور قدرتی مناظر سے تعلق رکھتی ہیں تاکہ زمین کی ہر مخلوق ان کی تصدیق کر سکے اور ان سے دانائی حاصل کر سکے۔ وہ ایسے تغیرات و حوادث اور غیر فطری و صناعی چیزوں کا ذکر نہیں کرتے جن کو دیکھنے سمجھنے کے لیے کسی خاص طرح کی زندگی، خاص طرح کے علم اور خاص طرح کے گرد و پیش کی ضرورت ہو، بلکہ اس کی ہر تعلیم ایسی عام اور خالص فطری حالات سے متعلق ہوتی ہے، جس کو سن کر جنگل کا ایک چرواہا اور متمدن آبادیوں کا فیلسوف دونوں یکساں اثر کے ساتھ خدا کی سچائی کو پاسکتے ہیں۔ پس اگر تم نے فلسفہ و حکمت نہیں پڑھا، اگر تم نے اجرام سماویہ کے دیکھنے کے لیے کسی رصد خانے کی قیمتی دور بین نہیں پائی، اگر تم کو مادہ کے خواص کا تجربہ نہیں، اگر تم کسی دارالعلوم کے اندر برسوں تک نہیں رہے، اگر تم صحرائی ہو، اگر تم پہاڑوں کی چوٹیوں پر گوشہ نشین ہو، اگر پھونس کی ایک چھت اور بانسوں کی ایک شکستہ دیوار ہی رہنے اور بسنے کے لیے تمہارے حصے میں آئی ہے اور اس طرح تم نہیں جانتے کہ اپنے خدا کو آسمان کے عجیب و غریب ستاروں کے اندر کیونکر دیکھو اور

اس کے حسن و جمال کو عناصر و ذرات خلقت کی آمیزش و آویزش کے اندر کیونکر ڈھونڈو، تاہم تم انسان ہو، تم کو روح دی گئی ہے اور تم زمین پر بستے ہو، تم آسمان کی ہر بدلی کے اندر، بادلوں کے ہر ٹکڑے کے اندر، ہواؤں کے ہر جھونکے کے اندر، باران رحمت کے ہر قطرے کے اندر، اپنے خداوندی و قیوم کو، اس کی حکمت و قدرت کو، اس کی رافت و رحمت کو، اس کے پیار اور محبت کو دیکھ سکتے ہو اور اسے پاسکتے ہو۔ تم میں سے کون ہے جس نے امید و بیم کی نظروں سے کبھی آسمان کو نہیں دیکھا اور اس کی بجلیوں کی چمک اور بادلوں کی گرج کے اندر اپنی کھوئی ہوئی امید کو نہیں ڈھونڈا؟

وَمِنْ آيَاتِهِ يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا (روم: ٢٤)

”اور قدرت الہی کی ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ جب زمین پیاسی ہوتی ہے اور خشک سالی کے آثار ہر طرف چھا جاتے ہیں تو وہ آسمان پر بارش کی علامتیں پیدا کر دیتا ہے اور تم امید و بیم کی نظروں سے انھیں دیکھتے ہو۔“

موت کے بعد زندگی

پھر وہ کون ہے کہ جب تم اور تمہاری تشنہ و بیقرار زمین پانی کے ایک ایک قطرے کے لیے ترس جاتی ہے، خاک کا ایک ایک ذرہ رطوبت و غمو کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے۔ کرہ ارضی اپنی بے خودانہ حرکت میں آفتاب کے آتش کدے سے قریب تر ہو جاتا ہے۔ اس کی تمام کائنات نباتات اپنا حسن و جمال فطری کھودیتی ہے، پرندے اپنے گھونسلوں میں، ٹہنیاں درختوں میں اور انسان گھروں میں پانی کے لیے ماتم کرتا اور ہر دم آسمان کی گرم و خشک فضا کی طرف مایوسی کی نگاہیں اٹھاتا ہے تو وہ اپنی محبت و ربوبیت کے نقاب میں آتا ہے اور مایوسی کے بعد امید کا، ناامدادی کے بعد مراد کا، موت کے بعد زندگی کا پیام زمین کے ایک ایک ذرہ تک پہنچا دیتا ہے۔

وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيُخْرِجُ بِهِ الْأَشْنَاعَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿٢٣﴾ (روم: ٢٣)

”اس کی ربوبیت و رحمت کو دیکھو کہ جب تم امید و بیم کی نظروں سے آسمان کو دیکھتے ہو اور تمام زمین پر مردنی اور ہلاکی چھا جاتی ہے تو وہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور زمین پر موت کے بعد زندگی طاری ہو جاتی ہے۔ یقیناً قدرت الہی کی اس نمود میں صاحبان فکر و عقل کے لیے بڑی ہی نشانیاں رکھی گئی ہیں۔“

روح کی پیاس اور دل کی بھوک

یہ وہ انتظام الہی ہے جو پروردگار عالم نے انسان کے جسم کی غذا کے لیے کیا ہے، پھر کیا اس نے انسان کی روح کے لیے کچھ نہ کیا ہو گا؟ وہ رب الارباب جو زمین کی پکار سن کر اسے پانی دیتا اور جسم کی بے

آسمان کو رحم کرنا چاہیے۔ وہاں بھی جب سچائی کا درخت مڑ جھکا جاتا ہے، نیکی کی کھیتیاں ٹوکھ جاتی ہیں، عدالت کا باغ ویران ہو جاتا ہے اور خدا کے کلمہ حق و صدق کا شجرہ طیبہ دنیا کے ہر گوشے اور ہر حصے میں بے برگ و بار نظر آنے لگتا ہے تو اس وقت رُوح انسانیت چیختی ہے کہ خدا کو رحم کرنا چاہیے۔ یہاں زمین پر موت طاری ہوتی ہے تو خدا کی بارش اسے پھر اٹھا کر بٹھا دیتی ہے:

وَهُوَ الَّذِي يُنْزِلُ الْغَيْثَ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَيَذَرُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ رُجُومَ الْمِطْرِ ۖ خَلَقَ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ عَالِمٌ بِذُنُوبِهِمْ ۚ وَهُوَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٠٧﴾ (اعراف: ٥٤)

”اور وہ پروردگار عالم ہی تو ہے کہ بارش سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے جو بارانِ رحمت کے آنے کی خوشخبری سنا دیتی ہیں، یہاں تک کہ جب اس کا وقت آ جاتا ہے تو وہ وزنی بادلوں کو حرکت دیتی ہیں اور ہم انہیں ایک ایسے شہر کے اوپر لے جا کر پھیلا دیتے ہیں جو ہلاک ہو چکا ہے اور زندگی کے لیے پیسا ہے۔ پھر پانی برستا ہے اور زمین کی موت کو زندگی میں بدل دیتا ہے، اس کی نمو بخشی سے طرح طرح کے پھل پیدا ہوتے ہیں اور مخلوقات اپنی غذا حاصل کر لیتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم مردوں کو بھی اٹھاتے ہیں اور یہ جو کچھ کہا گیا ہے سو دراصل ایک مثال ہے کہ تم دانائی اور سمجھ حاصل کرو۔“

رحمت الہی کی عالمگیر نمود

عالم انسانیت کی فضاے روحانی کا ایک ایسا ہی انقلاب عظیم تھا جو چھٹی صدی عیسوی میں ظاہر ہوا۔ وہ رحمت الہی کی بدلیوں کی ایک عالمگیر نمود تھی جس کے فیضان عام نے تمام کائنات ہستی کو سرسبزی و شادابی کی بشارت سنائی اور زمین کی خشک سالیوں اور محرومیوں کی بد حالی کا دور ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ وہ خداوند قدوس، جس نے سینا کی چوٹیوں پر کہا تھا کہ میں اپنی قدرت کی بدلیوں کے اندر آتشیں بجلیوں کے ساتھ آؤں گا اور دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ میرے جاہ و جلال الہی کی نمود ہوگی، سو بالآخر وہ آگیا اور سعیر و فاران کی چوٹیوں پر اس کے ابر کرم کی بوندیں پڑنے لگیں۔

یہ ہدایت الہی کی تکمیل تھی، یہ شریعت ربانی کے ارتقاء کا مرتبہ آخری تھا، یہ سلسلہ تریل رسل و نزول رحمت کا اختتام تھا۔ یہ سعادت بشری کا آخری پیام تھا، یہ وراثت ارضی کی آخری بخشش تھی، یہ امت مسلمہ کے ظہور کا پہلا دن تھا اور یہ حضرت ختم المرسلین و رحمۃ اللطیف محمد بن عبد اللہ کی ولادت باسعادت تھی صلی اللہ علیہ و علی آلہ وصحبہ وسلم۔

یہی واقعہ ولادت نبوی ہے جو دعوت اسلام کے ظہور کا پہلا دن تھا اور یہی ماہ ربیع الاول ہے، جس میں اس امت مسلمہ کی بنیاد پڑی، جسے تمام عالم کی ہدایت و سعادت کا منصب عطا ہونے والا تھا، یہ ریگستان حجاز کی بادشاہت کا پہلا دن تھا، یہ عرب کی ترقی و عروج کے بانی کی پیدائش نہ تھی، یہ

قراری دیکھ کر اسے غذا بخشتا ہے، کیا سر زمین روح و معنی کی تفکلی کے لیے کچھ نہیں رکھتا اور دل کی بھوک کے لیے اس کے خزانوں میں کوئی نعمت نہیں؟

وہ کہ اس کی محبت زمین کی مٹی کو خشک نہیں دیکھ سکتی اور درختوں کی ٹہنیوں کو وہ سبز پتوں اور سرخ پھولوں کی زیبائش سے محروم نہیں رکھتا، کیا روح انسانی کو ہلاکت و بربادی کے لیے چھوڑ دے گا اور عالم انسانیت کا مڑ جھکا جانا اسے خوشی دے گا؟ وہ رب العلمین جو تمہارے جسم کو غذا دے کر موت سے بچاتا ہے، کیونکر ممکن ہے کہ تمہاری روح کو ہدایت دے کر ضلالت سے نہ بچائے؟

جب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ:

فَمَنْ رَبُّكُمَا يُؤْتِيهِمَا هَٰذَا (ط: ٣٩)

”تمہارا پروردگار کون ہے، اے موسیٰ؟“

تو حضرت موسیٰ نے نہ صرف اپنے رب الطمین کی نسبت خبر ہی دی، بلکہ اس کی الوہیت کی دلیل فطری و قطعی بھی چند لفظوں میں فرمادی:

رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ حَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ (ط: ٥٠)

”ہمارا رب وہ ہے جو ”رب“ ہے اور اس کے لیے اس کی ربوبیت نے کائنات کی ہر چیز کو اس کی خلقی ضروریات بخشیں، پھر اس کے بعد ان کی ہدایت کر دی تاکہ صحیح اور فطری طریقے پر کاربند رہ کر اپنی خلقت کے مقاصد حاصل کریں۔“

پس اس نے کہ زمین کی مٹی کے اندر قوت نشوونما رکھی، پھر پانی برسا کر اس کی ہدایت کر دی، یعنی اس کے آگے نفوذ و عمل کی راہ کھول دی اور جس کی ربوبیت نے عالم ہستی کے ایک ایک ذرہ کے لیے خلقت اور ہدایت دونوں کا سامان کر دیا، انسان کو بھی جسم اور روح دونوں کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس کے لیے بھی خلقت اور ہدایت، دونوں کا سامان رکھتا ہے۔

رحمت باری تعالیٰ کے خزانے

اس کی ربوبیت نے جس طرح جسم کے لیے زمین کے اندر طرح طرح کے خزانے رکھے ہیں، اسی طرح روح کی غذا اسے بھی اس کے آسمانوں کی وسعت معمور ہے۔ جس طرح جسم کی غذا اور زمین کی مادی حیات و نمو کے لیے آسمانوں پر بدلیاں پھیلیں، بجلیاں چمکتیں اور موسلا دھار پانی برستا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اقلیم روح و قلب کی فضا میں بھی تغیرات ہوتے ہیں۔ یہاں اگر زمین کی مٹی پانی کے لیے ترستی ہے، تو وہاں بھی انسانیت کی محرومی ہدایت کے لیے تڑپنے لگتی ہے، یہاں پتے جھڑتے ہیں، ٹہنیاں ٹوکھ لگتی ہیں اور پھولوں کے رنگین ورق بکھر جاتے ہیں تو تم کہتے ہو کہ

محض قوموں کی طاقتوں کا اعلان نہ تھا، اس میں صرف نسلوں اور ملکوں کی بزرگی کی دعوت نہ تھی جیسا کہ ہمیشہ ہوا ہے اور جیسا کچھ کہ دنیا کی تمام تاریخ کا انتہائی سرمایہ ہے، بلکہ یہ عالم کی ربانی بادشاہت کا یوم میلاد تھا۔ یہ دنیا کی ترقی و عروج کے بانی کی پیدائش تھی، یہ کریمِ ارضی کی سعادت کا ظہور تھا۔ یہ نوعِ انسانی کے شرف و احترام کا قیام عام تھا۔ یہ انسانوں کی بادشاہتوں، قوموں کی بڑائیوں اور ملکوں کی فتوحات کا نہیں بلکہ خدا کی ایک ہی اور عالمگیر بادشاہت کے عرشِ جلال و جبروت کی آخری اور دائمی نمود تھی۔ پس یہی دن سب سے بڑا ہے کیونکہ اسی دن کے اندر دنیا کی سب سے بڑی بڑائی ظاہر ہوئی۔ اس کی یاد نہ تو قوموں سے وابستہ ہے اور نہ نسلوں سے، بلکہ وہ تمام کریمِ ارضی کی ایک عام اور مشترک عظمت ہے جس کو وہ اس وقت تک نہیں بھلا سکتی، جب تک اسے سچائی اور نیکی کی ضرورت ہے اور جب تک اس کی زمین اپنی زندگی اور بقا کے لیے عدالت و صداقت کی محتاج ہے۔

دنیا کی بڑائیاں اور ان کے نتیجے

دنیا میں بڑے بڑے انقلاب ہوئے ہیں۔ یہ انقلابات خاص انسانوں کے وجود سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے ان انسانوں کی پیدائش کے ایام کو بھی دنیا عظمت کے ساتھ یاد رکھنا چاہتی ہے اور اس اعتبار سے اس کی یادگاروں کی فہرست بڑی ہی طویل ہے۔ اس میں بادشاہوں کے زر نگار تختوں کی قطاریں ہیں۔ فاتحوں کی بے پناہ تلواروں کی جھنکار ہے۔ سپہ سالاروں کے زرہ بکتر کی ہیبت ہے۔ حکیموں کی حکمتوں اور دانائیوں کے دفاتر ہیں۔ فلاسفہ و علماء کے علوم و صحائف کے خزانے ہیں، صنایعوں کی ایجاد ہیں۔ وطن پرستوں کے مواظ ہیں۔ قومی پیشواؤں اور ملکی داعیوں کی جانفشانیوں اور سرفروشیوں کی داستانیں ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دنیا اگر اپنی عظمت کے اصلی دن کو یاد رکھنا چاہتی ہے تو ان میں سے کسے یاد رکھے؟ ان میں سے کون ہے جس نے دنیا کو سب سے بڑی چیز دی ہے تاکہ وہ بھی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اس کی یاد کو پیار کرے۔

اولو العزم شہنشاہ

آؤ، ہم سب سے پہلے بڑے بڑے اولو العزم شہنشاہوں کو دیکھیں جنہوں نے دنیا کے بڑے بڑے رقبوں کو نوکِ شمشیر پر رکھ لیا اور ایسے عجیب و غریب ایوانوں اور محلوں میں بے، جن کی دیواریں اور چھتیں چاندی، سونے اور لعل و جواہر سے بنائی گئی تھیں۔ انہوں نے بہت زیادہ مال و متاع جمع کیا، ان کے پاس لوہے کے بہت سے آلات خونریزی تھے اور ان کی اطاعت و غلامی میں انسانوں کا سب سے بڑا گلہ تھا۔ پس ان کی پیدائش کے واقعہ کو بھی سب سے زیادہ عظیم الشان اور ناقابل

فراموش ہونا چاہیے۔ لیکن اگر دنیا ان کی پیدائش کو یاد رکھے تو بتلاؤ دنیا کے لیے انہوں نے کیا کیا؟ ان کی فتوحات، بہت وسیع تھیں اور ان کی وہ دولت جو انہوں نے زمین کی بستیوں کو اجاڑ کر لوٹی تھی، بڑے بڑے وسیع رقبوں کے اندر آتی تھی، لیکن دنیا کو اس سے کیا ملا کہ دنیا کی گردن ان کی یاد کے آگے: اگر وہ بہت بڑے فاتح تھے، تو اس کو یوں کہو کہ انہوں نے سب سے زیادہ زمین کو ویران کیا، سب سے زیادہ اس کی آبادیوں کو اجاڑا، سب سے زیادہ خون کی ندیاں بہائیں اور سب سے زیادہ خدا کے بندوں کے گلے میں اپنی غلامی کی لعنت کا طوق ڈالا۔ پھر کیا دنیا اپنی ویرانیوں، قتل و غارت، نہب و سلب اور اپنی غلامی کی لعنت کے ناپاک دنوں کو یاد رکھے؟ جن کی ابلہ سیت نے یہ لعنت پھیلائی تھی، ان کی پیدائش کی نحوست پر خوشیاں منائے؟

سکندر اور دوسرے فاتح

سکندر دنیائے قدیم کا سب سے بڑا فاتح تھا، جس نے پوری دنیا سے اپنے تخت کی پوجا کرانی چاہی، لیکن دنیا اگر اس کی پیدائش کو یاد رکھے تو یہ دن کن واقعات کی یاد ہو گا؟ یہ دنیا کی ویرانیوں، ہلاکتوں اور غلامی کی لعنتوں کا ایک بہت بڑا سرمایہ ہو گا، جو اسے ہاتھ آئے گا۔ دنیا میں جس قدر بادشاہ پیدا ہوئے، اگر تم ان کی زندگی کے تمام کارناموں کا حاصل معلوم کرنا چاہو، تو اس کے سوا اور کچھ نہ ہو گا کہ وہ جتنے بڑے بادشاہ تھے، اتنے ہی زیادہ انسانوں کو غلام بنانے والے تھے، اتنے ہی زیادہ ان کی فطری قوتوں کے لیے پتھر تھے، اتنے ہی زیادہ ان کی قدرتی حرکت و نشو کے لیے زنجیر تھے اور اتنے ہی زیادہ خدا کی عطا کردہ جبلتِ صالحہ اور انسان کے نوعی شرف و احترام کے لیے ان کے اندر برادیوں اور ہلاکتوں کی نحوست تھی، پس جن کا وجود خود دنیا کے لیے ایک زخم تھا، وہ ان کی یاد میں اپنی گم شدہ شفا کیونکر پاسکتی ہے؟

حکماء و فلاسفہ

حکماء کی حکمت، فلاسفر کا فلسفہ، صنایعوں کی ایجادیں، بلاشبہ تاریخِ عالم کے اہم مقامات ہیں، لیکن اگر وہ اپنی یاد کے آگے دنیا کو جھکانا چاہتے ہیں، تو انہیں بتلانا چاہیے کہ انہوں نے اپنی حکمت سرانیوں اور عجیب عجیب ایجادوں سے دنیا کے اصلی دکھ اور زمین کی حقیقی مصیبت کے لیے کیا کیا؟ آسمان کی فضا میں ان گنت ستاروں کی قطاریں پھیلی ہوئی ہیں۔ بلاشبہ وہ شخص بہت بڑا غور کرنے والا دماغ اور بڑی ہی کاوش کرنے والی نظر رکھتا تھا، جس نے ہمیں سب سے پہلے بتلایا کہ یہ بڑے بڑے ستارے ہیں، ان میں ثوابت ہیں اور ان کی حرکتوں کے معین اوقات و ایام ہیں، لیکن دنیا جب ستاروں کی یہ بہت بڑی سچائی نہیں جانتی تھی، تو اس وقت بھی بیمار تھی اور یہ معلوم کر کے بھی بیمار ہی

رہی۔ اس کا اصلی دکھ یہ نہ تھا کہ انسان آسمان کے متعلق تھوڑا جانتا ہے، بلکہ ہمیشہ سے وہ اس ایک ہی مرض میں گرفتار رہی ہے کہ انسان خود اپنی نسبت، اپنی فطرت صالحہ کی نسبت، اپنی راہ سعادت کی نسبت کچھ بھی نہیں جانتا۔

صنعت گر

اس صناعت کو اگر تم بڑا سمجھتے ہو، جس نے انسان کے لیے فن تعمیر ایجاد کیا تاکہ وہ پائدار مکانوں اور خوبصورت چھتوں کے نیچے بیٹھے، تو تمہیں بتلانا چاہیے کہ کیا انسان درختوں کے نیچے بیٹھ کر نیک اور سچا انسان نہ تھا اور بڑے بڑے مخلوق کے اندر بس کر اس نے اپنی گم شدہ حقیقت پالی؟ دنیا کا اصلی مرض انسانیت حقیقی کی گم شدگی ہے۔ سعادت انسانی اور امن ارضی ہی وہ نعمت ہے جس کی ڈھونڈ میں ابتدا سے کائنات کا ذرہ ذرہ تہ و بالا ہو رہا ہے۔ پھر بتلاؤ کہ اگر یہ بڑے بڑے صناعت اور موجد ہی انسانیت کی سب سے بڑی بڑائی رکھتے ہیں، تو ان کی ایجادوں نے انسان کو کس قدر امن دیا؟ کس قدر سلامتی بخشی؟ کہاں تک صراط سعادت پر چلایا؟ طلسم حیات انسانی کا کون سا راز انشاء کیا؟ خدا اور بندوں کے رشتوں کو کہاں تک جوڑا؟ پھر اگر وہ یہ نہ کر سکے تو دنیا ان کی ایجادات کو اپنے خزانے میں رکھ سکتی ہے، لیکن ان کی یاد میں اس کے لیے کوئی خوشی نہیں ہو سکتی کیونکہ انہوں نے اس کے اصلی دکھ کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔

دور حاضر

اچھا، دنیا بے قدیم کے ذخیرے میں جو کچھ ہے، اسے چھوڑ دو، کلدان و بابل اور یونان و اسکندریہ کے کھنڈر اور مسافر شدہ آثار کے اندر اگر دنیا کے لیے کچھ نہ تھا، تو بہت ممکن ہے کہ آج لندن اور برلن و پیرس کی عجیب و غریب آبادیوں اور عقل و فہم کو مبہوت کر دینے والے تمدن کے اندر دنیا کو وہ چیز مل جائے، جس کے لیے وہ ابتدائے خلق سے حیران و سرگشتہ رہی ہے۔

موجودہ تمدن یورپ کی ابتدا جن بڑے بڑے دعووں سے ہوتی ہے، ضرور ہے کہ وہ سب کے سب اس وقت تمہارے سامنے ہوں، کیونکہ ہماری موجودہ صحبت ان کے اعادے کی متحمل نہیں۔

ہم کو بتلایا گیا تھا کہ موجودہ تمدن کو دنیا کے قدیم تمدنوں سے کوئی مشابہت نہیں۔ ان کی مختلف شاخوں میں باہم ربط و علاقہ نہ تھا۔ ان کی بنیادیں صحت و حقیقت پر نہ تھیں، وہ انسانی علم و عمل کی تمام شاخوں کو بیک وقت مکمل نہ کر سکی تھی، انہوں نے معلومات و اعمال میں کوئی صحیح نظم و ترتیب پیدا نہیں کی اور انہیں اپنے تمدن کی اشاعت اور پھیلاؤ کے وہ ذرائع حاصل نہ تھے جن کے ذریعہ ہم نے کر رہی تھی اور علم و تمدن کا ایک گھر بنا دیا ہے۔ پس گزشتہ تمدنوں کی ناکامی سے موجودہ تمدن کی

ناکامی پر استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اور اسی طرح کے دعوے تھے جن سے موجودہ تمدن کی فضا بھر گئی تھی اور جن کے ذریعے سے اعلان کیا جاتا تھا کہ دنیا میں سب سے بڑی طاقت موجودہ تمدن کی ہے، حالانکہ سب سے بڑا صرف خدا ہے:

لَقَدْ اسْتَكْبَرُوا فِيْ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْا عُتُوًا كَبِيْرًا ﴿٢١﴾ (فرقان: ۲۱)

”بلاشبہ انہوں نے یہ کہہ کر اپنے اندر بڑا گھمنڈ پیدا کیا اور بڑی سخت درجے کی سرکشی کی۔“

اپنے ہاتھوں گھر برباد کرنے والے

سواب تم دیکھو کہ دنیا اپنے اعتراف کا سر جھکانے کے لیے جب تمدن کے اس سب سے بڑے مغروریت کی طرف جاتی ہے، تو اسے کیا جواب ملتا ہے۔

آج تمدن کے ابلیدسانہ گھمنڈ کا ملعون بُت چور چور کر دیا گیا ہے، خدا کا وہ زبردست اور بے پناہ ہاتھ جو قوم ثمود و عاد اور بڑی بڑی آبادیوں اور بڑے بڑے خیموں والوں کو سزا دے چکا تھا، اپنے جلال اور ہولناکی کی آتیشوں کی چمک دکھلا رہا ہے۔ تم یورپ کی موجودہ جنگ^۱ اور متمدن اقوام کے باہمی قتل و خونریزی پر چارپایوں کی طرح نہیں بلکہ انسانوں کی طرح نظر ڈالو اور دیکھو کہ یہ کیا ہے جو تمہارے سامنے ہو رہا ہے؟ یہ تمدن اور وحشت کی پکار نہیں، یہ علم اور جہل کی ٹکر نہیں یہ تمدن ہے جو تمدن سے ٹکرار رہا ہے، یہ علم ہے جو علم کو ذبح کر رہا ہے۔ یہ صنعت ہے جو صنعت کو پس رہی ہے۔ یہ ایجاد کا مغرور شیطان ہے، جو ایجاد ہی کے شیطان لعین کو ڈس رہا ہے اور اس طرح تمدن کا گھمنڈ ہی ہے جو تمدن کے گھمنڈ کو ریزہ ریزہ اور پاش پاش کر رہا ہے۔

يُخْرِجُوْنَ يَبۡيُوۡتُهُمْ بِاٰيٰتِنَا يُنۡهَمُ ”اپنے گھروں کو وہ اپنے ہاتھوں ہی سے اجاڑ رہے ہیں۔“

پس اگر مسکین دنیا ان انسانوں کو یاد رکھنا چاہتی ہے جو تمدن کے بادشاہ تھے، علم کے فرمانبردار تھے اور ایجاد صنعت کے دیوتا تھے، تو تم اس کا ہاتھ پکڑو اور اسے آج یورپ کے ان میدانوں کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دو جہاں تمدن و علم کا تخت عظمت و جلال آگ اور لہو کی بدلیوں اور ڈھوئیں اور زہریلی گیسوں کی مسموم فضا کے اندر بچایا گیا ہے اور مسمار عمارتوں کے کھنڈروں، سُرخ سرخ خون کی ندیوں اور انسانوں کی تڑپتی ہوئی لاشوں کے تو دوں پر اس کے

^۱ یہ مقالہ پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴-۱۹۱۸) کے دوران میں لکھا گیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ (۱۹۳۹-۱۹۴۵) نے اس کے مطالب کی مزید تصدیق کر دی۔ عادیثہ، فرعون اور ہزاروں دوسرے سرکش مختلف طریقوں سے فنا کے گھاٹ اتر گئے۔ یورپ پر موت و ہلاکت کی جو ہولناک آفتیں عالمی جنگوں کی شکل میں مسلط ہوئیں، وہ بھی تو بے ہر حال ویسے ہی عذاب تھے جو سابقہ قوموں پر مختلف اوقات و ادوار میں نازل ہو چکے تھے۔ کیا اہل یورپ نے اپنے ہاتھوں اپنے گھر برباد نہ کیے؟ ہٹلر، سٹالین، چرچل، دوسرے لوگ ایک دوسرے کو کاٹا مٹا دینے کے لیے ہر ممکن جدوجہد نہ کرتے رہے؟

سنہرے ستون عظمت نصب کیے گئے ہیں۔ پھر اس سے کہو کہ وہ اپنی احسان مندی اور شکر گزاری کے لیے ان عظیم الشان انسانوں میں سے کسی کی بڑائی کو چھانٹ لے، جو آج گہیوں اور جو کے لیے روتے ہیں کیونکہ ہوا میں اڑنے کے آلات اور پانی کو مفرد اجزا میں بدل لینے کا علم ان کے کچھ کام نہ آیا۔

کس کی یاد منائیں؟

وہ ان میں سے کس کو اپنی پرستش اور یاد کے لیے پختے گی؟ کیا وہ اس سب سے بڑے فلسفی کو یاد کرے گی، جو چودھویں صدی عیسوی میں آیا اور اس نے تجربے کی راہ کھولی، جس راہ نے انسانوں کو ہلاکت اور خونریزی کے سب سے زیادہ روح پاش آلات تک پہنچا دیا؟ وہ کیمسٹری کے اس دیوتا کو یاد کرے گی جس پر موجود تمدن کو سب سے زیادہ ناز ہے اور جس نے ایسی زہریلی گیسیں، ایسے مہلک بم اور شیل اور ایسے بے پناہ مرکبات بنا دیے جن کے آگے انسانی جماعتیں بالکل بے بس ہو جاتی ہیں اور منوں کے اندر بڑی بڑی آبادیاں موت کی لعنت سے بھر جاتی ہیں؟ اچھا، بھاپ کی طاقت کے مؤجد کو بلاؤ، اس کی بڑائی کیسی عجیب تھی جس نے بھاپ کی غیر معلوم طاقت کو انسان کے تابع کر دیا؟ لیکن آہ! وہ اس دنیا کے لیے کیا کرے جو موت کی نہیں، بلکہ زندگی کی بھوک ہے اور دیکھ رہی ہے کہ بھاپ کے شیطان ہی کے اندر وہ سب سے بڑی بے پناہ خباثت ہے، جس نے آج جنگ کے میدانوں میں مختلف بھیسوں اور مختلف صورتوں کے اندر موت کی سب سے بڑی پھنکار ماری ہے اور تمام انسانی علم و دانائی اس کے بچاؤ کے لیے بیکار ہے!

پھر کیا دنیا تمدن و علم کے ان مغرور بانیوں کی پیدائش پر خوشیاں منائے جنہوں نے اس کی موت اور ہلاکت کے لیے تو سب کچھ کیا، پر اس کے امن و سلامتی اور سعادت و طمانیت کے لیے کچھ نہ کر سکے؟ ان کے پاس انسان کے اڑنے، سمندروں کے اندر جانے، بجلی کو قابو میں کرنے، ہوا کے تھوڑے اور ذرات کو اپنے نامہ و پیام کا سفیر بنانے اور خود بخود بجتے والے باجوں اور بڑے تیزی سے چلنے والی سواریوں کے لیے تو بڑا ذخیرہ ہے۔ لیکن انسان کو نیک اور راست باز بنانے، خدا کی عدالت و صداقت سے زمین کو معمور کرنے، امن اور راحت کی بادشاہت کے قائم کر دینے، ظلم و فساد کے بیج سے زمین کو صاف کرنے، طاقت اور حکم کے جبر سے ضعف اور ناتوانی کو بچانے اور انسانوں کو درندوں اور سانپوں کی طرح نہیں، بلکہ انسانوں کی طرح بے سادہ دینے کے لیے کچھ بھی نہیں۔

قرآن حکیم کا درس حکمت

تم نے یورپ کے تمدن کی، کتوں کی طرح لوٹ کر اور بھیڑوں کی طرح چل کر ہمیشہ پرستش کی ہے اور مذہب کی تعلیمات کی ہنسی اڑائی ہے کہ وہ ”آخرت آخرت“ کہتا ہے، مگر یورپ کی طرح

دنیا کے لیے کچھ نہیں بتلاتا لیکن شاید تم آج قرآن کی اس آیت کو سمجھ سکو۔ جس کے متعلق حدیث صحیح میں آیا ہے کہ اس کی تلاوت آخری زمانے کے فتنہ سے بچائے گی:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۚ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا تُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَزْنًا ۝ (کہف: ۱۰۳-۱۰۵)

”تم کو بتلاؤں کہ سب سے زیادہ ناکام و نامراد گھرانے والے کون ہیں؟ وہ جن کی تمام قوت سعی صرف دنیا کی زندگی سنوارنے ہی میں کھوئی گئی اور جہل حقیقت نے ان میں یہ گھمنڈ پیدا کر دیا کہ بہت سی خوبیوں کا کام کر رہے ہیں، یہی لوگ ہیں جنہوں نے پروردگار کی آیتوں اور اس کے حضور حاضر ہونے سے انکار کیا۔ پس ان کے سارے کام اکارت گئے اور قیامت کے دن انہیں کوئی وزن نصیب نہ ہو گا۔“

دوسری جگہ ارباب کفر کے اعمال یہ بتلائے:

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غٰفِلُونَ ۝ (روم: ۷)

”صرف دنیا کی زندگی کا ایک ظاہری پہلو انہوں نے جان لیا ہے اور وہ آخرت کے علاقوں سے بالکل غافل ہو گئے۔“

آخرت سے مقصود یہ نہیں کہ دنیا اور دنیا کے اعمال ترک کر دیے جائیں، بلکہ اس کی عملی تفسیر یورپ کی موجودہ زندگی کو سمجھو، جس نے اپنے تئیں صرف دنیا ہی کے لیے وقف کر دیا اور اس کے گھمنڈ میں وہ اللہ اور اس کے رشتے کے لیے کوئی وقت اور فکر نہ نکال سکی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے وہ چیز تو حاصل کر لی، جس کا نام تمدن رکھا گیا ہے، لیکن وہ شے حاصل نہ کر سکی جو انسان کے لیے امن حقیقی کی راہ اور اسلام و سعادت فکری کی صراط مستقیم ہے۔

خدا کے پاک رسول ﷺ

تم کہہ سکتے ہو کہ یہ ان انسانوں کا حال ہے، جن کی بڑائیاں صرف جسم و مادہ تک محدود تھیں لیکن اگر دنیا کے لیے ان کی پیدائش کی یاد میں کوئی تسکین اور راحت نہیں تو وہ ان تمام مصلوں سے باہر آجائے گی اور دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کے دامن میں پناہ لے گی۔ وہ بانیان مذہب کی عظمتوں کا نظارہ کرے گی۔ وہ خدا کے رسولوں اور اس کے پاک پیامبروں کو ڈھونڈے گی۔

ہاں، اگر دنیا ایسا کرے تو یہ فی الحقیقت اس کی مصیبتوں کا خاتمہ ہو گا، اس کے دائمی درد اور بے قراریوں کے لیے سکھ اور راحت کی ایک حیات بخش کرٹ ہو گی اور وہ بلاشبہ منزل مقصود کو پالے گی۔ قرآن حکیم نے بھی اس کے دکھ کا یہی علاج بتایا ہے اور جب کہ وہ بادشاہوں، قومی

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صرف بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلائی، مگر پوری دنیا غلامی سے نکلنے کی آرزو مند ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

دوسرا سب سے بڑا اسرائیلی مذہب مسیحی تحریک کا ہے لیکن مسیحی دعوت کی تعلیم ہمارے سامنے ہے۔ اس کے علاوہ مسیحیت سے منسوب قومیں جو کچھ کہیں گی، ہم اسے حضرت مسیح علیہ السلام کے نام سے قبول نہیں کر سکتے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے کہا کہ میں صرف تورات کو قائم کرنے آیا ہوں، خود کوئی نئی دعوت نہیں لایا (متی ۵: ۱۷) انہوں نے تصریح کی میرا مشن صرف بنی اسرائیل کی اصلاح تک محدود ہے۔ نیز انھوں نے غیر قوموں میں منادی کرنے سے روکا۔^{۱۰} اور ہمیشہ اپنے کاموں اور اپنی وصیتوں میں اپنی تعلیم کو اسرائیل کے گھرانے تک ہی محدود رکھا۔ پس دراصل انھوں نے جو کچھ بھی خدمت کرنی چاہی وہ محض بنی اسرائیل نامی ایک منحصر قوم کی تھی، تمام دنیا کے لیے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔

پھر ان کا ظہور اس وقت ہوا جب روم کی ظالمانہ حکومت نے شام کے مقدس مرغزاروں کو روند ڈالا تھا اور بت پرست قوموں کی جابر و مستبد گورنمنٹیں دنیا کے بڑے حصے کو اپنا غلام بنائے ہوئے تھیں، لیکن انھوں نے نہ تو اس ظلم و طغیان کے متعلق کچھ کہا اور نہ اس سے کچھ تعرض کیا۔

مسیحی قومیں اور تعلیم مسیح علیہ السلام

پہلی صدی مسیحی کے بعد جس قدر مسیحی قومیں دنیا میں آباد ہوئیں، ان کو حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم و دعوت سے کچھ تعلق نہ تھا اور وہ سرتاسر یونان کے ایک تعلیم یافتہ یہودی پولس کے مذہب کی پیرو تھیں۔ پولس نے تمام حواریان مسیح علیہ السلام کے مذہب کے خلاف غیر اسرائیلی انسانوں کو بپتسمہ دینا شروع کیا اور اس طرح روم اور یونان کے مختلف جزیروں اور دیہاتوں میں ایک نیا گروہ پیدا کر لیا پس اگر دنیا حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف جھکنا چاہے گی، تو دنیا کو ان کے کارنامہ حیات کے لیے بمشکل ایک چوتھائی صدی ہاتھ آئے گی، جس کے اندر ان کے تربیت یافتہ حواریوں کے اعمال نظر آسکتے ہیں اور یہ چند سال فضائل و محاسن اخلاق کا کیسا ہی عمدہ نمونہ پیش کریں، لیکن ان میں دنیا کے لیے کوئی پیغام نجات نہیں۔

^{۱۰} غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور نہ سامریوں کے کسی شہر میں داخل ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔ (متی ۱۰: ۶)

پیشواؤں، کاہنوں اور علم و مذہب کے جھوٹے مدعیوں کے دامن غرور میں لپٹی ہوئی تھی تو اسے وصیت کی کہ وہ سچائی کے رسولوں اور خدا کے داعیوں کی راہ اختیار کرے اور انہی کی زندگی کو اپنا نصب العین بنائے:

إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ﴿۱﴾ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴿۲﴾ (سورۃ فاتحہ)

”خدا یا تو ہمیں صراطِ مستقیم پر چلا، وہ صراطِ مستقیم جو تیرے نبیوں، صدیقیوں، شہیدوں، صالح بندوں کی راہ ہے۔“

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس میدان میں بھی آکر وہ کون سی زندگی ہے، جس کے اعمال دعوت کے اندر دنیا کو پیام امن و سعادت مل سکتا ہے؟

دنیا میں آج جو بڑے بڑے مذاہب موجود ہیں، وہ علم الاقوام کی تقسیم کے مطابق دو قسموں میں منقسم کیے جاسکتے ہیں۔ ایک سیماطبی (سامی) سلسلہ ہے، جس کے ماتحت یہودی اور مسیحی قومیں اب تک دنیا میں باقی ہیں۔ دوسرا آفرین سلسلہ ہے جس سے گوتم بدھ اور ہندوستان کے تمام داعیان مذہب وابستہ ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

پھر دنیا کے لیے اگر سب سے بڑا رسول یہودی مذہب کی تاریخ میں ہے، تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی اور ان کی پیدائش کو سب سے بڑا واقعہ قرار دے گی، لیکن اگر اس نے ایسا کرنا چاہا تو اسے یہ سمجھنے کا حق حاصل ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعمال حیات مقدس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مصر کی ایک جابر و ظالم گورنمنٹ کے پتھر استبداد سے بنی اسرائیل کو نجات دلائی اور اسے غلامی کی ناپاکی سے نکال کر جو انسانیت کے لیے سب سے بڑی ناپاکی ہے، حکومت اور امن و عزت کی طہارت تک پہنچا دیا۔

بلاشبہ انھوں نے اپنی قوم یعنی بنی اسرائیل کی نسل کے لیے بڑا ہی مقدس جہاد کیا اور یہ ان کا یادگار عالم اسوہ حسنہ ہے، جس کی دنیا کو تقدیس کرنی چاہیے، لیکن سوال یہ ہے کہ انہوں نے تمام دنیا کے لیے کیا کیا؟ دنیا صرف بنی اسرائیل ہی کا نام نہیں۔^{۱۱} غیر الہی عبودیت کی زنجیریں صرف بنی اسرائیل ہی کے پاؤں میں نہیں تھیں، بلکہ کریم ارضی کی تمام آبادی کے پاؤں اس کے بوجھ سے زخمی تھے، پس دنیا کے لیے وہی تلوار محبوب ہو سکتی ہے جو صرف فرعون کی ڈالی ہوئی زنجیریں ہی نہ کاٹے، بلکہ دنیا کے تمام فرعونوں کے تخت الٹ دے۔

^{۱۱} دراصل ان کی رسالت کا دائرہ کاری ان کی قوم تھی نہ کہ بین الاقوامیت۔

پھر اس سے بھی قطع نظر کرو، نتائج کی بحث بعد کو آتی ہے۔ سب سے پہلے دعوت، اعلان، ادعاء اور نفس تعلیم کا سوال ہے۔ دنیا حضرت مسیح علیہ السلام کی یاد پر کیونکر قناعت کرے، جب کہ خود انھوں نے دنیا کے لیے کچھ نہ کیا، بلکہ ہمیشہ اسے ٹھکرایا، مردود کہا اور اس کے ساتھیوں کو، اس کے دوستوں کو اور اس سے رشتہ رکھنے والوں کو خدا کی بادشاہت کی مہربانی سے محروم بتلایا، حتیٰ کہ ایک آخری فتویٰ دے دیا "تم خدا اور دنیا، دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے (متی ۶:۲۵) اونٹ کا ٹوٹی کے ناکے سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو"۔ (متی ۱۹:۲۳)

اس سے درگزر کرو اور اس کی بہتر سے بہتر توجیہ جو کر سکتے ہو کر لو اور نیز پولس کی دعوت ہی کو حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت تسلیم کر لو اور ان تمام قوموں کو جنہوں نے مسیح علیہ السلام کے نام پر جیتنے کا پانی اپنے اوپر چھڑکا، مسیحی دعوت کا پھل مان لو، لیکن پھر بھی مسیحی تحریک کی پوری تاریخ کا کیا حال ہے؟

مسیحیت کی حکمرانی

جب تک مسیحیت دنیا پر حکمران رہی، جس وقت تک مسیحی مذہب کا دینی تسلط انسانوں سے اطاعت کراتا رہا اور جب تک کہ مسیحی رہنماؤں کی غلامی سے دنیا نے انحراف نہ کیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس وقت تک اس کا وجود دنیا کے لیے، دنیا کے علم و تمدن کے لیے، آبادی و عمرانی کے لیے، اخلاق و پاکیزگی کے لیے اور ان سب سے بڑھ کر یہ ایک انسان کی فطری حریت اور شرف انسانیت کے لیے ایک بدترین لعنت رہا، جس نے جلایا، ویران کیا، مسمار کیا، قتل کیا، جیل خانے بھرے، زبانوں پر مہریں لگائیں، انسانی دماغوں کو معطل کیا، لیکن انسان اور انسانیت کی راستی و ترقی کے لیے چند لحوں کا بھی ایک دور پیدا نہ کیا۔^۱ مشہور مورخ گیزو، سیدیو، لامارے اور ڈرپر اس بارے میں ہمارے لیے بہترین راوی ہیں۔

لیکن جس وقت سے کہ مسیحیت کی قوت نے شکست کھائی تمدن کا غیر دینی دور شروع ہوا۔ مذہبی جماعتوں اور مذہبی خلافت (یورپ) کے حلقہ غلامی سے یورپ آزاد ہو گیا اس وقت سے یورپ کے موجودہ تمدن کی بنیاد پڑی اور مسیحی قوموں نے ترقی شروع کی۔ اگر تم کہتے ہو کہ دنیا کے لیے سب سے بڑی عظمت مسیحی مذہب کے بانی میں تھی، تو خود اس کے بانی ہی نے ہمیں معیار حق و

^۱ یورپ اور امریکہ مسیحیت کے بہت بڑے مراکز ہیں، کیا ان کی سرگزشت استعمار خواہ اس کی شکل کوئی ہو، ابتدا سے آج تک عالم انسانیت کے لیے خصوصاً کمزور قوموں، ملکوں اور ملتوں کے لیے سب سے بڑی مصیبت نہیں بنی رہی؟ اور آج بھی ہر مصیبت کا سرچشمہ یہی استعمار نہیں جس کی وجہ سے امن عالم معرض خطرے میں ہے؟ پہلے جمیت اقوام (لیگ آف نیشنز) استعمار پرستوں کی ذاتی اغراض کے باعث برباد ہوئی آج انجمن اقوام متحدہ ویسی ہی حالت سے دوچار ہے۔

باطل بھی بتلادیا ہے کہ "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے" (مرقس ۱۹-۱۶) پس دنیا اگر مسیحی مذہب کی پیدائش کے اندر اپنی خوشی کو ڈھونڈے تو اس کو انسان کے امن و سلامتی اور فطرت کی آزادی و سعادت کی جگہ قتل و غارت اور ہلاکت و غلامی کی یادگار کا جشن منانا پڑے گا کیونکہ "مسیحیت" کے درخت کا تو یہی پھل ہمارے سامنے ہے، پھر کیا دنیا اس کے لیے تیار ہے؟

یہ جو کچھ تھا، مسیحی اقوام کی تاریخ قدیم کی بنا پر تھا لیکن اگر اس پر گزشتہ دو صدیوں کے واقعات و نتائج کا بھی اضافہ کر دیا جائے جو اقوام یورپ کے اعمال تمدن سے وابستہ ہیں تو دنیا کی مایوسی اور زیادہ درد انگیز ہو جائے۔

آریائی نسل کی دعوتیں

اس کے بعد مذہب عالم میں آریین نسلوں کی دعوتیں ہمارے سامنے آتی ہیں، لیکن افسوس کہ دنیا کے لیے ان کے پاس بھی کوئی پیام سعادت نہیں۔ عظیم الشان گوتم بدھ کی تعلیم و وصایا کا ماحصل یہ بتلایا جاتا ہے کہ "نجات دنیا کے ساتھ رہ کر حاصل نہیں ہو سکتی"۔ پس دنیا کو جن لوگوں نے ٹھکرایا، دنیا ان کے پاس جا کر کیا سکھ حاصل کرے گی؟ پھر اس نے جو کچھ بھی بتلایا اور سکھلایا ہو، لیکن قوموں اور ملکوں کے دائرہ ہی میں اس کی دعوت محدود رہی۔ ہندوستان میں اسے شکست ملی تو جاپان اور چین میں جا کر محدود ہو گئی۔ پس زمین اپنی اس مصیبت کے لیے جو رقبوں اور ملکوں میں محدود نہیں، عظیم الشان بدھ سے کیا حاصل کر سکتی ہے؟

ہندوستان کے مذہبی ذخیرہ تعلیمات اور ان کی پُر اثر قدامت کی وقعت سے ہم انکار نہیں کر سکتے، تاہم دنیا کے لیے ان کے بانیوں کی عظمت کے اندر کیا خوشی ہو سکتی ہے جب کہ کوہ ہمالیہ کی دیواروں اور بحیرہ عرب کی موجوں سے باہر بھی دنیا ہے، مگر ہندوستان کے مذہبی داعیوں نے صرف ہندوستان کے اندر بسنے والوں ہی کو لہنی ہدایتیں سپرد کیں۔

نجات و تسکین کا واحد پیام

پس دنیا اگر اپنی نجات کے لیے بے چین ہے تو اس کے لیے راحت اور تسکین کا پیام صرف ایک ہی ہے اور صرف ایک ہی کی زندگی میں ہے۔ اس کا دکھ ایک ہی ہے اس لیے اس کی شفا کے نسخے بھی ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔ اس کا پروردگار ایک ہے جو اپنے ایک ہی آفتاب کو اس کے خشک و تر پر چمکا تا اور ایک ہی طرح کی بدلیوں سے اس کے آباد و ویرانے کو شاداب کرتا ہے۔ اس کی ہدایت و رحمت کا آفتاب بھی ایک ہی ہے اور بہت سے ستارے اس کی روشنی سے اکتساب نور حاصل کرتے ہوں مگر ان سب کا مرکز و مبدا نورانیت ایک ہی ہے۔

قرآن حکیم نے آفتاب کو ”سراج“ کہا:

وَجَعَلْنَاهُ سِرَاجًا وَهَّاجًا ﴿١٣﴾ (نبا: ۱۳)

”اور ہم نے آسمان میں سورج کے چراغ کو بڑا ہی روشن بنایا۔“
اور اسی طرح اس کے ظہور کو بھی ”سراج“ کہا، جس کی ہدایت و رحمت کی روشنی کرہ ارضی کی ظلمتوں کے لیے پیام صبح تھی:

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿١٤﴾ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُبِينًا ﴿١٥﴾

(احزاب: ۳۵-۳۶)

”اے پیغمبر اسلام! ہم نے تم کو دنیا کے آگے حق کی گواہی دینے والا، سعادت انسانیت کی خوشخبری پھیلانے والا، اللہ کی طرف اس کے بندوں کو بلانے والا اور دنیا کی تاریکیوں کے لیے ایک چراغ نورانی بنا کر بھیجا۔“

کرہ ارض کے لیے آفتاب ہدایت

پس تمام کرہ ارض کی روشنی کے لیے یہی ایک آفتاب ہدایت ہے، جس کی عالم تسخیر کرنوں کے اندر دنیا اپنی تمام تاریکیوں کے لیے نور بشارت پاسکتی ہے اور اس لیے صرف وہی ایک ہے جس کے طلوع کے پہلے دن کو دنیا کبھی نہیں بھلا سکتی اور اگر اس نے بھلا دیا ہے تو وہ وقت دور نہیں جب اسے کامل عشق و شیفگی کے ساتھ صرف اسی کے آگے جھکنا پڑے گا اور اسی کو اپنا کعبہ امید بنانا پڑے گا۔

اس مقدس پیدائش نے دنیا میں ظاہر ہو کر یہ نہیں کہا کہ میں صرف بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانے آیا ہوں، بلکہ اس نے کہا کہ تمام عالم انسانیت کو غیر الہی قوموں سے نجات دلانا میرا مقصد ظہور ہے۔ اس نے صرف اسرائیل کے گھرانے کی گم شدہ رونق ہی سے عشق نہیں کیا، بلکہ تمام عالم کی اجڑی ہوئی بستی پر غمگینی کی اور ان کی دوبارہ رونق و آبادی کا اعلان کیا۔ اس نے اس خدا کی محبتوں کی طرف دعوت نہیں دی جو صرف سینا کی چوٹیوں یا ہمالیہ کی گھاٹیوں میں بسا ہے، بلکہ اس رب العالمین کی طرف بلایا جو پورے نظام ہستی کا پروردگار ہے اور اس لیے تمام کائنات عالم کو اپنی طرف بلا رہا ہے۔ ہم کو دنیا میں سکندر ملتا ہے جس نے تمام عالم کو فتح کرنا چاہا تھا لیکن ہم دنیا کی پوری تاریخ میں خدا کے کسی رسول کو نہیں پاتے جس نے تمام عالم کی ضلالتوں اور تاریکیوں کے خلاف اعلان جہاد کیا ہو۔

جہانوں کے لیے رحمت

اس کا صرف ایک ہی اعلان ہے جو آغاز خلقت سے اب تک کیا گیا ہے اور اس لیے اگر دنیا نسلوں، قوموں اور ربوں کا نام نہیں بلکہ مخلوقات الہی کی اس پوری نسل کا نام ہے جو کرہ ارض کی پیٹھ پر بستی ہے تو وہ مجبور ہے کہ ہر طرف سے مایوسی کی نظریں ہٹا کر صرف اس ایک ہی اعلان عام کے آگے جھک جائے اور صرف اسی کی پیدائش کے دن کو اپنی عمر کا سب سے بڑا دن یقین کرے:

تَبٰرَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهِ لِيُكَفِّرَ عَنْكَ لَظْمَتَيْنِ ذٰلِيْكَ (فرقان: ۱)

”کیا ہی پاک اور برکتوں کا سرچشمہ ہے ذات اس کی جس نے اپنے برگزیدہ بندے پر الفرقان نازل کیا تاکہ وہ قوموں اور ملکوں ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام عالموں کی ضلالت کے لیے ڈرانے والا ہو۔“
دنیا میں جس قدر داعیان حق و صداقت کے اعلانات موجود ہیں۔ اگر دنیا ان کو بھلا دے گی تو یہ صرف قوموں اور ملکوں کی سعادت کی فراموشی ہوگی کیونکہ اس سے زیادہ انہوں نے کچھ نہ کہا لیکن اگر ریح الاول کو اس نے بھلا دیا تو یہ تمام کرہ ارض کی نجات کو بھلا دینا ہوگا کیونکہ ریح الاول کی رحمت کسی ایک سر زمین کے لیے نہیں بلکہ تمام عالمین کے لیے تھی (یہاں تک جو کچھ حوالہ قلم ہوا، یہ محض ایک تمہید تھی اور اسلام کی رحمت عامہ کا ایک سرسری مطالعہ، لیکن اس کے بعد اصل سوال ہمارے سامنے آتا ہے یعنی اس پیدائش نے دنیا کی حقیقی اور عالمگیر مصیبت کے لئے کیا کیا؟ اور انسانیت کی سعادت و ارتقاءے فطری کی کیونکر تکمیل کی؟ اس محبت عظیم کا احاطہ و استقصاء تو ممکن نہیں لیکن چند سرسری اشارات آنے والی مجلس میں ملیں گے۔

ربّ العلّیین اور رحمة للعلّیین

آفتاب توحید و ہدایت

قرآن حکیم نے توحید الہی کے داعی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو ”سراج منیر“ سے ملقب کیا اور ان کے خصائص کریمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿٢٥١﴾ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِآذَنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا ﴿٢٥٢﴾

(احزاب: ۲۵، ۲۶)

”اے پیغمبر! بے شک ہم نے تم کو شہادت دینے والا، بشارت پہنچانے والا، ضلالت و خباثت سے خوف دلانے والا۔ راہ الہی کی طرف داعی اور ایک نورانی مشعل بنا کر بھیجا ہے۔“

لیکن ایک دوسرے موقع پر آفتاب کو بھی ”سراج“ کے لقب سے یاد کیا ہے:

وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُجُودًا وَجَعَلَ الشَّمْسُ سِرَاجًا ﴿١٦﴾ (نوح: ۱۶)

”اور آسمان میں خدا نے چاند کو بھی بنایا، جو ایک نور ہے اور سورج کو بھی بنایا کہ وہ ایک روشن مشعل ہے۔“

اس مماثلت اور اشتراک تشبیہ سے مقصود یہ تھا کہ اسلام کی دعوت بھی اس آفتاب مادی کی طرح ایک آفتاب روحانی ہے۔ آفتاب جب نکلتا ہے تو اس کی روشنی اور حرارت میں کوئی تمیز نزدیک و دور، اعلیٰ و ادنیٰ، سیاہ و سفید، باغ و دشت کی نہیں ہوتی۔ اس کی روشنی بلا تمیز مکان و مقام ہر شے پر چمکتی اور ہر حرارت پذیر وجود کو گرم کرتی ہے۔ بعینہ یہی حال اس آفتاب دعوت الہی اور نیر درخشان سائے رسالت کے عموم فیضان بخشی کا تھا، جو گو سیر سے چلا، مگر فاران کی چوٹیوں پر نمودار ہوا جس کی کرنوں میں دہنی جانب شریعت الہی کی ”نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ“ (نمہ: ۱۵) تھی مگر بائیں جانب قیام عدل و میزان کی شمشیر آبدار چمک رہی تھی جس کا طلوع کائنات میں ظلمت کی شکست اور روشنی کی دائمی فیروزمندی تھا کیونکہ آسمان ہدایت پر شریعت الہی کے گو سینکڑوں ستارے نمودار ہوئے تھے لیکن تاریکی کی آخری شکست کے لیے دنیا کو آفتاب ہی کے طلوع کا انتظار ہوتا ہے:

وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ ﴿٢٥٠﴾ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ ﴿٢٥١﴾ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ﴿٢٥٢﴾ (الزلزال: ۱-۳)
”رات کی قسم، جبکہ اس کی تاریکی کائنات کی تمام اشیاء کو چھپا دیتی ہے اور روز روشن کی قسم، جبکہ آفتاب کی تجلی تمام کائنات کو روشن کر دیتی ہے اور دراصل اس خالق کی قسم، جس نے تخلیق عالم کے لیے نر اور مادہ کا وسیلہ پیدا کیا۔“

عالمگیر اخوت و اتحاد

اس آفتاب توحید نے طلوع ہوتے ہی تفریق و انشقاق کی تمام تاریکیوں کو مٹا دیا۔ اس کی روشنی کی فیضان بخشی میں اسود و ابیض اور عرب و عجم کی کوئی تمیز نہ تھی۔ خدا کی ربوبیت کی طرح اس کی رحمت بھی عام تھی۔ وہ ”ربّ العلّیین“ تھا، پس ضرور تھا کہ اس کی راہ کی طرف دعوت دینے والا بھی ”رحمتہ للعلّیین“ ہو:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (الانبياء: ۱۰۷)

”اے پیغمبر! ہم نے آپ کو نہیں بھیجا، مگر تمام عالموں کے لیے رحمت قرار دے کر۔“

انسان کی یہ سب سے بڑی ضلالت اور خدا فراموشی تھی، کہ اس نے رشتہ خلقت کی وحدت کو بھلا کر زمین کے ٹکڑوں اور خاندان کی تفریقوں پر انسانی رشتے قائم کر لیے تھے۔ خدا کی زمین کو جو محبت اور باہمی اتحاد کے لیے تھی، قوموں کے باہمی اختلافات و نزاعات کا گھر بنا دیا تھا، لیکن اسلام دنیا میں پہلی آواز ہے، جس نے انسان کی بنائی ہوئی تفریقات پر نہیں، بلکہ الہی تعبد کی وحدت پر ایک عالمگیر اخوت و اتحاد کی دعوت دی اور کہا کہ:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْثَرَكُمْ

عِنْدَ اللَّهِ أَتَفْكَمُ (حجرات: ۱۳)

”اے لوگو! ہم دنیا میں تمہاری خلقت کا وسیلہ مرد اور عورت کا اتحاد رکھا اور نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا اس لیے کہ باہم پہچانے جاؤ، ورنہ دراصل یہ تفریق و انشعاب کوئی ذریعہ امتیاز نہیں۔ امتیاز و شرف اسی کے لیے ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ متقی ہے۔“

صرف ایک رشتہ

پس درحقیقت اسلام کے نزدیک وطن و مقام اور رنگ و زبان کی تفریق کوئی چیز نہیں۔ رنگ اور زبان کی تفریق کو وہ ایک الہی نشان ضرور تسلیم کرتا ہے ”وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقَ السَّمَكِ وَالْأَفْزَاقِ وَالاخْتِلَافِ أَلْسِنَتِكُمْ وَالْأَلْوَانِكُمْ“ (الروم: ۲۲) لیکن اس کو وہ کسی انسانی تفریق و تقسیم کی حد نہیں قرار دیتا۔ انسان کے تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں، اصلی رشتہ

صرف ایک ہے وہی ہے جو انسان کو اس کے خالق اور پروردگار سے متصل کرتا ہے۔ وہ ایک ہے پس اس کے ماننے والوں کو بھی ایک ہی ہونا چاہئے۔ اگرچہ سمندروں کے طوفانوں، پہاڑوں کی مرتفع چوٹیوں، زمین کے دُور دراز گوشوں اور جنس و نسل کی تفریقوں نے ان کو باہم ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہو:

وَإِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ ﴿٥٢﴾ (مومنون: ۵۲)

”بیشک تمہاری جماعت ایک ہی امت ہے اور ہم ایک ہی تمہارے پروردگار ہیں۔ پس (انکار و بد عملی کے نتائج سے) ڈرو“

مقام محمود

آیت ۷۹ (بنی اسرائیل ۹) میں مقام محمود سے مراد ایسا درجہ ہے جس کی عام طور پر ستائش کی جائے فرمایا: کچھ بعید نہیں کہ تمہارا پروردگار تمہیں ایسے مقام پر پہنچا دے جو عالمگیر اور دائمی ستائش کا مقام ہو۔

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب پیغمبر اسلام کی ملی زندگی کے آخری سال گزر رہے تھے۔ مظلومیت اور بے سروسامانی اپنے انتہائی درجوں تک پہنچ چکی تھی، حتیٰ کہ مخالفین قتل کی تدبیروں میں سرگرم تھے۔ ایسی حالت میں کون امید کر سکتا تھا کہ ابھی مظلومیوں سے فتح و کامرانی پیدا ہو سکتی ہے؟ لیکن وحی الہی نے صرف فتح و کامرانی ہی کی بشارت نہیں دی، کیونکہ فتح و کامرانی کی عظمت کوئی غیر معمولی عظمت نہ تھی بلکہ ایک ایسے مقام تک پہنچنے کی خبر دی جو نوع انسانی کے لیے عظمت و ارتقاء کی سب سے آخری بلندی ہے۔ یعنی عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّخْنُودًا ﴿٥٩﴾ حسن و کمال کا ایسا مقام جہاں پہنچ کر محمودیت خلاق کی عالمگیر اور دائمی مرکزیت حاصل ہو جائے گی۔ کوئی عہد ہو، کوئی ملک ہو، کوئی نسل ہو لیکن کروڑوں دلوں میں اس کی ستائش ہوگی۔ ان گنت زبانوں پر اس کی مدحت طرازی ہوگی۔ محمود یعنی سر تا سر ممدوح ہستی ہو جائے گی۔ (بنی اسرائیل: ۷۹)

ما شئت قل فيه، فانت مصدق
فالحب يقضى والمحاسن تشهد!

﴿٥٩﴾ وَمِنْ آيَاتِهِ فَتَنَّا بِهِ نَأْفِلُكَ لَكَ عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّخْنُودًا ﴿٥٩﴾ (بنی اسرائیل: ۷۹)

”(اے پیغمبر) رات کا کچھ حصہ یعنی پچھلا پرشب بیداری میں بسر کر، یہ تیرے لیے ایک مزید عمل ہے قریب ہے، اللہ تجھے ایسے مقام میں پہنچا دے جو نہایت پسندیدہ مقام ہو۔“

انسانی عظمت کی انتہا

یہ مقام، انسانی عظمت کی انتہا ہے۔ اس سے زیادہ اونچی جگہ اولادِ آدم کو نہیں مل سکتی۔ اس سے بڑھ کر انسانی رفعت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ انسان کی سعی و ہمت ہر طرح کی بلند یوں تک اڑ جاسکتی ہے لیکن یہ بات نہیں پاسکتی کہ روحوں کی ستائش دلوں کی مداحی کا مرکز بن جائے۔ سکندر کی ساری فتوحات خود اس کے عہد و ملک کی ستائش اسے نہ دلا سکیں اور نپولین کی ساری جہاں ستائیاں اتنا بھی نہ کر سکیں کہ کورسیکا کے چند غدار باشندوں ہی میں اسے محمود و ممدوح بناتیں، جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ محمودیت اسی کو حاصل ہو سکتی ہے جس میں حسن و کمال ہو، کیونکہ روحیں حسن ہی سے عشق کر سکتی ہیں اور زبانیں کمال ہی کی ستائش میں کھل سکتی ہیں، لیکن حسن و کمال کی مملکت، وہ مملکت نہیں جسے شہنشاہوں اور فاتحوں کی تلواریں مسخر کر سکیں۔

زبانوں کی ستائش اور روحوں کا احترام

غور کرو، جس وقت سے نوع انسانی کی تاریخ معلوم ہے، نوع انسانی کے دلوں کا احترام اور زبانوں کی ستائش کن انسانوں کے حصے میں آئی ہیں؟ شہنشاہوں اور فاتحوں کے حصے میں یا خدا کے ان رسولوں کے حصے میں جنہوں نے جسم و ملک کو نہیں روح و دل کو فتح کیا تھا؟ یہی مقام محمود ہے جس کی خبر ہمیں ایک دوسری آیت میں دی گئی ہے اور خبر کے ساتھ امر بھی ہے۔

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿٥٩﴾ (احزاب: ۵۹)

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام کا ایک مشہور وہ معاملہ ہوگا، جو قیامت کے دن پیش آئے گا، جبکہ اللہ کی حمد و ثناء کا علم آپ بلند کریں گے اور بلاشبہ محمودیت کا مقام دنیا و آخرت دونوں کے لیے ہے۔ جو ہستی یہاں محمود خلاق ہے، وہاں بھی محمود و ممدوح ہوگی۔

جامعیت افضلیت رسول اکرم ﷺ

ان آیات کریمہ ۵۰ سے فضیلت و سیادت حضرت ختم المرسلین کا یوں اثبات ہوا کہ امت

۵۰ اللہ اور اس کے فرشتے پیغمبر (علیہ السلام) پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔ اے لوگو جو ایمان لائے تم بھی اس پر صلوٰۃ بھیجو اور سلام، اچھا سلام۔

۵۱ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ اور اَلْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّبَعْتُ عَلَيْكُمْ نَبِيًّا قَلِيلًا اِذَا جُنْتُمْ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجَعَلْنَاكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ

مسلمہ کو ساری امتوں سے بہتر فرمایا اور شریعت محمدیہ کو تکمیل ادیان اور اتمام نعمت قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ مطیع کی افضلیت مستلزم افضلیت مطاع اور نعمت کا اتمام نعم سابقہ سے اعلیٰ و دائم ہونا، حامل و مبلغ نعمت کے اعلیٰ و افضل ہونے پر دلیل ہے۔ اگر آخری شریعت تمام پچھلی شریعتوں کی جامع اور اس لیے ان سب سے افضل ہے، اگر آخری امت ساری پچھلی امتوں کے برکات و نعم سے مالا مال اور اس لیے ان سب سے افضل و اصل ہے اور اگر اس طرح شریعت آخری کے ظہور و زمان و مکان و قوام و اعمال کی ساری باتیں پچھلی امتوں کی ان ساری باتوں پر فوقیت و فضیلت رکھتی ہیں تو یہ بغیر اس کے ممکن نہیں کہ امت آخری کا رسول و مقوم بھی سارے پچھلے رسولوں کے مراتب و مقامات کا جامع اور اس لیے ان سب سے افضل و مافوق اور ”آنچہ خواباں ہمہ دارند تو تہاداری“ کا مصداق ہو۔ کتاب و سنت کے نصوص و تفریحات اس بارے میں بے شمار ہیں۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَتَلَدْنَا بَعْضَهُمْ (البقرہ- ۲۵۳) کی تفسیر میں اس مطلب کو کمال شرح و بسط اور شاید ایک طرز تازہ و استدلال جدید کے ساتھ لکھا جا چکا ہے اور حقیقت جامعیت رسالت محمدی و جامعیت شریعت اسلامیہ و جامعیت امت مسلمہ اور جامعیت جمیع مایعقل بہا پر ایک خاص اسلوب نظر سے بحث کی گئی ہے^۱ باقی رہا ”لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ“ (البقرہ- ۲۸۵) تو وہ معاملہ دوسرا ہے ”تفریق بین الرسل“ کو مسئلہ تفضیل سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح ”لَا تَفْضُلْ عَلَى يُونُسَ بَنِ مَتَّى وَغَيْرِ ذَلِكَ“ تو اسی نبی کا مورد و محل بھی دوسرا ہے اور مہنی عنہ معاملہ تفضیل میں وہ تکلم یا رائے ہے۔ منجربہ تفریق بین الرسل جس نے تمام اہم سابقہ کو گمراہ کیا، نہ کہ نفس تفضیل۔ کیونکہ ”اناسید ولد آدم و لافض“ اور ”آدم ما دون تحت لوائی“ کے بعد اور کیا باقی رہ گیا؟ پھر قطع نظر قرآن حکیم کے، خود نصوص سنت اس بارے میں بے شمار و معلوم ہیں۔

رب زدنی علما

آیت ۱۱۳^ط میں فرمایا: جب تک سلسلہ وحی پورا نہ ہو جائے، اس بارے میں جلدی نہ کر اور منتظر رہ کہ فیضان غیب کی بخششیں کہاں تک مالا مال کرتی ہیں۔ تیری زبان حال کی صدا تو یہ ہونی چاہیے کہ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا! یعنی میری تفکھی کی سیرابی کے لیے علم کے یہ سارے دریا اور عرفان حقیقت کی یہ ساری بارشیں بھی کافی نہیں۔ اے علم کی لا انتہائی اور حقیقت کی ناپید کناری! اپنی

^۱ مطلب ہے تفسیر ”البیان“ میں۔

^۲ فَتَلَدْنَا اللَّهُ الْبَلَدَ الْاَعْلَىٰ وَلَا تَعْلَنَ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ ۚ وَكُلَّ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا ﴿۱۱۳﴾
”پس ہر طرح کی بلندی اللہ ہی کے لیے ہے اور وہی جہاندار حقیقی ہے اور جب تک قرآن کی وحی تجھ پر پوری نہ ہو جائے تو اس میں جلدی نہ کر۔ تیری پکار یہی ہو کہ پروردگار! میرا علم اور زیادہ کر۔“

بخششیں اور زیادہ کر۔

اس آیت نے واضح کر دیا کہ پیغمبر اسلام کے مقام علم و عرفان کی وسعت و عظمت کا کیا حال تھا؟ وہ کسی حد پر بھی رکنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے لیے کوئی زیادتی بھی زیادتی نہ تھی۔ اس کے لیے ہر اضافہ نئے استفاضہ کا اشارہ تھا۔ اس کے لیے ہر عطیہ نئے عطیہ کا تقاضا تھا۔ وہ میسر طلب تھی۔ پھر رب زدنی کا سوال تھی۔ یہ معلوم ہے کہ یہاں مطلوب کی وسعت کے لیے کوئی انتہا نہیں ہو سکتی، لیکن یہ کیونکر معلوم کیا جائے کہ طالب کی طلب کہاں جا کر منتہی ہوئی تھی۔

کائنات انسانیت پر احسان عظیم

حضرت رحمۃ اللعالمین ﷺ نے کائنات انسانیت پر جو لا تعدد لا تحصى احسان کیے، ان کا استقصاء کون کر سکتا ہے۔ ان میں سے ایک احسان یہ بھی ہے کہ ہر قسم کے تعبد و غلامی اور ذلت و تحقیر کی زنجیروں کاٹ ڈالیں اور سب کے لیے استقلال و حریت ذات و رائے، شرف و احترام نفس اور مساوات صحیح کی بنیادیں استوار کر دیں۔

دنیا استبداد و استعباد کے عذاب الیم میں مبتلا تھی۔ غلامی کی زنجیروں نے اس کا بند بند جکڑ رکھا تھا۔ فرمانروایان ملک، امرائے شہر، روسائے قبائل اپنے اپنے حلقہ فرمانروائی میں ”اَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ“ (آل عمران: ۶۴) تھے اور ان کے اطاعت گزار اور پیروان کے ہاتھ بالکل مثل معدوم الا رادہ آلات عمل کے تھے، جن کی زندگی کا موضوع واحد صرف اپنے قادر قابض کی تکمیل ہو اسے نفس و اتباع مرضات کیا؟

مسیح علیہ السلام سے سترہ سو برس پہلے ذات شہانی ہر تقدیس سے متصف، ہر احترام فوق العادہ سے مقدس اور ہر نقص و عیب سے مبرا تھی۔ خدا کا سایا کم از کم مرتبہ انسانیت سے ایک بالاتر شے ضرور تھی۔ فراعنہ مصر دیوتا تھے۔ اسی لیے مصر کے فرعون نے مسیح علیہ السلام سے سترہ سو برس پہلے اپنے درباریوں سے کہا تھا ”اَنَا رَبُّكُمْ الْاَعْلَىٰ“ (الانعام- ۲۴) یعنی مولیٰ کا خدا کون ہے؟ تمہارا بڑا خدا تو میں ہوں۔ کلدانیوں کے ملک میں نمرود بابل کی پرستش کے لیے ہیکل بنتے تھے۔ ہندوستان کے راجا دیوتاؤں کے اوتار بن کر زمین پر اترتے تھے۔ رومہ کا پوپ ”خدا کے فرزند“ کا جانشین اور اس کا آستانہ مقدس سجدہ گاہ ملوک و سلاطین تھا۔

روم کے قیصر اور فارس کے کسری گود پوتا نہ تھے لیکن فطرت بشریت سے منزہ اور مرتبہ انسانیت سے بالاتر تھے، جن کے سامنے بیٹھنا ممنوع، جن کے نام لینا سوء ادب، جن کے سامنے ابتدائے کلام گناہ اور جن کے سامنے ادنیٰ سا اعتراض بھی موجب قتل تھا۔

دنیا سی تعبد و غلامی اور ذلت و تحقیر میں اسیر تھی کہ بحر احمر کے سوا حل پر ریگستانی سرزمین

میں ایک ”عربی بادشاہ“ کا ظہور ہوا، جس نے معجزانہ زور و توانائی سے قیصر و کسریٰ کے تحت اُلٹ دیے۔ بابائے رومۃ الکبریٰ کے ایوان مقدس کی بنیادیں ہلا دیں۔ تعبد و غلامی کی زنجیریں اس کی شمشیر غیر آہنی کی ایک ضرب سے کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں۔ استقلال ذات و فکر، حریت خیال و رائے، شرف و احترام نفس، مساوات حقوق، ابطال شہنشاہی کی روشنی دنیائے قدیم کے قلب سے نکل کر دنیا بھر میں پھیل گئی۔ شاہان عالم مرتبہ قدوسیت و معصومیت سے گر کر عام سطح انسانی پر آگئے اور عام انسان سطح غلامی و حیوانیت سے بلند ہو کر مصر و بابل کے دیوتاؤں اور روم و ایران کے قیصر و کسریٰ کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہو گئے۔

دین رحمت

اسلام دین رحمت ہے۔ اس دین کی کوئی بھی مشق ایسی نہیں، جو عالم انسانیت کے لیے بلا لحاظ نسل و خون، بلا امتیاز رنگ و نسب اور بلا قید مقام و محل یکساں پیام رحمت نہ ہو۔ سب سے پہلے اصولی اعتبار سے غور کیجیے۔ دنیا میں ہر نیک و بد کے لیے مہلت حیات اور فیضان معیشت کا انتظام موجود ہے، البتہ اس نظام سے استفادہ ہر فرد کی ہمت، صلاحیت اور جدوجہد پر موقوف ہے۔ کیونکہ:

زندگی جہد است واستحقاق نیست

قدرت نے گوناگوں نعمتوں کے لامتناہی خزانے جا بجا مہیا کر رکھے ہیں۔ اچھے بُرے تمام انسان ان سے فائدہ اٹھانے کے مجاز ہیں۔ جزائے اعمال آخرت پر اٹھار کھی گئی ہے۔ یہ اسی حقیقت کا نتیجہ ہے کہ یہاں رحمت کی کار فرمائی ہے:

رحمت کا تقاضا یہی تھا کہ اس کے فیضان و بخشش میں کسی طرح کا امتیاز نہ ہو اور مہلت حیات پوری طرح سب کو ملے۔ اس نے انسانوں کی انفرادی زندگی کے دو حصے کر دیے۔ ایک حصہ دنیوی زندگی کا ہے اور سراسر مہلت ہے۔ دوسرا حصہ مرنے کے بعد کا ہے اور جزا کا معاملہ اسی سے تعلق رکھتا ہے۔

قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ لَوْ يُؤْخَذُ مِنْهُمْ يَتَأَسَّرُونَ لَكُنْهُمْ مَوْعِدًا لَّنْ يَجْعَدُوا مِنْ دُونِهِ مَوْثِقًا ۝ (کہف: ۵۸)

”تیرا پروردگار بڑا بخشنش گراور رحمت والا ہے۔ اگر وہ لوگوں کو ان کے عمل کی کمائی پر پکڑتا تو فوراً عذاب نازل کر دیتا۔ لیکن ان کے لیے ایک میعاد ٹھہرا دی گئی ہے۔ جب وہ نمودار ہوگی تو اس سے بچنے کے لیے کوئی پناہ گاہ انہیں نہ مل سکے گی۔“

مہلت بجائے خود رحمت ہی کی دستاویز ہے تاکہ نیک زیادہ سے زیادہ نیکیاں کمائیں اور

برائیوں میں ڈوبے ہوئے لوگوں کو اعمال بد سے توبہ کی مہلت حاصل رہے۔ عمل بد کا ارتکاب ہوتے ہی عذاب نازل ہو جاتا تو مہلت کہاں رہتی؟ یاد رکھیے کہ اصلاح و درستی کا طریقہ یہی ہے اور اصل نصب العین اصلاح و درستی ہی ہے نہ کہ عذاب۔ عذاب تو ان کے لیے ہو سکتا ہے جو سمجھانے بھاننے، آگاہ کرنے اور مہلت دینے کے باوجود فائدہ نہ اٹھائیں اور اپنے غلط مسلک پر قائم و استوار رہیں۔

جرموں اور گناہوں کی نوعیت یا کیفیت و کیفیت کیسی ہی ہو، جب توبہ و انابت کے احساس میں جنبش نمودار ہوتی ہے اور غفلت و بے حسی کا خواب سنگین ٹوٹتا ہے تو رحمت قبولیت کا دروازہ کھول دیتی ہے اور توبہ کرنے والے کے نامہ اعمال کی سیاہی اس طرح ڈھل جاتی ہے۔ گویا اس سے کبھی کوئی گناہ سرزد ہی نہیں ہوا تھا یہ بھی سراسر رحمت ہی کی کار فرمائی کا ثبوت ہے۔

قرآن مجید ہر بندے کو رحمت کی بشارت پہنچا رہا ہے خواہ اس کے اعمال کتنے ہی برے اور مکروہ کیوں نہ ہوں:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۚ
اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۚ (زمر: ۵۳)

”اے میرے بندو! (جنہوں نے برائیوں کے ارتکاب سے) اپنی جانوں پر زیادتی کی۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو یقیناً اللہ تمہارے تمام گناہ بخش دے گا۔“

اسلام کے ضوابط

اسلامی ضوابط کی غرض و غایت یہی ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی ہر قسم کے اختلال سے محفوظ رہے اور معاشرے میں فتنہ و فساد پیدا نہ ہونے پائے، جو اجتماعی زندگی کے نظام کو درہم برہم کر ڈالتا ہے۔ ویسے ہر مجموعہ و ضوابط کی حقیقی حیثیت کا اندازہ کرنے کے لیے دو باتیں بطور خاص پیش نظر رہنی چاہیے:

۱۔ آیا اجتماعی زندگی کے لیے قوانین بنانے کے سلسلے میں جائز انفرادی انسانی حقوق کا پورا لحاظ رکھا گیا؟ ایسا نہ ہو تو جائز انفرادی حقوق اور اجتماعی قوانین میں تصادم کی نوبت آتی رہے گی اور ان حالات میں کوئی معاشرہ اختلافات سے، زیادہ عرصے تک محفوظ نہ رہ سکے گا۔

۲۔ اجتماعی قوانین کی غرض و غایت کیا ہے؟ کیا یہ ہے کہ افراد کے درمیان باہم محبت، رحمت اور رافت کو فروغ حاصل ہو؟ جس سے اجتماعی زندگی کی بنیادیں زیادہ سے زیادہ مستحکم ہو جائیں گی۔ افراد اجتماعی نظام کے عقیل، فہیم، عاقبت اندیش اور حق شناس کارکن بنے رہیں گے، ان میں ایک دوسرے کے حقوق کی حدود کا اندازہ کر لینے کی تمیز زیادہ قوی ہوتی جائے گی اور ایک دوسرے کا زیادہ سے زیادہ لحاظ ان کی فطرت ثانیہ بن جائے گا۔

اسلام ایسے ہی معاشرے پیدا کر دینا چاہتا تھا، اس کے مجموعہ ضوابط (جن میں اخلاقی تلقینات بھی شامل ہیں) کا اصل مقصد یہی تھا کہ انسانوں میں ذمہ داری کے احساس کو زیادہ سے زیادہ ترقی دی جائے، جس کے بعد کسی احتسابی نظام کی ضرورت بھی محض برائے نام رہ جائے۔ ابتدائی دور کی مربیانہ سیاست میں اس مقصد کی تکمیل یقیناً بہت قریب نظر آنے لگی تھی۔ لیکن حالات نے یکایک پلٹا کھلایا اور مربیانہ سیاست کی جگہ ملوکى نظام نے لے لی۔ پھر جو صورت حال پیش آئی اس کا موقع صدیوں سے ہر حساس فرد کے لیے دل کا نغور ہے۔ سب سے بڑھ کر اندوہ و قلق کی بات یہ ہے کہ بیشتر نعرے اسلام کے لگائے جاتے ہیں اور پیش نظر وہی پیمانے ہوتے ہیں، جو دور ملوکیت میں فروغ پذیر ہوئے۔

باہم سلوک کی مثالیں

۱۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

تَرَى الْمَوْتِينَ تَرَاحِبُهُمْ وَتَوَادُّهُمْ وَتَعَاطِفُهُمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ إِذَا شَتَّىكَ عُضْوُهُ تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ جَسَدِهِ بِالسَّهْرِ وَالْحُمَّى^①

”تو مومنوں کو باہم رحم، محبت اور مہربانی میں ایک جسم کے اعضا کی طرح دیکھے گا۔ جب ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے پورا جسم بے خوابی اور بخار کی دعوت بن جاتا ہے۔“

آپ ﷺ نے دل سے سوچیں کہ آیا آپس میں اس رحم، اس محبت اور اس مہربانی کی عملی مثالیں آپ کو کسی طرف نظر آتی ہیں؟ اللہ تعالیٰ، یا ہمارے گرد و پیش ایسا کوئی نظارہ روح و قلب کے لیے سرور شادمانی کی بشارت بن سکتا ہے؟

۲۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

وَاللّٰهُ لَا يُؤْمِنُ وَاللّٰهُ لَا يُؤْمِنُ وَاللّٰهُ لَا يُؤْمِنُ قِيلَ وَمَنْ يَأْرُسُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِي لَا يُؤْمِنُ جَارُهُ بِوَأَقْنَهُ^②

”اللہ کی قسم وہ ایمان نہیں لاتا، اللہ کی قسم وہ ایمان نہیں لاتا، اللہ کی قسم وہ ایمان نہیں لاتا، کسی نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ کون؟ فرمایا جس کا ہمسایہ اس کی بدیوں سے امن میں نہ ہو۔“

غور کریں کہ اگر ہر ہمسایہ حضور ﷺ کے اس ارشاد پر عمل پیرا ہو جائے۔ ہر لحظہ خیال رکھے کہ اس کی کسی حرکت سے ہمسایہ کو تکلیف نہ پہنچے تو پوری آبادیاں نہ محض ہر قسم کے شر سے پاک ہو جائیں بلکہ تمام باشندوں میں ایک دوسرے کے متعلق انتہائی محبت و احترام کے جذبات پیدا ہو جائیں حالانکہ یہ بظاہر ایک جزوی ارشاد ہے تاہم اس کی عملی صورت پر غور کریں تو اس کی

① صحیح بخاری، کتاب الادب باب رحمۃ الناس والہائم۔

② صحیح بخاری، کتاب الادب باب اثم من لا یؤمن جارہ۔

وسعت اور اثر خیر کا اندازہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔

یہ اسلام تھا جو دنیا کے لیے رحمت و رافت اور برکات و سعادت کی بشارت لے کر آیا تھا۔ کیا اس سے کسی کے لیے داعی اسلام ﷺ کی ”رحمۃ اللعالمین“ کا اندازہ کر لینا مشکل ہے؟

اشرف المخلوق کے واجبات

انسان کو اشرف المخلوق قرار دیا جاتا ہے۔ کیا اس لیے کہ اس پر فخر و مباہات کی سرشاری میں واجبات کو نظر انداز کر دیا جائے؟ انسان نیک و بد کی تمیز سے بہرہ مند ہے۔ آگ اور پانی میں فرق کر سکتا ہے۔ پھر کیا اس سے کوئی ایسی حرکت یا کوئی ایسا عمل سرزد ہونا چاہیے، جو انسانیت کے حسن اور شرف کے منافی ہو اور جو اسے ”اسفل سافلین“ میں پہنچا دے؟ یعنی جس سے ہم جنسوں کے طبعی و فطری حقوق پر زرد پڑے، خواہ ان کا تعلق ہم جنسوں کی جانوں سے ہو یا اموال سے یا آبروؤں سے؟ ایسا ہر فعل لازماً اجتماعی امن و راحت کے نظام میں کم یا زیادہ اختلال کا باعث ہو گا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ایسے اختلال انگیز افعال و حرکات سے احتراز حقیقتاً ہر فرد کے لیے ضروری ہے کیونکہ اگر زید کی کوئی حرکت کسی وقت بکر اور اس کے ساتھیوں کو نقصان پہنچائے گی تو دوسرے موقع پر بکر یا اس کے ساتھیوں کی ایسی ہی حرکت خود زید یا اس کے ساتھیوں کے لیے موجب آزار ہوگی۔

اسلام کی برتری یہ ہے کہ اس کے تمام اوامر و نواہی کی بنیاد و اساس معاشرے میں رحمت و محبت جاری و ساری رکھنے کے لیے ہے۔ وہ چاہتا ہے رحمت و محبت کے فروغ و عمومیت میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ تمام افراد معاشرہ کے درمیان اخوت، خلوص، ہمدردی اور یکجہتی کے روابط زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوں، یہ سب رحمت ہی کی کار فرمائی کے عوالم ہیں۔

محبوب معبود

غرض اسلام نے دینی عقائد و اعمال کا جو تصور قائم کیا ہے، اس کی بنیاد بھی تمام تر رحمت اور محبت ہی پر رکھی ہے، قرآن مجید کی مختلف تصریحات کے مطابق خدا اور بندوں کے درمیان بھی رشتہ محبت ہی کا ہے۔

سچی عبودیت ہے اسی کی عبودیت جس کے لیے معبود صرف معبود ہی نہ ہو، بلکہ محبوب بھی ہو۔ اسی لیے فرمایا۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ (بقرہ-۱۶۵)

”اور جو لوگ ایمان والے ہیں، ان کے دلوں میں تو سب سے بڑھ کر چاہت اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے۔“

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۳۱﴾

(آل عمران: ۳۱)

”اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے واقعی محبت رکھتے ہو تو چاہیے کہ میری پیروی کرو۔ (کیونکہ میں تمہیں اللہ سے محبت کی حقیقی راہ دکھا رہا ہوں) اگر تم نے ایسا کیا تو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔ وہ بڑا ہی غفور و رحیم ہے۔“

حب رسول ﷺ

خود رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکت سے محبت بھی اسی لیے دنیا بھر کے انسانوں پر فائز و برتر ہو گئی کہ ان کے ذریعے سے ہمیں خدا کا راستہ ملا۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین^۱

”تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک حقیقی مومن نہیں ہو سکتا، جب تک میں اس کے نزدیک باپ، بیٹے اور پورے عالم انسانیت سے محبوب تر نہ ہو جاؤں۔“

رسول اللہ ﷺ جو نور ہدایت لے کر آئے، اس کے سوا ہدایت کا کوئی وجود نہیں اور انسان کے لیے سب سے پہلی چیز ہدایت حق ہے، اس کے بعد تمام رشتے آتے ہیں اور خود رشتوں کے واجبات نیز ان کی تکمیل و سرانجام کے طریقے ہمیں اسی نور ہدایت سے ملے جو رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے ہماری زندگی میں مشعل راہ بنا۔

خدا سے محبت کی عملی راہ

یہ بھی بتادیا کہ خدائے بزرگ و برتر سے محبت کی عملی راہ خدا کے بندوں کی محبت سے ہو کر گزری ہے۔ جو شخص چاہتا ہے کہ خدا سے محبت کرے، اسے چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی اور حضور ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں خدا کے بندوں سے محبت کرنا سیکھے۔

قرآن مجید اور احادیث میں خدا کے بندوں سے پیار کے لیے جو کچھ موجود ہے اس کا خلاصہ ہر حصہ بجا پیش کیا جا چکا ہے اور اعادہ غیر ضروری ہے۔ اس دنیا میں نگرانی اور دیکھ بھال کے محتاجوں کی کوئی صنف ایسی نہیں، جس کے لیے مختلف صورتوں میں اتفاق کے احکام موجود نہ ہوں۔ عزیزوں اور رشتہ داروں کی اعانت، بیواؤں، مسکینوں اور اسیروں کی امداد، غلاموں کو غلامی سے چھڑانا، مسافروں کی خبر گیری، قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے لوگوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے

^۱ صحیح بخاری کتاب الایمان باب حب الرسول ﷺ۔

کے لیے سہارا دینا غرض کون سی ضرورت ہے، جس کا ذکر قرآن مجید میں نہیں آیا؟ واضح رہے کہ اسیروں سے مراد وہ لوگ نہیں جو جرموں کے ارتکاب کے بعد جیل خانوں میں چلے جاتے ہیں، اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو جنگ میں پکڑے جائیں یا زمانہ ماضی کی طرح اب کوئی ظالم شخص کسی کو گرفتار کر کے اپنا کام لینے لگے۔

جہاں صحیح اسلامی معاشرہ موجود ہو اس کے تمام افراد اپنے واجبات کتاب و سنت کے مطابق پورے کریں، وہاں کوئی ایسا محتاج نظر ہی نہیں آسکتا، جسے کسی کی طرف حسرت بھری نظر سے دیکھنے یا ہاتھ پھیلانے کی ضرورت ہو۔ ارباب استطاعت کا اسلامی جذبہ خیر نیز محتاج کی اسلامی خود داری اور عزت نفس، دونوں اپنی جگہ کار فرما ہوں گے۔ پہلے گروہ کے نزدیک اتفاق اسی طرح واجب ہے، جس طرح خود اس گروہ کے لیے ذاتی ضروریات پورا کرنا واجب ہے۔ محتاج کسی سے نہیں لیتا کہ اس کا ممنون ہو، اللہ نے اس کا حصہ مقرر کر دیا ہے اور وہ اپنا حصہ لیتا ہے۔ یہ اسلام تھا جو رسول اللہ ﷺ دنیا بھر کے انسانوں کے لیے لائے تھے۔

حضور ﷺ کے چند ارشادات

حضور ﷺ کے بعض ارشادات بھی ملاحظہ کر لیجیے، فرمایا:

- ۱۔ خدا کی رحمت انہی بندوں کے لیے ہے جو خدا کے بندوں کے لیے رحمت رکھتے ہیں۔
- ۲۔ زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔
- ۳۔ جو شخص رحم کرے گا، اگرچہ ایک چیز یا ہی کے لیے کیوں نہ ہو، خدا اس پر رحم کرے گا۔
- ۴۔ ”مَنْ لَا يَرْحَمُ لَا يَرْحَمْ“ یعنی جو شخص رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔
- ۵۔ ایک اعرابی نے نماز پڑھتے ہوئے دعا کی کہ اے اللہ مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحم کر اور ہمارے ساتھ اور کسی پر رحم نہ کر، جب وہ نماز ادا کر چکا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ تو نے بہت وسعت والے کا دروازہ تنگ کر دیا۔
- اعرابی نے یہ دعا بڑی نیت سے نہیں کی تھی، اس کے تصورات ہی اس قسم کے تھے، حضور ﷺ نے سمجھا دیا کہ اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے۔ تمام انسانوں کے لیے بھلائی مانگنے سے بھی اس کی رحمت میں کچھ فرق نہیں آتا۔

صفات الہی کا پرتو

انسانیت کی تکمیل یہ ہے کہ صفات الہیہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تشبیہ پیدا کیا جائے یعنی اتنا تشبیہ جتنا انسان کے بس میں ہو۔ ان صفات کا عکس انسان کے آئینہ فکر و عمل میں ٹھیک ٹھیک

اتارنے کے لیے کوئی دقیقہ سستی اٹھانہ رکھنا چاہیے۔ قرآن مجید ہم میں خدا کی رحمت کا تصور پیدا کرنا چاہتا ہے تو صرف اس لیے کہ ہم بھی سراپا رحمت بن جائیں۔ اسی طرح قرآن خدا کی ربوبیت، رافت، شفقت اور احسان، نیز دوسری صفات کا نقشہ کھینچتا ہے تاکہ ہم میں بھی بقدر ہمت واستطاعت انہی صفات کا جلوہ نمودار ہو۔

قرآن ہمیں بار بار سناتا ہے کہ خدا کی بخشش و درگزر کی کوئی انتہا نہیں اور اس طرح ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہم میں بھی اس کے بندوں کے لیے بخشش و درگزر کا غیر محدود جوش پیدا ہو جانا چاہیے! اگر ہم اس کے بندوں کی خطائیں بخش نہیں سکتے تو ہمیں کیا حق ہے کہ اپنی خطاؤں کے لیے اس کی بخششاثیوں کا انتظار کریں؟

یہ آخری فقرہ اس حدیث پر مبنی ہے کہ مَنْ لَاقِيَ حَمًّا لَا يُؤَيِّدُ حَمًّا

احکام و شرائع اور تلقینات

جس حد تک احکام و شرائع کا تعلق ہے، جَزَاؤًا سَيِّئَةً سَيِّئَةً مِّثْلُهَا (شوریٰ: ۴۰) (برائی کا بدلہ دینی ہی برائی) اپنی جگہ قائم ہے کیونکہ تمام انسان حوصلے اور ہمت میں یکساں نہیں ہوتے اور نہ ہر جرم ایسا ہوتا ہے کہ بخشا جائے تو مرتکب پر یا معاشرے کے حالات پر بہر حال اچھا اثر پڑے گا۔ تاہم کتاب الہی کی تلقینات ہر لحظہ پیش نظر رہنی چاہئیں، جو عزیمت کی متقاضی ہیں مثلاً:

۱۔ پھر جس نے درگزر کیا اور معاملے کو بگاڑنے کی جگہ سنوار لیا تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔ (شوریٰ: ۴۰)

۲۔ اور جو کوئی برائی پر صبر کرے اور بخش دے تو یقیناً یہ اولوالعزمی کی بات ہے۔ (شوریٰ: ۴۳)

۳۔ خوشحالی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں اللہ کے لیے خرچ کرنے والے، غصے کو پی جانے والے، ہم جنسوں کے قصور بخش دینے والے اللہ کی محبت انہی محسنین کے لیے ہے۔ (آل عمران: ۱۳۴)

۴۔ اور جن لوگوں نے اللہ کی رضا و خوشنودی کے لیے (تعلی و ناخوشگواری) صابرانہ برداشت کر لی، نماز قائم رکھی، ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے پوشیدہ اور علانیہ (ہمارے بندوں کے لیے) خرچ کرتے رہے اور برائی کا جواب برائی سے نہیں بلکہ نیکی سے دیا تو یقین کرو کہ یہی لوگ ہیں، جن کے لیے آخرت کا بہتر ٹھکانا ہے۔ (رعد: ۲۲)

۵۔ اور اگر تمہیں بدلا چاہیے کہ جتنی اور جیسی برائی تمہارے ساتھ کی گئی، ٹھیک اسی کے مطابق بدلا لو اور اگر تم برداشت کر جاؤ تو صابروں کے لیے برداشت کر لینا ہی بہتر ہے۔ (نمل: ۱۲۶)

اللہ کی بے پایاں رحمت

رسول اللہ ﷺ ہی کی ذات گرامی ہے جس کے ذریعے سے خداے قدوس کی بے پایاں اور لامتناہی رحمت کی بشارت بندگانِ خدا کو ملی۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

رَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ۔ (اعراف: ۱۵۶)

”میری رحمت کا یہ حال ہے کہ ہر شے پر چھائی ہوئی ہے۔“

صحیح بخاری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک موقع پر کچھ قیدی آئے۔ ان میں سے ایک عورت کو بچہ مل گیا، جو اس کا تھا۔ دیکھتے ہی مامتا کی خاص تڑپ کے ساتھ اس سینے سے لگا کر دودھ پلانے لگی۔ بچہ مل جانے کی خوشی اور دودھ پلانے کی پُر سرور تسکین سے وہ بظاہر اس درجہ سرشار ہو گئی کہ گرد و پیش اور ماحول کا بھی کچھ خیال نہ رہا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ کیفیت دیکھ کر فرمایا۔

اترون لهذا طارحة ولد هاني النار قلنا: لا وهي تقدرا ان لا تطرحه۔ فقال: الله راحم بعباده من لهذا بولدها۔

”تمہارا کیا خیال کہ آیا یہ عورت اپنا بچہ آگ میں ڈال دینے کے لیے تیار ہو جائے گی؟ ہم نے عرض کیا کہ جب تک اس کی طاقت و قدرت میں ہے کبھی نہ ڈالے گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ اپنے بندوں کے لیے اس سے زیادہ رحیم ہے جتنی یہ عورت اپنے بچے کے لیے ہے۔“

انسانوں، حیوانوں، پرندوں، چرندوں، درندوں وغیرہ میں سے کسی گروہ کو لے لیجیے، بچے کے لیے ماں کی مامتا سے بڑھ کر پُر خلوص محبت کا نظارہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ حضور ﷺ نے مامتا کا نظارہ دیکھ کر بندوں کے لیے اللہ کی رحمت کا ذکر فرمادیا اور اس محبت کا نقش لوگوں کے قلوب و ارواح پر جمادینے کی صورت اس کے سوا کیا تھی کہ دنیا کی بہترین محبت سے بہ طور مثال کام لیا جائے۔ حقیقت یہ بندوں سے اللہ کی محبت کا صحیح اندازہ پیش کرنے کی دل نشین تر صورت کون سی ہے؟

جزئیات مسائل

اگر آپ بعض امور کے متعلق حضور ﷺ کے ارشادات کی جزئیات سامنے رکھ لیں تو یقین ہے کہ سراپا حیرت زدہ رہ جائیں گے کیونکہ آج تک کائنات انسانیت کا کوئی بڑے سے بڑا عالم، فلسفی یا کوئی اور شخص ایسا استقصا نہیں کر سکا۔ تاہم وہ بیان کر دی جائیں تو آپ کے قلب و روح سے بے اختیار صدا بلند ہوگی، بلاشبہ ان میں سے ہر جزئیہ حق ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ پڑوسیوں کے حقوق کی نشاندہی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

۱۔ اگر پڑوسی بیمار ہو تو اس کی عیادت اور خبر گیری کی جائے۔

۲۔ اگر وہ انتقال کر جائے تو اس کے جنازے کا ساتھ دو یعنی تدفین میں ہاتھ بٹاؤ۔

۳۔ اگر وہ ضرورت مند ہو اور تم میں استطاعت ہو تو اسے قرض دو۔

۴۔ اگر وہ کوئی بر اکام کر بیٹھے تو اس کی پردہ پوشی کرو۔

۵۔ اگر اسے کوئی نعمت یا مال ملے تو مبارک باد دو (جس سے دلی مسرت کا اظہار مقصود ہوتا ہے)۔

۶۔ اگر اس پر کوئی مصیبت آپڑے تو اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرو۔

۷۔ اپنے گھر کی عمارت اس طرح بلند نہ کرو کہ پڑوسی کے گھر کی ہوا رک جائے۔

۸۔ جب تمہارے گھر میں کوئی اچھا کھانا پکے تو کوشش کرو کہ تمہاری ہنڈیا کی مہک پڑوسی (اور

اس کے بال بچوں تک) نہ پہنچے۔ یہ ان کے لیے باعث ایذا ہوگی یا اپنے اوپر لازم کر لو کہ اس

کھانے کا کچھ حصہ پڑوسی کے گھر بھی بھیج دو۔

پھر پڑوسیوں کی قسمیں بتائیں یعنی:

۱۔ غیر مسلم جس کے ساتھ رشتہ داری بھی نہیں نچلے درجے کا پڑوسی ہے یعنی اس کے بھی حقوق ہیں، مگر دوسروں سے کم۔

۲۔ مسلم پڑوسی جس کے ساتھ رشتہ داری نہ ہو، اس کا درجہ پہلے کے مقابلے میں بلند تر ہے۔

۳۔ رشتہ دار مسلم پڑوسی یعنی پڑوسی بھی، مسلم بھی اور رشتہ دار بھی، یہ سب سے اونچے درجے پر

فائز ہے۔ آپ کو ان جزئیات کی کوئی مثال کسی دوسری جگہ مل سکے تو مہربانی فرما کر پیش

کر دیجیے۔ اور یہ صرف ایک مسئلے کے متعلق ہے۔ ہر مسئلے میں آپکو ایسی ہی جزئیات ملیں گی

جو سامنے آجائیں تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ بھی واقعی جزئیات ہیں، ورنہ کسی کی نظر ان

گہرائیوں پر جا ہی نہیں سکتی۔

بنیادی امر

یہ پاک دین تھا، جس کی دعوت کے لیے رسول اکرم ﷺ مبعوث ہوئے۔ اسلام کا خدا

روف و رحیم، اسلام کا رسول ﷺ روف و رحیم، اسلام کے پیروں کو زیادہ سے زیادہ رحمت و

محبت، شفقت اور عفو و درگزر کی تعلیم دی گئی تھی۔ عالم انسانیت کی اصلاح و درستی کا کاراہم اسی طرح

بوجہ احسن پورا ہو سکتا تھا۔ بلاشبہ بدلے کی گنجائش رکھی گئی۔ کیونکہ تمام انسان عزم الامور کی ترازو

میں پورے نہیں اتر سکتے، لیکن ترجیح عزم الامور ہی کو حاصل ہے اور مقاصد اصلاح و درستی کو جلد

سے جلد پایہ تکمیل پر پہنچانا بھی عزم الامور ہی کے ذریعے سے ممکن ہے۔ اصلاح کے سلسلے میں

بنیادی امر یہ ہے کہ جن کی اصلاح مقصود ہو، انہیں سب سے پہلے یہ یقین ہو جائے کہ ان کے ساتھ

داعی اصلاح کو دلی ہمدردی ہے۔ یہ یقین داعی کے بلند طرز عمل ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ جیسے جیسے

دائرہ اصلاح پھیلتا جائے گا قتنہ و فساد کا ازالہ ہوتا جائے گا۔ نئے نئے داعی بروئے کار آئیں گے۔ اس

طرح رحمت خداوندی سے کیا بعید ہے کہ کروڑوں انسان تھوڑے ہی عرصے میں راہ حق پر لگ

جائیں۔ ”يَذْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا“ (النصر-۲) کا ایک منظر وہ تھا جس نے رسول ﷺ کی ذات

بابرکات کے معبود ہونے کی ضرورت پوری کر دی۔ ”يَذْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا“ کا آخری منظر

ابھی باقی ہے۔ جب شش جہت سے اعتراف رحمتہ للعالمین کی صدائے حق بلند ہوگی اور کائنات

انسانیت کے لبوں پر اللھم صل علی سیدنا و مولانا محمد و آلہ وسلم کا ترانہ ہو گا۔

عظیم ترین محسن انسانیت

آپ نے کبھی سوچا کہ خونی رشتے سے بڑھ کر سچی، پر خلوص اور مستحکم محبت پیدا کرنے کے

موثر ترین وسائل کیا ہیں؟ حضور ﷺ کے بعض ارشادات پر ایک سرسری نظر ڈال لیجیے آپ کو

یقین ہو جائے گا کہ انسانیت پر اس بنیادی اور دواوی احسان کے لیے جو طریقے حضور ﷺ نے

اختیار فرمائے۔ ان سے بہتر اور حصول مقصد کے لیے موثر ذریعے کوئی نہیں ہو سکتے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے حضور ﷺ نے فرمایا:

”بدگمانی سے دور رہو کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے، ایک دوسرے کے بھید نہ ٹٹولو،

عیب جوئی نہ کرو، باہم بغض نہ رکھو اور بھائی بھائی ہو جاؤ۔“^①

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

”آپس میں بغض نہ رکھو، باہم حسد نہ کرو، آپس کے تعلقات نہ توڑو اور خدا کے بندو! بھائی

بھائی ہو جاؤ۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اپنے بھائی کے ساتھ تین روز سے زیادہ قطع تعلق

رکھے۔“^②

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

”رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، جب تم میں سے کسی کے ہاں سالن پکے تو اسے چاہیے کہ

شور بازیاہ کر لے۔ پھر اس میں سے کچھ پڑوسی کو بھی بھیج دے۔“^③

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”وہ آدمی مجھ پر ایمان نہیں لایا (یعنی میری جماعت میں سے نہیں) جو ایسی حالت میں اپنا

پیٹ بھر کر مزے سے سو جائے جب اس کے پہلو میں رہنے والا پڑوسی بھوکا ہو اور پیٹ بھر کر

① صحیح بخاری، کتاب النکاح باب لا یخطب علی خطبۃ النبی۔

② صحیح بخاری، کتاب الادب باب ما یخفی عن التماس

③ رواہ الطبرانی الاوسط۔

سو جانے والے کو علم ہو کہ پڑوسی بھوکا ہے۔^۱

آج رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کے کتنے مدعی ہیں جو حقیقی ایمان کی اس میزان میں پورے اتر سکتے ہیں؟ جو لوگ محض اتفاقات کی بنا پر کچھ عرصے کے لیے امر و حکم میں شریک ہو جاتے ہیں، وہ اپنے عالی شان ابوانوں میں اس طرح پیٹ بھر کر سوتے ہیں کہ لاکھوں بھوکوں اور محتاجوں کا احساس تک انھیں نہیں رہتا۔ احساس ہو تو تڑپ کر باہر نہ نکل آئیں؟ احساس ذمہ داری ان کو تھا جو راتوں کو جگہ جگہ خفیہ خفیہ دورے کر کے اندازہ کیا کرتے تھے کہ کوئی ستم زدہ ان کے دائرہ علم سے باہر تو نہیں رہ گیا؟ پھر دیکھیے ارشاد کا مدعا جہاں یہ ہے کہ مختلف انسانی حقوق کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے وہاں یہ بھی ہے کہ ان میں وہ محبت و رحمت اور وہ شفقت بروئے کار آجائے، جو خونی رشتوں میں بہت کم نصیب ہوتی ہے۔ اگر انسانیت کا کوئی محسن اس عظمت و شان کا ہے تو اس کا نشان بتائیے۔ یہ منصب ازل سے رحمۃ للعالمین ﷺ کے لیے خاص ہو گیا۔

اُسوۂ محمدی ﷺ

احتساب

احتساب ایک سنہری زنجیر ہے، جس میں تمدن، اخلاق، مذہب اور معاشرت کی تمام جزئیات جکڑی ہوئی ہیں۔ اگر اس کی بندش ڈھیلی پڑ جائے تو دفعہ نظام عالم کی ایک ایک کڑی درہم برہم ہو جائے۔ اسی غرض سے دنیا نے احتساب کو مختلف صورتوں میں قائم رکھا۔ خاندانوں اور کنبوں نے مختلف رسم و رواج اختیار کیے، جن کی خلاف ورزی موجب ملامت، بلکہ بعض اوقات قوی جرم خیال کی جاتی ہے، سلطنتوں نے قوانین بنائے جو انسان کو ایک خاص نظام کے ماتحت ہر قسم کی مادی، اخلاقی اور مذہبی ترقی کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ حکماء نے فلسفہ اخلاق ایجاد کیا، جو اخلاقی قوانین کی پیروی پر جمعیت بشری کو مجبور کرتا ہے۔

ہمارا سرمایہ فخر

اگر یورپ کو اپنی تہذیب پر فخر ہے کہ وہ انسان کی ہر فروگزاشت پر سختی کے ساتھ گرفت کرتی ہے۔ اگر رومن لا (رومی قانون) کو اپنے اوپر ناز ہے کہ وہ دنیا کے قوانین متضادہ کو اپنے مرکز سے ہٹے نہیں دیتا، اگر یونان کو اپنے فلسفہ اخلاق پر گھمنڈ ہے کہ وہ اخلاقی قوی کی تربیت کرتا ہے تو ہمیں ان کے بڑے بول سے مرعوب نہیں ہو جانا چاہیئے۔ ہم رسم و رواج کے غلام نہیں کہ یورپ کے قوانین معاشرت پر فریفتہ ہو جائیں۔ ہم قانونی سختیاں برداشت کرنے کے خوگر نہیں کہ اپنے ہاتھ کو ہر جھکڑی کے حوالے کر دیں۔ قیاسات عقلی ہماری غذائے روحانی نہیں کہ یونانیوں کے طلسم میں پھنس جائیں، بلکہ ہمارے رگ اور پٹھے ایک پاک مذہب کے سلسلے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے گوشت اور خون پر چڑے کی جگہ مذہب کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ ہمارے قلب کو ایک غیر متزلزل مذہبی احساس حرکت دے رہا ہے، پس ہم کو ہر دلفریب رسم و رواج، ہر مرعوب کرنے والے قانون اور ہر متحیر کر دینے والے فلسفے کو چھوڑ کر اپنی باگ صرف اسلام ہی کے ہاتھ میں دینی چاہیے اور اس پر فخر کرنا چاہیے کہ:

^۱ رواہ الطبرانی فی الکبیر۔

رشتہ در گرو نعم اقلندہ دوست
مے برد ہر جاکہ خاطر خواہ اوست

اسوہ حسنہ

مذہب کی قوت احتساب ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر آنحضرت ﷺ کا اتباع فرض کر کے ہم کو پوری دنیا کی مادی و اخلاقی غلامی سے آزاد کر دیا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب: ۲۱)

”یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں پیروی و اتباع کا بہترین نمونہ رکھا گیا ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: کہ تم رسول اللہ کی تقلید کرو، کیونکہ ایک کی تقلید کرنے سے دوسرے اشخاص کی تقلید کی نفی نہیں ہو جاتی۔ بلکہ یہ فرمایا کہ تمہاری تقلید صرف اسی پاک ذات ﷺ میں محدود ہے کیونکہ تمہیں اعمال صالحہ کا یہ خزانہ دوسری جگہ نہیں مل سکتا۔ اس طرزِ بیاں سے نہ صرف جناب رسول اللہ ﷺ کا اتباع لازم کر دیا گیا، بلکہ ساتھ ہی دوسرے تمام بڑے بڑے انسانوں کے اتباع کی نفی بھی کر دی۔ اس لیے کہ صرف ایک ہی آفتاب ہے جس کی روشنی، ظلمت زار دنیا کی ہر اندھیری اور ہر تیرہ و تاریک راہ میں ہماری رہنمائی کر سکتی ہے!

جو غلام آفتاب ہم ہمہ ز آفتاب گویم

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

(مولانا روم)

آیات و احادیث

اسی آفتاب کی روشنی سے اور سیارے بھی نور حاصل کرتے ہیں، اس لیے ان کا اتباع بھی ہم پر واجب ہو جاتا ہے:

خَيْرُ الْقُرُونِ قَرْنِي ثُمَّ الذِّينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ الذِّينَ يَلُونَهُمْ

”بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے اس کے بعد ان لوگوں کا دور جو اس کے بعد آئیں گے، پھر وہ لوگ جو اس کے بعد اسوہ حسنہ کی تقلید کریں گے۔“

اصحابی کالنجوم

”میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں۔“

اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں جناب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کی اس خصوصیت کا بار بار ذکر کیا ہے:

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْنُوزًا عِنْدَهُمْ فِي السَّوَابِقِ وَالْإِنْجِيلِ ۚ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ لَهُمُ الْبَرَكَاتُ ۚ وَيُخَوِّمُهُمُ الْحَبِيبُ وَيُفَضِّلُهُمْ بَاطْنَهُمْ ۖ وَالْأَعْلَىٰ لَبِيقٌ ۚ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۖ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ ۖ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٥٧﴾ (اعراف: ۱۵۷)

”جو رسول اور نبی ﷺ کی پیروی کریں گے، جس کی بعثت توراۃ و انجیل میں لکھی پائیں گے۔ وہ انہیں نیکی کے کاموں کا حکم دے گا۔ برائیوں سے روکے گا۔ پاک و مفید چیزوں کو ان پر حلال اور ناپاک و مضر چیزوں کو حرام کرے گا۔“

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ

(آل عمران: ۱۱۰)

”تم لوگ بہترین امت ہو جسے خدا نے دنیا کی ہدایت و رہنمائی کے لیے نمایاں کیا۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان لاتے ہو۔“

لیکن ان آیتوں کی عملی تفسیر ہمیں صرف احادیث کی کتابوں میں ڈھونڈنی چاہیے جن کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہما کے مواقع احتساب کے ایک ایک جزئیہ کا پتا لگ سکتا ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا نے ہدایت و ارشاد کے لیے جو آفتاب اور سیارے پیدا کیے تھے، وہ ہمیشہ ضیا گستر رہتے تھے۔

احتساب کی ترتیب اصلاح نفس سے شروع ہو کر بالترتیب محتسب کے قبیلے اور قوم تک منتہی ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرض احتساب اسی ترتیب کے ساتھ ادا فرمایا ہے۔

اصلاح نفس

آنحضرت ﷺ کی ذات پاک جامع فضائل تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے تمام زلات کو معاف کر دیا تھا، بائیں ہمہ آپ ﷺ اس کثرت سے نماز پڑھتے تھے کہ پاؤں پھول کر پھٹ جاتے تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہما نے اس ریاضت شاقہ کو دیکھ کر عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ! خدا نے تو آپ ﷺ کے تمام اگلے پچھلے گناہوں کو معاف کر دیا ہے، پھر آپ ﷺ کیوں اس قدر مصروف عبادت رہتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

أَفَلَا أَكُونُ عَبْدًا شَكُورًا^۱

”کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ ہونے کی کوشش نہ کروں۔“

^۱ بخاری مطبوعہ بولاق ص: ۹۹ ج: ۸ کتاب التمجید باب قیام النبی ﷺ باللیل۔

چنانچہ جب کبھی اس قسم کے مواقع پیش آتے تھے، جو قلب کو خدا کی طرف سے پھیر دے سکتے تھے یا نفس میں غرور و تکبر پیدا کر سکتے تھے تو آپ ﷺ نہایت سختی کے ساتھ ان کا انکار فرماتے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے گھر میں ایک پردہ لٹکا لیا تھا جس میں تصویریں بنی تھیں آپ ﷺ کی نظر پڑی تو فرمایا:

أَمِيطُوا عَنَّا قَامَ امَلِكُ هَذَا فَانَّهُ لَا تَزَالُ تَصَاوِيْرُكَ تَعْرِضُ فِي صَلَاتِي ①

”ہمارے سامنے سے اپنا یہ پردہ ہٹا لو کیونکہ اس کی تصویریں میری نماز میں سامنے آتی رہتی ہیں یعنی خلل انداز ہوتی رہتی ہیں۔“

ایک صحابی نے بطور تحفہ کے آپ ﷺ کو حریر کا ایک پٹخہ دیا، آپ ﷺ نے اسے پہن کر نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد نہایت ناگواری سے اتار کر پھینک دیا اور فرمایا:

لَا يَنْبَغِي هَذَا لِلْمُسْلِمِينَ ②

”یہ پرہیز گاروں کے قابل نہیں۔“

غرور و کبر کا سرچشمہ

غرور و کبر کا سرچشمہ مدح و ستائش ہے۔ امر او سلاطین کو اسی مرض نے دنیا کی تمام چیزوں سے بالاتر بنا دیا ہے۔ آنحضرت ﷺ اگرچہ خیر البشر تھے لیکن اگر کوئی شخص آپ ﷺ کو انبیاء سے سابقین پر ترجیح دیتا تھا تو آپ ﷺ اسے منع فرماتے تھے۔ ایک صحابی اور ایک یہودی میں جھگڑا ہو گیا۔ صحابی نے غصے میں قسم کھائی اور کہا: اس خدا کی قسم جس نے محمد ﷺ کو تمام دنیا سے افضل بنایا ہے۔ یہودی نے بھی قسم کھائی: ”اس خدا کی قسم جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام دنیا پر ترجیح دی ہے۔“ صحابی نے اس پر غصے میں آکر یہودی کے منہ پر طمانچہ مارا، اس نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی۔ آپ نے حکم دیا کہ ”مجھے موسیٰ پر ترجیح نہ دو“ ③

احتساب قبیلہ و خاندان

خیرات گھر ہی سے شروع ہوتی ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا تھا: وَ اَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْاَقْرَبِينَ ④ (اپنے خاندان کے قریبی رشتہ داروں کے آگے حق پیش کرو اور

عذاب الہی سے ڈرا) (الشعرا: ۲۱۴) جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے اپنے پورے قبیلے اور خاندان کو جمع کر کے پیغمبرانہ لہجے میں یہ حکم الہی سنایا:

”یا معشر قریش! یا معشر بنی عبد مناف! یا معشر بنی قصی! یا معشر بنی عبد المطلب! اے فاطمہ رضی اللہ عنہا محمد ﷺ کی بیٹی، تم سب اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ کیونکہ میں تمہیں قیامت کے دن کچھ بھی نفع و نقصان نہ پہنچا سکوں گا: اے فاطمہ رضی اللہ عنہا تجھے مجھ سے صرف جسمانی تعلق ہے اور میں رشتے کی بنیل کو صرف دنیا ہی میں سرسبز و شاداب رکھ سکوں گا“ ⑤

یہ ایک عام احتساب تھا، لیکن مخصوص مواقع پر بھی آپ ﷺ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور اہل و عیال کو نیکی کی ترغیب دیتے اور برائی سے روکتے رہتے تھے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ ﷺ ایک رات اٹھے اور فرمایا: ”سبحان اللہ! آسمان سے فتنہ و فساد کی بارش ہو رہی ہے اور برکات و فضائل کے خزانے کھل گئے ہیں۔ حجروں میں سونے والیوں (ازواج مطہرات) کو جگا دو کیونکہ دنیا کی بہت سے کپڑے پہننے والی عورتیں آخرت میں برہنہ نظر آئیں گی۔“ ⑥

صدقے سے اجتناب میں اہتمام

آپ ﷺ نے تنزہ نفس اور استغنا کی وجہ سے فقر و فاقہ کے باوجود اپنے اوپر اور اپنے تمام خاندان کے اوپر صدقہ حرام کر دیا تھا۔

امام حسین رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ بچپن میں صدقہ کی ایک کھجور اٹھا کر منہ میں ڈال لی آپ ﷺ کی نگاہ پڑی تو فوراً ٹوکا: ”ک“، کیا تمہیں خبر نہیں کہ ہمارا خاندان صدقہ نہیں کھاتا؟“ ⑦

آپ ﷺ ایک مرتبہ شب کو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور فرمایا: ”تم لوگ اٹھ کر تہجد نہیں پڑھتے؟“ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ”یا رسول اللہ ﷺ! ہماری نیند اور بیداری تو خدا کے اختیار میں ہے، اگر وہ جگائے گا تو جاگیں گے؟ آنحضرت ﷺ خاموش ہو گئے مگر لہنی ران پر افسوس کے ساتھ ہاتھ مارا اور یہ آیت پڑھی:

وَ كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرُ شُكْرًا ⑧ (الکہف: ۵۴)

”آدمی بڑا ہی جھگڑا الوداع ہوا ہے۔“

① ترمذی ص ۵۲۶ کتاب التفسیر

② بخاری جز: ۲ ص: ۳۰

③ بخاری جز: ۲ ص: ۱۲۸

④ بخاری جز اول ص: ۵۰

⑤ بخاری جز: ۱ ص: ۷۰ (کتاب الصلوٰۃ باب من صلی فی ثوب مصلب)

⑥ بخاری جز: ۱ ص: ۸۰ (کتاب الصلوٰۃ باب من صلی فی فردج حریر)

⑦ بخاری جز: ۸ ص: ۱۰۸ (تاب الخصوصات: لا تحیرونی علی موسیٰ)

احتساب قوم

اگرچہ وہ تمام جزئی مواقع، جہاں آنحضرت ﷺ نے احتساب کا فرض ادا کیا ہے، احتساب قومی کے تحت میں داخل ہیں، لیکن آپ ﷺ نے دو موقعوں پر نہایت بلیغ تشبیہ کے ساتھ اپنی اس خصوصیت کا اظہار قوم کے سامنے فرمایا: ایک موقع پر فرمایا:

”میری اور میری شریعت کی مثال بعینہ اس شخص کی سی ہے، جس نے ایک قوم کے پاس آکر یہ وحشت انگیز خبر سنائی کہ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک لشکر تمہاری طرف آتے ہوئے دیکھا ہے، میں ایک ”نذیر عریاں“ ہوں،^۱ پس تمہیں ہوشیار ہو جانا چاہیے چنانچہ ایک گروہ نے اس کا کہنا مانا اور وہ رات ہی رات بچ کر نکل گیا۔ دوسرے گروہ نے اسے جھٹلایا: نتیجہ یہ ہوا کہ لشکر نے دھارا مارا اور اس گروہ کا استیصال کر دیا۔“

دوسرے موقع پر فرمایا:

”میری اور تمام لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ بھڑکائی۔ جب آگ کی روشنی چاروں طرف پھیلی تو پردانے اس پر ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔ اس نے پروانوں کو آگ میں جانے سے روکنا چاہا، لیکن وہ سب اس کے قابو میں نہ آ سکے اور آگ میں گھس گئے۔“

”اسی طرح میں تم لوگوں کی کمر پکڑ کر کھینچتا ہوں تاکہ آگ میں داخل ہونے نہ پاؤ، لیکن لوگ اس میں گھسے جاتے ہیں۔“^۲

عقائد کی درستی

آنحضرت ﷺ کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد صحیح عقائد تھا۔ عقائد میں بدترین چیز شرک فی اللہ تھی اور آنحضرت ﷺ نے صرف شرک ہی مٹانے کے لیے جہاد کیا، جو احتساب کی آخری منزل ہے لیکن اس کے علاوہ اور بھی بہت سے عقائد ہیں، جو عام دسترس سے باہر ہیں۔ اگر عام لوگوں کو ان میں غور و فکر کرنے کا موقع دیا جائے تو مذہبی عقائد میں بہت سے مفاسد پیدا ہو جائیں اور اسلامی عقائد کی سادگی فنا ہو جائے جو اسلام کا سب سے بڑا زیور ہے۔ اسی غرض سے آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کی یہ خصوصیت قرار دی تھی کہ وہ غیر ضروری چیزوں میں وقت ضائع نہیں کرتے، چنانچہ عہد نبوت میں جب کبھی اس قسم کے مواقع پیش آئے ہیں، آنحضرت ﷺ نے سختی کے ساتھ صحابہ کو زجر و توبیح کی ہے۔

^۱ یعنی بھاڑنے والا۔ عرب میں ہر اہم واقعے کی خبر سننے ہو کر دیتے تھے۔

^۲ بخاری جز: ۸ ص ۱۰۱-۱۰۲۔

مسئلہ قضا و قدر

ایک مرتبہ صحابہ مسئلہ قضا و قدر کے متعلق مباحثہ کر رہے تھے جس نے آگے چل کر مسلمانوں کے دو عظیم و حریف مقابل فرقے پیدا کر دیے^۱ آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو چہرہ مبارک غصے سے سُرخ ہو گیا اور فرمایا:

بِهَذَا امِرتُمْ اَوْ لِهَذَا اخَلَقْتُمْ تَضَرَّبُونَ الْقُرْآنَ بَعْضُهُ بَعْضًا بِهَذَا اَهْلَكَتِ الْاُمَمَ قَبْلَكُمْ^۲

”کیا تم لوگوں کو اس کا حکم دیا گیا ہے یا تم اس لیے پیدا کیے گئے ہو؟ تم لوگ قرآن کو گدڑ کر رہے ہو، گزشتہ قوموں کو اسی قسم کے لایعنی مسائل نے برباد کر دیا۔“

چاند سورج کا گہن

اگرچہ اسلام نے عرب جاہلیت کے تمام توہم آمیز عقائد مٹا دیے تھے، تاہم بعض باتیں رہ گئی تھیں اور بھی کبھی ان کا ظہور ہو جاتا تھا۔ عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مر جاتا ہے تو سورج میں گہن لگ جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے صاحب زادے ابراہیم رضی اللہ عنہ نے انتقال کیا تو اتفاق سے اسی دن سورج میں گہن بھی لگ گیا۔ لوگوں کو خیال ہوا کہ یہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی موت کا اثر ہے۔ لیکن آپ ﷺ نے فوراً اس خیال سے لوگوں کو روکا اور فرمایا: ”چاند اور سورج میں کسی کے مرنے اور جینے سے گہن نہیں لگتا۔“

عبادات

عبادات چونکہ روز کی چیزیں تھیں جن میں سہو و غفلت اور بے عنوانی کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ اس لیے آنحضرت ﷺ کو ان کے متعلق احتساب کی اکثر ضرورت پیش آتی تھی،^۳ اسلام نے ادائے نماز کے لیے جماعت کو واجب کر دیا تھا، لیکن اکثر لوگ اس میں غفلت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے جماعت میں چند اشخاص کو ڈھونڈا تو نہ پایا، نہایت برہم ہوئے اور فرمایا:

”جی میں آتا ہے کہ ایک شخص کو امام بنا کر خود ان لوگوں کے پاس چلا جاؤں اور لکڑیوں کا ڈھیر لگا کر ان کے گھر آگ میں پھونک دوں۔“^۴

^۱ یعنی جری اور قدری

^۲ سنن بن ماجہ ۱۶ (باب القدر)

^۳ بخاری جز: ۲ ص ۳۳۔

^۴ صحیح مسلم مطبوعہ مصر جلد: ۱ ص: ۲۴۳

نماز میں تخفیف کی تاکید

بعض لوگ جب امامت کرتے تھے تو نماز میں طول دیتے تھے، جس سے کاروباری اور ضعیف لوگ گھبر اجاتے تھے۔ ایک شخص نے اسی بنا پر امام کی شکایت کی، آپ ﷺ کو معمول سے زیادہ غصہ آگیا اور فرمایا:

”تم مذہب سے لوگوں کو متنفر کر رہے ہو۔ امام کو نماز میں تخفیف کرنی چاہیے کیونکہ ان میں مریض، ضعیف، کاروباری ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔“^۱

خشوع فی الصلوٰۃ

نماز کا اصل مقصد خشوع و خضوع ہے لیکن جب کسی کے طرزِ عمل سے ان کا ظہور نہیں ہوتا تھا تو آنحضرت ﷺ اسے تنبیہ فرماتے تھے۔ ایک بار ایک شخص نے نہایت عجلت کے ساتھ نماز پڑھی۔ نماز پڑھ چکا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”نماز کو دہراؤ، تم نے نماز پڑھی ہی نہیں۔“ اس نے تین بار نماز دہرائی اور آپ ﷺ نے تینوں بار ٹوکا، آخر میں اس نے کہا ”اب میں اس سے بہتر نماز نہیں پڑھ سکتا۔“ آپ ﷺ نے تکبیر، قرات، رکوع، سجود، قیام اور تعوذ کے وہ طریقے بتائے جن سے اطمینان، سکون و قار اور اعتدال کا اظہار ہوتا تھا۔^۲

جزئیات پر نظر

عبادات اور مقدمات، عبادات کے متعلق آپ ﷺ نہایت معمولی اور جزئی باتوں پر بھی گرفت فرماتے تھے۔ ایک بار سفر میں تھے، نماز عصر کا وقت آگیا، صحابہ نے پاؤں کا مسح کیا۔ آپ ﷺ نے دیکھا تو دور سے بہ زور آواز دی۔

ویل للعقاب من النار^۳

”ایڑیوں کے لیے آگ کا عذاب ہے۔“

ابتدائے اسلام میں نماز کے قیام و ادا کی حالت بالکل ابتدائی تھی اور تمام جزئیات و فروع ابھی واضح نہیں ہوئے تھے، اس طرح کا بتدریج ارتقاء مذہب کی ہر تعلیم میں ہوتا ہے۔ موجودہ حالت ایک مدت کے تغیرات کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ چنانچہ ابتدا میں اکثر لوگ مسجد کے اندر

^۱ بخاری جز: ۱ ص: ۲۶

^۲ بخاری جز: ۱ ص: ۱۳۸

^۳ بخاری جز: ۱ ص: ۲۷

تھوک دیتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے مسجد میں تھوک کا دھبا دیکھا، خود اٹھے اور ہاتھ مبارک سے اسے مٹا دیا۔ پھر فرمایا ”نماز میں ہر شخص خدا سے سرگوشی کرتا ہے“ اس لیے کسی شخص کو قبلہ کی طرف تھوکنا نہیں چاہیے، البتہ دائیں بائیں یا اپنے پاؤں کے نیچے تھوک سکتا ہے۔^۱

یہاں یہ واضح رہے کہ اس وقت مسجد کا فرش پختہ نہ تھا، صحن مسجد اور عام سطح زمین میں سوائے حدود عمارت کے اور کوئی امتیاز قائم نہ تھا۔ ریتلی زمین تھی اور وہ ہر طرح کی رطوبت جذب کر لیتی تھی لیکن اب مسجدوں کا داخلی حصہ (ہی نہیں صحن کا فرش بھی) پختہ ہوتا ہے، پس وہاں تھوکنا مسجد کی صفائی اور نمازیوں کے حقوق نشست پر حملہ کرنا ہے۔

بدعت

نظام مذہبی کا سب سے زیادہ خطرناک مرض بدعت ہے۔ اگرچہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں مسلمان اس مرض میں مبتلا نہیں ہو سکتے تھے تاہم جاہلیت کے زمانے کی بہت سی بدعتوں کی جھلک کبھی کبھی نظر آ جاتی تھی، اس لیے آپ ﷺ ہمیشہ ان کے مٹانے میں مصروف رہتے تھے۔

پیدل چلنے کا حلف

بدعت کی مختلف قسمیں اور مختلف مظاہر ہیں لیکن اس کی بدترین شکل رہبانیت اور جوگ ہے، جو یہود و نصاریٰ کے مذہب کا جزو بن گئی ہے۔ وَرَهْبَانِيَّة ابْتَدِعُوهَا۔ (اور رہبانیت انہوں نے خود نکالی۔ المائدہ: ۲۸) چونکہ عرب پر یہود و نصاریٰ کا مذہبی اثر غالب تھا اس لئے وہاں بھی اس قسم کی بدعات پیدا ہو گئی تھیں۔

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا کہ اپنے دو بیٹوں کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر جا رہا ہے۔ آپ ﷺ نے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے؟ لوگوں نے کہا: ”اس نے پیدل چلنے کی نذر مانی ہے۔ ضعف کی وجہ سے بیٹوں کے سہارے چلتا ہے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس نے اپنے آپ کو کیوں عذاب میں مبتلا کر دیا ہے؟ خدا اس سے بے نیاز ہے۔“

ننگے پاؤں چلنے کی منت

عقبہ بن عامر کی بہن نے خانہ کعبہ تک ننگے پاؤں پیدل چلنے کی منت مانی اور عقبہ کو آنحضرت ﷺ کے پاس بھیجا کہ پوچھ آئیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”سواری پر بھی

^۱ بخاری جز: ۱ ص: ۸۶۔

جاسکتی ہے۔^۱

کھڑے رہنا اور بات نہ کرنا

ایک مرتبہ آپ ﷺ خطبہ دے رہے تھے اور لوگ نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر سن رہے تھے لیکن ایک شخص کھڑا تھا۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا تو معلوم ہوا، اس نے نذر مانی ہے کہ ہمیشہ کھڑا رہے گا۔ سایے میں نہ بیٹھے گا۔ کسی سے بات چیت نہ کرے گا اور روزہ رکھے گا۔ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ اسے بیٹھنا چاہیے، سایے میں آنا چاہیے، گفتگو کرنی چاہیے اور روزے کو بھی پورا کرنا چاہیے۔^۲

ناک میں نکیل

اسی طرح آپ ﷺ کو ایک شخص نظر آیا جسے ایک آدمی ناک میں نکیل ڈال کر خانہ کعبہ کا طواف کرا رہا تھا۔ آپ ﷺ نے اس کی ناک کی رسی کاٹ دی اور فرمایا: ”اس کا ہاتھ پکڑ کر طواف کراؤ۔“^۳

تشدد آمیز مذہبی انہماک

لیکن ان بدعات سے زیادہ ان اصولوں کا مٹانا ضروری تھا جن کی بنا پر بدعات پیدا ہوتی ہیں۔ بدعات کا سب سے بڑا سرچشمہ، تشدد آمیز مذہبی انہماک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اپنے نظام عبادات کو نہایت سہل و آسان طریقے پر قائم کیا ہے، اس لحاظ سے اگرچہ خود اسلام کے سنگ بنیاد پر بدعت کی عمارت قائم نہیں کی جاسکتی تھی۔ تاہم ابتدا میں صحابہ کا ایک پر جوش و مخلص گروہ نہایت شدت کے ساتھ عبادت میں مصروف رہنا چاہتا تھا۔ جب آنحضرت ﷺ نے ایک دن چھوڑ کے روزہ رکھنا شروع کیا تو اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اس کی تقلید کی، لیکن آپ ﷺ کو نظر آیا کہ یہی چیز بدعت کا پیش خیمہ بھی ہے۔ آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ اس پر بھی لوگ باز نہ آئے تو معمول کے خلاف متصل روزہ رکھنا شروع کر دیا کہ لوگ خود گھبرا کر باز آجائیں۔^۴ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو کثرت صوم و صلوات سے اسی بنا پر روک دیا تھا۔ حضرت سلمان

^۱ صحیح مسلم جلد ۲ ص ۷۱۔

^۲ بخاری ج ۸ ص ۱۳۳۔

^۳ بخاری ج ۸ ص ۱۳۳۔

^۴ بخاری ج ۸ ص ۱۷۴۔

رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کو بھی شدت زہد سے منع فرمایا تھا اور آپ ﷺ نے ان کی تائید کی تھی۔^۱

رسم و رواج کا انسداد

رسم و رواج کو جب استحکام ہو جاتا ہے تو بدعات کی طرح ان کا چھوڑنا بھی نہایت شاق گزرتا ہے حالانکہ اکثر حالتوں میں وہ بدعات سے کم ضرر رساں ثابت نہیں ہوتیں اور بڑی قیامت یہ ہے کہ بعض اوقات مذہبی حیثیت پیدا کر لیتی ہیں۔ عرب میں بہت سی مضر رسمیں جاری ہو گئی تھیں، جن کی پابندی نہایت ضروری خیال کی جاتی تھی، اس لیے بدعات کے ساتھ ساتھ ان کا بھی انسداد کیا گیا۔

میت کا ماتم

عرب کے جذبات نہایت رقیق و لطیف تھے۔ اس لیے وہ اعزہ و اقارب کی موت سے نہایت متاثر ہوتے تھے۔ جس کا اظہار مختلف حیثیتوں سے کیا جاتا تھا۔ عورتیں نہایت شدت کے ساتھ میت پر گریہ و بکا کرتی تھیں۔ منہ نوچنا، سر کے بال مند و الینا، گریبان چاک کر دینا، شوہر کی موت پر برسوں تک خاص پابندیوں کے ساتھ گھر سے باہر نہ کرنا ماتم کرنا عرب کی عورتوں کا عام شعار تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ان تمام رسوم کو نہایت سختی سے مٹایا۔ شخصی حالتوں کے علاوہ میت پر قومی حیثیت سے بھی ماتم کیا جاتا تھا، یعنی قبیلے کی بہت سی عورتیں جمع ہو کر میت کے محاسن و فضائل بیان کرتیں اور باہم روتی تھیں۔ اسی رسم کا نام ”نجاح“ ہے۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے تک یہ رسم قائم تھی، لیکن آپ ﷺ کے سامنے جب کبھی اس قسم کے مواقع پیش آئے تو اس طرح کی عورتوں کو سختی کے ساتھ تنبیہ کی۔

حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کی شہادت

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو جب اپنے شوہر کے انتقال کی خبر ملی تو بہ حسرت بولیں ”مسافر مسافرت میں مرا۔ اس پر اس قدر گریہ و بکا کروں گی کہ یاد گار رہے گا۔“ چنانچہ اس غرض سے انھیں تو عرب کے دستور قدیم کے مطابق ایک عورت نے گریہ و بکا میں اس کا ساتھ دینا چاہا۔ آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو فرمایا: کیا اس گھر میں شیطان کو داخل کرنا چاہتے ہو، جس سے خدا نے

^۱ بخاری ج ۸ ص ۳۲۔

اسے نکال دیا ہے؟“^۱

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت

جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کی شہادت کی خبر آئی تو ان کی عورتوں نے اسی طریقے سے نوحہ کرنا شروع کیا۔ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ کو خبر کی۔ آپ ﷺ نے منع کرنے کا حکم دیا، لیکن وہ ناکام واپس آیا۔ آپ ﷺ نے اسی غرض سے دوسری مرتبہ پھر اسے بھیجا، اس پر بھی کچھ اثر نہ ہوا تو تیسری بار فرمایا: ”جا کر ان عورتوں کے منہ میں خاک جھونک دو۔“^۲

جنازے کے مراسم

جنازے کے متعلق بھی اسی قسم کی متعدد رسمیں پیدا ہو گئی تھیں مثلاً اہل عرب جنازے کے ساتھ سواری پر جاتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے چند اشخاص کو دیکھا کہ وہ ایک جنازے کے ساتھ سوار ہو کر جا رہے ہیں فرمایا: ”کیا تم کو شرم نہیں آتی کہ فرشتے پیدل ہیں اور تم سواری پر جا رہے ہو۔“^۳

جنازے کی مشابہت صرف کرۂ پہن کر کرتے تھے۔ اظہار غم کے لئے چادر اتار ڈالتے تھے۔ چادر عرب کا عام لباس تھا آنحضرت ﷺ نے اسی وضع میں چند اشخاص کو دیکھا تو فرمایا: ”کیا جاہلیت کے طریقے پر عمل کر رہے ہو؟“^۴

عورتوں کی شرکت جنازہ

جنازے میں عورتیں بھی عموماً شریک ہوتی تھیں، چنانچہ آپ ﷺ نے چند عورتوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو پوچھا: ”کیوں بیٹھی ہو؟“ بولیں: ”ایک جنازے کا انتظار ہے۔“ فرمایا: ”کیا اس کو غسل دو گی؟“ ان سبھوں نے کہا: ”نہیں“ پھر فرمایا: ”تو کیا لاش کو کندھا دو گی؟“ ان سبھوں نے کہا: ”نہیں۔“ پھر فرمایا: ”کیا لاش کو قبر میں اتار دو گی؟“ بولیں: ”نہیں،“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”پھر واپس جاؤ۔“^۵

۱ صحیح مسلم جلد اول ص ۳۴۰

۲ صحیح مسلم جلد اول ص ۳۳۵

۳ سنن ابن ماجہ ص: ۲۵۰

۴ سنن ابن ماجہ ص: ۲۵۱

۵ سنن ابن ماجہ ص: ۳۹۷

فخر و غرور کی ممانعت

عرب کی فخر پسند طبیعت ہمیشہ باپ دادا کے کارناموں کا ذکر نہایت بلند آہنگی سے علیٰ روس الاشہاد کرتی تھی۔ یہاں تک کہ زمانہ حج میں بھی یہ داستان پارینہ تازہ کی جاتی تھی۔ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اِبَاءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا (تو چاہیے کہ جس طرح پہلے اپنے آباؤ اجداد کی بڑائیوں کا ذکر کرتے تھے، اب اسی طرح اللہ کا ذکر کیا کرو بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ البقرہ: ۱۹۹)۔ اس کو ”مناسرت“ کہتے تھے۔ فخر و غرور کے اظہار کا یہ طریقہ اکثر بڑی بڑی نزاعیں قائم کر دیتا تھا۔ اسلام نے اس رسم کو بالکل ہی مٹا دیا، لیکن اس کا اثر مختلف صورتوں میں پھیل گیا تھا مجملہ ان کے ایک صورت یہ تھی کہ باپ دادا کے نام کی قسم کھاتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی قسم کھائی آپ ﷺ نے فرمایا: ”خدا باپ دادا کے نام کی قسم کھانے سے منع کرتا ہے، صرف خدا کی قسم کھانی چاہیے، ورنہ خاموشی بہتر ہے۔“^۱

اخلاقی اصلاح

آنحضرت ﷺ کی بعثت کا اصلی مقصد اصلاح اخلاق و تزکیہ نفس تھا، جسے خود آپ ﷺ نے ظاہر فرما دیا تھا:

اَتَبَا بَعَثْتُ لَاتَمَّ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ-

”میں اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں۔“

اور یہ مقصد ہمیشہ آپ ﷺ کے پیش نظر رہتا تھا۔ اصولی طور پر آپ ﷺ نے اخلاق کے متعلق جو اصلاحیں کیں، وہ ان کے علاوہ ہیں، جزئی طور پر جب کسی شخص سے کسی قسم کی بد اخلاقی کا ظہور ہوتا تھا تو آپ ﷺ فوراً اسے تنبیہ فرما دیتے تھے۔ چنانچہ احادیث میں اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں، جن کے جزئیات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

انسداد گد اگری

اسلام نے زکوٰۃ کا ایک مستقل نظام قائم کر دیا تھا کیونکہ خاص خاص لوگ اس کے حقیقی مستحق تھے عام طور پر اسلام گد اگری اور مفت خوری کو نہایت ذلیل پیشہ قرار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ غیر مستحق لوگوں کو گد اگری سے نہایت سختی کے ساتھ روکتے تھے۔

۱ سنن ابن ماجہ ص: ۳۹۷

ایک انصاری کی مثال

ایک مرتبہ ایک انصاری نے آپ ﷺ سے سوال کیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ”تمہارے گھر میں کچھ پونجی بھی ہے؟“ اس نے کہا: ایک ٹاٹ ہے جسے اوڑھتا بچھاتا ہوں۔ ایک پیالہ ہے جس میں پانی پیتا ہوں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جا کر اسے لے آؤ۔“ وہ جا کر اٹھالایا، آپ ﷺ نے تمام صحابہ کے سامنے اسے بغرض فروخت پیش کیا۔ ایک صحابی نے ایک درہم پر لینا چاہا، دوسرے صحابی نے قیمت میں اضافہ کر کے دو درہم پر لے لیا۔ آپ ﷺ نے دونوں درہم اس انصاری کے حوالے کیے اور فرمایا: ایک درہم کا غلہ لیکر گھر میں دے آؤ، دوسرے درہم کا ایک بسولا خرید کر میرے پاس لاؤ۔“ وہ بسولا خرید لایا۔ آپ ﷺ نے خود دست مبارک سے اس میں دستہ لگایا اور حکم دیا ”جنگل میں جا کر لکڑی کاٹو اور بیچو۔ پندرہ دن تک میں تمہاری صورت نہ دیکھوں۔“ وہ لکڑی کاٹ لایا اور اسے فروخت کیا۔ دس درہم ہاتھ آئے یہ رقم لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس رقم سے کچھ غلہ اور کچھ کپڑا خرید کر کھاؤ پہنو، گداگری سے یہ بہتر ہے۔ وہ تو آدمی کے چہرے کا داغ ہے، صرف اپانچ لوگوں کے لیے جائز ہو سکتی ہے۔“^۱

رشوت خوری

عدل و انصاف کی بربادی اور ظلم کی روح خبیث کا سب سے بڑا سبب رشوت خوری ہے۔ عہد نبوت میں چونکہ آنحضرت ﷺ کے فیض محبت سے صحابہ کا معیار اخلاق نہایت بلند ہو گیا تھا اس لیے رشوت خوری کی مثالیں نہیں ملتی۔ تاہم جب کبھی کسی کے طرز عمل پر رشوت کا شبہ بھی ہوتا تھا تو آنحضرت ﷺ اس پر تنبیہ فرماتے تھے۔ حکام و عمال کو اکثر رشوتیں نذر و ہدیہ کے ذریعے سے دی جاتی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا۔ آپ ﷺ نے قبیلہ ازد کے ایک شخص کو صدقہ وصول کرنے کے لئے بھیجا۔ اس نے واپس آکر آنحضرت ﷺ کے سامنے صدقہ کا مال پیش کیا اور کہا: ”اتنا مسلمانوں کا مال ہے اور اس قدر مجھے ہدیہ ملا ہے۔“ چونکہ اس قسم کا ہدیہ رشوت کا ذریعہ بن سکتا تھا اور اگر علانیہ اس کا انسداد نہ کیا جاتا تو اور لوگ بھی اس طریقے سے فائدہ اٹھاتے، اس لیے آپ ﷺ نے ایک خطبہ دیا اور فرمایا: اس عامل کو دیکھو جو کہتا ہے کہ یہ مال مسلمانوں کا اور یہ مال میرا ہے۔ ذرا وہ اپنے گھر میں تو بیٹھ کے دیکھے کہ اس کے پاس ہدیہ آتا ہے یا نہیں؟^۲

خیانت کا انسداد

معاملات میں خیانت، چالاکی اور خدع و فریب کا سب سے زیادہ موقع تجارتی کاروبار میں مل سکتا ہے، اس لیے آنحضرت ﷺ خاص طور پر اس کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ بازار میں سے گزرے اور ایک شخص کے غلے کے ڈھیر کے اندر ہاتھ ڈال کے دیکھا تو فنی محسوس ہوئی چونکہ بھیگنے سے غلے کا وزن بڑھ جاتا ہے، اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص دھوکا دیتا ہے، وہ ہم میں سے نہیں۔“^۱

چونکہ عرب میں غلہ بہت کم آتا تھا اس لیے جب باہر سے سوداگر غلہ لاتے تھے تو لوگ شہر سے باہر ہی تخمیناً خرید لیتے تھے، لیکن اس سے کئی طرح کے نقصانات پیدا ہوتے تھے۔ اول تمام شہر محروم رہ جاتا تھا، دوسرے یہ ایک غیر معین و غیر معلوم بیع تھی، اس لیے آنحضرت ﷺ نے اس سے روکا۔ آپ ﷺ لوگوں کو عموماً اس پر سزا دیتے تھے۔^۲

حفظ الید و حفظ اللسان

اسلام نے ایک عظیم الشان اخلاقی اصول یہ قائم کیا تھا۔

المسلم من سلم المسلمون من یدہ و من لسانہ۔

”مسلمان وہ ہے، جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمانوں کو ایذا نہ پہنچے۔“

اگرچہ اس اصول کی خلاف ورزی کا اثر ہر موقع پر بڑے نتائج پیدا کرتا ہے، تاہم برابر کے درجے کے لوگ انتقام لیکر اپنے دل کو تسکین دے لیتے ہیں، کمزور انسانوں کو تو اس کا بھی موقع نہیں مل سکتا چنانچہ اس قسم کے موقعوں پر جب کوئی شخص اس اخلاقی جرم کا مرتکب ہوتا تھا تو آپ ﷺ فوراً ٹوک دیتے تھے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے غلام کو مالا کی گالی دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم اس کو گالی دیتے ہو؟ تم میں زمانہ جاہلیت کا اثر باقی ہے۔ تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں، جنہیں خدا نے تمہارے سپرد کر دیا ہے، جو تم کھاؤ وہی ان کو کھاؤ، جو تم پہنو، وہی ان کو پہناؤ اور ان کی طاقت سے زیادہ ان سے کام نہ لو۔ اگر لیتے ہو تو ان کی اعانت کرو۔“^۱

حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ انصاری کہتے ہیں: ”میں اپنے غلام کو مار رہا تھا۔ یکایک پیچھے سے ایک آواز آئی، اے ابو مسعود رضی اللہ عنہ! ہوشیار! خدا کو تم پر اس سے زیادہ قدرت حاصل ہے۔“ میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو آنحضرت ﷺ تھے۔ حضرت مسعود رضی اللہ عنہ پر اس کا یہ اثر پڑا کہ انہوں نے

۱ سنن ابن ماجہ ص: ۴۰۳

۲ بخاری جز: ۳ ص: ۶۸

۳ بخاری جز: ۱ ص: ۱۱

۱ سنن ابن ماجہ ص: ۳۹۷

۲ صحیح مسلم جلد: ۲ ص: ۱۱۳

غلام کو آزاد کر دیا۔^①

مداحی اور عیش پروری کا انسداد

انسان خوشامد پسند ہے اور مداحی اس دینی ہوئی چنگاری کو اور بھی ابھار دیتی ہے امر اور سلاطین کو اسی نے تباہ کر دیا۔ آنحضرت ﷺ کو خود مدح سے نفرت تھی اور لوگوں کو بھی اس سے منع فرماتے تھے، چنانچہ ایک آدمی نہایت مبالغہ آمیز طور پر ایک شخص کی مدح کر رہا تھا۔ آپ ﷺ نے دیکھا تو فرمایا۔ ”تم نے اسے ہلاک کر دیا۔“

عیش پرستی بظاہر تمدن کا زیور ہے، لیکن درحقیقت اس کے اندرونی نظام کا اصلی گھن یہی چیز ہے۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ آپ ﷺ تمام لوگوں کو اسی سادگی کی تعلیم دیتے تھے اور جب کبھی کوئی چیز اس کے خلاف نظر سے گزرتی تو اس سے بیزاری ظاہر فرماتے تھے۔

ضرورت سے زائد عمارت

ایک مرتبہ آپ ﷺ راستے سے گذرے تو ایک بلند عمارت نظر آئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کس کا مکان ہے؟ لوگوں نے ایک انصاری کا نام لیا۔ آپ ﷺ خاموش ہو گئے، لیکن دل میں بات رکھ لی۔ وہ انصاری آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کیا۔ آپ ﷺ نے منہ پھیر لیا۔ انہوں نے اپنے دوستوں سے آنحضرت ﷺ کی ناراضگی کا سبب پوچھا تو لوگوں نے واقعہ بیان کیا۔ وہ فوراً گئے اور اس مکان کو مہندم کر دیا۔ آپ ﷺ دوسری بار اس طرف سے گزرے تو فرمایا کہ وہ عمارت کیا ہو گئی: لوگوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ صاحب خانہ نے آپ ﷺ کی ناراضگی کے خوف سے اس کو گرادیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہر وہ گھر جو ضرورت سے زائد ہو، صاحب خانہ پر وبال ہے۔^②

آرائشی پردے

ایک مرتبہ آپ ﷺ کسی لڑائی سے واپس آئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے شوق و محبت کے ساتھ گھر کو ایک نہایت رنگین پردے سے سجایا۔ آپ ﷺ تشریف لائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سلام کیا، لیکن آپ ﷺ کے چہرے سے ناراضگی کے آثار ظاہر ہوئے اور سلام کا جواب تک نہ دیا۔

① ابوداؤد ص: ۳۳۸ جلد: ۲ (باب فی حق الملوك)

② بخاری جز: ۳ ص: ۱۷۷

③ ابوداؤد جلد: ۲ ص: ۵۶ (کتاب الادب، باب ما حبا فی النہا)

پھر خود دست مبارک سے پردے کے دو ٹکڑے کر دیے اور فرمایا کہ خدا نے ہمیں مٹی اور پتھر کو آراستہ کرنے کا حکم نہیں دیا۔^① حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بھی اس قسم کے مواقع پیش آئے ہیں۔

عفت و عصمت

اسلام پاکبازی اور عفت کی تعلیم دینے کے لیے آیا تھا:

وَالَّذِينَ هُمْ لِغُفْوِ جِهَتِهِمْ حَفَظُونَ ﴿٥﴾ (المومنون-۵)

”کامیاب مسلمان وہ ہیں جو عفت اور پاکبازی ہیں۔“

اس بنا پر جب کبھی اس قسم کے مواقع پیش آتے تھے جن سے مسلمانوں کی اس خصوصیت پر حرف آسکتا تھا، تو آنحضرت ﷺ فوراً اس سے تعرض فرماتے تھے۔

حضرت فضل رضی اللہ عنہ بن عباس رضی اللہ عنہ نہایت وجہ آدمی تھے۔ زمانہ حج میں آنحضرت ﷺ نے انہیں اپنے ساتھ سوار کر لیا تھا۔ ایک خوش رو عورت آنحضرت ﷺ کی طرف فتویٰ پوچھنے کے لیے بڑھی۔ فضل رضی اللہ عنہ نے اس کو پر شوق نگاہوں سے دیکھا شروع کیا۔ آنحضرت ﷺ نے خود دست مبارک سے ان کی ٹھوڑی پکڑ کر منہ اس کی طرف سے پھیر دیا۔^②

ستر عورت کی تاکید

یورپ کو آج تہذیب و تمدن پر بڑا ناز ہے۔ اگرچہ یورپ کی اخلاقی حالت کے اصلی مناظر نہایت نفرت انگیز ہیں۔ بظاہر ہر انگریز کو ستر عورت کا خیال رہتا ہے اور کسی نے کسی انگریز کو راہ میں برہنہ تن بہت کم دیکھا ہو گا۔ لیکن اسلام کی تہذیب اس بارے میں صرف نمائش لباس آرائی ہی کو کافی نہیں سمجھتی۔ ایک بار آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو میدان میں برہنہ نہاتے ہوئے دیکھا، فوراً منبر پر تشریف لائے اور ایک عام خطبہ دیا:

”خدا صاحب حیا کو پسند کرتا ہے پس تم میں سے جو کوئی غسل کرے، چاہیے کہ پردہ ڈال لیا کرے۔“ آنحضرت ﷺ کو ستر عورت کا اس قدر خیال تھا کہ ایک مرتبہ مسور بن خرمہ نے ایک بھاری پتھر اٹھایا۔ اس حالت میں ان کا کپڑا گر گیا۔ آپ ﷺ نے فوراً ٹوکا کہ کپڑا اٹھاؤ۔ برہنہ نہ ہو۔^③ لیکن یورپ کی ستر پوشی کا یہ حال ہے کہ غسل خانوں، حماموں، بحری ساحلوں اور تیراکی کے حوضوں میں صدامتدین انسان برہنہ ہو کر ایک دوسرے کے سامنے نہاتے ہیں!

① ابوداؤد ص: ۲۱۶ جلد: ۲

② بخاری جز: ۸ ص: ۵۱

③ ابوداؤد جلد: ۲ ص: ۲۰۱

اصلاحِ شئون النساء

اس معاملے میں عورتوں کی حالت مختلف حیثیتوں سے قابلِ توجہ اور محتاجِ اصلاح تھی۔ عرب میں مثنوں کا ایک گروہ موجود تھا، جو علانیہ گھروں میں آتا جاتا تھا۔ ایک بار ایک مثن نے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے سامنے ایک عورت کے محاسن بلکل ایک مرد کی نظر و ذوق سے بیان کیے۔ آنحضرت ﷺ نے فوراً حکم دیا کہ یہ لوگ گھر میں نہ گھسنے پائیں۔^①

عرب کی عورتوں میں جو بد اخلاقیات پھیل گئی تھیں ان میں ایک بد اخلاقی یہ بھی تھی کہ بعض عورتیں مردوں کی وضع اختیار کرتی تھیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان پر عموماً لعنت بھیجی ہے۔ جب کبھی کسی عورت کی وضع کو مردوں سے بلا قصد بھی مشابہت ہو جاتی تو آپ ﷺ فوراً ٹوک دیتے۔ ایک مرتبہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا دوپٹہ اوڑھ رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے دیکھا تو فرمایا:

لعلہ لالبیتین ”ایک تہہ کر کے اوڑھو، دو تہہ نہ کرو۔“

کیونکہ دو تہہ کرنے سے عمامہ کے ساتھ مشابہت پیدا ہو جاتی، جو مردوں کی خاص وضع ہے۔ آپ ﷺ کو اس پر اس قدر اصرار تھا کہ ایک عورت نے پردے سے آپ ﷺ کو ایک خط دینا چاہا۔ اس کے ہاتھوں میں مہندی نہ تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ مرد کا ہاتھ ہے یا عورت کا؟“ اس نے کہا ”میں عورت ہوں۔“ فرمایا: ”اگر تم عورت ہو تو مہندی لگاؤ۔“

غیر محتاط لباس کی ممانعت

اکثر عورتیں نہایت غیر محتاط لباس پہنتی تھیں۔ اس کے متعلق قرآن حکیم میں آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ خود آنحضرت ﷺ جب کبھی اس قسم کی بے احتیاطی ملاحظہ فرماتے تھے تو فوراً ٹوک دیتے تھے۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پاس ایک کپڑا پہن کے آئیں تو آپ ﷺ نے منہ پھیر لیا پھر فرمایا: ”عورت بلوغ کے بعد صرف منہ اور ہاتھ کھلا رکھ سکتی ہے۔“^②

عورتیں عموماً راستوں میں مردوں کے دوش بدوش چلتی تھیں۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ مسجد سے نکلے تو دیکھا کہ مرد عورت دونوں ساتھ ساتھ راہ میں چل رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ”تم کو درمیان راہ چلنے کا کوئی حق حاصل نہیں، راستے کے کنارے چلنا چاہیے۔“ اس کے بعد سے عورتیں دیواروں سے لگ کر چلنے لگیں۔

اس قسم کے بیسیوں واقعات کتب حدیث میں مذکور ہیں۔

① مسلم جلد ۲: ص ۲۴۳

② ابوداؤد جلد ۲: ص ۲۱۱

اصلاحِ ذاتِ البین

اسلام نے مسلمانوں پر سب سے بڑا احسان الہی یہ بتایا ہے:

فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (آل عمران: ۱۰۳)

”خدا نے تم کو باہم دشمنی کے بعد بھائی بھائی بنا دیا۔“

لیکن باہمی اختلاف و تنازع سے یہ رشتہ اخوت ٹوٹ سکتا تھا۔ اس لیے آنحضرت ﷺ کے فرائض احتساب میں سب سے اہم فرض رفعِ نزاع تھا۔ چنانچہ جب کبھی آپ ﷺ کو کسی شرف و فسادِ خانگی کی خبر ملتی تو آپ ﷺ جاتے اور اصلاح فرماتے۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ کو خبر ملی کہ قبیلہ بنی عمرو بن عوف میں باہم کچھ ناچاقی پیدا ہو گئی ہے۔ آپ ﷺ چند صحابہ کے ساتھ تشریف لے گئے اور معاملے کے سلجھانے میں اس قدر دیر لگی کہ نماز کا وقت آگیا۔ چنانچہ حضرت بلالؓ کے درخواست کرنے پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی۔^①

عبداللہ بن ابی بن سلول ایک بار نہایت گستاخانہ پیش آیا۔ یہاں تک کہ صحابہ سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ لڑنے بھڑنے پر تیار ہو گئے، اس پر عبداللہ بن ابی کے حامی بھی اٹھے اور فریقین باہم دست و گریبان ہو گئے، لیکن آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو سمجھا بھجا کر الگ کیا اور فرمایا کہ ”صلح فساد سے بہتر ہے۔“^②

واقعہ اٹک کے متعلق خود مسلمانوں کے دو قبیلوں اوس و خزرج میں سخت نزاع قائم ہو گئی اور دونوں فریق آمادہ جنگ ہو گئے لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کو سمجھا بھجا کر ٹھنڈا کیا۔

مراعاتِ ادب

آنحضرت ﷺ کو بڑوں کے ادب و تعظیم کا نہایت خیال رہتا تھا۔ معمولی باتوں پر بھی گرفت کرتے تھے۔ ایک موقع پر جب حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مسعود کے چھوٹے بیٹے نے گفتگو میں ساقبت کرنی چاہی تو آپ ﷺ نے فوراً ٹوک دیا:

الکبد الکبد ”یعنی پہلے بڑے کو بولنے دو۔“^③

اخلاقی احکام

کچھ یہ ہے کہ اخلاقی احکام کا تعلق جہاں تک تعلیم محض سے ہے، وہ کوئی ایسی متاعِ غریب

① ابوداؤد جلد ۲: ص ۲۱۸

② ابوداؤد جلد ۲: ص ۲۱۱

③ ابوداؤد جلد ۲: ص ۳۶۰

نہیں جس کے پیش کرنے پر اسلام فخر کرے۔ اخلاقی احکام ہمیں ہر جگہ مل سکتے ہیں اور قریباً ہر مذہب نے اپنا مقصد یہی بتلایا ہے کہ انسان کو اخلاق کا وعظ سنائے۔ اگر قرآن حکیم تعلیم دیتا ہے کہ عہد و موافق کی پابندی کرو تو قوانین موسوی اور ضابطہ ناصری بھی یہ نہیں کہتا کہ عہد باندھ کر توڑ ڈالو۔ حتیٰ کہ آریائی نسل کی وہ فلسفیانہ روحانیت بھی جس نے ہندوستان اور ایران میں ظہور کیا، اپنی ہر ادنیٰ سے ادنیٰ شاخ کے اندر اخلاقی تعلیمات و احکام سے لبریز ہے۔

پس اصلی چیز تعلیم نہیں بلکہ تعلیم کے نتائج اور اس کا عمل ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کریم نے جو کچھ کہا، اس نے عملی شکل میں کیسی صورت اختیار کی؟ انسان کی روح اس لیے بیمار نہیں کہ زبانوں نے تعلیم کم کردی اور کاغذوں پر زیادہ نہیں لکھا گیا بلکہ اس کا اصل ڈھک زندگی کی عملی مشکلات میں ہے اور صرف وہی تعلیم فہمید ہو سکتی ہے، جو ایک مستحکم عملی نمونہ اپنے ساتھ رکھتی ہو۔

عملی حقیقت کے لحاظ سے اولین نمونہ حامل قرآن و اولین داعی اسلام (ﷺ) کا ہے :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب-۲۱)

یہاں ہم صرف اسی حیثیت سے اسلامی موافق و عہد پر نظر ڈالیں گے۔

جنگ و صلح کی متضاد حالتیں

جنگ و صلح کی متضاد حالتوں میں انسان کا نظام اخلاق دفعہ بدل جاتا ہے۔ ایک شخص بہ ذات خود نہایت رحم دل ہے لیکن میدان جنگ میں جا کر نہایت بے رحم ہو جاتا ہے۔ ایک شخص ذاتی معاملات میں نہایت حلیم الطبع ہے، لیکن کسی فوج میں شامل ہو کر سخت مشتعل اور مغلوب الغضب ہو جاتا ہے۔ ایک شخص امن و صلح کے زمانے میں نہایت صادق العقول اور پابند عہد ہے، لیکن زمانہ جنگ میں اتنا ہی خراہ اور عہد شکن بن جاتا ہے۔ ایک جماعت، ایک قوم، ایک ملک، امن و سکون کے دور میں انسانیت کا بہتر سے بہتر نمونہ ہوتا ہے لیکن جنگی اغراض، طامعانہ اقدامات اور حربی مصالح کے عہد فساد میں آکر چار پایوں سے زیادہ وحشی اور درندوں سے زیادہ خونخوار ہو جاتا ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۖ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ﴿۱﴾ اسی بنا پر بعض حکماء کا قول ہے کہ ”سیاست اپنے پہلو میں دل نہیں رکھتی“۔

لیکن دنیا میں صرف ”اسلام“ ہی ایک ایسی زندہ ہستی ہے جو اپنے پہلو میں دل اور دل میں ایک غیر ممکن التعمیر اخلاقی طاقت رکھتی ہے۔ اس پر عوارض خارجیہ کا کوئی اثر نہیں پڑتا، ظاہر و باطن، شخصیت و جمہوریت، افتراق و اجتماع، جنگ و صلح، اس کے لیے تمام حالتیں یکساں ہیں۔ اس کا معیار اخلاق جس طرح

۱ بلاشبہ ہم نے انسان کو بہترین حالت عدل پر پیدا کیا، پھر اسے بد سے بدتر حالت میں پھینک دیا۔ (التین: ۵-۳)

امن و صلح کی حالت میں قائم رہا، اسی استحکام و استواری کے ساتھ جنگ کے سیلاب اور آتش و خون کے طوفان میں بھی قائم و ثابت نظر آیا۔

رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ

پیغمبر اسلام (ﷺ) کی زندگی اعمال انسانیت کی ہر شاخ پر حاوی تھی۔ اس میں حق و صداقت کے آغاز کی غربت و مظلومی بھی تھی اور تمام کی فتح مندی و کامرانی کا جاہ و جلال اور سطوت و جبروت بھی تھا۔ انہوں نے امن و صلح کے ایام بھی کاٹے اور امن و صلح کے لیے جنگ کی تلوار باندھنے کا حکم بھی دیا۔ اس لیے عہد و میثاق اور ان کے نتائج و عواقب کے واقعات عہد نبوت کی تاریخ میں بے شمار نظر آتے ہیں اور ان کے اندر اخلاق قرآنی کی عملی صورت دیکھی جاسکتی ہے۔

ظالم دشمنوں سے سلوک

سب سے پہلی چیز اس سلسلے میں وہ اخلاقی سلوک ہے جو آنحضرت (ﷺ) نے غیر قوموں اور حریفان جنگ سے کیا۔ ان قوموں نے معاہدوں کو اکثر توڑا ہے اور نہایت شرمناک طریقے سے غداریاں کی ہیں۔

رعل، ذکوان، غصیہ اور بنو لحيان کے قبائل نے آنحضرت (ﷺ) سے کسی دشمن کے مقابلے کے لیے فوجی مدد کی درخواست کی۔ ۱ آنحضرت (ﷺ) نے قراء صحابہ میں سے ستر صحابی ساتھ کر دیے لیکن بڑے نمونہ پر لے جا کر ان لوگوں نے یوفائی کی اور مسلمانوں کو بے دریغ قتل کر دیا۔ جب حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کی فوج کو قبیلہ بنو لحيان کے دوسو تیر اندازوں نے گھیر لیا تو ان سے وعدہ کیا کہ اگر وہ نیچے اتر آئیں تو کچھ تعرض نہیں کیا جائے گا۔ اس پر ایک جماعت اتر آئی، لیکن بعض صحابہ کو اسی جگہ قتل کر دیا گیا اور بعض کو غلام بنا کر بیچ ڈالا گیا۔ ۲

ذاتی وفائے عہد

بہ ایں ہمہ غدروہ و وفائی، آنحضرت (ﷺ) کا جو معیار اخلاق شخصی حالتوں میں تھا، وہی میدان

۱ واقعہ یوں ہے کہ قبیلہ کلاب کے رئیس نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی تھی کہ چند لوگ میرے ساتھ کر دیجئے جو میری قوم کو اسلام کی دعوت دیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں مجھ کی طرف سے مطمئن نہیں۔ رئیس کلاب نے مجھ کی طرف سے ذمہ داری اٹھالی اور رسول اللہ ﷺ نے صحابی بھیج دیے۔ رئیس کلاب نے بڑے نمونہ بیچ کر غداری کی۔ اس پاس کے قبائل مثلاً رعل، غصیہ، ذکوان کے پاس آدمی دوڑائے کہ تیار ہو کر آؤ۔ یہ واقعہ رجب ہے جس میں عصل اور قارہ کے قبیلوں نے تعلیم اسلام کی غرض سے چند آدمی طلب کیے تھے اور اس آدمی بھیجے گئے تھے جن کا رئیس حضرت عاصم بن ثابت کو مقرر کیا گیا۔ ان قبیلوں نے بھی غداری کی۔

جنگ میں بھی قائم رہا۔ شخصی حالت میں آپ ﷺ کے وفائے عہد کا یہ حال تھا:

عن عبد الله بن ابی الحساء قال بايعت النبی ﷺ قبل ان یبعث، و بقیت له بقیة فوعدته ان یتیه بهانی مکانه ففسیت فذکرت بعد ثلاث فجئت، فاذا هنی مکانه، فقال یافقی لقد شققت علی انا ههنا منذ ثلاث انتظرک۔^①

”عبد اللہ بن حساء کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے ہاتھ ان کے مبعوث ہونے سے پہلے میں نے ایک چیز فروخت کی، جس کا کچھ حصہ آپ ﷺ کے حوالے نہیں کیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ آپ ﷺ ٹھہریے۔ میں اسی جگہ لے کے آتا ہوں مگر میں گھر جا کر بھول گیا اور تین دن کے بعد اپنا وعدہ یاد آیا، پلٹ کے آیا تو دیکھا کہ آپ ﷺ اسی جگہ ہیں۔ آپ ﷺ نے مجھے دیکھ کر فرمایا کہ تم نے مجھے بڑی تکلیف دی۔ میں تین دن سے اسی جگہ تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

مجاہدین کو وصیت

جہاد اسلامی کی وسعت نے آپ ﷺ کی اخلاقی طاقت کو اور بھی مستحکم و استوار کر دیا۔ آنحضرت ﷺ کا معمول تھا کہ جب مجاہدین جہاد کے لیے روانہ ہوتے تو آپ ﷺ ان کو مخاطب کر کے ایک عام وصیت فرماتے جو متعدد اخلاقی ہدایات کا مجموعہ ہوتی تھی۔ انھی ہدایات میں ایک حکم پابندی عہد کا بھی تھا:

کان رسول اللہ ﷺ اذا امر امیرا علی جیش اوسریة اوصاه خاصة بتقوی الله عزوجل ومن معه من المسلمین خیدا، ثم قال اغزوا باسم الله فی سبیل الله قاتلوا من کفر بالله اغزوا ولا تغلوا ولا تغدروا ولا تشلوا ولا تقتلوا ولیدوا۔^②

”آنحضرت ﷺ جب کسی شخص کو کسی فوج کا سپہ سالار مقرر فرماتے اسے خدا سے ڈرنے اور مسلمانوں کے ساتھ بھلائی کرنے کی وصیت کرتے۔ پھر فرماتے کہ خدا کی راہ میں خدا کا نام لے کر لڑو! جن لوگوں نے خدا کا انکار کیا ہے ان سے جہاد کرو لیکن مال غنیمت میں کسی قسم کی خیانت نہ کرنا، عہد کی پابندی کرو، بیوفائی نہ کرو، کسی کے ہاتھ، پاؤں، کان، ناک نہ کاٹو! بچوں کو قتل نہ کرو۔“

مجاہدین عموماً ان احکام پر عمل کرتے تھے اور یہی اخلاقی ہدایت تھی جو ان کو ہر قسم کے بے اعتدالانہ جنگی افعال سے روکتی تھی۔

① (ابوداؤد جلد ۲: صفحہ ۳۲۶ کتاب الادب)

② (صحیح مسلم جلد ۲: ص ۶۲ کتاب الجہاد)

حضرت خُصیب رضی اللہ عنہ کا واقعہ

لیکن ان ہدایات میں پابندی عہد پر مسلمانوں نے جس شدت کے ساتھ عمل کیا، اس کی نظیر دنیا کی اخلاقی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ حضرت خُصیب رضی اللہ عنہ اور ابن دہشہ کو قبیلہ بنی لُحیان نے امان دے کر پہاڑ سے اتروایا،^① پھر بد عہدی کی اور انہیں غلام بنا کر بیچ ڈالا، عام طور پر جب نقص عہد میں ایک فریق کی طرف سے پیش قدمی کی جاتی ہے تو دوسرا فریق ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور تمام معاہدوں کو توڑ سکتا ہے۔ اس لیے خُصیب رضی اللہ عنہ اگر اس وقت ان ہدایات کی پابندی نہ کرتے تو وہ معذور سمجھے جاسکتے تھے، لیکن آنحضرت ﷺ کے احکام جبری احکام نہیں ہوتے تھے بلکہ آپ ﷺ کا روحانی اثر ان کو مجاہدین کے رگ و پے میں ساری کر دیتا تھا۔ جب خُصیب رضی اللہ عنہ کو حارث بن عامر نے خرید لیا اور حرم کے باہر قتل کرنا چاہا تو انہوں نے حارث کی لڑکی سے استرا طلب کیا۔

لڑکی نے استرا ان کے ہاتھ میں دینا چاہا تو حضرت خُصیب رضی اللہ عنہ نے اسے گود میں بٹھالیا۔ اتفاقاً بچی کی ماں آگئی ڈری کہ جو شخص جان سے ہاتھ دھو چکا ہے اسے کسی کی جان پر حملہ کرنے میں کیا تامل ہو سکتا ہے؟ حضرت خُصیب رضی اللہ عنہ جان سے ہاتھ دھو چکے تھے اور ہاتھ میں ایک ہتھیار (استرا) بھی تھا لیکن آنحضرت ﷺ نے بچوں کے قتل نہ کرنے کا جو عہد ان سے لے لیا تھا، وہ انہیں جان سے بھی زیادہ عزیز تھا چنانچہ ماں کی سرانسی دیکھ کر اس سے کہا: کیا تم کو ڈر ہے کہ میں اس بچی کو قتل کر دوں گا! نہیں، تم ایسا نہ سمجھو۔ میں ایک بچے کا خون اپنی گردن پر نہیں لے سکتا۔^②

ان اخلاقی احکام سے زیادہ خود آنحضرت ﷺ کے طرزِ عمل نے صحابہ کرام کو پابندی عہد کی تعلیم دی تھی۔ یہود خیبر نے آنحضرت ﷺ کو زہر دے دیا، لیکن آپ ﷺ نے کسی قسم کا انتقام نہ لیا۔ آنحضرت ﷺ پر یہودیوں نے جادو کیا، لیکن آپ ﷺ نے معاہدے کی بنا پر انہیں معاف کر دیا۔

حدیبیہ کے بعد کا ایک واقعہ

آنحضرت ﷺ نے جب کفار مکہ سے بمقام حدیبیہ صلح کر لی تو صلح کے بعد مسلمانوں اور کافروں میں باہم میل جول ہو گیا۔ حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

میں اس حالت اطمینان میں ایک درخت کے نیچے جا کر لیٹ گیا۔ اتفاق سے میرے پاس چار مشرک آگئے اور آنحضرت ﷺ کی مذمت کرنے لگے۔ میں آپ ﷺ کی ہجو نہ سن سکا اور اٹھ

① یہ واقعہ رجب کا ایک حصہ ہے۔ رجب عصفان اور مکہ کرمہ کے وسط میں ایک مقام ہے۔

② بخاری جلد ۵: ۵

کردوسرے درخت کے سايے ميں چلا گيا۔ وہ سب درخت کی شاخ ميں ہتھيار لٹکا کر ليٹ گئے، اس حالت ميں دفعۂ غل ہوا کہ ابن زبیم قتل کر ديا گيا۔ ميں نے تلوار ميان سے کھینچ لی اور انہی چاروں پر حالت خواب ميں حملہ کیا پہلے ان کے ہتھياروں پر اچھی طرح قبضہ کر ليا پھر ان سے کہا کہ اس ذات کی قسم جس نے محمد ﷺ کو برگزیدہ کیا ہے تم ميں سے جو شخص سر اٹھائے گا اس کی گردن اڑا دوں گا۔ پھر ایک طرف سے ميں ان چاروں کو اور دوسری طرف سے ميرے چچا عامر ایک دوسرے کافر کو جس کا نام مکرز تھا، گھسیٹتے ہوئے آنحضرت ﷺ کے پاس لائے، ليکن آنحضرت ﷺ نے انہیں بالکل معاف کر ديا اور فرمایا: انہیں چھوڑ دو، برائی کی ابتدا انہی کی طرف سے ہونی چاہیے۔^۱

اگر آنحضرت ﷺ انہیں قتل کر دیتے تو در حقيقت اس بد عہدی کے ذمہ دار خود وہی لوگ ہوتے، ليکن آپ ﷺ نے نقض عہد کی اس ظاہری شکل کو بھی گوارا نہ کیا، جو ان کے اقدام قتل سے پيدا ہوتی تھی۔

احکام شریعت کے تین درجے

اسلام نے احکام شریعت کے تین درجے قرار دیے ہیں:

الحلال بینہ والحرام بینہ وما بینہما مشتبہات۔ (الحديث)

”حلال بھی کھلا ہوا ہے اور حرام بھی، البتہ ان کے درميان چند مراتب ایسے ہیں جو حلت و حرمت دونوں کا احتمال رکھتے ہیں۔“

یہی مشتبہات در حقيقت زہد و تقویٰ کی آزمائش ہیں۔ ایک خدا ترس شخص ایک کھلی ہوئی نیکی پر عمل کر سکتا ہے، ایک فریبی دکھلاوے کے لیے کسی صریح برائی سے اجتناب کر سکتا ہے، ليکن نیتوں کا کھٹ وہاں نہیں چھپ سکتا جہاں حلال و حرام کے نہایت نازک درمیانی مقامات ہیں۔ تمام جبکہ شرعی انہی کے محور پر گردش کرتے ہیں۔

ذاتی انتقام کبھی نہ لیا

آنحضرت ﷺ زہر دینے والے اور سحر کرنے والے یہودیوں کو قتل کر سکتے تھے۔ آپ ﷺ ان کفار سے بھی انتقام لے سکتے تھے جنہوں نے صلح حدیبیہ کے بعد جو غیبت بلکہ کُشت و خون کی طرف قدم بڑھایا۔ بہ ایں ہمہ آپ ﷺ نے انہیں معاف کر دیا، کیونکہ ان بد عہدیوں پر اشتباہ کے متعدد پردے پڑے ہوئے تھے۔ ان سے ذاتی انتقام کی بُو آتی تھی اور خلق عظیم کے تمام

ابواب اخلاق ميں سب سے زیادہ نمایاں باب یہ ہے کہ:

لَمْ يَنْتَقِمْ لِنَفْسِهِ۔ (صحیحین) ”آپ نے کبھی اپنی ذات کے لیے کسی سے بدلہ نہ لیا۔“
ایسا کرنے سے اگرچہ حقیقی طور پر نقض عہد نہیں ہو سکتا تھا، تاہم ظاہر نقض عہد کا شبہ پیدا ہو سکتا تھا۔ اسلام اپنے دامن پر اس قسم کا ظاہری دھبہ بھی نہیں دیکھ سکتا!

صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اتباع

آپ ﷺ کے طرز عمل نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لیے بھی پابندی عہد کا ایک بلند ترین معیار قائم کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے زمانے ميں ہمیشہ اسے قائم رکھا۔

عہد صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ميں جب کبھی نقض عہد کا ظاہری احتمال بھی پیدا ہوا تو لوگوں نے علانیہ اس کا انکار کیا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے رومیوں سے ایک مدت کے لیے معاہدہ صلح کر لیا تھا۔ وہ اگرچہ نقض عہد کرنا نہیں چاہتے تھے، تاہم انہوں نے زمانہ صلح ہی ميں رومیوں سے لڑنے کے لیے تیاریاں شروع کر دیں اور فوج لے کر ان کی طرف بڑھے کہ مدت صلح گزر جانے کے ساتھ ہی جنگ شروع کر دیں گے۔ اسی حالت سفر ميں ایک شخص گھوڑا دوڑاتا ہوا پہنچا اور کہا: اللہ اکبر! اللہ اکبر! کیا یہ بد عہدی تمہارے شایان شان ہے؟ تم کو وفاے عہد کرنا چاہئے۔ لوگوں نے تعجب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ عمر رضی اللہ عنہ بن عتبہ ہیں۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو خبر ہوئی تو بلا بھیجا اور ان سے گفتگو کی۔ انہوں نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے:

مَنْ كَانَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ قَوْمٍ عَهْدٌ فَلَا يَشُدُّ عَقْدَهُ وَلَا يَحْلِلُهَا حَتَّى يَنْقُضَ أَحَدُهُمَا أَوْ يَنْهَى إِلَيْهِمْ عُلَى سِوَاءِ۔
”اگر کوئی شخص کسی قوم سے معاہدہ کرے تو اس معاہدے کی گرہ نہ باندھے اور نہ کھولے (یعنی اس سے کسی قسم کا تعرض نہ کرے اور اسے اپنے حال پر قائم رہنے دے، یہاں تک کہ معاہدہ صلح کی پوری مدت گزر جائے یا یا بھی معاہدہ کے توڑنے کا عام اعلان کر دیا جائے۔“

چنانچہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ راستے ہی سے لوٹ آئے (ابوداؤد)

پابندی عہد کا کمال

سلطنتوں ميں باہم معاہدے ہوتے ہیں اور وہ قائم بھی رکھے جاتے ہیں، ليکن کوئی سلطنت اپنے معمولی مقاصد کی کامیابی کو بھی عہد وفا کی اخلاقی پابندی پر قربان نہیں کر سکی۔ یورپ کا موجودہ اخلاق اس کے لیے کافی شہادت ہے۔ اٹلی نے اپنے عالم آشکار عہد کو چند لمحوں کے اندر فراموش کر دیا^۱ اور جرمنی پیرس کی طرف بڑھنے کو اس قدر ضروری سمجھتا ہے کہ اس کے سامنے تسلیم کی نا

• مطلب یہ کہ اٹلی کا معاہدہ جرمنی اور آسٹریا سے تھا مگر پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) ميں وہ اپنے طیفوں کو چھوڑ کر برطانیہ و فرانس سے مل گیا۔

طرفداری کوئی شے نہیں۔^۱ اسلام کا مقصد پیرس کے قلعوں کی برجیوں سے زیادہ بلند تھا، لیکن اس نے پابندی عہد پر اپنے عظیم الشان مقصد کو بارہا قربان کر دیا ہے۔ اسلام کا مقصد حقیقی اشاعت حق تھا، اسی کے لیے وہ لڑتا تھا، اسی کے لیے صلح کرتا تھا، اسی کے لیے معاہدہ کرتا تھا، یہ مقصد کبھی کبھی بغیر کسی قسم کی جدوجہد کے بھی حاصل ہو جاتا تھا اور تلوار کی جگہ صرف داعی اسلام کی روحانی طاقت ہی اس میدان کو فتح کر لیتی تھی، لیکن آنحضرت ﷺ نے ایسے اعلیٰ مقصد کو بھی، جو نہایت آسانی سے حاصل ہو سکتا تھا، معاہدے کی اخلاقی پابندی پر ترجیح نہ دی۔ قریش نے ایک شخص کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں قاصد بنا کر بھیجا۔ وہ آپ ﷺ کی صورت مبارک دیکھتے ہی اسلام کی طرف مائل ہو گیا اور بے اختیار پکار اٹھا ”اب اس چوکت کو چھوڑ کر قیامت تک نہ جاؤں گا“ لیکن چونکہ قاصدوں کے ساتھ کسی قسم کا تعرض نہیں کیا جاتا اور ان کے ساتھ ایک خاص معاہدے کی پابندی لازمی ہے اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا: میں عہد شکنی نہیں کر سکتا۔ تم سر دست تو واپس جاؤ۔ اگر تمہارے دل میں اسلام کی محبت ہے تو پھر واپس آ سکتے ہو۔ وہ پیغام لے کر گیا، پھر پلٹ کر آیا اور اسلام لایا۔ (ابوداؤد)

صلح حدیبیہ

مشرکین نے صلح حدیبیہ میں جو شرطیں پیش کی تھیں، ان میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ ”کفار مکہ میں سے جو شخص مسلمان ہو کر مدینہ بھاگ جائے گا، اسے مسلمان واپس کر دیں گے۔“ اس شرط پر باہم سخت اختلاف ہوا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ ایک مسلمان کو کیونکر کفار کے حوالے کیا جاسکتا ہے؟ ابھی اس شرط کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ ابو جندل رضی اللہ عنہ ابن سہیل بیڑیاں گھسیٹتے ہوئے مکہ تک پہنچے اور اپنے آپ کو مسلمانوں کے پاؤں پر ڈال دیا۔ ابو جندل رضی اللہ عنہ کا باپ سہیل تھا اور وہی اس وقت قریش کی طرف سے معاہدے کے لیے آیا تھا۔ سہیل نے کہا کہ میں اپنے بیٹے کی واپسی پر صلح کروں گا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ابھی تک معاہدہ صلح مکمل نہیں ہوا۔ اس لیے اس کی پابندی ہمارے لیے ضروری نہیں، مگر اس نے کہا کہ اس کے سوا کسی دوسری بات پر صلح ناممکن ہے۔ آپ ﷺ نے مکرر اصرار کیا کہ کم از کم ابو جندل رضی اللہ عنہ کو تو اس شرط سے مستثنیٰ کر دو، مگر سہیل نے صاف انکار کر دیا۔ ابو جندل رضی اللہ عنہ نے تمام مسلمانوں سے نہایت درد انگیز لہجے میں کہا کہ ”مسلمانو! میں مسلمان ہو کر آیا ہوں۔ کیا اب پھر مشرکین کی طرف واپس کیا جاؤں گا؟ ان الفاظ نے صحابہ کے

۱۔ پہلی عالمی جنگ میں فرانس پر حملے کے لیے جرمنی کو تسلیم میں سے گزرنا مناسب معلوم ہوا اور اس نے تسلیم کی غیر جانبداری کی کوئی پروا نہ کی۔ دوسری عالمی جنگ میں بھی جرمنی نے تسلیم، ڈنمارک، ہالینڈ کی غیر جانبداری کو خس برابر بھی وقعت نہ دی۔ اتحادیوں کو ایران کے راستے روس سامان بھیجنا مناسب نظر آیا تو ایران کی غیر جانبداری ان کے لیے سدا رہا نہ ہوئی۔

مذہبی جذبات میں آگ لگا دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بے اختیار اٹھ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ کیا آپ پیغمبر خدا اور آپ کے ساتھی بر سر حق نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک حق پر ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پھر ہم کیوں اس قدر دب رہے ہیں اور ذلت گوارا کر رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے جواب دیا کہ اللہ کا حکم ایسا ہی ہے۔

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس سوال و جواب سے تسکین نہ ہوئی اور انہوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی قسم کی گفتگو کی۔ تاہم کچھ نتیجہ نہ نکلا اور آنحضرت ﷺ نے قریش کی تمام شرطیں منظور کر کے صلح نامہ مرتب کر دیا اور دستخط ہو گئے۔

ابو بصیر رضی اللہ عنہ کا واقعہ

اس کے بعد جب آنحضرت ﷺ مدینہ کو روانہ ہوئے تو ساتھ ساتھ ابو بصیر^۱ بھی مسلمان ہو کر مکہ سے نکل آئے۔ قریش نے انکی جستجو میں دو آدمی بھیجے اور شرائط صلح یاد دلانیں۔ آنحضرت ﷺ نے فوراً ابو بصیر رضی اللہ عنہ کو واپس کر دیا۔ وہ ان کو لے کر چلے تو مقام ذوالحلیفہ میں پہنچ کر کھجوریں نکالیں اور کھانے پینے میں مشغول ہوئے۔ ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر بلا تلافی لیل ان کے چھندے سے نکلنا چاہا۔ وہ کھجور کھانے میں مصروف تھے۔ ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کی تلوار کی طرف دیکھ کر کہا: کتنی اچھی تلوار ہے۔ اس نے داد پا کر تلوار کھینچ لی اور کہا بے شبہ، میں اس کا بارہا تجربہ کر چکا ہوں۔ ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے ہاتھ بڑھا کر دیکھنے کے بہانے لی لی اور سب سے پہلے اسی شخص کی گردن قلم کر دی۔ دوسرا شخص یہ حالت دیکھ کر بھاگا اور دوڑتا ہوا مدینہ پہنچا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کی پیشانی دیکھی تو فرمایا: اس پر کوئی مصیبت آگئی ہے۔ اس نے کہا: میرا ساتھی تو قتل کر دیا گیا ہے اور میں بھی قتل کے قریب پہنچ گیا تھا۔

ایک جمیعہ کی فراہمی

اسی حالت میں ابو بصیر رضی اللہ عنہ بھی پہنچے اور آنحضرت ﷺ سے عرض کی کہ ”آپ ﷺ نے اپنا عہد پورا کر کے مجھے واپس کر دیا۔ اب خدا نے مجھے نجات دی ہے، آپ ﷺ اس کے ذمہ دار نہیں۔“ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”یہ شخص تو لڑائی کا شعلہ معلوم ہوتا ہے۔“ ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ سے یہ نتیجہ نکالا کہ آپ ﷺ دوبارہ مجھے واپس کر دیں گے۔ چنانچہ وہ مدینہ سے بھاگ کر سمندر کے کنارے مقیم ہو گئے۔ ابو جندل رضی اللہ عنہ کو خبر ہوئی تو وہ بھی ان سے جا

۱۔ ان کا نام عتبہ بن اسید تھا۔

ملے، یہاں تک کہ قریش کا جو شخص مسلمان ہوتا تھا وہ بھاگ کر ابو بصیر رضی اللہ عنہ کے دامن میں پناہ لیتا تھا۔ رفتہ رفتہ ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے ایک اچھی خاصی جمیعت قائم کر لی اور قریش کے کاروان تجارت کو جو شام کی طرف جاتا تھا، عام طور پر لوٹنا شروع کر دیا۔ بالآخر قریش نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی اور آنحضرت ﷺ نے ابو بصیر رضی اللہ عنہ وغیرہ کو بلا لیا۔ (بخاری)

جنگ میں بھی عہد کی پابندی

عوماً زمانہ جنگ میں معاہدوں کی پابندی نہیں کی جاتی اور اشخاص کے باہمی معاہدے تو صلح کی حالت میں بھی کوئی جمہوری وقعت نہیں رکھتے، لیکن اسلام کی جمہوریت اور شخصیت دونوں ایک ہی روحانی طاقت کے تابع تھیں۔ اس لیے زمانہ جنگ میں اشخاص کے مجبورانہ معاہدوں کو بھی نہایت مضبوطی کے ساتھ قائم رکھا جاتا تھا۔ حذیفہ بن یمان کا بیان ہے کہ ”میں غزوہ بدر میں صرف اس لیے نہیں شریک ہو سکا کہ میں اور ابو جندل رضی اللہ عنہ ساتھ چلے تو کفار قریش نے ہمیں گرفتار کر لیا اور کہا کہ تم محمد ﷺ کے پاس جاتے ہو۔ ہم دونوں نے کہا کہ نہیں، ہم صرف مدینہ کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے عدم شرکت جہاد کا معاہدہ لے کر ہمیں چھوڑ دیا۔ ہم آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شریک جہاد ہونا چاہا لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: تم لوگ مدینہ کو واپس جاؤ، ہم کفار کے معاہدوں کو پورا کرتے ہیں اور ان کے مقابلے میں صرف خدا سے مدد چاہتے ہیں۔“^۱

فراخ دلی اور فیاضی

ایفائے عہد کے متعلق سب سے بڑی بحث یہ ہے کہ کس کے ساتھ معاہدہ کرنا چاہیے اور کس کے ساتھ قائم رکھنا چاہیے؟ یونان کے مقنن اعظم سولن نے اس کا نہایت مختصر جواب دیا ہے اور وہی تمام دنیا کے سیاسیات کی روح ہے یعنی ”معاہدہ کمزری کا جالا ہے، جو اپنے سے کمزور کو تو اُلجھا لیتا ہے اور اپنے سے قوی کے مقابلے میں ٹوٹ جاتا ہے۔“ لیکن اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے، جس کے اخلاقی معاہدوں نے سولن کے اس تار عنکبوت کو توڑ دیا۔ اسلام ضعیفوں کے ساتھ فیاضانہ معاہدہ کرتا ہے اور اسے نہایت مضبوطی کے ساتھ قائم رکھتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے کفار قریش سے بہ مقام حدیبیہ جو صلح کی تھی، وہ بظاہر نہایت عاجزانہ و مجبورانہ صلح معلوم ہوتی ہے۔ خود صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کا احساس کیا تھا اور آپ ﷺ نے بھی نہایت صراحت کے ساتھ فرمایا تھا:

لایسألون خطة یعظون فیہا حرمات اللہ الا اعطیتهم۔

”میرے سامنے وہ جو شرط پیش کریں گے میں اسے قبول کر لوں گا، بشرطیکہ اس سے شعائر الہی کی توہین نہ ہو۔“^۱

چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے گوہر مقصود یعنی ان مسلمانوں کو جو نور ایمان سے لبریز ہو کر آتے تھے، واپس کرنے کا عہد کر لیا۔ آنحضرت ﷺ نے صلح نامہ پر ”بسم اللہ“ لکھنا چاہا۔ کفار نے اس سے انکار کیا، لیکن آپ ﷺ نے باوجود صحابہ رضی اللہ عنہم کے اصرار کے کفار کی خواہش پوری کر دی اور ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ کی جگہ ”باسمک اللہم“ لکھا۔ آپ ﷺ نے اپنے نام کے ساتھ ”رسول اللہ“ لکھنا چاہا۔ کفار نے کہا: اگر ہم آپ ﷺ کو رسول اللہ مانتے تو یہ جھگڑا ہی کیوں ہوتا؟ صرف محمد بن عبد اللہ لکھیے۔“ معاہدہ پر رسول اللہ کا لفظ لکھا جا چکا تھا لیکن آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ”اسے مٹا دو“ ان کے جوش ایمان نے اسے گوارا نہ کیا تو آپ ﷺ نے خود مٹا دیا۔ اس سے زیادہ کمزوری اور کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن کیا درحقیقت آپ ﷺ مجبور تھے؟ کیا قریش کی عظیم الشان طاقت نے آپ ﷺ کو بالکل بے دست و پا کر دیا تھا؟

صلح دامن

تمام سلطنتیں نقض عہد کے لیے ضعف کا بہانہ ڈھونڈتی ہیں اور صلح تو ہمیشہ قوی ہی کے ساتھ کی جاتی ہے، لیکن اسلام کی امن پسندی نے ایک نہایت ضعیف گروہ کے مقابلے میں یہ فیاضانہ صلح کی اور اسے نہایت مضبوطی کے ساتھ قائم رکھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے خود فرمایا:

انام تجنی لقتال احد ولکننا جئنا معتبرین وان قریشا قد تهلکتم الحرب و اخرت بهم

فان شاؤا شاورتهم مدۃ۔

”ہم کسی سے لڑنے بھڑنے کے لیے نہیں آئے ہیں صرف عمرہ کے لیے آئے ہیں۔ قریش کو متواتر لڑائیوں نے چور چور کر دیا ہے اور ان کی طاقت کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ بہ ایس ہمہ وہ چاہیں تو ہم ایک مدت کے لیے ان سے صلح کر سکتے ہیں۔“

دنیوی سلطنتوں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ اس بہترین موقع سے کیا کام لیتیں؟ انعقاد صلح کا یا اشتعال جنگ کا؟ دنیا کی قدیم و جدید تاریخ اس کا نہایت آسانی کے ساتھ جواب دے سکتی ہے۔ اگر اس حالت میں کوئی سلطنت صلح بھی کرتی تو اس کا نتیجہ جنگ سے زیادہ درد انگیز ہوتا۔

• حقیقت یہ ہے کہ قریش لڑائیوں کے ذمہ دار تھے جو اسلام کو بہ جبر و قوت مٹانے کے درپے تھے۔ صلح حدیبیہ میں وہ جنگ سے دست بردار ہو رہے تھے۔ یہ اسلام کے لیے فتح مبین تھی۔ لہذا اس بنیادی اور اساسی فتح کے سلسلے میں ہر شرط قبول کی جاسکتی تھی۔ البتہ شعائر الہی کی حرمت کا لحاظ لازم تھا۔

اہل بخران سے معاہدہ

لیکن یہ جزئی طرز عمل صرف اختلافی حیثیت رکھتا تھا۔ اسلام کی وسعت ایک مستقل اور جامع ہدایت کی محتاج تھی، جو اس اخلاقی طرز عمل کے ساتھ اپنے اندر ایک قانونی طاقت بھی رکھتی تھی اور جب پچھلوں کی اخلاقی طاقت آنحضرت ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو بھلا دیتی تو وہ اپنی جزئی طاقت سے اس کو یاد دلاتی۔ آنحضرت ﷺ نے غیر قوموں کے ساتھ جو تحریری معاہدے کیے ہیں وہ بالکل قانونی اور سیاسی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس باب میں اسلام کا قانون کس قدر فیاضانہ تھا۔ آنحضرت ﷺ نے بخران کے عیسائیوں کے ساتھ جو معاہدہ کیا، اس کے الفاظ یہ ہیں:

علی اہل بخران الفی حلة النصف فی صغر والنصف فی رجب یردونہا الی المسلمین و عاریة ثلاثین درعا و ثلاثین بعیرا و ثلاثین من کل صنف من اصناف السلام یرغزون بہا و المسلمون ضامنون لہا حق یردوہا علیہم ان کان ہالیسن کید ذات غدر علی ان لا تہدم لہم بیعہ ولا یخرب لہم قس ولا یفتنوعن دینہم۔ (ابوداؤد جلد ۲: ص ۷۵)

”اہل بخران کو دو ہزار طے باقسط دینا پڑیں گے۔ ایک ہزار ماہ صفر میں اور ایک ہزار ماہ رجب میں اور ان کو تیس زرہیں، تیس گھوڑے، تیس اونٹ اور ہر قسم کے ہتھیار بطور عاریت کے بھی دینے ہوں گے۔ اگر یمن میں کوئی جنگ ہوگی تو وہ لوگ ان چیزوں کو واپس کر دیں گے اور اس معاہدہ کی بنا پر نہ تو ان کے گرجے گرائے جائیں گے، نہ ان کے کسی پادری کو جلا وطن کیا جائے گا اور نہ ان کے مذہب سے کوئی تعرض ہو گا۔“

اخلاقی نصاب

لیکن اسلام کا ہر قانون اپنے اندر اخلاقی روح بھی رکھتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اخلاقی نصاب سے اس کو اور بھی موثر بنادیا:

الامن ظلم معاہدا و اتقوا فوق طاقتہ او اخذ منہ شیئا بغیر طیب نفس فانا

حییجنتہ یوم القیامۃ۔ (ابوداؤد جلد ۲: ص ۷۷)

”خبردار، اگر کسی نے کسی غیر مذہب رعیت پر ظلم کیا، یا اس کی تنقیص کی یا اس کی کوئی چیز بہ جبر لے لی۔ اگر ایسا ہو تو میں اس کی طرف سے قیامت کے دن خدا کے سامنے جھگڑوں گا۔“

ایک قطبی کا واقعہ

صحابہ رضی اللہ عنہم نے آنحضرت ﷺ کے بعد اس فیاضانہ طرز عمل کو نہایت بے تعصبی کے ساتھ قائم رکھا چنانچہ ہشام ابن حکیم نے حمص کے عامل کو دیکھا کہ قبطیوں کو دھوپ میں بٹھا کر جزیہ

وصول کر رہا ہے۔ انہوں نے اسی وقت آنحضرت ﷺ کی یہ اخلاقی نصیحت یاد دلائی۔

ان الله یعذب الذین یعذبون الناس فی الدنیا۔

”خدا قیامت میں ان لوگوں کو عذاب دے گا جو دنیا میں انسانوں کو دکھ پہنچاتے ہیں۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وصیت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وفات کے وقت اسی اخلاقی قانون کی تجدید کی تھی:

واوصیت ہذمۃ اللہ وذمۃ رسولہ ﷺ ان یونی لہم لعنہم وان یقاتل من ورائہم

ولا یکلّفوا الا طاقتہم۔ (بخاری جلد ۴: ص ۶۹)

”میرے بعد جو خلیفہ ہو گا میں اس کو خدا اور خدا کے رسول ﷺ کے معاہدے کی حفاظت کے لیے وصیت کرتا ہوں، وہ وصیت یہ ہے کہ غیر مذہب رعایا سے جو معاہدہ کیا جائے وہ پورا کیا جائے۔ ان کی جان و مال کی حفاظت کے لیے لڑائی کی جائے اور ان پر اتنا ہی بوجھ ڈالا جائے جس کے وہ تحمل ہوں۔“

فاتح اور پیغمبر کا فرق

جہاد اسلامی کی حقیقت جن مقاصد پر مشتمل ہے، اس کے لحاظ سے وہ دنیوی لڑائیوں سے بالکل مختلف ہے اور یہ اختلاف اس قدر بدیہی ہے کہ ہم کو اس کی ظاہری شکل کے ایک ایک خط و خال کے اندر نمایاں طور پر نظر آسکتا ہے۔

ایک فاتح جب ملک گیری کے ارادہ سے میدان جنگ کا رخ کرتا ہے تو طبل و دھل کے غلغلے اور قرائد بوق کے ترانے خیر مقدم بجالاتے ہیں، سر پر پرچم لہراتا ہے۔ چتر شاہی آفتاب کی شعاعوں کو بھی اس کی طرف نگاہ گرم سے دیکھنے نہیں دیتا۔ جاہ و جلال کا یہ دیوتا میدان جنگ میں ایک مجسمہ کی طرح کھڑا کر دیا جاتا ہے اور تمام فوج اسی مرصع بت کے گرد طواف کرنے لگتی ہے۔ عظمت و جبروت کا یہ منظر دنیا کو دفعۃ مرعوب کر دیتا ہے اور اس رعب و داب کے احساس سے اس دنیوی فتح کا سر باد نہ کبر و نخوت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ خاک و خون میں مل کر بھی یہ نشہ نہیں اترتا۔ اگر کوئی اس سر پر غرور کو ٹھکرا دیتا ہے تو اس سے مغرورانہ صدمہ بلند ہوتی ہے۔

پیغمبر کا سفر

لیکن ایک پیغمبر کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ وہ گھر سے جب نکلتا ہے تو اگرچہ مخلصین و مومنین کی ایک جماعت اس کے ساتھ ہوتی ہے لیکن وہ اپنا رفیق سفر صرف خدا کو بناتا ہے:

فوج کی روانگی

فوج کو روانہ کرتا ہے تو اسے نہ غرور و طاقت کی یاد دلاتا ہے، نہ اس کے جوش کو دو آتشہ کرتا ہے، نہ قدیم کارنامہ ہائے شجاعت کا تذکرہ کر کے اس کے دل کو گرماتا ہے، بلکہ اس کے دین کو، اس کی امانت کو، اس کے تمام نتائج اعمال کو خدا کے سپرد کر کے رخصت کر دیتا ہے:

استودم اللہ دینکم و امانتکم و خواتیم اعبالکم۔

”میں تمہارے دین، تمہاری امانت اور تمہارے نتائج اعمال کو خدا کے سپرد کر کے تمہیں خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے بھیجتا ہوں۔“

منزل پر نزول

وہ منزل پر اترتا ہے تو نہ سلاطین کی طرح اس کے لیے خیمے قائم کیے جاتے ہیں، نہ فرش و بساط شاہانہ سے زمین آراستہ ہوتی ہے اور نہ میدان کا نشیب و فراز ہموار کیا جاتا ہے۔ وہ خدا کا نام لے کر فرش خاک پر لیٹ جاتا ہے اور اس نام کی عظمت کے سہارے پر زمین ہی کو اپنی حفاظت کی خدمت سپرد کر دیتا ہے:

یا ارض ربی و ربک اللہ اعوذ باللہ من شرک و شر ما فیک و من شر ما یدب علیک۔

”اے زمین! میرا اور تیرا، دونوں کا خدا ایک ہی ہے۔ میں تیرے شر سے، تیری سطح باطنی کے شر سے اور تجھ پر چلنے والوں کے شر سے، پناہ مانگتا ہوں۔“

جہاد سے مراجعت

وہ سفر جہاد سے پلٹ کر گھر پہنچتا ہے تو سب سے پہلے اسے خدا کا گھریا داتا ہے اور مسجد میں جا کر دو رکعت نماز ادا کرتا ہے، جب اسے فتح و ظفر کی خبر ملتی ہے تو نہ تو اس کے سامنے شادیانے بجائے جاتے ہیں، نہ جشن شاہانہ کی تیاریاں کی جاتی ہیں، نہ عیش و طرب کے گانے گائے جاتے ہیں۔ وہ صرف اپنے خدا کے آگے سر بہ سجود ہو جاتا ہے اور سجدہ شکر بجالاتا ہے۔ اسے جب مشیت ایزدی سے شکست ہوتی ہے تو وہ فوج کو بالکل جوش و غیرت نہیں دلاتا، بلکہ خدا ہی کی غیرت کی سلسلہ جنبانی کرتا ہے کیونکہ وہ اپنی فوج کو خدا کی فوج یقین کرتا ہے:

کان یقول یوم احد: اللہم ائتک ان تشاء لا تعبد فی الارض۔

”آپ ﷺ معرکہ احد کے دن کہتے تھے: خدا یا کیا تو چاہتا ہے کہ اب زمین میں تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہو؟“

کان رسول اللہ ﷺ اذا سافر قال اللہم انت صاحب السفیر و الخلیفۃ فی الاہل! اللہم انی اعوذ بک من وعشاء السفیر و کابۃ القلب و سوء المنظر فی الاہل و البال اللہم اطولنا الارض و ہون علینا الضی!۔

”آنحضرت ﷺ جب بغرض جہاد روانہ ہوتے تھے تو یہ دعا کرتے تھے، خدا یا! تو ہی ہمارا رفیق سفر ہے، تو ہی ہمارے بال بچوں میں ہمارا قائم مقام ہے۔ خدا یا! سفر کے شدائد اور پلٹ کر اہل و عیال کو بڑے حال میں دیکھنے کی مصیبت سے پناہ مانگتا ہوں۔ خدا یا مسافت سفر کو کم کر دے اور ہمارے لیے آسان بنا دے۔“

سواری

وہ سواری کی پشت پر قدم رکھتا ہے تو خدا کا شکر ادا کرتا ہے:

سُبْحَنَ الَّذِی سَخَّرَ لَنَا هَذَا وَمَا كُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ ﴿۱۳﴾ (الزمر: ۱۳)

”کیا پاک و برتر ہے وہ خدا جس نے اس سواری کو ہمارا فرمانبردار بنا دیا اور نہ ہم اس کی قدرت نہیں رکھتے تھے“

سفر سے واپسی

وہ سفر سے پلٹتا ہے تو راہ میں خدا کی حمد کا ترانہ گاتا ہوا چلتا ہے:

اٰمِیْن تائبون عابدون لِیْ رِئاسا حامدون! ^۱

”ہم لوٹ کر آنے والے ہیں۔ ہم توبہ کرنے والے ہیں ہم خدا کے عبادت گزار بندے ہیں اور ہم اپنے رب کی حمد ثنا کرتے ہیں۔“

پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھتا ہے تو غلغلہ تکبیر بلند کرتا ہے، نیچے اترتا ہے تو ترنم ریز تسبیح و تہلیل ہوتا ہے۔

^۱ یہ بخاری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جنگ یا حج یا عمرہ سے لوٹے تو تین مرتبہ اللہ اکبر کہہ کر فرماتے:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِیْكَ لَہٗ لَہٗ الْبَلَدُ وَلَہٗ الْحُدُ وَہُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر، اٰمِیْن، تائبون، عابدون، ساجدون، لربنا حامدون صدق اللہ وعدہ و نصیحتہ و ہزم الاحزاب و حدیث۔

”خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، کوئی اس کا شریک نہیں۔ ملک اسی کا ہے، ستائش اسی کے لیے ہے اور وہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے ہم لوٹ کر آنے والے ہیں، تائب ہیں، عبادت گزار ہیں۔ اپنے پروردگار کی حمد کرتے ہیں اس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا اپنے بندے کی مدد کی اور اسیکے ہی تمام احزاب یعنی گروہوں اور لشکروں کو شکست دی۔ (کتاب المغازی، باب غزوہ احزاب)

میدان جنگ میں خدا سے التجا

وہ اپنی فوج کی قلت اور دشمن کے لشکر کی کثرت دیکھتا ہے تو صرف رحمت آسمانی ہی سے مدد طلب کرتا ہے اور کسی دنیوی طاقت کے آگے دستِ سوال نہیں پھیلاتا:

لباکن یوم بدر نظر رسول الله ﷺ الى المشركين وهم الف واصحابه ثلاثاثة وتسعة عشر رجلا، فاستقبل القبلة ثم مديديه فجعل يهتف بربه، اللهم انجني ما وعدتني، اللهم ائت ما وعدتني اللهم ان تهلك هذه العصابة من اهل الاسلام لا تعبدني الارض۔ فما زال يهتف بربه ما دايديه مستقبلا القبلة حتى سقط رداة عن منكبيه فاتاه ابوبكر فاخذ رداة فالتقاء على منكبيه، ثم التزمه من ورائه وقال يا نبی الله! كفك منا شدتك ربك فانه سينجزك ما وعدك۔ (مسلم)

”بدر کے دن جب آنحضرت ﷺ نے مشرکین کی طرف دیکھا اور آپ ﷺ کو نظر آیا کہ ان کی جمعیت ایک ہزار کی ہے اور مسلمان صرف تین سو انیس ہیں تو آپ ﷺ قبلہ کی طرف متوجہ ہو گئے اور دونوں ہاتھ پھیلا کر خدا کو پکارنا شروع کیا: خدا یا تو نے مجھ سے فتح و ظفر کا جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کر! خدا یا اگر مسلمانوں کا یہ مختصر سا گروہ فنا ہو گیا تو تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔ وہ اسی طرح ہاتھ پھیلا کر متصل پکارتے رہے، یہاں تک کہ جوشِ استغراق میں دوش مبارک سے چادر گر گئی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے اس تضرع والِحاح کو دیکھا تو پاس آئے اور چادر اٹھا کر آپ ﷺ کے کاندھے پر ڈال دی۔ پھر پیچھے سے آکر آپ ﷺ سے لپٹ گئے اور کہا: ”یا رسول اللہ! آپ ﷺ اپنی مناجات ختم کیجیے، خدا نے آپ ﷺ سے جو وعدہ کیا ہے اسے بہت جلد پورا کرے گا۔“

میدان جنگ میں زخم

میدان جنگ میں اسے شدید زخم لگتا ہے، تو اس حالت میں صرف یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے:

رب اغفر لقومي فانهم لا يعلمون۔ (مسلم)

”خدا یا! میری قوم کو معاف فرما، کیونکہ وہ لوگ حق کو نہیں جانتے۔“

لیکن جب کبھی اس کے ہاتھ سے جہاد کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے تو وہ از فرق تا بقدم غضب و قہر الہی کا پیکر جلال و جبروت بن جاتا ہے:

ملاء الله قهوههم ناراً قد شغلونا عن الصلوة الوسطى۔

”خدا کفار کی قبروں کو آگ سے بھر دے کیونکہ انھوں نے ہماری نماز عصر قضا کرادی۔“

بادشاہ اور پیغمبر کا فرق

قصہ مختصر، ایک فاتح میدان جنگ میں ”سر پر غرور“ مگر ایک پیغمبر ”جبین نیاز“ ہوتا ہے۔ ایک بادشاہ میدان جنگ میں ”زبان خود ستا“، مگر ایک داعی حق ”زبان شکر سخ“ ہوتا ہے۔ ایک بادشاہ میدان جنگ میں ”غیظ و غضب“ کا آتش کدہ مگر ایک مناد توحید ”رحم و کرم کا سرچشمہ“ ہوتا ہے۔ ان دونوں متضاد حالتوں کا انجام بھی نہایت مختلف اور عبرت خیز ہے۔ بادشاہوں کے سر پر غرور بارہا ٹھکرا دیے گئے، لیکن کسی موید من اللہ کی جبین نیاز خاک مذلت سے آلودہ نہ ہوئی۔ بادشاہوں کی زبان خود ستا بارہا ذلت کے ساتھ خاموش کر دی گئی، لیکن کسی داعی الہی کا نغمہ حمد و شکر کبھی چپ نہ ہوا۔ بادشاہوں کے غیظ و غضب کے شعلے بارہا بجھا دیے گئے ہیں مگر کسی پیغمبر کے دریائے کرم کو دنیا کے خس و خاشاک نہ روک سکے:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ۖ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ ۖ وَإِن جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ ۖ ۝^۱
(الطفت: ۱۷۱-۱۷۳)

مساوات

مساوات قانونی کو چھوڑ کر عام طرز مساوات پر غور کرنا چاہیے۔ آنحضرت ﷺ تمام مسلمانوں کے آقا و سردار تھے، تاہم آپ ﷺ نے عام مسلمانوں سے اپنے لیے کبھی کوئی امتیاز نہ چاہا۔ ایک سفر میں کھانا پکانے کے لیے صحابہ نے کام تقسیم کر لیے تو جنگل سے لکڑیاں لانے کی خدمت سرور کائنات ﷺ نے خود اپنے ذمے لے لی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ دس برس خدمت نبوی میں رہے لیکن ان کا بیان ہے کہ اس مدت میں جتنی خدمت آپ ﷺ کی میں نے کی، اس سے زیادہ آپ ﷺ نے میری کی۔ مساوات کا یہ عالم تھا کہ ”ما قال لی شیء لسا فعلت“ یعنی تمہارے کام لینا یا جھڑکی دینا تو بڑی بات ہے، کبھی آپ ﷺ نے اتنا بھی نہ فرمایا کہ فلاں کام یوں سے یوں کیوں کیا؟

غلام اور آقا

ایک صحابی نے اپنے غلام کو مارا تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تمہارے بھائی ہیں، جنہیں خدا نے تمہارے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ جو خود کھاؤ، وہ انھیں کھاؤ، جو خود پہنو، وہ انھیں پہناؤ۔

^۱ اور ہمارا حکم ہمارے بندوں کے حق میں پہلے سے ہو چکا ہے جو رسول ہیں کہ پیچک انھی کو مددی جائے گی۔ بے شک ہمارا لشکر غالب رہے گا۔

email: hikmatequran@gmail.com

کے انبعاث و قیام کی دعوت ہے۔ غور کرو اس دعوت نے وقت کی تمام مردہ جماعتوں کو کس طرح قبروں سے اٹھا کر زندگی کے میدانوں میں متحرک کر دیا تھا۔ اس سے بڑھ کر مردوں کو جلانا کیا ہو گا۔ عرب کے سارے بادلوں میں ابو بکر، عمر، علی، عائشہ، خالد، ابن ابی وقاص، ابن العاص (رضی اللہ عنہم) جیسے اکابر پیدا ہو گئے اور پچاس برس کے اندر عرب کے وحشی، کرہ ارضی کی سب سے بڑی اور مہذب قوم تھے۔

توحید

خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ مالک الملک ہے، جی و قیوم ہے۔ اس کی حکومت سے کوئی گوشہ باہر نہیں اس کے علم سے کوئی شے مخفی اور اوچھل نہیں۔ وہ غفلت سے منزہ اور نسیان سے پاک ہے۔ جس ہستی کی ایسی صفیتیں ہوں، اس کے سامنے کسی کی سعی و سفارش کی کیا گنجائش ہے اور اس کے احکام و قوانین کے نفاذ میں کون ہے جو دخل دینے کی جرأت کر سکتا ہو؟

بعض ضروری نکتے

قرآن مجید میں توحید فی الذات کے ساتھ توحید فی الصفات بھی کمال پر پہنچادی گئی۔ انسان کے لیے دینی عقائد و اعمال کا جو تصور قائم کیا، اس کی بنیاد تمام تر رحمت و محبت پر رکھی۔ سورہ فاتحہ میں ربوبیت و رحمت کی صفتوں کے بعد ”مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ“ (جو اس دن کا مالک ہے جس دن کاموں کا بدلہ لوگوں کے حصے میں آئے گا) کہہ کر صفت عدالت کا ذکر کیا اور تمام صفات جلال کو عدالت ہی کے تابع رکھا۔

- ۱۔ فطرت کائنات میں ربوبیت و رحمت کے ساتھ مجازات بھی ہیں۔ انسان نے مجازات کو قہر و غضب پر محمول کر لیا۔ اس طرح خدا کی صفات میں خوف و دہشت کا تصور پیدا ہو گیا، حالانکہ جن مظاہر کو قہر و غضب پر محمول کیا گیا، وہ عین مقتضائے رحمت ہیں، تعمیر کی تحسین و تکمیل کے لیے تخریب نہ ہوتی تو میزان عدل قائم نہ رہتی اور نظام ہستی درہم برہم ہو جاتا۔
- ۲۔ صفات الہی میں قہر و غضب کے لیے کوئی جگہ نہیں، البتہ عدالت ضرور ہے اور صفات قہریہ جس قدر بیان کی گئی ہیں دراصل اسی (عدالت ہی) کے مظاہر ہیں۔

(توحید فی الصفات میں صرف توحید ہی پر زور نہیں دیا بلکہ شرک کی تمام راہیں بھی بند کر دیں۔) (الف) عبادت اور نیاز کی مستحق صرف خدا کی ذات ہے۔ اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے سامنے سر جھکا یا تو توحید الہی کا اعتقاد باقی نہ رہا۔

(ب) صرف خدا ہی کی ذات انسانوں کی پکار سنتی اور دعائیں قبول کرتی ہے۔ اگر تم نے

دعاؤں اور طلبگاریوں میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا تو گویا تم نے اسے خدا کی خدائی میں شریک کر لیا۔

(ج) اسی طرح عظمتوں، کبریائیوں، کارسازوں اور بے نیازوں کا جو اعتقاد تمہارے اندر خدا کی ہستی کا تصور پیدا کرتا ہے وہ صرف خدا ہی کے لیے مخصوص رہنا چاہیے۔ اگر تم نے ویسا ہی اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لیے پیدا کر لیا تو توحید کا اعتقاد درہم برہم ہو گیا۔

(د) یہی وجہ ہے کہ سورہ فاتحہ میں ”إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ“ میں اول عبادت کے ساتھ استعانت کا ذکر بھی کیا گیا۔ پھر دونوں جگہ مفعول کو مقدم کیا، جو مفید حصر ہے یعنی ”صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں۔“

(ه) سب سے زیادہ اہم مسئلہ شخص نبوت کی حد بندی کا تھا۔ پیغمبر اسلام کی بشریت اور بندگی پر زور دیا اور اپنی تعلیم کا بنیادی کلمہ یہ قرار دیا، اشہد ان لا اله الا الله و اشہد ان محمداً عبداً و رسولاً۔ ”یعنی میں اقرار کرتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اقرار کرتا ہوں کہ محمد (ﷺ) خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔“ اس میں جس طرح خدا کی توحید کا اعتراف کیا گیا اسی طرح پیغمبر اسلام کی بندگی اور رسالت کا بھی اعتراف ہے (اور بندگی کا اقرار رسالت کے اقرار پر مقدم ہے)۔

نبوت کی روشن ترین دلیل

سورہ یونس میں ہے:

قُلْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُمْ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَأْتُكُمْ فِيهِ ۚ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۱۱﴾ (آیت: ۱۶)

”تم کہو، اگر اللہ چاہتا تو میں قرآن تمہیں سناتا ہی نہیں اور تمہیں اس سے خبردار ہی نہ کرتا (مگر اس کا چاہنا یہی ہوا کہ تم میں اس کا کلام نازل ہو اور تمہیں اقوام عالم کی ہدایت کا ذریعہ بنائے) پھر دیکھو، یہ واقعہ ہے کہ میں اس معاملے سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں، کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں؟“

صداقت نبوت کی سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل بیان کی ہے کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی نہیں، جس کے فضائل و حالات کی تمہیں خبر نہ ہو، تمہیں میں سے ہوں اور اعلان وحی سے پہلے ایک عمر

تم میں بسر کر چکا ہوں یعنی چالیس سال کی مدت تک یہ عمر انسان کی چشتی کی خاص مدت ہے۔ اس تمام مدت میں میری زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے رہی، بتلاؤ اس تمام عرصے میں کوئی ایک بھی بات تم نے سچائی اور امانت کے خلاف دیکھی؟ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کسی انسانی معاملے میں جھوٹ بولو تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب خدا پر بہتان باندھنے کے لیے تیار ہو جاؤں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں کہ مجھ پر اس کا کلام نازل ہوتا ہے؟ کیا اتنی سی موٹی بات بھی تم نہیں پاسکتے؟ تمام علمائے اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس سال کا زمانہ اس کے اخلاق و فضائل کے ابھرنے اور بننے کا اصل زمانہ ہوتا ہے، جو سانچا اس عرصے میں بن گیا، وہ بقیہ زندگی میں بدل نہیں سکتا پھر فرمایا:

فَمَنْ أَكْثَرُ ظُلْمًا مِمَّنْ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۖ إِنَّهُ لَا يُفْعِلُ الْمُعْجِزُونَ ﴿١٤﴾ (یونس: ۱۴)

”بتلاؤ اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے، جو اپنے جی سے جھوٹ بنا کر اللہ پر افترا کرے اور اس آدمی سے جو اللہ کی سچی آیتیں جھٹلائے؟ یقیناً جرم کرنے والے کبھی کا میابی حاصل نہیں کر سکتے۔“

دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے جو شخص اللہ پر افترا کرے اس سے بڑھ کر کوئی شریر نہیں، جو صادق کو جھٹلائے وہ بھی سب سے زیادہ شریر ہے۔ اگر میں مفتوی علی اللہ ہوں تو مجھے ناکام و نامراد ہونا پڑے گا۔ اگر تم سچائی کے مکذب ہو تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے اور اس کا قانون ہے کہ مجرموں کو فلاح نہیں دیتا۔

چنانچہ اللہ کا فیصلہ صادر ہو گیا۔ جو مکذب تھے ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ جو صادق تھا، اس کا کلمہ صدق آج تک قائم ہے اور قائم رہے گا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی صداقت

پیغمبر اسلام کی صداقت کی اس سے بڑھ کر دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے سخت سے سخت معاند بھی اس عجیب و غریب کشش و تاثیر سے انکار نہیں کر سکتے تھے، جو آپ کی شخصیت اور آپ کی تعلیم میں پائی جاتی تھی، چونکہ اعتراف حقیقت کے لیے تیار نہ تھے اس لیے مجبور ہو جاتے تھے اسے جادو سے تعبیر کریں۔

”الانبياء“ کی آیت¹ میں فرمایا: وہ پیغمبر اسلام کے پاس جانے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور کہتے

① سورۃ انبیاء کی آیت ۳۱ ہے:

”دل ہیں کہ یک قلم غافل اور (دیکھو) قلم کرنے والوں نے چپکے سرگوشیاں کیں۔ یہ آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ ہماری ہی طرح کا ایک آدمی ہے؟ پھر کیا تم جان بوجھ کر ایسی جگہ آتے ہو جہاں حادو کے سوا اور کچھ نہیں؟“

ہیں کہ تم ان کے پاس گئے اور جادو میں پھنسے، یہ ہماری طرح ایک آدمی ہے، پس جو کچھ اس کا اثر و نفوذ ہے، وہ جادو ہی کی وجہ سے ہے۔

سچائی کی سب سے بڑی شناخت یہ ہے کہ اسے سچائی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اگر اور کچھ کہنا چاہو گے تو کتنا ہی زور لگاؤ، بات بنے گی نہیں، بنے گی اسی وقت جب سر جھکا دو گے کہ ہاں یہ سچائی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ نفس انسانی کی گہرائی و سرکشی پر حقیقت کا اعتراف ہمیشہ گراں گزرتا ہے۔ وہ بغیر لڑے کبھی ہتھیار نہیں رکھے گی۔ وہ مانے گی (کیونکہ سچائی منوائے بغیر رہ نہیں سکتی) مگر اس وقت جب ماننے پر مجبور ہو جائے۔

پیغمبر اسلام نے جب کلام حق کی منادی شروع کی تو قریش کہہ کا یہ حال ہوا۔ وہ سچائی دیکھ رہے تھے، مگر اسے سچائی سمجھنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ کبھی کہتے یہ جمنون ہو گیا ہے، خواب و خیال کو دوجی نبوت سمجھتا ہے۔ پھر تاثیر نفوذ دیکھنے تو کہتے جادو گر ہے۔

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش دارالندوہ میں جمع ہوئے اور یہ ساری باتیں آپس میں کہیں۔ (ابن ہشام)

دین میں جبر نہیں

اس اصل عظیم کا اعلان کہ دین و اعتقاد کے معاملے میں کسی طرح کا جبر و استکراہ جائز نہیں۔
دین کی راہ دل کے اعتقاد و یقین کی راہ ہے اور اعتقاد دعوت و موعظت سے پیدا ہوتا ہے۔ نہ کہ جبر و
استکراہ سے۔

قریش مکہ کا فتنہ کیا تھا؟ یہ کہ ظلم و تشدد سے دین و اعتقاد کا فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ قرآن نے اس کے خلاف جنگ کا حکم دیا، پس جس بات کے خلاف اس نے جنگ کا حکم دیا خود اسی بات کا منکر کیونکر ہو سکتا ہے۔

دعوت کی راہ تلقین و ہدایت کی راہ ہے، جدل و خصومت کی راہ نہیں۔ داعی حق کا طریقہ یہ نہیں ہوتا کہ مخاطب کو دلیلوں کے الجھاؤ میں پھنسا دے یا کسی خاص دلیل پر اڑ کر اس کا مطلقہ بند کر دے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کے دل میں سچائی اتار دے۔

خدا پرستی اور نیک عملی

خدا پر، خدا کے فرشتوں پر، خدا کی کتابوں پر، خدا کے تمام رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنا سچا اور کامل ایمان ہے۔ خدا کی ہستی، اس کی وحدانیت، اس کی صفات اور آخرت دین کے بنیادی حقائق ہیں۔

”خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم تمہیں روزی دیتے ہیں، انہیں بھی دیں گے۔ بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ، کھلے طور پر ہوں یا چھپی ہوں۔ کسی جان کو قتل نہ کرو جسے خدا نے حرام ٹھہرا دیا ہے۔ یتیموں کے مال کی طرف نہ بڑھو۔ جب کبھی کوئی بات کہو، انصاف کی کہو، اگرچہ معاملہ اپنے قرابت دار ہی کا کیوں نہ ہو۔ اللہ کے ساتھ جو عہد و پیمان کیا ہے، اسے پورا کرو۔

خدا پرستی اور نیک عملی کی یہی راہ میری (خدا کی) ٹھہرائی ہوئی سیدھی راہ ہے، اسی پر چلو، اور راہوں پر نہ چلو کہ خدا کی راہ سے ہٹ کر تمہیں تتر بتر کر دیں۔ جو کوئی اللہ کے حضور نیکی لائے گا تو اس کے لیے اس عمل نیک سے دس گنا زیادہ ثواب ہو گا اور جو کوئی برائی لائے گا تو اس کے بدلے ہی سزا پائے گا۔ مجھے تو میرے پروردگار نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، وہی درست اور صحیح دین ہے۔ ابراہیم کا طریقہ کہ ایک خدا کے لیے ہو جانا۔ میری نماز، میرا حج، میرا جینا، میرا امر ناصرف اللہ ہی کے لیے ہے، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں خدا کے فرمانبرداروں میں پہلا فرمانبردار (یعنی مسلم) ہوں۔“ (القرآن)

ادامرو نوائی

- ۱۔ توحید فی العبادت کی تلقین، کیونکہ نفس توحید کا اعتقاد تو تمام پیروان مذاہب میں موجود تھا، لیکن توحید فی العبادت کی حقیقت مفقود ہو گئی تھی۔
- ۲۔ پھر والدین کے حقوق پر توجہ دلائی گئی۔ انسان کے لیے والدین کی ربوبیت، ربوبیت الہی کا پر تو ہے۔ والدین کی خدمت و اطاعت کی آزمائش کا اصلی وقت ان کے بڑھاپے میں آتا ہے، جب کمزوریاں انہیں دوسروں کی خدمت کا محتاج بنادیتی ہیں۔
- انسان کی احتیاج کے دو ہی وقت ہیں: طفولیت اور بڑھاپا۔ طفولیت میں ماں باپ نے خدمت کی تھی، بڑھاپے میں اولاد کو خدمت کرنی چاہیے۔
- ۳۔ ماں باپ کے بعد ان سب قرابت داروں کے حقوق ہیں، جو ہماری خبر گیر یوں کے محتاج ہوں، ساتھ ہی ”تنبذیر“ یعنی بے محل خرچ کرنے سے روکا۔ فرمایا: مال و دولت بے محل خرچ نہ کرو، خرچ کرنے کا صحیح محل ارباب حقوق ہیں۔
- ۴۔ مال و دولت خرچ کرنے میں اور ہر بات میں اعتدال کی راہ اختیار کرو، کسی ایک طرف نہ جھک پڑو کہ خرچ کرنے پر آئے تو سب کچھ اڑا دیا۔ احتیاط کرنی چاہی تو کجی پر اتر آئے۔
- ۵۔ اولاد کو افلاس کے ڈر سے ہلاک نہ کرو۔ ہم تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور انہیں بھی۔
- ۶۔ زنا سے دور رہو، یہ بڑی بے حیائی کی بات اور بڑی برائی کا چلن ہے۔

- ۷۔ کسی جان کو ناحق قتل نہ کرو۔ جسے قتل نہ کرنا اللہ نے حرام ٹھہرا دیا ہے، ہم نے مقتول کے وارث (یا وارثوں) کو مطالبہ قصاص کا اختیار دے دیا ہے۔ پس چاہیے کہ خونریزی میں زیادتی نہ کی جائے۔
- ۸۔ یتیموں کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ (یعنی اسے خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو) مگر ایسے طریقے پر جو ان کے لیے بہتر ہو، جب یتیم جو ان ہو جائیں تو امانت ان کے حوالے کر دو۔
- ۹۔ عہد پورا کرو، اس کے بارے میں تم سے باز پرس کی جائے گی۔
- ۱۰۔ جب کوئی چیز ماپو تو پیانا بھر پور رکھا کرو۔ تولو تو صحیح ترازو سے (یعنی نہ ماپ میں کمی کرو اور نہ تول میں ڈنڈی مارو)۔

فرمانبرداروں کے نشان

ان لوگوں کے اعمال و اوصاف (کی مجمل سی کیفیت) جنہوں نے احکام حق قبول کیے اور دنیا کے لیے نافع بن گئے۔

- الف۔ اللہ کی بندگی کا عہد پورا کرتے ہیں اور اپنی عبودیت میں سچے اور کامل ہیں۔
- ب۔ اللہ نے جو رشتے جوڑ دیے، انہیں ظلم و نا انصافی سے توڑتے نہیں بلکہ رشتے کا پاس کرتے اور ہر علاقے کا حق ادا کرتے ہیں۔ اس عمل میں تمام حقوق العباد آگئے جس طرح الف میں حقوق اللہ آگئے۔
- ج۔ آخرت کی فکر سے بے پروا نہیں ہوتے۔ جو کچھ کرتے ہیں، اس میں خوف آخرت کی کھٹک موجود ہوتی ہے۔ یقین رکھتے ہیں کہ ایک روز کسی کے آگے پیش ہونا ہے اور حساب کی سختی سے پچھا ممکن نہیں۔
- د۔ اللہ کی محبت میں ہر طرح کی ناخوشگوار حالتیں صبر و ثبات کے ساتھ جھیل لیتے ہیں، شدتوں اور محنتوں سے منہ نہیں موڑتے، آزمائشوں کو پیٹھ نہیں دکھاتے۔
- ہ۔ نماز اس کی ساری شرطوں کے ساتھ قائم کرتے ہیں۔
- و۔ جو کچھ کماتے ہیں، اسے صرف اپنے ہی نفس پر خرچ نہیں کرتے، دوسروں پر بھی خرچ کرتے ہیں اور ہر حال میں خرچ کرتے ہیں، کھلے طور پر بھی اور پوشیدہ طور پر بھی۔
- ز۔ بدی کے بدلے بدی کرنا ان کا شیوہ نہیں۔ کوئی ان کے ساتھ کتنی ہی برائی کرے، وہ بھلائی ہی سے پیش آئیں گے۔

ایمان والوں کے پانچ وصف

مومنوں کے پانچ وصف خصوصیت سے بیان کیے گئے۔ گویا قرآن کے نزدیک ایمان و عمل کے مرقع میں سب سے زیادہ نمایاں خط و خال یہی ہیں۔ جس زندگی میں یہ خصائص نہ ہوں وہ مومن کی زندگی نہیں ہو سکتی۔

الف۔ نماز کی محافظت اور اس کا خضوع و خشوع سے ادا کرنا۔ کسی بامیبت و جلال مقام پر کھڑے ہو جاؤ، تمہارے ذہن و جسم پر کیسی حالت طاری ہو جائے گی؟ ایسی ہی حالت کو عربی میں ”خشوع“ کہتے ہیں۔

ب۔ ہر اس بات سے مجتنب رہنا جو نکلی ہو، صرف انہی باتوں کا اشتغال رکھنا جو دین و دنیا میں نافع ہوں۔

ج۔ کمائی میں سے اپنے محتاج بھائیوں کے لیے خرچ کرنا۔

د۔ زنا سے کبھی آلودہ نہ ہونا۔

ہ۔ امانت دار ہونا اور اپنے عہدوں کو پورا کرنا۔

راہ حق کے پیشرو

راہ حق میں سب سے آگے نکل جانے والے وہ ہیں:

الف۔ جو اپنے پروردگار کے خوف سے ڈرتے ہیں اور اس کی نشانیوں پر یقین رکھتے ہیں۔

ب۔ جو پروردگار کے ساتھ کسی ہستی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔

ج۔ جو اس کی راہ میں جتنا کچھ دے سکتے ہیں، بلا تامل دے دیتے ہیں۔ ان کے دل ترسان رہتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے حضور انہیں لوٹنا ہے۔

طریق خیر و سعادت

ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ قربت داروں کے حقوق سے غافل نہ ہو۔ یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور یتیموں کی خبر گیری کرتے رہو۔ پڑوسی خواہ قربت دار ہو، خواہ اجنبی، ہر حال میں اچھے برتاؤ کا مستحق ہے۔ اسی طرح جو لوگ تمہارے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے ہوں لونڈی غلام جو تمہارے قبضے میں ہیں، ان سب کے بھی تم پر حقوق ہیں۔ ضروری ہے کہ سب کے ساتھ محبت اور احسان سے پیش آؤ۔

بخل نہ کرو، خدا نے جو کچھ عطا فرمایا ہے اس کے بندوں کی خدمت میں خرچ کرو۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اس کا ہاتھ اتفاق فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے) سے کبھی رک نہیں سکتا۔ البتہ جو کچھ خرچ کرو اللہ کے لیے کرو، نام و نمود کے لیے نہ کرو۔

نظم و فلاح میں اصل اصول

اجتماعی زندگی میں نظم و فلاح کے لیے اصل اصول یہ ہے کہ جو جس بات کا حقدار ہو، اس کے حق کا اعتراف کرو اور جو چیز جسے ملنی چاہیے، وہ اس کے حوالے کر دو۔ وارث کا حق ہو، یتیم کا مال ہو، قرضدار کا قرض ہو، امانت رکھنے والے کی امانت ہو، اہلیت رکھنے والے کے لیے منصب اور عہدہ ہو۔ جو جس کا اہل ہو، اسے ملنا چاہیے۔

جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو صرف عدل و انصاف پیش نظر ہو، کسی حالت اور کسی صورت میں بھی یہ جائز نہیں کہ فیصلہ انصاف کے خلاف کیا جائے۔

مسلمانوں کے لیے اصل دین

مسلمانوں کے لیے اصل دین یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کریں۔ اللہ کے رسول کی اطاعت کریں اور جو لوگ ان میں سے صاحب حکم و اختیار ہوں ان کی اطاعت کریں (بشرطیکہ اصحاب حکم و اختیار کی طرف سے کوئی ایسی بات پیش نہ ہو جو اللہ اور رسول کی اطاعت کے خلاف ہو) بہ صورت نزاع اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی طرف رجوع کیا جائے اور جو فیصلہ ملے، اس کے آگے سب سر تسلیم خم کر دیں۔

قوامون بالقسط

مسلمانوں کو چاہیے کہ ”قوامون بالقسط“ ہوں یعنی حق و راستی پر اس مضبوطی سے قائم رہنے (اور جم جانے والے) کہ کوئی بات بھی انہیں جگہ سے ہلانا نہ سکے۔ چاہیے کہ وہ اللہ کے لیے گواہی دینے والے ہوں۔ دنیا کی کوئی چیز انہیں سچ کہنے سے روک نہ سکے۔ اگر کسی معاملے میں سچائی خود ان کی ذات کے خلاف ہو یا ان کے ماں باپ اور اعزہ و اقربا کے خلاف ہو، جب بھی انہیں سچائی ہی بات کہنی چاہیے، وہ صرف سچائی ہی کے لیے دل و زباں رکھتے ہیں۔^①

بنیادی دستور العمل

مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ خدا کے شعائر کی بے حرمتی روا نہ رکھیں۔ دوسروں کے

① سورہ مائدہ ۸ میں صاف صاف فرمایا گیا ہے کہ:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوْا ۖ اِعْدِلُوْا ۚ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يَخْبِرُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝
”ایسا نہ ہو کہ کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات کے لیے ابھاردے کہ اس کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ ہر حال میں انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے اور اللہ کی نافرمانی کے نتائج سے ڈرو۔ تم جو کچھ کرتے ہو وہ اس کی خبر رکھنے والا ہے۔“

معاملے میں ان کا دستور العمل یہ ہونا چاہیے کہ نیکی کے کاموں میں سب کی مدد کریں۔ کوئی ظلم کرے تو یہ برائی ہے، اس سے بچیں۔ کوئی حج و زیارت کو جائے تو یہ بھلائی ہے اس کے معاون بنیں (گویا نیکی اور پرہیزگاری کی ہر بات میں تعاون، گناہ اور ظلم کی ہر بات میں لاتعاون ہر مسلمان کے لیے بنیادی اصل کار ہے)۔

دین کی تکمیل اور نعمت کا اتمام چاہتا ہے کہ ہم اپنی سیرت میں سر تا سر حق و صداقت کے پیکر بن جائیں۔

انسانی مساوات

نسل انسانی کی مساوات کا اعلان اور نسل و شرف کے تمام امتیازات سے انکار جو لوگوں نے بنا رکھے تھے اور جن کی وجہ سے انسانی حقوق پامال ہو رہے تھے۔ آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، بڑا ہو یا چھوٹا، وضیع ہو یا شریف، انسان ہونے کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد جو خطبہ ارشاد فرمایا، اس میں قریش کو خطاب کرتے ہوئے یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکار فرمادی تھی۔ فرمایا:

”اے جماعت قریش! خدا نے تمہاری جاہلانہ نخوت اور آباؤ اجداد پر اترانے کا غرور آج توڑ دیا (سچ تو یہ ہے) سب لوگ آدم کے فرزند ہیں اور آدم مٹی سے بنایا گیا تھا۔ خدا فرماتا ہے: ”لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے۔ گو کہ قبیلے سب پہچان کے لیے بنا دیے ہیں اور خدا کے ہاں تو اس کی زیادہ عزت، جس میں تقویٰ زیادہ ہے“^①

جب تمام انسان ایک ہی ماں باپ (آدم و حوا) کی اولاد ہیں تو انسان ہونے میں امتیازات کی کون سی وجہ ہے۔ پھر خدا کے ہاں عزت کا جو معیار قرار پایا یعنی تقویٰ، وہ ایسا ہے کہ اس میں انسانوں کے درمیان حسد و رقابت ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ منافی تقویٰ ہوگی۔ باقی ہر معیار یعنی دولت، عہدہ، رنگ وغیرہ میں حسد و رقابت کے سوا اور کسی بات کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔“

دین کی اصل عظیم

دین کی اصل عظیم کا اعلان کہ سعادت و نجات کی راہ سچی خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی سے حاصل ہوتی ہے۔ اصل شے دل کی پاکی اور عمل کی نیکی ہے۔ شریعت کے ظاہری احکام و رسوم بھی اسی لیے ہیں کہ یہ مقصود حاصل ہو۔

① متین جلد اول ص ۱۵۶۔ جس آیت کا ترجمہ دیا گیا ہے وہ سورۃ حجرات کی تیرھویں آیت ہے یعنی: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَاۗئِلَ لِتَعَارَفُوْۤا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ

نزول قرآن کے وقت دنیا کی ایک عالمگیر مذہبی گمراہی یہ تھی کہ لوگ سمجھتے تھے، دین سے مقصود محض شریعت کے ظواہر و رسوم ہیں اور انہیں کے کرنے، نہ کرنے پر نجات و سعادت موقوف ہے۔ پس جہاں تک دین کا تعلق ہے، ساری طلب مقاصد کی ہونی چاہیے، نہ کہ وسائل کی۔

ابراہیم علیہ السلام کی راہ

دین کی جو راہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اختیار کی تھی، وہ کیا تھی؟ ان کے بعد ان کی اولاد جس طریقے پر چلتی رہی، وہ کون سا طریقہ تھا؟ خود حضرت یعقوب علیہ السلام نے بستر مرگ پر جس دین کی وصیت کی تھی وہ کونسا دین تھا؟ وہ یہودیت اور مسیحیت کی گروہ بندی نہ تھی (اس وقت تک یہودیت اور مسیحیت کا وجود بھی نہ تھا) وہ صرف خدا پر ایمان لانے اور اس کے قانون سعادت کی فرمانبرداری کرنے کی فطری اور عالمگیر سچائی تھی۔ اسی کی دعوت قرآن نے دی۔

دین الہی کو ”الاسلام“ کے نام سے تعبیر کیا گیا، جس کے معنی اطاعت کرنے کے ہیں یعنی ہر طرح کی نسبتوں اور گروہ بندیوں سے الگ ہو کر صرف اطاعت حق کی طرف انسانوں کو دعوت دی جائے۔^①

عمل کی کمائی

قانون الہی یہ ہے کہ ہر فرد کو وہی پیش آتا ہے۔ جو اس نے اپنے عمل سے کمایا ہے۔ نہ تو ایک کی نیکی دوسرے کو بچا سکتی ہے اور نہ ایک کی بد عملی کے لیے دوسرا جواب دہ ہو سکتا ہے۔

انسان کے لیے قدامت پسندی کا پھندا بڑا ہی سخت ہے، اس کے بچے سے وہ نکل نہیں سکتا۔ وہ ہمیشہ ماضی کے افسانوں میں گم رہے گا۔ ہندو ہزاروں برس سے مہابھارت اور پرانوں کے افسانوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے دو فرقے آج تک اس نزاع سے فارغ نہیں ہوئے کہ تیرہ سو برس پہلے سفید (بنو ساعدہ) میں خلافت کا جو انتخاب ہوا تھا وہ صحیح تھا یا غلط؟ قرآن کہتا ہے، ”تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ“ (البقرہ ۱۳۴) اب اس کے پیچھے پڑے رہنے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ تم اپنی خبر لو۔ ان کے اعمال ان کے لیے تھے اور تمہارے، تمہارے لیے ہیں۔

دنیا پرستی کا غرور

دین حق دنیا کا نہیں، دنیا پرستی کے غرور و سرشاری کا مخالف ہے۔ یہی دنیا کا غرور انسان کو

① ملاحظہ فرمائیے اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ۔ بلاشبہ اصل دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ (آل عمران ۱۹) وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ اِِسْلَامًا وَّیُنَافِقْ فَاِنَّهُ یُفْعَلْ مِنْهُ (جو کوئی اسلام کے سوا دوسرے دین کا خواہش مند ہو گا تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ آل عمران ۸۵) وَ زُیِّنَتْ لَكُمْ الْاِسْلَامُ وِیْنًا۔ تمہارے لیے پسند کیا دین اسلام کو۔ (البقرہ ۳)

خدا پرستی اور راست بازی سے بے پروا کر دیتا ہے۔ جب اسے طاقت اور حکومت مل جاتی ہے تو غرض و نفس کی پرستش میں وہ سب کچھ کر گزرتا ہے، جو دنیا میں انسان کا ظلم و فساد کر سکتا ہے۔ جو لوگ سچے خدا پرست ہیں، وہ دنیا میں کتنے ہی مشغول ہوں، مگر ان کے پیش نظر نفس پرستی نہیں، صرف رضائے الہی ہوتی ہے۔

آخرت کی نجات

آخرت کی نجات کا دار و مدار تمام تر ایمان و عمل پر ہے۔ وہاں نہ تو نجات کی خرید و فروخت ہو سکتی ہے نہ کسی کی دوستی اور آشنائی کام دے سکتی ہے، نہ کسی کی سفارش سے کام نکالا جاسکتا ہے۔ (کسی نیک اور بزرگ ہستی سے حسن عمل کا سبق لیا جاسکتا ہے۔ اس کی صحبت میں بیٹھ کر اپنی اصلاح کی جاسکتی ہے۔ اہل علم سے مسائل پوچھے جاسکتے ہیں، لیکن نجات کا انحصار اپنے ہی ایمان و عمل پر اللہ کی رحمت پر ہے۔ کسی کی سعی و سفارش کچھ اعانت نہیں کر سکتی۔ ایسا تصور ہی سراسر غیر اسلامی ہے۔)

حق و باطل کا معیار

حق و باطل کے معاملے میں انسانوں کی قلت و کثرت معیار نہیں۔ گراہی و حق فراموشی کے ایسے اوقات بھی آجاتے ہیں کہ نوع انسانی کی اکثریت حق و یقین کی روشنی سے محروم ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی دور نزول قرآن کے وقت بھی دنیا پر چھایا ہوا تھا۔ گمراہوں کی کثرت نہ دیکھو یہ دیکھو کہ کون سی راہ یقین اور بصیرت کی راہ ہے اور کون سی جہل و گمان کی۔ حق کی راہ یقین و بصیرت ہی کی راہ ہے نہ کہ جہل و گمان کی۔ اگرچہ بہت تھوڑے آدمی اس راہ پر کار بند ہوں۔ آج دنیا کی آبادی میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے، نہ کہ مسلمانوں کی۔ پھر کیا اس بنا پر اکثریت کے مطابق حق کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے؟ ابتدائی دور میں مسلمان بہ مشکل چند لاکھ ہوں گے لیکن انہوں نے حیرت انگیز سعی و ہمت اور نادیدہ جوش فداکاری سے چند سال کے اندر روئے زمین کے گوشے گوشے میں نور حق کا اجالا کر دیا۔ آج ان کی بھیڑ ساٹھ کروڑ بتائی جاتی ہے لیکن وہ اپنے آپ کو باطل کی ظلمت کاریوں سے محفوظ رکھنے میں بے بس نظر آتے ہیں اور وہ گروہ گروہ ایسے طور طریقے اختیار کیے بیٹھے ہیں، جنہیں حق نہیں، باطل کے شاخصانے ہی کہا جاسکتا ہے۔

منکرین آخرت

جو لوگ منکرین آخرت ہیں یعنی محاسبہ اعمال پر اعتقاد نہیں رکھتے، ان کی ذہنیت چار حال سے

خالی نہیں:

- ا۔ انہیں خدا سے ملنے کی توقع نہیں۔
 - ب۔ وہ صرف دنیوی زندگی میں خوشنود ہوتے ہیں۔
 - ج۔ اس حالت کے خلاف ان کے اندر کوئی خلش پیدا نہیں ہوتی، اسی پر وہ مطمئن ہو گئے ہیں۔
 - د۔ ان کے ذہن و ادراک میں اس درجہ تعطل پیدا ہو گیا ہے کہ قدرت کی تمام نشانیاں جو چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں، انہیں بیدار نہیں کر سکتی۔
- ان میں سے ہر بات نہ صرف بیان حال ہے بلکہ بجائے خود ایک دلیل بھی ہے اور یہی قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے۔

مشکلیں اور آزمائشیں

کتاب و حکمت کی تعلیم، شخص نبوت کی پیغمبرانہ تربیت (تزکیہ)، مرکز ہدایت کا قیام (کعبہ مکرمہ) اور بہترین امت (حَدِيثُ اُمَّةٍ اُخْرَىٰ لِدُنْيَا آلِ عِمْرَانَ - ۱۱۰)۔ ہونے کا نصب العین، یہی وہ بنیادی عناصر تھے جو موعودہ امت کی نشوونما کے لیے ضروری تھے۔ یہ تمام مراتب ظہور میں آگئے تو پیر و ان دعوت قرآنی کو سرگرم عمل ہو جانے کا حکم مل گیا۔ سرگرم عمل ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مشکلیں اور آزمائشیں پیش آئیں، اس لیے صبر و استقامت اور جاں فروشی کی بھی دعوت دی گئی۔

صبر و ثبات

فرمایا: ”صبر اور نماز کی قوتوں سے مدد لو“۔ صبر کی حقیقت یہ ہے کہ مشکلات و مصائب کو جھیلنے اور نفسیاتی خواہشوں سے مغلوب نہ ہونے کی قوت پیدا کی جائے۔ نماز کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے ذکر و فکر سے روح کو تقویت ملتی ہے۔ جس جماعت میں یہ دو قوتیں (صبر اور نماز) پیدا ہو جائیں گی، وہ کبھی ناکام نہیں ہو سکتی۔

دوسرا جو جماعت موت سے ڈرتی ہے وہ کبھی زندگی کی کامرانیوں حاصل نہیں کر سکتی، راہ حق میں موت، موت نہیں، سرتاسر زندگی ہے۔ کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر غالب ہیں اور کتنی بڑی جماعتیں ہیں جو چھوٹی جماعتوں سے شکست کھا جاتی ہیں۔ فتح و شکست کا مدار افراد کی قلت و کثرت پر نہیں، دلوں کی قوت پر ہے۔ اللہ کی مدد انہیں لوگوں کا ساتھ دیتی ہے جو صابر اور ثابت قدم ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کا نصب العین

مسلمانوں کا جماعتی نصب العین یہ نہیں قرار دیا گیا کہ وہ طاقتور قوم نہیں یا سب سے برتر گروہ ہوں کیونکہ طاقت و برتری میں جماعتی گھمنڈ اور قوی حرص و آز کا لگاؤ تھا اور یہ بات انسانیت کے امن و سلام اور مساوات و اخوت کے منافی تھی۔ پس صرف ”خیر“ اور ”بہتر“ ہونے پر زور دیا گیا۔ (كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ) جس کی تمام تر روح اخلاقی اور معنوی محاسن پر مبنی ہے۔ جس جماعت کا نصب العین یہ ہو گا کہ وہ سب سے اچھی اور نیک ہو، وہ طاقتوں کے غرور اور قوی نخوت و برتری کے مفاسد سے آلودہ نہیں ہو سکتی۔ (اور حق یہ ہے کہ خیر و سعادت میں سب سے بڑھ کر ہونے کے بعد کسی جماعت کی معنوی قوت میں کون سی چیز کی کمی رہ سکتی ہے اور معنوی قوت سے بڑھ کر کون سی قوت ہے جو امن و سلام کی ضامن ہو؟)

وحدت و دعوت

قرآن مجید نے دین حق کے اس اصل عظیم کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ تمام نبی صرف ایک ہی دین کے داعی تھے۔ جب اللہ کا دین ایک ہے تو تمام رہنما ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جو ان میں تفریق کرتا ہے، وہ پورے سلسلہ ہدایت ہی کا منکر ہے۔ اللہ کا دین اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کے ٹھہرائے ہوئے قوانین فطرت کی اطاعت کی جائے اور آسمان و زمین میں جس قدر مخلوق ہے، سب قوانین الہی کی اطاعت کر رہی ہے۔ پھر اگر تمہیں اللہ کے قوانین فطرت سے انکار ہے تو اللہ کے قانون کے سوا کائنات ہستی میں اور کون سا قانون ہو سکتا ہے؟

ایمان اور محبت

اللہ پر ایمان اور اللہ کی محبت دونوں لازم ملزوم ہیں۔ اگر کوئی اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی کو بھی ویسی ہی چاہت سے ماننے لگے، جیسی چاہت سے ماننا صرف اللہ کے لیے ہے تو یہ اللہ کے ساتھ دوسرے کو ہم پلہ بنادینا ہو اور توحید الہی کا اعتقاد درہم برہم ہو گیا۔ مومن وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ کی محبت رکھنے والا ہو۔ (وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ۔ البقرہ۔ ۱۶۵) جو کوئی اللہ سے محبت رکھنے کا دعویدار ہے اسے چاہیے کہ اللہ کے رسول کی پیروی کرے۔ اللہ کی محبت کا دعویٰ اور اس کی راہ بتلانے والے کی پیروی سے انکار ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔

قرآن مجید کے چار وصف

سورہ بونس میں ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّبَنَاتِنَا فِي الصُّدُورِ ۚ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿٥٤﴾ (آیت: ۵۴)

”لوگو تمہارے پاس پروردگار کی جانب سے ایک ایسی چیز آگئی ہے، جو موعظت ہے۔ دل کی بیماریوں کے لیے شفا ہے اور ہدایت اور رحمت ہے، ان لوگوں کے لیے جو اس پر یقین رکھتے ہیں۔“ اس میں قرآن کے چار وصف بیان کیے:

ا۔ ”مَوْعِظَةٌ“ ہے یعنی دل میں اثر جانے کی دلیلوں اور روح کو متاثر کرنے والے طریقوں سے ان تمام باتوں کی ترغیب دیتا ہے، جو خیر و حق کی باتیں ہیں۔ ان تمام باتوں سے روکتا ہے جو شر و بطلان کی باتیں ہیں۔ کیونکہ عربی میں وعظ کا مفہوم صرف نصیحت نہیں بلکہ ایسی نصیحت ہے جو موثر دلائل اور دل نشیں دلیلوں سے کی جائے۔

ب۔ ”شِفَاءٌ لِّبَنَاتِنَا فِي الصُّدُورِ“ دل کی تمام بیماریوں کے لیے نسخہ شفا ہے، جو فرد یا جو گروہ اس نسخے پر عمل کرے گا، اس کے قلوب ہر طرح کے مفاسد و ذائل سے پاک ہو جائیں گے۔ یاد رہے کہ عربی میں قلب، فواد اور صدر کے الفاظ جب کبھی ایسے موقع پر بولے جائیں، جیسا یہ موقع ہے تو ان سے مقصود انسان کی معنوی حالت ہوتی ہے۔ یعنی ذہن و فکر کی قوت، عقلی اور اک، جذبات و عواطف، اخلاق و عادات، اندرونی حیات۔ وہ عضو مقصود نہیں ہوتا، جو فن تشریح کا دل اور سینہ ہے۔

ج۔ ”هُدًى“ ہے یعنی یقین کرنے والوں کے لیے ایک ہدایت۔ د۔ ”رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ“ یقین کرنے والوں کے لیے پیام رحمت ہے، یعنی ظلم و قساوت اور بغض و تنفر سے دنیا کو نجات دلاتا ہے۔ رحم و محبت اور امن و سلامتی کی روح سے معمور کرتا ہے۔

اعلان ہی نہیں دلیل بھی

یہ محض قرآن کے اوصاف کا مدعیانہ اعلان ہی نہ تھا، بلکہ اس کی صداقت کی سب سے زیادہ موثر دلیل بھی تھا۔ اگر ایک شخص دعویٰ کرے کہ وہ طیب ہے تو اس کے دعوے کی جانچ کا سب سے زیادہ سہل اور قطعی طریقہ یہ ہو گا کہ دیکھا جائے اس کے علاج سے بیماروں کو شفا ملتی ہے یا نہیں؟ قرآن نے بھی جانچا یہی جانچ منکروں کے سامنے پیش کی ہے۔ اس نے کہا، میں نسخہ شفا ہوں۔ ثبوت میں مومنوں اور متقیوں کی جماعت پیش کر دی، جو اس کے دارالشفاء میں تیار ہوئی تھی۔ آج بھی اس کی دلیل اسی طرح قاطع ہے، جس طرح عہد نزول میں تھی۔ اگر اس نے عرب جاہلیت کے مریضان روح و دل میں سے ابو بکر، عمر، علی، خالد، سلمان، ابوذر رضی اللہ عنہم وغیرہ جیسی تندرست روحمیں پیدا کر دی تھیں تو کیا اس کے نسخہ شفا میں شک کیا جاسکتا ہے؟

صراط مستقیم اور دین قیم
سورۃ بنی اسرائیل آیت ۹ میں فرمایا:

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلْبَاقِي هِيَ الْقَوْمُ

”بلاشبہ یہ قرآن اس راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی راہ ہے۔“

قرآن نے اپنے جس قدر اوصاف بیان کیے ہیں، ان میں جامع ترین وصف یہی ہے کہ زندگی اور سعادت کے ہر گوشے میں اس کی رہنمائی سیدھی سے سیدھی بات کے لیے ہے۔ کسی طرح کی کجی، کسی طرح کا کچھ و خم، کسی طرح کا الجھاؤ، کسی طرح کی افراط و تفریط اس کی رہنمائی میں نہیں ہو سکتی۔ یہی حقیقت دوسری جگہ ”الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيمُ“ اور ”الذِّينُ الْقَيِّمُ“ (التوبہ۔ ۳۵) سے تعبیر کی گئی۔

دین حق کے تین بنیادی اصول
سورۃ اعراف آیت ۲۹ میں ہے:

قُلْ أَمَرَكَ بِالْقِسْطِ وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوا مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ

”تم کہو! میرے پروردگار نے جو حکم دیا ہے وہ تو یہ ہے کہ بات میں اعتدال کی راہ اختیار کرو۔ اپنی تمام عبادتوں میں خدا کی طرف توجہ درست رکھو اور دین کو اس کے لیے خالص کر کے اسے پکارو۔“
اس آیت میں دین حق کے تین بنیادی اصول واضح کر دیے:

۱۔ عمل میں اعتدال، ۲۔ عبادت میں توجہ اور ۳۔ خدا پرستی میں اخلاص۔ یہ آیت باب توحید میں اصل اصول ہے۔ دین کو خدا کے لیے خالص کر کے پکارو یعنی دین کی جتنی باتیں ہیں وہ صرف خدا ہی کے لیے مخصوص کرو۔ ”خلق“ اور ”امر“ دونوں اللہ ہی کی ذات سے ہیں یعنی وہی کائنات ہستی کا پیدا کرنے والا ہے اور اسی کے حکم و قدرت سے اس کا انتظام ہو رہا ہے۔

دکھاوے کی خیرات

دکھاوے کی خیرات اکارت جاتی ہے۔ جو شخص نیکی کے لیے نہیں، نام و نمود کے لیے خیرات کرتا ہے اور خدا کی جگہ انسانوں میں بڑائی چاہتا ہے وہ یقیناً خدا پر سچا ایمان نہیں رکھتا۔ ایسی خیرات سے روکا گیا ہے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب تک چوری چھپے خیرات نہ کر سکو، خیرات کرو ہی نہیں یا پوشیدگی کا تعلق بجائے خود عمل خیر سے مانع ہو جائے (چھپائے رکھنا ممکن ہو تو نہ چھپانا رفتہ رفتہ ریا و نمائش کا باعث بن سکتا ہے۔ نیت پاک ہو اور خدا کی رضا کے سوا کچھ منظور نہ ہو تو کسی کے سامنے بھی خیرات کر دینا نامناسب نہیں بلکہ بعض اوقات کھلم کھلا خیرات دوسروں کے لیے وسیلہ ترغیب بن جاتی ہے۔ مقصود حقیقی یہ ہے کہ نمود و نمائش سے نیت کا آئینہ آلودہ نہ ہونے پائے۔)

نکی اور بیکار چیزیں خیرات کے نام سے محتاجوں کو نہ دو، سوچو کہ اگر تمہیں کوئی ایسی چیز دے تو لینا پند کرو گے؟

محبت و ہمدردی کے تقاضے

نیکی کی راہ میں خرچ کرنے کی استعداد نشو و نما نہیں پاسکتی تھی، اگر اس کا حکم دیتے ہوئے ایسی باتوں سے روک نہ دیا جاتا جو ٹھیک ٹھیک اس کی ضد ہیں۔ پس اتفاق فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں خرچ کرنا) کے ساتھ ساتھ عود کی بھی ممانعت کر دی گئی۔

دین حق انسانوں میں محبت و ہمدردی پیدا کرنا چاہتا ہے اسی لیے خیرات کا حکم دیا کہ ہر انسان دوسرے کی احتیاج، اپنی احتیاج سمجھے۔ سود خوار کی ذہنیت بالکل اس کی ضد ہے، وہ چاہتا ہے دوسرے کی احتیاج سے خود انتہائی فائدہ اٹھائے اور محتاج کو دولت جمع کرنے کا ذریعہ بنائے (گویا سود خور کے دل میں ہم جنسوں کے لیے محبت و ہمدردی کا کوئی احساس باقی ہی نہیں رہتا۔)

مومن اور امید و یقین

قرآن نے ہر جگہ حقیقت واضح کی کہ ایمان، امید اور یقین ہے، کفر، شک اور مایوسی ہے۔ وہ بار بار اس بات پر زور دیتا ہے کہ مایوس نہ ہوں۔ امید کا چراغ روشن رکھو، ہر حال میں امید وار فضل و سعادت رہو، یہی مقتضائے ایمان ہے، یہی سرچشمہ زندگی ہے۔ اسی سے تمام دنیوی اور اخروی کامرانیوں کی دولت حاصل ہو سکتی ہے۔

جس انسان نے امید و یقین کی جگہ شک و مایوسی کی راہ اختیار کی، خواہ دنیا کی زندگی کے لیے ہو، خواہ آخرت کے لیے، اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اب اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ ایسے آدمی کے لیے صرف یہی چارہ کار رہ جاتا ہے کہ گلے میں پھند اڑالے اور زندگی ختم کر دے۔

ایمان نام ہی امید کا ہے اور مومن وہ ہے جو مایوسی سے کبھی آشنا نہیں ہو سکتا۔ اس کا ذہنی مزاج کسی چیز سے اتنا بیگانہ نہیں، جس قدر مایوسی سے۔ زندگی کی مشکلیں اسے کتنا ہی ناکام کریں لیکن وہ پھر سستی کرے گا۔ لغزشوں اور گناہوں کا ہجوم اسے کتنا ہی گھیرے لیکن وہ پھر توبہ کرے گا۔ نہ تو دنیا کی کامیابی سے وہ مایوس ہو سکتا ہے، نہ آخرت کی نجات سے۔ وہ جانتا ہے کہ دنیا کی مایوسی موت ہے اور آخرت کی مایوسی شقاوت۔ وہ دونوں جگہ رحمت الہی کو دیکھتا اور اس کی بخششوں پر یقین رکھتا ہے کہ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝ (اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اللہ سبھی گناہ بخش دیتا ہے۔ ہاں، وہ بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔ (سورہ زمر: ۵۳))

قبول حق کی استعداد

بارش سے صرف وہی زمین فائدہ اٹھا سکتی ہے جس میں اس کی استعداد ہو۔ شور زمین پر کتنی ہی بارش ہو سرسبز نہ ہوگی۔ اسی طرح قرآن کی ہدایت سے بھی وہی روحیں شاداب ہوں گی جن میں قبولیت حق کی استعداد ہے۔ جنہوں نے استعداد کھودی، ان کے حصے میں محرومی و نامرادی کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔

قبول حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ آباء و اجداد کی اندھی تقلید، گھڑی ہوئی بزرگیوں اور روایتی عظمتوں کی پرستش ہے۔ ابتدا میں جبل و فساد سے کوئی عقیدہ گھڑ لیا جاتا ہے، ایک مدت تک لوگ اسے ماننے رہتے ہیں۔ جب ایک عرصے کے اعتقاد سے اس میں شان نقد پس پیدا ہو جاتی ہے تو اسے شک و شبہ سے بالاتر سمجھنے لگتے ہیں اور عقل و بصیرت کی کوئی بھی دلیل اس کے خلاف تسلیم نہیں کرتے۔ قرآن اسی کو ”اَسْبَاءَ سَيِّئَاتُهَا اَنْتُمْ وَاَبَاؤُكُمْ“ (نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے گھڑ لیے ہیں) سے تعبیر کرتا ہے کیونکہ بنائے ہوئے ناموں کے سوا وہ کوئی حقیقت اور معقولیت پیش نہیں کر سکتے۔

پیغمبر اسلام کی دعوت کی تین خصوصیتیں

سورہ اعراف کی آیت ¹ میں پیغمبر اسلام کی دعوت کی تین خصوصیتیں بیان کیں:

- ۱۔ نیکی کا حکم دیتا ہے، برائی سے روکتا ہے۔
۲۔ پسندیدہ چیزوں کا استعمال جائز ٹھہراتا ہے، ناپسندیدہ چیزوں کے استعمال کو روکتا ہے، قرآن نے اس معنی میں ”طیبات“ اور ”خبائث“ کا لفظ اختیار کیا ہے۔
۳۔ جو بوجھ اہل کتاب پر پڑ گیا تھا اور جن پھندوں میں وہ گرفتار ہو گئے تھے، ان سے نجات دلاتا ہے۔ یہ بوجھ کیا تھا اور یہ پھندے کیا تھے، جن سے قرآن نے نجات دلائی؟ قرآن نے دوسرے مقامات پر اسے واضح کر دیا ہے: مذہبی احکام کی بیجا سختیاں، مذہبی زندگی کی ناقابل عمل پابندیاں، ناقابل فہم عقیدوں کا بوجھ، وہم پرستیوں کا انبار، عالموں اور فقیہوں کی تقلید کی بیڑیاں، پیشواؤں کے تعبد کی زنجیریں۔ پیغمبر اسلام کی دعوت نے ان سب سے نجات دلادی۔ سچائی کی ایسی سہل و آسان راہ دکھادی جس میں عقل کے لیے کوئی بوجھ اور عمل کے لیے کوئی سختی نہیں۔

① اس آیت ۱۵۷ کا متعلقہ حصہ یہ ہے:

يَا مُؤْمِنُ بِالْمُؤَدَّبِ وَيُؤْمِنُ عَنْ الْمُتَكَبِّرِ لَكُمْ الْعَاقِبَتُ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيُعَذِّبُ عَنْهُمْ اَصْرَهُمْ وَالْأَعْلَاقُ الْقِيَامُ كَانَتْ عَلَيْهِمُ (يعني اسلام، جس کی شفاعت تورات و انجیل میں یوں لکھتے تھے کہ) وہ نیکی کا حکم دے گا برائی سے روکے گا پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا گندی چیزیں حرام ٹھہرائے گا اس پر جو سے نجات دلائے گا جس تلے وہ دبے ہوں گے۔ ان پسندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار ہوں گے۔

در خشاں حقائق

چند حقائق ملاحظہ فرمائیے:

- ۱۔ قرآن کے نزدیک کسی جماعت کے مسلمان ہونے کی عملی شناخت دو باتیں ہیں: نماز کا اہتمام اور زکوٰۃ کا نظام، جو جماعت یہ دو عمل ترک کر دے گی (وہ عملاً) مسلمان متصور نہ ہوگی۔ زکوٰۃ کے نظام سے مراد ہے کہ حکومت یہ انتظام نہ کر سکے یا کسی جگہ مسلمان خدا نخواستہ محکوم ہو جائیں تو وہ خود زکوٰۃ کا نظام سنبھالیں۔
- اس آیت کا متعلقہ حصہ یہ ہے:
- ۲۔ شرف و بزرگی کے رسمی مناصب کوئی چیز نہیں۔ بزرگی اسی کے لیے ہے جو عمل و ایمان کی بزرگی رکھتا ہے۔
- ۳۔ قرآن کے نزدیک سب سے بڑا درجہ ان انسانوں کا ہے جو ایمان و حق پرستی کی راہ میں قربانیاں کرنے والے ہیں، نہ کہ ان لوگوں کا جو رواجی نیکیوں اور رسمی نمائشوں میں سرگرم نظر آتے ہیں۔
- ۴۔ مومن وہ ہے جس کی حب ایمانی پر دنیا کی کوئی محبت غالب نہ آ سکے۔
- ۵۔ جماعت کی زندگی اور فتح و کامرانی کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی خطرہ نہیں کہ مذہب اور رد لے آدمی اس میں موجود ہوں۔
- ۶۔ کاروبار حق میں دار و مدار شخصیتوں پر نہیں۔ شخصیت اس لیے ہے کہ بیج بودے۔ باقی رہے برگ و بار، تو ہو سکتا ہے کہ اس کی زندگی ہی میں سب نمودار ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ زندگی میں، کچھ اس کے بعد ہوں۔ اس تاخیر سے کاروبار حق پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔
- ۷۔ حلت و حرمت اشیاء میں قرآن کے اصول اربعہ:
- الف۔ اصل اباحت ہے نہ کہ حرمت، والا یہ کہ وحی الہی نے کسی چیز کو حرام ٹھہرا دیا ہو۔
- ب۔ کسی چیز کو حرام ٹھہرا دینے کا حق خدا کی شریعت کو ہے۔
- ج۔ محض اپنی رائے اور قیاس سے کوئی چیز حرام ٹھہرانا افزا علی اللہ یعنی خدا پر بہتان باندھنا ہے۔
- د۔ انسان کے عقائد و اعمال کی بنیاد علم و یقین پر ہونی چاہیے، نہ کہ وہم و گمان پر۔

تذکیر و توکیل

پیغمبر کا کام ”تذکرہ“ و ”تلیغ“ ہے ”بتیسر“ و ”تندیر“ ہے۔ وہ داعی اور مذکر ہے۔ ”وکیل“ یعنی نگہبان نہیں جو زبردستی کسی راہ میں کھینچ لے جائے، پھر اس سے نکلنے دے۔ سورہ یونس میں ہے: وَمَا آتَاكَ عَلَيْهِمْ يُوسِیْل (میں تم پر نگہبان نہیں۔ یونس: ۱۰۷)۔ دوسری جگہ پیغمبر اسلام کو مخاطب

کرتے ہوئے یہی مطلب یوں ادا کیا: وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ (تو ان لوگوں پر حاکم جابر کی طرح مسلط نہیں کہ جبراً اوپر آیت منوادی ق: ۴۵) نیز فرمایا: لَسْتُ عَلَيْهِمْ بِمُصْطَفٍ (مجھے ان پر داروغہ بنا کر نہیں بٹھادیا ہے کہ مانیں یا نہ مانیں لیکن تو انہیں راہ حق پر چلا دینے کا ذمہ دار ہو۔ غاشیہ: ۲۳) پھر فرمایا: فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْإِلَهَامُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (جو کچھ تیرے ذمے ہے یہی ہے کہ پیغام پہنچا دیا جائے۔ ان سے ان کے کاموں کا حساب لینا ہمارا کام ہے۔ رعد: ۴۰)

قرآن صاف صاف کہتا ہے کہ خدا کے رسولوں کا منصب تذکیر و تبلیغ کے اندر محدود تھا حالانکہ وہ خدا کی طرف سے مامور تھے۔ پھر ظاہر ہے کہ کسی دوسرے شخص کے لیے وہ کب گوارا کر سکتا ہے کہ وکیل، مصیطر اور جبار بن جائے۔

تذکیر و تبلیغ اور پسند و قبول

دراصل اعمال انسانی کے تمام گوشوں میں اصل سوال حدود ہی کا ہے اور ہر جگہ انسان نے اسی میں ٹھوکر کھائی ہے، یعنی ہر بات کی جو حد ہے اس کے اندر نہیں رہنا چاہتا۔ دو حق ہیں۔ دونوں کو اپنی اپنی حدود کے اندر رہنا چاہیے۔ ایک حق ہے تذکیر و تبلیغ کا، ایک پسند و قبولیت کا۔ ہر انسان کو اس کا حق ہے کہ جس بات کو درست سمجھتا ہے، اسے دوسروں کو بھی سمجھائے لیکن اس کا حق نہیں کہ دوسروں کے حق سے انکار کر دے۔ یعنی یہ بات بھلا دے کہ جس طرح اسے ایک بات کے ماننے نہ ماننے کا حق ہے، ویسا ہی دوسرے کو بھی ماننے نہ ماننے کا حق ہے اور ایک فرد دوسرے کے لیے ذمہ دار نہیں۔

تاریخ کو بارہ صدیوں تک اس بات کا انتظار کرنا پڑا کہ ایک انسان دوسرے انسان کو محض اختلاف عقائد کی بنا پر ذبح نہ کرے۔ اتنی بات سمجھ لے کہ ”تذکیر“ و ”توکیل“ میں فرق ہے۔ اب ڈیڑھ سو برس سے یہ بات دنیا کے عقلی مسلمات میں سے سمجھی جاتی ہے، لیکن اسے معلوم نہیں کہ اس کے اعلان کی تاریخ امریکہ اور فرانس کے ”اعلان حقوق انسانی“ سے شروع نہیں ہوئی۔ اس سے بارہ سو برس پہلے (نزل قرآن کے ساتھ) شروع ہو چکی تھی۔

خوف و حزن

قرآن نے اہل ایمان کی نسبت جو کچھ کہا ہے اس میں کوئی بھی بات اس قدر نمایاں نہیں جس قدر یہ کہ ”وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ“ (اور یہ قرآن میں کئی مقامات پر ارشاد ہوا ہے۔ البقرہ: ۶۲) یعنی وہ خوف اور غم دونوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کی سعادت کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا اور اس کی شقاوت کی ساری سرگزشت انہی دو لفظوں میں سمٹی ہوئی ہے: خوف اور دکھ۔ جو نبی ان دو باتوں سے

اسے رہائی مل گئی، اس کی ساری سعادتیں اس کے قبضے میں آگئیں۔ زندگی کے جتنے کانٹے بھی ہو سکتے ہیں سب کو ایک ایک کر کے چنو، خواہ جسم میں چھبے ہوں، خواہ دماغ میں، خواہ موجودہ زندگی کی عافیت میں خلل ڈالتے ہوں، خواہ آخرت کی۔ تم دیکھو گے کہ ان دو باتوں سے باہر نہیں، یا خوف کا کاٹنا ہے یا غم کا۔ قرآن کہتا ہے کہ ایمان کی راہ سعادت کی راہ ہے، جس کے قدم اس راہ میں جم گئے اس کے لیے دونوں کانٹے بے اثر ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہو گا، نہ کسی طرح کی غمگینی۔

عقل اور ماورائے عقل

قرآن اس بات کی بھی مذمت کرتا ہے کہ علم و بصیرت کے بغیر کوئی بات مان لی جائے اور اس کی بھی کہ محض عدم ادراک کی بنا پر کوئی بات جھٹلا دی جائے۔ اگر غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ انسان کی فکری گمراہیوں کا سرچشمہ یہی بات ہے۔ یا تو وہ عقل و بینش سے اس قدر کورا ہو جاتا ہے کہ ہر بات بے سمجھے ہو جھٹھ مان لیتا ہے اور ہر راہ میں آنکھیں بند کیے چلتا رہتا ہے، یا پھر سمجھ بوجھ کا غلط استعمال کرتا ہے۔ جہاں کوئی حقیقت اس کی شخصی سمجھ سے بالاتر ہوئی، جھٹلا دی۔ اس طرح حقیقت کے اثبات و وجود کا مدار صرف ایک خاص فرد کی سمجھ پر رہ گیا۔

صورتیں دو ہیں اور دونوں کا حکم ایک نہیں۔ ایک یہ کہ کوئی بات عقل کے خلاف ہو۔ ایک یہ کہ تمہاری عقل سے بالاتر ہو۔ بہت سی باتیں ہو سکتی ہیں، جن کا احاطہ تمہاری سمجھ نہیں کر سکتی، لیکن تم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ سرے سے خلاف عقل ہیں۔ اس لئے کہ اول تو افراد کی عقلی قوت یکساں نہیں، ثانیاً عقل انسانی برابر نشو و نما کی حالت میں ہے۔ ایک عہد کی عقل جن باتوں کا اثبات نہیں کر سکتی دوسرے عہد کے لیے وہ عقلی مسلمات بن جاتی ہیں۔ ثالثاً انسانی عقل کا ادراک ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور عقل ہی کا فیصلہ ہے کہ حقیقت اسی حد پر ختم ہو جاتی ہے۔

مرد و عورت کی اخلاقی مساوات

قرآن نے مرد اور عورت دونوں کا مساویانہ حیثیت سے ذکر کیا ہے اور فضائل و خصائل کے لحاظ سے وہ دونوں میں کسی طرح کی تفریق نہیں کرتا۔ سورہ نساء میں جہاں ازدواجی زندگی کے احکام کی تشریح ہے وہاں صاف صاف تصریح کر رہی ہے کہ فضائل و محاسن کے لحاظ سے دونوں یکساں طور پر اپنی اپنی راہیں رکھتے ہیں اور دونوں کے لیے ایک ہی طرح پر فضیلتوں کا دروازہ کھول دیا

گیاہے۔^۱ چنانچہ جس طرح وہ نیک مردوں کے فضائل و مدارج بتلاتا ہے اسی طرح نیک عورتوں کے بھی بتلاتا ہے یعنی جس طرح مردوں میں مسلم و مومن ہیں اسی طرح ایمان والی عورتیں ہیں۔ جس طرح اطاعت گزار مرد ہیں اسی طرح عورتوں میں بھی قانت عورتیں ہیں، جس طرح مردوں میں صادق مرد ہیں، اسی طرح عورتوں میں بھی صادق عورتیں ہیں۔ جس طرح مردوں میں اللہ کا خوف رکھنے والے اور بہ کثرت اس کا ذکر کرنے والے ہیں، اسی طرح عورتوں میں بھی اللہ کا خوف رکھنے والیاں اور بہ کثرت ذکر کرنے والیاں ہیں۔

قرآن کریم کی شہادت

مردوں کے لیے فرمایا:

الْمُتَّقِينَ الْعَمِلُونَ الصَّالِحِينَ الَّذِينَ لَهُمْ أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَاتٌ وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ الْكَافِرَاتُ وَالْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ (سورہ توبہ: ۱۱۲)

”اپنی لغزشوں اور خطاؤں سے (توبہ کرنے والے، عبادت میں سرگرم رہنے والے، اللہ کی حمد و ثنا کرنے والے، سیر و سیاحت کرنے والے، رکوع و سجود میں جھکنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے اور اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حد بندیوں کی حفاظت کرنے والے۔“

عورتوں کے لیے بھی فرمایا:

مُسْلِمَاتٍ مُّؤْمِنَاتٍ قَنَاطِئِرٍ تَطِيبُ لِحْظَهُنَّ يَتَّبِعْنَ عِلْمَهُنَّ (سورہ تحریم: ۵)

”مسلم عورتیں، مومن عورتیں، فرمانبردار، توبہ کرنیوالیاں، عبادت کرنے والیاں، سیر و سیاحت کرنے والیاں۔“

منافقوں کا ذکر کیا تو دو جنسوں کا کیا

الْمُتَّقِينَ وَالْمُتَّقَاتُ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (سورہ توبہ: ۶۷)

”منافق مرد اور منافق عورتیں، سب ایک دوسرے کے ہم جنس، برائی کا حکم دیتے ہیں اور اچھی باتوں سے روکتے ہیں۔“

پھر فرمایا:

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَنَاطِئِرَ وَالشَّاهِدِينَ وَالشَّاهِدَاتِ

^۱ اشارہ ہے اس آیت کی طرف: لِلَّذِينَ جَاءُوا الْغِيَاظَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُسْلِمِينَ (النساء: ۳۲) ”مردوں نے اپنے عمل سے جو کچھ حاصل کیا اس کے مطابق (ثمرات و نتائج میں) ان کا حصہ ہے۔ اور عورتوں نے اپنے عمل سے جو کچھ حاصل کیا اس کے مطابق (ثمرات و نتائج میں) ان کا حصہ ہے۔“

وَالشَّاهِدِينَ وَالشَّاهِدَاتِ وَالْمُتَّقِينَ وَالْمُتَّقَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّالِحِينَ وَالصَّالِحَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرًا وَأَجْرًا عَظِيمًا (سورہ احزاب: ۳۵)

”مسلم مرد اور مسلم عورتیں اور مومن مرد اور مومن عورتیں اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں اور صدق پر کاربند مرد اور صدق پر کاربند عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنیوالی عورتیں اور فروتنی کرنے والے مرد اور فروتنی کرنے والی عورتیں اور اپنی حفاظت کرنے والے پاکباز مرد اور اپنی حفاظت کرنے والی پاکباز عورتیں اور اللہ کا بہت ذکر کرنے والے مرد اور بہت ذکر کرنے والی عورتیں۔ ان کے لیے اللہ کے ہاں مغفرت اور بڑا اجر ہے۔“

غور کرو کسی وصف میں تفریق نہیں، کسی فضیلت میں امتیاز نہیں، کسی بڑائی میں عدم مساوات نہیں۔ پھر کیا ممکن ہے کہ جس قرآن نے مردوں اور عورتوں کی اخلاقی مساوات اس درجہ ملحوظ رکھی ہو، اسی قرآن کا یہ فیصلہ ہو کہ عورتوں کی جنس مردوں کے مقابلے میں زیادہ بد اخلاق ہے؟

صبر اور شکر

”صبر“ کے معنی ہیں مشکلوں اور مصیبتوں کے مقابلوں میں جے رہنا۔ ”شکر“ کے معنی ہیں اللہ کی بخشی ہوئی قوتوں (اور نعمتوں) کی قدر کرنا اور انہیں ٹھیک ٹھیک کام میں لانا۔ خدا کا یہ مقررہ قانون ہے کہ جو قوم (مشکلوں اور مصیبتوں کے مقابلے میں ثبات و استقامت پر استوار رہتی ہے اور) خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کی قدر بجالاتی ہے اور ان سے ٹھیک طور پر کام لیتی ہے۔ خدا اسے اور نعمتیں عطا فرماتا ہے، لیکن جو کفران نعمت کرتی ہے یعنی قدر شناسی نہیں کرتی، محرومی و ناامدادی کے عذاب میں گرفتار ہو جاتی ہے اور یہ اللہ کا سخت عذاب ہے، جو کسی انسانی گروہ کے حصے میں آتا ہے۔ غور کرو یہ حقیقت حال کی سچی تعبیر ہے کہ جو فرد یا گروہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کی قدر کرتا ہے مثلاً خدا نے اسے فتح مندی و کامرانی عطا فرمائی ہے وہ اس نعمت کو بچھڑاتا، اسے ٹھیک طور پر کام میں لاتا اور اس کی حفاظت سے غافل نہیں ہوتا، وہ اور زیادہ نعمتوں کے حصول کا مستحق ہو جاتا ہے یا نہیں؟ جو ایسا نہیں کرتا، اس کی ناامدادی و تباہی میں کوئی شک ہو سکتا ہے؟

اکتساب مال اور انفاق مال

ہر انسان کی ذہنی و جسمانی استعداد یکساں نہیں ہوتی، اس لیے وسائل معیشت کے حصول کے اعتبار سے بھی سب کی حالت یکساں نہیں ہوتی۔ کسی کو کمانے کے زیادہ مواقع حاصل ہو گئے کسی کو

تھوڑے پہلے قوت میں مقابلہ ہوا، طاقتور نے کمزور کو مغلوب کر لیا۔ پھر ذہن و جسم کا مقابلہ شروع ہوا اور ذہنی قوت نے جسمانی قوت کو مقہور کر لیا۔

قرآن اس صورت حال سے تو تعرض نہیں کرتا کہ حیثیت کے اعتبار سے تمام انسانوں کی حالت یکساں نہیں، لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ حصول و رزق کے اعتبار سے لوگوں کی حالت یکساں نہ ہو اور کسی کو ملے، کسی کو نہ ملے۔ وہ کہتا ہے ہر انسان جو دنیا میں پیدا ہوا، دنیا کے سامان رزق سے حصہ پانے کا یکساں طور پر حقدار ہے۔

دراصل قرآن کی اس تہ میں یہ بنیادی اصل کام کر رہی ہے کہ وہ نوع انسانی کے مختلف افراد اور جماعتوں کو ایک دوسرے سے الگ اور منقسم تسلیم نہیں کرتا، بلکہ سب کو ایک ہی گھرانے کے مختلف افراد قرار دیتا ہے۔ ایسے افراد جو آپس میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، ایک دوسرے کے شریک حال ہیں۔

(قرآن) کہتا ہے کمائی کے حق کا دامن انفاق کی ذمہ داری سے بندھا ہوا ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ تم انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ یہاں کمائی کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خرچ کرنے کی ذمہ داری اٹھائی جائے۔ تم جس قدر کماسکتے ہو کماد، لیکن یہ نہ بھولو کہ زیادہ سے زیادہ کمانا، زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کو کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے افراد کے ہاتھ کمائی کے لیے ہیں، لیکن جماعت کا حق خرچ کرانے کا ہے۔

غرض جہاں تک نظام معیشت کا تعلق ہے۔ قرآن نے اکتساب مال کا معاملہ، انفاق مال کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے اس لئے کوئی کمائی جائز نہیں تسلیم کی جاسکتی، اگر انفاق سے انکار کرتی ہو۔ ہر وہ کمائی جو محض اکتناز کے لیے ہو اور انفاق کے لیے دروازہ کھلا نہ رکھے، قرآن کے نزدیک ناجائز، ناپاک اور مستحق عقوبت ہے۔

بد عملی کا بڑا مرکز

انفرادی زندگی میں بد عملی کا بڑا مرکز دنیوی خوشحالی کی زندگی ہے۔ خوشحالی و ثروت کی حالت ایک ایسی حالت ہے کہ اگر کسی جماعت میں پھیلی ہوئی ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی برکت نہیں اور اگر صرف چند افراد میں سسٹی ہوئی ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں۔ کیونکہ جب دولت صرف چند افراد کے قبضے میں آگئی، باقی افراد جماعت محروم رہ گئے تو قدرتی طور پر ہر طرح کا غلبہ و تسلط چند افراد کے ہاتھ آجائے گا اور ایسے غلبہ و تسلط کا نتیجہ غرور باطل اور استکبار عن الحق ہے (اس صورت حال کی الم انگیز مثالیں ہر طرف موجود ہیں)۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن جس جماعتی خوشحالی کو اللہ کا سب سے بڑا فضل قرار دیتا ہے، اسی کو

انفرادی حالت میں ”فتنہ“ اور ”متاع غرور“ بھی کہتا ہے۔

آج تمام دنیا میں شور مچ رہا ہے کہ انفرادی سرمایہ داری دنیا کے لیے مصیبت ہے، لیکن قرآن چودہ سو برس پہلے اسے ”فتنہ“ قرار دے چکا اور اس کے لیے اکتناز کا لفظ بول چکا ہے۔

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا (سورۃ توبہ: ۳۴)

”اور جو لوگ چاندی اور سونا اپنے ذخیروں میں جمع کرتے رہتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اسے خرچ نہیں کرتے۔“

مشکل یہ ہے کہ جب تک قرآن کی صدا قرآن کی صدا ہے تمہاری نظروں میں چھپتی نہیں، جب وہی بات وقت کے ذہن و فکر سے اٹھنے لگتی ہے تو فوراً اس کی پرستش شروع کر دیتے ہو۔

فضیلت و کامرانی کے طریقے

سورہ اعراف میں ہے:

وَإِنْ تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَى لَا يَسْمَعُوا وَتَوَلَّوْهُمْ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ﴿۱۹۸﴾ خُذِ الْعُقُودَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ﴿۱۹۹﴾ (آیت ۱۹۸-۱۹۹)

”(اے پیغمبر) اگر تم ان لوگوں کو سیدھے راستے کی طرف بلاؤ تو ہرگز تمہاری پکار نہ سنیں۔ تمہیں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تمہاری طرف تک رہے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دیکھتے نہیں (بہر حال) نرمی و گزر سے کام لو، نیکی کا حکم دو، جاہلوں کے طرف متوجہ نہ ہو۔“

(دیکھیے) چند لفظوں کے اندر زندگی کی اخلاقی مشکلات کا پورا حل اور فضیلت و کامرانی کے تمام طریقے واضح کر دے۔ ”خُذِ الْعُقُودَ“، ”أْمُرْ بِالْعُرْفِ“ اور ”أَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ“ یعنی نا سمجھوں کی نا سمجھی بخش دینا، نیکی کی دعوت میں سرگرم رہنا اور جاہلوں کے پیچھے نہ پڑنا۔ سرسری نظر میں پتا نہیں لگے گا، اچھی طرح اور بار بار غور کرو۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کون سا گوشہ ہے جس کی ساری عملی مشکلات ان تین اصولوں سے حل نہیں ہو جاتیں؟

آیت ۱۹۸ میں فرمایا: حقیقت یہ ہے کہ تجھے دیکھتے نہیں کیونکہ اگر دیکھتے تو کبھی انکار نہ کرتے۔ سو ایک دیکھنا سلمان رضی اللہ عنہ فارسی کا تھا، جو پہلی ہی نگاہ میں پکار اٹھا: واللہ ما هذا الوجه وجه الکذاب (خدا کی قسم یہ صورت جھوٹے آدمی کی ہو نہیں سکتی) اور ایک دیکھنا ابو جہل کا تھا کہ مَالِ هَذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَنْشَرِي فِي الْأَشْوَاقِ (یہ کیسا نبی ہے کہ آدمیوں کی طرح غذا کا محتاج ہے اور بازاروں میں پھرتا ہے؟ الفرقان: ۷)

وفائے عہد اور قرآن

عہد جاہلیت کے عرب وفائے عہد کی اخلاقی قدر و قیمت سے بے خبر نہ تھے، ان میں ایسے لوگ بھی تھے، جو اپنے اور اپنے قبیلے کے مفاخر میں سب سے زیادہ نمایاں جگہ وفائے عہد کو دیتے تھے، لیکن جہاں تک جماعتی معاہدوں کا تعلق ہے، وفائے عہد کا عقیدہ کوئی عملی قدر و قیمت نہیں رکھتا تھا۔ آج ایک قبیلہ ایک قبیلے سے معاہدہ کرتا تھا، کل دیکھتا تھا کہ اس کے مخالف زیادہ طاقتور ہو گئے ہیں تو بے دریغ ان سے جا ملتا تھا اور معاہدہ و حلیف پر حملہ کر دیتا تھا۔ اگر کسی دشمن فریق سے (عہد جاہلیت کے عرب) امن کا معاہدہ کرتے، پھر دیکھتے کہ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا موقع پیدا ہو گیا ہے تو ایک لمحے کے لیے بھی معاہدے کا احترام انہیں حملہ کر دینے سے نہیں روکتا تھا اور بے خبر دشمن پر جاگرتے تھے۔

قرآن راستبازی کی جو روح پیدا کرنا چاہتا تھا وہ ایک لمحے کے لیے بھی ایسی بد اخلاقی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے وفائے عہد اور احترام پیمان کا جو معیار قائم کیا ہے وہ اس درجہ بلند، قطعی، بے پلک اور عالمگیر ہے کہ انسانی اعمال کا کوئی بھی گوشہ اس سے باہر نہیں رہ سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ فرد ہو یا جماعت، ذاتی معاملات ہوں یا سیاسی، عزیز ہوں یا اجنبی، ہم قوم و مذہب ہوں یا غیر ہم قوم و مذہب، دوست ہوں یا دشمن، امن کی حالت ہو یا جنگ کی، لیکن کسی بھی حال میں عہد شکنی جائز نہیں، وہ ہر حال میں جرم ہے، معصیت ہے۔ اللہ کے ساتھ ایک بات کر کے اسے توڑ دینا ہے عذاب عظیم کا اپنے کو مستحق ثابت کرنا ہے۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جابجا وفائے عہد پر زور دیا ہے اور جہاں کہیں مومنوں کے ایمانی فضائل کی تصویر کھینچی ہے، یہ وصف سب سے زیادہ ابھر اہوا نظر آتا ہے:

۱۔ وَالْمُؤْمِنُونَ بَعْدَهِمْ إِذَا عَاهَدُوا (البقرہ: ۱۷۷)

”اور جب قول و قرار کر لیتے ہیں تو اس کا پاس کرتے ہیں۔“

۲۔ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمْتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رِعُونَ ﴿۸﴾ (المومنون - ۸)

”نیز جن کی حالت یہ ہے کہ اپنی امانتوں اور عہدوں کا پاس رکھتے ہیں۔“

احادیث میں منافق کی یہ پہچان بتلائی گئی ہے: إِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ: ”جب وعدہ کرے گا پورا نہ کرے گا۔“

سورۃ نحل آیت ۹۲ میں فرمایا:

تَتَخَذُونَ آيَاتِنَا كَمَا تَتَّخِذُونَ آيَاتِ اللَّهِ مِنْ أَهْلِ مِنْ أُمَّةٍ إِنَّمَا يَبْتَلُواكُمُ اللَّهُ بِهِ

”تم آپس کے معاملے میں اپنی قسموں کو مکرو و فساد کا ذریعہ بناتے ہو، اس لیے کہ ایک گروہ کسی دوسرے گروہ سے (طاقت میں) بڑھ چڑھ گیا ہے (یاد رکھو) اس معاملے میں اللہ تمہاری

(راستبازی اور استقامت کی) آزمائش کرتا ہے۔“

پھر اس طرح کی بد عہدی کی مثال کیا ہے؟ فرمایا:

كَالَّذِي نَقَضَتْ غَزَلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَا (اس عورت کی سی ہے جس نے بڑی جانفشانی سے سوت کا تا، پھر خود ہی اسے ٹکڑے کر کے برباد کر دیا۔ النحل - ۹۲) یعنی جب ایک شخص یا ایک گروہ کوئی معاہدہ کرتا ہے تو اس کی جنگی کے لیے بڑی باتیں کرتا ہے۔ ہر طرح دوسرے فریق کو یقین دلاتا ہے۔ پھر اگر ایک بات اتنی کوشش کے بعد پختہ کی گئی ہے تو کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ جس نے کل پختہ کی تھی، وہی آج اسے اپنے ہاتھوں سے توڑ کر رکھ دے۔

رسول اکرم ﷺ کی شانِ رافت و رحمت

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿۱۲۹﴾ (توبہ: ۱۲۸-۱۲۹)

”تمہارے پاس اللہ کا رسول آگیا ہے جو تم ہی میں سے ہے۔ تمہارا رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق گزرتا ہے۔ وہ تمہاری بھلائی کا بڑا ہی خواہشمند ہے۔ وہ مومنوں کے لیے شفقت اور رحمت رکھنے والا ہے اگر اس پر بھی یہ لوگ سرتابی کریں تو ان سے کہہ دو میرے لیے اللہ کا سہارا بس کرتا ہے کوئی معبود نہیں مگر اس کی ذات، میں نے اسی پر بھروسہ کیا وہ تمام عالم ہستی (کی جہانداری) کے عرش عظیم کا خداوند ہے۔“

ان دو آیتوں میں عرب کی اس نسل سے خطاب ہے جو اس وقت مخاطب تھی۔ فرمایا: اللہ کا رسول تم میں آگیا اس نے اپنا فرض رسالت ادا کر دیا۔ وہ کسی دوسری جگہ سے تم میں نہیں آ نکلا تھا۔ سنت الہی کے مطابق خود تمہیں میں پیدا ہوا اور چونکہ تمہیں میں سے ہے، اس لیے اول سے آخر تک اس کی ساری باتیں تمہاری نگاہوں کے سامنے رہی ہیں۔ اس کا لڑکپن بھی تم میں گزرا اس کی جوانی کے دن بھی تم میں بسر ہوئے۔ پھر اس نے نبوت کا اعلان کیا تو اس نے تم سے کہیں چھپ کر زندگی بسر نہیں کی، اس کی ساری باتیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے پھر جو کچھ گزرا تھا، گزرا۔ تم نے مظلومی و بیکسی کے اعلان بھی سن لیے۔ فتح و کامرانی میں ان کی تصدیق بھی کر لی۔ تم میں کوئی نہیں جو اس کی بے داغ زندگی کا شاہد نہ ہو اور کوئی نہیں جس نے اس کی ایک بات کی سچائی آزمائش نہ لی ہو۔

پھر (رسول ﷺ کے) ایک ایسے وصف پر زور دیا، جو منصب رسالت کے لیے اور ہر اس انسان کے لیے جو قوم کی رہنمائی و قیادت کا مقام رکھتا ہو، سب سے زیادہ ضروری ہے، یعنی ابنائے جنس کے لیے شفقت و رحمت۔ فرمایا: اس سے زیادہ کوئی بات تمہارے لیے یقینی نہیں ہو سکتی کہ وہ سرتاپا شفقت و رحمت ہے۔ وہ تمہارا دکھ برداشت نہیں کر سکتے۔ تمہاری ہر تکلیف خواہ جسم کے لیے

اسلام صلعم کی مخالف تھیں، ان کے تمام کام اول سے آخر تک ظلم و تشدد، دغا و فریب اور وحشت و تشدد پر مبنی رہے اور پیغمبر اسلام صلعم اور ان کے ساتھیوں نے جو کچھ کیا اس کا ایک ایک فعل، صبر و تحمل، راستی و دیانت اور عفو و بخشش کا اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ تھا:

- ۱۔ مظلومی میں صبر۔
- ۲۔ مقابلے میں عزم۔
- ۳۔ معاملے میں راستبازی۔
- ۴۔ طاقت و اختیار میں درگزر۔

تاریخ انسانیت کے وہ نوادر ہیں، جو کسی ایک زندگی کے اندر اس طرح کبھی جمع نہیں ہوئے (جس طرح رسول اکرم ﷺ کی ذات بابرکت کے اندر جمع ہوئے اور پورا عہد مبارک نبوت ان نوادر کی درخشاںیوں سے جگمگا رہا ہے۔ گویا سیرۃ طیبہ کا نچوڑ یہی ہے جو حقیقت میں انسانیت عالیہ و عظمیٰ کا سدرۃ المنتہی ہے)۔

”نذیر“ و ”بشیر“

انسان کی ایک عالمگیر گمراہی یہ رہی ہے کہ جب کوئی انسان روحانی عظمت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے تو چاہتے ہیں کہ اسے انسانیت و بندگی کی سطح سے بلند کر کے دیکھیں۔ لیکن قرآن نے پیغمبر اسلام ﷺ کی حیثیت صاف اور قطعی لفظوں میں واضح کر دی کہ ہمیشہ کے لیے اس گمراہی کا ازالہ ہو گیا۔ صرف یہی ایک بات ان کی صداقت کے اثبات کے لیے کفایت کرتی ہے۔

جو دنیا پیشواؤں کو خدا اور خدا کا بیٹا بنانے کی خواہشمند تھی، اسلام کے پیغمبر ﷺ نے اس سے اتنا بھی نہ چاہا کہ کاہنوں کی طرح مجھے غیب دان تسلیم کر لو۔ زیادہ سے زیادہ اپنی نسبت جو بات سنائی، یہ تھی کہ میں انکار و بد عملی کے نتائج سے خبر دینے والا ”نذیر“ اور ایمان و نیک عملی کی برکتوں کی بشارت دینے والا ”بشیر“ ایک بندہ ہوں، اگر غیب داں ہوتا تو زندگی کا کوئی گزند مجھے نہ پہنچتا:

کیا ایسے انسان کی زبان سے سچائی کے سوا کوئی بات نکل سکتی ہے؟

چہ عظمت دادہ ای یا رب بخلق آں عظیم الشان
کہ ”انی عبدہ“ گوید بجائے قول ”سجانی“

ہو، خواہ روح کے لیے، اس کے دل کا درد و غم بن جاتی ہے۔ وہ تمہاری بھلائی کی خواہش سے لبریز ہے۔ وہ اس کے لیے ایسا مضطرب قلب رکھتا ہے کہ اگر اس کی بن پڑتی تو ہدایت و سعادت کی ساری پاکیاں پہلے ہی دن گھونٹ بنا کر پلا دیتا۔ پھر اس کی یہ شفقت و محبت تمہارے ہی لیے نہیں وہ تو تمام مومنوں کے لیے خواہ عرب کے ہوں یا عجم کے ”رؤف رحیم“ ہے۔

”رؤف“ ”رافت“ سے ہے اور اس کا اطلاق ایسی رحمت پر ہوتا ہے جو کسی کی کمزوری اور مصیبت پر جوش میں آئے۔ پس رافت رحمت کی ایک خاص صورت ہے اور رحمت عام ہے۔ دونوں کے جمع کر دینے سے رحمت کا مفہوم زیادہ قوت و تاثیر کے ساتھ واضح ہو گیا۔ خدا نے یہ دونوں وصف جابجا اپنے لیے فرمائے ہیں اور یہاں اپنے رسول کے لیے بھی فرمائے۔

پیام موعظت کی ضرورت

اس کے بعد مجمع مخاطبین یہ سب کچھ دیکھ لینے اور تجربہ کر لینے کے بعد بھی ادائے فرض سے اعراض کرے تو اسے پیغمبر تم آخری اعلان کرو کہ میرے لیے اللہ بس کرتا تھا اور اب بھی بس کرتا ہے۔ وہ اپنے کلمہ سخت کا محافظ ہے اس کی مشیت نے جو فیصلہ کر دیا ہے بہر حال ہو کر رہنے والا ہے۔ اس کا قیام و عروج کسی خاص ملک اور قوم کی پشت پناہی پر موقوف نہیں۔ میرا بھروسہ اللہ ہی پر تھا، اسی پر ہے، میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو گیا۔

یہ پیام موعظت یہاں کیوں ضروری ہوا؟ اس کے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ دو باتیں سامنے رکھ لی جائیں: سورۃ (یعنی سورۃ توبہ) کے نزول کا وقت اور سورۃ کے مطالب۔ یہ سورۃ اس وقت نازل ہوئی جب تمام عرب میں کلمہ حق سر بلند ہو چکا تھا اور گو قرآن کی عالمگیر فیروز مندویوں کی خبر دے دی تھی، تاہم ان لوگوں کے لیے جو کل تک غربت و بیکسی کی انتہائی مصیبتوں میں رہ چکے تھے۔ تمام عرب کا مسلمان ہو جانا بڑی سے بڑی کامرانی تھی اور اس لیے ناگزیر تھا کہ ایک طرح کی فارغ البالی اور بے پروائی طبیعتوں میں پیدا ہو جائے۔ غزوہ تبوک کی تیاریوں میں بعض سے جو تساہل ہوا اس کی تہ میں بھی اس حالت کی جھلک صاف دکھائی دے رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورۃ میں اس تفصیل اور شدت کے ساتھ استعداد کار اور عزم و ہمت کی گئی ہے کہ اس کی نظیر کسی دوسری سورۃ میں نہیں ملتی۔

تاریخ انسانیت کے نوادر

کوئی شخص کتنے ہی مخالفانہ ارادے سے مطالعہ کرے، لیکن تاریخ اسلام کے چند واقعات اس درجہ واضح اور قطعی ہیں کہ ممکن نہیں کہ ان سے انکار کیا جاسکے۔ ازاں جملہ یہ کہ جو جماعتیں پیغمبر

رحمت و شفقت کا ابر گہر بار

آدمیت احترام آدمی

ہدایت کے لیے لامتناہی تڑپ

رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک میں مخلوق کے لیے بے پایاں شفقت و رحمت کا جو سمندر موجزن تھا، اس کا ذکر کتاب میں پے در پے آتا رہا ہے، ساتھ ساتھ مثالیں پیش ہوتی رہی ہیں۔ باقی رہی شفقت و رحمت کی مفصل کیفیت تو اگر میں بیان کرنا بھی چاہوں تو الفاظ اور بیان مطالب کی صلاحیت کہاں سے لاؤں؟ وہی ایرانی شاعر کا معاملہ ہے:

کتاب فضل ترا آب بحر کافی نیست

کہ ترکتم سر انگشت و صفحہ بشمارم

ہمارے لیے کلام الہی سے بڑھ کر قاطع، فیصلہ کن اور دل پذیر شہادت کوئی نہیں ہو سکتی۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَلَعَلَّكَ بَاعِثٌ نَفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا ۝ (کہف: ۶)

”(اے پیغمبر تری حالت تو یہ ہو رہی ہے کہ) اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائیں تو عجب نہیں تو ان کے پیچھے افسوس کے مارے اپنی جان ہلاکت میں ڈال دے۔“

کیا خلق خدا کی دنیوی اور اخروی بہبود کے لیے انتہائی محبت و شفقت کی کوئی روشن تر شہادت ہو سکتی ہے۔ جس کا دائمی ذکر اس کتاب مقدس میں محفوظ ہو گیا۔ جو ذکر ”الطلمین“ ہے؟ یہ غمگینی اور اندوہنا کی روئے زمین کے تمام انسانوں اور پوری نوع بشر کے لیے تھی، خواہ ان کا تعلق کسی نسل، کسی خطے اور کسی قوم سے تھا۔

انبیائے کرام ہدایات اصلاح کے طالب ہی نہیں، عاشق ہوتے ہیں۔ انسانوں کی گمراہی ان کے دلوں کا ناسور ہوتی ہے اور ہدایت کا جوش ان کے دل کے ایک ایک ریشے کا عشق۔ اس سے بڑھ کر ان کیلئے کوئی غمگینی نہیں ہو سکتی کہ ایک انسان سچائی سے منہ موڑ لے اور اس سے بڑھ کر ان کے

لیے کوئی شادمانی نہیں ہو سکتی کہ ایک گمراہ قدم راہ راست پر آجائے۔ قرآن میں اس صورت حال کی شہادتیں جا بجا ملتی ہیں۔

غور طلب حقائق

آپ نے اس صورت حال کے اسباب پر بھی کبھی غور فرمایا؟ یہ خیال کر لیتا تو انتہا درجے کی سخافت و کم عقلی کا ثبوت ہو گا کہ داعی حق ایک انسان نما مشین ہوتا ہے جو اوپر سے نازل شدہ ہدایات کو خلق خدا کے سامنے دہراتا رہتا ہے، حاشا وکلا۔

۱۔ مشیت ایزدی جن مقدس ہستیوں کو دعوت حق کے لیے چنتی رہی ان کی فطرتیں ہم جنسوں کی اصلاح و فلاح اور سودو بہبود کے غم میں سراپا سوز و درد ہوتی تھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی داعی حق روزگار کی حد درجہ حوصلہ فرسا مشکلات کے باوجود اپنے وظیفے کی بجا آوری پر چٹان کی طرح جمایا نہ کر رہ سکتا تھا؟ اگر ایسا نہ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ انتہائی ناسازگار حالات میں یہ کیوں فرماتے کہ خدا کی قسم ’ اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند لا کر رکھ دیں، تب بھی میں اپنے فریضہ دعوت سے باز نہ آؤں گا، یہاں تک کہ خدا اس کام کو پورا کر دے یا خود میں اس پر نثار ہو جاؤں۔

۲۔ قرآن مجید اس حقیقت کی پے در پے گواہی دے رہا ہے کہ ہر داعی حق نے آغاز دعوت کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کر دیا کہ میں اس کام کے لیے کسی سے اجر کا طلبگار نہیں۔ میرا اجر تو اللہ کے پاس ہے۔ اگر ہر داعی حق کے قلب مقدس میں ہم جنسوں کو راہ راست پر لانے کے لیے انتہائی تڑپ نہ ہوتی تو ہر قسم کی ذاتی اغراض سے کامل برات کا دعویٰ کیوں بار بار زبان پر لایا جاتا؟

۳۔ پھر ہر داعی حق پر ایک ایک فعل اور ایک ایک حرکت کے نتائج و عواقب برائی الصین آشکارا ہوتے ہیں۔ انجام بد کا تصور ایک شے ہے، انجام بد کی تلخیوں اور ناخوشگوار یوں کا مشاہدہ بالکل دوسری شے ہے۔

۴۔ اگر کسی کا قدم گمراہی میں بڑھتا جائے تو عام لوگ سمجھیں گے کہ وہ از روئے شریعت عذاب کا سزاوار ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بخش دے تو دوسری بات ہے، لیکن داعی حق پر معاملہ جزا اسی طرح عیاں ہوتا ہے جس طرح سلیم البصارت آدمی کو دن کے وقت آفتاب نظر آتا ہے۔ پھر ہم جنسوں کے لیے بے پایاں شفقت و رحمت کی بنا پر سب کو تعزیر و معفویت کی حوصلہ فرسائیوں اور ٹکلیب گداز یوں سے محفوظ رکھنے کے لیے داعی حق جس غمگینی و اندوہنا کی اور جس اضطراب و بے تابی کا تحنہ مشق مبتا ہو گا، اس کی شدت اور وسعت حدود

صافی میں اور کسی چیز کا سراغ نہیں لگایا جاسکتا۔

۵۔ پھر یہ بھی فرمایا: میں ان لوگوں کی تباہی کے لیے کیوں دُعا مانگوں؟ اگر یہ ایمان نہیں لاتے تو کیا ہوا، ان کی آئندہ نسلیں ضرور ایک خدا پر ایمان لائیں گی۔

کیا اپنے پیغام کی صداقت پر بے پایاں یقین اور ہم جنسوں کے لیے بے پایاں رحمت کی ایسی کوئی مثال مل سکتی ہے؟ کیا ہدایت کی لامتناہی امید کا کوئی ایسا نقشہ آپ کو کسی دوسری جگہ نظر آسکتا ہے؟

تاریخ گواہ ہے کہ آئندہ نسلیں نہیں، خود وہ نسل بھی حضور ﷺ کے دست مبارک پر ایمان لائی، جس کے ہاتھ چند سال پیشتر حضور ﷺ کو سنگ باری کا نشانہ بنا چکے تھے۔ یقین رکھیے واقعہ طائف اپنی معنوی بے مثالی ہی کی بن پر سیرۂ طیبہ کا ایک اہم موڑ بن گیا، جہاں سے ہجرت کے مقدمات شروع ہو گئے اور دین حق کی دعوت اس منزل کے دروازے پر پہنچ گئی، جس میں ”يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَهْلًا“ (النصر-۲) کا نظارہ مہر و ماہ کی آنکھوں کے لیے جشن عید بننے والا تھا۔

عہد نبوی ﷺ کی جنگیں

ہم جنسوں کے لیے بے پایاں شفقت و رحمت کی ایک روشن و ستاریز عہد نبوی کی جنگیں بھی ہیں، جن کی حقیقی حیثیت اور معنوی خصوصیت پر اب تک بہت کم توجہ فرمائی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کسی بھی دور میں جنگ کے خواہاں نہ تھے جو دین عالم انسانیت کے لیے صلح و امن، محبت و اخوت اور فلاح و بہبود کا پیغام تھا، اس میں رزم و پیکار کے لیے کون سی گنجائش ہو سکتی تھی؟ لیکن قریش مکہ کے غرور و تکبر اور ظلم و جور نے شریف و حق پرست انسان کے لیے جینا دو بھر کر دیا، حالانکہ ان کی کلوکاری حق پرستی اور شرافت کسی کے لیے بھی باعث تکلیف نہیں ہو سکتی تھی، مجبور ہو کر پہلے ایک جماعت کو حبش جانے کی اجازت دے دی گئی۔ قریش مکہ نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا، پھر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کا انتظام ہوا۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام پشتوں کے گھر بار چھوڑ کر مدینہ منورہ چلے گئے لیکن یہ بعد مکانی بھی قریش کی آتش اشتعال روک نہ سکا۔ بلکہ ان کی پیش دستوں اور آزار رسانیوں کا سلسلہ تیز تر ہو گیا۔ ان حالات میں حفظ و دفاع اور پیش بندیوں کے سوا چارہ نہ رہا اور حفظ و دفاع اس دنیا میں ہر فرد و جماعت کا اولین فطری حق ہے، جس پر امن عالم کا انحصار ہے۔

غزوات و سرایا

رسول اللہ ﷺ کو جن مہموں سے سابقہ پڑا انھیں دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن مہموں کی قیادت حضور ﷺ نے بہ نفس نفیس فرمائی انھیں غزوات کہتے ہیں، جن مہموں کی

ہمارے محدود اور آلودہ اغراض ذہنوں میں کیونکر سما سکتی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے خود ایک موقع پر فرمایا کہ میں تمہیں دامن پکڑ پکڑ کر کھینچ رہا ہوں مگر تم آگ میں گر پڑتے ہو۔

۵۔ رسول اللہ ﷺ تمام مکارم و فضائل نبوت کے جامع تھے، کیونکہ آپ ﷺ پورے عالم انسانیت کی ہدایت کے لیے مجبوث ہوئے تھے، اس لیے تمام خصوصیات میں بھی سب سے افضل تھے۔ سورۃ کہف کی محولہ بالا آیت کے دو پہلو ہیں اور دونوں بہ ہر حال ہر اس فرد کے پیش نظر ہونے چاہئیں جو رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات سے انتساب کا مدعی ہو:

الف: یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے جوش و دعوت و اصلاح اور نوع بشر کے لیے بے پایاں شفقت کا صحیح نقشہ پیش کر رہی ہے۔

ب۔ ہر مدعی اسلام کا فرض ہے کہ ”لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ“ کی پیروی میں حضور ﷺ کی ان خصوصیتوں (جوش و دعوت و اصلاح اور بے پایاں شفقت و رحمت) کا بھی بہتر عملی پیکر بنے۔

واقعہ طائف

حضور ﷺ کے سفر طائف کا ذکر کرتے ہوئے عرض کیا جا چکا ہے کہ دعوت حق کی جو سرگزشت دنیا کے مذہبی دفتر اور سفینوں میں محفوظ ہے، اس میں سے کوئی ایسا واقعہ دکھایا نہیں جاسکتا جو طائف میں حضور ﷺ کی دعوت حق کا ثبیل بن سکے، دیکھیے:

۱۔ سفر طائف کا مقصد اس کے سوا کیا تھا کہ اہل طائف ہدایت کی راہ پر لگ جائیں؟ اس میں انہی لوگوں کی بھلائی اور بہتری تھی، دنیوی بھی اور اخروی بھی، حضور ﷺ نے صرف فریضہ تبلیغ ادا کرنے میں ہر زحمت گوارا فرمائی تھی۔

۲۔ طائف کے گمراہ اور حق ناشناس رنیموں نے حضور ﷺ سے جو سلوک روا رکھا وہ ہر زاویہ نگاہ سے ظلم و تعدی کا ایک نہایت افسوسناک مظاہرہ تھا۔ عرب کے دور جاہلیت میں ایسے مظاہروں کی کہیں بھی کمی نہ تھی۔

۳۔ ان رنیموں کی انگیت پر اوباشوں نے رسول اللہ ﷺ کو سنگ باری کا ہدف بنایا، یہاں تک کہ پیشانی مبارک کا خون بہہ بہہ کر پائے مبارک تک پہنچ گیا اور آپ ﷺ نے ایک باغ میں پناہ لی۔

۴۔ اس دردناک حالت میں بھی آپ ﷺ کے قدوسی تحمل پر کوئی اثر نہ پڑا۔ اس موقع پر بارگاہ باری تعالیٰ میں جو دُعا کی وہ اپنے محل پر منقول ہے۔ اس میں سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں نکالا جاسکتا جس سے متنی و ناخوشگوار کی بو سونگھی جاسکے۔ اللہ کی لگن کے سوا حضور ﷺ کے قلب

سر عسکری پر دوسرے اصحاب مامور ہوئے انہیں سرایا (جمع سرے) کہا جاتا ہے۔

قاضی محمد سلیمان مرحوم منصور پوری نے ”رحمۃ المصلین“ کی دوسری جلد میں بیایا غزوات، سرایا کا ذکر نام بنام کیا ہے اور ان کی تفصیلات بتائی ہیں۔ بعض کتابوں میں اس سے بہت کم تعداد کا ذکر ہوا ہے لیکن اصل سوال تعداد کا نہیں بلکہ نوعیت کا ہے۔ ان سب کو عموماً غزوات یا سرایا ہی قرار دے لیا گیا ہے حالانکہ ان میں سے اکثر ایسی تھیں، جنہیں کسی بھی زاویہ نگاہ سے جنگیں سمجھنا یا جنگیں قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔ مثلاً ابن حزمؒ نے حدیبیہ کو بھی غزوہ قرار دیا ہے حالانکہ نہ رسول اللہ ﷺ جنگ کے ارادے سے نکلے تھے، نہ جنگ کی نوبت آئی۔ آپ ﷺ صرف عمرہ ادا کرنا چاہتے تھے۔ جس کے دروازے سب کے لیے کھلے تھے اور حضور ﷺ کا یہ سفر ذی قعدہ میں ہوا تھا، جو اشہر الحرم میں سے تھا یعنی جس میں ککشل یاروک تمام قریش کے لیے جائز ہی نہ تھی۔ قاضی سلیمان مرحوم نے انہیں مہمیں بھی نہیں کہا بلکہ محض ”نقل و حرکت“ قرار دیا ہے اور یہ تعبیر ان میں سے اکثر کی حقیقی کیفیت کی صحیح آئینہ دار ہے۔

مہموں کی نوعیت

قاضی سلیمان مرحوم کی بیان کردہ بیایا مہموں میں سے بیشتر کی کیفیت خلاصہ ذیل میں درج کی جاتی ہے:

۱۔ ان میں سے بعض کو جنگیں قرار دینا واہقہ غلط ہے۔ مثلاً رجب اور بزمعونہ کی طرف جو لوگ بھیجے گئے وہ نہ فوجی دستے تھے نہ اس غرض سے بھیجے گئے تھے کہ لڑیں۔ وہ محض مبلغ اور مقرر تھے، اس وجہ سے بھیجے گئے تھے کہ لوگوں نے قرآن اور اسلام سیکھنے کی غرض سے ان کے ارسال پر اصرار کیا تھا۔ بزمعونہ بھیجے جانے والے لوگوں کے لیے ایک رئیس قبیلہ نے ذاتی ضمانت بھی قبول کر لی تھی۔ یہ کل اسی (۸۰) افراد تھے۔ ستر بزمعونہ اور دس رجب بھیجے گئے۔ ان دونوں جماعتوں کو اچانک غداری سے سابقہ پڑا۔ اسی (۸۰) میں سے صرف ایک محفوظ رہا، باقی سب نے شہادت پائی، ان کا نقصان بھی جنگی نقصانات میں محسوب نہیں ہو سکتا۔

۲۔ پھر ان میں سے خاصی مہمیں ایسی تھیں جن میں بہت کم آدمی بھیجے گئے، اتنے کم کہ انہیں جنگوں میں شامل کرنا معطلہ خیر ہوگا۔ مثلاً:

آدمی	مہمیں
ایک ایک	۵
پانچ پانچ	۲

دس دس	۲
بارہ بارہ	۲
پندرہ پندرہ	۳
تیس تیس	۴
پچیس پچیس	۲
تیس تیس	۵
چالیس چالیس	۲

گویا ستائیس مہموں میں اتنے تھوڑے آدمی بھیجے گئے کہ انہیں جنگیں کہا ہی نہیں جاسکتا۔ یہ دراصل طلائے گرد دستے تھے، جو اس وجہ سے وقتاً فوقتاً اطراف میں بھیجے گئے کہ دشمن کی نقل و حرکت کے متعلق معلومات حاصل کریں تاکہ اس کے مفید منصوبوں سے آگاہ ہو کر مناسب دفاعی تدبیریں عمل میں لائی جاسکیں یا کہیں کوئی فتنہ انگیز فرد قتل و غارت کے عادی قبیلوں کو براہیختہ کر کے مدینہ منورہ پر چھاپا مارنے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ ایک جانباز گیا اور اس فتنہ انگیز کو ”وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ“ (البقرہ۔ ۲۱۷) کے اصول پر ختم کر کے چلا آیا اور وہاں لوگ امن چین سے بیٹھ گئے۔

۳۔ حدیبیہ کا ذکر پہلے آچکا ہے، وہ جنگ تھی ہی نہیں، اس کا مقصد ادائے عمرہ تھا۔ آخر قریش سے دس سال کے لیے صلح ہو گئی نیز قرار پا گیا کہ مسلمان آئندہ سال آکر عمرہ ادا کر لیں۔ قریش تین روز کے لیے شہر مکہ سے نکل کر آس پاس کے پہاڑوں میں جا بیٹھیں گے۔ بعض مہمیں اس وجہ سے تیار ہوئیں کہ دشمن کے چھاپا مار دینے اچانک حملہ کر کے چند امن پسند شہریوں کو خاک و خون میں تڑپا چکے تھے، ان کا تعاقب کیا گیا۔ ایسی مہمیں بھی عرفاً جنگ نہیں سمجھی جاسکتیں۔

۵۔ بعض مہمیں اطراف مدینہ کے پاس گئیں اور ان سے معاہدہ ہائے صلح و امن کر لیے۔ ان معاہدوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ دشمن کی فتنہ انگیزی کا دائرہ محدود کر دیا جائے اور قبیلوں کو دشمن کی عیاریوں کا تحنہ مشق نہ بننے دیا جائے۔

۶۔ ایک مثال ایسی بھی ہے کہ کچھ لوگ باہر سے آئے جو بیمار تھے انہیں رحم کھا کر مدینہ کی چراگاہ میں ٹھہرا دیا گیا تاکہ کھلی آب و ہوا میں رہیں اور اونٹنیوں کا دودھ پئے۔ وہ تندرست ہو گئے لیکن دور جاہلیت کے احسان ناشناسوں کی طرح انہوں نے چراگاہ کے رکھوالے کو شہید کر ڈالا اور اونٹ ہنگالے گئے۔ ان کا بھی تعاقب کر کے انہیں پکڑا اور مناسب سزا دی گئی۔ اسے کون جنگ کہنا پسند کرے گا؟

۷۔ ایک مرتبہ بعض قبائلیوں نے اچانک چر اگاہ پر حملہ کر دیا تھا اور کچھ اونٹ ہنکالے گئے تھے۔ ان کا بھی تعاقب کیا گیا اور اونٹ واپس لے لیے گئے، یہ بھی جنگ نہ تھی۔

جانی نقصان

سیرت نگاروں نے ان تمام مہموں کو باقاعدہ جنگیں قرار دے لیا اور اس طرح تعداد خاصی بڑھ گئی حالانکہ ان میں سے ایک بھی مہم ایسی نہ تھی جسے جنگ کہا جاسکے۔ بلاشبہ بعض مہمیں ایسی ہیں کہ اطلاع ملی، فلاں مقام پر لوگ اس غرض سے جمع ہو رہے ہیں کہ مدینہ منورہ پر حملہ کر کے اول لوٹ مار کا شوق پورا کریں دوم قریش مکہ کی نظروں میں اعتبار پائیں، جو ہر اس گروہ کو سر پر بٹھانے کے لیے تیار ہتے تھے جس کے ذریعے سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے، ایسے بعض گروہوں کے خلاف اچانک اقدام کر کے انھیں منتشر کر دیا گیا۔ ایسی مہموں میں مسلمانوں کو بھی جانی نقصان پہنچا اور غیر مسلموں کے آدمی بھی قتل ہوئے۔ غرض میں نے قاضی سلیمان مرحوم کی درج کی ہوئی فہرست میں سے کم و بیش ستر مہمیں الگ کر لیں، جنہیں کسی بھی اعتبار سے جنگ نہیں کہا جاسکتا اور ان کے جانی نقصان کے اعداد بھی قاضی صاحب مرحوم ہی کی فہرست کے مطابق جمع کیے تو نتیجہ یہ نکلا:

فریق	نقصان جان
مسلمان	۹۶
مخالفین	۱۸۸

بعض مہموں میں مخالفوں کے مقتولوں کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو سکی اور قاضی صاحب مرحوم بھی انکا کوئی سراغ نہ لگا سکے۔ وہ اعداد قیاساً شامل کر لینے چاہئیں تاہم وہ پندرہ بیس سے زیادہ نہ ہوں گے۔ ان اعداد میں بنو قریظہ کے ان افراد کا جانی نقصان شامل نہیں، جنھیں سعد رضی اللہ عنہ بن معاذ کے فیصلہ ثالثی کی بنا پر موت کی سزا دی گئی تھی، یہ سزا موسوی شریعت کے عین مطابق تھی اور سعد رضی اللہ عنہ کو بنو قریظہ نے خود ثالث بنا دیا تھا۔ ان مقتولین میں ایک عورت بھی تھی، جسے اس لیے سزائے موت ملی کہ اس نے قلعے کی چھت پر سے ایک مسلمان پر چکی کا پاٹ گرا کر شہید کر دیا تھا، حالانکہ وہ دیوار کے سایے صرف سستانے کے لیے بیٹھ گیا تھا۔ یہ لوگ میدان جنگ کے مقتولین نہ تھے۔ اسی طرح رجب اور بزم معونہ کے مسلمان شہداء بھی مسلمانوں کے جانی نقصان میں شامل نہیں۔

باقاعدہ جنگیں

جن مہموں کو باقاعدہ جنگیں قرار دیا جاسکتا ہے، وہ بھی مسلمانوں کو بالکل ناخواستہ پیش آگئی تھیں اور ان میں بھی پیش دستی مسلمانوں کی طرف سے نہیں ہوئی تھی۔ مثلاً

۱۔ غزوہ بدر یوں پیش آگیا: رسول اللہ ﷺ یہ اطلاع پا کر مدینہ منورہ سے نکلے کہ قریش کا وہ قافلہ تجارت شام سے لوٹ رہا ہے، جس کا پورا نفع مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاری میں صرف ہو نوا تھا اس قافلے کو روکنا ضروری تھا۔ لیکن سالار قافلہ مختلف اطلاعات کی بنا پر پہلے ہی عام راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے نکل گیا جو دس بارہ میل مغربی جانب تھا۔ اس اثنا میں یہ اطلاع مل گئی تھی کہ قریش ایک ہزار کے قریب سواروں اور پیادوں کے ساتھ بدر پہنچ گئے ہیں نیز ان کا ارادہ وہاں ٹھہرنے اور جشن منانے کا ہے۔ مسلمانوں کے لیے لڑنا اس وجہ سے ناگزیر ہو گیا کہ اگر طرح دے جاتے تو اول قریش ان قبیلوں پر دباؤ ڈالتے، جن سے مسلمانوں کے معاہدے ہو چکے تھے اور ان قبیلوں کے لیے دوبارہ مسلمانوں سے معاہدہ کرنے کی کیا صورت رہتی؟ دوم قریش مدینہ منورہ پر چڑھائی کر دیتے تو نتائج مسلمانوں کے لیے بدر جہاز زیادہ خطرناک ہوتے، جتنے بدر میں لڑنے سے ہو سکتے تھے۔ لہذا بدر کو مشیت ایزدی نے حق و باطل کی جنگ کا پہلا میدان بنا دیا۔

۲۔ غزوہ احد اس لیے پیش آیا کہ قریش مکہ نے بدر کے انتقام میں مدینہ منورہ پر حملہ کیا تھا۔ قریش مکہ کی فوج کم از کم تین ہزار تھی۔ مسلمان زیادہ سے زیادہ ساڑھے سات سو تھے۔ تیر اندازوں کے ایک گروہ کی غلطی کے باعث مسلمانوں کا سخت نقصان ہوا تاہم میدان انہی کے ہاتھ رہا۔

۳۔ غزوہ احزاب بھی قریش مکہ اور یہود خیبر کی مشترکہ سازش کا نتیجہ تھا، جس میں قریش و یہود مختلف قبائل کو گوناگوں لالچ دے کر ساتھ لے آئے اور کم از کم دس ہزار افراد نے مدینہ منورہ پر ہجوم کیا اور دفاع کے لیے ایک طویل خندق کھودی گئی۔

۴۔ غزوہ خیبر اس وجہ سے پیش آیا کہ یہود خیبر نے احزاب میں ناکامی کے بعد غطفان اور دوسرے قبائل کو مدینہ منورہ پر حملے کے لیے آمادہ کر لیا تھا۔ اس وجہ سے ناگزیر ہو گیا کہ اقدام کر کے قتل کی یہ آگ ہمیشہ کے لیے بھجادی جائے۔

۵۔ موت کی مہم اس سبب سے پیش آئی کہ موتہ کے مسیحی حاکم ثرجیل نے رسول اللہ ﷺ کے سفیر کو ناحق قتل کر دیا تھا۔ سفیر کا قتل اس دور میں بھی ایک فتنہ بین الاقوامی جرم تھا۔ تین ہزار مجاہدین اس خون ناحق کا انتقام لینے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ انھوں نے کم از کم ایک لاکھ فوج غنیم کو میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

۶۔ مکہ مکرمہ پر پورش اس وجہ سے ناگزیر ہو گئی کہ قریش نے معاہدہ حدیبیہ کے باوجود اپنے ایک حلیف قبیلے کوشہ اور مدد دے کر مسلمانوں کے قبیلے پر حملہ کر لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے طائفی مافات کی دو صورتیں پیش کر دیں۔ یعنی یا تو ان لوگوں کا خون بہا دیا جائے جو حملے کے

باعث ناحق مارے گئے۔ یا قریش اپنے حلیف قبیلے کی پاسداری سے خود ہاتھ اٹھالیں۔ مسلمان بطور خود مناسب فیصلہ کر لیں گے۔ قریش نے دونوں میں سے کسی بھی صورت پر عمل نہ کیا اور مکہ مکرمہ پر پیش قدمی کے سوا چارہ نہ رہا۔

۷۔ غزوہ حنین اس وجہ سے پیش آیا کہ فتح مکہ کے بعد بنو ہوازن اور بنو ثقیف مسلمانوں پر حملے کی تیاریاں کر رہے تھے اور اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ حدود حرم میدان جنگ بنیں گے۔ محاصرہ طائف غزوہ حنین ہی کا شاخسانہ تھا۔

۸۔ جو کہ کا سفر اس لیے اختیار کیا گیا کہ قیصر کی طرف سے عرب پر حملے کی تیاریوں کے متعلق متواتر خبریں موصول ہوئی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ تیس ہزار جانبازوں کی معیت میں کھن منزلیں طے کر کے عرب کی شمالی سرحد پر پہنچ گئے تاکہ لڑائی غنیم کے علاقے میں ہو، بیس روز قیام فرمایا۔ کوئی لڑائی پیش نہ آئی اور حضور ﷺ مختلف گروہوں کو امان نامے دے کر لوٹ آئے۔

باقاعدہ جنگوں کے نقصانات

ان باقاعدہ جنگوں کے جانی نقصانات کا اندازہ قاضی محمد

سلیمان مرحوم کے فراہم کردہ اعداد کے مطابق درج ذیل ہے: ①

جنگ	مسلمانوں کا جانی نقصان	مخالفوں کا جانی نقصان	کیفیت
بدر	۲۲	۷۰	عام روایتوں کے مطابق صرف چودہ مسلمان شہید ہوئے تھے۔
اُحد	۷۰	۳۰	عام روایت کے مطابق قریش کے صرف ۲۳ افراد قتل ہوئے تھے۔
خندق یا احزاب	۶	۱۰	عام روایت کے مطابق مخالفوں کے صرف چار آدمی قتل ہوئے تھے۔
خیبر	۱۸	۹۳	
موتہ	۱۲	نامعلوم	

① اس نقشے میں فتح مکہ کے نقصانات شامل نہیں وہ سابقہ اعداد میں شامل کر لیے گئے ہیں یعنی دو مسلمان اور گیارہ غیر مسلم۔

حنین	۶	۷۱	ابن حزم نے شہدائے حنین کی تعداد چار بتائی ہے۔ (جوامع السیرۃ ص ۲۴۱)
محاصرہ طائف	۱۳	نامعلوم	
تبوک	x	x	
میزان	۱۴۷	۲۷۴	

مخالفین کے جانی نقصان میں موتہ اور طائف کے اعداد شامل نہیں، وہ بہت زیادہ نہ ہوں گے۔ غرض تمام چھوٹی بڑی مہموں اور باقاعدہ جنگوں میں مسلمانوں اور مخالفوں کا کل جانی نقصان یہ ہوا:

$$\text{مسلمان} = ۶ + ۱۴۷ + ۹ = ۲۶۲$$

$$\text{مخالفین} = ۱۸۸ + ۲۷۴ + ۳۶۲ = ۷۲۴$$

ان میں رجیع اور بر معونہ کے شہداء کو شامل نہیں کیا گیا، کیونکہ وہ تبلیغ کے سوا کسی دوسرے مقصد کے لئے بھیجے ہی نہیں گئے تھے اگر آپ انہیں بھی جانی نقصان میں شامل کر لیں تو پوری تعداد اتنا ہی کے اضافے سے تین سو تیس بن جائے گی۔ اسی طرح مخالفوں کے اعداد نقصان میں جنگ، موتہ اور محاصرہ طائف کے مقتولین شامل نہیں کیے گئے۔ ان کے شمول سے مخالفوں کی تعداد میں بھی کسی قدر اضافہ ہو جائے گا اگرچہ وہ زیادہ سے زیادہ چند سو ہی کا ہو سکتا ہے۔

قاضی صاحب مرحوم کا نقشہ

قاضی محمد سلیمان مرحوم نے پہلے غزوات و سرایا کا ایک مفصل نقشہ دیا ہے، جس میں ایک ایک مہم اور ایک ایک جنگ کے متعلق الگ الگ بتایا گیا ہے کہ فریقین کے کل کتنے آدمی شریک تھے اور ان میں سے کتنے مقتول یا شہید، کتنے مجروح اور کتنے اسیر ہوئے۔ ① پھر انھوں نے تمام اعداد کا ایک جامع نقشہ تیار کیا جو درج ذیل ہے: ②

فریق	شہید یا مقتول	مجروح	اسیر	میزان	کیفیت
مسلمان	۲۵۹	۱۲۷	۱	۳۸۷	قاضی صاحب مرحوم نے تصریح فرمادی کہ فریقین کے زخمیوں کی

① رحمة اللعالمین جلد دوم (ص ۲۴۳، ۲۶۴)

② ایضاً ایضاً (ص ۲۸۰)

تعداد صحیح نہیں، اسیروں اور مقتولوں کی تعداد صحیح ہوگی۔ انشاء اللہ					
مخالفین	۷۵۹	-	۶۵۶۲	۷۳۲۳	=
میزان	۱۰۱۸	۱۲۷	۶۵۶۵	۷۷۱۰	=

توجہ طلب حقیقت

خاص توجہ کی محتاج یہ حقیقت ہے کہ رمضان ۱۱ھ (مارچ ۶۲۳ء) سے ۹ھ (۶۳۰ء) تک جتنی جہڑ ہیں، یا کھکشیں یا جنگیں ہوئیں، ان میں مسلمانوں اور مخالفوں کا نقصان جانی زیادہ سے زیادہ ایک ہزار اٹھارہ لاکھ ہے اور یہ اتنا بے حقیقت نقصان ہے کہ جب میں نے مختلف احباب سے اس کا ذکر کیا تو انھیں ابتدا میں یقین ہی نہ آیا کہ جو کچھ عرض کیا جا رہا ہے، وہ حقیقت ہے۔ اچھا، آپ فرض کر لیں کہ یہ نقصان حقیقی کا صحیح مرقع نہیں۔ اس عدد کو دگنا یا گنا کر لیجیے۔ پھر بھی نقصان زیادہ سے زیادہ تین ہزار جانوں کا ماننا ہو گا۔ یاد رہے کہ اس حساب میں ہم نے غزوات و سرایا کی نوعیتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے ہر جہڑ کے نتائج یکجا کر لیے ہیں، انھیں اٹھ سال پر پھیلا لیا جائے تو فی سال کے حساب سے پونے چار سو آدمیوں کا نقصان ہوا اور یہ ان جنگوں کا نقصان ہے جن کے نہ رسول اللہ ﷺ خواہاں تھے اور نہ حضور نے کسی میں پیش دستی کی۔ معاملہ محض پیغام حق کی تبلیغ کا تھا، جو صلح و امن کے ساتھ رزم و پیکار سے قطع نظر کرتے ہوئے برابر جاری رہا۔ کس طرح اور کیونکر؟ اس کے مفصل حالات ہمیں معلوم نہیں۔ یہاں تک کہ ہجرت کے آٹھویں سال عرب کی اندرونی کشمکشیں ختم ہو گئیں اور تبلیغ نے پہلی منزل کامیابی سے طے کر لی، یعنی عرب جو ق درجہ، گروہ در گروہ اور قبیلہ در قبیلہ حلقہ بغوش اسلام ہو گئے، جو وجود اقدس حق و باطل کی پہلی امتحان گاہ یعنی غزوہ بدر میں صرف تین سو تیرہ جانباز لاسکا تھا، وہ جوک کی جانب روانہ ہوا تو اس کا پرچم حق تیس ہزار سرفروشنوں پر لہرا رہا تھا۔ اللہ اور دین حق کی راہ میں سب کچھ نثار کر دینے والا اتنا بڑا لشکر پہلے عرب کی سر زمین سے اٹھا تھا۔

کیا حقیقتہً ہزار سوا ہزار یا زیادہ سے تین ہزار جانوں کے نقصان کے ساتھ اتنا عظیم القدر کا رنامہ انجام دینے کی کوئی مثال روئے زمین کی سرگزشت کے کسی بھی حصے سے پیش کی جاسکتی ہے؟ اس سرگزشت میں ظہور اسلام سے پیشتر کا دور بھی شامل ہے اور بعد کا دور بھی، پھر یہ روشن حقیقت بھی ہر لحاظ سے سامنے رہنی چاہیے کہ یہ صرف زمین کی تسخیر نہ تھی، یہ تخت حکومت اور سر پر

سلطنت آراستہ کرنے کا معاملہ نہ تھا۔ اس دور میں ایک نئی قوم وجود پذیر ہو چکی تھی۔ کیسی قوم؟ قرآن مجید گواہ ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْعُرْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (آل عمران: ۱۱۰)

”مسلمانو! تم تمام امتوں میں بہتر امت ہو جو عالم انسانیت کے ارشاد و اصلاح کے لیے ظہور میں آئی۔ تم نیکی کا حکم دینے والے برائی سے روکنے والے اور اللہ پر سچا ایمان رکھنے والے ہو۔“

ان تین چھوٹے چھوٹے جملوں میں سب کچھ فرما دیا گیا، جو کسی انسانی گروہ کی مدح و ستائش میں کہا جاسکتا تھا۔ اللہ پر ایمان، معروف کا حکم اور منکر کی روک تھام کے بعد کون سی چیز باقی رہ گئی، خواہ اس کا دائرہ کوئی ہو؟

پھر عربوں کی حالت ظہور اسلام سے پیشتر کیا تھی؟ جنگل کے وحشیوں اور درندوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔ تمام قبیلوں اور گروہوں کے چلن و حیثیت تھے۔ لوٹ مار کے سوا ان کا کوئی پیشہ نہ تھا۔ ان کی زندگیاں فتنہ و فساد میں کٹتی تھیں۔ دو شخصوں میں معمولی سی بات پر جھگڑا ہو جاتا تو قبیلوں کے قبیلے اس آگ میں کود پڑتے تھے۔

قرآن مجید ہی گواہ ہے کہ اس قوم کو جو شیوہ ہائے انسانیت کے اعتبار سے شاید روئے زمین کی پست ترین قوم تھی، بلند ترین مسند پر لایا گیا اور امامت روئے زمین کا منصب سونپ دیا:

وَإِذْ كُنَّا إِلَهُكُمْ عَلَى الْأَرْضِ وَكُنْتُمْ عَلَى الْكُفْرِ كَاذِبِينَ (آل عمران: ۱۰۳)

”اللہ نے تمہیں جو نعمت عطا فرمائی ہے اس کی یاد سے غافل نہ ہو تمہارا حال یہ تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے۔ (لیکن اللہ کے فضل و کرم سے ایسا ہوا کہ) بھائی بھائی بن گئے۔ تمہارا حال تو یہ تھا کہ آگ سے بھری خندق کے کنارے کھڑے تھے (ذرا پاؤں پھسلتا اور شعلوں میں جا گرتے) اللہ نے تمہیں اس خطرناک حالت سے نکال لیا۔“

وَأَلْفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ لَوْ أَنفَقْتَ مِثْرَى الْأَرْضِ جَمِيعًا مَا أَلْفَتْ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ أَلْفَ بَيْنَهُمْ (انفال: ۶۳)

”اور (اللہ ہی ہے جس نے) مومنوں کے دلوں میں باہم الفت پیدا کر دی، اگر تو وہ سب کچھ صرف کر ڈالتا جو روئے زمین میں ہے۔ جب بھی ان کے دلوں میں باہمی الفت نہ جوڑ سکتا یہ اللہ ہے جس نے ان میں باہمی الفت پیدا کر دی۔“

اس مختصر سی مدت میں جس میں تسخیر ارض کی پہلی منزل طے ہوئی، نئی قوم معرض وجود میں آگئی۔ ایک نیا نظام بھی پوری کامیابی سے جاری ہو گیا جو روئے زمین کے انسانوں کی تقدیریں پلٹ دینے والا تھا اور کیسی قوم؟

اگر تاریخ میں ایسی دوسری قوم کی مثال ملتی ہے تو تلاش کر لیجیے۔ اتنے معمولی سے جانی نقصان کی بناء پر جس کی حقیقی مقدور سوا ہزار سے زیادہ نہ تھی، صرف آٹھ نو سال میں یہ سب کچھ عملی صورت میں دنیا کے سامنے آگیا۔ کیا اس وجود اقدس کے ”رحمتہ للعالمین“ ہونے میں کسی کو دم بھر کے لیے تامل ہو سکتا ہے؟ لوگ معجزوں میں کلام کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ پُر تاثیر اور یقینی طور پر ناقابل انکار معجزہ کون سا ہو سکتا ہے؟

تصویر کا دوسرا رخ

یہاں تقابل مقصود نہیں، کیونکہ تقابل بہ ہر حال کسی نہ کسی مناسبت کی بناء پر کیا جاسکتا ہے اور یہاں مناسبت کا ملا نا پید ہے۔ ہاں، عبرت کی غرض سے کچھ اعداد و شمار ان قوموں اور ملکوں کے پیش کیے جاتے ہیں، جو بہ زعم خویش تہذیب و شائستگی کے سدرۃ المنبتی پر بیٹھے ہیں۔

دوسری عالمی جنگ کے ابتدائی دور میں انگریزوں کو اپنی اور فرانسیسیوں کی فوجیں ڈنکرک سے نکالنی پڑی تھیں تو آدمیوں کو بچالانا مقدم قرار دے دیا گیا اور بھاری سامان جنگ دشمن کے حوالے کیے بغیر چارہ نہ رہا۔ چرچل نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ساز و سامان جنگ مشینوں میں ڈھالا جاسکتا ہے لیکن آدمی مشینوں میں نہیں ڈھالے جاسکتے۔ تاہم آپ خوب چھان بین کر لیں کہ مہذب یورپ نے باہمی جنگوں میں اور خصوصیت سے ان جنگوں میں جو ایشیائی اور افریقی خطوں میں کی گئیں، انسانی خون کو پانی سے بڑھ کر ارزاں بنائے رکھا یا نہیں اور یہ سلسلہ مشرق وسطیٰ یا ہند چینی میں آج بھی انتہائی بے پروائی سے جاری ہے۔ گویا وہاں انسان نہیں بے جتن کے خون کا احترام اہل مغرب میں سے کسی کے لیے قابل توجہ ہو۔

مرقع عبرت

آپ نے رحمتہ للعالمین ﷺ کی ناخواستہ جنگوں کے اعداد ملاحظہ فرمائیے، جنہیں زیادہ سے زیادہ بڑھا کر بھی آٹھ نو سال میں تین ہزار تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ اب داعیان تہذیب کی رزم آرائیوں کا پورا مرقع نہیں، بلکہ اس کی صرف چند جھلکیاں دیکھ لیجیے۔

۱۔ ”سی سالہ جنگ“ ۱۶۱۸ء سے ۱۶۴۸ء تک تیس سال جاری رہی، جس میں جرمنی، فرانس، آسٹریا، سویڈن وغیرہ نے حصہ لیا۔ اس میں صرف جرمنی کے ایک کروڑ بیس لاکھ آدمی مارے گئے۔^①

۲۔ امریکی خانہ جنگی ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۵ء تک جاری رہی۔ اس میں ایک فریق شمالی ریاستیں اور دوسرا فریق جنوبی ریاستیں تھیں اور جنگ کا سبب غلامی کا مسئلہ تھا۔ اس میں تین لاکھ آدمی شمالی ریاستوں کے اور پانچ لاکھ جنوبی ریاستوں کے مارے گئے۔ چوتھ کرڈ پونڈ خرچ ہوئے۔ اس رقم سے دنیا بھر کے غلام ایک قطرہ خون بہائے بغیر آزاد کرائے جاسکتے تھے۔ امریکہ میں غلامی قانوناً ختم ہو چکی ہے۔ لیکن اس کی تمام لعنتیں آج بھی وہاں مکر وہ ترین صورت میں موجود ہیں۔

۳۔ پہلی عالمی جنگ میں ایک کروڑ آدمی مارے گئے تھے اور دو کروڑ مجروح ہوئے تھے۔ خدا جانے ان میں سے کتنے لوے، لنگڑے، اندھے اور اپاہج ہوئے اور کتنوں نے ہسپتالوں میں جانیں دیں۔ پھر اس جنگ ہی سے انفو سنز شروع ہوا، جس میں مزید ایک کروڑ آدمی مر گئے۔ ایک انسانیت دوست صاحب علم کا اندازہ ہے کہ اس جنگ پر اسی (۸۰) ارب پونڈ خرچ ہوئے۔ اس رقم سے فرانس اور بلجیم کی نہ صرف زمین بلکہ ہر چیز پانچ پانچ مرتبہ خریدی جاسکتی تھی۔

دوسری عالمی جنگ

۴۔ دوسری عالمی جنگ کے صرف مقتولین کی فہرست پر ایک نظر ڈال لیجیے:

چین	۱۳،۱۰،۲۲۴
فرانس	۲،۰۰،۰۰۰
جرمنی	۶۳،۰۰،۰۰۰
صرف فضائی بمباری	۵،۰۰،۰۰۰
جاپان	۵،۳۵،۷۹۵
بمباری سے	۴۱،۲،۳۰۹
یونان	۴،۱۵،۰۰۰
برطانیہ	۳،۵۳،۶۵۲

ان اعداد کی میزان قریباً ایک کروڑ بنتی ہے لیکن ان میں بہت سے شرکائے جنگ کے مقتولین شامل نہیں۔ مثلاً چیکو سلواکیا، پولینڈ، روس، فن لینڈ، یوگوسلاویا، بلغاریا، ناروے، ڈنمارک، ہالینڈ، اٹلی وغیرہ، پھر مختلف ملکوں کے ان گروہوں کا جانی نقصان معلوم نہ ہو سکا، جنہیں ہٹلر کی فوجیں جبری مزدوری کے لیے جرمنی لے گئی تھیں۔ اور جنگ کے اختتام تک وہ لوگ واپس نہ ہو سکے۔ یہ تمام اعداد جمع کیے جائیں تو دوسری عالمی جنگ کا نقصان دو کروڑ افراد سے بھی بڑھ جائے گا۔

عالمی اصلاح و امن کی محکم بنیادیں

آل کتب زندہ قرآن حکیم حکمت او لایزال است و قدیم
نوع انسان را پیام آخریں حامل او ر رحمة اللعین صلی اللہ علیہ وسلم

عالمی اور بین الاقوامی زاویہ نگاہ

اسلام کا زاویہ نگاہ یک قلم عالمی اور بین الاقوامی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پوری کائنات انسانیت کی ہدایت کے لیے معبوث ہوئے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب تبلیغی دعوت نامے ارسال فرمائے تھے تو وہ صرف روسائے عرب کے لیے نہ تھے بلکہ ایران کے کسریٰ، مشرقی روم کے قیصر، مصر کے مقوقس اور حبش کے نجاشی کے لئے بھی تھے۔ یہ ملک عرب کے ارد گرد واقع تھے، ان کے ساتھ عربوں کے تجارتی روابط تھے اور وہ ان ملکوں میں جاتے آتے تھے۔ یہ عالمی دعوت اسلام کی طرف پہلا قدم تھا۔ مسلمانوں کا فرض تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کی پیروی میں دعوت و تبلیغ کے دائرے کو تدریجاً وسیع کرتے رہتے۔ یہاں تک کہ اسلام دنیا بھر میں پھیل جاتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس غرض سے معبوث ہوئے تھے۔ وہ پایہ تکمیل پر پہنچ جاتی۔ افسوس کہ تھوڑا ہی عرصہ گزرنے کے بعد ایسی حکومتیں وجود میں آ گئیں، جو وضع و ہیئت ہی کے اعتبار سے نہیں بلکہ بڑی حد تک معنوی اعتبار سے بھی ویسی ہی بادشاہیاں تھیں، جیسی ظہور اسلام سے پیشتر موجود تھیں۔ کہیں کوئی اچھا فرمانروا بروئے کار آتا رہا تو اس نے اپنے ماحول کے اعتبار سے مریانہ سیاست کے مطابق کام کیا لیکن فی الجملہ حالت بگڑتی گئی، یہاں تک کہ وہ بادشاہیاں بھی رفتہ رفتہ اسی حالت کو پہنچ گئیں، جو ان کے لیے مقدر تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تعمیر ہی میں خرابی کی صورت مضمر تھی البتہ بعض نیک اور سعید ہستیوں نے جا بجا تربیتی اور تبلیغی مرکز قائم کیے، جن کی برکات و حسنات کے ذکر کا یہ محل نہیں۔

یہاں قرآن مجید کے چند انقلاب انگیز اصول پیش کیے جاتے ہیں، جو عالمی صلح و امن اور خیر و

آتش ریز اور آتش خیز بموں سے شہر، قصبے، کارخانے، کھیتیاں، زمینیں، گاؤں، بندر گاہیں، بجلی اور پانی کے مرکز جس طرح تباہ ہوئے ان کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ ہیر و شیما اور ناگاساکی میں ایٹمی بموں سے جو قیامت برپا ہوئی، اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں۔

ربانی سیاست اور شیطانی سیاست

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم ربانی سیاست پر کار بند تھے اور اسی سیاست کو اولاد آدم کا دائمی مسلک بنادینے کا پیغام پہنچا گئے۔ جو اعداد اوپر پیش ہو چکے ہیں، وہ ان گروہوں، جماعتوں اور قوموں کے کارنامے ہیں، جنہیں ربانی سیاست سے دور کا بھی واسطہ نہیں، ان کا مدار شیطانی سیاست ہے۔ ربانی سیاست کا پورا نظام ربانی صفات کے مرکز پر گھوم رہا ہے۔ جس میں رحمت، شفقت، رافت کار فرما ہوتی ہیں۔ انسانوں کی مادی اور معنوی تربیت صحیح اصول پر کی جاتی ہے۔ شیطانی سیاست عالم انسانیت کے لیے شدید طوفان برق و باد یا نہایت خوفناک بھونچال کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کے جزوی مظاہرے جا بجا ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ تخریب در تخریب اور اعداد در اعداد کے سوا کچھ نہیں۔

سوچئے کہ اگر نوع بشر کے ہوش و حواس سلامت ہیں تو وہ کس سیاست کو اپنی بہتری اور بہبود کے لیے چنے گی؟ وہ سیاست جسے تھوڑی مہلت مل جائے تو روئے زمین کے بہترین خطوں کو جلا کر خاک سیاہ کر ڈالے اور انسانوں کی عظیم صفوں کی مہلت حیات آگ اور خون کے طوفانوں میں ڈبو دے؟ انسانیت کی بہتری صرف ربانی سیاست ہے، جسے عرب کی چھوٹی جماعتیں لے کر نکلیں تو جہاں پہنچیں تاریکیوں میں اجالا کر دیا۔ صلح و امن اور محبت و مواخات کے سلسلے قائم کر دیے اور انسانوں میں جب باری تعالیٰ، حب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حب انسانیت کی لگن پیدا کر دی۔ آج حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے کروڑوں نام لیوا موجود ہیں مگر کہیں کوئی ایسا منظر نہیں ملتا جو قلب و روح کے لیے وجہ اطمینان یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات سے انتساب کے پیش نظر زیبا ہو:

نہ داغ تازه مے کا رد نہ زخم کہنہ مے خارد

بدہ یا رب دے کایں صورت بے جاں نے خواہم

مطلوب مساوات کی تکمیل ہو۔ تمام قوموں اور گروہوں کے درمیان ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کے رشتے استوار ہوتے جائیں۔ امن عالم ایک حقیقت ثابتہ کی شکل اختیار کر لے۔ ایسا ہی ماحول پیغام حق کی اشاعت کے لیے بہ حیثیت مجموعی سازگار ہو گا۔ توپوں کے آتشیں گولوں یا طیاروں کی تباہی نیز بمباریوں کو پیغام پہچانے اور حضور ﷺ کے منصب اصلاح انسانیت کو لباس عمل پہنانے کا اچھا ذریعہ نہیں سمجھا جاسکتا۔

اکثریت کی بنیاد

پھر دیکھیے، اس آیہ مبارکہ میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک انسانوں کی عزت و اکرامیت کی بنیاد دولت، رنگ، خون، نسل، قوم یا کوئی خاص جغرافیائی خطہ نہیں صرف تقویٰ اور حسن عمل ہے۔ ہر انسان اس بنا پر عزت کا مستحق نہیں سمجھا جاسکتا کہ کروڑ پتی یا ارب پتی ہے، اس کا رنگ گورا ہے، اس کا تعلق آریائی نسل سے ہے جیسا کہ روئے زمین کے بعض فاتر العقل گروہ سمجھ رہے ہیں اور ان میں چھوٹ چھات کوئی نہ کوئی شدید افتراق انگیز شکل اختیار کیے ہوئے موجود ہے۔ صرف نیک عملی انسانی اکرامیت کی اساس ہے۔ اس باب میں سکندروں اور پونیوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ موجودوں، فلسفیوں، سیاست دانوں، عالموں اور خطیبوں کو ان کے محض پیشوں اور مشغولیوں کے اعتبار سے بھی لائق توجہ نہیں سمجھا جاتا۔ وہاں محض کلوکاری، راست بازی، حق پرستی اور خلق دوستی درکار ہے۔ اس کے سوا ہر سکڑ عمل کھوٹا اور ہر سرگرمی کاربے حقیقت ہے۔

اس کی حقیقت پر آپ نے غور فرمایا؟ اس دنیا میں حسن عمل کے سوا ہر معیار عظمت حسد، رقابت اور کشمکش کا موجب ہوتا ہے۔ دولت کو معیار بنایا جائے تو جسے جائز ذریعے سے حاصل نہ ہوگی، وہ ہر ناجائز ذریعے سے حاصل کرے گا اور خلق خدا کے لیے لعنت بن جائے گا۔ فن حسب و سیاست میں کمال کو معیار بنایا جائے گا تو مختلف لوگ روئے زمین کو انسانوں کے خون سے رنگنے میں اپنی زندگیاں تمام کر دیں گے اور دنیا ان کو صرف نفرین کا مستوجب ٹھہرائے گی لیکن حسن عمل میں رقابت یا حسد راہ ہی نہیں پاسکتے کیونکہ وہ منافی حُسنِ عمل ہوں گے۔ یوں تمام انسانوں کی انتہائی کوشش یہ ہوگی کہ حسن عمل کی فراوانی سے روئے زمین امن و سلامتی کا بہشت زار بن جائے۔

دین میں کوئی جبر نہیں

قرآن مجید کا ایک انقلاب انگیز اصول یہ ہے:

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۚ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ ۚ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۰۶﴾ (بقرہ: ۲۵۶)

بہود کے زبردست عوامل تھے۔ تعجب ہے کہ خود مسلمان بھی ان پر ٹھیک ٹھیک عمل پیرانہ ہو سکے۔ اس حالت میں دوسروں سے عمل پیرائی کی کیا امید رکھی جاسکتی تھی۔

بین الاقوامی امن کے تقاضے

بین الاقوامی اصلاح و امن کے سلسلے میں سب سے پہلا اور بنیادی امر یہ ہے کہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانی گروہوں، جماعتوں اور قوموں کو اصولی اعتبار سے مساوی تسلیم کیا جائے اور اس مساوات کو عملی لباس پہنانے میں قطعاً کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی جائے۔ اگرچہ کسی کا عقیدہ کچھ ہو جو کتاب رحمۃ اللطیفین ﷺ پر نازل ہوئی، اس میں انسانی مساوات کا غیر مشتبہ اعلان موجود ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاهُ شُعْبًا وَفَصِيلًا لِّتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿۱۳﴾ (حجرات: ۱۳)

”لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے خاندان اور قبیلے بنائے تاکہ تم پہچان لیے جاؤ۔ یقیناً تم میں اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہ ہے، جو زیادہ متقی اور پرہیزگار ہے۔ خدا دانا اور واقف کار ہے۔“

تمام انسان ایک مرد اور ایک عورت یعنی آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کی اولاد ہیں۔ جس طرح ایک ماں باپ کے بچوں میں فرق و امتیاز کی کوئی وجہ نہیں، اسی طرح تم کیوں امتیازات قائم کرتے ہو؟ وہ بھی ایسے جن کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہیں مثلاً رنگ اور نسل کا اختلاف، دولت و حشمت کا اختلاف، مختلف جغرافیائی خطوں کا اختلاف، یہ تمام اختلافات سر اسر باطل اور بے اصل ہیں، جن میں الجھ کر تم ایک دوسرے کے خلاف نفرت کی دیواریں کھڑی کرتے ہو، حالانکہ تمہیں چاہیے ان سے قطع نظر کرتے ہوئے بنیادی یکسانی اور یکجہتی کو مرکز توجہ بناؤ یعنی تم سب انسان ہو۔

حضور ﷺ نے فتح مکہ کے بعد حرم پاک میں جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا ان میں مخاطب وہ تھے جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف اکیس برس تک ظلم و تعدی کا کوئی بڑے سے بڑا طوفان پھا کرنے میں کسر نہیں اٹھا رکھی تھی اور شاید ہی کوئی ایسا چہرا ہو، جو مخاطبین کی برچھیوں، تلواروں اور تیروں سے جراحت زار نہیں بن چکا تھا۔ تاہم حضور ﷺ نے فرمایا آج تم پر کوئی الزام نہیں اور تم سب آزاد ہو۔

نیز فرمایا: اے قریش! جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار خدا نے مٹا دیا۔ تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ پھر سورہ حجرات کی یہی چودھویں آیت تلاوت فرمائی جو اوپر منقول ہے۔ اس سے مزید توثیق ہو گئی کہ یہ آیت مساوات انسانی کی بنیاد ہے۔

واضح رہے کہ اسے وقفاً وقفاً پڑھ دینا کافی نہیں، اس پر اسی طرح عمل ہونا چاہیے، جس سے

گنجائش نہیں۔ اللہ کی مشیت یہی ہوئی کہ لوگوں کی طبیعتیں خود سوچ سمجھ کر اس طرف متوجہ ہوں اور بقدر استعداد سعادت کی منزلیں طے کریں۔ حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں:

آپ کو (رسول اللہ ﷺ) کو یہ قدرت نہیں کہ زبردستی کسی کے دل میں ایمان اتار دیں۔ خدا چاہتا تو بے شک سب آدمیوں کے دلوں میں ایمان ڈال سکتا تھا مگر ایسا کرنا اس کی نیکوینی حکمت و مصلحت کے خلاف تھا۔ اس لیے نہیں کیا گیا۔^①

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَن شَاءَ فَلْيُكْفُرْ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا
أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا۔ (کہف: ۲۶)

”(اے پیغمبر) کہہ دو، یہ سچائی تمہارے پروردگار کی جانب سے ہے اب جو چاہے مانے جو چاہے نہ مانے۔ ہم نے ظالموں کے لیے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی لپٹیں چاروں طرف سے انھیں گھیر لیں گی۔“

غرض جس طرح مساوات کا اعلان شرف انسانی کے اعتراف کا ایک جزو ہے، اسی طرح عقیدہ و ایمان کے سلسلے میں جبر کی نفی بھی انسانی شرف ہی کا ذریعہ ہے، لیکن اسلام ہر انسان میں جہاں اشرفیت کا زیادہ سے زیادہ گہرا احساس پیدا کرنا چاہتا ہے، وہاں یہ توقع بھی رکھتا ہے (اور رکھنی چاہیے) کہ انسان اپنے شرف ہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے حسن عمل کا مصدر بنیں گے اور خدا پران کا ایمان زیادہ سے زیادہ مستحکم و استوار ہو گا کیونکہ اشرفیت کا احساس سلیم العقل انسان کو کسی اور طرف لے جانی نہیں سکتا۔

عدل پر استواری

قرآن مجید کا ایک انقلاب انگیز اصول یہ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوِّمِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا
إِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ⑧ (مائدہ: ۸۰)

”اے ایمان والو! اللہ کے لیے انصاف کی گواہی دینے کو مضبوطی سے کھڑے ہو جایا کرو اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ اس سے انصاف نہ کرو۔ (ہر حال میں) انصاف کرو۔ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے اور اللہ (کی نافرمانی کے نتائج) سے ڈرو اللہ کو خوب خبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔“

① قرآن مجید مترجم، حضرت شیخ الہند ۲۳۸-۲۸۵ حاشیہ

”دین کے بارے میں کوئی جبر نہیں۔ بلاشبہ ہدایت کی راہ گمراہی سے الگ اور نمایاں ہو گئی ہے۔ پھر جو کوئی طاغوت سے انکار کر دے (یعنی سرکشی، فساد اور گمراہی سے یک قلم بیزار ہو جائے) اور اللہ پر ایمان لائے تو بلاشبہ اس نے فلاح و سعادت کی مضبوط ٹہنی پکڑ لی جو ٹوٹنے والی نہیں (جس کے ہاتھ آگئی وہ گرنے سے محفوظ ہو گیا) اور یاد رکھو اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔“

انسانی ظلم و ستم کے جو خوں چمکاں واقعات تاریخ کے صفحات پر منقوش ہیں، ان میں سے تین چوتھائی واقعات صرف جبر و تشدد کا نتیجہ ہیں، جو ایک گروہ نے دوسرے گروہ کو اپنا ہم نوا بنانے کے لیے بے دریغ روار کھے۔ اگرچہ یہ حقیقت ہر سلیم العقل انسان پر، روز روشن کی طرح آشکارا تھی کہ دین کی راہ دل کے اعتقاد و یقین کی راہ ہے اور اعتقاد دعوت و موعظت ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ جبر و استکراہ سے انسانی جسم کو اپنی مرضی کے مطابق جھکایا جاسکتا ہے، مگر دل میں اعتقاد و ایمان کا چراغ روشن نہیں کیا جاسکتا اور جب تک چراغ یقین روشن نہ ہو گا، وہ اعمال ظہور پذیر نہیں ہو سکتے، جو از روئے دین مطلوب و منظور ہیں بلکہ جبر سے دلوں میں نفرت و کراہت کی آگ مشتعل ہو گی اور جب جابر قوت میں ضعف آئے گا تو رد عمل کو کوئی طاقت روک نہ سکے گی اور وہی صورت حال نمودار ہو جائے گی جس کا ذکر قرآن مجید میں یوں آیا ہے:

كَالَّذِي نَفَقَتْ غَوْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا (نمل: ۹۲)

”اس عورت کی مثال، جس نے بڑی محنت سے سوت کا تاپھر اسے کلڑے کلڑے کر ڈالا۔“

حضرت مولانا شیخ الہند مرحوم کے مترجمہ قرآن کے فوائد میں اس آیت کے متعلق لکھا گیا ہے:

جب دلائل توحید بخوبی بیان فرمادی گئیں، جس سے کافر کا کوئی عذر باقی نہ رہا تو اب زور سے کسی کو مسلمان کرنے کی کیا حاجت ہو سکتی ہے؟ عقل والوں کو خود سمجھ لینا چاہیے۔ نہ شریعت کا یہ حکم ہے کہ زبردستی کسی کو مسلمان بناؤ۔^①

پھر اس آیت کے مطالب کی توثیق بعض دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَأَمَنَّ الْمَنَ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَنِيحًا ۚ أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ⑨
(یونس: ۹۹)

”اگر تیرا پروردگار چاہتا تو جتنے آدمی روئے زمین پر ہیں، وہ سب کے سب ایمان لے آتے تو کیا تو ان پر جبر کرے گا کہ جب تک ایمان نہ لاؤ میں چھوڑنے والا نہیں؟“

اس آیت مبارکہ سے ایک طرف یہ نمایاں ہے کہ مخلوق کی ہدایت کے لیے رسول اللہ کے قلب مبارک کی تڑپ کا کیا عالم تھا۔ دوسری طرف یہ واضح ہے کہ اس معاملے میں جبر کی کوئی

① قرآن مجید مترجم، حضرت شیخ الہند ۵۴ حاشیہ

نیکی میں تعاون بدی سے گریز

قرآن نے ایک انقلاب انگیز اصول مندرجہ ذیل آیت میں پیش کیا ہے۔

وَلَا يَجْرِمُكُمْ شَتَاءُ قَوْمٍ أَوْ صَدُوقَكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَنْ تَعْتَدُوا ۚ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ التَّقْوَىٰ ۚ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۲﴾ (نساء: ۲)

”جس گروہ نے تمہیں مسجد حرام سے روک دیا تھا، اس کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ ابھار دے کہ اس کے ساتھ زیادتی کرنے لگو (تمہارا دستور العمل تو یہ ہونا چاہیے کہ) نیکی اور پرہیزگاری کی ہر بات میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔ گناہ اور ظلم کی کسی بات میں تعاون نہ کرو اور اللہ (کی نافرمانی کے نتائج) سے ڈرو۔ وہ (پاداش عمل میں) سخت عذاب دینے والا ہے۔“

قریش مکہ نے حدیبیہ میں مسلمانوں کو اداے عمرہ سے روک دیا تھا، جب اختیار کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں آئی تو انھیں پر یہ واضح کر دینا ضروری تھا کہ قریش کی سابقہ زیادتی تمہارے لیے زیادتی کا موجب نہ بن جائے۔ اگرچہ تمہارے خیال کے مطابق وہ ان کی زیادتی کا جواب ہی ہو۔ مسلمان کا دستور العمل یہ ہے کہ جہاں نیکی اور اچھائی دیکھتا ہے، اس کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھاتا ہے تاکہ بر و تقویٰ زیادہ سے زیادہ فروغ پائیں۔ البتہ ظلم و گناہ سے دور رہنا لازم ہے۔ انھیں بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا موقع نہ دینا چاہیے۔

انسان اور راستبازی

قرآن مجید کا ایک انقلاب انگیز اصول یہ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ إِنَّ يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۚ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا ۚ وَإِنْ تَلَوَّا أَوْ تَعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿۱۳۵﴾ (نساء: ۱۳۵)

”اے ایمان والو! تم انتہائی مضبوطی اور چنگی سے قائم رہنے والے اور اللہ کے لیے سچی گواہی دینے والے ہو جاؤ کہ اگر وہ گواہی خود تمہارے خلاف یا تمہارے ماں باپ اور قربات داروں کے بھی خلاف ہو تو ہرگز نہ جھگو۔ اگر کوئی والد یا مفلس ہے تو اللہ تم سے زیادہ ان پر مہربانی رکھنے والا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہوائے نفس کی پیروی تمہیں انصاف سے باز رکھے۔ اگر تم (گواہی دیتے وقت) بات کو گھما پھرا کر پیش کرو گے یا گواہی دینے سے پہلو بچا جاؤ گے تو (یاد رکھو) اللہ تمہارے کاموں سے پوری طرح آگاہ ہے۔“

انسان کے لیے ایک اہم مرحلہ یہ ہے کہ وہ ہر حال میں سچ پر قائم و استوار رہے اور سچی گواہی دینے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرے، اگرچہ سچ بولنے سے خود اسے یا اس کے والدین اور قربات

حضرت مولانا شیخ الہند مرحوم کے مترجمہ قرآن میں ہے کہ قَوَّامِينَ لِلَّهِ میں حقوق اللہ کی طرف اور ”شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ“ میں حقوق العباد کی طرف اشارہ ہے:

”عدل“ کا مطلب ہے کسی کے ساتھ بدون افراط و تفریط وہ معاملہ کرنا، جس کا وہ واقعی مستحق ہے۔ عدل و انصاف کی ترازو ایسی صحیح اور برابر ہونی چاہیے کہ عمیق سے عمیق محبت اور شدید سے شدید عداوت اس کے دونوں پلڑوں میں سے کسی پلے کو جھکانے کے معلوم ہوتا ہے کہ ”عدل و قسط“ یعنی دوست دشمن کے ساتھ یکساں انصاف کرنا اور حق کے معاملے میں جذبات محبت و عداوت سے قطعاً مغلوب نہ ہونا، یہ فضیلت حصول تقویٰ کے موثر ترین اور قریب ترین انصاف میں سے ہے۔^۱ ہر سلیم العقل انسان اندازہ کر سکتا ہے کہ اسلام کن خصوصیات والے انسان پیدا کرنا چاہتا ہے۔ کسی فرد یا جماعت سے کتنی ہی عمیق محبت یا کتنی ہی شدید دشمنی ہو۔ جب گواہی دینے کا مرحلہ سامنے آئے گا، مسلمان کی زبان سے ایک حرف بھی ایسا نہ نکلے گا، جو حق و انصاف کے عین مطابق نہ ہو۔

یاد ہو گا کہ فتح خیبر کے بعد وہاں کی زمین نصف پیداوار کی بنا پر یہودیوں کے حوالے کر دی گئی تھی۔ عبد اللہ ﷺ بن رواحہ کو بیانی کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ وہ پیداوار کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دو انبار لگوا دیتے اور یہودیوں سے کہتے کہ جو حصہ چاہو، اٹھا لو۔ یہودی کہتے: ”زمین اور آسمان ایسے ہی عدل سے قائم ہیں۔“ مسلمانوں کا وظیفہ حیات روئے زمین پر یہی تھا اور ایسے ہی اصول حیات عالمی امن کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ وہ افراد یا گروہ اس وظیفے کی بجا آوری سے کیونکر عہدہ بر آہو سکتے ہیں، جن کی زبانوں سے الفاظ نکلتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے، پھول جھڑ رہے ہیں لیکن ان کے دل، ان کی طبیعتیں اور ان کی ذہنیتیں نہایت پست اور امن بر انداز اغراض سے یک قلم آلودہ ہیں۔ یہ وہی شیوہ ہے جس پر مدینہ منورہ کے یہودی عربوں کے تعلق میں کار بند تھے اور کہا کرتے تھے:

لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيَّاتِ سَبِيلٌ ۚ وَيَعْلَمُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۷۵﴾ (آل عمران: ۷۵)

”امیوں (یعنی عربوں) کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے ہم پر کچھ مواخذہ نہیں (یعنی ان کے ساتھ دیانت داری برتنا ضروری نہیں) اور یہ کہہ کر وہ اللہ پر تہمت باندھتے ہیں حالانکہ اچھی طرح جانتے ہیں حقیقت حال کیا ہے؟“

یعنی جس گروہ سے ذاتی اغراض وابستہ ہیں، ان کے متعلق ایک نظام اخلاق اور ایک ضابطہ نیک و بد ہے لیکن جن سے کوئی خاص علاقہ نہیں، ان کے باب میں بالکل دوسری روش اور دوسرے اصول پیش کیے جاتے ہیں۔

^۱ قرآن مجید مترجمہ، حضرت شیخ الہند ص ۱۲۰ حاشیہ

داروں کو نقصان پہنچے۔ یہ بھی ممکن ہے کسی کو مالدار کے مال کا لالچ یا اثر و رسوخ کا خوف سچ کہنے سے تمہیں باز رکھے یا کوئی مفلس ہو جس کی مفلسی پر ترس کھا کر تھوڑی سی غلط بیانی گوارا کر لی جائے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ کوئی مالدار ہو یا غریب، اللہ تعالیٰ کی مہربانی ان کے لیے گواہی دینے والے سے کہیں زیادہ سود مند اور نفع بخش ہوگی۔ غرض انصاف کے معاملے میں ہوائے نفس کی پیروی ہر گز نہ کرنی چاہیے۔ یہ بھی نہیں کہ بیان میں ہیر پھیر کا طریقہ اختیار کیا جائے یا گواہی نہ دینے ہی سے گریز کو پناہ گاہ بنالیا جائے۔ اس طرح انسانوں کو چمکا دیا جاسکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ تو دلوں اور نیتوں کے بھید بھی جانتا ہے۔ جو لوگ اپنے خلاف یا اپنے انتہائی قریبی رشتہ داروں کے خلاف بھی سچ کہتے ہوئے نہ جھجکیں، وہ مخلوق کی بھلائی اور بہبود کے لیے جو گراں بہا کام انجام دے سکتے ہیں، ان کی توقع ایسے لوگوں سے کیونکر رکھی جاسکتی ہے جو ایک لفظ زبان سے نکالتے وقت دس مرتبہ سوچتے ہیں کہ اس سے ہمارے موافقوں پر تو زد نہ پڑے گی اور ہمارے مخالف تو فائدہ نہ اٹھالیں گے اس کا نام ان کے ہاں ”سیاستدانی“ اور ”تدبر“ ہے۔ امن عالم کے ضامن وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو حق و انصاف کے معاملے میں راست بازی کے اس انتہائی بلند مرتبے پر فائز ہوں۔

برائی کے جواب میں بھلائی

قرآن مجید کا ایک انقلاب انگیز اصول یہ ہے:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ

كَأَنَّهُ وَفٍ حَبِيبٌ ﴿٣٣﴾ (م سجدہ: ۳۳)

”اور نیکی اور بدی برابر نہیں۔ (بدی کو) اس طریق سے دور کر جو اچھا ہے (یعنی نیکی کے ذریعے سے) پھر تم دیکھو کہ تمہارے اور جس شخص کے درمیان دشمنی ہے وہ تمہارا گرم جوش دوست بن جائے گا۔“

حضرت شیخ الہند مرحوم کے مترجمہ قرآن مجید کے فوائد میں ہے:

خوب سمجھ لو بدی نیکی اور نیکی بدی کے برابر نہیں ہو سکتی، دونوں کی تاثیر جدا گانہ ہے۔ بلکہ ایک نیکی دوسری نیکی سے اور ایک بدی دوسری بدی سے اثر میں بڑھ کر ہوتی ہے۔ لہذا ایک مومن قانت خصوصاً ایک داعی الی اللہ کا مسلک یہ ہونا چاہیے کہ برائی کا جواب برائی سے نہ دے بلکہ جہاں تک گنجائش ہو برائی کے مقابلے میں بھلائی سے پیش آئے۔ اگر کوئی اسے سخت بات کہے یا بر معاملہ کرے تو اس کے مقابل وہ طرز عمل اختیار کرنا چاہیے جو اس سے بہتر ہو اس طرز عمل کے مقابلے میں تم دیکھ لو گے سخت سے سخت دشمن بھی ڈھیلا پڑ جائے گا اور جو دل سے دوست نہ بنے تاہم ایک وقت آئے گا جب وہ ظاہر میں ایک گہرے اور گرم جوش دوست کی طرح تم سے برتاؤ کرنے لگے گا

بلکہ ممکن ہے کچھ دنوں کے بعد سچے دل سے دوست بن جائے۔ غرض یہ اصول ایسا ہے کہ ہر ہمتور اور مخلص انسان اس پر عمل پیرا ہو سکتا ہے۔ پھر مسلمان تو حقیقتہً ایک مستقل داعی الی اللہ ہے۔ مزید برآں خود رسول اللہ ﷺ کا دستور یہی رہا اور حضور ﷺ کی پیروی سے بڑھ کر کسی کے لیے راہ سعادت کیا ہو سکتی ہے؟

عدل و احسان

قرآن مجید کی ایک اور جامع انقلابی دعوت پر غور فرمائیے، ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَايَ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُم لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿٩٠﴾ (نحل: ۹۰)

”اللہ حکم دیتا ہے کہ (ہر معاملے میں) انصاف کرو۔ (سب کے ساتھ) بھلائی سے پیش آؤ۔ قربت داروں کے ساتھ سلوک کرو اور تمہیں روکتا ہے بے حیائی کی باتوں سے، ہر طرح کی برائیوں سے اور ظلم و زیادتی کے کاموں سے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ (سمجھو) اور نصیحت پکڑو۔“

اللہ کا فرمان مسلمانوں کے لیے یہ ہے کہ عدل کو اپنا شیوہ بناؤ، نیک کرداری میں سرگرم رہو۔ قربت والوں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ فحش کاموں سے بچو، ہر طرح کی برائیوں سے اجتناب کرو۔ ظلم و زیادتی سے کبھی آلودہ نہ ہو۔

جو لوگ مسلمان ہو چکے تھے، ان کے لیے اب آزمائش عقاید میں نہ تھی، اعمال میں تھی۔ اس لیے اس آیت میں عملی زندگی کی تمام مہمات بیان کر دیں اسی لیے مفسرین نے اسے جوامع آیات میں شمار کیا ہے۔

عدل، تمام محاسن اعمال کی اصل ہے۔ جس انسان کے اندر یہ بات پیدا ہو گئی کہ جو بات کرنی چاہیے انصاف کے ساتھ کرنی چاہیے، اس نے سب کچھ پالیا۔ احسان سے یہاں مقصود حسن و عمل ہے۔ جو بات کرو حسن و خوبی کی کرو۔ نیکی اور بھلائی کی کرو یعنی بنیاد عمل بھلائی ہو، برائی نہ ہو جو ہم سے قریب کا رشتہ رکھتے ہیں، وہ ہمارے حسن سلوک کے زیادہ حقدار ہیں، اس لیے ایٹائی ذی القربی کی رعایت بھی ضروری ہوئی۔ پھر فحشا، منکر اور بغی سے روک کر انہی کے سارے مقاصد پورے کر دیے۔ فحش سے مقصود وہ برائیاں ہیں جو حد درجے کی برائیاں تسلیم کر لی گئی ہیں، منکر میں ہر طرح اور ہر قسم و درجہ کی برائیاں آگئیں۔ بغی میں ہر طرح کی زیادتی آگئی، خواہ کسی گوشے اور کسی شکل میں کی گئی ہو۔

جو کتاب ایسے سانچے لے کر آئی ہو، جس سے ایسے اعمال ڈھلتے ہوں، جو ایسی زندگیاں بناتی ہو، اگر وہ ہدایت، رحمت اور بشارت نہیں تو اسے اور کس نام سے پکارا جاسکتا ہے؟ یہ بالکل درست ہے جس شخص کو نیکی، بدی اور اچھائی برائی کا کچھ بھی احساس و شعور ہو اور وہ

وہ ہو گا جو تم اپنے عمل سے کماد گے، تم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ ان کے (یعنی گزری ہوئی قوموں اور جماعتوں کے)، اعمال کیسے تھے؟“

کتنا پاکیزہ اور امن پرور اصول ہے، جو ہمارے بے شمار جھگڑوں اور بحثوں کو ختم کر سکتا ہے۔ جب یہ مسلم ہے کہ نہ گزرے ہوئے لوگوں کی نیکیاں ہمارے بحثوں سے کم یا زیادہ ہو جائیں گی اور نہ ان کی برائیوں میں ہمارے جھگڑوں کی وجہ سے کوئی فرق پڑے گا۔ آخر ان بحثوں سے اس کے سوا کیا حاصل ہو سکتا کہ اپنا وقت بیجا صرف کریں، یا یہی روابط کو بگاڑیں حالاں کہ ہماری یہ گرم جوشیاں نہ خود ہمارے نامہ اعمال میں کوئی اچھا اضافہ کرتی ہیں، نہ گزرے ہوئے لوگوں کے لیے کسی بھی درجے میں مفید و سودمند ہیں۔ اگر دنیا اس اصول کو اپنالے تو غور کیجئے کہ اس کی ناخوشگوار اور بے نتیجہ سرگرمیوں میں کتنی کمی آجائے اور تعاون و خوشگوار کی فضا کتنی اچھی ہو جائے؟

بھائیوں کے درمیان مصالحت قرآن مجید کا ایک اصول یہ ہے:

وَاِنْ طَائِفَتَيْنِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اُتْعِلُوا فَاَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْ بَعَثَ اِحْدَاهُمَا عَلٰى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا ۚ اِلَيْهِ تَرْجِعُ حَتّٰى تَخْرُجَ اِلٰى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَاَتَتْ فَاَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوا ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ﴿١٠﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ اِخْوَةٌ ۚ فَاَصْلِحُوا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاَتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٩﴾ (حجرات: ۹-۱۰)

”اور اگر مسلمانوں کے دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرادو۔ پس اگر ان میں سے ایک زیادتی پر تیار ہے تو اس سے جنگ کرو جو زیادتی کا مرتکب ہو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ پس اگر وہ لوٹ آئے تو دونوں فریقوں کے درمیان عدل کے مطابق صلح کرادو اور انصاف پر استوار رہو۔ یقیناً اللہ کو پسند آتے ہیں انصاف کرنے والے۔ مومن باہم بھائی بھائی ہیں۔

پس اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرادیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔“
دیکھیے، قتل و خونریزی کو روکنے کی کتنی عمدہ، منصفانہ اور مؤثر عملی تدبیر ہے۔ ممکن ہے دو بھائیوں کے درمیان غلط فہمی کی بناء پر کشمکش کی نوبت آجائے تو اس صورت میں دوسرے بھائیوں کا فرض ہے کہ ان میں صلح کرادیں۔ اگر کوئی فریق صلح سے انکار کرے یا زور و قوت کے بل پر دوسرے فریق کو پامال کر دینے پر تل جائے تو سب کا فرض ہے کہ متحد ہو کر مظلوم کی حفاظت کے لیے کھڑے ہو جائیں اور ظالم کو روک جانے پر مجبور کر دیں۔ جب زیادتی کرنے والا بھی صلح پر آمادہ ہو جائے تو بیچ بچاؤ کرنے والوں کا فرض ہے کہ صلح کرادیں مگر وہ صلح عدل و انصاف کی بنا پر ہونی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ بعض لوگ قوی اور زبردست فریق کی کوئی بات اس بناء پر قبول کر لیں کہ وہ زبردست ہے حالانکہ وہ بات عدل کے خلاف ہو۔

دنیا کو بہتر سے بہتر حالت میں دیکھنے کا واقعی آرزو مند ہو، اسے ان باتوں سے ایک لمحے کے لیے بھی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حقیقی اور پایدار فلاح کی راہ وہی ہے جس کی طرف قرآن دعوت دے رہا ہے اور اس کا صحیح اندازہ ہر انسان کو محض تدبر و تفکر صحیح سے ہو سکتا ہے، اگرچہ وہ اسلام کا معتقد نہ ہو۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی تو نظر انداز نہ ہونی چاہیے کہ جس وجود اقدس کو اس تعلیم و دعوت کا مکمل و اتم پیکر بنا کر ہدایت عالم کے لیے مبعوث فرمایا گیا۔ اس کے ”رحمۃ اللعالمین“ ہونے میں کسی کے لیے کیا گنجائش کلام باقی رہ سکتی؟ قرآن یقیناً ”ذکر اللعالمین“ ہے اور حضور ﷺ لاریب ”رحمۃ اللعالمین“ ہیں۔

عہد ماضی کے مناقشات

دنیا کا بڑا حصہ عہد ماضی کے مناقشات میں الجھا ہوا ہے۔ جھگڑے جاری ہیں، بحثوں کی گرم بازاری ہے حالانکہ جس دور پر سیکڑوں یا ہزاروں سال بیت چکے ان کے متعلق آج کوئی فیصلہ بھی ہو جائے تو گزشتہ حالات کی تلافی کی کوئی صورت نہیں۔

سورۃ طہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان ایک مکالمے کا مختصر سا ذکر ہے۔ فرعون نے سوال کیا کہ موسیٰ علیہ السلام! تمہارا پروردگار کون ہے؟ جواب ملا کہ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر شے کو اسکی خلقت بخشی، پھر اس پر زندگی اور عمل کی راہ کھول دی۔ فرعون کو خیال آیا کہ بے شمار گروہ گزر چکے ہیں۔ جو ایسے پروردگار کے معتقد نہ تھے۔ چنانچہ سوال کیا کہ ان لوگوں کا کیا حال ہونا ہے، جو گزر چکے اور ایسے پروردگار کے تصور سے بھی نا آشنا تھے۔ حضرت موسیٰ نے جواب دیا:

عَلِمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِی کِتَابٍ ۚ لَا یَفْصِلُ بَیْنِیْ وَ لَا یَنْسُو ﴿٥٢﴾ (طہ: ۵۲)

”اس کا علم میرے پروردگار کے پاس لکھا ہوا موجود ہے۔ میرا پروردگار ایسا نہیں کہ کھویا جائے یا بھول میں پڑ جائے۔“

یعنی اس کاوش میں پڑنے اور بحث و نزاع میں الجھنے سے ہمیں کیا حاصل ہو گا؟ بہتر ہے کہ گزرے ہوئے لوگوں کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں اور اپنی توجہ صرف ذاتی درستی پر جمادیں، کیونکہ نہ پہلوں کی گرہاں ہمیں کچھ نقصان پہنچا سکتی ہیں اور نہ ان کی نیکیوں سے ہمیں کوئی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ ہمارا اچھا یا برا انجام ہمارے ہی اچھے یا برے اعمال کی بناء پر ہو گا، پھر کیوں انہی کی فکر نہ کریں؟ قرآن مجید نے یہی اصول دوسرے مقام پر ان الفاظ میں پیش کیا:

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْأَلُونَ عَنْهَا ۚ كَانُوا یَعْمَلُونَ ﴿١٣٣﴾ (بقرہ: ۱۳۳)

”یہ ایک امت تھی، جو گزر چکی۔ اس کے لیے وہ تھا، جو اس نے اپنے عمل سے کمایا۔ تمہارے لیے

زاویہ نگاہ عالمی اور بین الاقوامی ہے۔ ساتھ ہی بین الاقوامی ادارہ ہائے امن و سلامتی کے بنیادی اصول بھی سامنے آجاتے ہیں اور یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ ایسے اداروں کو زیادہ سے زیادہ موثر و کامیاب بنانے کے لیے کن کن اوصاف و خصائص کی اشد ضرورت ہے۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ ان اوصاف و خصائص کے مطابق ٹھیک ٹھیک عمل کئے بغیر کوئی اجتماعی ادارہ خصوصاً بین الاقوامی ادارہ کامیاب ہو ہی نہیں سکتا۔

تمت بالخیر

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ اپنے بھائی کی مدد کرو، ظالم ہو یا مظلوم۔ عرض کیا گیا کہ مظلوم کی مدد تو کی جاسکتی ہے ظالم کی مدد کیونکر ہوگی؟ فرمایا: اس کا ہاتھ پکڑ کر ظلم سے روکو۔ یہ اصول مسلمانوں کے تعلق میں بیان ہوا ہے، لیکن یہی اصول دنیا کے ہر بین الاقوامی ادارے کا ایک بنیادی اصول بن سکتا ہے اور جس حد تک اندازہ کیا جاسکتا ہے، انجمن اقوام متحدہ کا پورا نظام اسی پر قائم ہے، اگرچہ مختلف اقوام یا حکومتوں نے ذاتی اغراض کی وجہ سے اس پر عدل و انصاف کے ساتھ عملی پیرا ہونے کی صحیح صورت پیدا نہیں ہونے دی۔ ذاتی اغراض ہی کی آلودگی اب تک انجمن اقوام متحدہ کی کمزوری اور بے اثری کا باعث ثابت ہوئی ہے۔ قرآن مجید کے اس اصول سے جتنا انحراف کیا جائے گا اس پر عمل کی زیادہ سے زیادہ اچھی صورت اختیار کرنے میں جتنا تاثر ہوگا، اتنا ہی امن عالم میں اختلال کا دروازہ کھلا رہے گا۔

موجبات اختلال کا انسداد

- پھر قرآن مجید نے قوموں کے خوشگوار تعلقات میں خلل ڈالنے والا ایک ایک رخنہ بند کیا۔ مثلاً:
- ۱۔ لَا يَسْخَرُونَ مِنْ قومٍ مِّنْ قومٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ (حجرات: ۱۱)
”ہم نہ اڑائیں ایک قوم کے لوگ دوسری قوم کے لوگوں کی شاید وہ ان سے بہتر ہوں۔“
 - ۲۔ لَا تَلْبِسُوا الذِّنَّ بِالْإِثْمِ (حجرات: ۱۱)
”عیب نہ لگاؤ ایک دوسرے کو۔“
 - ۳۔ وَلَا تَتَّبِعُوا آيَاتِ الْكُفَّارِ (حجرات: ۱۱)
”چڑانے کی غرض سے ایک دوسرے کے نام نہ رکھو۔“
 - ۴۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ ۚ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ (حجرات: ۱۲)
”اے ایمان والے لوگو! بہت بدگمانیوں سے اجتناب کرو، کیونکہ بعض بدگمانیاں گناہ ہیں۔“
 - ۵۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْحَبُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۖ (حجرات: ۶)
”اے ایمان والے لوگو! اگر کوئی فاسق آدمی تمہارے پاس خبر لائے تو (اسے صحیح سمجھنے سے پیشتر) تحقیق کر لیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ (خبر سننے ہی) تم نادانی سے دوسری قوم پر جا پڑو۔ پھر کل اپنے کیے پر پچھتانے لگو۔“

آخری گزارش

یہ صرف چند اصول بطور نمونہ پیش کئے گئے ہیں، جن سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا

سب سے بڑا نبی کون ہے؟

انبیاء میں سب سے بڑی شان والا وہ نبی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کی قوم کے ساتھ دوسری اقوام کی طرف بھی نبی بنا کر بھیجا ہو۔ پھر وہ نبی اپنی قوم کو اندھیروں میں سے روشنی کی طرف نکالنے کا سبب ہو گا اور اس کی قوم دوسرے اقوام کی رہنما بنے گی۔ یہ دونوں باتیں محمد رسول اللہ ﷺ میں موجود ہیں۔ پہلی بات کی طرف سورہ جعہ کی دوسری اور تیسری آیت میں ارشاد ہے۔ ان دونوں آیتوں کے معنی یہ ہیں ”اللہ وہ ہے جس نے ان پڑھوں میں ان میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور بیشک وہ اس سے پہلے ظاہر گمراہی میں تھے اور ان میں سے دوسروں کے لئے بھی (اس کو بھیجا ہے) جو اب تک اُن (پہلوں) سے نہیں ملے اور وہ زبردست حکمت والا ہے۔“ دوسری بات کی طرف سورہ آل عمران کی ایک سو دسویں آیت میں اشارہ ہے، اس آیت کے معنی یہ ہیں ”تم اچھے کام کا حکم کرتے ہو اور برے کام سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔ اگر کتاب والے ایمان لاتے تو ان کے لئے بہتر تھا۔ کچھ ان میں سے ایمان والے ہیں اور بہت سے ان میں سے نافرمان ہیں۔“ اور مندرجہ ذیل احادیث میں بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے۔

☆ حدیث: رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو (لوگوں کے لئے) آسانی پیدا کرنے والا بنا کر بھیجا ہے اور ان پر تنگی کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا (یعنی اُمت محمدی کے افراد بھی انسانوں کی ہدایت کے لئے اس طرح بھیجے ہوئے ہیں جس طرح انبیاء علیہ السلام کو بھیجا جاتا ہے) علاوہ اس کے رسول اللہ ﷺ میں علم کے وہ سب اقسام موجود تھے جو جدا جدا ان لوگوں میں موجود ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بادشاہی کی حقیقت سمجھائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے پہلے جو انبیاء تھے ان میں سے کسی کو ایک قسم کا علم تھا۔ کسی کو دو قسموں کا۔ لیکن علم کے تمام اقسام رسول اللہ ﷺ کے سوا دوسرے کسی میں بھی نہ تھے (یعنی انبیاء، حکماء اور جن کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید ہوتی ہے۔ رہنما اور اماموں کے جتنے بھی جدا جدا علم ہیں، علم کے وہ سب اقسام ہمارے نبی کو حاصل ہیں)۔

نبیوں کو انبیاء بنا کر کیوں بھیجا جاتا ہے؟

یہ بھی جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت رسولوں کو بھیجنے کی تب خواہش کرتی ہے جب رسولوں کے بھیجنے میں کسی قسم کی بھلائی ہو۔ اس بھلائی کو اللہ غیب دان کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا۔ لیکن بعض اسباب ایسے بھی ہیں جن کو ہم بھی جانتے ہیں۔ وہ اسباب رسولوں کے بھیجنے کے وقت ضرور پائے جائیں گے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ وقت کسی نئی حکومت (یعنی نئے نظام حکومت)

اشارات سیرت پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم

نبی کس کو کہتے ہیں؟

جاننا چاہئے کہ منہمین (یعنی وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بادشاہی کی حقیقت سمجھائی ہے) کے بہت سے اقسام ہیں اور ان کی لیاقتیں اور قابلیتیں بھی جدا جدا ہیں۔ انہی میں سے اللہ تعالیٰ نوری انسان کے لئے رہبر اور رہنما مقرر کرتا رہتا ہے۔ جب اللہ کی حکمت یہ چاہتی ہے کہ ان میں سے ایک کو اپنی مخلوق کی طرف بھیجے اور اس کو لوگوں کے تاریکی میں سے نکال کر روشنی کی طرف آنے کے لئے سبب بنائے تو لوگوں پر یہ فرض کرتا ہے کہ دل اور جان سے اس کی تابعداری کریں۔ اور اسی کے لئے اس دنیا سے باہر کی مخلوق یعنی ملائکہ کی اونچی جماعت میں یہ تجویز پاس کی جاتی ہے کہ جو آدمی اس کی تابعداری کرے گا اس سے ملائکہ راضی ہوں گے اور جو اس کی مخالفت کرے گا اس کے دشمن ہو جائیں گے اور اس پر لعنت کرتے رہیں گے۔ جب اللہ کا یہ فیصلہ ہوتا ہے تب اللہ تعالیٰ اس دنیا کے رہنے والے انسانوں کو اس بات کی خبر دیتا ہے اور ان پر اس بھیجے ہوئے انسان کی تابعداری کرنا لازم ٹھہراتا ہے۔ اس بھیجے ہوئے بزرگ کو جس کی تابعداری کرنا لوگوں پر لازم ہے نبی کہا جاتا ہے۔

اللہ والوں کے اقسام

اوپر گزر چکا ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بادشاہی کی حقیقت سمجھائی ہے ان کے بہت سے اقسام ہیں۔ پھر ان میں سے کوئی کامل ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی بادشاہی کی حقیقت سمجھنے میں کمال کو پہنچ چکا ہے۔ یہی نبی کی شان ہے)، کوئی حکیم ہے (یعنی اللہ کی بادشاہی میں جو حکمت رکھی ہوئی ہے وہ اس کو سمجھتا ہے) کوئی ”مؤید روح القدس“ ہے (یعنی انسانیت کو کمال تک پہنچانے کے لئے جو کام اس پر رکھا ہوا ہے یا اس نے اپنے اوپر لیا ہے اس میں اس کی مدد روح القدس سے ہوتی رہتی ہے)، کوئی لوگوں کو راستہ دکھانے والا ”ہادی“ اور ان کو پاک کرنے والا ”مزکی“ ہے، کوئی امام (یعنی قوموں کا رہنما) ہے۔ کوئی منبذ (یعنی کاموں کے نتائج کی پہلے سے خبر دینے والا) ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے وقت میں ملک کی حالت اور آپ نے اُسے کیسے بدلا؟
 جن ملکوں کی آب و ہوا معتدل ہے (جس کی وجہ سے وہاں کے لوگوں کا مزاج بھی معتدل ہے) وہ ملک رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہونے کے وقت دو بڑے بادشاہوں کے قبضہ میں تھے۔
 ۱۔ کسریٰ (ایران کا بادشاہ) جس کا عراق۔ یمن۔ خراسان اور ان ملکوں کے ارد گرد والے ملکوں پر قبضہ تھا، ماوراء النہر سندھ اور ہندوستان کے بادشاہ بھی اس کے ماتحت تھے اور ہر سال اس کو خراج دیتے تھے۔

۲۔ قیصر (روم یا یورپ کا بادشاہ) جس کا شام، روم اور ان ملکوں کے ارد گرد والے علاقوں پر قبضہ تھا۔ مصر، مغرب اور افریقہ کے ملک بھی اس کے ماتحت تھے اور ہر سال اس کو خراج دیتے تھے۔ پس ان دونوں بادشاہوں کو شکست دینے اور ان کے ملکوں پر غالب آنے کے یہ معنی ہوں گے کہ جس نے ان کو شکست دی اس کا تمام پر غلبہ ہو گیا (امت اسلامیہ نے خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ان دونوں حکومتوں کو فتح کر کے گویا روئے زمین کو اپنے قبضہ میں کر لیا)۔ اس کے علاوہ ان دونوں بادشاہوں کی عیش و عشرت کی عادات ان کے ماتحت ملکوں میں پھیل گئی تھیں پس ان عادات کے بدلنے اور ان عادات سے لوگوں کو روکنے کے یہ معنی ہوں گے کہ گویا تمام ملکوں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ ان عادات کو چھوڑ دیں (ورنہ ان پر تباہی آئے گی)۔

لیکن جن ملکوں کی آب و ہوا اور وہاں کے لوگوں کا مزاج معتدل نہیں ہے ان کا انسانی نوع کی اصلاح میں کوئی خیال نہیں کیا گیا ہے۔

پس جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ اس ٹیڑھے راستہ کو سیدھا کرے اور لوگوں کے لئے ایک ایسی جماعت (امت اسلامیہ) پیدا کرے جو ان کو اچھے کام کا حکم کرے اور بُرے کام سے روکے اور ان کے بگڑے ہوئے رسم و رواج کو بدلے تب یہ بات اس پر موقوف ہوئی کہ قیصر و کسریٰ کی حکومت برباد کی جائے۔ اور ان کی پیدا کی ہوئی بُری عادتوں کو درست کیا جائے کیونکہ ان کی پیدا کردہ حالت نے معتدل مزاج ملکوں میں گہرا اثر کیا تھا۔ اس لئے ان دونوں بادشاہوں کے برباد ہونے کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیصلہ ہوا اور رسول اللہ ﷺ نے خبر دی کہ کسریٰ برباد ہو گا اور اس کے بعد کوئی بھی کسریٰ پیدا نہ ہو گا اور قیصر برباد ہو گا اس کے بعد کوئی دوسرا قیصر پیدا نہ ہو گا۔ اور تمام دنیا کے باطل کو مٹانے والا (قرآن کریم) اللہ کی طرف سے نازل ہوا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ عرب کے باطل عناصر کو رسول اللہ ﷺ اور اس کے صحابہ کے ہاتھوں سے مٹائے گا۔ اور پھر اسی عرب کے ہاتھوں سے قیصر اور کسریٰ کے باطل کو مٹائے گا اور باقی ملکوں کے باطل کو ان دونوں بادشاہوں کے رہنے والوں کے ہاتھوں سے مٹائے گا۔

کے ظاہر ہونے اور پہلی حکومت کے برباد ہونے کا ہو گا۔ پھر اس وقت اللہ تعالیٰ ایسا رسول بھیجے گا جو اس نئی حکومت کا دین یا قانون قائم کرے گا۔ اور پرانی حکومت برباد ہوگی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے سردار محمد ﷺ کو اس کام کے لئے نبی بنا کر بھیجا ہے۔ کہ قیصر و کسریٰ کی سرمایہ دارانہ (یعنی سرمایہ پرستانہ) اور ظالمانہ حکومتوں کو مٹا کر خلافت الہی کی عادلانہ حکومت قائم کی جائے۔

رسول اللہ ﷺ کو نبی بنا کر بھیجنے کی حکمت

جب ہر قوم (ملت) کا دین اور دھرم جدا ہو گیا اور ہر ایک قوم نے خاص طریقے اختیار کر لئے اور ان رسومات اور طریقوں کو قائم رکھنے کے لئے دوسری قوموں کے ساتھ پہلے زبان کے ساتھ انہوں نے جھگڑے کئے اور اس کے بعد اپنے مخالفین پر غالب آنے کے لئے اپنے ہتھیار اٹھا کر ان سے جنگ بھی کی اور ان میں ظلم پھیل گیا۔ اور کتنے کام جو ان کو کرنے تھے ان کو انہوں نے چھوڑ دیا۔ اور ہر جماعت نے دوسری جماعت پر لعنت کی۔ اور ان کو برا سمجھ کر ان کے ساتھ جنگ جاری رکھی اور قوموں کے آپس میں جھگڑے کے سبب حق چھپ گیا۔ تب ایک راہ راست پر چلنے والے امام یا پیشوا کی ضرورت پڑی جو تمام جماعتوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرے جیسا حق پر چلنے والا خلیفہ (اللہ کا نائب) ظالم بادشاہوں کے ساتھ کرتا ہے (یعنی یہ پیشوا مختلف جماعتوں کو ملا کر ان کو ایک جماعت بنائے گا)۔ یہ امام (پیشوا) جو جدا جدا جماعتوں کو ملا کر ایک جماعت بنائے گا اس کو چند اصولوں پر چلنا ہو گا۔ ان اصولوں میں سے پہلا اصول یہ ہے کہ وہ ایک قوم کو راہ راست کی طرف بلائے گا۔ اور ان (کے اخلاق) کو پاک کرے گا اور ان کی حالت درست کرے گا۔ اس کے بعد ان سے ایسا کام لے گا جیسا اپنے اعضاء سے لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ ان کو لوگوں کی ہدایت کے لئے جدا جدا ملکوں میں بھیج دے گا۔ اور سیدھے راستے پر نہ چلنے والی دنیا سے جنگ بھی کرے گا۔ یہ تیسرے فائدہ میں بیان کی ہوئی آل عمران کی آیت ۱۱۰ کے معنی ہیں۔

اس پہلے اصول پر امام کو اس لئے چلنا پڑے گا کہ اس اکیلے امام (پیشوا) سے دنیا کی بے شمار جماعتوں کے ساتھ مقابلہ نہ ہو سکے گا۔ اور گمان بھی یہ ہے کہ سیدھے راستے پر چلانے کے لئے جنگ کے بڑے ساز و سامان اور پوری فوج کے سوا (جن کے حاصل کرنے کے لئے نبی (امام) کی عمر کافی نہیں ہے) وہ دوسری جماعتوں کی تابعداری قبول نہیں کرے گی جیسے کہ اس وقت کے موجودہ ادیان والوں (یہود، عیسائی اور مسلمانوں) کے شروع زمانہ میں ہوا۔ کیونکہ ان میں سے جو لوگ ابتدا میں اپنے اپنے انبیاء علیہ السلام پر ایمان لائے۔ وہ بالکل تھوڑے تھے۔ اس نبی کے بعد وہ آہستہ آہستہ طاقت ور ہوئے اور اقوام کی ہدایت کا سبب بنے اور حق کے لئے انہوں نے لڑائیاں کیں۔

مہاجرین اولین اور انصار سبب بنے قریش اور قریش کے ارد گرد رہنے والوں کے اسلام میں داخل ہونے کا پھر ان کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے عراق اور شام فتح کرایا۔ اس کے بعد عراق اور شام والوں کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے فارس اور روم فتح کرایا۔ پھر ان کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے ہندوستان و ترکستان اور سوڈان فتح کرایا۔ گویا کہ یہ کام ایک مکان کی طرح ہے جو دیواروں پر کھڑا ہوتا ہے اور دیواریں بنیادوں پر کھڑی ہوتی ہیں۔

مذکورہ بالا چھ فوائد سے رسولوں کے بھیجے کی حکمت بھی سمجھ میں آگئی اور یہ بات بھی کہ رسول اللہ ﷺ کے آنے سے جو نتیجہ ظاہر ہوا وہ قرآن پر عمل کرنے سے ہوا۔ پس اس تمام نتیجہ کو قرآن کی تعلیم کا نتیجہ سمجھنا چاہئے اور اس نتیجہ کے پیدا کرنے کے لئے قرآن کو نازل کیا گیا ہے۔ (یہ چھ فوائد امام ولی اللہ دہلویؒ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ سے لئے گئے)۔

☆

۱۔ رسول اللہ ﷺ کی شریعت کا اصل مول متہ کیا تھا؟

رسول اللہ ﷺ نے یہ دعویٰ کیا کہ آپ خود ابراہیمی ملت کو ان کے فرزند اسماعیل علیہ السلام کے طریقہ پر زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام گزر چکے تھے اور وہ بھی ابراہیمی ملت کو زندہ کرنا چاہتے تھے لیکن اسرائیل (یعقوب) بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ پر۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ کی نظر ہمیشہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر پڑتی ہے جیسا کہ قرآن میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا ۖ شَهِدْنَا عَلَىٰ نَفْسِكَ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا (سورہ مزمل- ۱۵)

(یعنی بے شک ہم نے تمہاری طرف ایک گواہی دینے والا رسول بھیجا ہے جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا) اس آیت میں مذکورہ بالا بات کی طرف اشارہ کیا ہوا ہے۔

تمام شریعتوں کا اصل، حظیرۃ القدس (اس جہان کا انتظام کرنے والی مقدس مجلس) میں موجود ہے۔ پس جن بزرگوں کا تعلق حظیرۃ القدس سے ہے وہ ہر شریعت کو وہاں سے معلوم کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ بھی موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو وہاں سے معلوم کرتے تھے۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ نے دنیا کی اقوام تک دین حنیفی کی کیسے تبلیغ فرمائی؟

رسول اللہ ﷺ نے عرب کے سوا تمام دنیا کو اس طرح دعوت دی اور ارشاد فرمایا کہ توراۃ اور قرآن کی تعلیم ایک ہی ہے۔ اگر تم کو ان دونوں کتابوں میں سے کسی کتاب کی تعلیم پر اعتراض ہے تو تم ان دونوں کتابوں جیسی تعلیم پیش کرو۔ اگر تمہاری تعلیم توراۃ اور قرآن کی تعلیم سے زیادہ

رہنما ثابت ہوئی تو میں اس کی تابعداری کروں گا۔ لیکن خاص عرب قوم کو صرف اکیلے قرآن کی تعلیم کی دعوت دیتے تھے۔ قرآن اور توراۃ کی تعلیم کے بارے میں قرآن نے جو اعلان کر رکھا ہے اس کو سورۃ المائدہ کی آیات ۲۴ سے ۵۰ تک دیکھنا چاہیے۔

۳۔ دین حنیفی کی دوسرے ادیان سے برتری

اس وقت مسلمانوں کے سوا زمین پر جتنی بھی جماعتیں موجود ہیں ان میں سے ایک حنیفی (یعنی یہودی اور عیسائی) ہیں جن کے پاس تورات ہے، دوسرے صابی ہیں پھر صابی مذہب والوں کے کئی اقسام ہیں: (۱) ایران کے مجوسی، جن کے پاس زردشت کی کتاب ہے (۲) ہندو۔

ہندو دھرم والوں کی پھر دو جماعتیں ہیں: (۱) برہمن، جن کے پاس وید ہیں (۲) سنی، جن کے پاس بُدھ کی تصانیف اور احکام ہیں۔ برہمنوں کی مثال ہمارے پاس یہودیوں جیسی ہے اور بُدھ دھرم والوں کی مثال عیسائیوں کی طرح ہے۔

حنیفی اور صابی مذہب والوں کے سوا تیسرے وہ لوگ ہیں جو عقل اور فکر سے سوچی ہوئی باتوں پر چلتے ہیں جن کے مراکز یونان اور روم ہیں۔ انہوں نے جب کبھی کوئی بادشاہی قائم کر کے قوم کو اکٹھا کیا ہے اور اس لئے ان کو دنیا کے قوانین سے کسی اونچے قانون کی ضرورت پڑی ہے تو انہوں نے اہل کتاب کے قانون میں سے جو قانون ان کی رائے کے مناسب ہوا ہے اس کو لیا ہے اور اس کے بعد یا تو کسی (ڈکٹیٹر) بادشاہ کی طاقت سے مدد لی ہے یا آسانی ادیان میں سے کسی دین کی طرف انہوں نے رجوع کیا۔ اس طرح انہوں نے اپنی عقل سے کام لیا ہے۔

زردشت ایرانیوں کی کتاب، وید اور بُدھ دھرم والوں کی کتاب یہ سب کتابیں توراۃ کے درجہ کو کبھی نہیں پہنچ سکتیں۔ اس بات کو مذکورہ بالا مذہب والے بھی مانتے ہیں۔

حاصل مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا جماعتوں میں سے کسی جماعت کے پاس بھی تورات جیسی کتاب نہیں ہے جس میں انبیاء سے لیا ہوا قانون جمع کیا ہوا ہو۔

۴۔ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے امام کا خطاب کیوں ملا؟

ابراہیم علیہ السلام کا دین کسی زمین یا کسی قوم کے ساتھ خاص نہ تھا بلکہ روئے زمین کے تمام نوع انسانی کے لئے تھا۔ ابراہیم علیہ السلام کے بعد کوئی بھی ایسا آدمی پیدا نہیں ہوا جس نے ابراہیم علیہ السلام کی طرح تمام نوع انسانی کے فائدہ کے لئے کوئی عام فکر پیش کی ہو۔ یہ معنی اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ہیں إِنْ يَنْتَهِبْكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا (البقرہ- ۱۲۴) (یعنی اے ابراہیم علیہ السلام! میں تجھ کو لوگوں کے لئے امام بنانے والا ہوں)۔

۵۔ حنیفی ملت کی اصلی روح

ابراہیم علیہ السلام کے دین کی اصل روح یہ تھی کہ کسی بھی جماعت پر کسی شخص کی بادشاہی نہ ہو اور کوئی چیز بھی مخلوقات میں سے خدا نہیں بن سکتی۔ اس عقیدہ کو ہی توحید کہا جاتا ہے۔ یہ ایسا فکر ہے کہ جس کو ہر ایسا شخص پسند کرے گا جس کی انسانیت اور عقل سلامت ہوں گے کیونکہ کوئی بھی انسان نہیں چاہتا کہ اپنے جیسے انسان سے دھوکا کھا جاوے اور اس کا زیر دست ہو کر رہے۔ بلکہ ہر انسان کسی ایسی بات کو پسند کرتا ہے جس میں مشورہ لیا جائے اور اس مشاورت میں اس کو بھی دخل ہو۔ یہ گویا کہ انسانی فطرت ہے۔

اس کے علاوہ بڑے حکماء کے یہاں یہ بھی ثابت ہے کہ اس جسمانی دنیا کے پردہ کے پیچھے ایک اور ذات بھی ہے جس کے لازمی صفات کی بنا پر یہ جہان پیدا ہوا ہے۔ وہ ذات انسانی حواس کے سمجھنے سے بالکل دور ہے۔ چنانچہ ہر انسان کے لئے ضروری ہے کہ جس چیز کو اپنے حواس سے معلوم کر سکے، اس کو اللہ کا درجہ نہ دے۔ کیونکہ اللہ کی ذات حواس کے دائرہ کار سے بالکل باہر ہے۔ پس جو انسان آنکھوں اور دیگر حواس سے معلوم کی ہوئی مخلوق کو اللہ کے مترادف نہیں سمجھتا وہ اللہ کے خاص بندوں میں سے ہے۔

۶۔ یہودی اور عیسائی اگرچہ حنیفی ملت کی شاخیں ہیں لیکن انہوں نے اس کی پوری تبلیغ نہیں کی۔

پانچویں فائدہ میں بیان تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعوت تمام روئے زمین کے انسانوں کے لئے تھی لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ دعوت آپ کی زندگی میں انسانیت کے تمام اقسام تک نہ پہنچ سکی۔ پس آپ نے دعا مانگی کہ کاش: اللہ تعالیٰ اُسے اولاد دے اور ان کے لئے ایک مرکز قائم ہو! اور آپ کی وفات کے بعد آپ کی اولاد کی طرف سے آپ کے فکر (یعنی دعوت توحید) کو انسانوں کے تمام اقسام تک پہنچایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا قبول کی اور اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام دو فرزند عطا فرمائے۔ ان کے لئے آپ نے دو تبلیغی مرکز قائم کئے۔ اسحق علیہ السلام کے لئے بیت المقدس کی مسجد اور اسماعیل علیہ السلام کے لئے مکہ شریف کی مسجد الحرام۔

پھر جو بھی ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے بلند خیال والا انسان پیدا ہوا ہے اس نے کوشش کی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے فکر کو انسانوں کے تمام اقسام تک پہنچا دے۔ اور خود قوموں کا امام (پیشوا) بنے۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام بھی ان بلند خیال والے انسانوں میں سے ایک بڑے پیغمبر تھے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں کوشش کی لیکن وہ بھی کام کو پورا نہ کر سکے کیونکہ ان کی قوم نے، جسے آپ نے

ابراہیمی ملت کی اشاعت کیلئے اپنا مددگار بنایا تھا، اس کی پوری تابعداری نہ کی۔ اس لئے کام ادھورا رہ گیا۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام کی یہ مرضی تھی کہ اپنی قوم کو مصر کے ملک سے نکال کر بیت المقدس میں بسائیں اور وہاں اپنا مقصد پورا کرنے کے لئے ایک ادارہ قائم کریں لیکن آپ بیت المقدس تک پہنچے ہی نہیں کہ راستے میں فوت ہو گئے۔ اس کے بعد بنی اسرائیل میں موسیٰ علیہ السلام جیسا اور العزم دوسرا کوئی بھی پیدا نہیں ہوا جو ان کے چھوڑے ہوئے کام کو پورا کر سکے۔

موسیٰ علیہ السلام کے بعد عیسیٰ علیہ السلام آئے اور انہوں نے ارادہ کیا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کا قائم مقام بن کر ابراہیمی دعوت کو انسانوں کے تمام اقسام تک پہنچا دیں! لیکن یہود نے اس بات کو قبول نہیں کیا۔ اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام نے فقط ایک ”تبلیغی جماعت“ تیار کی جو ابراہیمی دعوت کو تمام اقوام تک پہنچاتی رہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی تیار کردہ تبلیغی جماعت کی کوشش کا یہ نتیجہ نکلا کہ مشرقی رومی سلطنت نے، جو اسرائیلی قوم سے بالکل الگ قوم تھی عیسائی مذہب قبول کیا اور اس نے وہ کام کر دکھایا جس کی یہود کو توفیق نہ ہوئی۔

یہودیوں نے بھی ابراہیمی طریقہ پر ایک ادارہ قائم کیا لیکن وہ محض اپنی قوم کے لئے تھا دے گرا انسانوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کا مقصد فقط یہ تھا کہ وہ خود ابراہیم علیہ السلام کے دین پر چلیں گے اور جو شخص بھی ابراہیم علیہ السلام کے دین کی دوسری اقوام میں تبلیغ کرتا اسے دشمن سمجھتے اور اس کو طرح طرح کی تکالیف پہنچاتے تھے۔

عیسیٰ علیہ السلام نے پہلے یہود کو ابراہیمی ملت کی روح سمجھائی لیکن جب ان سے ناامید ہو گئے تو اپنے حواریوں کی ایک جماعت تیار کی اور ان سے یہ عہد لیا کہ وہ ابراہیمی ملت کی روح کو تمام اقوام میں پھیلا دیں گے۔

اب ابراہیمی ملت پر چلنے والوں کے دو مذاہب قائم ہو گئے: (۱) یہودی جنہوں نے ابراہیمی دعوت کو بنی اسرائیل کے لئے مخصوص کر دیا (۲) عیسائی جنہوں نے ابراہیمی دعوت کو دیگر اقوام تک بھی پہنچایا لیکن سالہا سال کے بعد انہوں نے نہ صرف یہ کہ ابراہیمی ملت کی روح کو چھوڑ دیا، بلکہ اس کی صورت کو ہی بگاڑ دیا۔

۷۔ حنیفی ملت کی پوری پوری تبلیغ کون کرے گا؟

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ان کی اولاد میں سے ایک نبی ﷺ پیدا ہو گا جو ان کی تعلیمات کو دنیا کے کونے کونے میں پھیلائے گا۔ ابراہیم علیہ السلام کو اس وعدہ پر پورا بھروسہ تھا اور یہ بھی یقین تھا کہ وہ نبی اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے پیدا ہو گا۔ اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام کو اللہ کے حکم سے ایسی زمین میں بسایا جہاں کوئی کھیتی نہیں ہوتی کیونکہ کھیتی کرنے

اس بات کو صاف اور واضح الفاظ میں بیان نہیں فرمایا بلکہ مختلف اوقات میں علیحدہ علیحدہ موقعوں پر حسبِ ذیل طور پر ارشاد فرمایا:

- ۱۔ میں اپنے رب سے درخواست کروں گا کہ وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے کہ اب تک تمہارے ساتھ رہے (یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۶) یعنی یہ میری قوم تمام اقوام انسانیت میں پھیل جائے۔
- ۲۔ میں تمہیں یتیم نہ چھوڑوں گا۔ میں تمہارے پاس آؤں گا۔ (یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۸) یعنی میری تعلیم توحید کی تکمیل ہوگی۔

۳۔ میں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ رہ کر تم سے کہیں لیکن مددگار (یعنی روح القدس) اسے بھیجے گا (وہی تمہیں تمام باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا۔) (یوحنا باب ۱۴ آیت ۲۵)

۴۔ اب میں اپنے بھیجنے والے کے پاس جاتا ہوں اور تم میں سے کوئی مجھ سے نہیں پوچھتا تو کہاں جاتا ہے، بلکہ اس لئے میں نے یہ باتیں تم سے کہیں کہ تمہارا دل غم سے بھر گیا لیکن میں تم سے بچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارے میں قصور وار ٹھہرائے گا مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم انکی برداشت نہیں رکھ سکتے، لیکن جب وہ (توحید) سچائی کا روح آئے گا تو تم کو پوری سچائی کی راہ دکھائے گا اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ نئے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا کہ کامیابی تمہاری ہے۔

وہ میرا جلال ظاہر کرے گا اس لئے کہ مجھ ہی سے حاصل کر کے تمہیں خبریں دے گا جو کچھ رب کا ہے وہ سب میرا ہے۔ اس لئے میں نے کہا کہ وہ مجھ ہی سے حاصل کرتا ہے گا اور تمہیں خبر دے گا۔ تھوڑی دیر تم مجھے نہ دیکھو گے اور پھر تھوڑی دیر میں تم مجھے دیکھ لو گے۔

(انجیل یوحنا باب ۱۶ آیت ۵)

عیسیٰ علیہ السلام کی ان تمام بشارتوں سے یہ بات ظاہر ہے کہ یہ تمام بشارتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے متعلق ہیں۔ ان بشارتوں کے علاوہ انبیاء سابقین کی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کے بارے میں بہت سی بشارتیں موجود ہیں۔ یہود ان بشارتوں کو دیکھ نہیں سکتے اس لئے کہ انہوں نے ان پیشگوئیوں کی غلط معنی بیان کر کے بگاڑ دیا ہے تاکہ لوگ ان کے صحیح معنی نہ سمجھ سکیں۔ لیکن وہ اللہ کی صحیح بات کو بدل نہیں سکتے۔ جو شخص بھی توراۃ اور اناجیل کو غور و فکر سے پڑھے گا وہ حق کو سمجھ جائے گا۔ اور جو کچھ ان سرکشوں نے لکھا ہے اسے چھوڑ دے گا۔

والے لوگوں کو ہمیشہ اپنے سرسبز وطن پر فخر رہتا ہے اور وہ اپنے وطن والوں کو منفرد قوم سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد اگر وہ اس وطن والے کسی خاص آدمی کی اولاد ہوں گے تو وہ اپنی نسل پر بھی اترائیں گے اور دوسرے لوگوں کو حقیر سمجھیں گے اور ان میں اپنے خیالات کی تبلیغ کرنے سے رُک جائیں گے۔ کھیتی والے ملکوں کے باشندوں کو دیکھا گیا ہے کہ ان کے باپ دادا کی اولاد اگر دوسرے ملک میں بستی ہے اور ان کے ساتھ کسی بات پر جھگڑا ہو جائے تو وہ اپنے بھائیوں کے فائدہ کو اپنے وطن کے مفاد پر کبھی ترجیح نہیں دیں گے۔

اسی طرح اگر ایک جماعت کی بنیاد چند سچے اعتقادات پر قائم ہو اور اس جماعت کا ایک حصہ جدا ہو کر کسی بڑے خوشحال ملک میں آباد ہو جائے تو وہ حصہ اپنے مذہب والوں کی مصلحت کا اس وقت کبھی خیال نہیں کرے گا، جب ان کے مذہب کی مصلحت ان کے وطن کی مصلحت سے مخالف ہوگی۔ ابراہیم علیہ السلام کا اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو ایک بیابان میں بسانے سے یہی مقصد تھا کہ اس کی اولاد میں وطن کی (فاخرانہ) محبت پیدا نہ ہو بلکہ اپنے مذہب کو ہر حالت میں مقدم رکھتے آئیں۔ آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ جس بیٹے کا اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ وعدہ کیا تھا جو اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہو گا۔ وہی ان کی ملت کو تمام دنیا میں پھیلانے میں کامیاب ہو گا۔ اسی لئے اسماعیل علیہ السلام کو حجاز کے بیابان میں رہنے کا حکم دیا۔ اس کے علاوہ ابراہیم علیہ السلام یہ بھی جانتے تھے کہ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کے سوا بہت سے لوگ اس مقصد کے لئے کوشش کریں گے لیکن وہ کامیاب نہیں ہوں گے کیونکہ وہ خوشحال ملکوں کے باشندے ہوں گے۔ پس ان میں کسی نہ کسی قسم کا تمدن آئے گا۔ پھر دوسرے لوگ جن کا تمدن بھی اگرچہ انہی کی طرح ہو گا لیکن وہ یہ کبھی برداشت نہ کریں گے کہ ان کے تابعدار ہو کر رہیں اور وہ ان سے برتر و بلند رہیں۔ اسی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام اپنے ہدف تک پہنچ نہ سکے۔

۸۔ عیسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی کہ حنیفی دین کی پوری تبلیغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کریں گے عیسیٰ علیہ السلام نے جب دیکھا کہ یہودی، ابراہیمی ملت کو تمام اقوام میں پھیلانے کے لئے کوئی کوشش نہیں کرتے تو وہ ان سے ناامید ہو گئے لیکن پہلی کتابوں سے ان کو معلوم تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے جو مرد خدا اس کے دین کو تمام اقوام میں عام کرے گا وہ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے پیدا ہو گا۔ اس لئے انہوں نے ایک پیغمبر کے پیدا ہونے کی خوشخبری سنائی اور فرمایا کہ جس کام کے کرنے کا میں نے ارادہ کیا تھا اس کو وہ آکر پورا کرے گا۔ اور اپنے حواریوں کو بھی وصیت فرمائی کہ جب اس کا ظہور ہو تو تم اس کی تابعداری کرنا۔ لیکن عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کی مخالفت کے پیش نظر

۹۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا اصلی مقصد

ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کو جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے رسول اللہ ﷺ کے آنے کا یقین تھا اور عیسیٰ علیہ السلام نے بھی آپ کے آنے کی خوش خبری دی تھی۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ کے آنے کا مقصد متعین ہو جاتا ہے وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ دنیا میں ایک زبردست حکومت قائم کریں گے جس کا مقابلہ دوسری کوئی بھی حکومت نہیں کر سکے گی۔ اور اس حکومت میں تمام اقوام کو حنیفی ملت پر جمع کریں گے۔

رسول اللہ ﷺ اپنے اس مقصد میں یقیناً کامیاب ہوئے لیکن آپ کے اس مقصد کی تکمیل میں آپ کے خلفاء ابو بکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ کی کوششوں کو بھی شریک اور شمار کیا جائے۔ ان چاروں بزرگوں نے اس مقصد کو یقیناً پورا کیا۔ ان چاروں کے بعد پھر قدم پیچھے ہٹنے شروع ہوئے۔

۱۰۔ رسول اللہ ﷺ کا اپنے مقصد میں کامیاب ہونا

قرآن کریم رسول اللہ ﷺ کی کامیابی کی خوش خبری ایک مثال کے ذریعے سناتا ہے وہ یہ ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ (سورہ فتح ۲۹) اس مثال میں ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی روح دیکھنے میں آتی ہے۔ دوسری طرف رسول اللہ ﷺ نے وہ کام کیا ہے جو دوسرے کسی بھی انسان نے نہیں کیا۔ قرآن اس تمام کام کو اکیلے رسول اللہ ﷺ کا کام نہیں ٹھہراتا بلکہ آپ کی ذات مبارک کے ساتھ اس کام کو آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کا کام بھی ٹھہراتا ہے۔ چنانچہ کسی کو بھی جائز نہیں ہے کہ آپ کی ذات مبارک کو غیبی طاقت کا مالک مانے اور قانون کا مالک (بادشاہ) ٹھہرائے۔ اور یہ فکر تورات، انجیل اور قرآن سے ثابت ہوتی ہے۔ اس فکر کے ساتھ مندرجہ ذیل باتیں بھی یاد رکھنی چاہئیں۔

(پہلی بات) وہ حکماء اور عقلمند جنکی سمجھ پر بھروسہ کیا جاتا ہے ان میں سے کسی نے بھی انسانی اجتماع کے لئے قرآن جیسا پروگرام پیش نہیں کیا۔ سورہ اسراء کی آیت ۲۸ کے معنی یہ ہیں: (اے رسول کہہ دو: اگر انسان اور جن اس پر جمع ہو جائیں کہ اس قرآن جیسا کوئی کتاب آئیں تو اس جیسا نہیں لاسکیں گے اگرچہ بعض ان کے مددگار بھی بن جائیں)

(دوسری بات) صابئی مذہب کی جو شاخیں ایران، چین اور ہندوستان میں ہیں ان سب کا مقصد وہی تھا جو رسول اللہ ﷺ اور قرآن نے پیش کیا اور ان مذاہب میں بلند مرتبہ آدمی بھی پیدا ہوئے لیکن انہوں نے بھی تمام انسانی جماعتوں کے لئے ابراہیم علیہ السلام کے دین جیسا مقصد پیش

نہیں کیا۔ جو مذہبی کتابیں ہندوستانیوں، ایرانیوں، چینوں اور یونانیوں کے پاس ہیں ان کی اللہ کے فضل سے ہم کو سمجھ ہے لیکن اس (تکمیل توحید کے) مقصد کو کیسے پورا کیا جائے اس میں وہ بھی قرآن سے بہت پیچھے ہیں۔

ان مذاہب کے بعض آدمیوں میں ایسے افکار اور خیالات موجود ہیں لیکن وہ بھی کوئی جماعت نہ بنا سکے۔ جماعت ایک آدمی سے نہیں بنتی بلکہ اس وقت وجود میں آتی ہے جب بہت سارے آدمی ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں اور اس مقصد پر اتفاق کریں۔

ہندوستان کی تاریخ میں امام ولی اللہ اور آپ کے اتباع سے پہلے کوئی بھی ایسی جماعت نہیں ملتی جس نے ایسی تحریک پیدا کی ہو جو مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کو اکٹھا کر سکے! شاہ صاحب کا فلسفہ جس طرح مسلمانوں میں اپنا اثر ظاہر کرتا ہے اسی طرح ہندوؤں پر بھی۔ اثر کر سکتا ہے۔ کیونکہ امام صاحب کے فلسفہ کی بنیاد ہندوؤں کے فلسفہ کے موافق ہے، اس لئے ہم ولی اللہ کی امامت ہندوؤں سے بھی منواسکتے ہیں (یعنی ہندوؤں سے بھی اس نام کی حقانیت قبول کر سکتے) ہندوستان کی قومیں مجتمع ہو گئیں تو پھر پوری دنیا کی اقوام اکٹھی ہو جائیں گی۔

(تیسری بات) رسول اللہ ﷺ اگرچہ عام انسانیت کے رہبر اور انکو پاک کرنے والے تھے لیکن آپ کی پہلی توجہ اور فکر اپنی قوم قریش کو کمال تک پہنچانے کیلئے تھی کیونکہ:

۱۔ عام عرب بیت اللہ شریف کی عزت کرتے تھے۔ پس بیت اللہ شریف اور ابراہیم علیہ السلام کی وجہ سے وہ قریش کو اپنا دینی سردار سمجھتے تھے۔ بنی اسرائیل کو عرب اگرچہ عزت کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کے علم و فضیلت کے قائل بھی تھے اور ان کو ابراہیم علیہ السلام کی اولاد بھی سمجھتے تھے لیکن چونکہ ان کا تعلق بیت اللہ شریف سے کچھ نہیں تھا اس لئے وہ ان کو اپنا دینی رہبر نہیں سمجھتے تھے۔

ابراہیم علیہ السلام اصل میں عراق عجم سے تھے تو ان کی اولاد اسماعیل اور اسرائیل سب عجمی النسل ہوتے ہیں۔ اور چونکہ سارہ لفظ بمعنی حمیدہ خالص سندھی ہے تو سندھ سے تعلق زیادہ قوی ہے۔ قریش اور یہود کے اخلاق سندھ میں اب تک موجود ہیں۔

۲۔ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد خالص عربوں میں رہ کر عرب بن گئی۔ اس لیے عرب قریش کو اپنا سمجھتے تھے لیکن بنی اسرائیل کو اپنا نہیں سمجھتے تھے۔

۳۔ قریش تجارت کرتے تھے۔ تجارت پیشہ طبقہ انسانیت کا درمیانہ درجہ ہے اس لئے ان کو جس طرح عوام سے واسطہ پڑتا تھا اسی طرح بادشاہوں سے بھی تعلق تھا۔ وہ بادشاہوں اور ان کے حالات کو سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ ایسا معاملہ کرتے تھے کہ وہ ان سے خوش ہو جائیں اور

۱۱۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کا خلاصہ

امام شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی قدس اللہ سرہ کی تعلیم کے موجب انبیاء علیہ السلام کی تعلیم اور رسول اللہ کی ہدایت (جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو لوگوں کو پاک کرنے کے لئے بھیجا ہے) کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں میں چار خصلتیں پیدا ہوں۔

۱۔ طہارت: طہارت کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت سے کچھ چیزوں کو ناپاک ٹھہراتا اور اپنے بدن کو ان پلید چیزوں سے بچاتا ہے جیسے پیشاب، پاخانہ وغیرہ۔ پھر چونکہ یہ بات اس کے دل میں رکھی گئی ہے اور اسی سے ایک گھڑی بھی غافل نہیں رہ سکتا اس لئے اس خصلت کو کمال تک پہنچانا اس کے لئے آسان ہے پھر وہ ہر کلام، ہر فکر اور ہر عادت، جسے وہ پیشاب اور پاخانہ کی طرح بُرا سمجھے گا، اس سے بھی اپنے آپ کو بچائے گا! امام شاہ صاحب کے نزدیک یہ خصلت دین کا چوتھا حصہ ہے۔

۲۔ اخبات: تواضع و عجز اختیار کرنا۔ اس خصلت کی حقیقت یہ ہے کہ انسان جب اپنے باپ دادا یا مرشدوں، استادوں یا نیک بخت حاکموں اور بادشاہوں میں سے کسی کی عزت کرتا ہے تو جب کسی وقت ان کی خدمت میں حاضر ہو گا تو اپنے دل میں اس وقت ایک قسم کی عاجزی محسوس کرے گا۔ اور یہ خواہش کرے گا کہ کاش! وہ اسے کسی کام کے کرنے کا حکم دیں اور یہ اس کام کو خوشی سے پورا کر کے اپنی تابعداری کے ذریعے ان کے نزدیک ہو جائے۔ اس آدمی کو اس بزرگ کے نزدیک ہونے میں ایک قسم کی لذت محسوس ہوگی۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔ کوئی آدمی اس کو سکھائے یا نہ سکھائے لیکن یہ بات اس کے دل میں رکھی ہوئی ہے۔

اس کے بعد جب وہ اپنے دل کی ہدایت سے یا کسی نیک بخت کے ہدایت کرنے سے اللہ پر ایمان لائے گا اور اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کے آگے عاجزی کرنے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی خواہش اس درجہ کو پہنچے گی جس میں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے کسی کو بھی شریک نہیں کرے گا۔ تب کہا جائے گا کہ اسے اللہ تعالیٰ کے آگے عاجزی کرنے کی خصلت حاصل ہو گئی ہے۔ اس وقت اگر وہ کسی کے آگے عاجزی کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے کرے گا۔ جس کے آگے عاجزی کرنے میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی نہیں دیکھے گا اس کے آگے عاجزی کبھی نہیں کرے گا۔ اس کا باپ بھی اگر اس کو کوئی حکم دیکھا تو اس لئے اس کی تابعداری کرے گا کہ وہ سمجھے گا کہ باپ کی تابعداری کرنے سے میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہو جاؤں گا۔

۳۔ ساحت (سقاوت): اس خصلت کی حقیقت یہ ہے کہ انسان بہت سی چیزوں کو پسند کرتا ہے، اس کا دل چاہتا ہے کہ اچھا کھانا کھائے۔ اچھے کپڑے پہنے اچھے مکان میں رہے۔ اس کی

اپنے بیوپار کو ترقی دینے کے لئے عام لوگوں کو بھی اپنی طرف کھینچنا جانتے تھے۔ یہ بات عام عربوں میں نہ تھی وہ بدو اور اجڑ تھے۔

۴۔ قریش رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہونے سے تقریباً ایک سو برس پہلے اکٹھے ہو کر مکہ شریف میں بیت اللہ شریف کے ارد گرد آکر رہنے لگے تھے۔ ان کو رسول اللہ ﷺ کے ادا اقصیٰ نے کوشش کر کے اکٹھا کیا تھا۔ اس لئے بھی عام عرب ان کی عزت کرتے تھے۔ ان سو برس سے پہلے وہ عرب کے مختلف قبائل میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور وہ قبائل قریش کی ایسی عزت کرتے تھے جس طرح آج کل پیروں اور بزرگوں کی اولاد کی ہوتی ہے۔ پس اگر قریش رسول اللہ ﷺ کی تعلیم و تبلیغ سے راہِ راست پر آجائیں گے اور عام لوگوں کے فائدہ کے لئے کام کرنا چاہیں گے تو عوام آسانی سے ان کی تابعداری قبول کریں گے!

۵۔ عرب کے شمال میں مختلف یہودی قبائل بستے تھے جو تجارت پیشہ تھے۔ حجاز کے اقتصادی حالات کا دار و مدار اکثر انہی پر تھا۔ پس جیسا کہ قریش اور یہودی دونوں تجارت پیشہ تھے اس لئے یہودی ایک تو بیوپار کی وجہ سے دوسرا اس وجہ سے کہ دونوں قومیں ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھیں، قریش سے دوستی اور میل ملاپ کی رسمیں جاری رکھتے تھے۔

قریش کی مذکورہ پانچ حالات رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہونے سے پہلے تھیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے جب اپنی شروع عمر میں اپنے مبعوث ہونے سے پہلے قریش کے بڑوں سے منا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی اولاد میں سے ایک ایسا رسول پیدا کرے گا جو اس کی ملت کو دنیا میں شائع کرے گا تب آپ نے ابراہیمی ملت کو زندہ کرنے اور قریش کو بلندی کے درجہ تک پہنچانے کا خیال کیا کیونکہ یہ کام کرنے کا آپ کی فطرت و طبیعت خواہش کرتی تھی اور اس کام کے صحیح ہونے کی شہادت ایک تو آپ کا دل دیتا تھا دوسری وہ روایت تھی جو ابراہیم علیہ السلام سے نقل ہوئی چلی آرہی تھی۔

نبوت حاصل ہونے کے بعد یہ کام آپ پر آسان ہو گیا کیونکہ وحی کے ذریعہ سے اس کام کے صحیح ہونے کا آپ کو زیادہ یقین ہو گیا۔ نبوت سے پہلے اور بعد کے حالات میں فرق صرف یہ تھا کہ نبوت سے پہلے آپ نہ نبوت کو جانتے تھے اور نہ اس درجہ کے ملنے کی آپ کو امید تھی۔ آپ صرف ابراہیمی ملت کے زندہ کرنے سے قریش کو بلند درجہ پر پہنچانا چاہتے تھے۔ نبوت کے بعد آپ کا پروگرام (دستور العمل) یہ تھا کہ آپ قریش اور قریش کے ارد گرد بسنے والے قبائل کی اصلاح میں مصروف ہوں گے پھر جب اس کام سے فارغ ہوں گے اور آپ کی قوم میں آپ کی طاقت بڑھے گی تو دوسری اقوام بنی آدم کی درجہ بدرجہ اصلاح کریں گے تا آنکہ تمام دنیا کی اصلاح کو کمال تک پہنچائیں گے۔

ایک طریقہ جسے تمام انبیاء علیہم السلام پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جیسے سورج کی تجلی (عکس) آئینہ پر پڑتی ہے اور سورج آئینہ کے اندر دیکھنے میں آتا ہے پس اگر وہ آئینہ بھی سورج کے عکس جتنا ہو گا (نہ اُس سے بڑا اور نہ چھوٹا) تو لوگ حقیقی سورج میں اور سورج کے اس عکس میں اپنی گزشتہ معلومات ملانے کے بغیر فرق معلوم نہیں کر سکیں گے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تجلی اس کی مخلوق میں سے بعض چیزوں پر پڑتی ہے اور وہ چیزیں منفرد نظر آتی ہیں پس اگر انسان ان چیزوں کی طرف دیکھنے کے وقت یہ سمجھے گا کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں اور ان چیزوں کی طرف کچھ بھی خیال نہ کرے گا تو سمجھنا چاہئے کہ اس نے اللہ کی تجلی کو دیکھا اور وہ تجلی اس کو اس لئے دکھائی گئی ہے کہ اس کو اللہ کی صفات میں سے کوئی صفت معلوم ہو جائے۔ انسان کو جب بھی سمجھ میں آجائے کہ یہ اللہ کی تجلی ہے تو اس پر لازم ہو گا کہ وہ اس تجلی کے آگے اپنی انتہائی طاقت سے جھکے اور اس کی تعظیم کرے۔ اس تجلی کی عزت اللہ تعالیٰ کی عزت کے قائم مقام ہوگی۔ کیونکہ جن چیزوں پر وہ تجلی پڑی انکی طرف کوئی بھی خیال نہیں کیا گیا ہے بلکہ ان کو اس تجلی کے دیکھنے کے وقت اس شے جیسا سمجھا گیا ہے جس پر صورت کا عکس پڑتا ہے یا ان چیزوں کو عینک کی طرح سمجھا گیا ہے جس سے انسان دور کی چیز کو دیکھ سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ایک تجلی عرشِ عظیم پر پڑتی ہے۔ اس تجلی کو رحمن کہا جاتا ہے۔ یہ وہ آخری تجلی ہے جس تک انسان کی سمجھ خود کو پہنچانے میں ترقی کر کے پہنچتی ہے اس کے بعد جو تجلی عرشِ عظیم پر پڑتی ہے اس سے نیچے اس تجلی کی پھر کتنی ہی تجلیاں آسمان اور زمین میں ہیں۔

اگر انسان ان چیزوں کو دیکھتے وقت یہ سمجھے کہ میں اللہ کی تجلی کو دیکھ رہا ہوں اور ان چیزوں کی طرف بھی خیال کرے تو اس وقت ان چیزوں کو شعائر اللہ کہا جائے گا۔

شعائر اللہ کی تعظیم ایمان کے اجزاء میں سے ایک بڑا جزو ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں ایک ایسی طاقت رکھی ہے جس کی وجہ سے اس کو بلا واسطہ اللہ کے معلوم کرنے میں مزہ آتا ہے اور انسان اپنے تمام مقاصد میں سے اس مقصد کو بڑا مقصد کہتا ہے اور شعائر اللہ کی تعظیم بلا واسطہ اللہ تک پہنچاتی ہے۔ پس جس کے دل میں شعائر اللہ کی تعظیم ہوگی اس کے دل میں ایمان کے تمام اجزاء میں سے بڑا جزء موجود ہو گا۔

مذکورہ بالا چار خصلتوں کو حاصل کرنے اور شعائر اللہ کی تعظیم کرنے سے انسان ان ملائکہ جیسا ہو جاتا ہے جو اللہ کی تجلی کے آگے حاضر رہتے ہیں۔

امام ولی اللہ ان چار خصلتوں اور شعائر اللہ کی تعظیم کو دو مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

(۱) التطلع الی الجہود (یعنی اللہ تعالیٰ کی ان صفات کی طرف دیکھنا جن کا تعلق اس جہان کے نظام سے ہے۔)

خوبصورت عورت ہو اور قوم میں عزت والا ہو اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اس کو قرب حاصل ہو۔ پھر اگر کسی انسان کی طبیعت ایسی ہو جائے کہ اچھا کھانا کھائے اور عورتوں سے صحبت کر کے ان لذتوں کو یاد کرتا ہے تو یہ طبیعت اس کو دوسری ضروریات میں مشغول ہونے اور پورے کرنے سے روکتی رہے گی۔

لیکن اگر اس کی طبیعت ایسی ہوگی کہ کھانا کھانے اور عورتوں کے نزدیک ہونے کے مزہ حاصل کرنے کے بعد جب فارغ ہو تو اس کو بھلا دے اور اس کی طرف کوئی خیال نہ کرے تو یہ انسان اپنے دوسرے کام بھی پورے کر سکے گا۔ اور اپنے اخلاق کو بھی کمال تک پہنچا سکے گا۔ یہ شخص اگر کتاب اٹھا کر پڑھے گا یا مسجد میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کو یاد کرے گا تو وہ اپنے دماغ کو دنیا کے تمام افکار سے پاک کر کے پھر یہ کام کرے گا۔ اس شخص کی طبیعت کی مثال پانی کی طرح ہوگی۔ پانی میں اگر انگلی داخل کر دو تو اس میں انگلی چلی جاتی ہے اور جب باہر نکالو تو پانی میں کسی قسم کا بھی سوراخ دکھائی نہیں دیتا۔ اسی طرح یہ انسان جب نفسانی کام کرے گا تو اس کو اچھی طرح سے کرے گا اور جب اس سے فارغ ہو گا تو اس کو بھلا دے گا۔ اسی عادت کو ہم سخاوت کہتے ہیں۔

۴۔ عدالت۔ اس خصلت کی انسانی جماعت کو کس قدر ضرورت ہے یہ بات ہر ایک جانتا ہے۔ کوئی بھی اجتماع عدالت کے بغیر قائم نہیں ہوتا۔ پس عدالت یا تو انسانیت کے برابر ہے یا ایک دوسرے کو لازم و ملزوم ہیں۔ جس انسان، گھر، قبیلہ یا قوم میں انصاف نہ ہو گا اس میں کسی قسم کی بھی انسانیت نہ ہوگی۔

حضرت امام شاہ صاحب ان چار خصلتوں کو تمام احکام کا اصل اور جو ان چار خصلتوں کے مخالف خصلتیں ہیں انہیں ان بُرے کاموں میں شمار کرتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں روکا ہے۔ ان چار خصلتوں کے علاوہ ایک اور چیز ہے جسے امام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس اللہ سرہ شعائر اللہ (یعنی اللہ کو پہچاننے کی نشانیاں) کہتے ہیں۔ حضرت امام ولی اللہ صاحب شعائر اللہ کی عزت کرنے کو اللہ تعالیٰ کی ذات کی عزت کے برابر رکھتے ہیں۔ پس جس الہی دین کو رسول اللہ ﷺ لائے ہیں اس کا خلاصہ امام شاہ صاحب کے پاس یہ ہے کہ انسان اپنے اندر مذکورہ بالا چار خصلتوں کے مخالف خصلتوں کو چھوڑنے کی کوشش کرے اور شعائر اللہ کی عزت کرے۔

۱۲۔ شعائر اللہ کی حقیقت

شعائر اللہ کی عزت کیسے کی جائے؟ اس کے لئے خدا شناس عارف اور حکماء اس بات پر متفق ہیں کہ اس جہان کے پیدا کرنے والے اور اس میں تغیرات کرنے والے کی حقیقت تک انسانوں کی سمجھ پہنچ نہیں سکتی۔ کچھ خاص طریقے ہیں جن سے لوگ اللہ کے وجود کو سمجھ سکتے ہیں۔

اور کسی کی تیاری میں زیادہ تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ اس لحاظ سے مالدار اس کو سمجھنا چاہئے جس کے پاس اوزار بہت ہوں اور غریب اس کو جس کے پاس اوزار نہ ہوں۔ غریب لوگ مالدار لوگوں کے اس لئے تابع ہوتے ہیں کہ مالداروں کے پاس اوزار ہوتے ہیں اور غریب لوگ اپنی طبعی طاقت سے وہ کام نہیں کر سکتے جو اوزاروں کے ذریعے تھوڑے وقت اور کم طاقت سے ہو سکتے ہیں۔ اس لئے وہ مالداروں کے پاس جاتے ہیں تاکہ ان کی طرف سے ان کی طبعی طاقت ہو اور مالداروں کی طرف سے اوزار، دونوں کو ملا کر کوئی کام کریں اور فائدے میں شریک ہوں۔ پھر اگر مالدار آدمی طاقتور بھی ہے تو وہ ترقی کر کے بادشاہ بن جائے گا۔ اور اگر اس کی طاقت دوسروں کی طاقت کے برابر ہے تو اس کو جماعت کا بڑا بنائیں گے۔

انسان اگرچہ بہت سے حیوانوں سے ضعیف ہے لیکن اس پر اللہ کی یہ مہربانی ہے کہ اس کو عقل دی ہے۔ عقل حیوانی طاقت ہے جس پر اس کا ملکی فکر اثر کرتا ہے پس عقل سے انسان اوزار بناتا ہے اور اوزاروں کے واسطے سے وہ اپنی ضعیف طاقت سے تھوڑے وقت میں وہ کام لے سکتا ہے جن سے بڑے سے بڑے جانور بھی عاجز ہیں۔ اس کی عقل تمام حیوانی طاقتوں کی امام ہے۔ حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلوی اوزاروں (آلات) کے استعمال کو اور ان کے واسطے سے تھوڑی طاقت سے چیزوں کے حاصل کرنے کو ارتفاق کہتے ہیں۔

پھر ارتفاق کی کئی قسمیں ہیں:

- ۱۔ وہ ارتفاق جس سے کوئی بھی انسان خواہ کہیں ہو، پھوٹ نہیں سکتا۔
- ۲۔ آداب المعاش (زندگی گزارنے کے طریقے)
- ۳۔ تدبیر المنزل (گھریلو زندگی کے طریقے)
- ۴۔ فن المعاملات (لوگوں کے آپس میں معاملات کے طریقے)
- ۵۔ سیاست المدنیہ (شہری نظم و نسق اور زندگی کے طریقے)
- ۶۔ سیاست (یعنی شہروں کو ملا کر ان کو کس طرح چلایا جائے)

پھر شہروں کو ملا کر چلانے کے کئی اقسام ہیں۔ ان میں سے ایک قسم وہ ہے جس کو امام ولی اللہ دہلوی قدس اللہ سرہ خلافت کہتے ہیں۔ جب تک ایسی زبردست خلافت جس کا مخالف جماعتیں مخالفت کرنے کے باوجود مقابلہ نہ کر سکیں اور جب تک وہ قائم نہ ہو جائے کسی آدمی کے لئے بھی سستی کر کے بیٹھ رہنا جائز نہیں۔ یہ بات اُس وقت ممکن ہو سکتی ہے جب وہ اوزاروں کے استعمال میں درجہ کمال کو پہنچ جائے۔

۲۔ التشبہ بالملکوت (یعنی ان ملائکہ جیسا ہونا جو اللہ تعالیٰ کی تجلی کے آگے رہتے ہیں۔)

امام ولی اللہ دہلوی کے نزدیک التطلمع الی الجہود اور التشبہ بالملکوت دونوں وصفوں کا اپنے میں پیدا کرنا انسان کا انتہائی کمال ہے۔ انسان کی پیدائش میں اس کی فطرت کے موافق جو حقیقی لطائف اور پاک طاقتیں رکھی ہوئی ہیں ان کی وجہ سے یہ دونوں صفتیں اپنے میں پیدا کرنا اس غرض سے لازم ہے۔

۱۳۔ عدالت کی وضاحت

یہاں کچھ باتیں جاننا ضروری ہیں اس کے بعد عدالت کی حقیقت اور ضرورت وضاحت سے سمجھ میں آجائیں گی۔

پہلی بات انسان کی حقیقت کیا ہے؟

حکماء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ انسان حیوانِ ناطق ہے۔ یعنی وہ بڑھنے والا۔ حس رکھنے والا اور ارادہ سے حرکت کرنے اور فکر کرنے والا جسم ہے۔ فکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے افکار کو ترتیب دے سکتا ہے، انکے بہت سے اقسام بنا سکتا ہے اور ان کو اپنے فصیح کلام سے دوسروں کے آگے ظاہر بھی کر سکتا ہے۔

انسان کی اس تعریف کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے کہ انسان میں التطلمع الی الجہود اور التشبہ الی ملکوت کی دو طاقتیں رکھی ہوئی ہیں۔ اس لئے انسان کو یہ دونوں صفتیں اپنے میں پیدا کرنی چاہئیں۔

۱۔ وہ تمام حیوانات کی طرح اپنی غذا حاصل کرنے کے لئے ایسی چیزوں کا محتاج ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے پیدا کیا ہے۔ ان چیزوں کے پیدا کرنے میں نہ تو انسان کی طاقت کام کر سکتی ہے نہ اس کی عقل اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ مثلاً: انسان پانی پیتا ہے پھل کھاتا ہے پانی اور پھل کو اللہ کی قدرت کے سوا دوسرے کسی نے پیدا نہیں کیا۔

۲۔ دوسری بات انسان میں یہ رکھی گئی ہے کہ وہ کسی چیز کو پسند کرتا ہے لیکن اس تک نہ اس کے ہاتھ پہنچ سکتے ہیں نہ اس کی طبعی طاقت اس کو حاصل کر سکتی ہے پس وہ اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے کسی دوسری چیز کو اس چیز کے حاصل کرنے کا ذریعہ بناتا ہے مثلاً وہ درخت کی چوٹی پر پھل دیکھتا ہے جس تک اس کے ہاتھ نہیں پہنچ سکتے۔ پس وہ پھل کو حاصل کرنے کے لئے پتھر مارتا ہے تاکہ پھل ٹوٹ کر نیچے گر پڑے یا درخت کی کسی ٹہنی کے ذریعے اس کو نیچے اتار لیتا ہے، یہ ہے آلات کا استعمال۔ اس طرح جوں جوں اس کی ضروریات بڑھتی جاتی ہیں آلات کے استعمال کا شوق بھی بڑھتا جاتا ہے۔ آلات کو حاصل کرنے اور تیار کرنے کے لئے انسان کو شش کرنا ہوتا ہے کسی اوزار کے تیار کرنے میں اس کو تھوڑا وقت لگتا ہے

۱۴۔ رسول اللہ کی کوئی بھی تعلیم انسانی فطری صفات کے خلاف نہیں

امام ولی اللہ قدس اللہ سرہ مذکورہ بالا ارتقاات کو انسانی فطرت سے باہر کی چیز نہیں کہتے جو انسان کے ساتھ چٹا دی گئی ہو۔ بلکہ فرماتے ہیں کہ انسانی فطرت ان تمام ارتقاات کی خواہش کرتی ہے۔ کیونکہ اگر کوئی انسان شہروں سے دور کسی جنگل یا بیابان میں پیدا ہو اور کسی سے بھی کوئی رسم و رواج نہ سیکھے تب بھی اس کو بھوک پیاس لگے گی، عورت کی خواہش ہوگی اور شادی کرنے کے بعد اس کے بال بچے پیدا ہوں گے جس کے بعد بہت سے گھر بن جائیں گے اور ان میں خرید و فروخت اور ان کے لین دین ہوں گے۔ اس طرح پہلا ارتقاات ترتیب وار موجود ہو جائے گا۔ پھر جب آبادی بڑھے گی۔ تو ضرور ان میں بلند اخلاق آدمی پیدا ہوں گے اور ان کے سامنے ایسے معاملات پیش آئیں گے جن کی وجہ سے سب ارتقاات موجود ہو جائیں گے۔ اس لئے کسی قوم میں انصاف کی بادشاہی کا پیدا ہونا اور بہت سی قوموں میں انصاف کی خلافت (یعنی بین الاقوامی حکومت) کا پیدا ہونا انسانی نوع کی خواہش کے مطابق ہے۔

اب سمجھنا چاہئے کہ انسان میں (۱) التطلمع الی جہود (۲) التشبہ بالملکوت (۳) ارتقاات کو کمال تک پہنچانے کی تمام صفات ہیں اور رسول اللہ اللوگوں کو تطلمع الی الجہود کا سبق اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کرنے، شعائر اللہ کی تعظیم کرنے اور التشبہ بالملکوت کا سبق آپس میں ایسے بلند اخلاق کے پیدا کرنے سے سکھاتے ہیں جن کا فائدہ خاص انہی کو نہیں پہنچتا بلکہ عام انسانی نوع کو پہنچتا ہے اور اس کے بعد ان کی ذات کو بھی پہنچے گا کیونکہ وہ بھی تو انسانی نوع کے افراد میں سے ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ ارتقاات کی تعلیم بھی دیتے ہیں (یعنی جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے دنیا اور آخرت میں پیدا کی ہیں ان سے زیادہ سے زیادہ فائدے کم سے کم وقت اور تھوڑی طاقت خرچ کر کے کیسے حاصل کئے جائیں، اس طرح کہ ملائکہ ان کے کام کو دیکھ کر تعجب کریں) یہ تینوں باتیں تفصیل سے کسی بھی شریعت میں بیان نہیں کی گئیں۔

۱۵۔ انسان کی تشریح اور اس کے مختلف مقامات میں مختلف مرتبے اور اس کے اچھے اعمال کا بیان

ترتیب وار رکھی ہوئی چیزوں میں جب کوئی چیز اثر کرے گی تو اس چیز کا اثر، ترتیب وار تمام چیزوں میں ان کی استعداد اور لیاقت کے موافق ظاہر ہوگا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے مختلف رنگدار شیشوں کو ترتیب وار رکھا جائے اور پھر ایک شیشے کے سامنے موم جلائی جائے۔ اس موم کی روشنی تمام شیشوں میں ان کے رنگوں کے موافق ظاہر ہوگی۔ ظاہر میں تمام شیشوں میں جدا جدا روشنی نظر آئے گی لیکن ہر عقلمند ایسا ہی کہے گا کہ جو روشنی پہلے شیشے میں ظاہر ہوئی وہ ہی تمام شیشوں میں نظر آتی ہے۔

اس بات کے سمجھنے کے بعد انسان کی حقیقت کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ انسان چار چیزوں سے بنا ہوا ہے: (۱) بدن (۲) ہوائی روح (۳) نفس ناطقہ (۴) ملکوتی روح (یعنی الہی روح۔ ملکوتی روح اور الہی روح ایک ہی چیز کے نام ہیں) حظیرۃ القدس میں انسانی نوع کا امام ہے جس کو انوع یا انسان کبیر یعنی بڑا انسان کہا جاتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو نوع انسانی کے امام کے بے شمار عکس ظاہر ہوئے جس طرح آئینہ میں ہمارے عکس ظاہر ہوتے ہیں۔ ان عکسوں میں ان تمام صفات کے عکس بھی آگئے جو اس بڑے انسان میں ہیں۔ ان میں حظیرۃ القدس کے ملائکہ کی روحانی طاقت اور نیچے طبقہ والے ملائکہ کی روحانی طاقت کے عکس بھی آگئے اور جو ستارے اس دنیا کی چیزوں پر اپنا اثر پیدا کرتے ہیں ان کی طاقت کے عکس بھی آگئے۔ اسی طرح بڑے انسان کے دل پر جو اللہ تعالیٰ کی تجلی پڑتی ہے اس کا عکس بھی ان عکسوں میں آگیا۔ ان عکسوں کو ملکوتی روح کہا جاتا ہے۔ یہ ملکوتی روحیں ہر انسان کی جدا جدا ہیں۔ پھر ایک طویل عرصہ کے بعد ملکوتی روحوں کے عکس عالم مثال کے تختہ پر آئے۔ دونوں عکسوں میں اتنا ہی فرق ہے جیسے چھوٹی تصویر کو بڑا اور بڑی تصویر کو چھوٹا کیا جائے۔ باقی کوئی چیز جو ان میں بڑھائی یا کم کی گئی ہو وہ دیکھنے میں نہیں آئے گی۔ دونوں عکس ایک جیسے نظر آئیں گے۔ ان کا آپس میں ایسا ہی تعلق ہے جیسے روح اور جسم کا۔ یہ عالم مثال کا عکس ملکی روح کا جسم ہو گا اور ملکی روح اس کی روح ہوگی۔ اس کے بعد جب ماں کے رحم میں مٹی اور حیض کا خون اکٹھا ہوتا ہے اور ماں کا نفس اس کی تدبیر کرتا ہے تب اس میں دل اور دماغ اور جگر ظاہر ہوتے ہیں پھر بچے میں بدن کے واسطے سے ایک قسم کی لطیف ہوا تیار ہوتی ہے۔ یہ لطیف ہوا بدن کے لطیف اخلاط سے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ انسان میں جو سننے، دیکھنے اور دوسرے کاموں کی طاقتیں ہیں وہ اسی لطیف ہوا کی طاقتیں ہیں۔ اس لطیف ہوا کے ساتھ وہ عالم مثال میں پیدا شدہ نورانی روح چمٹ جاتی ہے جیسے سورج کی صورت آئینے کے ساتھ چمٹ جاتی ہے۔ اب وہ نورانی روح لطیف ہوا میں اثر کرے گی اور وہ لطیف ہوا اس نورانی روح میں اثر کرے گی۔ اس وقت اس نورانی روح کو نفس ناطقہ (یعنی فکر کرنے والا نفس) کہا جاتا ہے اور اس لطیف ہوا کو اس نورانی روح کا جسم اور اس نورانی روح کو اس کی روح سمجھنا چاہئے۔ یہ دونوں کبھی بھی نہ اس دنیا میں اور نہ ہی جنت اور جہنم میں ایک دوسرے سے جدا ہوں گی۔ اس کے بعد یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ یہ لطیف ہوا جو انسان کے دل میں لطیف خلطوں سے پیدا ہوتی ہے اس کی طاقتیں جب کام کرتی ہیں تب کم ہوتی رہتی ہیں پھر اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بدن لطیف ہوا کو تیار کرتا رہتا ہے۔ اس وقت اس لطیف ہوا کو نسہ یا ہوائی روح یا برقی روح کہا جاتا ہے۔ انسان کے بدن کو لطیف ہوا کا جسم اور لطیف ہوا کو اس کی روح سمجھنا چاہئے۔ انسان کی یہ ہوائی روح جو انسانی صورت میں باقی حیوانات سے جدا ہوئی ہے وہ نفس ناطقہ کے سبب ہوئی ہے ورنہ ہوائی روح تمام حیوانات میں ایک جیسی ہے۔

رضامندی حاصل کرنے کے لئے انہیں کیا جاتا۔ اور جیسے وہ کام جن سے انسان کا تعلق عالم مثال میں فقط جنوں سے ہوتا ہے اور ملائکہ کے ساتھ نہیں ہوتا۔

اس سے بھی زیادہ اچھا کام وہ ہے جس کو انسان کا نفس ناطقہ بھی قبول کرے لیکن اس کی الہی روح قبول نہ کرے۔ یہ عقلی بات ہے ورنہ اس کی ظاہر میں کوئی بھی مثال موجود نہیں۔

سب سے بہتر کام وہ ہے جسے انسان کی ملکوتی روح بھی قبول کرے کیونکہ وہ عمل ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گا اور اس سے اسے انتہائی خوشی حاصل ہوگی اور اس سے زیادہ خوشی پہنچنے کا امکان ہی نہیں۔ جب انسان میں اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے فائدہ حاصل کرنے کے وقت مذکورہ چار اخلاق ہوں گے اور انسان کا نفس ناطقہ شعائر اللہ کی عزت کرنے سے اللہ کی طرف دیکھنے والا ہوگا تب اس کی انسانیت بھی کمال کو پہنچے گی اور اس کے کاموں کی روح بھی اس کی الہی روح تک پہنچے گی۔

۱۶۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کا خلاصہ:

پندرہویں فائدہ میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان کے سمجھنے کے بعد یہ جاننا چاہئے کہ ہم جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی قوم کو راستہ دکھانے والے اور ان کو پاک کرنے والے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کو ارتقا قات صالحہ یعنی اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے اوزاروں کے ذریعہ تھوڑے وقت میں کم طاقت خرچ کرنے سے بہت سا فائدہ حاصل کرنے کا ایسا طریقہ سکھاتے ہیں جس سے ان کاموں کی روح ملکوتی روح تک پہنچتی ہے اور مذکورہ بالا چار اخلاق بھی ان میں پیدا کرتے ہیں اور شعائر اللہ کی تعظیم کرانے سے اللہ تعالیٰ کی تجلی کی طرف توجہ کرنا بھی سکھاتے ہیں پھر جب آپ کی قوم ہدایت پر آجائے گی اور پاک ہو جائے گی تو آپ ان کو حکم کریں گے کہ دنیا کی اقوام کو بھی اس تعلیم اور تہذیب پر اکٹھا کریں جس پر وہ خود ہیں لیکن اس تعلیم و تہذیب کا ان کو ایسا آسان طریقہ سکھائیں گے کہ وہ آسانی سے سکھائیں اور اس کام کو رسول اللہ ﷺ کا کام سمجھ جائے گا۔ یہ معنی ہیں خلافت قائم کرنے کے۔

اس معنی سے رسول اللہ ﷺ، اور ان کے بعد ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں سے یہ کام اللہ تعالیٰ نے پورا کیا اور ان دونوں خلفاء کے کام کو بھی رسول اللہ ﷺ کا کام سمجھا گیا۔ پس اس معنی سے رسول اللہ ﷺ نے ارض مقدسہ (پاک زمین) کو جس کا اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا ابراہیمی ملت کی روشنی سے روشن کیا اور مکہ معظمہ، بیت المقدس اور مدینہ منورہ کی مسجدوں کو اس تعلیم کا مرکز بنایا۔ اور قیصر و کسریٰ کی دو بڑی حکومتوں کو برباد کر کے ان کی رعایا کو دور استوں میں سے ایک راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ وہ راستے یہ ہیں کہ یا تو وہ رسول اللہ ﷺ

اس کے بعد جب انسان کا بدن لطیف ہوا کے پیدا کرنے سے بالکل عاجز ہو گا تو وہ عاجزی ان کی موت ہے۔ بدن کے بیکار ہونے سے بعضے اس کو قبر میں دفن کرتے ہیں اور بعضے جلادیتے ہیں۔ اس وقت باقی بچی ہوئی لطیف ہو اور نورانی روح انسان کے بدن سے جدا ہوتی ہے پھر نورانی روح اس کو اس کی لیاقت کے موافق روشن جسم یا تاریک جسم عالم مثال سے دلاتا ہے اور وہ جسم لطیف ہوا کی کمی کو پورا کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح انسان کی اس کے مرنے کے بعد حفاظت کی جاتی ہے۔ عالم مثال کا یہ بدن قیامت کے قائم ہونے تک قائم رہے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو یا تو دنیاوی جسم دے گا یا ایسا جسم دے گا جو دنیاوی جسم سے بھی مناسبت رکھے گا اور عالم مثال والے جسم سے بھی۔

انسان کی حقیقت سمجھنے کے بعد دو باتیں سمجھنا چاہئیں: (۱) ایک یہ کہ دنیا میں انسان مذکورہ بالا اجزاء کے مجموعہ کو کہا جاتا ہے۔ انسان کے مرنے کے بعد دنیا والے بدن کے علاوہ باقی تین اجزاء کے مجموعہ کو انسان کہا جائے گا۔ اس کے بعد انسان ترقی کر کے جب اس درجہ کو پہنچے گا جہاں انسان کی ہوائی روح پہنچ نہیں سکتی بلکہ فقط اس کا نفس ناطقہ پہنچ سکے گا تو وہاں انسان ملکوتی روح اور نفس ناطقہ کو کہا جائے گا۔ اسی طرح جب انسان ترقی کر کے وہاں پہنچے گا جہاں اس کا نفس ناطقہ بھی نہیں پہنچ سکتا تو وہاں انسان فقط ملکوتی روح کو کہا جائے گا۔ اور ملکی روح اور روح الہی ایک ہی چیز ہے۔ تو یہ ذات پاک وہاں پہنچی جہاں کا خمیر تھا۔ یہ ہے مطلب اِنَّا لِلّٰہ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ کا۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ انسان کے یہ چار اجزاء ترتیب وار ہیں چنانچہ جو چیز ملکوتی روح میں ظاہر ہوگی وہ نفس ناطقہ میں بھی اس کے مزاج کے موافق ظاہر ہوگی اور جو چیز نفس ناطقہ میں ظاہر ہوگی وہ ہوائی روح میں بھی اس کے مزاج کے موافق ظاہر ہوگی۔ اور جو چیز ہوائی روح میں ظاہر ہوگی وہ بدن میں بھی اس کی قابلیت کے موافق ظاہر ہوگی۔ پس انسان کے ہر ایک جز میں سے اگرچہ ظاہر میں جدا جدا صورت نظر آئے گی لیکن حکیم کی نظر میں وہ ایک ہی چیز ہے۔ پس سمجھنا چاہئے کہ تجلی جو انسانی نوع کے امام پر پڑتی ہے وہ ملکوتی روح پر چمکتی ہوئی اور ترتیب وار نیچے اترتی ہوئی بدن تک پہنچتی ہے۔ بدن پر عمل کرنے کے بعد پھر جیسے نیچے اتری تھی ایسے ہی چڑھتی ہوئی ملکوتی روح تک پہنچے گی۔ یہ انسانی فطرت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا ہے۔ پس تمام ارتقا قات سے بہتر ارتقا قات وہ ہے کہ انسان جب کوئی کام بدن سے کرے تو اس کام کا اثر ملکوتی روح تک پہنچے۔ اور سب سے بُر ارتقا قات وہ ہے کہ انسان جب کوئی کام بدن سے کرے تو اس کام کی روح کو اس کی ہوائی روح بھی قبول نہ کرے۔ جیسے زنا اور چوری جس پر انسان کو آخر پشیمان ہونا اور بچھتاوا کرنا پڑتا ہے۔ جو جہنم کی زندگی ہے۔ اس سے اچھا کام وہ ہے جس کی روح کو انسان کی ہوائی روح قبول کرے لیکن اس کو نفس ناطقہ اور الہی روح قبول نہ کرے جیسے بڑھئی کے پیشے اور دوسرے ہنر کہ لوگوں کو ان ہنروں کی اپنی زندگی کے لئے ضرورت بھی ہے لیکن گر ان کو اللہ تعالیٰ کی

(اپنے ہاتھ روک کر رکھو) اس سے بھی واضح سند یہ ہے کہ سورۃ کافرون کی سورت ہے اور وہ تمام دنیا کے مخالفین کے لئے الٹی میٹم ہے کہ، ”تم سے صلح کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔“ جو لوگ دین کے اندر، ”سیاست کیسے ترقی کرتی ہے“ کے سیاسی اصول پر مطالعہ نہیں کرتے بلکہ سب چیزوں کو اخلاقی نقطہ نگاہ سے حل کرنا چاہتے ہیں وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی اور قرآن حکیم کی تعلیم کو منظم طور پر کبھی بھی سمجھ نہیں سکتے۔

حزب اللہ مدینہ منورہ میں

حزب اللہ جس کی بنیاد مکہ معظمہ میں رکھی گئی تھی اب اپنا مرکز بدل کر مدینہ منورہ میں جمع ہوتا ہے۔ وہ یہاں نسبتاً آزاد ہے۔ یہاں کمزور طاقتوں نے حزب اللہ کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ سورۃ مجادلہ میں اس طرف توجہ دلائی گئی کہ ان مخالفین کو حقیر نہ سمجھو۔ اگر ان کا سدباب نہ کیا گیا تو یہ اس نئی سوسائٹی کو کھاجائیں گے۔ اس پر مسلمان سنبھلے اور منافقین ڈر گئے۔

منافقین سے مقابلہ

منافقین جس طاقت کے بل بوتے پر باتیں بناتے تھے وہ یہود کی طاقت تھی جن کے قریے پاس ہی تھے۔ ادھر حجاز کی تمام سرمایہ داری یہود کے قبضے میں تھی۔ اور جاہلیت میں قریش بھی تاجر ہونے کی حیثیت میں سرمایہ داری سے کسی قدر اُنس پیدا کر چکے تھے۔ اس لئے یہود اور قریش ہم بیٹھنے کی وجہ سے آپس میں ملتے رہتے تھے۔ اب ان لوگوں نے ادھر تو مدینہ میں مسلمانوں کے گھروں میں فساد ڈلوانے کے لئے خفیہ سازشیں شروع کر دیں اور ادھر کسریٰ اور قیسر تک اپنے پیغام پہنچانے شروع کر دیئے۔ اب اس سیاسی پارٹی کا جو اپنے آپ کو آزاد سمجھتی ہو ایسی حالت میں صبر سے بیٹھے رہنا جائز نہ تھا۔ اگر مخالفین حملہ نہیں کرتے تو یہ سیاسی حزب حملہ کرے گا۔ یہ ہے وہ حملہ جسے لَاقِلِ الْحَشْمِ (الحشر: ۲) کہا گیا۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں یہ پہلا اقدامی حملہ تھا۔ اس سے پہلے جتنی جنگیں تھیں وہ سب مدافعت تھیں۔ بعض لوگوں نے صرف ان مدافعتی جنگوں سے قاعدہ بنالیا کہ حزب اللہ کا کام صرف مدافعتی جنگ کرنا ہے۔ یہ لوگ ان اقدامی جنگوں کو بھی دیکھیں جو پیغمبر ﷺ اور آپ کے خلفاء نے کیں (غزوہ بنی نضیر اس قسم کی اقدامی جنگوں کی پہلی مثال ہے)۔

کیا اسلامی جنگ مدافعتی ہے؟

مسلمانوں میں قدیم سے ایسی جماعتیں چلی آتی ہیں جو اسلام کا نام تو لیتی ہیں مگر اس کی سیاست

کے طریقے کو اختیار کر کے اسلامی اجتماع میں داخل ہو جائیں یا ذمی بن کر اسلامی اجتماع کو خراج تحسین دے کر ان کے حکم کے فرمان بردار رہیں اور اسلامی دین کی جو خاص نشانیاں (شعار اللہ) ہیں ان کی بے حرمتی نہ کریں۔

رسول اللہ ﷺ کے سوا جن لوگوں نے آج تک خلافتیں قائم کی ہیں ان سب سے کامل خلافت وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے قائم کی اور اس کا پروگرام اللہ تعالیٰ نے ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں سے پورا کیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو انسانی نوع کے لئے ایک مقدس مثال بنایا ہے کہ ان کی ہمت سے ایک ایسی خلافت قائم ہو گئی جس کو پانچ سو برس تک آپ کی قوم قریش نے چلایا اور دوسرے پانچ سو برس دوسری اقوام نے چلایا جنہوں نے آپ کے دین کو سچے دل سے قبول کیا۔ سورہ جمعہ میں آیت ۲ سے ۴ تک اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ ان آیات سے آخرین کے لفظ سے مطلب فارس، روم، ہندوستان اور ترک ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کو دنیا میں پھیلانے کے لئے حکومتیں قائم کیں۔ اس کے بعد جب کبھی انسانی نوع کا نظام ارتقا قات میں ترقی کرنے سے بدلتا رہے گا تو حکومتوں کی صورت بھی انسانی اجتماع کے موافق ضرور بدلتی رہے گی۔

ہزار سال کے بعد جب لوگوں کا نظام ارتقا قات میں ترقی کرنے سے بدلا تو مسلمانوں کے رہنما اپنے پرانے طریقہ کو بدل نہ سکے۔ اس لئے ان کی شان و شوکت فنا ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے جب ہمیں امام ولی اللہ دہلوی کے طریقہ پر چلنے سے دین کی سمجھ پیدا ہوئی تب ہم نے سمجھا کہ ہزار سال کے بعد جو مسلمانوں کی شان و شوکت فنا ہوئی اس میں قصور ہمارا ہی تھا۔ اللہ اور اس کے رسول کے تعلیم میں کوئی قصور نہ تھا۔ (تفسیر المقام المحمود ص ۱۶۱ سے ۱۸۳)

☆

حزب اللہ کی تاسیس مکہ معظمہ میں

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا حزب، مکہ معظمہ میں پیدا ہوا، وہاں وہ بالکل ابتدائی حالت میں تھا۔ چند آدمیوں سے زیادہ اس کے ماننے والے نہ تھے بایں ہمہ ایک دنیا ان کے نام سے کانپ رہی تھی۔ چنانچہ اس حزب کو فنا کرنا ہر شخص اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس لئے کہ وہ حضرت ابراہیم کی متابعت میں حنیفی دین کو قائم کرنے کا دعویٰ کرتا تھا اور کسی مخالف قوت کو نہیں مانتا تھا، خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ تھی۔ یہ حزب مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے اپنا نظام مکمل کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے فی الحال طرح دیتا جاتا تھا۔ جس نے مخالفت کی یا ضد، اس سے ہٹ گئے یہ ان کی سیاسی پالیسی تھی۔ اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ ان کے نزدیک لڑنا جائز نہ تھا۔ بارہا ایسے مواقع آئے کہ لوگوں نے خواہش کی کہ لڑنے کی اجازت مل جائے۔ مگر قرآن نے اس وقت یہی حکم دیا کہ ”لَا تَجِدُ أُمَّةَ يُدْعِي بِكَ“ (۴: ۷۷)

قومی انقلاب کی دعوت

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا (مرل-۱۴)
(ہم نے تم عربوں کی طرف اسی طرح نگرانی کرنے والا رسول بھیجا ہے جس طرح فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا)

بین الاقوامی انقلاب کے چند اصول بیان کرنے کے بعد ان کو قومی انقلاب میں استعمال کرنے کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔ یہ قومی انقلاب آگے چل کر بین الاقوامی انقلاب کی شکل اختیار کرے گا۔ اور قومی انقلاب لائیوالی جماعت ہی اس بین الاقوامی انقلاب کی مجلس عاملہ (ورکنگ کمیٹی Working Committee) بن جائے گی۔

نبی اکرم ﷺ کی دو حیثیتیں:

حضرت امام الائمہ امام ولی اللہ دہلویؒ کے نزدیک نبی اکرم ﷺ کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ عرب کے لئے قومی نبی ہیں تاکہ اہل عرب کے اخلاق وعادات کی اصلاح کریں اور ان میں قانون الہی جاری کریں۔ دوسری یہ کہ آپ تمام اقوام عالم کے لئے نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ چنانچہ حضرت امامؒ فرماتے ہیں کہ:

وَهَذَا الْإِمَامُ الَّذِي يَجْعَلُ الْأُمَّةَ عَلَىٰ مِلَّةٍ وَاحِدَةٍ يَخْتَارُ إِلَىٰ أَصُولٍ أُخْرَىٰ غَيْرَ الْأَصُولِ
الْبَدْوِيَّةِ فِيهَا سَبَقَ، مِنْهَا أَنْ يَدْعُو قَوْمًا إِلَى السُّلَّةِ الرَّاشِدَةِ وَيُرْكَبَهُمْ وَيُضِلَّ شَأْنَهُمْ
ثُمَّ يَسْخَرُهُمْ بِسُنَّةٍ جَوَارِحِهِ فَيُجَاوِزُ الْأَصْلَ وَيُفَرِّقُهُمْ فِي الْأَفَاقِ وَقَوْلُهُ تَعَالَى:
رَكْنُكُمْ حَيْثُ أُمَّةٌ أُخْرَىٰ لِلنَّاسِ، وَذَلِكَ لِأَنَّ هَذَا الْإِمَامَ نَفْسَهُ لَا يَتَكَلَّمُ مِنْهُ مُجَاهِدَةً
أَمِيمٌ غَيْرَ مَحْضُورَةٍ فَإِذَا كَانَ كَذَلِكَ وَجَبَ أَنْ تَكُونَ مَادَّةُ شَرِيْعَتِهِ هُوَ بِسُنَّةِ الْمَذْهَبِ
الطَّبِيعِيِّ لِأَهْلِ الْأَقَالِيمِ الْقَابِلَةِ عَرَبِيَّةً وَعَجَبِيَّةً ثُمَّ مَاعِنْدَ قَوْمِهِ مِنَ الْعِلْمِ
وَالِاتِّفَاقَاتِ وَيُزَاعَىٰ فِيهِ حَالُهُمْ أَكْثَرُ مِنْ غَيْرِهِمْ (حجۃ اللہ البالغہ جلد اول ص ۱۱۸)

”اس بین الاقوامی دعوت دینے والے نبی کی کامیابی کے اصول ان اصولوں سے مختلف ہوں گے جو ایک امام صرف اپنی قوم کے اندر دعوت کے لئے استعمال کرتا ہے۔ ان میں سے ایک اصول یہ ہے کہ یہ بین الاقوامی امام اپنی قوم کو صحیح سنت کی دعوت دے گا۔ اور انہیں پاک کرے گا اور ان کی حالت درست کرے گا ان کو اپنا آلہ کار بنائے گا۔ وہ ان کی مدد سے باقی اقوام عالم سے لڑے گا اور ان کو چاروں طرف اپنی دعوت کا پیام دے کر بھیج دے گا۔ چنانچہ قرآن حکیم کی آیت: كُنْتُمْ حَيْثُ أُمَّةٌ أُخْرَىٰ لِلنَّاسِ (آل عمران-۱۱۰) (تم امت کا بہترین طبقہ ہو جو تمام دنیا کے لوگوں کے لئے پیدا کئے گئے ہو) اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ امام تنہا بنفس نفیس لا تعداد اقوام کے پاس شریعت

نہیں سمجھتیں۔ ایسی جماعتوں کے لوگ اسلام کی تعلیم کو فقط اخلاقیات میں منحصر کر دیتے ہیں اور سیاسی تقدم کو ایسی شرطوں کے ساتھ مشروط کر دیتے ہیں جن کا تحقق ناممکن ہے، اسی طرح وہ قوم کو مار دیتے ہیں۔ اس قسم کی جماعتیں جہاں کہیں مسلمانوں میں پیدا ہوئیں انہوں نے فائدے کی بہ نسبت نقصان زیادہ پہنچایا۔

برصغیر میں انگریزی غلبے کے بعد مسلمانوں میں دو تحریکیں چلائی گئیں۔ بعض نے قرآنی حکمت کو سمجھتے ہوئے اس خیال کی تائید کی کہ اسلام کی جنگیں ہمیشہ مدافعتانہ رہی ہیں۔ ان کا فیصلہ یہ ہے کہ اسلام نے کبھی حملہ نہیں کیا بلکہ ہمیشہ مدافعت ہی کی ہے۔ اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔

قرآن حکیم کی آیت ”هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ“ (البقرہ-۲۳) سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن حکیم بین الاقوامی انقلاب کا پروگرام پیش کرتا ہے۔ چنانچہ ایک جماعت کی صورت میں انقلابی ذہنیت والے استاد ہر طبقے میں موجود رہے۔ مثلاً حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور شیخ الہند مولانا محمود حسن میں ”قرآن اور آنحضرت ﷺ کی سیرت کا انقلابی تخیل“ پایا گیا۔

اسلام اور جنگ:

الغرض انقلابی جماعت دیکھے گی کہ وہ مخالفوں کا مقابلہ کر سکتی ہے تو وہ اقدامی حملہ کرنے میں تاخیر نہیں کرے گی۔ اس مسئلے کو یوں حل کیا گیا کہ حملہ کرنے میں پیش قدمی کرنا یا مدافعت پر اکتفا کرنا یہ دوسرے درجے کی چیز ہے۔ اس کا فیصلہ کرنا قائد لشکر کا کام ہے۔ یہ اصولی بحث نہیں ہے۔ مکائڈر اپنی فوج کی حالت کے مطابق مدافعت ہی کو کافی سمجھے گا تو فقط مدافعت ہی کرے گا، اور اگر حملہ کرنا ضروری خیال کرے گا تو حملہ کرنے میں پیش قدمی کرے گا۔

دنیا میں مذہبی پروگرام دو طریقوں پر چل رہے ہیں۔ بعض مذہب وہ ہیں جو لڑنا اور حملہ کرنا کسی حالت میں بھی جائز نہیں سمجھتے جیسے بدھ دھرم والے جو اصولاً انہماکے قائل ہیں اور جنگ کو کسی شکل میں بھی جائز نہیں سمجھتے۔

دوسرے وہ مذہب ہیں جن کے نزدیک حسب ضرورت لڑنا جائز ہے۔

پس اصولی بات یہ ہے کہ کسی مذہب کے نزدیک جنگ جائز ہے یا نہیں۔ اس معیار کے مطابق قرآن حکیم جنگ کو بالکل جائز رکھتا ہے۔ قرآن حکیم ایک عظیم الشان بین الاقوامی انقلاب کا زبردست حامی ہے۔ قرآن فقط انقلابیوں کی چیز ہے جو مناسب موقع پر اپنے انقلاب کی کامیابی کے لئے لڑنا جائز سمجھتے ہیں۔ (قرآنی شعور انقلاب- ص ۱۸۶، ۱۸۹)

نہیں پہنچا سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کے قانون شریعت کا جوہر تمام اقوام کے لئے خواہ وہ عرب ہوں یا غیر عرب جو اچھی آب و ہوا کے خطوں میں بستی ہیں بمنزلہ مذہب طینی ہو۔ بایں ہمہ اس امام کی قوم کے علوم وارتقاات کا دیگر اقوام کی بہ نسبت اس تعلیم میں زیادہ خیال رکھا گیا ہو۔ پس بین الاقوامی دعوت دینے والا امام اپنا کام بین الاقوامی دعوت سے شروع نہیں کرے گا۔ بلکہ سب سے پہلے اپنی قوم کے صالح عناصر کو جمع کر کے قومی انقلاب برپا کرے گا۔ اور پھر اس قومی انقلاب کی مجلس عاملہ (جیسے عشرہ مبشرہ اس قومی انقلاب کی مجلس عاملہ تھی) دوسری اقوام میں کام کرے گی اور ان کے اندر انقلاب برپا کرے گی۔ (قرآنی شعور انقلاب۔ ص ۳۴۰)

☆

بین الاقوامی درجہ

آپ کی نبوت کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ آپ مِلّتِ حَنِیْفِیَّةِ اِبْرَاهِیْمِیَّہ پر تمام اقوام عالم کو جمع کریں گے۔ کیونکہ انسان کی نوعی ترقی کا یہی راستہ ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس دعاء ”الفتح“ میں اپنے آپ کو ”رَبِّ الْعَالَمِیْنَ“ کی حیثیت سے شناخت کروایا ہے۔ اس تمہیدی دعا کے بعد سورہ بقرہ وغیرہ باقی قرآن حکیم میں تمام اقوام عالم کے لئے بنیادی دستور حیات دیا گیا ہے، جس پر انہیں جمع کیا جائے گا۔

سورہ فاتحہ قرآن حکیم کا مقدمہ ہے۔ اس میں نبی اکرم ﷺ کی دعوت کی عالمی حیثیت کی طرف اشارہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ کی نبوت کا یہ درجہ ہی آپ ﷺ کی بعثت کا اصل مقصد ہے۔ اور سورہ العلق کو قرآن حکیم کے آخر میں لے جانا ظاہر کرتا ہے کہ قومی درجہ جس کی طرف سورہ العلق میں اشارہ ہے، بین الاقوامی عالمی درجہ کے لئے بطور تمہید اور وسیلے کے تھا۔ اس لئے انسانیت کے اندر عالمی تحریک ہی قرآن حکیم کی دعوت کا عنوان بن سکتی ہے۔

امام ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ:

اَلَا تَبْیِّنُ اَنْیَّ قَبْلَ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانُوْا یُعْشَوْنَ اِلٰی اَقْوَامِہِمۡ خَاصَّةً....
وَبُعِثَ نَبِیُّنَا صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلٰی کَافَّةِ النَّاسِ

(حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۲۴)

(ترجمہ) یعنی نبی اکرم اسے پہلے جو انبیاء گذرے ہیں وہ سب کے سب اپنی اپنی خاص قوم کی طرف بھیجے گئے تھے۔ لیکن حضرت محمد رسول اللہ دنیا کی تمام اقوام کی طرف مبعوث ہوئے ہیں۔

نیز فرماتے ہیں کہ:

”وَلَمَّا کَانَ الشَّمْسُ السَّارِیُّ فِی زَمَنِ اِبْرَاهِیْمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ هُوَ نَسِیَانُ الشُّجُوْدِ نَزَلَ الْحَقُّ

بِاٰرَآئِہ بِاِشَاعَةِ الشُّجُوْدِ وَتَوَلِّیْدِ الْعِبَادَاتِ مِنْ طَهَارَةٍ وَصَلَوَةٍ وَزَكَاةٍ وَحَجٍّ وَصَوْمٍ
وَذِكْرِی وَلَمَّا کَانَ الشَّمْسُ السَّارِیُّ فِی زَمَنِ نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ هُوَ اِخْتِلَالُ
النِّسْلِ وَانْقِلَابُ الْاَزْتِقَافَاتِ خَاصَّةً عَلٰی اَصْحَابِہَا وَکَانَ الْاَمْرُ اَشَدَّ وَاَقْلَبُ نَزَلَ
الْحَقُّ بِاٰرَآئِہ بِالْجِهَادِ وَاِشَاعَةِ الْعِبَادَاتِ وَتَوَقُّعِیَّتِہَا وَالْقَضَائِی بِوَدَالِ دَوْلَةِ الرُّوْمِ
وَالْعَجِیْمِ وَاسْتِظْہَامِ اَمْرِ النَّبُوَّةِ کَهَیئَةِ الْاَزْتِقَافِ الرَّابِعِ

(التجہبات الاحیاء جلد اول ص ۸۳، ۸۴)

(ترجمہ: سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں نسیان توحید کا معاشرہ انسانی میں پھیل چکا تھا اس لئے حق اس کے بالمقابل نازل ہوا یعنی اشاعت توحید اور طہارت صلوٰۃ، زکوٰۃ، روزوں اور ذکر الہی کی عبادات جاری کرنے کی شکل میں۔ لیکن چونکہ ہمارے نبی حضرت محمد رسول اللہ کے زمانے میں اقوام عالم کی ثقافتوں میں خلل پڑ چکا تھا اور انکی ارتقائی زندگی میں بگاڑ پیدا ہو گیا تھا اور یہ حالت نہایت شدید صورت اختیار کر گئی تھی اور یہ خرابیاں اقوام دنیا کے بدن میں دور تک سرایت کر گئی تھیں۔ اس لئے اب حق ان ضرورتوں کے لئے نازل ہوا اور قرار پایا کہ ان خرابیوں کے خلاف جہاد کیا جائے اور عبادات کی اشاعت کی جائے، ان کے ادا کرنے کے اوقات معین کر دیئے جائیں اور قضا و قدر نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ رومی اور ایرانی سلطنتیں برباد کر کے ان کی جگہ نبوی نظام بین الاقوامی پیمانے پر قائم کیا جائے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے تشریف لاکر انسانی فلاح و خیر کا دروازہ کھولا جو آج تک نہ کھلا تھا اور اس خیر و فلاح انسانی کی تعلیم کے ذریعے سے انسانوں میں سے ایک ایسی امت (جماعت) منظم کی جو نوع انسانی کے لئے بہترین (نمونے کی) جماعت بن گئی)

حقیقت عالمی تحریک ہے:

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ کی تحریک عالمی تحریک (World Movement) ہے صرف عربی تحریک نہیں ہے۔ عربی تحریک اس عالمگیر تحریک کی ترقی کا ایک زینہ تھی اور اس کے ارتقاء کی ایک منزل۔ یہ عالمی تحریک اصل میں حنیفی تحریک ہی ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ نوع انسانی کو اس کی فطرت کے مطابق کمال تک پہنچایا جائے۔

دینی اور سیاسی تحریک میں فرق:

حنیفی تحریک میں ذہنی، عقلی، معاشی اور معاشرتی تمام پہلو موجود ہیں اور ان تمام پہلوؤں میں ترقی ہی، اسے تکمیل تک پہنچا سکتی ہے۔ ان پہلوؤں کے لحاظ سے یہ تحریک دینی بھی ہے اور سیاسی بھی، لیکن آج کل بعض لوگ دینی حرکت اور سیاسی حرکت میں فرق کرتے ہیں۔ یہ لوگ

ہیں۔ اس لئے جب ہم کہتے ہیں کہ انسانیت ناقابل تقسیم وحدت ہے تو اس سے ہماری یہی مراد ہوتی ہے۔

امام ولی اللہ دہلویؒ لکھتے ہیں کہ: وَيَجِبُ بَذْلُ الْجُهْدِ عَلَى أَهْلِ الْأَكْزَارِ الْكُلِّيَّةِ فِي إِشَاعَةِ الْحَقِّ وَتَشْيِيتِهِ وَإِحْصَالِ الْبَاطِلِ وَصَدِّهِ فَمَنْ بَيَّنَّاهُمْ يُبَيِّنُ ذَلِكَ إِلَّا بِتَخَصُّصَاتٍ أَوْ مُقَاتَلَاتٍ فَيَعْدُ كُلُّ ذَلِكَ مِنْ أَفْضَلِ أَعْمَالِ الْبِرِّ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۵۰ طبع منیر یہ مصر)

”جو لوگ انسانی معاشرے کی کلی اصلاح حال کے رنگ میں سوچتے ہیں ان پر واجب ہوتا ہے کہ اشاعت حق کرنے اور اسے معاشرے میں چلانے کے لئے اور باطل کا زور توڑنے اور اس کا نفاذ روکنے کے لئے پوری پوری (جانی مالی) کوشش کریں لیکن اکثر یہ کوشش صرف ان شکلوں ہی میں ممکن ہو پاتی ہے کہ مخالفین حق کے خلاف نشر و اشاعت کی جائے اور قتال کیا جائے اس صورت میں یہ دونوں اعمال بہترین نیکی کے اعمال شمار ہوتے ہیں۔“

ایسے ہی یہ بھی صحیح ہے کہ جب کوئی جماعت انسانی منافع میں سے کسی ایک حصے کی خدمت کے لئے اٹھے لیکن وہ اپنے آپ کو جامعہ انسانیہ (Human Society) کا ایک جزو تصور کرے تو اس کے پروگرام کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ غلط ہو گا کہ وہ جماعت اپنی جزوی خدمت کو کلی قرار دے کر دوسری جماعت کے خلاف صف آرا ہو جائے اور یہ تو اور بھی بڑی حماقت ہو گی کہ وہ کلی تحریک کا انکار کر دے یا اس کی طرف التفات نہ کرے۔

الغرض ائمہ اديان ہی اصل میں جامع انسانیہ (Human Society) کے حقیقی امام ہوتے ہیں۔ جو لوگ انسانی سوسائٹی کے منافع میں سے چند ایک کو لے کر کام کرتے ہیں وہ انبیاء سے کم درجے کے لوگ ہوتے ہیں۔ جو اہل سیاست اور اہل فلسفہ و حکمت اور جو سائنسدان اپنے آپ کو ان ائمہ دین کے تحت بطور جزوی کارکن لے آئیں وہ طبعی طور پر ان ائمہ سے دوسرے درجے پر شمار ہوں گے۔ جو شخص دین کے معنی سمجھتا ہے اور اجتماعیت کا مفہوم بھی جانتا ہے اور اہل سیاست و فلسفہ میں سے خدام انسانیت کی بھی پہچان رکھتا ہے وہ ائمہ دین کے سوا کسی کو اجتماعیت انسانیہ کا امام تسلیم نہیں کر سکتا۔

عام مؤرخین بین الاقوامی تحریک کی ابتداء سکندر مقدونی (Alexander of Macedonia) سے کرتے ہیں لیکن ہماری تحقیق یہ ہے کہ عالمی انسانی تاریخ کا آغاز سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نسبت قرآن حکیم میں آیا ہے کہ (۲:۱۲۳) ”میں تجھے نوع انسانی کا امام بناؤں گا۔“ اور ان کی اولاد اس عالمی پیشوائی کے لئے کام کرتی رہی۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام ایسے ہی امام ہیں اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ انہی کی تحریک کی تکمیل کے لئے مبعوث ہوئے ہیں۔

دینی حرکت کو خیالی (Ideological) تحریک کہتے ہیں اور اس لحاظ سے یہ صرف رہبانیت کی تحریک بن کر رہ جاتی ہے۔

سیاسی تحریک کو حقیقت پسندانہ (Realistic) تحریک قرار دیتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک حقیقی تحریک کے بارے میں ”دینی“ اور ”سیاسی“ کی یہ تقسیم صحیح نہیں ہے اور نہ یہ تقسیم کسی مضبوط بنیاد پر قائم ہے۔

اصل میں انسانیت شروع سے آخر تک ایک وحدانی (Unitar) چیز ہے اسے تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ اجتماعیت انسانی، کسی تحریک کو عمل کی سہولت کی غرض سے دینی اور سیاسی اجزاء میں تقسیم بھی کر لے تو اس سے دو تحریکیں نہیں بن جاتیں۔ کیونکہ ان دونوں کا مقصد بہر کیف انسانیت عامہ کی ترقی ہی رہتا ہے۔ جب اہل دین ایسے خیالات اور اعمال کی طرف رجعت اختیار کر لیں جو غیر محققانہ (Unscientific) ہوں یا اہل سیاست انسانیت کے صرف معاشی پہلو کو لیکر بیٹھ جائیں اور انسان کی مکمل انسانیت کی ترقی کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں تو یہ اختلاف صرف اصطلاحی اختلاف رہ جاتا ہے۔ ہم ان دونوں کی طرف التفات نہیں کرتے۔ اس کی مثال یوں سمجھنی چاہئے کہ ایک بادشاہ ممالک فتح کرنے کے درپے ہو جاتا ہے تاکہ ان میں ظلم دور کر کے انصاف و عدل قائم کرے۔ ایک اور شخص سوسائٹی میں صحیح علم پھیلانے میں لگ جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ دونوں انسانیت کی تکمیل کر رہے ہیں۔ ان میں آپس میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ اصل میں صحیح دین وہ ہے جس کے امام سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ وہی کامل اور مکمل انسانیت سے بحث کرتا ہے اور ان کی تحریک عالمی تحریک ہے جو ایک ہی وقت میں دینی بھی ہے اور سیاسی اور معاشی بھی۔ اس تحریک کو بین الاقوامی پیمانے پر ترقی دینے کے لئے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے ہیں۔

دین کو سیاست کی ضرورت :

ایک علمی شخص اپنے علم کو انسانیت عامہ کے لئے مفید دیکھتا ہے۔ وہ یہ علم ان لوگوں کو سکھاتا ہے جو اسے سیکھتے ہیں۔ اس فکر پر ان کے جمع ہو جانے سے طبعی طور پر جماعت (Party) بن جاتی ہے جو اس اجتماع سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ اگر وہ شخص چاہے کہ اس کے عمل کو دوسرے لوگ جو اس کے طریقے سے واقف نہیں ہیں یا جو اس فکر کی ترقی میں اپنے ذاتی مفادات (Vested Interests) کا نقصان تصور کرتے ہیں قوت کے ذریعے سے خراب کر دیں تو کیا صحیح علم کے مالک کے لئے یہ ضروری نہ ہو گا کہ اپنے فکر کی حفاظت کے لئے قوت دفاع (Defence Power) مہیا کرے؟ اور کیا اس طرح اسے سیاست کے میدان میں آنا نہیں پڑے گا؟ اس سے ظاہر ہے کہ صحیح علم کے لئے سیاست (Politics) اور حکومت (State) ضروری اور ناگزیر

مقرر ہو کر آتا ہے تو اس قوم میں کچھ اچھے طور طریقے باقی ہوں تو وہ انہیں نہیں بدلتا۔ کیونکہ ان کو بدلنا بالکل بے معنی ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت نبی اکرم ﷺ نے بھی ملت حنیفیہ اسماعیلیہ کی شریعت پر نظر ڈالی۔ تو جو چیز حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اصل طریقے پر دیکھی اسے باقی رہنے دیا۔ اور جو چیز بدل چکی تھی اور جس میں فساد اور خرابی آچکی تھی اس کو ہٹا دیا۔ آپ نے ملت حنیفیہ کے اشاعت کی بے حد کوشش کی کہ یہ قانون تمام قوموں پر غالب آجائے۔ اس سلسلے میں ملت حنیفیہ میں جو تحریفات دیکھیں ان کو مٹا دیا اور بڑے زور سے ان کی نفی کی۔ اور جو ارتقاات صحیح تھے۔ انہیں قائم رکھا۔ اور ان پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ ان میں جو خراب رسمیں آگئی تھیں۔ ان سے روکا اور جبراً منع کیا اور اس ملت کے اصول پر بین الاقوامی حکومت قائم کی اور جو لوگ اس بارے میں آپ کے ساتھ شریک ہوئے ان کی مدد سے جنگیں بھی کیں۔ یہاں تک کہ مخالفین کی مخالفت دھری کی دھری رہ گئی اور خدا کا قانون سب قوموں پر چل کر رہا۔” (ملخصاً)

اور خیر کثیر میں فرماتے ہیں کہ:

”حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کی طرح حضرت محمد رسول اللہ بھی پہلی حیثیت میں اپنی قوم کے لئے نبی بن کر آئے۔ جب اس پر ایک زمانہ گزر گیا تو آپ کی قوتیں چودھویں کے چاند کی جگہ سورج بن کر چمکنے لگیں۔ پھر ایک اور ترقی ہوئی کہ آپ کی شان کو پورا پورا کمال حاصل ہوا جس سے اوپر کوئی کمال نہیں ہے۔ اب آپ کرہ زمین کے ہر ایک گوشے کے امام بنائے گئے۔“

آپ کی ان دو حیثیتوں کی حکمت جتنے اللہ البالغہ میں یوں بیان فرماتے ہیں۔

”جو امام سب قوموں کو اپنی ملت پر جمع کرنے کے لئے اٹھتا ہے۔ وہ پہلے ایک قوم کو صحیح اصول کی دعوت دیتا ہے۔ انہیں غلط کاریوں سے پاک کرتا ہے ان کی حالت درست کرتا ہے اور پھر انہیں اپنا آلہ کار بنا کر دنیا کی سب قوموں سے جنگ کرتا ہے اور اپنی قوم کے لوگوں کو سب قوموں کے اندر پھیلا دیتا ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ کسی امام کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اکیلا تمام قوموں سے جنگ کرتا پھرے۔“

(جلد اول ص ۱۱۸)

اس اصول نے حضرت نبی اکرم ﷺ کی مبارک زندگی میں کس طرح کام کیا۔ اس کی تشریح آگے چل کر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

چونکہ قرآن حکیم بین الاقوامی تحریک پیدا کرتا ہے جس کی ابتدا عسیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کی اس لئے اس کی پہلی سورت میں ”رَبِّ الْعَالَمِينَ“ کا تصور دیا گیا ہے۔
(قرآنی شعور انقلاب۔ ص ۶۰، ۵۵)

☆

مقام نبوت

حضرت نبی اکرم ﷺ قریش پر حملہ کرنے کے لئے آئے ہی نہیں۔ بلکہ ان کی کمی پوری کرنے اور تعلیم دینے کے لئے آئے۔ چنانچہ امام ولی اللہ دہلوی ”تہذیبات الہیہ جلد اول ص ۲۰۳ میں فرماتے ہیں کہ:

”واضح رہے کہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ حضرت نبی اکرم ﷺ میں دو خصوصیتیں جمع ہو گئی ہیں۔

(۱) نبوت عامہ اور (۲) قریش کی سعادت کا سبب بننا۔

آپ کی نبوت میں مفہمیت کی تمام قسمیں آگئی ہیں۔ اس سے ہر ایک رنگدار اور گوری قوم کو فیض پہنچتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب (رحمت الہی) کی مصلحت کلی کا تقاضا ہوا۔ کہ ترکوں کی سلطنت عام طور پر پھیل جائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توجہ اسلام قبول کرنے کی طرف پھیر دی۔ باقی رہی قریش کی سعادت تو ان کی لمبی حکومت کی وجہ یہی سعادت تھی۔

میرا وجدان گواہی دیتا ہے کہ اگر کسی سیاسی انقلاب کا تقاضا یہ ہوا کہ ہندوستان کے ہندو مستقل عمومی حکومت پیدا کریں۔ تو یقیناً قانون الہی کا فیصلہ یہ ہو گا کہ ہندو لے ڈر اسلام قبول کر لیں۔ جیسے ترکوں نے قبول کر لیا تھا۔ کیونکہ جناب نبی اکرم ﷺ کی نبوت کی عمومیت اور آپ کے صاحب ملت ہونے کا یہی طبعی تقاضا ہے۔

حضرت نبی اکرم ﷺ کے کلام کے ایک سے زیادہ پہلو ہیں۔ کبھی تو آپ نبی ہونے کی حیثیت سے کلام فرماتے ہیں کبھی اس حیثیت سے کہ آپ قریش کی سعادت کا ذریعہ ہیں۔

اسی فکر کو امام ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ (مطبوعہ مصر) جلد اول ص ۱۲۳ اور ص ۱۲۸ میں یوں ظاہر فرماتے ہیں:

”واضح رہے کہ حضرت نبی اکرم ﷺ ملت حنیفیہ اسماعیلیہ میں پڑی ہوئی کجی کو ٹھیک کرنے، اس کی گہری ہوئی شکل کو صاف کرنے اور اُس کا نور پھیلانے کے لئے تشریف لائے۔ جب حقیقت یہ ٹھہری تو لازم آیا کہ اس ملت کے اصول تو قائم رکھے جائیں اور اس کے طریقے نہ ہٹائے جائیں۔ کیونکہ جب نبی اپنی قوم کی طرف

جہاد کرتے ہیں۔ جملہ بھلائیاں ان سب کے لئے ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔) یہاں بھی صحابہ کرام کو رسول کا شریک ایمان یا رفیق فکر اور جہاد میں شریک یعنی رفیق عمل ظاہر کر کے کامیابی کے نمونے کے لئے ساری جماعت کو پیش کیا گیا۔

یہی وہ چیز ہے جسے حضرت نبی اکرم ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے بھی مَا اَنَا عَلَيْهِ وَ اَصْحَابِي (جس اصول کار پر میں اور میرے ساتھی ہیں) کے الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے۔

مشورہ کرنا آنحضرت ﷺ کے لئے ضروری تھا آپ کی یہ اجتماعی حیثیت ہے جو مشورہ کرنے کے حکم کو قبول کر سکتی ہے جس کا ذکر قرآن حکیم میں ان الفاظوں میں آیا ہے:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۖ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَشْكُلْ عَلَى اللّٰهِ (آل عمران ۱۵۹)

(ان سے معاملات ملی میں مشورہ (ضرور) لیا کرو۔ اور جب پختہ ارادہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو)

امام ابو بکر جصاص الرازی الحنفی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

”حضرت نبی اکرم ﷺ پر اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا لازم تھا۔ دینی امور میں بھی اور ان امور میں بھی جن کے متعلق خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی صریح حکم موجود نہ تھا۔ اور دنیاوی امور میں بھی۔ یہ غلط کہا جاتا ہے کہ یہ مشاورت محض ان کا جی خوش کرنے اور ان کی قدر بڑھانے کے لئے تھی اور اس لئے بھی کہ آپ کی امت اسی طرح کرے۔ کیونکہ جب کسی کو معلوم ہو کہ مجھ سے جس امر کے متعلق مشورہ لیا جا رہا ہے اور جس بارے میں صحیح رائے پوچھی جا رہی ہے اس کے متعلق میں نے ایک مشورہ اپنی پوری کوشش سے پیدا بھی کر لیا۔ یا سوچ بچار کر کے کوئی صحیح رائے قائم کر لی تو بھی اس پر عمل نہ کیا جائے گا اور نہ اسے قبول کیا جائے گا۔ تو بھلا اس مشاورت سے اس کا جی کیا خوش ہو سکتا ہے اور اس کی قدر کیا بڑھ سکتی ہے؟ بلکہ اس کا اثر الٹا یہ ہو گا کہ ایسے مشورہ لینے والے سے وحشت بڑھے گی۔ کیونکہ اسے علم ہو گا کہ میری رائے نہ کسی کو سنی ہے اور نہ اس پر عمل کرنا ہے۔“

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

”نبی ﷺ کے لئے ضروری تھا کہ آپ اپنے ساتھیوں سے ان معاملات میں مشورہ کرتے جن میں کوئی صریح حکم موجود نہ تھا۔ البتہ صریح احکام کے بارے میں مشورہ ناجائز تھا۔ مثلاً یہ پوچھنا کہ نماز ظہر یا عصر کے بارے میں یا زکوٰۃ یا روزے کے

”مہاجرین اور انصار کی پہلی جماعت، قریش اور ان کے ارد گرد کے قبیلوں کے اسلام میں داخل ہونے کا سبب بنی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان عربوں کے ہاتھوں عراق اور شام فتح کر لیا۔ کیونکہ ان علاقوں میں عرب غصہ موجود تھا۔ اسے اپنی اپنی قوم کے اندر عربی اسلامی انقلاب کے لئے تیار کیا گیا۔ پھر ان عراقیوں کے ہاتھوں ایران اور شامیوں کے ہاتھوں روم فتح کرائے (کیونکہ انہیں ان علاقوں کے باشندوں سے مناسبت تھی) پھر ایرانیوں کی مدد سے ہندوستان اور ترکستان اور رومیوں کی مدد سے حبشہ وغیرہ کے علاقے فتح کرائے۔“

(قرآنی شعور انقلاب۔ ص ۵۳)

☆

نبی اکرم ﷺ کی اجتماعی حیثیت

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک اجتماعی تحریک ہے۔ اکیلے حضرت محمد رسول اللہ کا کام نہیں ہے۔ (وہ مزل۔ رفقاء کا جمع کرنے والے ہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اور ان کے مشورے سے کام کرتے ہیں۔ ان کی نبوت کی حیثیت جداگانہ، مستقل حیثیت ہے۔ اس میں ان کا کوئی شریک نہیں اور نہ ان کا کوئی مشیر ہے)؟ قرآن حکیم میں حضرت نبی اکرم ﷺ کی اس اجتماعی حیثیت کی طرف جا بجا اشارے موجود ہیں۔ مثلاً

فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَاٰخِرُ جَوَا مِنْ دِيَارِهِمْ (آل عمران ۱۹۵)

(جن لوگوں کو گھر بار سے ہجرت کرنی پڑی اور جن کو اپنے وطن سے نکالا گئے) ظاہر ہے کہ وہ تنہا حضرت نبی اکرم ﷺ نہیں تھے بلکہ آپ اور آپ کے ساتھی سب مراد ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (انفال ۶۳)

”اے نبی! اللہ تجھے اور تیرے مومن ساتھیوں کے لئے کافی ہے“

اس میں بھی نبی اکرم ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو ملا کر ایک جماعت ظاہر کیا گیا ہے۔

ثُمَّ اٰتٰنَا اللّٰهُ سِكِيْنَتَهُ عَلٰی رَسُوْلِهِ وَعَلٰی الْمُؤْمِنِيْنَ

(یعنی پھر اللہ نے اپنے رسول اور مومنین سب پر اطمینان قلب نازل فرمایا (توبہ ۲۶)

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهُ جُهْدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَاُوْلٰئِكَ لَهُمُ الْغَيْرُ

وَاُوْلٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقِيْنَ (توبہ ۸۸)

یعنی رسول اور وہ لوگ جو اس کے شریک ایمان ہیں۔ اپنے مال و جان سے اللہ کے راستے میں

بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ بالکل غیر ضروری تھا اور پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو مشورے کا حکم دیتے وقت یہ نہیں کہا کہ فلاں بات میں مشورہ کرو۔ اور فلاں میں نہ کرو۔ اس لئے لازم تھا کہ ہر دو معاملات میں صحابہ کرام سے مشورہ لیتے۔“

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

”عزیمت (پختہ ارادہ) کا ذکر مشاورت کے بعد آیا ہے^①۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہاں وہ عزیمت مراد ہے جو مشاورت سے پیدا ہو۔“

(احکام القرآن جلد دوم ص ۳۱ طبع بیروت)

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت کے مطابق آپ سے دریافت کیا گیا کہ عزم سے کیا مراد ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ مُشَاوَرَتٌ أَهْلِ الرَّأْيِ ثُمَّ اتَّبَاعُهُمْ یعنی جو لوگ مشورہ دینے کے قابل ہوں، ان سے رائے لے کر ان کی رائے کی پیروی کرنے کا نام عزم ہے۔

مشاورت کی اہمیت :

لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں نے عام طور پر حضرت نبی اکرم ﷺ کے اس بلند اجتماعی تصور کو آپ کی انفرادیت میں گم کر دیا۔

مشاورت کا مسئلہ اسلام میں بہت بڑا مسئلہ ہے۔ لیکن اسلامی حکومتوں کو مشورے سے خالی کر کے مطلق العنان، جاہل حکمرانوں اور امیروں کا کھیل بنا دیا گیا۔ وہ مسلمانوں کی امانت (سرکاری خزانے) سے اپنی شہوت پرستیوں پر روپیہ صرف کرتے ہیں۔ وہ بڑی سے بڑی مصلحت کے مقابلے میں خیانتیں کرتے ہیں اور ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔

اس قسم کی غلطیوں کا خمیازہ مسلمانوں کو صرف اس غلط تفسیر کی وجہ سے بھگتنا پڑا۔ ورنہ ہر ایک مسلمان ایک حاکم کے اوپر نگلی تلوار ہے۔ وہ حاکم کیوں قانون الہی کی اطاعت نہیں کرتا؟ اگر وہ اطاعت نہیں کرتا تو کس بنا پر ہم سے اطاعت کا طلبگار ہوتا ہے؟ یہ طاقت مسلمانوں میں پھر سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اور اس سے ان کی جماعتی زندگی آسانی کے ساتھ قرآن کے مطابق بن سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شوریٰ کو مستحب کا درجہ^② بنا کر اسے سیاست اسلامی سے نکال ڈالنے والے لوگوں نے اسلام کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔

① قرآنی الفاظ کی ترتیب یوں ہے: وَشَاوَزْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۖ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَشَٰوِرْهُمْ عَلٰی اللّٰهِ - ظاہر ہے کہ اس میں وَشَاوَزْهُمْ (ان سے مشورہ لیا کر) پہلے واقع ہوا ہے اور (فَاِذَا عَزَمْتَ جب تو پختہ ارادہ کرے) بعد میں آیا ہے۔ (مرتب)
② مستحب وہ امر ہے کہ اس پر عمل کریں تو اچھا ہے اور نہ کریں تو کوئی حرج بھی نہیں (مرتب)

صحابی سے کون مراد ہیں؟

ایسے ہی صحابی کی وہ تعریف عوام میں مشہور ہو گئی ہے جس سے بہت غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ صحابی کی یہ تعریف کہ اس نے ایمان کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہو۔ حدیث کی روایتیں جمع کرنے کی خاطر بنائی گئی ہیں ورنہ اصل میں سیرت نبوی کے اعتبار سے صحابی وہ ہے جس نے آپ کی معیت لازم پکڑی اور آپ کے ساتھ آخر تک انقلاب میں شریک رہا۔ تکلیفیں اٹھائیں اور اس تحریک کی صداقت کے متعلق پورے یقین کے ساتھ یہ اطمینان کر لیا کہ انسانیت کے لئے اس کے سوا اور کوئی پروگرام نہیں ہے۔^① یہی وجہ وہ لوگ ہیں جن کی تعریف قرآن حکیم ان الفاظ میں کرتا ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالَّذِينَ آوَدُوا وَنَصَرُوا ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ ۙ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ (انفال- ۷۴)

(یعنی جو لوگ ایمان لائے جنہوں نے اپنے گھر چھوڑے اور اللہ کی راہ میں لڑے اور جن لوگوں نے انہیں جگہ دی اور ان کی مدد کی وہی ہیں سچے مسلمان، ان کے لئے بخشش ہے اور عزت کی روزی ہے) رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کی جنہوں نے آپ کی سیرت (حالات زندگی) کے بنانے میں حصہ لیا چند صفیتیں ہیں۔

(۱) اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ (الفتح- ۲۹) (کافروں پر سخت)

نبی ﷺ کے ساتھی اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ ہیں: ان کی سختی کے دو پہلو ہیں: یہ لوگ مخالفوں سے لڑنے میں بڑے سخت ہیں۔ کہ موت قبول کر کے لڑنے کے لئے جاتے ہیں۔

(۲) جو لوگ اس تحریک کے کھلم کھلا دشمن (کافر) ہیں۔ یہ لوگ ان کافروں کو انتہائی سزا دینے کے طرفدار ہیں۔ قتل کی ضرورت ہو تو قتل کر دئے جائیں۔^② ورنہ جو اس سے کم سزا

① چنانچہ محدث مازری شرح برہان میں رقمطراز ہیں کہ: نلشنا نعنٰی بقولنا ”الصحابہ عدول“ کل من رآہ صلعم یومامنا، اوزارہ لبامنا، اواجتمع بہ الغرض وانصرف مکتشا انہا نعنٰی بہ الذین لازموہ وعزودہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہ اولئک ہم الفضلحون) منقول از اسوہ صحابہ از مولانا محمد سعید انصاری جلد اول ص ۱۱۱ بحوالہ ”فتح المغیث“ ص ۷۷ (۳) یعنی جب ہم کہتے ہیں کہ الصحابہ عدول (صحابی سب عادل ہیں) تو اس سے ہماری مراد ہر وہ شخص نہیں جس نے آنحضرت ﷺ کو کسی روز دیکھ لیا یا بھی زیارت کر گیا۔ یا کسی کام سے آیا اور فوراً واپس لوٹ گیا۔ بلکہ ہماری مراد ان بزرگوں سے ہے جنہوں نے آپ کی معیت لازم پکڑی، جہاد میں آپ کی مدد کی۔ آپ کی حمایت میں آپ کے دشمنوں سے لڑے۔ اور اس نور کی پیروی کی جو آپ پر نازل ہوا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حقیقی معنوں میں کامیاب ہوئے۔ (مرتب)

② جنگ بدر میں جو کافر قیدی گرفتار ہو کر آئے حضرت عمرؓ نے ان کے متعلق تجویز کیا کہ ہر ایک مسلمان ان میں سے اپنے اپنے عزیزوں کو قتل کر دے۔ (مرتب)

ضروری ہو وہ دی جائے۔

قتل ہمیشہ اسی وقت کیا جائے گا جب انہوں نے قتل کیا ہو یا وہ لڑنے کے لیے تیار ہوئے ہوں۔ ورنہ ان کی انتہائی سزا یہ ہے کہ ان کی سیاسی تحریک روک دی جائے اور انہیں سیاست میں حصہ نہ لینے دیا جائے۔ ان کی عقلمندی سے جو ارتقائی اور تمدنی فائدے حاصل ہو سکتے ہیں، ان سے جماعت کو محروم کرنا مقصود نہیں ہے۔

(۲) رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (آپس میں رحمدل)

وہ ”رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ“ بھی ہیں: جو لوگ اس تحریک کی تائید میں ان کے ساتھی ہیں ان کے لئے ان کے پاس سوائے رحمت کے اور کچھ نہیں۔ جیسے ماں باپ اپنی اولاد پر رحمت کرتے ہیں۔ ایسے ہی یہ لوگ اپنے ساتھیوں کے ساتھ رحمت سے پیش آتے ہیں اور اپنے بعد آنے والوں کے لئے بھی رحمت کے دروازے کھولتے ہیں جس شخص کے متعلق امکان نظر آتا ہے کہ وہ اس تحریک کی تائید کرے گا۔ اسے مخالف بننے کا موقعہ نہیں دیتے۔

ان کے جو ساتھی مظلوم اور ضعیف ہیں۔ اگرچہ یہ انہیں پہنچانے بھی نہیں۔ مگر ان پر رحم کرنے کے لئے اپنی تمام عزت قربان کر دیتے ہیں۔ جیسے انہوں نے حدیبیہ کی صلح میں کیا۔ یا حضرت فاروق اعظم نے عراق کی زمین فوجیوں میں تقسیم کرنے سے اس بناء پر انکار کر دیا تھا کہ ان اراضی کا فائدہ بعد میں آنے والی نسلوں کو ملنا چاہئے۔ (ازالہ الخفاء: امام ولی اللہ دہلوی مقصد دوم ص ۱۲۷)

(قرآنی شعور انقلاب۔ ص ۵۸۰)

☆

رسول اللہ ﷺ کی پارٹی کی ضرورت

اگر کتاب الہی کی اشاعت کو پارٹی پروگرام میں منضبط کر لیا جائے، جیسے ہم سورہ مجادلہ میں حزب اللہ کی تاسیس سے استنباط کرتے ہیں اور انسانی عقلمند جماعتوں کا فیصلہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ کوئی انقلاب پارٹی کی آمریت کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا تو انبیاء کرام کی کامیابی کو ان کی پارٹی کی کامیابی تسلیم کرنا پڑے گا۔ انبیاء کرام اپنی پارٹیوں کے لیڈر ہوتے ہیں اس لئے دنیا غلطی سے رہنما کو ڈکٹیٹر سمجھ لیتی ہے۔ حقیقت میں کوئی نبی اپنے انقلابی رفقاء کی کامیابی کے بغیر کامیاب نہیں ہوا۔ بڑے بڑے اولوالعزم نبی اپنے رفقاء کی کمزوری کے سبب اپنی تعلیمات کے نتائج نہ دیکھ سکے جیسے موسیٰ علیہ السلام کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ بذات خود بڑے اولوالعزم نبی تھے اور ان کی نظیر تاریخ میں بہت کم ملتی ہے، مگر ان کے رفقاء کی کمزوری سے انہیں بے حد تکالیف پیش آئیں اور منازل مقصود پر پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ چنانچہ سورۃ المائدہ آیت نمبر ۲۶ ملاحظہ ہو۔

قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً يَكُونُونَ فِي الْأَرْضِ ۖ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ترجمہ: اللہ نے فرمایا تحقیق وہ زمین ان پر چالیس برس حرام کی گئی ہے وہ اس ملک میں سرگرداں پھریں گے۔ سو تو نافرمان قوم پر افسوس نہ کر!

یعنی کہ اگر یہ (بنی اسرائیل) ایسے ہی ڈرپوک اور بے حس ہو گئے ہیں تو ان کو ارض مقدس کی بادشاہی دینے سے کیا نفع ہو گا؟ لہذا سزا کے طور پر یہ چالیس سال یہاں جنگل میں پھریں تاکہ بے غیرت اور بے حس بڑھے مر جائیں اور ایک نئی نسل غیور اور حریت پسند پیدا ہو، وہ جا کر اپنے آبائی ملک پر قبضہ جمالے۔

ادھر قرآن حکیم رسول اللہ ﷺ کی کامیابی کو ’الذین معہ‘ کی کامیابی پر منحصر کرتا ہے۔

لَكِنَّ الرُّسُلَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَهْدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ وَأُولَئِكَ لَهُمُ الْخَيْرُ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ أَحَدًا اللَّهُ لَهُمْ جَلَّتْ تَجَرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَخَالِدِينَ فِيهَا ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝

(۸۹: ۸۸-۸۹)

ترجمہ: لیکن رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان والے ہیں وہ اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں اور انہی لوگوں کے لئے بھلائیاں ہیں اور وہی نجات پانے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے باغ تیار کئے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكْعًا سَجِدًا يَتَسَوَّوْنَ فَعَسَىٰ أَلْفُ مِنْ اللَّهِ وَرِضْوَانًا ۖ سَيَجَاهِدُ فِي وَجْهِهِمْ مِنْ أَثَرِ الشُّجُوذِ ۚ ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي الشُّرُورِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْسَانِ جَلِيلٌ ۖ كَذَرِ أَخْرَجَ شَطْرَهُ فَآزَرَهُ ۖ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَصْبُغَهُمْ ۚ وَكَذَلِكَ اللَّهُ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا (سورہ الفتح: ۲۹)

ترجمہ: محمد (ﷺ) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں کفار پر سخت ہیں آپس میں رحم دل ہیں۔ تو انہیں دیکھے گا کہ رکوع و سجود کر رہے ہیں۔ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی تلاش کرتے ہیں۔ ان کی شناخت ان کے چہروں میں سجدے کا نشان ہے۔ یہی وصف ان کا تورات میں ہے اور انجیل میں ان کا وصف ہے۔ مثل اس کھیتی کے، جس نے اپنا اکھوا نکالا پھر اسے قوی کر دیا۔ پھر موٹا ہو گیا۔ پھر اپنے تنے پر کھڑا ہو گیا۔ کسانوں کو خوش کرنے لگا۔ تاکہ اللہ ان کی وجہ سے کفار کو غصہ دلائے۔ اللہ نے ان میں سے ایمانداروں اور نیک کام کرنے والوں کے لئے بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے ذوی القربیٰ کون ہیں؟

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء کی کامیابی ان کے حزب کی کامیابی ہی ہوتی ہے اس کے بعد

انسانیت خراب ہو جاتی ہے۔ پس نبی اکرم ﷺ لوگوں سے فرماتے ہیں کہ میری رسالت کا اجر اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تم آپس میں صلہ رحمی کرو اور اس باب میں گمراہی میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ اس آیت میں اس امر کی طرف اشارہ واضح موجود نہیں ہے کہ مودۃ فی القربی سے مراد رسول اللہ ﷺ کے قرابت داروں کے ساتھ مودۃ ہے۔

مودۃ فی القربی کا اصل مفہوم

اس دعوت کی کہ لوگ اپنے اپنے اقربا کے حقوق ادا کریں یہ حکمت تھی کہ لوگ اس پر مطمئن تھے کہ نبی اکرم ﷺ ہمیں اس چیز کی طرف بلا رہے ہیں جس میں ہمارا ہی نفع ہے۔ پس اہل بیت اور سب مائیں اس دعوت کو سنتی تھیں کیونکہ قطع رحم سے سب سے زیادہ نقصان امہات ہی کو پہنچ سکتا ہے۔ جب انہوں نے سنا کہ نبی اکرم ﷺ اپنی تبلیغ و سعی اصلاح کا اس کے سوا اور کوئی اجر طلب نہیں کرتے کہ ہماری اولاد ہماری خدمت کرے تو وہ اسلام کی طرف زیادہ مائل ہو جاتی تھیں۔ جو شخص مکہ معظمہ میں اسلام کے پھیلنے کی رفتار کا مطالعہ کرے وہ اس چیز کو نہایت بین پائے گا۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔

قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ (سہ-۴۷)

ترجمہ: کہہ دیجئے میں نے تم سے جو کچھ معاوضہ مانگا ہو تو وہ تم ہی رکھو

پس نبی اکرم ﷺ بھی دوسرے انبیاء کی طرح امت سے کوئی مادی یا غیر مادی اجر طلب نہیں کرتے۔ وہ تو ساری عمر یہی فرماتے جاتے ہیں کہ

إِنْ أَجْرِي إِلَّا عَلَى اللَّهِ (۳۷:۳۳)، ۷۲:۱۰، ۲۹:۱۱، ۵۱:۱۱، ۲۶:۱۰۹، ۳۴:۷۷،

اور یہی سنت انبیاء ہے۔

البتہ یہ صحیح ہے کہ متقدم فی الاسلام ہونے کی وجہ سے بنو ہاشم عجمیوں سے افضل واولیٰ ہیں، بشرطیکہ ان میں شرائط خلافت پائی جائیں۔

الغرض قرآن حکیم رسول اللہ ﷺ کے نبی رشتہ داروں کا اس آیت میں کوئی ذکر نہیں کرتا۔ اس لئے ان سے مراد وہ رشتہ دار ہیں جو حضور ﷺ کی تحریک میں جان و مال لٹا کر شریک ہوتے ہیں۔ وہ حزب اللہ کے مندرجہ ذیل تین اجزاء ہیں۔

یعنی رسول اللہ ﷺ کے تین قسم کے ذوی القربی:

(۱) مہاجرین۔ آیت نمبر ۸ (۲) انصار آیت نمبر ۹ (۳) تابعین باحسان آیت نمبر ۱۰۔ یہ تینوں قسم کے لوگ ذوی القربی کی تفسیر ہیں۔

اگر یہ پوچھا جائے کہ رسول ﷺ کے ذوی القربی کون ہیں؟ تو بلا تامل یہی جواب دیا جائے گا کہ ”اس ﷺ کی پارٹی کے ممبر“ مگر ایک ایسا آدمی جس نے انبیاء کی کامیابی کا ایسے نقطہ نگاہ سے مطالعہ نہیں کیا۔ کہے گا ”رسول اللہ کے شخصی رشتہ دا!“

رسول اللہ ﷺ کے نبی قربی

نبی اکرم کے نبی رشتہ دار اولاد بنی ہاشم اور پھر اولاد علی رضی اللہ عنہ اور اولاد عباس رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کی سیاست کا مخصوص انداز یہی تھا کہ وہ بنی اسرائیل کے طریق پر خلافت قائم کر کے اس کے مرکز میں آنا چاہتے تھے، مگر نبی اکرم ﷺ نے ان کے اس استحقاق کی ہرگز صراحت نہیں فرمائی۔ بنی امیہ کی خلافت کے زمانہ میں بنی ہاشم حزب مخالف کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ اب انہوں نے جماعت کے ذریعے سے کوشش کی اور کامیاب ہوئے۔ کامیابی کے بعد دو حصے ہو گئے (۱) بنی عباس (۲) علویون

نبی قربی کسی ترجیحی حق کے مستحق نہیں:

بنی عباس نے مرکزی خلافت پر قبضہ کر لیا اور علویوں نے اطراف مملکت پر، علوی، آیت:

قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى (شوری-۲۳)

ترجمہ: کہہ دو میں تم سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا۔ مگر رشتہ داری کی محبت کے).... میں ’ذوی القربی‘ سے اپنی ذات مراد لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اجر یہ ہونا چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ کے خاندان کی حکومت قیامت تک تمام مسلمانوں کے گلے میں پڑی رہے خواہ وہ حکومت کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ کی محنت کا اجر یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے اقرباء سے محبت سے پیش آنے لگیں۔

(نساء-۱) میں دیکھیے:

وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا

ترجمہ: اور اللہ سے ڈرتے رہو جس کے واسطے سے آپس میں سوال کرتے ہو اور قرابت والوں کے بارے میں سے خبردار رہو! بیشک اللہ تم پر نگہبان ہے۔

شریعت اسلامیہ کی بنیاد اس پر ہے کہ یہ دعوت الی اللہ ہے، اللہ کے احکام کا اتباع ہے اور ان کا انصاف کے ساتھ قیام ہے۔ شریعت الہیہ کا دوسرا جزو اعظم جو اس سے متفرع ہوتا ہے صلہ رحمی ہے یعنی اہل حق کے حقوق بے کم و کاست ادا کئے جائیں۔ انسانی فطرت اسی پر مجبور ہے اور قرآن حکیم اس فطرت انسانی ہی کے تقاضے پورا کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر یہ فطرت خراب ہو جائے تو

رسول اللہ ﷺ کی صحیح پوزیشن

نے میں سے جو حصہ ۵۱ رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا ہے وہ کافی بڑی مقدار ہے۔ یہ اس لئے دیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ذاتی یعنی نسبی رشتہ دار بہت سے ہیں جن کے رسول اللہ ﷺ پر طبعی حقوق ہیں۔ ان کے مصارف اس حصے میں سے نکلیں گے۔ ذی القربى کا جو ۵۱ حصہ ہے وہ رسول اللہ ﷺ کے ذاتی اور نسبی رشتہ داروں کے لئے نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا اسوہ حسنہ تو یہ ہے کہ وہ اپنا ذاتی پانچواں حصہ بھی کبھی پورا وصول نہیں کرتے بلکہ ازواج مطہرات اور قریبی رشتہ داروں کے واجبی حقوق ادا کرنے کے بعد باقی ماندہ رقم پھر یتامی اور مساکین کے حصے میں لوٹا دیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ خیال بنانا کہ رسول اللہ ﷺ ۵۱ حصہ اپنے ذاتی نام سے اور ۵۱ حصہ اپنے ذوی القربى کے نام سے لیتے ہیں یہ اس پرانی سرمایہ دارانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے لئے شہنشاہیت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بنی ہاشم میں چند آدمی اس خیال کے ضرور پیدا ہو گئے تھے مگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو کامیاب ہونے نہیں دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا نسلی حق جس کے بعض بنی ہاشم مدعی تھے قائم نہ ہو سکا۔ یہ اسلامی تعلیم اور رسول اللہ ﷺ کا بہت بڑا شرف ہے۔ اس لئے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت بڑی عزت کے مستحق ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا بلکہ بعض بنی ہاشم کی پالیسی چل جاتی تو ساری دنیا یہی کہتی کہ رسول اللہ ﷺ نے رسالت کا دعویٰ کر کے اپنے خاندان کے لئے چند روزہ شہنشاہی پیدا کر لی۔ (قرآنی شعور انقلاب ص ۲۰۲، ۱۹۷۷)

☆

نبی اکرم ﷺ کی جماعت کی خوبی

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ (الف - ۲۹) محمد رسول اللہ اور ان کے ساتھی) سے جو جماعت پیدا ہوئی ہے اس کی زندگی ارفاق اور اقتراب دونوں کے لحاظ سے نمونے کی زندگی ہے۔ انہوں نے بین الاقوامی حکومت بھی پیدا کی اور قرب الہی کے بھی اونچے سے اونچے درجوں تک پہنچے۔ ان کا یہ کارنامہ قیامت تک کے انقلابیوں کے لئے اعلیٰ درجے کا نمونہ ثابت ہو گا۔ بیچ میں اس نمونے پر اور نمونے ڈھلتے رہیں گے۔ لیکن اصل نمونہ یہی ہو گا۔ حضرت امام ولی اللہ دہلوی رحمونے کے اس اولین دور کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر ختم مانے ہیں۔

اور اس دور کی تاریخ کے جس اعلیٰ پائے کے وہ شرح کرنے والے ہیں اس سے بہتر کوئی دوسرا عالم نہیں مل سکتا۔

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن کا قانون بین الاقوامی درجے پر غالب رہنا چاہئے۔ یہ جماعت

اپنے فیصلے سے اس ذمہ داری کو قبول کرتی ہے۔ یتیموں (چاہتے ہیں) سے یہی مراد ہے کہ اپنی مرضی اور فیصلے سے ”چاہتے ہیں“۔

(ہ) سَيَجَاهِدُونَ فِي دُجُوهِهِمْ مِّنْ أَثَرِ الشُّجُودِ (الف - ۲۹)

(ان کی نشانی ان کے مونہوں پر ہے سجدے کے اثر سے)

سجدے کی روح۔۔۔۔۔ قربانی۔۔۔۔۔ ان کے اندر داخل ہو چکی ہے اور اس سے وہ اس قدر نڈر ہو چکے ہیں کہ ان کے چہرے سے ایک نور ابلتا ہے وہ ہر ایک مصیبت کو برداشت کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ انہیں راہ حق سے کوئی مصیبت ہٹا نہیں سکتی۔

(و) ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْبَةِ (الف - ۲۹)

ان کی یہ تمثیل تورات میں (پہلے ہی) بیان کر دی گئی ہے

تورات اور انجیل میں اس جماعت کا ذکر:

تورات میں اس کا اشارہ مجمل ہے۔ چنانچہ تورات میں ہے کہ میں بنی اسماعیل کو اتنا ہی بڑھاؤں گا جتنا بنی اسحاق کو۔ میں انہیں ایک بڑی قوم بناؤں گا۔

(ز) وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيلِ كَذَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْطُهُ فَازْرَعًا فَاسْتَعْلَظَ فَاَسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوْقِهِ يُعْجِبُ الْوَزَّاعَ

(اور انجیل میں ان کی تمثیل جیسے کھیتی نے نکالا اپنا پنہا، پھر اس کی کمر مضبوط کی۔ پھر وہ موٹا ہوا پھر کھڑا ہو گیا اپنی نال پر۔ خوش لگتا ہے کھیتی والوں کو) (الف - ۲۹)

اس سلسلے میں انجیل کے مندرجہ ذیل مقامات لائق توجہ ہیں:

انجیل مرقس باب ۴ آیات ۳-۹ میں ہے کہ:

”سنو، دیکھو، ایک بونے والا بیج بونے نکلا اور بوتے وقت ایسا ہوا کہ کچھ راہ کے کنارے گر اور پرندوں نے آکر اسے چک لیا۔ اور کچھ پتھریلی زمین پر گر ا جہاں اسے بہت مٹی نہ ملی، اور گہری مٹی نہ ملنے کے سبب جلد آگ آیا۔ اور جب سورج نکلا تو جل گیا اور جڑ نہ ہونے کے سبب سوکھ گیا۔ اور کچھ جھاڑیوں میں گر۔ اور جھاڑیوں نے بڑھ کر اسے دبا لیا۔ اور وہ پھل نہ لایا۔ اور کچھ چھپی زمین پر گر۔ وہ آگ اور بڑھکر پھلا اور کوئی تیس گنا کوئی ساٹھ گنا کوئی سو گنا پھل لایا۔“

پھل لانے کی مزید کیفیت آگے چل کر آیات ۲۶-۲۷-۲۸ میں اس طرح بیان کی گئی ہے: اور اس نے کہا: خدا کی بادشاہت ایسی ہے جیسے کوئی آدمی زمین میں بیج ڈالے، اور رات کو سوئے اور دن کو جاگے، اور وہ بیج اس طرح اُگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے، زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے

پہلے پتی، پھر بالیں، بعد اس کے بالوں میں تیار دانے“

(ح) لِيَغْضَظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ۔ (تاکہ ان سے کافروں کا جی جلائے)

خدا نے قوموں کو رسولوں کے ذریعے سے اپنی کتابیں اور ہدایتیں دیں۔ وہ لوگ اس دین کی عزت کرتے اور اپنی کتاب پر عمل کرتے تو ان کی عزت قائم رہتی اور ان پر کوئی دوسرا حاکم نہ ہو سکتا مگر انہوں نے ان کتابوں کی عزت نہ کی اور اپنے دین کا احترام قائم نہ رکھا۔ بلکہ اس کی عملاً مخالفت کی یہ کفار ہیں۔

اب ایک دیندار جماعت پیدا ہوتی ہے جو ان پر غالب آجاتی ہے۔ کفار اپنے آپ کو بھی دیندار سمجھتے ہیں۔ انہیں غصہ آتا ہے کہ یہ لوگ ہمارے دین پر غالب کیوں آگئے؟ لیکن حکمت الہی کا تقاضا ہے کہ یہ باعمل جماعت جو مرنے پر آمادہ ہے۔ ان ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے والوں یا نیم دلی سے اپنے دین کے ماننے والوں پر غالب آجائے۔

ان نام نہاد ”دیندار“ قوموں کو مغلوب کرنا ایک دن کا کام نہیں ہے۔ یہ انقلاب قیامت تک جاری رہے گا۔ کیا مہاجرین کی پہلی جماعت کے ذریعے ہندوستان، ترکستان اور سوڈان فتح ہو سکتے تھے؟ پس قرآنی تحریک کی ترقی ایسی ہے جیسے کھیتی کا نشوونما پانا۔ یہ چھو مٹر کا کام نہیں ہے۔ ارتقائی کام ہے۔ یہ طبعی چیز ہے ہو کر رہے گی۔ مگر بعض لوگ جن کی نظر قرآن پر گہری نہیں ہے طبعی رفتار کو دین سے الگ کرتے ہیں لیکن ہم امام ولی اللہ کے واسطے سے نیچر اور دین کو ایک ہی چیز مانتے ہیں۔ یہ تحریک اس کی مثال ہے یعنی جس طرح بیج بونے کے بعد کھیتی طبعی رفتار سے ترقی کرتی ہے۔ ایسے ہی یہ قرآنی تحریک طبعی طور پر ترقی کرے گی۔ اور تمام دنیا پر چھا جائے گی۔

یہاں تک حضرت نبی اکرم ﷺ کی جماعت کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں جو ان کی کامیابی کے کفیل بنے۔ اب ایک نئے کے طور پر جامع اصول بیان کیا جاتا ہے۔

(ط) وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا (ان میں سے جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے۔ ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ انہیں معافی ملے گی اور بڑا اجر ملے گا) یہ نمونے کی جماعت ہے: اس انٹرنیشنل تحریک کو چلانے والی جتنی جماعتیں ہیں۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ۔ ان سب سے وعدہ ہے کہ ان کی غلطیاں معاف کر دی جائیں گی۔ بشرطیکہ وہ اس پروگرام پر چلتی رہیں۔ وہ اس تحریک سے بڑے بڑے فائدے حاصل کریں گے۔ اس دنیا میں بھی اور اُس دنیا میں بھی۔

رسول اللہ کی جماعتی کامیابی جو نمونے کے طور پر قرآن کی عملی زندگی پیش کرتی ہے۔ وہ سورہ فتح کی آخری آیت میں ضبط کر دی گئی ہے اس نمونے پر قیامت تک عمل کرنا ہو گا۔ اب قرآن شریف کو کسی اور نمونے کی ضرورت نہیں ہوگی اور نہ انسانیت کو کسی اور کتاب الہی کی حاجت ہوگی۔

تمام مسلمانوں پر ایسی جماعت کا قائم رکھنا فرض ہے۔ (قرآنی شعور انقلاب ص ۵۹۱، ۵۸۸)

نبی اکرم ﷺ بطور معلم اور نذیر

رسول اکرم ﷺ کی یہ دو حیثیتیں اس طرح ہیں۔

(۱) معلم (۲) جماعت کا لیڈر

معلم کی حیثیت سے آپ شاگردوں کے متعلق شہادت دیتے ہیں کہ فلاں شاگرد فلاں قابلیت کا ہے۔ اور فلاں شاگرد فلاں قابلیت کا۔ یہاں آپ کی شان معلمی ختم ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد وہ شاگرد آپ کے ساتھ ایک جماعت کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ آپ اس جماعت کے رہنما ہیں۔ یہ جماعت منافقوں اور مشرکوں سے بالکل الگ اور خاص صفتوں کی مالک ہے۔ یہ جماعت قرآن کے اس پروگرام پر چلتی ہے کہ مظلوم انسانیت کی خدمت کرو۔ ظالموں کو گراؤ اور مظلوموں کی دادرسی کرو۔ اور اس سارے کام کا بدلہ صرف اللہ سے مانگو۔ اس پروگرام پر جو ٹھیک ٹھیک طور پر کام کرتا ہے اسے حضرت نبی اکرم ﷺ کامیاب زندگی کی بشارت دیتے ہیں۔ (مبشرا) اور اسے یقین دلاتے ہیں کہ اس کی دنیاوی اور اخروی زندگی کے فوائد محفوظ ہیں۔ جو لوگ اس پروگرام پر ٹھیک ٹھیک نہیں چلتے انہیں خبردار کرتے ہیں کہ جن کی دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی ناکام رہے گی۔ وہ بہانے بنا کر دل کو خوش کر لیں، لیکن کامیابی نصیب نہ ہوگی۔ (نذیرا)

لَتَشْكُرُوا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ وَتَعَزَّوْا وَتُؤْتُوا زَكَاةً وَتَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا (الفج-۹)

”تم ضرور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اور اس کی مدد کرو۔ اور اس کا وقار قائم کرو۔ اور صبح و شام اس کی پاکیزگی بیان کرو۔“

خدا کی محبت کی معنی

حضرت نبی اکرم کو شاہد، مبشر اور نذیر بنا کر بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں خدا کی محبت ہے انہیں ایک استاد کی ضرورت ہے جو انہیں بتائے کہ محبت کیسے کی جاتی ہے اور خدا کی محبت کے دعوے سے انسانوں کی خدمت کس طرح ہونی چاہیے۔

(قرآنی شعور انقلاب ص ۵۴۶)

☆

سیدھی راہ

رسول اللہ کی کامیابی کا صحیح پروگرام یہ ہے کہ قریش آپ کی تعلیم کے خادم بنیں۔ اور آپ کے اصول پر جو حکومت پیدا ہو اسے چلائیں۔ تاکہ حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہم السلام کی دعا عمل میں آئے۔^①

اگر یہ صورت پیدا نہ ہو اور آپ دوسری قوموں کی مدد سے اپنا پروگرام کامیاب بنا کر دکھادیں۔ تو گو آپ انسانیت پر ایک بہت بڑا احسان کرنے والے گئے جائیں گے۔ لیکن ابراہیم اور اسماعیل علیہم السلام کی دعا کا مصداق نہ ٹھہریں گے۔ پہلے نبیوں کی برکتوں کا مصداق بننا تو اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ قریش کو اپنا مددگار بنائیں۔ پہلے سب نبی اپنی اپنی قوم کو دعوت دیتے چلے آئے ہیں اور انہیں ساتھ ملا کر کام کرتے رہے ہیں۔ اس لئے آپ کا بھی فرض ہے کہ اپنی قوم کو ساتھ ملا لیں۔ کیوں کہ کام کرنے کا طبعی طریقہ یہی ہے اس سے آپ کا طریقہ وہ ہو جائے گا جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر آپ تک ایک ہی طرح قائم رہا۔ یعنی پہلے قومی انقلاب مکمل کرنا پھر اسے بین الاقوامی درجے تک کامیاب بنانے کی کوشش کرنا۔ اگر آپ بھی اس طریق پر کام کریں تو؟ یہ طریقہ رہتی دنیا تک انسانیت کے لئے مستقل پروگرام بن جائے گا اگر آپ پہلے نبیوں کے طریق سے ہٹ کر طریقہ اختیار کریں تو وہ آئندہ انسانیت کے لئے تبدیل نہ ہو سکنے والا پروگرام نہ ہو گا۔ غرض حضرت نبی اکرم ﷺ یہی طریق اختیار کیا کہ پہلے اپنی قوم کو درست کیا اور انہیں اپنا دست و بازو بنایا۔ پھر ان کی مدد سے دوسری قوموں کے ایک ایک حصے کو ساتھ ملایا۔ پھر اس حصے نے اپنی اپنی قوم میں یہ انقلابی کام کیا اور قرآن حکیم کی تعلیم پھیلا کر اس انقلاب کی تکمیل کی۔ چنانچہ حضرت امام ولی اللہ دہلوی نے قوم بقوم اسلام پھیلنے کا جو طریق تاریخی طور پر ثابت کیا ہے اس کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔ آج بھی جو قوم قرآن کے انقلاب کو بین الاقوامی درجے پر کامیاب بنانے کا تہیہ کرے وہ اسی طریق سے اسلام کی تعلیم کو کامیاب بنا سکتی ہے۔ یہ تنظیم و تربیت

① ان کی دعا کے الفاظ یہ ہیں: رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةٌ مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُؤْتِيهِمُ الْغَنَى الْحَكِيمُ ۝ (البقرہ ۱۲۹-۱۲۸) (اے ہمارے رب! (اے) قبول فرما۔ بے شک تو سننے والا جاننے والا ہے اے ہمارے رب! ہم دونوں کو اپنا تابع بنائے رکھ اور ہماری نسل سے ایک ایسی امت پیدا کر جو تیرے حکموں کے نیچے رہ کر زندگی بسر کرے۔ اور ہمیں مناسک سکھا اور ہم پر رحم فرما۔ تو رحمت کرنے والا مہربانی کرنے والا ہے۔ اے ہمارے پروردگار! ہماری اس نسل میں (جس کی ہم نے دعا کی ہے) انہی میں سے ایک (ایسا) رسول پیدا کر جو انہیں تیرے حکم پڑھ کر سنائے، قانون سکھائے (اس قانون کی) حکمت بتائے اور انہیں پاک کرے بے شک تو عزت دینے والا حکمت والا ہے۔)

ہی انقلاب کی روح ہے۔

وَيُخَصِّرُكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا (الفتح-۳)

(اور اللہ مجھے زبردست مدد دے)

کل قومی حکومت تیری اس کمزور جماعت ہی کے ذریعے سے مہیا ہو جائے گی۔ چنانچہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت سے پہلے ان غریب اور بے کس عربوں نے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کے تختے الٹ کر رکھ دئے۔ اور ان کی جگہ قرآن کا قانون چلایا۔ اس انقلاب کی بنیاد انسانی فطرت کی ضرورتوں پر تھی۔ اس لئے رفتہ رفتہ سب قوموں کے عقلمند لوگوں نے اسے مان لیا۔ اس طرح یہ تحریک روز بروز بڑھتی گئی۔ یہ سب کچھ اس صلح حدیبیہ کا نتیجہ تھا۔

(قرآنی شعور انقلاب ص ۵۳۸، ۵۳۷)

☆

اب انقلاب عمومی حضرت محمد ﷺ ہی کی اتباع سے آسکتا ہے

حنیفی اولوالعزم انبیاء علیہم السلام مثلاً حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شش کرتے رہے کہ تمام دنیا میں تورات کو پھیلا کر امامت کبریٰ (بین الاقوامی قیادت) حاصل کریں لیکن یہ مقام محمود حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہی حاصل کر سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب انقلاب عمومی اپنے مختلف ادوار میں آپ کے اتباع سے باہر نہیں جاسکتا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جو انقلاب رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا خاصہ ہے وہ ایک دن میں ساری دنیا میں نہیں پھیل سکتا۔ اس انقلاب کا پہلا حصہ وہ تھا جو خلافت راشدہ سے شروع ہو کر عباسی حکومت کے خاتمے تک کامیاب رہا۔ جب قریش میں اس انقلاب کو آگے بڑھانے کی طاقت نہ رہی تو اس انقلاب کے آگے بڑھنے کے لئے ایک اور قوم ایرانیوں کو ذریعہ بنایا گیا۔ لیکن قریش کے تنزل اور ایرانیوں کے عروج کا درمیانی وقفہ انقلاب کی ”رات“ تھی۔ اس میں نئی قوم تیار ہوئی۔ اس کے بعد ترکمانی قوموں نے اس انقلاب کو آگے بڑھایا اور پھر ہندوستانی قوم نے اسے اپنایا۔ اس طرح کلڑے کلڑے ہو کر یہ انقلاب ساری دنیا میں کامیاب رہا۔ ان کلڑوں کو علیحدہ علیحدہ خیال کرنا غلطی ہے۔ یہ سب ایک سلسلے کی کڑیاں ہیں جب تک انسان روئے زمین پر قائم ہے، یہ انقلاب کسی نہ کسی شکل میں آگے بڑھتا رہے گا۔ اور آخر میں ایک ایسا زمانہ آسکتا ہے کہ تمام اقوام جو اس انقلاب سے مانوس ہو چکی ہوں ایک سطح پر آکر اس کے ماتحت مل جائیں۔ اس وقت یہ انقلاب عمومی، مکمل ہو گا۔

پس البرمل سے مراد وہ صاحب امامت کبریٰ ہے جس کے ماتحت تمام اقوام عالم جمع ہوں گی۔

یہ گویا الحاشیہ کا دنیاوی مظہر ہے۔

الزلزل کے دوسرے معنی: امام ائمہ انقلاب

(۲) اِذْ مَلَٰئِكُہٗ یَاۡزِیۡدُ مَلٰٓئِکَہٗ دُحٰلَہٗ (المنجد) (یعنی اونٹ کی طرح بوجھ اٹھا کر ایک ہی نیچے سے اٹھ کھڑا ہوا)

اِذْ مَلَٰئِکُہٗ: اِخْتَبَلَہٗ یعنی بوجھ اٹھالیا۔ (صراح) وَمِنْہٗ قَوْلُہٗ تَعَالٰی یَاۡاَیُّہَا النَّبِیُّ مَلِیۡا اَیُّہَا الزَّلَزَلُ بھی اسی معنی میں ہیں۔

رازیؒ نے عکرمہ کا قول نقل کیا ہے۔ کہ زلزل کے معنی ہیں وہ شخص جس پر بھاری کام ڈال دیا گیا ہو۔ کیونکہ زلزل کے معنی ہیں حَلَل

یہ بار کیا ہے؟: قومی اور بین الاقوامی انقلاب

یہ بار جو نبی اکرم ﷺ نے اٹھایا قومی اور بین الاقوامی انقلاب کا بار تھا۔ اور تعجب یہ ہے کہ آپ نے پہلے اپنی قوم کو ترقی دے کر بین الاقوامی درجے کے کام کرنے والے کارکن تیار کرنے کا انتظار نہیں کیا۔ گواگر آپ ایسا کرتے تو بھی کسی عقلمند کو اس پر اعتراض نہ ہوتا لیکن آپ نے بین الاقوامی انقلاب کو موخر نہیں کیا۔ بلکہ دونوں کام ایک ہی وقت شروع کر لئے۔ یہ نہایت مشکل کام تھا۔ لیکن آپ نے جو انردی، ہمت، محنت اور مشقت سے کام لیا اور پورے کے پورے بوجھ کو سنبھال کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اللہ کے فضل سے بہت جلد منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے قریش کی ذہنیت ایسی تیار کی کہ وہ جہاں امرائی مدینہ کے ساتھ مل کر کام کر سکے وہاں بلال حبشی رضی اللہ عنہ، صہیب رومی رضی اللہ عنہ اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہ وغیرہ غیر عربوں کے ساتھ اور ان کے ماتحت بھی کام کر سکے۔

جو شخص سیاسی اجتماعیت میں اس قسم کا بار گراں اٹھاتا ہے وہ امام انقلاب کہلاتا ہے۔ اس لحاظ سے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ الزلزل یعنی آخری درجے کے امام ائمہ انقلاب ہیں۔ مولانا محمد قاسم رضی اللہ عنہ اس آخری درجے کا نام خاتم النبیین رکھتے ہیں۔ اس سے اوپر کوئی درجہ ہی نہیں ہے۔

(قرآنی شعور انقلاب ص ۳۱۸، ۳۱۷)

☆

مدرثر کے معنی

موطا امام مالک میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا ایک نام الماحی بھی ہے جس کے معنی خود حضرت نبی اکرم ﷺ نے بتائے ہیں کہ: ”یَسْعُو اللہُ الْکُفْرَ“ (یعنی میرے ذریعے سے اللہ کفر کو

محو کرے گا) چنانچہ لغوی طور پر مدرثر کے معنی اھلک (ہلاک کرنا) بیان کئے گئے ہیں جو بالکل الماحی کے معنوں کے مترادف ہیں۔ پس مدرثر کے معنی ہیں دنیائے انسانیت سے ہر قسم کا ظلم و جور مٹانے والا۔ نبی اکرم ایہ کام ملت حنیفیہ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اصول حیات کے دوبارہ زندہ کرنے سے کریں گے جو آپ کی گھٹی میں پڑی تھی، اور جس کے نمائندے قریش تھے۔

نبی اکرم ﷺ کی سیرت پر ایک نکتہ:

سیرت نبی (علی صاحبھا التوحید والسلام) کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ملت حنیفیہ ابراہیمیہ کے قیام کے لئے طبعاً بے تاب تھے۔ آپ کی تربیت بھی قریش کے اونچے گھرانوں میں ہوئی۔ جن میں اس ملت کی اچھی اچھی باتیں باقی تھیں۔^①

پھر وہ انقلاب کا زمانہ تھا۔ فارس اور روم آپس میں لڑ رہے تھے اور چاہتے تھے کہ دنیا کی اقوام کو اپنے قبضے میں لائیں۔ ان سیاسی اور جنگی حالات کا اثر قریش پر بھی پڑ رہا تھا۔ کیونکہ ان کے تجارتی تعلقات دونوں ممالک کے ساتھ تھے اور ان ملکوں میں ان کی کافی آمد و رفت تھی۔ چنانچہ قریش کا سمجھدار طبقہ سیاسی میلانات کے لحاظ سے تین طبقوں میں تقسیم ہو گیا تھا:

(۱) ایک طبقہ قیصر کی طرف مائل تھا۔

(۲) دوسرا طبقہ کسریٰ ایران کی طرف مائل تھا۔

(۳) تیسرا طبقہ دونوں سے الگ تھا اور حنیفیت پر قائم تھا۔

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ طبعاً اس تیسرے گروہ کے سرگرم رکن تھے یہ گروہ اگرچہ اقلیت میں تھا لیکن عرب پر قریش کی سیادت قائم کر کے آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ میں اس قسم کی قیادت کی طبعی خداداد استعداد بھی موجود تھی۔ آپ کو اس انقلاب میں کامیابی کے لئے جس ہدایت کی ضرورت تھی اور جس کے لئے آپ سرگرداں تھے (وَوَجَدَكَ ضَالًّا)^② وہ خداوند تعالیٰ نے فراہم کر دی (فہادی)^③

آپ قرآن حکیم کے ذریعے سے دنیائے انسانیت میں جو انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں اس کا

① یہ خیال غلط ہے کہ قریش اور اہل عرب افریقہ کے وحشیوں کی طرح بالکل وحشی لوگ تھے جن میں کوئی انسانی خوبی باقی نہ رہی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ قریش اور اہل عرب میں ملت حنیفہ کا اچھا خاصہ حصہ باقی تھا۔ جیسے آج کل مسلمانوں کی تباہی کے باوجود ان میں اپنے بزرگوں کی بہت سی اچھی باتیں موجود ہیں تفصیل کے لئے دیکھو (حجتہ اللہ

الباقی ج اول ص ۱۲۴)

② اللہ تعالیٰ نے تمہیں سرگرداں پایا۔

③ پھر ہدایت دی۔

ہوئے ہے، ہم سے ہدایت لے اور محنت سے کام کر۔ اور جن لوگوں تک تیری آواز پہنچ سکتی ہے ان کو انسانی انقلاب کا یہ پیام سنا دے۔ اور ایسے لوگ تیار کر جو یہ انقلابی تعلیم دوسرے لوگوں تک پہنچادیں۔ ایسے خاص لوگوں کی مرکزی قوت راتوں کو کھڑے ہو کر قرآن حکیم کی تعلیم پر تدریس کرنے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے جس کا ذکر سورہ مزمل میں آچکا ہے۔ چنانچہ تجربے نے ثابت کر دیا کہ اس شبانہ تعلیم نے وہ لوگ پیدا کر دیئے جنہوں نے اس انقلاب کو فارس اور روم تک پہنچا دیا۔ اور پھر آگے وہ لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اسے حبشیوں، ترکوں اور ہندوؤں تک پہنچا دیا۔ اب پھر یہ انقلاب پہلو بدل رہا ہے اور انشاء اللہ اس کی دعوت ہندوستان سے یورپ کی اقوام تک پہنچے گی۔

(قرآنی شعور انقلاب ص ۳۶۰)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مثال:

حضرت نبی اکرم ﷺ کی شاندار بین الاقوامی کامیابی اسی اصول طبعی کی پابندی کی رہیں منت ہے۔ یہ اصول اس سے پہلے بھی برتنے کی کوشش کی گئی تھی۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے بین الاقوامی مرکزیت کو توڑنے کے لئے اسی حربے سے کام لیا۔ جب خداوند تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت حنیفی کی ریاست سپرد کی (جو بین الاقوامی دعوت ہے) تو ان کو اور ان کے رفیق کار حضرت ہارون علیہ السلام کو حکم دیا:

فَاتَّبِعْهُ قَوْلًا ۖ اِنَّا رُسُلًا رَبِّكَ ۚ فَارْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرٰٓءِٖلَ ۚ وَلَا تَعْبُدْهُمْ ۚ قَدْ جِئْتُكَ بِبَآئِةٍ مِّنْ رَبِّكَ ۚ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی (طہ ۴۷)

(یعنی دونوں فرعون کے پاس جاف اور اسے کہو کہ ہم تیرے پروردگار کے پیامبر ہیں اس لئے بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور ان کو عذاب مت دے! ہم تیرے پاس تیرے رب کی کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے ہیں۔ اب جو ہدایت کی پیروی کرے گا وہی سلامت رہ سکتا ہے۔)

چنانچہ خدا کے دونوں پیامبر فرعون کے پاس جاتے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بطور نمائندہ گفتگو کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّكُمْ ۚ فَارْسِلْ مَعِيَ بَنِي إِسْرٰٓءِٖلَ (الاعراف: ۱۰۵)

(میں یقیناً تمہارے رب کی طرف سے کھلی کھلی نشانی لے کر آگیا ہوں۔ اس لئے اب بنی اسرائیل کو میرے ساتھ روانہ کر دو)

بالکل ایسے ہی حضرت نبی اکرم ﷺ نے پہلے قریش اور عرب میں بین الاقوامی کام کو قومی رنگ میں کرنا شروع کیا اور ان مظالم سے پاک کرنے کی کوشش کی جو وہ انسانیت پر کر رہے تھے۔ اور ان کو تعلق باللہ کا وہ سبق یاد دلایا جو وہ بھول چکے تھے۔

لازمی نتیجہ ہو گا کہ انسانی معاشرہ (سوسائٹی) میں سے ہر قسم کا ظلم خواہ وہ خدا اور بندوں کے تعلقات میں ہو یا فقط بندوں کے باہمی تعلقات میں یعنی روحانی ہو یا اقتصادی سب مٹا دیا جائے گا۔ اور اس کی جگہ خدا کے ساتھ صحیح طریق پر تعلقات قائم کئے جائیں گے اور انسانیت میں معاشیات، معاشرت اور اقتصادیات میں ایک نظم جدید پیدا کیا جائے گا۔ اس انقلاب میں کسی خاص قوم یا ملک کی خصوصیت نہ ہوگی۔ بلکہ وسیع ترین معنوں میں عالمگیر اور ہمہ گیر ہوگا۔

اسلام کا جامع انقلاب:

دنیا میں اب تک جو انقلابات ہوئے ہیں وہ سب کے سب جزوی انقلابات ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی عالمگیر اور جامع انقلاب نہیں ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ آخری امام انقلاب ہیں۔ جن کی دعوت جامع عالمگیر انقلاب کے لئے ہے اور آپ نے اس جامعیت کا بہترین نمونہ سر زمین حجاز میں قائم کر کے دکھا دیا۔ جسے دنیا اب تک اس حیثیت سے جانتی اور مانتی ہے۔ آپ کے انقلاب میں اس وقت کی مہذب اقوام کا بیشتر حصہ آگیا۔ اور سب کو خدمت انسانیت کے ایک نقطے پر جمع کر کے نہ صرف یہ کہ ان کے تعلقات ان کے خالق کے ساتھ درست کر دیئے۔ بلکہ ان کے آپس کے تعلقات بھی درست کر دیئے۔ اب جب کبھی کوئی جماعت جامع بین الاقوامی انقلاب پیدا کرنا چاہے گی اسے آپ ہی کے نقش قدم پر چلنا ہوگا۔ جو جماعت اس لائحہ عمل کے خلاف کوئی اور لائحہ عمل لے کر اٹھے گی وہ یا تو سرے سے ناکام رہے گی یا صرف جزوی طور پر کامیاب ہوگی۔ چنانچہ فرانس، جرمنی، ترکی اور روس کے انقلابات اس اصول کی بین مثالیں ہیں۔ ان انقلابوں میں وہ جامعیت نہیں جو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے پیدا کردہ حجازی انقلاب میں تھی۔ جس نے بعد میں قیصر و کسریٰ کو بھی ہضم کر لیا۔

الغرض ہمارے نزدیک المدثر کے معنی ہیں ”الہلک الکفر“ یعنی انسانیت میں سے ہر قسم کا کفر (انکار) نکالنے والا وہ انکار خواہ خدا کے حقوق کے متعلق ہو یا انسانوں کے حقوق کے متعلق یہ انقلاب اسے انسانیت میں سے نکال باہر کرے گا۔

اس لفظ میں جو مبالغہ پایا جاتا ہے وہ حضرت نبی اکرم ﷺ کا طبعی اور فطرتی عزم و استقلال ظاہر کرتا ہے جو اس کفر کے خلاف انقلاب برپا کرنے کے بارے میں ان کے دل میں پوشیدہ ہے۔

انقلاب میں اشاعت کی ضرورت:

(۲) قُم: (اٹھ)

یعنی اسے وہ کہ تو دنیا سے انسانیت سے ہر قسم کا ظلم اور کفر مٹانے کا تہیہ اور پختہ عزم کئے

(۱۶) فَعَصَى فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا (فرعون نے اس پیامبر کا کہنا نہ مانا تو ہم نے اسے دردناک عذاب میں مبتلا کر دیا)

فرعونی ملوکیت کا خاتمہ :

فرعون کی ملوکیت، بنی اسرائیل اور سب مصریوں سے ناجائز انفعاع (Exploitation) کر رہی تھی۔ اس نے ان کو غلامی کی انتہائی ذلالت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ان سے اتنی محنت و مشقت لی جاتی تھی کہ ان کو بیلوں اور گدھوں کی طرح تمام گھریلو کاموں کے لئے استعمال کیا جانے لگا تھا۔ اہرام مصر (Paramids) جیسی عظیم الشان عمارتیں جن کی تعمیر میں لاکھوں من پتھر کی سلیں لگی ہیں سب مصریوں کے ہاتھوں بنوائی گئیں۔

جب حکمران طبقہ اپنی قوم کو یوں ذلیل بنائے تو اسے کیوں زندہ رہنا چاہئے؟ وہ تو اپنی قوم کو آدمی ہی نہیں مانتے! بنی اسرائیل کی ان کے ہاں کیا قیمت ہو سکتی ہے؟ چنانچہ فرعون نے بھی بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ کے ساتھ جانے دینے سے انکار کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو آزادی کے پروگرام پر منظم کر لیا اور بالآخر ان کو مصر سے نکال لے گئے۔ اب خداوند تعالیٰ نے بھی بنی اسرائیل کی خاص مدد فرمائی۔ اور ان کے دشمنوں کو ان کی آنکھوں کے سامنے برباد کر دیا۔

چھٹی صدی عیسوی کے فراعنہ: کسریٰ اور قیصر

اسی طرح چھٹی صدی عیسوی کے فراعنہ (Pharoas) کسریٰ ایران اور قیصر روم۔۔۔۔۔ کے لئے ایک نبی عظیم ﷺ آیا جس نے ان کو دعوت دی کہ وہ اسلام کا قانون قرآن حکیم قبول کر کے اسے رائج کریں اگر وہ اس قانون کو رائج نہ کریں گے تو کسانوں پر جو ظلم وہ کر رہے ہیں اس کے وہ ذمہ دار ہوں گے۔ چنانچہ قیصر روم کو جو خط لکھا گیا اس میں یہ الفاظ خاص ہیں:

إِنِّي أَدْعُوكَ بِدَايِعَةِ الْإِسْلَامِ، أَسْلِمْتَ تَسْلَمَ يَوْمَ تَبْتَغِي أَجْرَكَ مَرْتَبِينَ فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَإِنَّ عَلَيْكَ إِثْمَ الْبَيْسُوتَيْنِ (الصبح البخاری باب بدء الوحي)

(میں تم کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر اسے مان لو گے تو دنیا میں بھی بچ رہو گے اور اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا دگنا اجر بھی دے گا اگر تم نے اس دعوت کو قبول نہ کیا تو تمہارے کسانوں پر جو مظالم ہو رہے اور وہ اپنی جہالت کے باعث جو غلطیاں کر رہے ہیں ان کے تم ذمہ دار ہوں گے)

اس خط سے ظاہر ہے کہ حضرت نبی اکرم ﷺ کی انسان دوستی شروع ہی سے ملوکیت پرستوں کے جوئے تلے دبے ہوئے لوگوں خصوصاً کسانوں کے ساتھ تھی کیونکہ ان ممالک کی غالب آبادی ان کسانوں وغیرہ ہی پر مشتمل تھی۔ چنانچہ امام الانعمہ امام ولی اللہ دہلوی نے جنتہ اللہ البالغہ (ص ۱۰۵) میں اس طبقے کی زبوں حالی کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ نہایت عبرت انگیز ہے۔

کسریٰ و قیصر نے یہ دعوت قبول نہ کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جس طرح فرعون کو دنیا میں سزا دی گئی اسی طرح یہ دونوں سلطنتیں صفحہ ہستی سے مٹا دی گئیں۔ اور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد صحیح ثابت ہوا کہ هَلْكَ كَثَرٌ فَلَا كَثَرٌ لِي بَعْدَهُ وَهَلْكَ قَتْنَصْرٌ فَلَا قَتْنَصْرٌ بَعْدَهُ (کسریٰ و قیصر ہلاک کر دیئے جائیں گے اور ان کے بعد ان کا کوئی جانشین نہیں ہوگا)

یہ تھا بین الاقوامی انقلاب، جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے قرآن کے ذریعے سے پیدا کیا اور جس کا فائدہ تمام کمزور جماعتوں کو پہنچا۔

(۱۷) فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبَةً (۱۸) (الف) السَّيِّئُ مُمْسِكٌ بِهِ: (تم کس طرح بچ سکو گے؟ اگر تم نے انکار کیا اس دن کا جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا اور جس سے آسمان پھاڑا جائے گا۔)

وہ یوم انقلاب آنے والا ہے اور جس طرح قیامت کبریٰ کا عذاب ایسا خوفناک ہو گا کہ بچے بوڑھے ہو جائیں گے اور آسمان پھٹ جائیں گے اسی طرح چھوٹے پیمانے پر آنے والے ایام انقلاب میں تمام مخالفین کو سخت سزا دی جائے گی۔ اس یوم انقلاب کے لانے کے لئے خدائے قدیر اور مدبر السموت والارض تدابیر کر رہا ہے۔ اگر اسے قریب تر لانے کے لئے آسمانی قوتوں کو پھاڑنا یا بقول حضرت مسیح علیہ السلام ”بلانا“ پڑے گا تو وہ بھی کر ڈالے گا۔

انقلاب کے لئے تدبیر الہی کے طریقے :

تدبیر الہی کے انہی اصول کار کی تشریح کرتے ہوئے امام ولی اللہ فرماتے ہیں:

وَإِذَا تَهَيَّأَتْ أَسْبَابُ هَذَا الشَّيْءِ اقْتَضَتْ رَحْمَةُ اللَّهِ بَعَادَهُ وَلَقْفَهُ بِهِمْ وَعُيُونُهُ قُدْرَتَهُ عَلَى الْكُلِّ وَشُؤْلُهُ عَلَيْهِ بِالْكُلِّ أَنْ يَتَصَرَّفَ فِي تِلْكَ الْقُوَى وَالْأُمُورِ الْحَاصِلَةِ لَهَا بِالْقَبْضِ وَالْبَسْطِ وَالْإِحَالَةِ وَالْإِلْهَامِ حَتَّى تَقْضَى تِلْكَ الْجُمْلَةُ إِلَى الْأَمْرِ الْمَطْلُوبِ

یعنی جب عارضی قباحت کے اسباب جمع ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی مہربانی تقاضا کرتی ہے کہ اس عارضی قباحت کو دور کر کے مصلحت عامہ کے مطابق حالت پیدا کر دی جائے اور یہ اللہ تعالیٰ کے لئے مشکل نہیں ہے اس لئے کہ وہ ہر چیز پر براہ راست قادر ہے۔ اور کائنات کے ذرے ذرے کے ظاہر و باطن کو جانتا ہے۔ اس غرض کے لئے وہ مخلوقات اور ان کی قوتوں میں

تصرف کرتا ہے اس کے تمام تصرفات چار قسموں میں منقسم ہو جاتے ہیں:

- (۱) قبض: (یعنی جو قوتیں مصلحت کلیہ کے خلاف ہوں ان کی قوت عاملہ روک دی جاتی ہے)
- (۲) بسط: (یعنی جو قوتیں مصلحت کلیہ کے لئے مفید ہوں مگر کمزور ہوں ان کو قوی مثالیہ سے مدد پہنچا کر طاقتور بنادیتا ہے)
- (۳) احالہ: (یعنی مصلحت کلیہ کے قیام کی غرض سے اگر ضرورت پڑے تو ایک عنصر کو دوسرے عنصر میں تبدیل کر دیا جاتا ہے)
- (۴) الہام: (یعنی مصلحت کلیہ کے قیام کے اصول کی محبت یا اس کے مخالف قوتوں کی نفرت لوگوں کے دلوں میں ڈال دی جاتی ہے اور وہ اس کے حق میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

کسریٰ و قیصر اور ان کے متبع میں قریش کو انداز:

الغرض ان تدابیر کے ذریعے سے قرآنی انقلاب لایا جائے گا اور کوئی قوت اسے روک نہ سکے گی اور نہ جہاز میں کوئی غیر انقلابی رہنے پائے گا۔ اب اگر فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تحریک انقلاب کی مخالفت کر کے نکلے گا تو قیصر و کسریٰ اور ان کے کئی اور جہازی متبعین اس انقلاب سے جو قرآن حکیم لانے والا ہے کس طرح بچ سکتے ہیں؟

اس پیشگوئی کی تصدیق:

تاریخ شاہد ہے کہ یہ پیشگوئی حرف بحرف صحیح نکلی اور اس اعلان کے تیرہ سال کے بعد جنگ بدر میں ابو جہل اور اس کے متبعین اور چند سال کے بعد ایرانی اور رومی جنگوں میں کسریٰ ایران اور قیصر روم ہلاک ہو گئے۔

(ب) كَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا: (یہ بات ہو کر رہنے والی ہے) یہ انقلاب ہو کر رہے گا اور کوئی طاقت اسے روک نہ سکے گی!

یہ اعلان جنگ بدر سے تیرہ سال پہلے کیا گیا تھا۔ اور بدر میں عین اس کے مطابق ہو کر رہا۔

انقلاب کا مطالعہ کرنے کی ضرورت:

ہمارے اکثر مفسرین نے اپنی تفسیریں اس زمانے میں لکھیں جب قرآنی انقلاب دنیا کے اکثر حصوں پر چھا چکا تھا اور قرآنی نظام (Quranic Order) کے مطابق مسلمانوں کی زندگی کی تنظیم ہو چکی تھی اس لئے یہ مفسرین انقلاب کی وہ کیفیت سمجھنے سے معذور رہے جو صدر اسلام میں پیش آئی تھی اور جس میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں نے واقعہ زندگی بسر

کی۔ اس لیے یہ مفسرین اکثر واقعات کو جو انقلاب کے زمانے میں پیش آیا کرتے ہیں اور جو واقعی قیامت کبریٰ کا نمونہ ہوتے ہیں، قیامت کبریٰ ہی پر محمول کر کے خاموش ہو گئے۔ اس انقلاب کی حقیقت کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے اس قسم کا انقلاب دیکھا ہو۔

(قرآنی شعور انقلاب ص ۳۳۶، ۳۳۷)



سورۃ فتح کا مرکزی واقعہ

سورۃ فتح میں صلح حدیبیہ کے واقعات کی طرف اشارے پائے جاتے ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے کہ ذی قعدہ ۶ ہجری میں حضرت نبی اکرم ﷺ نے ایک خواب دیکھا کہ گویا آپ اور مسلمان مکہ مکرمہ پہنچ گئے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں۔ اس خواب کی کیفیت سن کر غریب الوطن مسلمان جو عرصے سے خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے بے تاب تھے اور بھی بے چین ہو گئے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر آنحضرت ﷺ بھی عمرہ کے لئے جانے پر تیار ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ اور آپ کی جماعت ذی قعدہ ۶ھ میں مدینہ منورہ سے نکلے۔

اس سفر میں آپ کے ساتھ پندرہ سو صحابہ تھے۔ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) جن میں کچھ سوار تھے اور کچھ پیدل۔ جب آنحضرت ﷺ ذی الحلیفہ کے گاؤں پہنچے تو آپ نے عمرے کا احرام باندھا اور قبیلہ خزاعہ کے ایک آدمی کو بطور جاسوس بھیجا کہ قریش کی خبر لائے۔ چنانچہ جب آپ عسفان کے قریب پہنچے تو وہ سکاوٹ واپس آیا اور اس نے خبر دی کہ قریش آپ کو روکنے اور آپ سے لڑنے کے لئے جمع ہو رہے ہیں۔

جب حضرت نبی اکرم ﷺ کو یہ خبر پہنچی تو آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم کسی سے لڑنے کے لئے گھر سے نہیں نکلے لیکن اگر کوئی ہمیں بیت اللہ (کعبہ) تک پہنچنے سے روکے گا تو اس سے لڑیں گے۔ یہ سن کر حضرت نبی اکرم ﷺ آگے بڑھے اور کچھ دور جا کر آپ نے فرمایا کہ خالد بن ولید غنیم میں ہے ہم دائیں کو ہو چلیں۔ یہاں تک کہ آپ اپنی جماعت سمیت اس وادی تک پہنچ گئے جہاں سے مکہ کو جاتے ہیں۔ یہاں آپ کی اونٹنی یکایک ٹھہر گئی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر قریش مجھ سے کسی ایسی بات کا مطالبہ کریں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی حرمت کی تعظیم ہوتی ہو تو میں ان کی بات مان لوں گا۔ آگے بڑھ کر آنحضرت ﷺ حدیبیہ کے مقام پر اترے یہاں سے مکہ صرف ۱۹ میل تھا۔

یہاں سے آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان کو سفیر بنا کر قریش کے پاس بھیجا تاکہ انہیں خبر دیں کہ مسلمان صرف عمرہ ادا کرنے آئے ہیں ساتھ ہی انہیں ہدایت کر دی کہ مکہ

مکہ میں جو مسلمان چھپے چھپے رہتے ہیں ان سے بھی ملیں۔ اور انہیں فتح کی خوشخبری دیں اور انہیں اطمینان دلادیں کہ مکہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے گا اور کسی کو اپنا ایمان چھپانے کی ضرورت نہ رہے گی۔ چنانچہ حضرت عثمان بلوچ کے مقام پر قریش کی جماعت سے ملے اور پھر مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔

اس اثناء میں آنحضرت ﷺ کو یہ خبر پہنچی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں پر اس خبر کا اثر پڑ سکتا تھا۔ ظاہر ہے آنحضرت ﷺ نے نیکر کے ایک درخت کے نیچے تمام حاضرین سے اس امر پر اقرار لیا کہ اگر اب لڑنا پڑے تو ثابت قدم رہیں گے۔ مسلمانوں نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ بیعت کی۔ سب سے پہلے حضرت ابوسنان الاسدی نے بیعت کی۔ ایک صحابی حضرت سلمہ بن اکوع نے تین مرتبہ بیعت کی یعنی شروع میں، بیچ میں اور آخر میں۔ یہ خبر سن کر قریش کے ہوش جاتے رہے اور انہوں نے صلح کے لئے آدمی بھیجے۔ آخر ان باتوں پر صلح ہو گئی۔

(۱) یہ صلح دس سالوں تک رہے گی۔

(۲) جو قبیلے قریش سے ملنا چاہیں، قریش سے مل جائیں اور جو مسلمانوں سے ملنا چاہیں مسلمانوں سے مل جائیں۔

(۳) مسلمان ابھی واپس جائیں اور اگلے سال کعبہ کا طواف کر لیں۔

(۴) اگر مکہ والوں میں سے کوئی شخص مسلمان ہو کر نبی اکرم ﷺ کے پاس چلا جائے تو اسے قریش کے طلب کرنے پر واپس کر دیا جائے اور اگر کوئی مسلمان قریش میں چلا گیا تو اسے واپس نہیں دیا جائے گا۔

اس شرائط پر ابھی بحث ہو رہی تھی کہ مسلمان ابو جندل رضی اللہ عنہ بن سہیل مکہ سے آیا اور تمام مسلمانوں کے سامنے گر گیا۔ قریش کے سفیر نے معاہدے کی شرط کے مطابق اسے طلب کیا حالانکہ ابھی اس شرط پر بحث ہو رہی تھی۔ اس آخری شرط سے سب مسلمان سوائے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سخت پریشان ہوئے۔ اس پریشانی کی ترجمانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کی۔ آپ نے حضرت نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا کہ ”یا رسول اللہ کیا آپ اللہ کے نبی نہیں ہیں؟“ آپ نے فرمایا یقیناً۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ ”کیا ہم حق پر اور ہمارا دشمن ناحق پر نہیں ہیں؟“ آپ نے فرمایا یقیناً۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ ”کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم عنقریب بیت اللہ کا طواف کریں گے؟“ آپ نے فرمایا کہ ”کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اسی ہی سال کریں گے؟“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ”نہیں“۔ تو آپ نے فرمایا کہ ”یقین رکھو ہم ضرور یہاں آئیں گے اور طواف کریں گے۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی قسم کی باتیں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بھی کیں۔ حضرت صدیق اکبر نے بھی وہی جوابات دے دیے، جو آنحضرت نے دیئے تھے بلکہ یہ بھی فرمایا کہ آنحضرت جو بات فرمائیں اسے مرتے دم تک بے چون و چرا ماننے رہو۔ غرض یہ شرط منظور ہو گئی اور آنحضرت ﷺ نے ابو جندل رضی اللہ عنہ کو قریش کے سفیر کے حوالے کر دیا۔ اور ابو جندل رضی اللہ عنہ نے صبر کے ساتھ اپنی مصیبت کو قبول کر لیا۔ اور تمام مسلمان یہ تلخ گھونٹ پی کر بھی چپکے ہو رہے۔

ابھی حضرت نبی اکرم ﷺ حدیبیہ ہی میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ اسی (۸۰) آدمی کوہ نعیم سے صبح کے وقت اس ارادے سے اترے کہ مسلمانوں کو نماز کی حالت میں قتل کر دیں۔ یہ سب لوگ گرفتار کر لئے گئے۔ لیکن آنحضرت نے انہیں معاف کر کے رہا کر دیا۔

اس معاہدے کے بعد آپ حدیبیہ سے مدینہ منورہ کو واپس تشریف لے گئے۔ راستے میں سورہ فتح کے شروع کی آیتیں اتریں۔

ترجمہ: ہم نے تجھے کھلی فتح دی اور تیری پہلی لغزشیں اور پچھلی لغزشیں معاف

کر دیں اور اپنی نعمت تجھ پر تمام کر دی اور (یہ کہ وہ) سیدھی راہ کی طرف تیری

راہنمائی کری اور تجھے زبردست مدد دی۔

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ کیا یہ فتح ہے؟ (یعنی حدیبیہ کا صلح نامہ) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ہاں یہی چیز ہے جسے فتح قرار دیا گیا ہے۔

آپ مدینہ منورہ میں ذی الحجہ کے شروع میں واپس تشریف لے آئے۔ یہاں کوئی تین ہفتے ٹھہرے ہوں گے کہ محرم میں خیبر پر چڑھائی کر دی۔ اس معرکے میں صرف ان مسلمانوں کو شامل ہونے کی اجازت تھی جو حدیبیہ کے واقعے میں شریک رہ چکے تھے۔

صلح کا نتیجہ اور اثر:

اس صلح کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں اور ان کے مخالفوں میں راہ و رسم بڑھا اور میل جول زیادہ ہوا تو اسلام کے متعلق غلط فہمیوں کے بادل چھٹنے لگے اور لوگ مسلمانوں کے اچھے سلوک سے اثر لے کر مسلمان ہونے لگے۔ آنحضرت ﷺ نے صلح نامہ کی چوتھی شرط کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ مخالفین میں سے جو شخص مسلمان ہو کر شرط کے مطابق مخالف کیسپ میں بھیجا جائے گا، وہ ضرور وہاں بھی اپنا کام کرتا رہے گا۔ چنانچہ حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ جن کا ذکر اوپر آچکا ہے عین معاہدہ لکھے جانے کے وقت قریش کے حوالے کر دیئے گئے۔ انہیں مکہ معظمہ لے جا کر قید کر دیا گیا۔ لیکن جو شخص ان کی نگرانی پر مقرر ہوتا۔ وہ ان کے سمجھانے سے مسلمان ہو جاتا۔ اب دونوں

اختتامیہ

اظہار رسالت عہدِ حاضر میں

پیغمبر اسلام ﷺ کو خصوصی طور پر اظہار کی نسبت دی گئی ہے۔ آپ کے دین کے لئے مقدر کر دیا گیا ہے کہ وہ تمام ادیان پر غالب و سر بلند ہو۔ یہی نسبتِ غلبہ آپ کی امت کو بھی حاصل ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسا کیا کہ ڈھائی ہزار سال کے ایک خصوصی منصوبہ کے ذریعہ وہ اسباب فراہم کئے جن کو استعمال کر کے آپ دینِ خدا کو غالب و ظاہر کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہی معاملہ آپ ﷺ کی امت کے ساتھ ہے۔ چنانچہ پچھلے ہزار سال کے عمل کے نتیجے میں خدا نے وہ موافق حالات کامل طور پر فراہم کر دیئے ہیں جو دورِ جدید میں اسلام کے غلبہ کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ پیغمبر کے امتی اگر ان موافق حالات کو حکمت اور صبر کے ساتھ استعمال کریں تو خدا کا وعدہ نصرت دوبارہ پیغمبر کے امتیوں پر اسی طرح واقعہ بن سکتا ہے جس طرح وہ خود پیغمبر کے اوپر واقعہ بنا تھا۔

امریکہ سے ایک انسائیکلو پیڈیا جیچی ہے جس کا نام ہے: انسان اور اس کے معبود (Man and his Gods) اس کتاب میں مختلف مذاہب پر مقالے ہیں۔ اسلام پر جو مقالہ ہے، اس کے عیسائی مقالہ نگار نے اسلامی انقلاب کے بعد پیدا ہونے والے عظیم نتائج کے بارے میں یہ الفاظ لکھے ہیں۔ ”اس کے ظہور نے انسانی تاریخ کے رخ کو بدل دیا:“

(Its advent changed the course of human history (p.389)

یہ ایک مستشرق کی زبان سے اسلامی انقلاب کی پیدا کردہ ان تبدیلیوں کا اعتراف ہے جنہوں نے تاریخ میں ایسے دور رس امکانات کھولے جن کے بعد اسلام کو غیر اسلامی ادیان پر غالب و برتر کرنا اسی طرح آسان ہو گیا ہے، جس طرح بارش آجانے کے بعد کھیت سے فصل اگانا۔ پیغمبر آخر الزماں اور آپ کے ساتھیوں کے ذریعہ جو انقلاب برپا کیا گیا وہ اگرچہ اصلاً توحید اور آخرت کی فکر پر مبنی ایک دینی انقلاب تھا۔ لیکن اس نے بہت سے دور رس دنیوی نتائج بھی پیدا کئے۔ آپ کے لئے ہوئے انقلاب کے دنیوی نتائج میں سب سے اہم وہ نتائج ہیں جنہوں نے قدیم

* لِيُظْهِرَ مَا عَلَى الْبَيْنِ (توبہ۔ ۳۳)

مل کر تلقین کرتے۔ اس طرح ان قیدیوں کی تلقین سے تین سو کے قریب آدمی مسلمان ہو گئے۔ قریش مکہ نے بہتیرا چاہا کہ آنحضرت ﷺ معاہدے کی اس شرط کو توڑ کر ان مسلمانوں کو اپنے ہاں لے لیں۔ لیکن آپ نے معاہدہ توڑنا قبول نہیں فرمایا۔ آخر قریش کو خود ہی ان مسلمانوں کو کسے سے نکال دینا پڑا۔

حدیبیہ میں اسلامی جماعت کے ضبط کا حال اوپر بیان ہو چکا۔ یہ لوگ تو آنحضرت کے سامنے تھے لیکن حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ آپ سے دور ہوتے ہوئے بھی جماعتی ضبط کے اتنے پابند نکلے کہ جب مدینہ منورہ کے مسلمانوں نے قرار دیا کہ ابو جندل رضی اللہ عنہ نے ابو العاص کی کے جس قافلے کو لوٹا ہے اس کا مال اسے واپس کر دیں تو انہوں نے اس فیصلے کی اطلاع پاتے ہی ابو العاص کے قافلے کا سارا اسباب یہاں تک کہ رسی اور اونٹ کی مہارت تک ابو العاص کے حوالے کر دی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ابو العاص نے سارا مال حق داروں تک پہنچا کر اسلام قبول کر لیا۔

غرض اس صلح کے نتیجے کے طور پر لوگ کثرت سے اسلام لانے لگے۔ چنانچہ جہاں حدیبیہ کے واقعے میں آنحضرت کے ساتھ پندرہ سو آدمی تھے وہاں ایک سال بیچ دے کر اگلے سال فتح مکہ کے وقت آپ کے ساتھ دس ہزار ”قدوسی“ تھے۔ یہ نتیجہ تھا اس بات کا کہ اب مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمیوں کے بادل چھٹ رہے تھے۔ گویا اس صلح نے اسلام کی فتح کا دروازہ کھول دیا۔ (قرآنی شعور انقلاب ص ۵۲۱، ۵۲۵)

زمانہ کے سماجی اور اجتماعی نظام کو اس طرح بدل دیا کہ وہ حالات ہی ختم ہو گئے جن میں دعوت حق کا کام ایک انتہائی مشکل کام بننا ہوا تھا۔

سورہ براءۃ نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مکہ بھیجا تاکہ وہ اعلان کر دیں کہ اس سال کے بعد کسی مشرک کو حج بیت اللہ کی اجازت نہ ہوگی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں حج کے اجتماعات میں بلند آواز سے اس کا اعلان کرتا پھر تا تھا، یہاں تک کہ میری آواز بھاری ہو گئی (فکننت انادی حتی صحل صبحی، تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۱۲۳) مگر آج لاؤڈ اسپیکر و دیگر وجود میں آنے کے بعد یہ مسئلہ کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں اعلان حق کا کام کتنا زیادہ آسان ہو چکا ہے۔

دین کی دعوت کے دو بڑے دور ہیں۔ ایک پیغمبر آخر الزماں کے ظہور سے پہلے۔ دوسرا پیغمبر آخر الزماں کے ظہور کے بعد۔ رسول اللہ ﷺ سے پہلے خدا کی جو کتابیں آئیں ان کی حفاظت کی ذمہ داری خود ان امتوں پر ڈالی گئی جن کے پاس وہ کتابیں بھیجی گئی تھیں۔ چنانچہ ان کے بارے میں قرآن میں استخفاط (طلب حفاظت) کا لفظ آیا ہے

بِنَا اسْتَحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ (المائدہ-۳۴)

(کیونکہ وہ کتاب اللہ کے محافظ ٹھہرائے گئے تھے اور اس (کے حکموں اور ہدایتوں) پر گواہ تھے)

مگر قرآن کی حفاظت کے بارے میں فرمایا گیا کہ خدا نے اس کتاب کو اتارا ہے اور وہی اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے

إِنَّا نَحْنُ حَافِظُوا لِكِتَابِ اللَّهِ وَآلَهُ لِيَحْفَظُوهُ (الحجر-۹)

(بلاشبہ خود ہم نے ”الذکر“ (یعنی قرآن کہ سر تا پا نصیحت ہے) اتارا ہے اور بلاشبہ خود ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔)

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے ساتھ خدا کا یہ منصوبہ تھا کہ شرک کو مغلوب کیا جائے اور توحید کو دنیا میں غالب فکر کا مقام عطا کیا جائے (الانفال ۳۹) یہ کام اتنے مختلف اسباب کی مساعدت چاہتا ہے جو صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ڈھائی ہزار سالہ عمل کے نتیجے میں وہ موافق حالات پیدا کئے جن کو استعمال کر کے آپ نے شرک کو مغلوب کیا اور توحید کو فکری غلبہ کے مقام پر پہنچا۔

رسول اور اصحاب رسول کی کوششوں سے جو انقلاب آیا اس کے بعد شرک ہمیشہ کے لئے مغلوب ہو گیا۔ اب اس کی کوئی امید نہیں کہ شرک دوبارہ ایک غالب فکر کی حیثیت سے دنیا میں چھاسکے۔ تاہم موجودہ زمانہ میں دوبارہ یہ واقعہ ہوا کہ توحید والوں نے غالب فکر کی حیثیت سے اپنا

مقام کھودیا۔ اس بار یہ واقعہ ’الحاد‘ کے ہاتھوں سے ہوا۔ چنانچہ آج کی دنیا میں الحاد نے غالب فکر کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ بے خدا ذہن یا سیکولر ذہن آج دنیا کا غالب ذہن ہے۔ اس کے مقابلہ میں توحید کا ذہن عملاً دوسرے درجہ پر چلا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو یقیناً معلوم تھا کہ آئندہ دور الحاد آنے والا ہے۔ اس لئے اس کی نصرت دوبارہ متحرک ہوئی۔ پچھلے ہزار سالہ عمل کے دوران اس نے دوبارہ ایسے حالات پیدا کرنے شروع کئے جو بالآخر غلبہ توحید کی جدوجہد کے لئے موافق زمین کا کام کر سکیں۔ یہ عمل اب اپنی تکمیل کے مرحلہ میں پہنچ گیا ہے۔ آج اگرچہ بظاہر الحاد کا غلبہ ہے مگر وہ موافق حالات پوری طرح پیدا ہو چکے ہیں جن کو استعمال کر کے دوبارہ توحید کو غالب فکر کا مقام دیا جاسکے۔

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تقریباً چار ہزار سال پہلے قدیم عراق کے دارالسلطنت (ار) کے لوگوں کو پکارا کہ ایک خدا ہے جس کا حکم اور بندگی ہے، جو نفع و نقصان کا مالک ہے۔ خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اسی لئے تم اسی سے حاجتیں مانگو اور اسی کی پرستش کرو۔ اس دعوت توحید کے خلاف اس وقت کے مشرک بادشاہ نمرود کلدانی نے اتنا سخت رد عمل ظاہر کیا کہ آپکو آگ کے لالہ میں ڈال دیا۔

آج بھی دنیا کے ہر ملک میں شرک کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ لیکن آج آپ کسی ملک میں دعوت ابراہیمی کو لے کر انھیں تو موجودہ زمانہ کا کوئی حکمران آپ کے ساتھ اس قسم کا شدید سلوک نہیں کرے گا۔

اس کی وجہ فلسفہ حکومت کی تبدیلی ہے۔ نمرود کے زمانہ میں شرک ایک سیاسی عقیدہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب کہ آج وہ صرف ایک محدود مذہبی عقیدہ ہے۔ قدیم زمانہ میں عام طور پر مشرکانہ نظریہ سیاست دنیا میں رائج تھا۔ نمرود، دور قدیم کے دوسرے بادشاہوں کی طرح، اسی قسم کے نظریہ کی بنیاد پر حکومت کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ سورج دیوتا کا مظہر ہے، اس لئے وہ دوسروں سے برتر ہے اور اس کو دوسروں کے اوپر حکمرانی کرنے کا فوق الفطری حق حاصل ہے۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے حکمران اس قسم کے نظریہ حکومت سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ انہوں نے عوامی رائے کی بنیاد پر اپنے لئے حکمرانی کا حق حاصل کیا ہے نہ کہ کسی فوق الفطری عقیدہ کی بنیاد پر۔ یہی وجہ ہے کہ توحید کی دعوت میں موجودہ حکمرانوں کو اپنے اقتدار کے لئے کوئی چیلنج نظر نہیں آتا۔ جب کہ نمرود اور دور قدیم کے دوسرے بادشاہوں کو توحید کا عقیدہ پھیلنے میں اپنی سیاسی جڑ کٹی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

قدیم زمانہ میں جب کوئی پیغمبر اٹھتا تو اکثر پہلے ہی مرحلہ میں وقت کے اقتدار سے اس کا ٹکراؤ شروع ہو جاتا اور غیر ضروری قسم کی مشکلات اس کی راہ میں حائل ہو جاتیں۔ اس کی وجہ سیاسی ادارہ

میں شرک کے اوپر توحید کو غلبہ دیا تو اسی کے اندر وہ اسباب بھی پیدا کر دئے جو بعد کے زمانہ میں الحاد پر توحید کو غالب کرنے میں مددگار بن سکیں۔

اسلام کے ذریعہ آنے والے توحیدی انقلاب سے پہلے ساری دنیا میں شرک کا غلبہ تھا۔ شرک دراصل مفادات و مظاہر پرستی کا دوسرا نام ہے۔ دنیا کی ہر چیز جو نمایاں اور اغراض کا محور نظر آئی اسی کو انسان نے اپنے غرض کا خدا بنا کر پوجنا شروع کر دیا، خواہ وہ آسمان کا سورج ہو یا زمین کا بادشاہ۔ اس کی وجہ سے دور شرک میں سائنسی تحقیق کا کام ممکن نہ ہو سکا۔ آرٹھڈو انٹن بی کے الفاظ میں، فطرت کے مظاہر اس وقت پرستش کا موضوع (Object of Worship) بنے ہوئے تھے، پھر وہ تحقیق کا موضوع (Object of Investigation) کیسے بنتے۔ اسلام نے شرک کو مغلوب کر کے توحید کو غالب کیا تو ایک خدا کے سوا ہر چیز مخلوق نظر آنے لگی، اس انقلاب نے یہ ممکن بنادیا کہ چیزوں پر تحقیق کا عمل جاری کیا جاسکے۔ یہ عمل ابتدائی صورت میں دور اول ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ ایک بار چاند گرہن کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سورج گرہن اور چاند گرہن اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ وہ کسی بڑے آدمی کی پیدائش یا موت کی بنا پر نہیں ہوتے۔ اس طرح آپ نے مادی بڑائی کی بھی نفی کر دی اور انسانی بڑائی کی بھی۔ یہ فکری لہر عقیدہ سے الگ ہو کر یورپ پہنچی اور بالآخر جدید انقلاب کا سبب بنی۔

۱۔ اس انقلاب کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ توہماتی دور کا خاتمہ ہو گیا۔ توہم پرستی کیا ہے؟ توہم پرستی نام ہے حقائق کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کے بجائے مفروضات و قیاسات کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کا۔ (مثلاً یہ فرض کر لینا کہ جب کسی بڑے آدمی کی موت ہوتی ہے تو سورج یا چاند گہنا جاتے ہیں) یہ ذہن اسلام کی طرف بڑھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ایسا آدمی حقائق واقعی کی بنیاد پر اسلام اور غیر اسلام کا جائزہ نہیں لیتا بلکہ بیٹھکی مفروضات کی بنیاد پر بلادلیل ایک کو صحیح اور دوسرے کو غلط مان لیتا ہے۔ مثلاً اسلام تاریخی طور پر ایک مستند دین ہے اور دیگر تمام مذاہب اپنی اور بیجن کی تاریخی استناد سے محروم ہیں۔ مگر توہمات کے دور میں انسان اس کو اہمیت نہیں دے پاتا تھا۔ جدید دور نے اس کو پوری اہمیت کے ساتھ لیا۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں تنقید عالیہ (Higher Criticism) کے نام سے ایک مستقل فن وجود میں آ گیا ہے۔ اس فن کے تحت یہ حقیقت پوری طرح مسلم ہو گئی ہے کہ تاریخی طور پر معتبر دین صرف اسلام ہے۔ دوسرے ادیان کو تاریخی اعتباریت کا درجہ حاصل نہیں۔

۲۔ سائنسی ذہن نے کائنات کو تجربہ اور مشاہدہ کی روشنی میں جاننے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں کائنات میں چھپے ہوئے ایسے فطری حقائق انسان کے علم میں آئے جو اسلام کی تعلیمات کی تصدیق اعلیٰ سطح پر کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر انسان کی تحقیق نے بتایا کہ کائنات میں ہر

کے ساتھ فوق الطبعی عقائد کی یہی وابستگی تھی۔ قدیم زمانہ کے بادشاہ عوام کو یہ یقین دلا کر ان کے اوپر حکومت کرتے تھے کہ وہ دیوتاؤں کی اولاد ہیں، خدا ان کے اندر حلول کر آیا ہے۔ ایسے ماحول میں جب توحید کی آواز بلند ہوتی تو ان کو نظر آتا کہ وہ ان کے سیاسی استحقاق کو بے اعتبار بنا رہی ہے۔ یہ اعتقادی پیچیدگی ان کو داعی حق سے ٹکرا دیتی تھی۔ اسلام نے ثابت کیا کہ ہر قسم کی فوق الفطری حیثیت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اس نے اعلان کیا کہ تمام انسان برابر ہیں، ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ اس طرح اسلام نے سیاسی ادارہ کو اعتقادات سے جدا کر دیا۔ اب حکومت کرنے کا حق کسی کو عوامی رائے سے ملتا تھا نہ کہ خدا سے کسی قسم کے پراسرار رشتہ کی بنیاد پر۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے قدیم زمانہ میں کچھ لوگ یہ بات مشہور کر کے اپنا طبی کاروبار چلاتے تھے کہ انہوں نے ایک جن کو مسخر کر رکھا ہے اور وہ ان کے پاس آکر ان کو فن طب کے رموز بتاتا ہے۔ ایسے ماحول میں اگر کوئی شخص یہ آواز بلند کرے کہ علم طب میڈیکل کالج میں سکھایا جاتا ہے نہ کہ جنات کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے تو مذکورہ قسم کے طبیب ایسے شخص کے سخت مخالف ہو جائیں گے۔ مگر موجودہ زمانہ کے ایم بی بی ایس ڈاکٹر کو ایسی تحریک سے کوئی عداوت نہ ہوگی۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے انقلاب کے ذریعہ تاریخ کا رخ موڑنے کا علم ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوا تھا۔ اب وہ اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ دین کے داعیوں کے لئے اب خود انسانی اسلحہ خانہ میں ہر قسم کے تائیدی اسباب موجود ہیں۔ جدید قانونی اور سماجی تبدیلیوں نے اب اس کا موقع دے دیا ہے کہ دعوت دین کا کام کٹے طور پر کیا جائے اور کوئی فرعون یا نمرد اس کا راستہ روکنے کیلئے میدان میں موجود نہ ہو، حقائق کی دنیا جواب انسان کے علم میں آئی ہے اس نے ایسے دلائل جمع کر دئے ہیں جو دین کی صداقت کو خالص علمی طور پر ثابت شدہ بنا سکیں۔

موجودہ زمانہ میں ایک عظیم فکری انقلاب آیا ہے۔ یہ انقلاب وہی ہے جس کو عام طور پر سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔ جدید سائنسی انقلاب نے انسانی تاریخ میں پہلی بار ایسی فکری تبدیلیاں پیدا کی ہیں جو دعوت توحید کے عین موافق ہیں۔ ان کو مناسب طور پر استعمال کیا جائے تو صرف قلمی اور لسانی تبلیغ کے ذریعہ غلبہ توحید کا وہ مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے جس کے لئے پچھلے زمانوں میں تلوار اٹھانی پڑتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنسی انقلاب زمانہ رسالت کے اسلامی انقلاب کا ایک ضمنی حاصل (By-product) ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر آخر الزماں کے لائے ہوئے انقلاب کے ذریعہ ایسے اسباب پیدا کئے جنہوں نے تاریخ کے اندر اپنا عمل شروع کیا۔ تبدیلی کا یہ عمل مسلسل جاری رہا۔ یہاں تک کہ وہ اس انقلاب تک پہنچا جس کو جدید سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔ گویا خدا نے صدر اول

یہ حقیقت مشکف ہوتی ہے کہ کائنات اس سے زیادہ پیچیدہ ہے کہ انسان کا محدود ذہن اس کا احاطہ کر سکے۔ سائنس کی یہ دریافت اسلامی نقطہ نظر سے بے حد اہم ہے۔ کیونکہ اس سے رسالت کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ ایک طرف انسان کا یہ حال ہے کہ وہ حقیقت کو آخری حد تک جان لینا چاہتا ہے۔ دوسری طرف انسان اپنی بناوٹ کے اعتبار سے ایسی محدودیت کا شکار ہے کہ وہ کبھی بھی حقیقت کو آخری حد تک نہیں جان سکتا۔ انسانی زندگی کا یہ خلا واضح طور پر یہ بتاتا ہے کہ اس کو ایک برتر رہنما کی ضرورت ہے۔ اسی برتر رہنما کا دوسرا نام پیغمبر ہے۔ انسانی محدودیت کے بارے میں سائنس کے اقرار نے پیغمبر کی ضرورت کو خالص علمی سطح پر ثابت کر دیا ہے۔

۴۔ قدیم زمانہ میں انسان کو اظہار رائے کی آزادی حاصل نہ تھی۔ اس کی اصل وجہ بادشاہوں اور بڑے انسانوں کے تقدس کا عقیدہ تھا۔ جو لوگ کسی درجہ سے اونچے مقام پر پہنچ جاتے ان کو مقدس سمجھ لیا جاتا ان کی رائے دوسروں سے برتر مانی جاتی۔ ان کو یہ حق مل جاتا کہ جس طرح چاہیں دوسروں کو اپنی مرضی کا پابند بنائیں۔ توحید کے انقلاب نے ہر سطح پر انسانی غلامی اور بڑائی کا خاتمہ کیا اور یہ اعلان کیا کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر فضیلت نہیں۔ اس کے بعد تاریخ میں ایک نئی فکری لہر چل پڑی۔ یہی وہ فکری لہر ہے جس کی سیاسی تکمیل بالآخر یورپ میں جمہوریت کی صورت میں ہوئی۔ جمہوری انقلاب نے تمام انسانوں کو برابر ٹھہرا دیا۔ ہر شخص کے لئے یہ فکری حق تسلیم کر لیا گیا کہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق جو چاہے لکھے اور جو چاہے بولے۔ اس انقلاب نے تاریخ میں پہلی بار اس بات کو ممکن بنادیا کہ خدا کے دین کی تبلیغ اس طرح کی جائے کہ تبلیغ کرنے والے کے لئے کسی طرح کی پکڑ دھکڑ کا اندیشہ نہ ہو۔

۵۔ سائنس نے آج کے انسان کے لئے خدا کی بہت سی وہ مادی نعمتیں کھولی ہیں جو ہزاروں برس سے کائنات کے اندر چھپی ہوئی تھیں۔ ان میں اسلامی دعوت کے نقطہ نظر سے سب سے اہم جدید ذرائع مواصلات ہیں۔ پریس، ریڈیو، ٹیلی ویژن مانیٹ اور اسی طرح مختلف قسم کی تیز رفتار سواریاں۔ یہ چیزیں اسلام کے حق میں عظیم نعمتیں ہیں۔ ان کو استعمال کر کے اسلامی دعوت کو عالمی سطح پر پھیلایا جاسکتا ہے۔

یہ مواقع جو عین اسلامی دعوت کے حق میں ہیں، پچھلے ہزار سالہ عمل کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں۔ پچھلے زمانہ میں جس طرح اللہ تعالیٰ نے ڈھائی ہزار سالہ عمل کے ذریعہ اسلام کے غلبہ اول کے حالات فراہم کئے، اسی طرح اس نے دوبارہ ہزار سالہ عمل کے نتیجے میں اسلام کے غلبہ ثانی کے حالات فراہم کر دئے ہیں۔ تاہم یہ حالات و مواقع خود اپنے زور پر واقعہ نہیں بن جائیں گے۔ اس امکان کو واقعہ بنانے کے لئے زندہ انسانوں کی ایک جماعت درکار ہے۔ ایسی ایک جماعت

جگہ ایک ہی قانون فطرت کا فرمان ہے۔ جو قانون زمین کے احوال پر حکمراں ہے وہی قانون کائنات کے دور دراز مقامات پر بھی حکمراں ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کائنات کا خدا صرف ایک ہے۔ دو خدا یا بہت سے خداؤں کی اس کائنات میں گنجائش نہیں۔

۳۔ دین توحید کو قدیم زمانہ میں اختیار کرنے کے لئے، ایک علمی رکاوٹ، قدیم فلسفہ بھی تھا۔ قدیم زمانہ میں فلسفہ کو غالب علم کا مقام حاصل تھا۔ تعلیم یافتہ طبقہ کے سوچنے کی ذہنی زمین اس زمانہ میں فلسفہ ہو جاتا تھا۔ اس کے نتیجے میں دین توحید کی راہ میں ایک بہت بڑی مصنوعی رکاوٹ حائل ہو گئی تھی۔

قدیم فلسفہ کا آخری نشانہ ہمیشہ سے آخر سچائی کی تلاش رہا ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ تقریباً پانچ ہزار سال کی شان دار تاریخ کے باوجود فلسفہ اپنے نشانہ تک پہنچنے میں مکمل طور پر ناکام رہا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ فلسفہ انسان کی محدودیتوں (Limitations) کا ادراک نہ کر سکا۔ وہ آخری سچائی تک پہنچنے کے لئے ساری کوششیں صرف کرتا رہا۔ جب کہ انسان اپنی محدود صلاحیتوں کی وجہ سے بطور خود آخری سچائی تک پہنچ ہی نہ سکتا تھا۔

اس فلسفیانہ طرز فکر کی وجہ سے ہزاروں برس تک انسان یہ چاہتا رہا کہ دین توحید کی بنیاد جن اساسی عقائد پر قائم ہے اس کو انسان کے لئے مکمل طور پر معلوم اور مشاہد بنادیا جائے۔ مگر یہ تمام غیبی حقیقتیں انسانی اپنی موجودہ صلاحیتوں کے ساتھ آپ ہی آپ ان غیبی حقیقتوں کا کامل ادراک نہیں کر سکتا۔

جدید سائنس کا، دینی نقطہ نظر سے، سب سے براکار نامہ یہ ہے کہ اس نے اس مفروضہ کو ڈھال دیا۔ اس نے آخری طور پر یہ ثابت کر دیا کہ انسان کی صلاحیتیں محدود ہیں۔ وہ اپنی محدودیت کی وجہ سے حقیقت کا کلی ادراک نہیں کر سکتا۔ قدیم فلسفہ کی پیدا کردہ ذہنی زمین اب ساری دنیا میں دفاعی حیثیت کے مقام پر جا چکی ہے اور اب سائنس کی دریافت کردہ ذہنی زمین کو علمی دنیا میں غالب مقام حاصل ہے۔

ذہن کی اس تبدیلی نے دین توحید کے لئے راستہ صاف کر دیا ہے۔ اب اس نقطہ نظر کو، کم از کم بالواسطہ طور پر، مکمل علمی تائید حاصل ہے کہ انسان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ حقیقت اعلیٰ کو پانے کے لئے وہ پیغمبر کی اطلاع کا اعتبار کرے۔ اب یہ مطالبہ سراسر غیر علمی مطالبہ بن چکا ہے کہ خدا اور وحی اور آخرت کو ہماری آنکھوں سے ہمیں دکھاؤ، اس کے بعد ہی ہم اس پر ایمان لائیں گے۔

معلوم تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ خود علم انسانی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان کا علم محدود ہے اور ہمیشہ محدود رہے گا۔ انسان سائنسی ذرائع سے جب کائنات کی کھوج کرتا ہے تو اس پر

اگر کھڑی ہو جائے تو قریبی مستقبل میں اسی طرح دوبارہ اسلام کو فکری غلبہ مل سکتا ہے جس طرح قرن اول میں اس کو شرک کے مقابلہ میں فکری غلبہ حاصل ہوا تھا۔ (مولانا وحید الدین خان)

اس غلبہ کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ قرآن کے ان پہلے مخاطبین کے سامنے روایات کا مسخ شدہ دین نہیں تھا بلکہ قرآن کی ہدایت ان کا اصل الاصول تھی۔ انہوں نے توحید کے عظیم تصور کو صرف غیر اللہ کے سامنے ماتھانہ ٹکینے کا پیغام نہیں جانا بلکہ توحید کے تصور عظیم سے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا عبدیت اور غلامی کے تمام تصورات کو خاتمہ یقینی بنایا۔ اور ہر سطح پر انسانی آزادیوں کی داغ بیل ڈال دی۔

اس طرح توحید میں اللہ تعالیٰ کی عبدیت کے ساتھ اس کی ربوبیت اور اس کی حاکمیت کے تصورات پر قرآنی ہدایات کے عین مطابق عمل پیرا ہوئے۔ اس طرح انسانی کو معاشرت و اقتصاد کی بے مثال فیض رسانی ہوئی انہوں نے دنیا کو باطل قرار دیکر آخرت کی تیاری کا سامان نہیں بنایا بلکہ قرآن کی ہدایت کے مطابق حسنۃ فی الدنیا۔ دنیا کی حسنا کیوں سے حسنۃ فی الآخرت کا سامان تیار کیا۔ انہوں نے استخلاف فی الارض یعنی زمین پر خدائی خلافت کا ایسا مثالی نمونہ قائم کیا کہ انسانی فلاح و کامرانیوں کے میدان میں آئندہ کی انسانیت کیلئے شاندار روایتیں قائم ہو گئیں۔

اب بھی قرآن حکیم کے بتائے ہوئے توحید کے انہی تصورات سے جن کو پیغمبر اسلام ﷺ اور اس کی جماعت نے اختیار کر کے بڑی عالمی تبدیلیوں کی بنیاد ڈالی، اس مضطرب و مسائل میں گھری ہوئی دنیا کو امن و آشتی کا گہوارہ بنایا جاسکتا ہے۔ (مرتب)